اختر اورینوی نمبر
پٹنہ
HADI

دعائیہ

محترمی!

آپ اپنے رسالہ کا اختراورینوی نمبر شائع کررہے ہیں دعا ہے کہ اختر صاحب کی خدمات اور خوبیوں کے اعتراف میں اس طرح کے صحیفے تادیر شائع ہوتے رہیں اور احباب اعزا اوربزرگوں کو خوش ہونے اور فخر کرنے کا موقع ملتا رہے۔

آمین —

رشید احمد صدیقی
۱۴ جنوری سنہ ۱۹۶۵ء

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
(غالب)
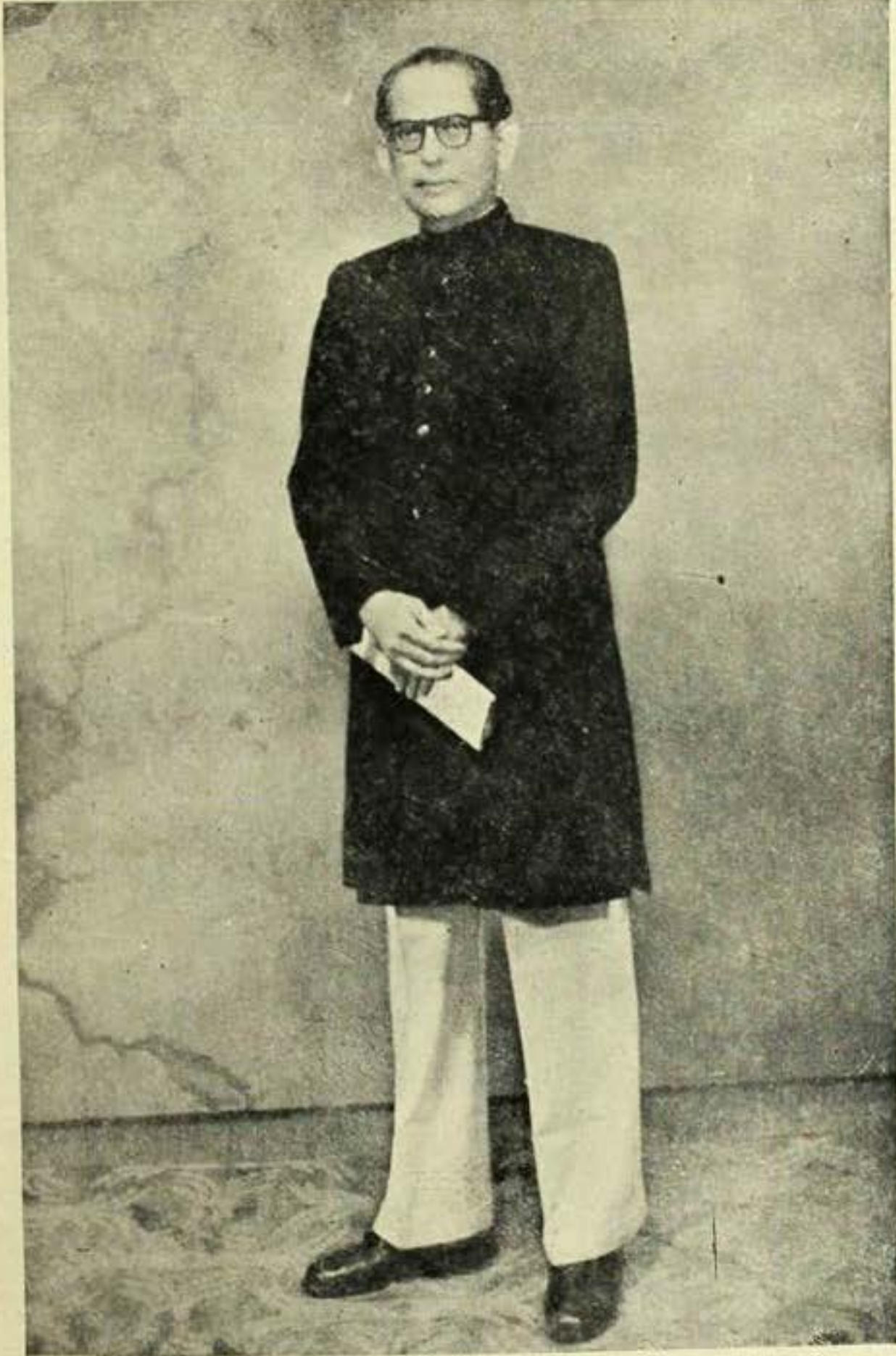
بلائے جاں ہے غالب اُسکی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

جناب سید وزارت حسین

اختر صاحب کے
والد ←

اختر اورینوی

اختر صاحب
کے بھائی
اور انکے بچے

دائیں سے بائیں :— طارق احمد، نعیم احمد، اختر اورینوی،
فضل احمد، محمود احمد، مبارک احمد، بے بی بشریٰ
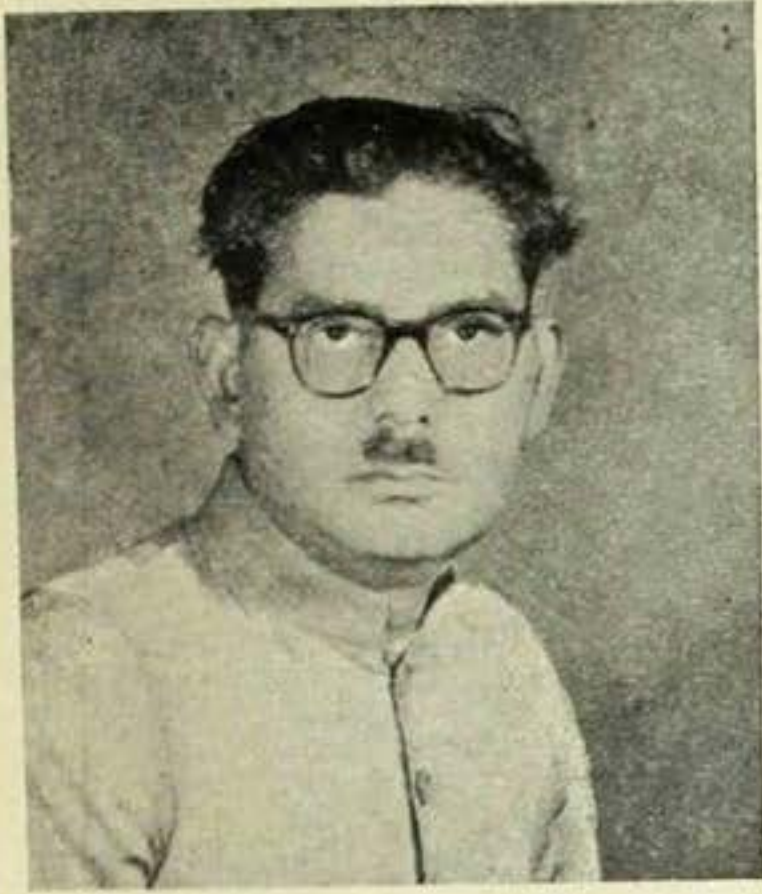
اختر صاحب گھر کے بچوں کے ساتھہ !

سید غلام مصطفٰے (چچازاد بھائی)

ڈاکٹر منصور احمد (چچازاد بھائی)

فضل احمد اور ڈاکٹر خورشید

جوئے ارول کا ایک نظارہ
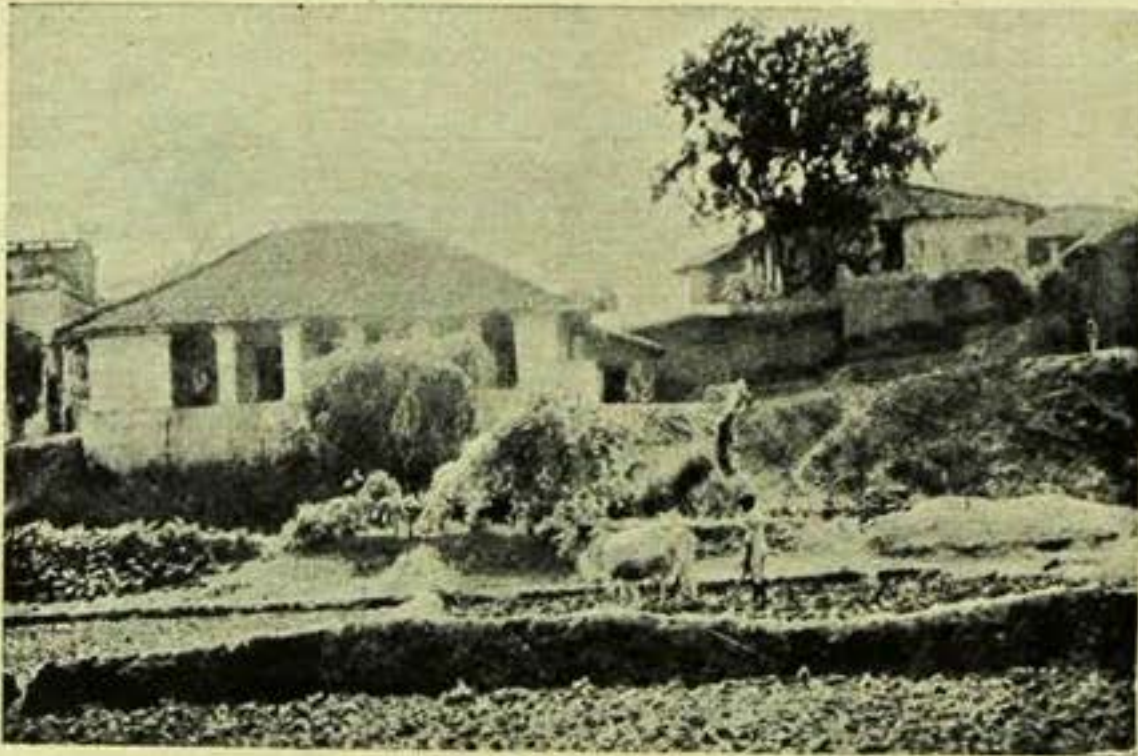
اختر صاحب کا دادیہالی مکان، موضع اورین، ضلع مونگیر
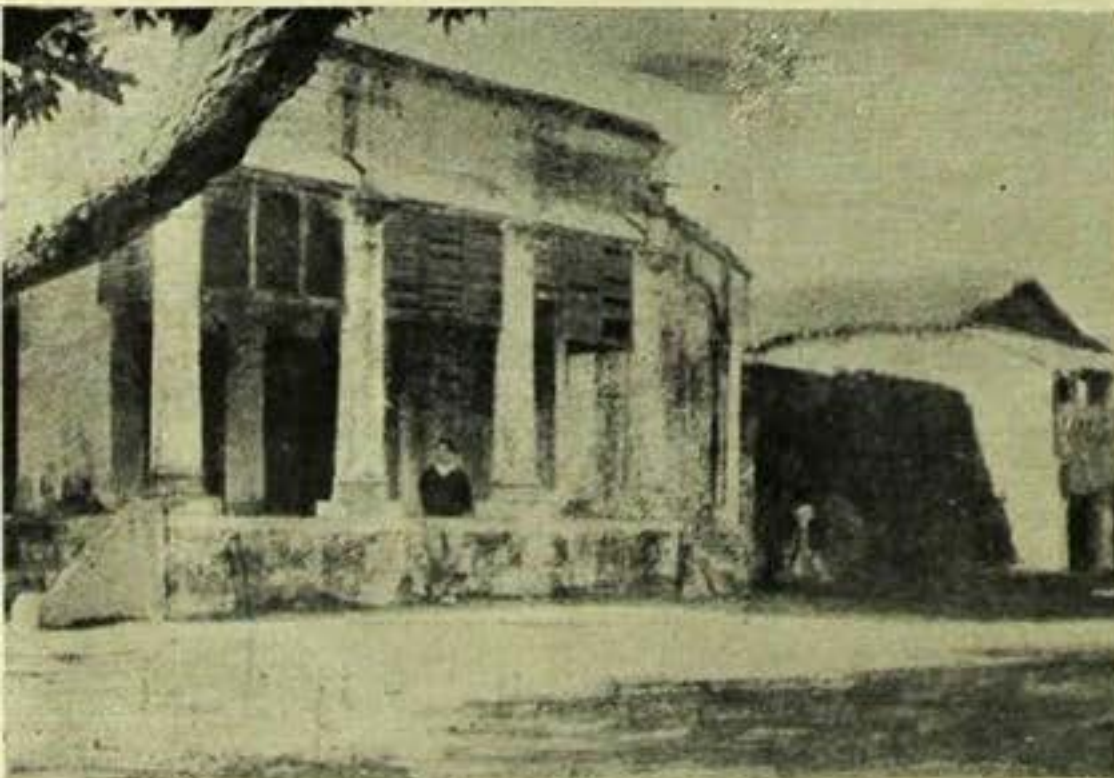
جائے پیدائش (نانیہال) موضع کاکو ضلع گیا
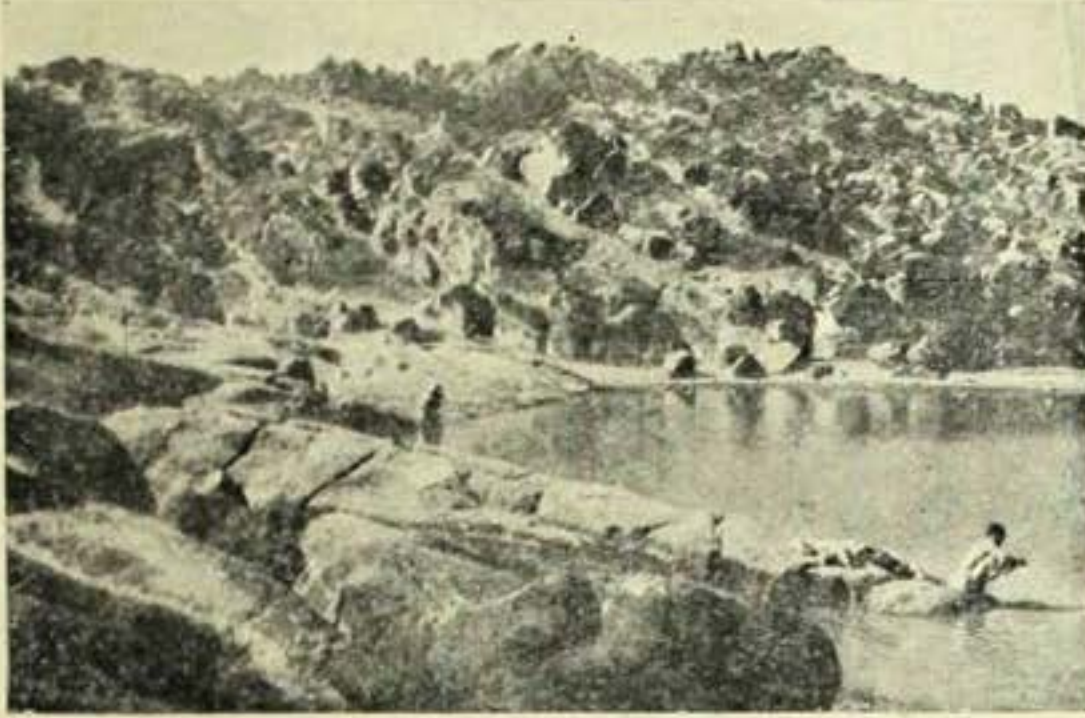
خادم خاص اوتھیلو (اسماعیل)

قصبہ اورین کا کوھستانی منظر

اختر صاحب کے زندہ افسانوی کردار
شمشیروا' سیخ جہور
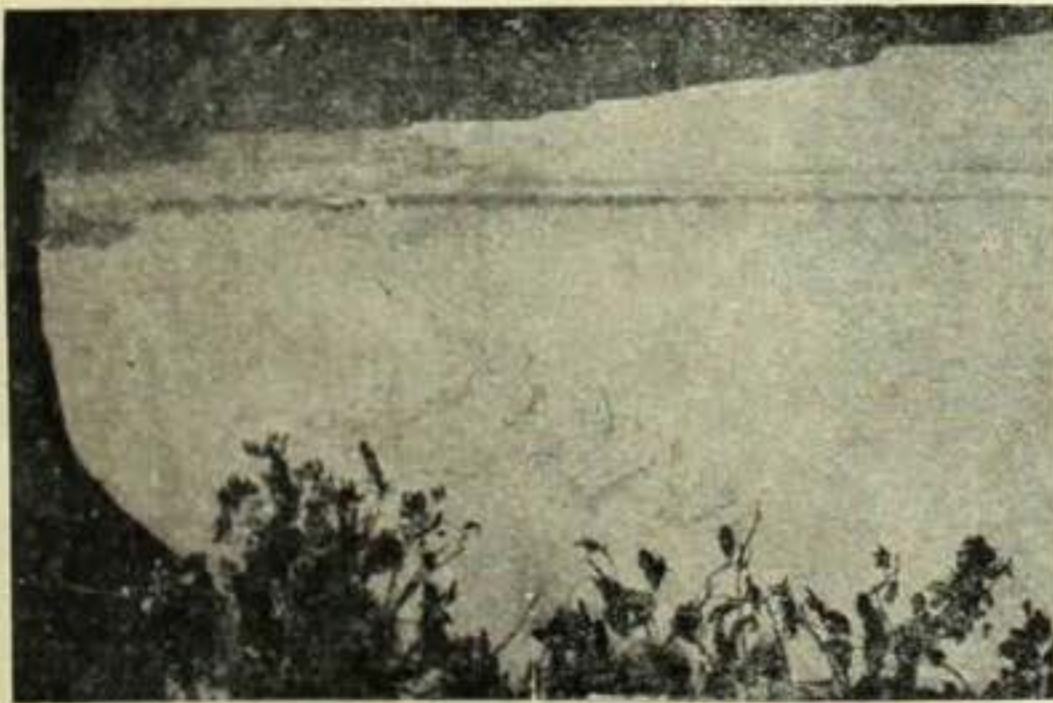
آغوش دریائے سون جہاں اختر اورینوی
کے ذوق فن کی پرورش ھوئی (ارول)

بزم احباب
دائیں سے بائیں — (کرسیوں پر) رضاکریم رضا، ڈاکٹر محمد محسن
پروفیسر پرویز شاہدی، اختر اورینوی
(کھڑے ہوئے) — پرفیسر سید حسن، جناب رضانقوی
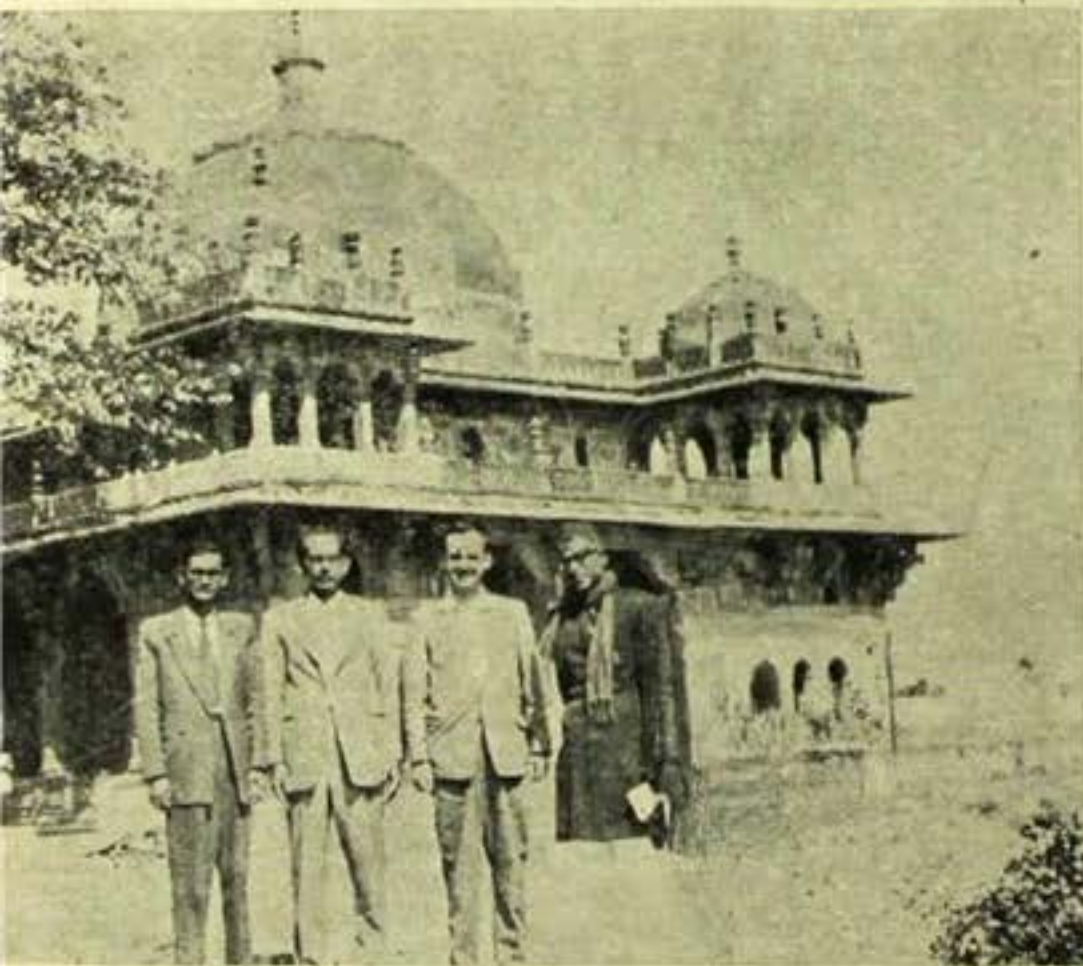
(دائیں سے بائیں) — پروفیسر سید حسن عسکری،
پرفیسر یان مارک (زیکو سلواکیہ) اختر اورینوی،
ڈاکٹر سید فخرالدین -

اطہر اور شرت (ارول میں)
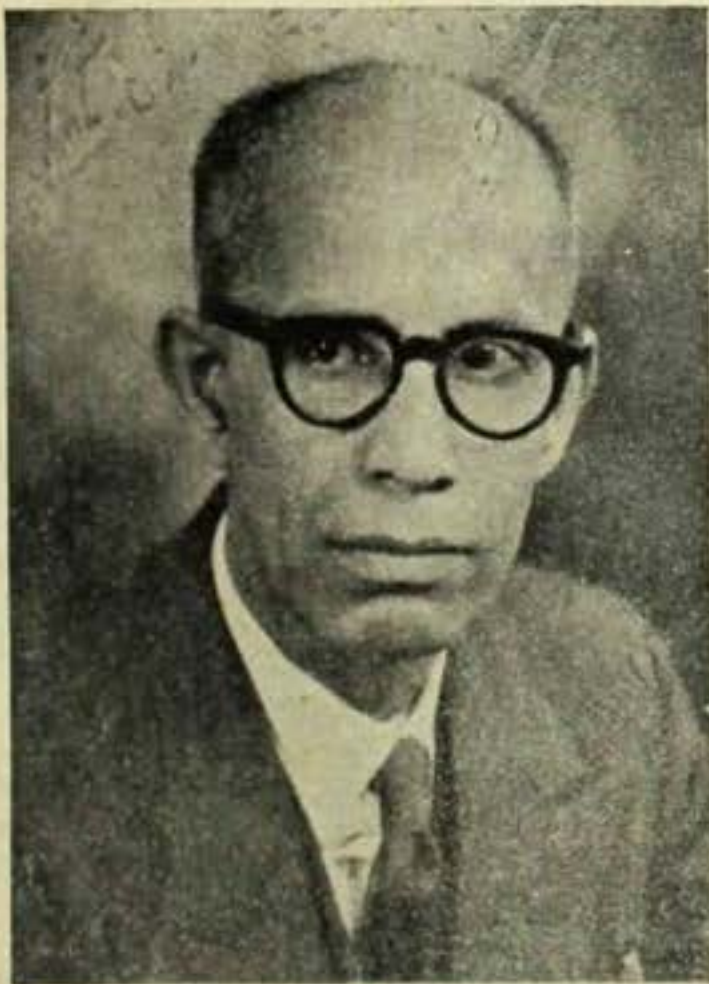
اختر اورینوی

بیگم آفاق شرت

محفل
دوستاں

یحییٰ نقوی

شرت عظیم آبادی

محمد طفیل (اڈیٹر نقوش لاہور)

ڈاکٹر ایس، ایم، نواب

انجمن
احباب

رضا نقوی

رضا کریم رضا ڈی۔ ایس۔ پی،

علی عباس - ڈی، آئی، جی، پولس
آئینہ فنکار

پروفیسر سید حسن

پرنسپل اجتبیٰ رضوی
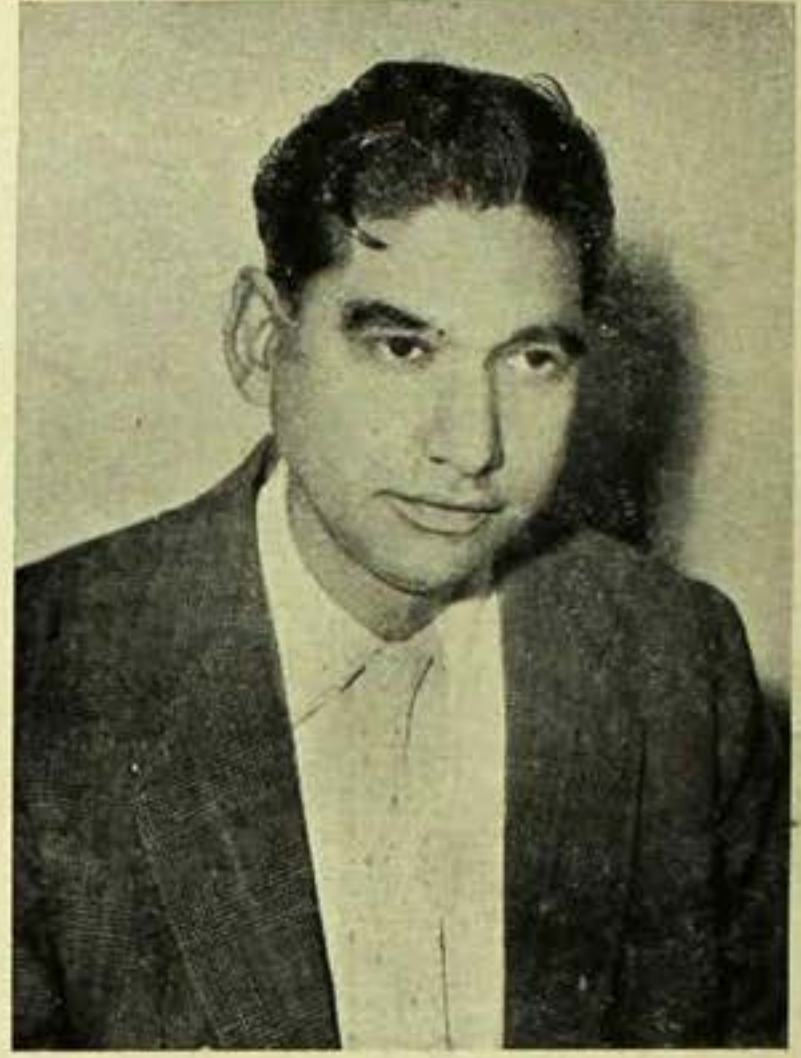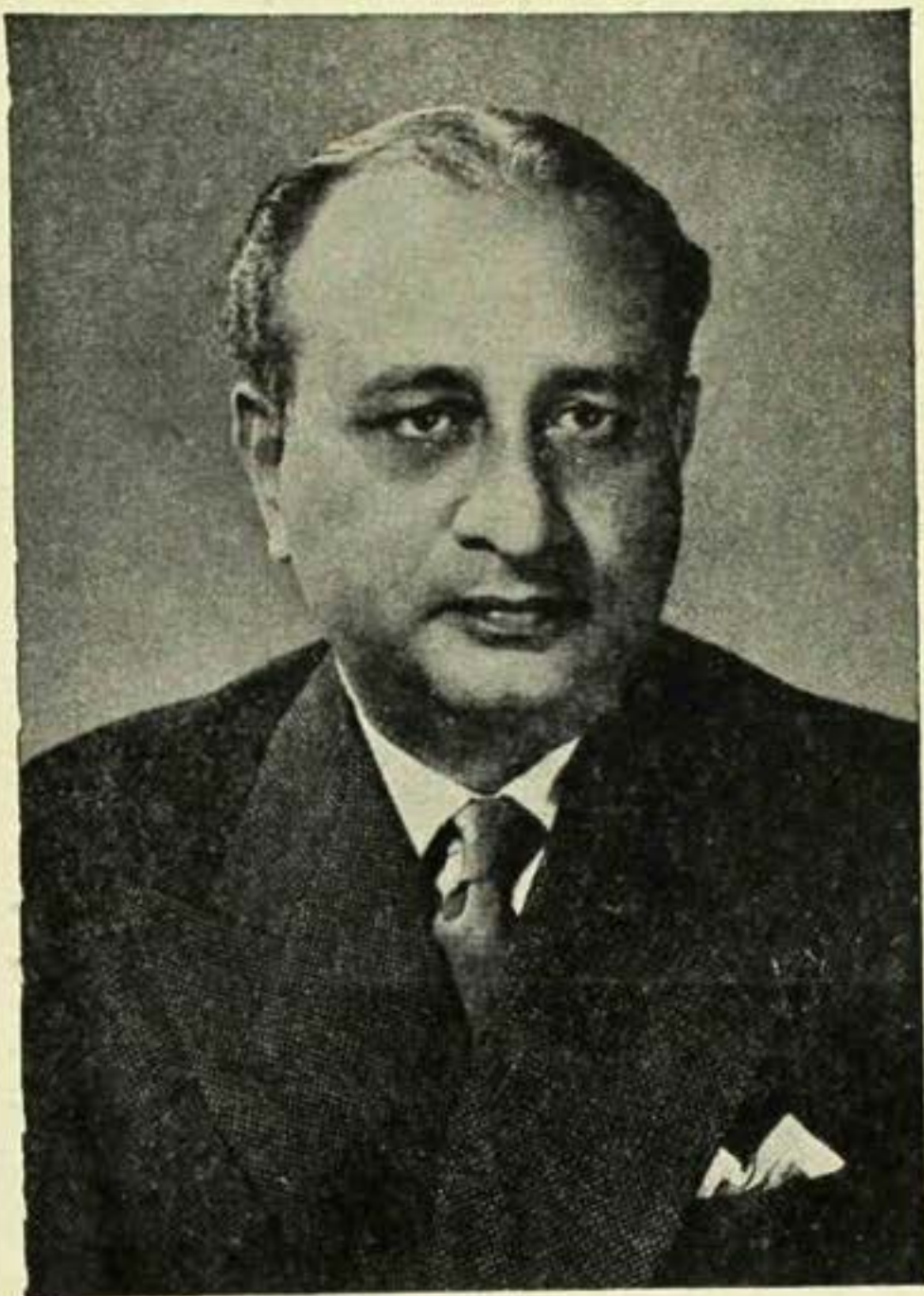
سہیل عظیم آبادی

پروفیسر احتشام حسین

معین احسن جذبی

فنکاروں کی محفل

پروفیسر اختر قادری

مظہر امام

اہل قلم حضرات

→ ڈاکٹر سید عقیل

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی ←

→ قاضی عبدالستار

پروفیسر شاہ مقبول احمد ←

→ بیتاب صدیقی

ایس، ایم، عمر فرید
(چیف ایڈیٹر قومی تنظیم) ←
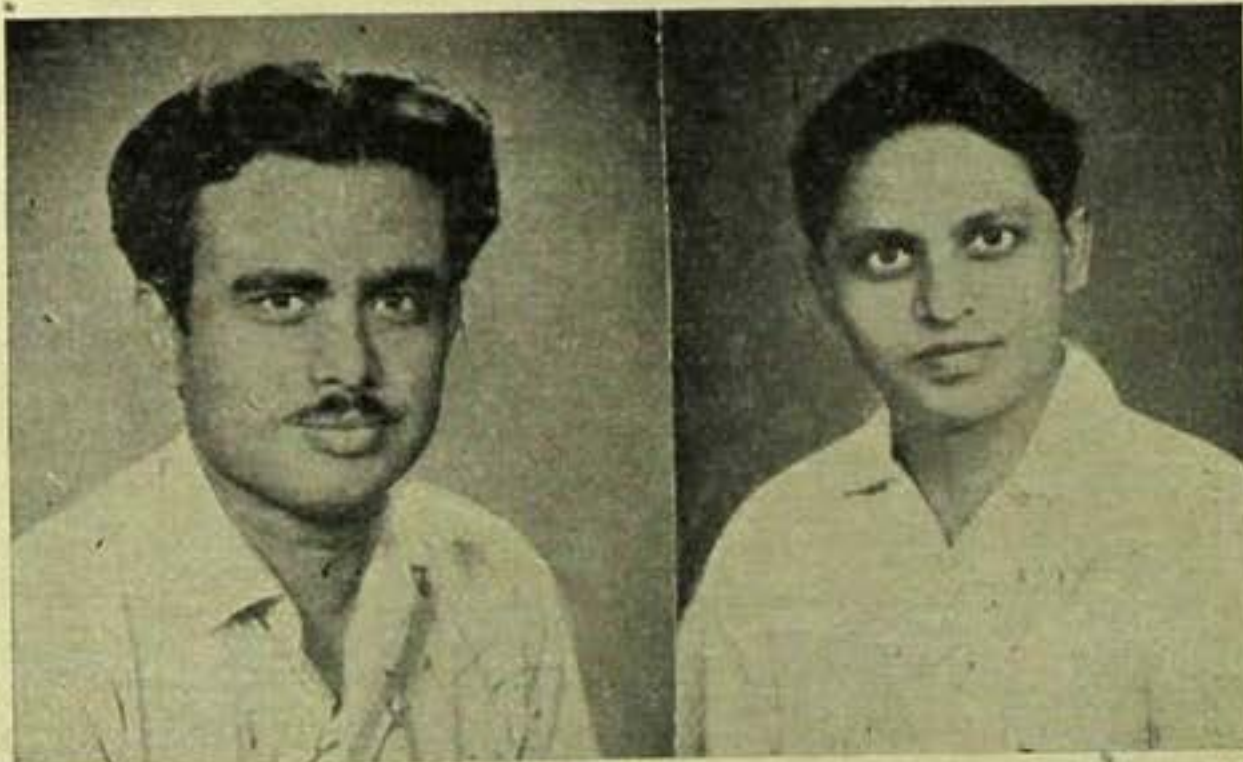
ہوش عظیم آبادی

سلطان احمد (سابق ایڈیٹر "اتحاد")

سرور جہاں

اویس احمد دوراں

حمد نیاز

ڈاکٹر ظفر حمیدی

مولانا محمد سلیم

قریشی عبدالحق فضل

قیوم خضر (اڈیٹر اشارہ)

ظہیر صدیقی

صابر آروی

ڈاکٹر احمد حسین
ڈاکٹر محمد مطیع الرحمن

غلام سرور

شہزاد معصومی

اطہر شیر

وہاب اشرفی

مظفر اقبال

بہزاد فاطمی

مصطفےٰ سیماب قادری

شعیب راہی

اختر کے شاگرد اور قلمکار

علقمہ شبلی

ارماں نجمی

شمس گیاوی (اڈیٹر ہمزاد)

ابوذر عثمانی

طلحہ رضوی برق

ڈاکٹر اختر اورینوی پٹنہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے ایم۔ اے کلاس میں لکچر دیتے ہوئے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد

پروفیسر عزیز احمد

ڈاکٹر یوسف خورشیدی

ایک نادر تصویر

دائیں سے بائیں (کرسیوں پر)—پروفیسر شمس منیری، پروفیسر عبدالمنان بیدل، پرنسپل آرمر، سر ظفراللہ خاں، پروفیسر بے تیجہ۔

(کھڑے ہوئے)—مظفر گیلانی، قمرالدین رضوی، شاہ شکیل احمد، اختر اورینوی
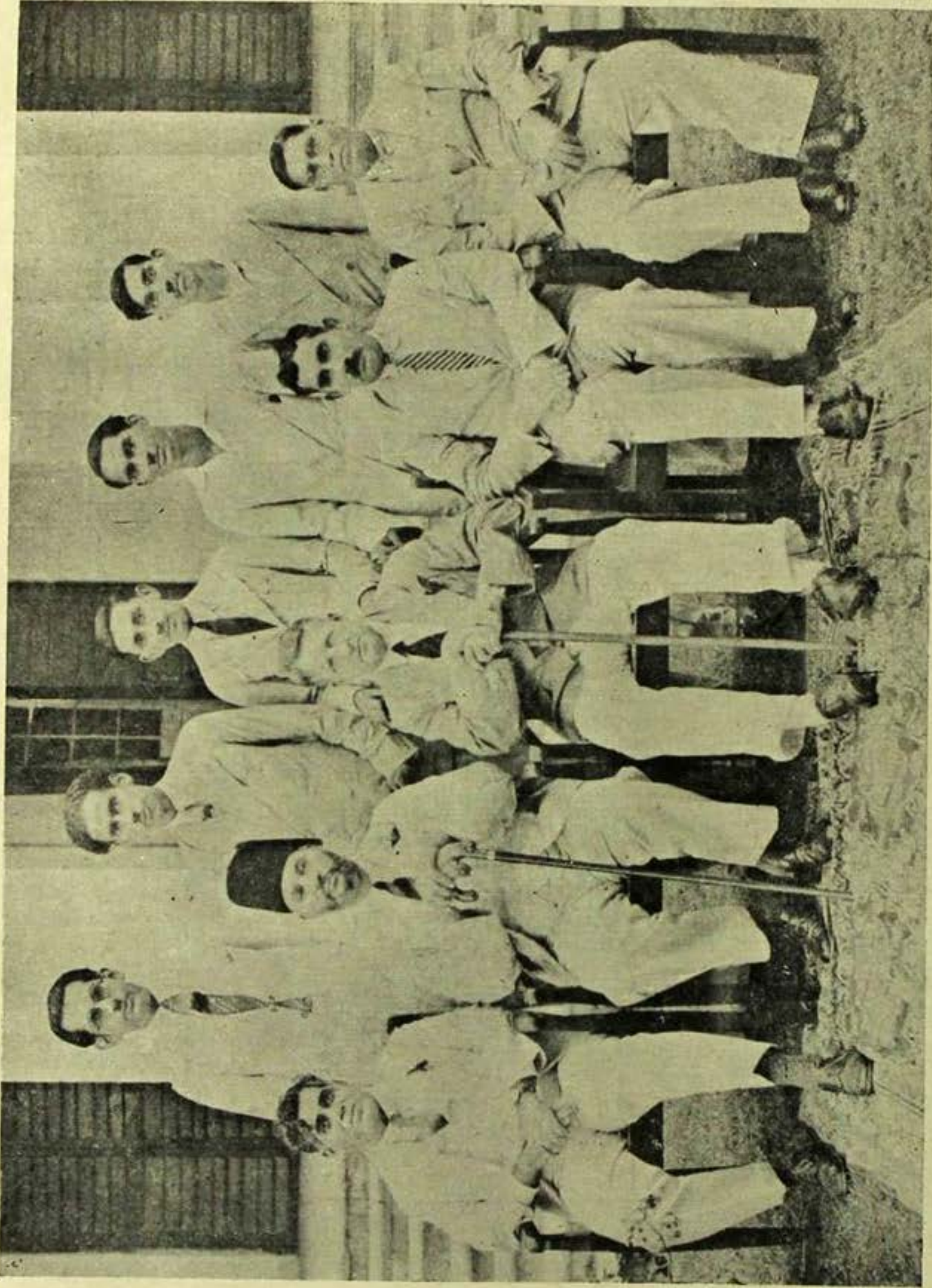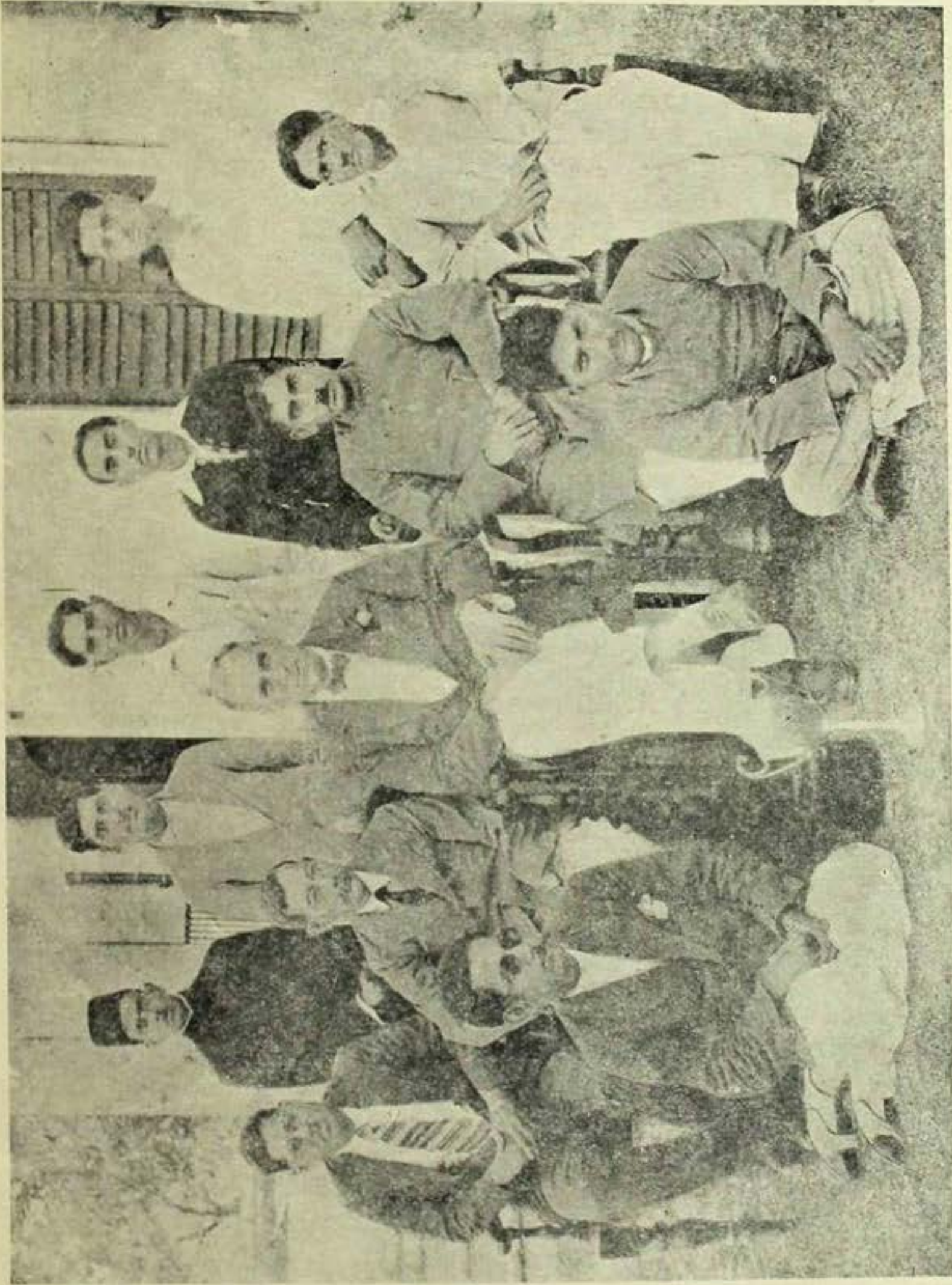
ایک قدیم تصویر

دائیں سے بائیں (کرسیوں پر)—جناب عزیز مصطفےٰ' پروفیسر عبدالمنان بیدل' پرنسپل وہٹ لاک' ڈاکٹر عظیم الدین احمد' پروفیسر شمس منیری۔

(نیچے بیٹھے ہوئے)—سعیدالحق' اختر اورینوی۔

بزم ادب سلور جبلی

دائیں سے بائیں (کرسیوں پر) — زین العابدین سکریٹری بزم ادب، ڈاکٹر محمد مطیع الرحمن، ڈاکٹر اختر اورینوی ڈاکٹر اعجاز حسین، کلیم الدین احمد، عزت ماب مہتہ پرشاد سنہا، وزیر ریاست بہار، پروفیسر عبدالمنان بیدل، ڈاکٹر اقبال احمد، پروفیسر جمیل مظہری، حبیب الحق ندوی -
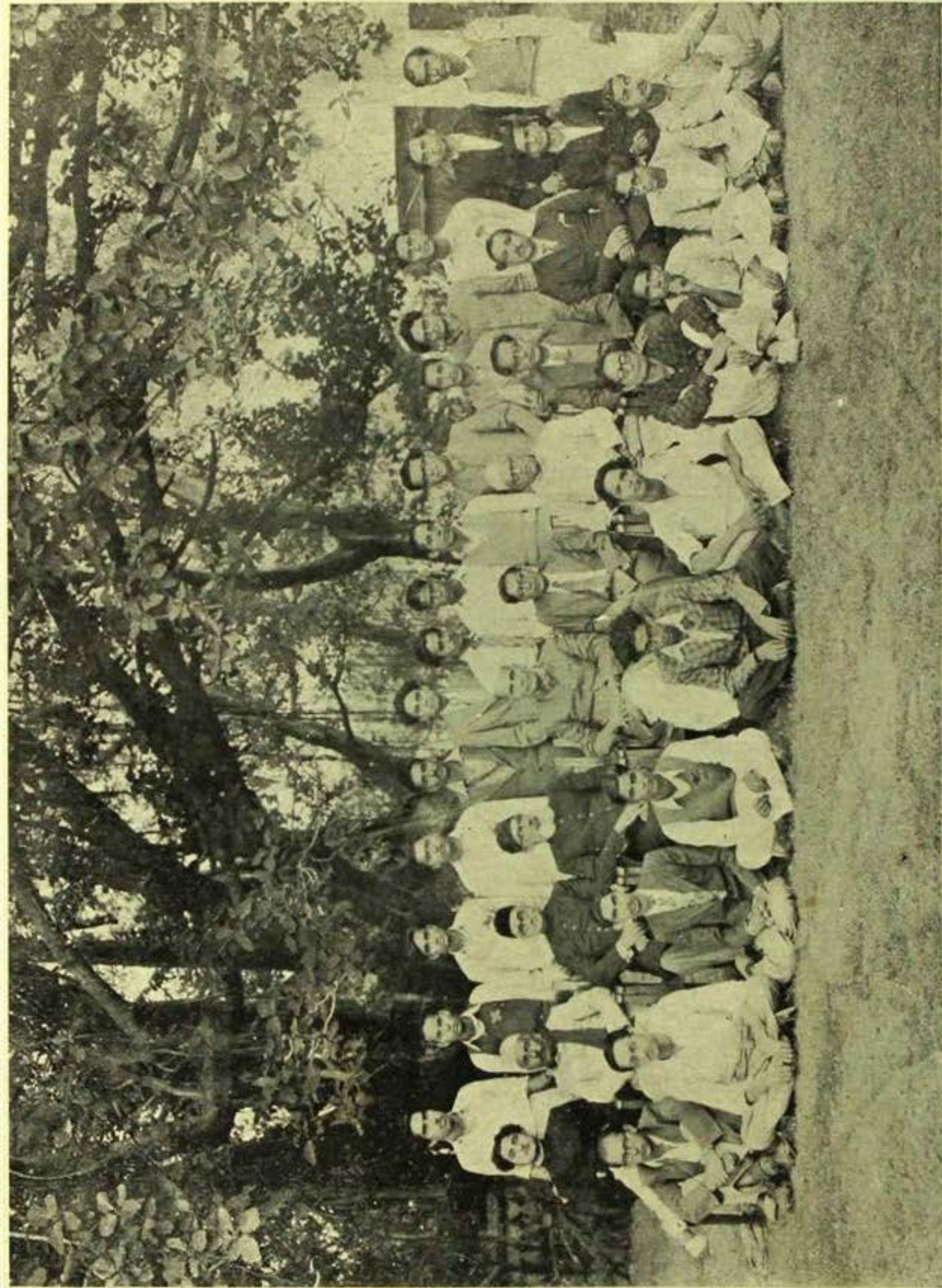
مسٹر یان ماریک

ڈاکٹر آفتاب احمد

اختر اورینوی ریسرچ اسکالرس کے ساتھ
دائیں سے بائیں (کرسیوں پر)— بدرالنساء، آصفہ واسع، یاسمین روحی ظفر، اختر اورینوی، کلیم احمد عاجز، خالد رشید صبا۔
(کھڑے ہوئے)— قمر اعظم ہاشمی، علیم اللہ حالی، محمد لطف الرحمن، ظفر اوگانوی، انجم فاطمی۔

جناب سید ارادت حسین (مرحوم)
اختر صاحب کے چچا

جناب محمد ایوب ایڈوکیٹ
(مرحوم)

شاہ محمد توحید مرحوم
(اختر صاحب کے خسر)
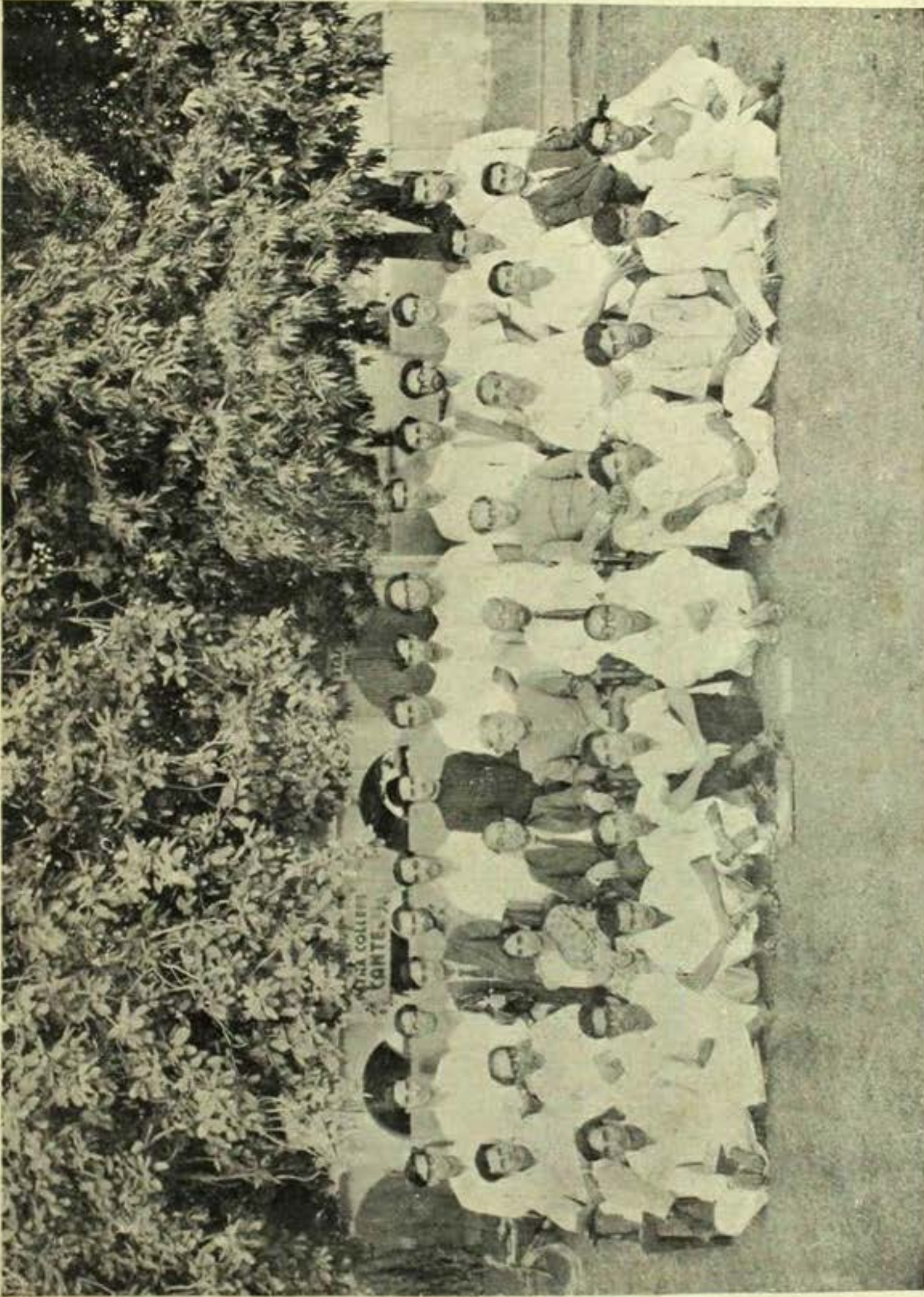
اختر اورینوی اپنے مہمانوں کے ساتھ

دائیں سے بائیں (کرسیوں پر)— شہاب احمد سکریٹری بزم ادب، عبدالوہاب اسسٹنٹ سکریٹری، ڈاکٹر محمد مطیع الرحمن، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر اعجاز حسین، کرشن چندر، سرلادیوی، سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر ممتاز احمد -
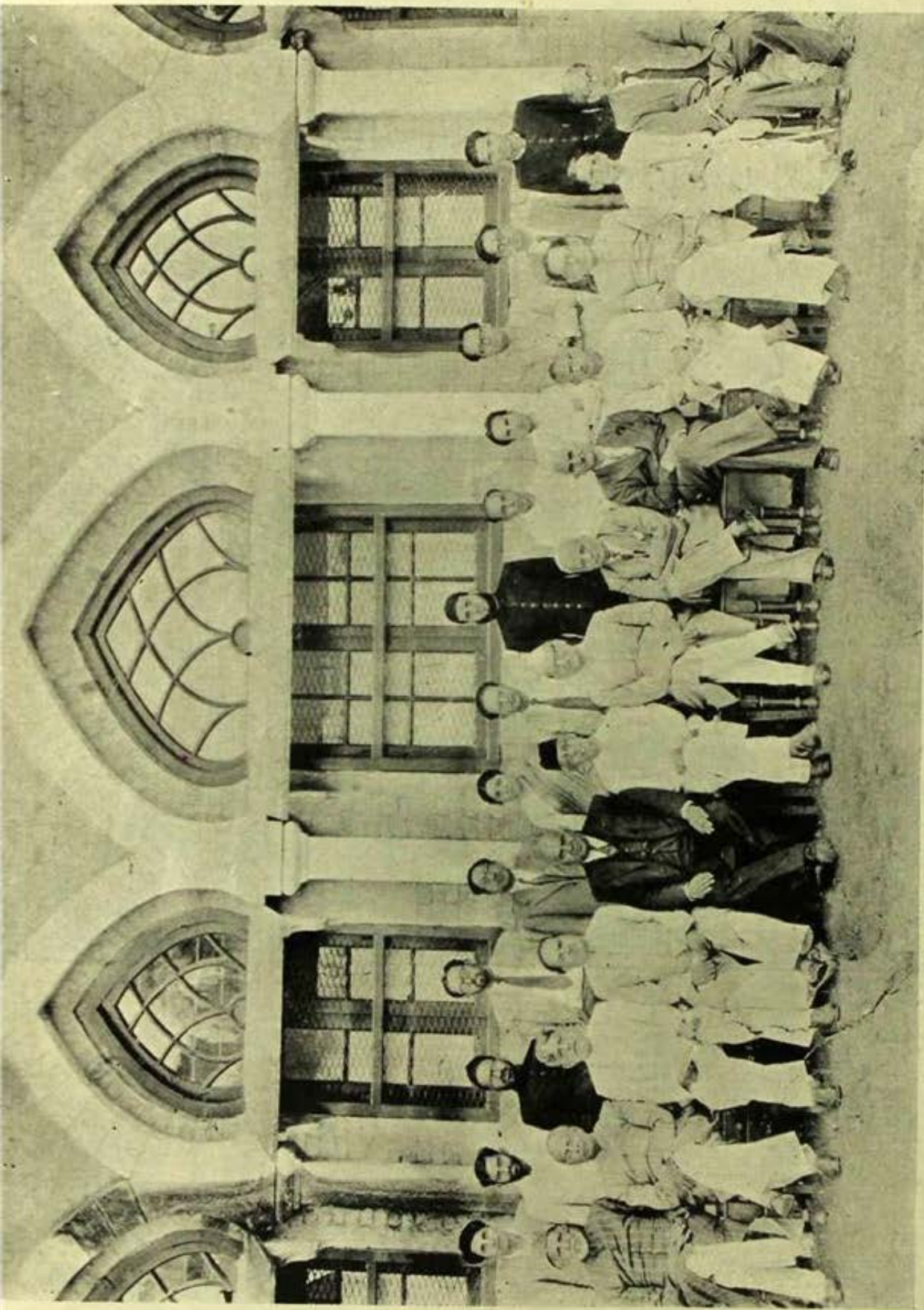
علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر کانفرنس ۱۹۵۷ء

دائیں سے بائیں (کرسیوں پر) — آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، اختر اورینوی، مالک رام، سید نجیب اشرف ندوی، قاضی عبدالودود، سید بشیر حسین زیدی وائس چانسلر، رشید احمد صدیقی، رام بابو سکسینہ، محی الدین قادری زور، سید اعجاز حسین، عبدالقادر سروری علوی۔

(کھڑے ہوئے) — عبدالعظیم، محمد حسن، مسعود حسین، خلیل الرحمن اعظمی، معین احسن جذبی، نادر علی خاں، خلیق احمد نظامی، سیدہ ثریا سلطانہ، خورشید الاسلام، مختار الدین احمد، نذیر احمد اعظمی، محمود الٰہی، قمر رئیس۔

کسے کہ کشتہ نشد از قبیلہ ما نیست
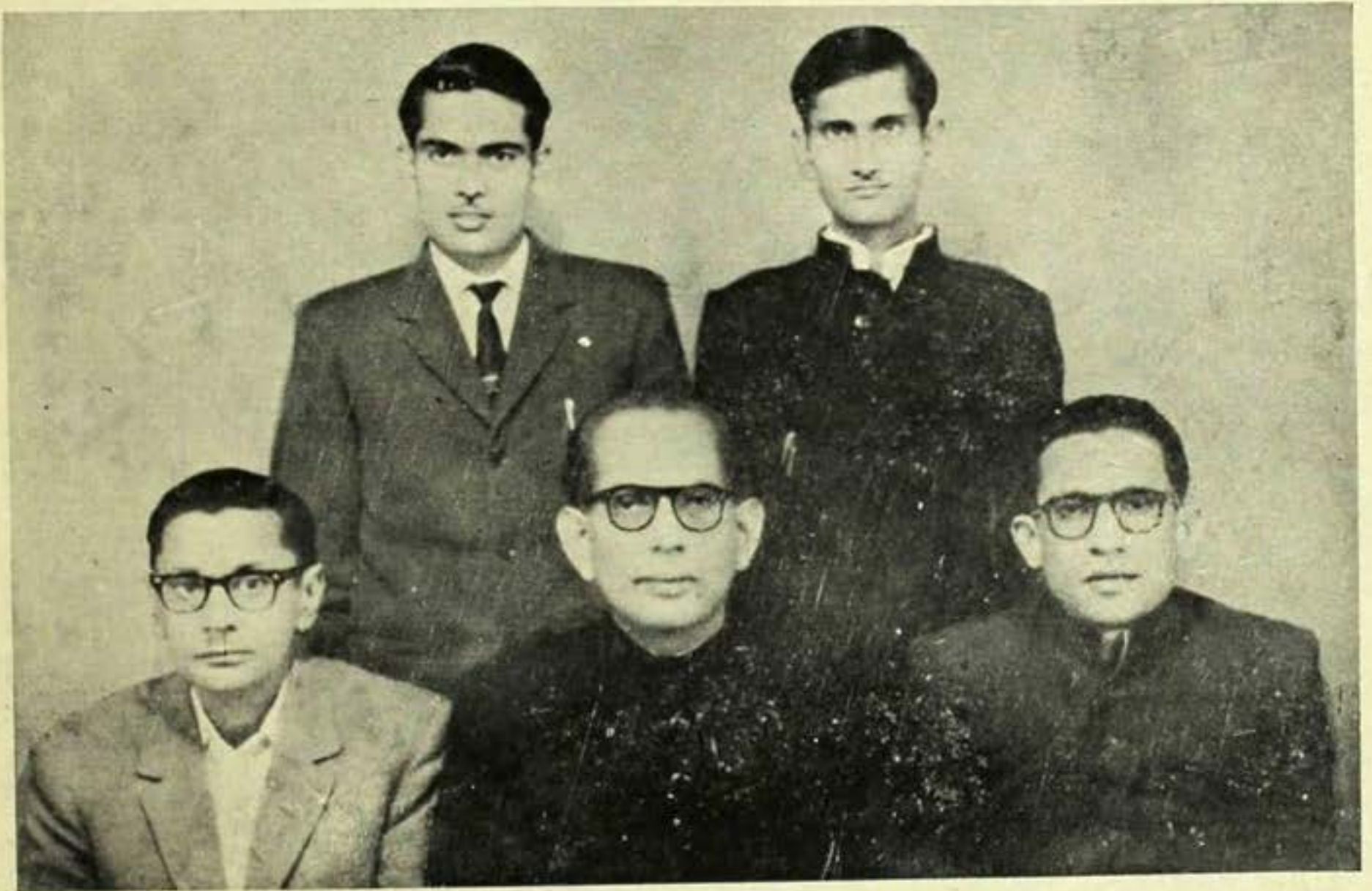
اختر اورینوی ادارہ ساغر نو کے اراکین کے درمیان
دائیں سے بائیں (بیٹھے ہوئے) — عبدالمغنی، اختر اورینوی، رضا نقوی۔
(کھڑے ہوئے) — قمر اعظم ہاشمی، محمد لطف الرحمن

باسمہٖ تعالیٰ
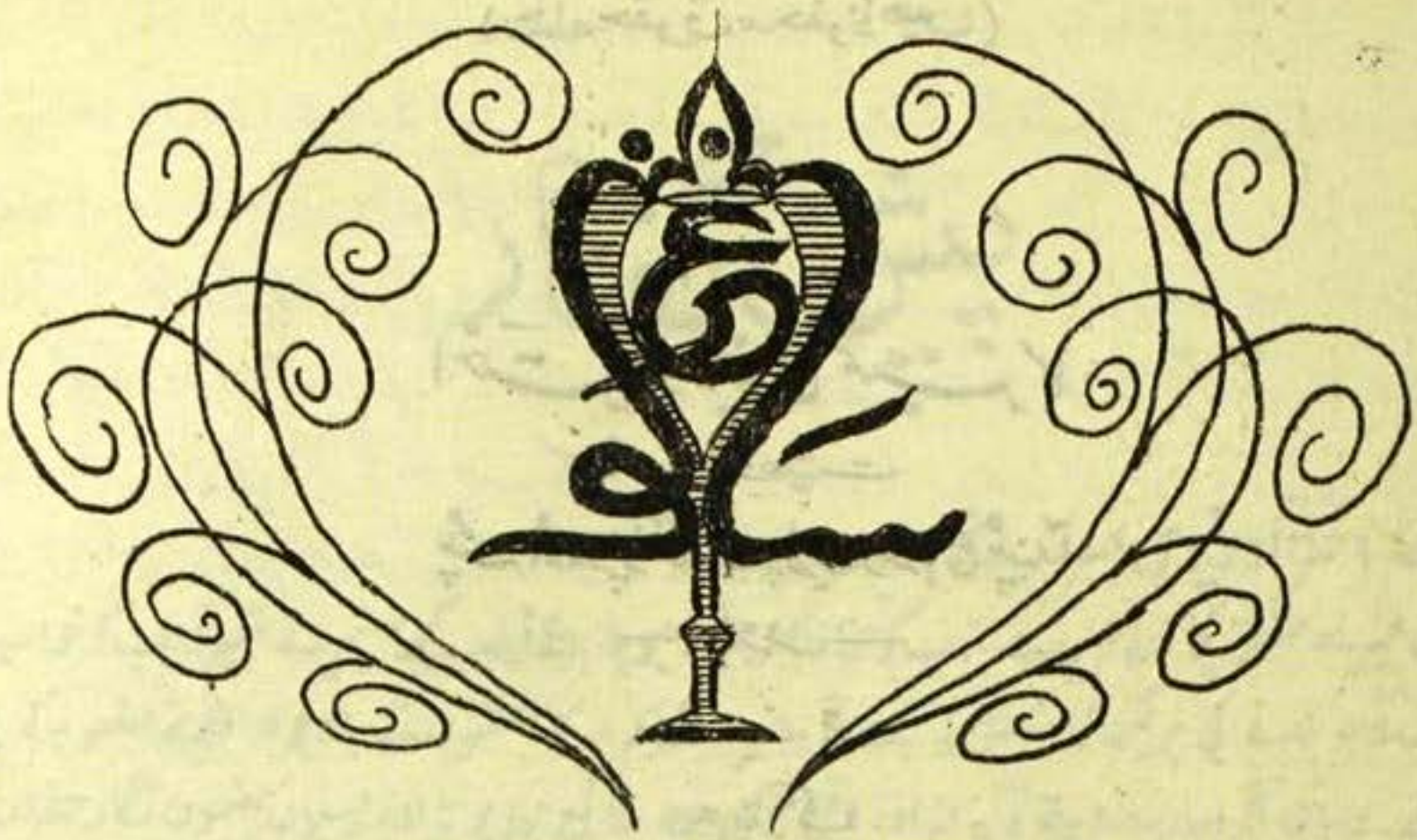
اختر اورینوی نمبر

مرتبہ

قمر اعظم ہاشمی

مجلس مشاورت

رضا نقوی

عبدالمغنی

محمد لطف الرحمن

بدل اشتراک — فی جلد چھ روپے

دارالاشاعت

مکتبہ ادبیہ روڈ نمبر ۵ گردنی باغ پٹنہ

اختر اُورینوی نمبر کا
باب شخصیت
پٹنہ اُردو پرنٹنگ پریس رمنہ باغ پٹنہ ۴
— اور —
باب فن
مع بلاک
یٹبل لیتھو پریس۔ رمنہ روڈ۔ پٹنہ ۴
— میں —
چھپواکر دفتر "ساغرِ نو" ۵/۱۶ گردنی باغ پٹنہ سے شائع کیا

دستیابی کے پتے

مکتبۂ ادب، روڈ نمبر ۵/۱۶، گردنی باغ، پٹنہ

دفتر "قومی تنظیم"، سبزی باغ، پٹنہ ۴

پیش گفتار

لیجئے اختر اورینوی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
ہمیں نمبر سے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے۔ آپ کو حق حاصل ہے، جو چاہیئے فیصلہ کیجئے۔ ہم نے تعبیر خواب کو خواب سے زیادہ پُراثر اور قابل توجہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم کوششوں کے باوجود اپنے منصوبہ کو پوری طرح تشکل نہ کر سکے۔ وسائل اگر اجازت دیتے تو یہ نمبر اور وقیع شکل میں شائع ہوا ہوتا اور بیسیوں مضمون نگار حضرات سے معذرت بھی نہ کرنا پڑتی جن کی نگارشات وقت اور جگہ کی کمی کی وجہ سے شریک اشاعت نہ ہو سکیں اور جن کو آئندہ شمارہ کے لئے محفوظ کر لینا پڑا۔ اختر صاحب کے افسانوں، مضامین اور شعری تخلیقات کا ایک مختصر سا انتخاب بھی اس نمبر میں دیا جانے والا تھا۔ لیکن صد افسوس کہ کثرت مضامین نے اس ارادہ کو بھی آئندہ کے لئے ملتوی کر دینے پر مجبور کر دیا۔
ایک تجویز یہ تھی کہ اب تک جن کتابوں میں اُردو کے ناقدین نے اختر صاحب کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے اقتباسات شریک اشاعت کرلئے جائیں اور جن رسالوں میں ان کے فن پر مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کو بھی اکٹھا کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں کام بہت آگے بڑھ گیا تھا اور خاصا مواد بھی جمع ہو چکا تھا، بعض مضامین کی کتابت بھی ہو چکی تھی اس کے باوجود اس تجویز کو بعض ناگزیر وجوہ کی بناء پر ترک کر دینا پڑا۔
اختر صاحب کی شخصیت بیحد مقبول ہے اس کا احساس تو تھا، مگر اتنی زیادہ مقبول ہو گی اس کا اندازہ نہ تھا۔ صحیح صورت حال اس وقت سامنے آئی جب بہت سارے غیر طلبیدہ مضامین بھی پہنچنا شروع ہو گئے۔ بہرحال ہم اپنے تمام مضمون نگاروں کے فرداً فرداً تہہ دل سے شکر گذار ہیں، جنھوں نے اپنی قابل قدر تحریروں سے ہمیں نوازا۔ بعض مشاہیر کے مضامین تاخیر سے ملے اس لئے صفحات کی ترتیب میں بے ترتیبی آ گئی۔

ہم اپنا فرض پوری طرح ادا نہ کر سکے، اس کا احساس ہمیں بھی ہے۔ لیکن اختر اورینوی کیا ہیں؟ اور کیا نہیں ہیں؟ کی بحث کی گنجائش اب بہت کم رہ جائے گی۔ اختر صاحب کی خدمات اور کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اردو کی تاریخ ان سے آنکھ بچا کر نہیں نکل سکتی۔ یہ نمبر نہ مُردہ پرستی کے خلاف علَم جہاد ہے اور نہ زندہ پرستی کی روایت کا سنگ میل۔ محض ایک بڑے فن کار کے مرتبہ سے آگہی کی کوشش ہے اور اس کی ادبی خدمتوں کا اعتراف اور بس!
اُردو رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں سب سے پُرپیچ مسئلہ کتابت کا ہے۔ ہم نے حتی الامکان

سعی کی کہ کتابت کی غلطیاں نہ رہ جائیں۔ لیکن رسالہ کا کچھ حصہ چھپ چکا تو علم ہوا کہ ہماری یہ کوشش رائیگاں تو نہ گئی، البتہ کاتب صاحبان نے اسے پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا۔ چنانچہ کتابت کی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ہم اس کے لئے شرمندہ بھی ہیں اور معذرت خواہ بھی۔

اختر اورینوی نمبر کو منظر عام پر لانے کے لئے مجلس مشاورت کے ارکان نے دن رات محنتیں کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی دوستوں اور بزرگوں نے اس سلسلہ میں خاص طور پر ہماری اعانت فرمائی ہے۔ ہم ان تمام حضرات کے ممنون و شکر گذار ہیں۔ کیونکہ ان سب کی مشترکہ کاوشوں ہی کی بدولت ہمیں ہند و پاک کے اتنے مشاہیر کی تخلیقات مل سکیں اور یہ نمبر اس صورت میں اتنی کم مدت میں شائع ہو سکا۔

ہم بالخصوص محمد طفیل صاحب ایڈیٹر "نقوش" لاہور کے ممنون کرم ہیں، جنہوں نے اس نمبر سے خاصی دلچسپی لی۔ اپنا قیمتی مضمون بھیجا اور از خود اپنے آرٹسٹ سے اختر صاحب کا ایک اسکیچ بنوا کر روانہ کرنے کی زحمت گوارا کی۔

اختر صاحب کے حلقۂ احباب میں شرف الدین احمد عظیم آبادی اور ان کی بیگم صاحبہ نے بڑے اخلاص اور انہماک کا ثبوت دیا اور کراچی سے اپنے نہایت انمول مضامین بھیجے۔

ہم اپنے قارئین اور ناظرین کرام کے سامنے ایک ادبی تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ ہدیہ ان کی توجہات کو اپنی طرف مبذول کرے گا اور وہ ہماری فروگذاشتوں سے چشم پوشی کریں گے۔

والسّلام

قمر اعظم ہاشمی

پٹنہ

ترتیب

جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

کلیمے بیں کہ ہم پیغمبری ہم ساحری کردہ

معین احسن جذبی

اخترؔ اورینوی کی نذر

شبِ سیاہ میں دیکھی ہے میں نے اے اخترؔ
تری نزاکتِ احساس کی خنک تنویر
تری لطافتِ انفاس کے سبک انوار
تری بلندیٔ فطرت کی نرم نرم ضیا
جلال جس پہ تصدّق جمال جس پہ نثار
پر اس فریب کی ظلمت نواز دُنیا میں
پرکھ نہ پائے گا یہ لعلِ شب چراغ کوئی
بجز شعاعِ مہ و کہکشانِ شب افروز
بجز فروغِ دلِ شاعرانِ شب بیدار

عبدالمغنی

۵۴ سال کے اختر اورینوی ربع صدی سے زائد عرصہ سے گیسوئے
اردو کی شانہ آرائی کر رہے ہیں۔ ان کے سنِ شعور میں اُن کا ملک بہت سے
ہنگاموں یا اُن کے اثرات سے دوچار ہوا۔ جنگِ عظیم ثانی برپا ہوئی، ہیروشیما پر
بم پھٹا، ۱۹۴۲ء کا اندولن چلا، خلافتِ عثمانیہ کی دھجیاں اُڑائی گئیں
۱۹۴۶ء کا خون خرابہ ہوا، ۱۹۴۷ء کی آزادی ایک برصغیر کو دو
ملکوں میں بانٹ دی گئی، چین کا اشتراکی انقلاب رونما ہوا، چین نے
ہندوستان پر حملہ کیا، ایشیا پر برطانیہ عظمیٰ کا سورج غروب ہو گیا۔
سرمایہ و محنت کی کشمکش نے ایک کارزار برپا کیا، افریقہ کا تاریک براعظم
دن کی روشنی میں آگیا ——— ان خارجی ہنگاموں کے ساتھ
ساتھ اختر اورینوی کی جسمانی و روحانی دنیاؤں میں بھی ایک سے ایک
تہلکے برپا ہوتے رہے۔ وہ پیہم ایک کے بعد دوسرے موذی مرض کی شکار ہوتے
رہے، امراض کے وقفوں میں وہ سائنس، طبِ مغرب، اور فن و ادب، فن و
ادب میں بھی انگریزی سے اردو کے متنوع تعلیمی سانچوں میں اپنے ذہن کو
ڈھالتے رہے، اُن ہی وقفوں میں انہوں نے محبت بھی کی اور شادی بھی۔
تعلیم سے فارغ ہو کر محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور اب بہار کی
سب سے بڑی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ اس وقت بہار میں
اور بہار سے باہر بہاریوں کے بیچ جہاں بھی اردو کا چراغ جل رہا ہے
اُس میں اختر اورینوی کے دماغ کا روغن کچھ نہ کچھ ضرور شامل ہے۔
اختر اورینوی کی زندگی کشمکش، جہد اور [illegible] گزار رہی ہے

یہ تو نہیں کہ ان کی زندگی ہر جہت سے مکمل اور آسودہ رہی ہے۔ مگر اس
ایک زندگی میں اتنی جہتیں جمع ہو گئی ہیں کہ بہرحال ایک متنوع شخصیت
پیدا ہو گئی ہے۔ یہ شخصیت نہایت مرکب اور نہایت پیچیدہ ہے۔
اس میں علم و ادب، جدید و قدیم، فطرت و صنعت، مشرق و مغرب،
فنون و عمرانیات کے بہت سارے گوشے کسی نہ کسی درجے میں یکجا
ہو گئے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے اختر اورینوی کی شخصیت میں اقدام و
اظہار کے زبردست تقاضے بھی موجود ہیں۔ ان تقاضوں نے صاحبِ
شخصیت کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ذہن و مزاج کے پیچ و خم دنیا کے سامنے
کھول ڈالے۔ چنانچہ اختر اورینوی نے اپنے نفس اور ضمیر کی توضیح و تسکین
اور اس طرح اپنی شخصیت کی ترتیب و تکمیل کے لئے کبھی شاعری، افسانے،
ڈرامے، تنقید اور ناول کو وسیلۂ کار بنایا اور کبھی اجتماعات میں تقریر، مختلف
تحریکوں کے ساتھ تعاون اور متعدد دوسرے طریقوں سے حلِ مسائل کی کوشش
کی۔ یہ ساری کوششیں تمام ہیں یا ناتمام، ان سے شخصیت کی جامعیت
کا پتہ چلتا ہے یا انتشار کا؟ ان سوالوں کا جواب تو مستقبل ہی دے گا۔
اتنی بات یقینی ہے کہ یہ کوششیں ایک صاحبِ بصیرت اور اولوالعزم
فرد کا پتہ دیتی ہیں، ان سے زندگی کے تسلسل اور انسانیت کے ارتقا کا
احساس ہوتا ہے۔

بروقت ہمارے پیشِ نظر صرف یہ بات ہے کہ اختر اورینوی کی
کارگزاریوں سے انسانیت کی خدمت کتنی اور کیسی کچھ بھی ہو سکی ہے، اس کو

حتی الامکان ایک رسالے میں محفوظ و متعین کر دیا جائے۔

افسانہ نگاری کی صف اولین میں اختر اورینوی ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کو ایک منفرد عنصر عطا کیا ہے جو موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے اختر اورینوی کے ہونے کی روایت میں ایک بیش قیمت اضافہ ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں اختر اورینوی کا امتیاز ایک مخصوص تفکر ہے جو بعض اوقات [illegible] تصوف کی حدود تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اختر اورینوی کے چند فلسفیانہ افسانے ہی ہیں اردو افسانہ نگاری میں معدوم ایک اہم بُعد کی تلافی کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اردو افسانہ کی عام ہیئت ان فلسفیانہ افسانوں کی وسعتوں پر تنگ تھی چنانچہ اختر اورینوی نے اپنے مواد کے واضح اظہار کے لئے اس ہیئت میں کچھ ترمیم کی جو فن کے نقطۂ نظر سے ایک ضروری بات تھی۔ یوں بھی اورینوی کے اہم افسانے عام طور پر رسمی افسانہ نگاری کے قالب میں پورے طور پر نہیں بیٹھتے ایسا صرف اس لئے ہے کہ اصلاً اورینوی رسمی افسانہ نگار ہیں ہی نہیں۔ وہ کہانی محض سننے کے لئے نہیں لکھتے، بلکہ سمجھنے کے لئے لکھی۔ بالعموم اُن کے پیش نظر کہنے کی کچھ باتیں ہوتی ہیں جن کا ابلاغ وہ کہانی کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں محض کہانی کی دلچسپی سے ماورا کچھ اسرار ضرور ایسے ہوں گے جو عام حیثیت کے پڑھنے والے کے ذہن میں "گتھیوں" کی طرح اُبھرتے ہوئے ہوں گے، یہ گوشے افسانے کے بعض قاریوں کو ممکن ہے کھٹکتے ہوں، مگر در اصل یہی گوشے کسی فن کار کو دوسروں سے ممتاز اور اپنے فن میں مستقل اور منفرد بناتے ہیں۔ وہی یہ بات کہ بعض گوشے بڑے نرم ہوتے ہیں اور بعض بڑے سخت کچھ معتدل ——— تو یہ انفرادیتوں کا قدرتی فرق ہے جو اپنے جواز کے لئے کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ بہر حال، اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے کئی پہلو ہیں۔ جن میں وہ پہلو بھی ہیں جو گوشوں سے خالی ہیں یا جن کے گوشے بہت نرم ہیں۔ اسی طرح بحیثیت مجموعی اورینوی کی افسانہ نگاری اردو ادب میں ایک بڑی طاقت کا درجہ رکھتی ہے۔

اورینوی کی تنقید نگاری بھی ان کی ادبی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس صنف ادب میں بھی موصوف کو وہی انفرادیت حاصل ہے جو افسانہ نگاری میں ہے۔ یہاں بھی ان کا اسلوب اسی طرح طرفہ ہے جس طرح افسانے میں۔ یہاں بھی افسانے کی طرح مصنف کی مخصوص انشا اس کے مطالعات کی ترسیل ایک خاص انداز میں کرتی ہے۔ اس انشا کا اپنا ایک مخصوص ڈھانچہ بھی ہے۔ انشا ہی کی طرح یہ ڈھانچہ بھی اپنی جگہ منفرد ہے مقالہ نگاری ایک فن ضرور ہے اور اس فن کے آداب بھی متعین ہیں مگر اس فن کا کوئی ڈھلا ڈھلایا سانچہ ایسا نہیں کہ اس میں ہر قسم کا مواد ڈال کر ناقد مشین کی طرح ایک ہی جیسے نمونے پر نمونے نکالے جاتے رہیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو محمد حسین آزاد، نذیر احمد، سر سید، حالی اور شبلی کی مقالہ نگاری میں ایک دوسرے سے امتیاز کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اسی طرح پچھلی نسل فقیر کی طرح ان بزرگوں کی لکیر ہی پیٹتی رہ جاتی اور اردو مقالہ نگاری یا تنقید نگاری کا ارتقا تو کیا شاید تسلسل بھی بند ہو جاتا چنانچہ آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، احتشام حسین اور اختر اورینوی کی تنقید نگاری یا مقالہ نگاری صرف آزاد، نذیر، سر سید، حالی اور شبلی ہی سے مختلف نہیں بلکہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہے۔ یہ امتیاز انداز نظر سے اسلوب تک ہر دو میں واضح ہے۔ بہر حال اختر اورینوی کی تنقیدیں نہ کلیم الدین احمد کی طرح فن پرستانہ ہیں اور نہ احتشام حسین کے مانند فکر پرستانہ۔ وہ کلیم الدین احمد کی ہیئت اور احتشام حسین کی اشتراکیت ——— دونوں انتہاؤں کے بیچ، اپنی حدود میں ایک اعتدال کی راہ نکالتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ آل احمد سرور کے قریب ہیں۔ کہنا چاہیے کہ سرور ہی کی طرح اختر اورینوی اردو تنقید میں مشرقی روایات کے علمبردار ہیں۔ اسی روایت پسندی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی تنقیدوں میں مغربی اصولوں کے ساتھ ساتھ مشرقی معیاروں کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب عالم انگریزی، فرانسیسی اور جرمن تک محدود نہیں بلکہ عربی اور فارسی کی وسعتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے اورینوی کی تنقیدوں نے ایک حد تک جدید اردو تنقید کی اس کمی کو پورا کیا ہے جو اس میں مشرقی ادبیات سے بے اعتنائی کے سبب پیدا ہو گئی ہے۔

افسانے اور تنقید کے علاوہ اصناف ادب میں بھی اختر اورینوی نے طبع آزمائی کی ہے اور کم از کم اپنی تخلیقات میں اُن کی انفرادی چھاپ نمایاں ہے۔ انہوں نے دو ڈرامے لکھے ہیں، ایک معروف "شہنشاہ حبشہ"

اور دوسرا غیر معروف "وزوال کیپٹن"۔ یہ ڈرامے اسٹیج کے لئے کہاں تک موزوں ہیں، یہ سوال ادب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ڈرامہ بہرحال ایک صنفِ ادب ہے۔ اور ادب اپنی مستقل قدریں رکھتا ہے، وہ اپنی تکمیل یا ترسیل کے لئے کسی دوسرے فن کا محتاج نہیں۔ جس طرح غزل یا نظم کی کامیابی کا مدار یہ نہیں ہے کہ اس کو موسیقی کے کسی راگ یا آہنگ پر گایا جا سکتا ہے یا نہیں، ٹھیک اسی طرح ڈرامے کی کامیابی کا مدار یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے اسٹیج پر تھیٹر کے اصولوں کے مطابق پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ "ڈراما ڈراما ہے۔ تھیٹر اور ایکٹنگ نہیں۔" اختر اورینوی کے ڈراموں کے متعلق دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ خود ڈرامے کی ادبی قدروں کے کہاں تک مطابق ہیں؟ اس پہلو سے ان ڈراموں کا جائزہ ضرور لینا چاہئے تاکہ خوبیوں اور خامیوں کی پرکھ ٹھیک ٹھیک ہو جائے۔ بہرحال اورینوی کے ڈرامے ڈرامے ہی ہیں اور اپنی تمام کمیوں کے باوجود لائق شمار ڈرامے ہیں، بلکہ اردو ادب میں ڈراموں کی کمی کے پیشِ نظر قابلِ لحاظ ڈرامے ہیں، خاص کر "شہنشاہ حبشہ" کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ محفوظ ہے۔

اورینوی نے ناول اب تک ایک ہی لکھا ہے "حسرتِ تعمیر"۔ یہ ناول دو حیثیتوں سے اردو ناول نگاری میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں پہلی بار چھوٹا ناگپور کی زرخیز و کیف آگیں سرزمین کو ایک ادبی جسم، ایک فنی روح عطا کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں حسنِ فطرت اور حسنِ صنعت بلکہ بہتر لفظوں میں جمالِ فطرت اور جلالِ صنعت بیک وقت دونوں کے درمیان ایک ایسے انسانی کردار کے ذہن و مزاج کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کی شخصیت انتہائے آرزو اور شکستِ آرزو کے درمیان بٹی ہوئی ایک نہایت پیچیدہ اور دلچسپ تماشا پیش کرتی ہے۔ مگر اس ناول کا انجام تعمیر نہیں صرف حسرتِ تعمیر ہے۔ شاید اس لئے کہ "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"۔ اور اس المیے کو بھی اس کی آخری حدوں تک نہیں لے جایا گیا ہے، بلکہ المیے کے تمام پہلوؤں کو بھی نہیں سمیٹا گیا ہے۔ غالباً ایسا اس لئے ہے کہ ہیرو اپنی تمام بلند پروازیوں کے باوجود نفسی لحاظ سے ایک کمزور شخصیت کا مالک ہے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ناول کا خاکہ اور ارتقا اپنے کردارِ خصوصی کی شخصیت سے ہم آہنگ ہو۔ بہرحال بحیثیت مجموعی "حسرتِ تعمیر" ایک عظیم ناول ہونے کی صرف صلاحیت رکھتا ہے اور فی الواقع ایک اہم ناول ہے اردو ناولوں کے درمیان ایک منفرد مقام کا مالک۔

اورینوی نے اپنے دل کے گداز کو ایک شکل دینے کے لئے شاعری بھی کی ہے، غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کا اپنا تیور یہاں بھی الفاظ، تراکیب اور آہنگ کے ذریعہ ایک حد تک پہچانا جا سکتا ہے۔ بعض غزلیں اور بعض نظمیں خاصی حسین اور پراثر ہیں۔

اورینوی نے تحقیق کا بھی کچھ کام کیا ہے۔ ڈی لٹ کے مشہور مقالے "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کے علاوہ بھی ان کے نسبتہً مختصر تحقیقی مقالے کئی ایک مجموعہ ہائے مقالات میں شامل ہیں۔ اورینوی کی تحقیق کا خاص میدان لسانیات ہے، اگرچہ کام انھوں نے ادبیات پر بھی کیا ہے۔ لسانی و ادبی دونوں ہی دائروں میں موصوف کی تحقیقات موضوع کے متنوں سے بحث نہیں کرتیں، بلکہ ان کی توجہ سامنے آئے ہوئے مواد کے مختلف گوشوں کے تقابل، تجزیہ اور تعیّن و ترتیب پر مرکوز رہتی ہے۔ اس طرح تلاشِ نوادر و دریافت و انکشاف کی بجائے اورینوی کی اکثر تحقیق کا انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دریافت شدہ نکتوں کو لا کر بڑی دقتِ نظر اور اجتہادِ فکر کے ساتھ کچھ نئے زاویئے اور نظریئے سامنے لاتے ہیں۔ اگر تحقیق صرف اعداد و شمار کی دریافت کا نام نہیں بلکہ اصول و اقدار کی تعیّن بھی اس میں شامل ہے (جیسا کہ دنیا کے مستند محققین کی اکثریت سمجھتی ہے) تو اورینوی نے بھی دادِ تحقیق دی ہے اور ان کی تحقیقات اپنی کمیوں کے باوجود اردو ادب میں ایک جگہ رکھتی ہے۔

اختر اورینوی اجتماعی مسائل سے بھی گہری اور وسیع دلچسپی رکھتے ہیں۔ مذہب میں اپنے مخصوص عقیدۂ احمدیت کے باوجود وہ بحیثیت مجموعی اسلام اور مسلمانوں کے فروغ کے متمنی اور اپنی حدود میں اس کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے اپنا میدانِ عمل ادب اور سیرت کے ان اجتماعات کو بنایا جن سے خطاب کرنے کا موقع ان کو اکثر ملتا رہتا ہے۔ ان اجتماعات میں اورینوی

کے خطبات اگر کسی طرح محفوظ کئے جاسکتے تو وہ اُن کے میزانِ عمل میں مستقل کارنامے شمار کئے جاتے۔ بہر حال وہ نسلیں جنھوں نے اُن کے خطبوں کو سنا ہے اُن کی خطابت اور تبلیغ دین کا چرچہ سینہ بہ سینہ شاید حشر تک اپنے ساتھ لے جائیں گی۔

ادارہ

اختر اورینوی سے انٹرویو

س۔ اس بات کے محرکات کیا ہیں کہ آپ نے کسی ایک صنفِ ادب پر اکتفا نہ کرکے افسانہ، تنقید، شاعری، ڈرامہ، ناول اور تحقیق جیسی متنوع اور مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی؟

ج۔ اپنی شخصیت کو سمجھنا بہت مشکل امر ہے۔ اس میں بڑے محاسبۂ نفس اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بھی غالباً معروضیت قائم نہیں رہتی۔ میں نے سنجیدگی سے ابھی تک ان محرکات کے متعلق غور و فکر نہیں کیا ہے جن کے تحت میں نے مختلف ادبی صنفوں کی طرف توجہ کی۔ لیکن کبھی کبھی بعض باتیں ذہن میں ابھری ہیں۔ شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف ایک ساتھ توجہ ہوئی تھی۔ لیکن تنقید کی طرف اُس وقت توجہ ہوئی جب انگریزی ادب کا مطالعہ مجھے کرنا پڑا۔ غالباً میری تعلیم کے نشیب و فراز مجھے مختلف صنفوں کی طرف لائے ہیں۔ سائنس کی ٹریننگ نے تجزیہ و تنقید کی طرف متوجہ کیا اور تحقیق تو محض میں نے یونیورسٹی کے مطالبات کے تحت کی ہے۔ اس کا کوئی خاص ذوق مجھے نہیں۔ ویسے افسانہ نگاری اور ناول نگاری تو بہت ہی قریبی تعلق کی صنفیں ہیں اور ادبِ عالم میں بکثرت ایسی مثالیں ہیں کہ افسانہ نگاروں نے ناول نگاری کی ہے اور ناول نگاروں نے افسانہ نگاری۔ شاعری اور افسانہ نگاری میری طبیعت کا خاص میلان ہے۔ یعنی ان کاموں سے مجھے تسکین ہوتی۔ تنقید جبریہ ہو گئی ہے اور تحقیق سے میری تحقیق کی رہبری فرائض میں شامل ہے۔ یعنی قدیم میں ایک ڈرامیٹک کلب تھا وہیں کچھ ڈرامے کی طرف توجہ ہوئی لیکن وہ دلچسپی قائم نہیں رہی۔ شہنشاہ جعفر میں نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا، اس کے بعد کوئی ڈرامہ نہیں لکھا۔

س۔ ایسا تو نہیں ہے کہ آپ اپنی روح کے انشراح اور ذہن کے اظہار کے لئے کسی ایک صنف میں مطمئن نہ ہو سکے بلکہ ہمیشہ اظہارِ ذہن و روح میں کچھ نقص اور ناتکمیلی کا احساس ہوا چنانچہ صنف پر صنف بدلتے رہے؟

ج۔ یہ ممکن ہے۔ لیکن یہ باتیں لاشعوری طور پر ہوئی ہوں گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ناول لکھنے کی خواہش اسلئے ہوئی کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس صنف میں اظہار و بیان کی وسعتیں ہیں۔ غالباً میرے مزاج کی اندرونی تہہ میں تھوڑی سیمابیت بھی ہے۔ یہ نا آسودگی کی پروردہ ہے یا مزاج کا جزو ہے نہیں معلوم۔ ویسے عقل و شعور کے تحت میں استواری اور وضع داری کی بہت کوشش کرتا ہوں۔ ادب و شعر کی دنیا نفسیاتی پیچیدگیوں کے اظہار کی دنیا بھی ہے۔ ارتقائی طور پر بھی ہے۔ میرے مزاج میں مثال پرستی بھی ہے اور جب مثالیت کی تسکین نہیں ہوتی تو اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہ مثالیت اخلاق و محبت کے سلسلے میں بھی ہے اور معاشی و جنسی معاملے میں بھی۔ عین ممکن ہے، یہ بھی مختلف سمتوں میں مڑنے کی وجہ ہوئی ہو۔ مختصر یہ کہ خارجی اسباب بھی کچھ ایسے ہے جنہوں نے مجھے ڈانواڈول رکھا اور داخلی اسباب بھی اس کے باعث ہوئے۔ اصلیت کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔

س۔ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے نتیجے میں آپ کی شخصیت میں انتشار تو نہیں پیدا ہو گیا، یا آپ اسی کو جامعیت سمجھتے ہیں؟

ج۔ میرے خیال میں ہو سکتا ہے کہ اندرونی انتشار کے نتیجے میں ایسا ہوا ہو لیکن اس طرزِ کار سے انتشار پیدا نہیں ہوا۔ سوال کا دوسرا پہلو

غور طلب ہے۔ میں اپنے کو ہرگز اتنا بڑا فنکار نہیں سمجھتا کہ میں نے ہر صنف میں شہ کار پیش کئے ہیں۔ جامعیت کا دعوی کرنا بہت بڑا دعوی ہے۔ اگر ایک صنف میں بھی کچھ کام ہو جائے تو بڑی بات ہے۔

س۔ آپ کے پیش نظر زندگی کا کوئی خاص مقصد ہے جس کا ابلاغ آپ ادب کی ان مختلف صنفوں کے ذریعے کرنا چاہتے ہوں جنہیں آپ نے استعمال کیا ہے؟

ج۔ جب ادب کی طرف دلچسپی ہوئی تو کوئی مقصد نہیں تھا، محض فطری تقاضے کے تحت یہ ہوا۔ ادب و شعر کی تخلیق سے نشاط اور اندرونی طمانیت پیدا ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے ادب کے ذریعہ کچھ کہنا بھی چاہا۔ میں نے ابتدا میں نیاز کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اقبال کا بھی۔ مقصدیت کی طرف مجھے اقبال لائے جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو مقصدیت اور افادیت کی عام فضا تھی۔ مجموعی طور پر میں نے ادب کو تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال کیا، اپنے دل کی تسکین کیلئے، زندگی کی تشریح کی خاطر، اور رحم و انصاف قائم کرنے کے لئے۔ میں رحم و انصاف قائم کرنے کا دعوے کرنے والے نظاموں میں اسلام کو سب سے افضل سمجھتا ہوں۔ اپنے فن میں میں نے براہ راست اسلام کی تبلیغ نہیں کی ہے، لیکن انسانی ہمدردی کا آدرش مجھے اسی سرچشمہ فیض سے ملا۔

زندگی کا ایک اعلی مقصد ضرور ہے اور وہ یہ کہ زندگی اور نظام زندگی کو حق و انصاف کے مطابق ڈھال جائے۔ اسے رفعت عطا کی جائے اور اس دنیا میں بھی جنت کی تعمیر ہو جائے۔ اگر ادب کے ذریعہ بھی سلیقے سے اس مقصد کا اظہار و ابلاغ کر سکیں تو نور علی نور۔

س۔ ایک ادیب کے لئے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بات کہنے سے پہلے بات کی حقیقت اور رخ سے واقف ہو، اگر ایسا ہے تو کیا یہ بات زندگی کے کسی مستقل نظریہ یا باضابطہ نظام سے شعوری وابستگی کے بغیر ممکن ہے؟

ج۔ ادب کے مختلف محرکات ہوتے ہیں۔ بنیادی محرک فکر نہیں ہے لیکن ارتقائی منزلوں میں فکر کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور یہی فکریات کو سمت، رفتار اور وزن عطا کرتا ہے۔ اعلی ادب کے لئے میرے خیال میں ضروری ہے کہ فنکار صاحب فکر و نظر ہو۔ فکر میں جتنی پختگی ہوگی اتنا ہی فنکار کی تخلیقات میں توازن پیدا ہوگا خطرہ یہ ہوتا ہے، فکر اور نظریے کی پختگی اور بالیدگی، احساس، جذبہ اور تخیل پر بھاری پڑنے لگتی ہے اور فن کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے۔ دنیا کے بڑے فنکار ایک واضح نظریہ حیات رکھتے ہیں۔ ابن عربی، رومی، اقبال، دانتے، ملٹن، گوئٹے یہ سب صاحبان فکر و نظر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیکسپیئر کا کوئی فلسفہ زندگی یا نظام فکر نہیں ہے۔ میری ناچیز رائے میں یہ صحیح نہیں ہے۔ شیکسپیئر تدریجی طور پر ایک ایسے مقام پر پہنچا تھا جہاں اسے پورے طور پر بصیرت حیات حاصل ہوئی۔ غالباً ٹمپسٹ میں وہ اپنا نظریۂ حیات پیش کرتا ہے ویسے وہ اپنے المیوں اور طربیوں میں بھی ایک خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ شیکسپیئر ہرگز ادباشی (ریوہیمین) نہیں۔ ہاں اس کے یہاں تعصبات جارحانہ ڈھنگ میں نہیں نظر آتے۔ ہمدردی، انسانیت دوستی، رواداری، انسانی کمزوریوں سے چشم پوشی وغیرہ بہت سی اخلاقی قدریں شیکسپیئر کے عقیدے میں شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ مقصدیت کو فن کا تکملہ سمجھتا ہوں، بشرطیکہ اس کے جمالیاتی تقاضے بھی پورے کئے جائیں۔ باضابطہ نظریے کی تشریح کرنی ہوگی لیکن بہر حال فکر میں اسی وقت استواری پیدا ہوتی ہے جب نظریے میں باضابطگی آئے۔ سوچنے اور غور کرنے میں باضابطگی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ انسانی نظریوں میں ہمیشہ اختلافات رہے ہیں۔ اسلئے ہم ادب کی توانائی کا سبب کسی ایک نظریے کو نہیں کہہ سکتے۔ یہ فنکار کے ذوق سلیم، اس کی معاملہ فہمی اور توفیق پر منحصر ہے کہ وہ کسی صالح نظریہ کو اپنائے۔

س۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فکر اور فن کسی بھی درجے میں ایک دوسرے سے الگ بروئے کار آ سکتے ہیں؟

ج۔ مختلف لفظ مختلف معنوں میں اور مختلف سطحوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ یوں تو شاعر بھی کہتے ہیں کہ وہ فکر سخن کر رہے ہیں، لیکن اعصاب کے علما اور ذہن و دماغ کے حکما فکر کے عمل کو محدود کرتے ہیں اور وہ ایسے انسان کی اعلی ترین صلاحیت قرار دیتے ہیں۔ عام جمالیاتی تخلیق میں یا ہر تخلیق فن کے بنیادی حصے میں فکر کا دخل نہیں ہوتا۔ جمالیاتی تخلیق کا عمل فکر سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔

س۔ یہ تو ماہرین نفسیات کا نظریہ ہوا جب کہ علم النفس ایک بہت ہی غیر یقینی اور انتہائی مبہم دوسرا علم ہے۔ کیا آپ نفسیات کو انسانی افعال کی توجیہ میں صرف آخر سمجھتے ہیں؟ جمالیاتی تخلیق فکر سے آزاد ہو کر جمالیاتی رہ بھی پائے گی؟

ج۔ مشکل یہ ہے کہ ہم علوم ہی کے سہارے انسان اور انسانی اعمال کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سارے انسانی علوم ناقص ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اوہام قیاسات

اور عطائی خیالات پر ان ناقص علوم کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ ہم دنیا کے چوٹی کے علماء اور حکما کی رائے کو بنیاد بنائیں۔ علم اور حکمت کی تردید صرف عرفان، الہام ہی سے ہو سکتی ہے۔ انسانی دماغ اور انسانی نفس کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لئے جدید سائنس کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ہاں اگر قرآن علم و حکمت کی روشن دلیلوں کے سامنے نئے علوم نہ ٹھہریں تو میں انہیں رد کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ قرآن بھی انسانی دماغ کے ارتقا کا قائل ہے۔ بلوغت کے بعد ہی انسان مکلف ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جذباتی اپیل کی جاتی ہے۔ فکر کی منزل بعد میں آتی ہے۔ جمالیاتی میلان بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے لیکن فکری میلان بعد کی پیداوار ہے۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ترقی یافتہ ہنروں کا فن اور خصوصاً اُن کے اعلیٰ ترین نمونے فکر سے محروم نہیں ہو سکتے۔

س۔ دو باتوں کی وضاحت مطلوب ہے۔ کیا آپ نے تحقیق کر لیا ہے کہ جدید علوم خاص کر علم النفس، قرآن کے نظریۂ تفکر و تدبر سے بہتر ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ فن تو بلوغت ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے یعنی منزلِ فکر کے بعد کا یہ مرحلہ ہے، لہٰذا ابتدائی حسن جمال فن کی بنیاد کیسے ہو سکتی ہے؟

ج۔ میں نے یہ بات نہیں کہی کہ موجودہ علم النفس عین قرآن کے مطابق ہے لیکن میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن کے بتائے ہوئے علم النفس سے میں پورے طور پر باخبر ہوں۔ پھر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ قرآن نے انسانی دماغ کے افعال کا اس طرح تجزیہ کیا ہے جیسے جدید سائنس نے کیا ہے۔ ہم علم نجوم یا علم کیمیا یا طبیعیات کی تفصیلیں قرآن میں نہیں ڈھونڈ سکتے اور اس کی ضرورت ہے۔ احساس جمال فکر سے پہلے پیدا ہوتا ہے، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی فنون لطیفہ کی تخلیق افراد اور اقوام کی طفلی اور عنفوان شباب میں ہونے لگتی ہے۔ ہم منظری اور رومانی نظموں کو بھی شاعری کا نمونہ کہتے۔ اسی طرح بت گری کے ابتدائی نمونے یا رقص یا موسیقی کا بنیاد فکر سے آزاد ہوتا ہے، جذبہ اور تخیل سے آزاد نہیں ہوتا۔ فن کی تخلیق وجدانی ہے اور اس کا بنیادی تعلق جبلتِ جمال سے ہے۔ یہ تو آپ کے معیار پر منحصر ہے کہ آپ غیر فکری فن کو اہم قرار نہ دیں لیکن بہت سے اہل نظر ایسے ملیں گے جو غیر فکری فن کو فن قرار دیتے ہیں۔ میری ذاتی ترجیح یہ ہے کہ میں فکر آمیز فن کو بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ارتقا کی بلند منزلوں کی پیداوار ہے۔

س۔ آپ لکھتے کس طرح ہیں، فکری منصوبہ بنا کر یا ارتجالی طور پر؟

ج۔ دونوں طرح۔ یعنی اب تک میں نے بعض چیزیں منصوبہ بنا کر بھی لکھی ہیں اور بہت زمانے تک اُسے اپنے ذہن و دماغ میں سمائے رہا ہوں اور بعض چیزیں اس طرح لکھی گئی ہیں کہ بس میں لکھنے بیٹھ گیا، کوئی کیفیت طاری ہوئی یا کوئی جذبہ ابھرا، یا کسی غیر معمولی تجربے نے تقاضا کیا اور ادبی کاوش شروع ہو گئی۔ نظم و نثر دونوں میدانوں میں ایسا ہوا ہے۔ میں ایک نشست میں بہت کم لکھتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی غزل ایک نشست میں ہو گئی ہے۔ یوں بھی میں دیر تک محنت نہیں کر سکتا۔ گھنٹوں سے لگاتار گھنٹہ بھر لکھتا ہوں۔ یہی حال پڑھنے میں بھی ہے۔ دو گھنٹہ لگاتار پڑھ لیا تو گویا بہت بڑا کام کیا۔

س۔ میں جاننا یہ چاہتا ہوں کہ آپ پہلے ذہن میں ایک مجموعی خاکہ بنا کر لکھنا شروع کرتے ہیں یا کہ الہام کے تحت بس شروع ہو جاتے ہیں اور پھر 'الہام' ہی کے تحت تحریر کو ختم بھی کر دیتے ہیں؟

ج۔ شاید آپ نے صحیح نتیجہ نہیں نکالا۔ میں نے عام بات کہی تھی کہ میں نے نقشہ بندی کے ساتھ بھی کام کیا ہے اور ارتجالی طور پر بھی لیکن میں نے اپنی تخلیقات کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے یہ بات نہیں کہی تھی۔ اب مجموعی طور پر میں یہ کہتا ہوں کہ ابتدا ارتجالی طور پر ہو جائے' یہ اور بات ہے' لیکن فنی نمونے کی تکمیل پلان ہی کے تحت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی فنکار کو پلان کرنے کا کتنا سلیقہ ہے' اور یہ بات بھی ہے کہ مختلف تخلیقات میں پلاننگ کا وقفہ مختلف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صنفیں جو نسبتاً مختصر ہیں اُن میں بڑی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی، ایک تخلیقی کوندا اور تھوڑی سی تنظیم کافی ہوتی ہے لیکن بالیدہ اور ترقی یافتہ صنفوں میں پلاننگ کی ضرورت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں ایک اور دلچسپ بات تخلیقِ فن کے سلسلے میں رونما ہوتی ہے۔ تحریک اور القا کسی پلاننگ کے ہوتا ہے۔ ہاں تجربے کی تشکیل کی منزل میں یا خیال کو بالیدہ بنانے کے مرحلہ میں غور و فکر، منصوبہ بندی، ترک و انتخاب اور تنظیم و تعمیر کی ضرورت پڑتی ہے۔

س۔ آپ نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں دوسروں کی طرف روئے سخن کئے بغیر آپ کیا تاثر رکھتے ہیں؟

ج۔ میں کسی مخصوص فنکار کی طرف روئے سخن تو کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن باستثنائے اقبال میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں ابھی بڑے کارنامے پیش نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ہم عالمی معیار کو سامنے رکھیں اور اگر

صرف ایشیا کے ہی ادب العالیہ کا جائزہ لیں تو یہ بات روشن ہو جائے گی کہ اردو
شاعری بزرگوں کے معیار تک بھی نہیں پہنچی تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ ہمارا سفر جاری ہے۔ اس دور میں شاعری کے لئے جو کچھ ہوا ہے وہ ہمت افزا ہے
اسی طرح اردو افسانہ و ناول کا معیار عالمی بلندیوں تک نہ پہنچا ہو لیکن ان صنفوں
کو بھی اردو میں فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اور ڈرامہ کی صنف ترقی نہیں کر رہی ہے۔
اردو تنقید کے میدان میں کوئی عظیم الشان کارنامہ اب تک سامنے نہیں آیا۔
ہم میں سے اکثر لوگ مضامین اور مقالوں ہی پر بس کرتے ہیں، اصولی تنقید پر کتابیں
نہیں ہیں، ادیبوں اور شاعروں کا بھرپور جائزہ لینے والی تنقیدیں بھی کمیاب
ہیں۔ پھر بھی یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اردو تنقید نگار آگے بڑھنے کی مخلصانہ کوششیں
کر رہے ہیں۔

اپنے متعلق مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں۔ میں نہ خوش فہمی میں گرفتار ہوں
اور نہ احساس کمتری میں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میں نے موجودہ اردو دنیا کے معیار
کا ساتھ دیا ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے تجدید ہوئی ہیں گو انکار نہیں۔ کچھ ایسے بھی۔
بعض جہت سے میری تخلیقی کوششیں دوسرے دوسروں سے بہتر ہیں اور کئی جہتوں میں
کم تر۔

س۔ کیا آپ کے خیال میں واقعی اردو شاعری، افسانہ اور تنقید ایشیا
اور اس سے زیادہ یورپ کے فنی معیاروں پر پوری نہیں اترتی، حالانکہ کم از کم ان
تین صنفوں میں ہمارے ادب میں چند نام تو ایسے لئے ہی جا سکتے ہیں جنہیں عالمی
معیار سے قد آور فنکار کہا جا سکے۔ مثلاً شاعری میں اقبال کے علاوہ میر اور
غالب، افسانے میں کرشن چندر، منٹو اور اختر اورینوی اور بیدی، تنقید میں
کلیم الدین احمد، آل احمد سرور اور احتشام حسین؟

ج۔ میں نے مجموعی طور پر گفتگو کی ہے۔ حالی دور میں اردو ادب کو ایشیا
کے بہت سے ادیبوں پر فوقیت حاصل ہے۔ فارسی ادب کی اطلاع مجھے ایک
حد تک براہ راست ہے، عربی کے متعلق ترجموں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ دوسرے ایشیائی
ادیبوں کی اطلاع بالواسطہ ہے۔ لیکن ایشیا سے قدیم کا سرمایہ شاعری اور قصہ نگاری
میں بہت ہی قیمتی ہے۔ جدید صنفوں کی مخصوص ٹیکنک کو سامنے رکھ کر مجموعی طور
پر قصہ نگاری کے فن اور شاعری نے ایشیا میں بہت ترقی کی تھی، ہاں جدید دور
میں ایشیائی ادب یورپ کے مقابلے میں پچھڑا ہوا ہے۔ اگر ہم یورپ کے عالمی کارناموں
کو سامنے رکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی ہم نے ان بلندیوں تک رسائی حاصل نہیں
کی ہے۔ لیکن بعض صنفوں میں ہم تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ مثلاً افسانہ نگاری
کے باب میں۔ شاعری اور تنقید میں، ناول اور ڈرامے میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ نہ معلوم
میں پتہ نہیں کیوں اردو شعرا بڑی ہستیوں کی طرف توجہ نہیں دیتے، اب تو مثنویاں
بھی بہت ہی کم لکھی جا رہی ہیں۔ بہت ہی عمدہ بات ہوتی اگر اردو میں منظوم
ڈرامے، بڑی رزمیہ نظمیں اور ترقی یافتہ مثنویاں پیش کی جائیں۔ کاش اقبال
جاوید نامہ اردو میں لکھتے یا انیس کی مجلس شوری کے کنونیس کو بڑا کر دیتے۔ اقبال
کی کئی اردو نظمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہماری روحیں ان محدود قالبوں میں نہیں
سما رہی ہیں۔ تنقید میں بھی ابھی بہت تشنگی پائی جاتی ہے۔

س۔ معاف کیجئے گا شاید ہم لوگوں کا روئے سخن دوسری ہی طرف
ہو گیا۔ کیا آپ بغیر کسی انکسار کے ایسا سمجھتے ہیں کہ آپ نے جن اصناف ادب میں
طبع آزمائی کی ہے ان میں کم از کم افسانے اور تنقید میں آپ کی کارگزاریاں قد آور
اول کی ہیں؟

ج۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کئی افسانے قد آور کے لکھے ہیں۔ تنقید میں
بھی میں نے کئی مقالے بہت اچھے پیش کئے ہیں۔ لیکن ابھی تک میں نے نظریاتی
تشریحات بھرپور طور پر نہیں کیں اور نہ کسی بڑے فنکار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ویسے
میں نے اقبال اور نظیر کی شاعری پر کتابچے لکھے ہیں۔ اور وہ میری رائے میں اچھی
کوششیں ہیں۔ میرا ناول حسرت تعمیر بہت ہی برا چھپا ہے۔ لیکن میرے خیال میں
وہ ایک عمدہ ناول ہے۔

س۔ کیا آپ بھی اردو کے بعض ناقدوں کی طرح ایسا سمجھتے ہیں کہ بڑی
چیز وہی ہوتی ہے جس کا حجم بھی بڑا ہو، یعنی مقالے سے زیادہ کتابیں اہمیت رکھتی
ہے؟ دوسری بات یہ کہ نظریاتی تشریح بجائے خود کوئی ضروری چیز تو نہیں ادیبوں
کے انفرادی اور عملی مطالعے بھی بعض وقت نظریاتی بحثوں سے زیادہ اہم ہو سکتے ہیں؟

ج۔ حجم کا سوال نہیں۔ لیکن جب ہم کبھی کسی بڑے فن کار کا جائزہ لیتے
ہیں تو اس تشریح و تفصیل میں جو کتاب کے ذریعہ ہوتی ہے اچھی تنقید کے اظہار کے
بہتر سے بہتر مواقع ملتے ہیں۔ اور ناقد کی تعمیری اور تنظیمی صلاحیت کا بھی اظہار
ہوتا ہے۔ یوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک شعر میں بھی شعریت کوٹ کوٹ کر بھری
ہوتی ہے اور اس سے شاعر کے مقام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مگر ایک رزمیہ اور

نثر میں اپنے انداز سے کے موضوع کثرت سے ملتے ہیں۔ اسی طرح ایک تنقیدی کتاب بھی انتقادی کے جو ایسے بہت کثرت سے ملتے ہیں اور پھر وہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف نظریاتی بحث کی بھی بڑی ایک اہمیت ہے۔ ویسے عملی طور پر جابجا نظریہ کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ لیکن فلسفۂ تنقید اور فلسفۂ فن پر ترتیب و تفصیل کے ساتھ منظم طور پر مدوّن نہیں ڈالی ایک نظر کا آج بھی ادھار ہی ہمارے یہاں ایسا کام ابھی نہیں ہوا۔

س۔ آپ کی دلچسپیاں ادب اور زندگی دونوں سے اتنی گہری اور متنوع ہیں۔ ساتھ ہی آپ کے مطالعات اور تجربات نے دیکھے ہیں۔ تو اس دور میں جب بحران کا دور ہے آپ اجتماعی کاموں میں براہ راست حصہ کیوں نہیں لیتے؟

ج۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ غالباً میرے متعلق جن خوش فہمی میں آپ گرفتار ہیں اسی متعلق اتنی خوش فہمی میں خود مبتلا نہیں ہوں جو آپ کو ایک بتاتا ہوں۔ وہ آپ کو معلوم نہ ہوگی۔ میں آٹھ سال کا تھا تو مجھے سخت طور پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہوا۔ حالت نازک ہوگئی۔ چالیس دنوں تک بخار کی شدت رہی۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ با نماز بچھا کر اکثر و بیشتر سجدہ میں پڑے ہوئے تھے۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے مجھے اسی وقت وقف فی الدنیا کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سنیں اور میں اچھا ہوگیا۔ عجب بات ہے کہ مجھ پر بار بار مہلک بیماریوں کا حملہ ہوا۔ مجھے کالا آزار ہوا اس وقت اس کا علاج نہیں تھا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میری بیماری کے بعد ایک علاج نکلا اور میں اچھا ہوا۔ پھر میرے رخساروں کی ہڈیوں میں ناسور ہوگیا وہ بھی آپریشن کے بعد مندمل ہوا۔ یہ سب لڑکپن کے دور کی بات تھی۔ جب میں بڑا ہونے لگا تو والد صاحب نے مجھے وقف کے عہد کی اطلاع دی اور میں اس پر رضامند ہوگیا۔ اسی نیت سے کالج میں پڑھنا شروع کیا کہ نوکری نہیں کروں گا، خدمتِ دین کروں گا۔ لیکن وہاں مجھ پر سل کا حملہ ہوا۔ برسوں بیمار رہا تعلیم منقطع ہوگئی۔ پھر بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا اس دوران میں بھی بیمار ہوتا رہا ذات الجنب کا سخت حملہ ہوا اور دل پر ضرب پڑی۔ ایک منزل ایسی آئی کہ میں نے اپنے کو دوراہے پر پایا: نوکری کروں یا خدمتِ دین۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور یہ طے کیا کہ وقف کے عہد کو نہیں توڑوں گا۔ میں نے ساری باتیں امام جماعت احمدیہ کو لکھ کر بھیج دیں۔ اپنی کیفیت بالکل لکھی۔ والد صاحب کے ارادہ اور اپنی منظوری کا تذکرہ بھی کیا اور میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جو امام کا حکم ہوگا وہی کروں گا۔ حضرت صاحب کا جواب آیا ـــ آپ کے حالات کے پیش نظر آپ کو ملازمت کی اجازت دی جاتی ہے۔ آپ کے لئے یہی وقف شمار ہوگا کہ آپ جہاں بھی ہوں زبان و قلم اور دوسرے اعمال کے ذریعہ خدمتِ دین کرتے رہیں۔ یہ سنہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے پھر ایک موقع پر افریقہ میں عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی تبلیغ کا ایک سخت مرحلہ آیا اور حضرت صاحب نے نوجوانوں کو وقفِ زندگی کی تحریک کی۔ غالباً یہ ۱۹۴۱-۴۲ء کی بات ہے۔ میں نے پھر اپنے دل کو ٹٹولا اور حضرت صاحب کو لکھا کہ حضور میں تو وقف شدہ ہی ہوں۔ مجھے تو صرف نوکری کی رخصت ملی تھی۔ اب میں کالج میں لیکچرار کا کام کر رہا ہوں۔ حضور نے جواب دیا کہ آپ جہاں ہیں وہیں رہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وہاں کے دروازے پر کھڑا کیا ہے خدمتِ دین میں لگے رہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں غفلتوں میں مبتلا رہا ہوں لیکن کبھی کبھی خدا تعالیٰ نے مجھ سے کام لیا ہے۔ مجھے سیرت کے جلسوں میں تقریریں کرنے کے موقع ملے ہیں اور میں نے اپنے آقا کے قدموں میں عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ میں نے اپنے ہندو دوستوں اور اساتذہ کو اسلام کی تبلیغ کی ہے۔ اس طرح بڑے گاندھی جی، پنڈت نہرو، راج گوپال اچاریہ، جے پرکاش نرائن، سری کرشن سنہا وزیر اعلیٰ بہار، جسٹس بی۔ پی۔ سنہا، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور موجودہ وزیر اعلیٰ بہار کو تبلیغ اسلام کی ہے اور قرآن حکیم کے انگریزی ترجمے تحفتاً دئیے ہیں۔

سماجی اور سیاسی کاموں کی بھی کام کرنے کے بڑے امکانات تھے۔ لیکن میری سرکاری ملازمت کے معاہدے نے راستہ روکا۔ پھر بھی قانون کے دائرے میں رہ کر جو کچھ مجھ سے بن پڑا ہے وہ درمے قدمے کر رہا ہوں۔

میری گرتی صحت اور میری ملازمت میرے پاؤں کی زنجیریں ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کبھی وسیع پیمانے پر میں خدمت خلق و ملت کر سکوں گا یا نہیں۔ خدا تعالیٰ میری غفلتوں کو معاف کرے۔ پابندیوں میں بھی جتنا کچھ کر سکتا تھا شاید نہیں کیا۔

س۔ آپ کی زندگی کے وہ کون سے واقعات یا حادثات ہیں جنہوں نے آپ کے ذہن اور شخصیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے؟ آپ اپنی علمی و

علمی زندگی میں کن اشخاص و تحریکات سے کس طرح متاثر ہوئے ہیں؟

ج۔ میرے خیال میں سوال کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر باتیں کی جائیں تو اچھا ہے۔ میرے خاندان کا پس منظر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا پس منظر ہے۔ میں نے اپنی دادی اماں مرحومہ سے قدیم روایات کو سنا، سمجھا اور ان کی ذات میں محسوس کیا۔ دادی صاحبہ بتاتی تھیں کہ سید صاحب کی تحریک کے دو پہلو تھے، اصلاح مسلمین اور جہاد۔ دادی اماں سید صاحب کے پیغام کی علامت تھیں۔ میری زندگی اور میرے نصب العین کو انہوں نے بہت متاثر کیا۔ وہ ایک قصباتی رئیس کی بیوی تھیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو دادا ابا فوت ہو چکے تھے۔ پھر بھی دادی صاحبہ کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن وہ دو کمبل، چار جوڑا سادہ لباس، ایک کاٹھ کا بکس، پیڑھا، ایک لوٹیا جس پر ناریل کے چھلکے کا ڈھکن ہوتا تھا، ایک تیمم کا ڈھیلا اور ایک بڑے حروف کا قرآن شریف ــــ ان کی کل کائنات تھی۔ اگر ان کے بیٹوں میں سے کوئی انہیں کچھ اور دینا چاہتا بھی تھا تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں۔ ہمیشہ انہوں نے مٹی کے برتن میں بہت ہی سادہ کھانا کھایا۔ عموماً وہ نمک اور روٹی کھاتی تھیں۔ میں نے ان کو اکثر روتے ہوئے دیکھا۔ میں ان سے پوچھتا، دادی اماں کیوں روتی ہیں؟ وہ دیہاتی انداز میں کہتیں، تم کو کیا معلوم کہ ہم سب لوگ کتنے گنہگار ہیں اور ہم نہ خدا کا حق ادا کرتے ہیں اور نہ بندوں کا۔ ایک دفعہ انہیں کسی خادم پر غصہ آیا اور وہ اسے ڈانٹنے لگیں، غصہ اور بڑھا تو اپنی چھڑی سے اس کے پاؤں کے کسی حصے میں ٹھوکا لگانے لگیں۔ خادم نے چوری کی تھی۔ دادی اماں اچانک رک گئیں۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ شاید ان دنوں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا "ارے اختر، رسول اللہؐ نے غلاموں کو مارنے سے منع کیا ہے نا، لیکن چھڑی سے ٹھوکا لگانے سے تو گناہ نہیں ہوگا نا" اور وہ یہ کہہ کر رونے لگیں۔ میں نے بہت سمجھایا کہ دادی اماں چوروں کا تو ہاتھ بھی کاٹا جاتا ہے۔ لیکن وہ روتی جاتی تھیں اور کہتیں کہ سزا کے لئے ثبوت تو نہیں ملا۔ اس واقعہ کا ہمیشہ میری طبیعت پر اثر رہا ہے۔ بہت سی باتیں ہیں اس سلسلے کی۔ دادی اماں نے ہماری تربیت کی۔ وہ اپنے پوتوں اور پوتیوں کو قصص القرآن سناتیں اور نماز کی بہت تاکید کرتی تھیں۔ میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہوں تو ایک بات مجھے خود بہت پسند آتی ہے

دادی اماں نے اپنا ایک کمبل کسی غریب کو دے دیا تھا اور خود ایک کمبل اس طرح استعمال کر رہی تھیں کہ آدھا اوڑھتیں اور آدھا بچھاتیں۔ میں کرسمس کی چھٹیوں میں اورین گیا تو ان کو اس حال میں پایا۔ پوچھا کہ آپ نے مجھلے ابا اور ابا جان سے کیوں نہ کہا۔ بولیں کہ گزر جاتی ہے، کیا ضرورت ہے ایک اور کمبل کی۔ لیکن درحقیقت وہ سردی کھا رہی تھیں۔ میرے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔ میں نے فوراً [illegible] سے قینچی منگوائی اور اپنی توشک کو دو حصوں میں کاٹ ڈالا۔ دادی اماں چیختی رہیں کہ توشک چھوٹی ہو جائے گی۔ مگر بعد میں انہوں نے بڑے پیار سے نصف توشک قبول کر لی، ان کی آنکھوں سے آنسو گرے اور ان کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔

میرے چچا سید ارادت حسین صاحب مرحوم (والد سید وزارت حسین صاحب، مدظلہٗ) ابتدا سے مذہبی میلان رکھتے تھے۔ وہ آریوں اور عیسائیوں سے مباحثوں کے قصے سناتے اور ہمیں قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد درس قرآن کریم ہوتا۔ والد صاحب کو ادبی ذوق بالکل نہیں تھا لیکن انہوں نے ایک کتاب مرآۃ الجہاد لکھی تھی۔ چچا کو ادبی ذوق بھی بہت تھا۔ وہ گاؤں میں ادبی پرچے منگوایا کرتے تھے۔ نگار، نیرنگ خیال، عالمگیر، ادبی دنیا، شاہکار ہمارے وہاں آتے تھے اور ہم سب بھائی مل کر پڑھتے تھے۔

کالج کی زندگی میں کچھ ایسے دوست ملے جنہیں بے حد ادبی ذوق تھا۔ اقبال سے باضابطہ تعارف ایوب مرحوم کے ذریعہ ہوا۔ ہم دونوں کیمسٹری کلاس سے نکل بھاگتے تھے اور بانگ درا کی تلاوت ہوتی تھی۔ اقبال کا اثر بڑھنے اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ نگارستان کا مطالعہ تو [illegible] شروع ہو گیا تھا۔ ہوسٹل میں ایک دوست ابوالخیر بھی نیاز کے رسیا تھے، ہم لوگ ادھر ادھر رات تک ساتھ مل کر نگارستان بار بار پڑھتے تھے۔ اقبال اور نیاز کا متحدہ اثر میری ادبی زندگی پر گہرا پڑا ہے۔

سائنس کالج کے بعد میڈیکل کالج کی تعلیم نے بھی میری تخلیقات کو متاثر کیا۔ میں نے سائنس سے افسانہ نگاری اور تنقید میں بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ میڈیکل کالج سے مجبوراً نکلنے کے بعد انگریزی آنرز کی تعلیم نے بھی مجھے بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔ وہاں دو شخصیتیں ایسی تھیں جن کا آج تک میری ذہنی زندگی پر اثر ہے۔ انگریزی کے پروفیسر جے۔ ایل۔ ہل۔ اور معاشیات کے پروفیسر ڈاکٹر گیان چند

اول اول انھوں نے ادب و شعر کی دنیا میں میری صحیح رہنمائی فرمائی اور زندگی اور اس کے معاملات کی بصیرت عطا کی۔ ان صاحب کی دین یہ ہے کہ انھوں نے آزادیٔ فکر و نظر کی دولت بخشی۔ انھوں نے مجھے خاص طور پر یہ نصیحت کی تھی کہ میں انگریزی میں کبھی نہ لکھوں لیکن انگریزی ادب سے فائدہ اٹھا کر اردو کو مالا مال کر دوں۔

۱۹۳۵ء کے قریب میں ادب کی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوا اور ان دنوں مجھ پر اشتمالیت کا بھی حملہ ہوا۔ کچھ تو مطالعہ اور کچھ دوستوں کی صحبت۔ یہ حملہ اچھا خاصا سخت تھا لیکن میری زندگی کو کبھی ایک لمحہ کو بھی الحاد نہ آیا۔ تب بھی میں نے اشتمالیت کو ایک مکمل انسانی نظام سمجھا ہو۔ ہاں ان دنوں اشتمالیت کے اقتصادی نظام کو اعلیٰ ترین نظام سمجھتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ معاشیات کے متعلق اسلام نے جن اصولی باتیں بتادی ہیں اور تفصیلات میں خاموشی اختیار کی ہے اس لحاظ سے میں اشتمالی اقتصادی نظام کو اسلامی معاشیات کے خلاف نہیں سمجھتا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ میری اشتمالیت پسندی کی خبر امام جماعت احمدیہ کو بھی ہوئی۔ میں سنہ ۱۹۴۲ء میں قادیان گیا اور خاص طور پر معاشیاتی مسائل کے سلسلے میں حضرت صاحب سے باتیں کیں۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جلسہ سالانہ میں امام جماعت احمدیہ نے اسلام کے اقتصادی نظام پر لمبی تقریر کی اور اشتمالیت پر کڑی تنقید۔ چند سال کے بعد اس سلسلہ کی ایک اور کڑی کتابی شکل میں نمودار ہوئی۔ پہلی تقریر نظام نو کے نام سے شائع ہوئی ہے اور دوسری اسلام کے اقتصادی نظام کے نام سے۔ ان دونوں کتابوں کا میرے ذہن و دماغ پر بہت گہرا اثر ہوا ہے۔

ترقی پسند تحریک سے میں متاثر بھی ہوا اور میں اس کا ناقد بھی ہوں لیکن یہ کہنا سچائی سے دور نہیں ہوگا کہ اقبال کی شاعری، حالی کے مقدمہ اور ترقی پسند تحریک نے مل کر مجھے ادب میں مقصدیت کا قائل بنا دیا۔

س۔ موجودہ نظام تعلیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ افراد کی تربیت صحیح خطوط پر کر رہا ہے؟ اگر نہیں تو آپ کی نگاہ میں کسی متبادل نظام تعلیم کے بنیادی خطوط کیا ہو سکتے ہیں؟

ج۔ تعلیم کا مسئلہ بہت ہی اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ایک امر تو واضح ہے کہ تعلیمی نظام کو زندگی کے کُلّی نظام سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ ابھی تک ہم لوگوں نے ایمانداری سے اپنا کوئی نصب العین ہی مقرر نہیں کیا۔ ہم نے سیاست کو اولیت دے رکھی ہے اور نظامِ زندگی کے تقاضوں سے تغافل برت رہے ہیں۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ بڑے خلوص، بڑی سنجیدگی اور دانشوری سے نظامِ حیات کی تعیین کی جائے۔ منزل اور مقصد متعین کئے جائیں اور پھر ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی درجہ بندی کرتے ہوئے سلیقے کے ساتھ ایک ایسے نظامِ تعلیم کی تنظیم کرنی چاہیے جو ملک کے نوجوانوں کی صحیح تربیت اور تعلیم کا موجب ہو۔ ظاہر ہے کہ صحت تعلیم سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسے کارکن پیدا کر سکے جو جیتی جاگتی، فعال اور مقررہ قومی نصب العین پر عمل کرنے والی ہوں۔

انگریزوں نے ہندوستانی زندگی کا ایک ناقص تصور پیش کیا اور اسی کے مطابق ایک ناقص نظامِ تعلیم جاری کر دیا۔ انگریزوں کے نظامِ تعلیم میں قصور تھا مگر وہ ان کے تصورِ حیات سے ہم آہنگ تھا۔ میکالے نے نہایت سوچ سمجھ کر ایک نظامِ تعلیم جاری کیا جو ہمارے لئے برا تھا مگر انگریزوں کے لئے اچھا تھا۔ ہم لوگوں نے اب تک سوچا ہی نہیں۔ کبھی کبھی سرسری طور پر کچھ فکر و تحقیق کی اور پرانے نظام میں پیوند لگانے شروع کر دیے۔ ملکی حالت بدلتی چلی گئی، عالمی حالات میں تیز تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن ہم پرانے تجربے میں اب تک صرف چند ہی تبدیلیاں ہی جوڑ سکے ہیں، آزادیٔ وطن کے تصور تو بہت دور ہے۔

نظامِ تعلیم پر کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔ میں چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے۔ لہٰذا ہمارے نظامِ تعلیم کو ایسا ہونا چاہیے جو ہماری روحانی اور اخلاقی تہذیب کا موجب بھی ہو اور ہماری ذہنی و دنیوی کا ذریعہ بھی۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ نظامِ تعلیم کو معاشی اور سماجی اصلاح و فلاح کا وسیلہ بھی بنانا چاہیے۔ ہم کسی مخصوص نظامِ معاش یا نظامِ سیاست کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ایشیا کی بہترین روایات میں خدا ترسی، انسانیت دوستی، عدل اور انصاف، رحم و شفقت، کمزوروں کی دستگیری، ضبطِ نفس اور مکافاتِ عمل کا خاص لحاظ پایا جاتا ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو ایسا ہونا چاہیے جو ابتدائی منزلوں سے آخری منزل تک ان اقدار کی پرورش کرے۔

س۔ آپ کے خیال میں تعلیم کا نشانہ تعداد کو ہونا چاہیے یا وصف کو؟

ج۔ زندگی کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ منہاج تو تعداد ہے
لیکن اس مقصد تک ہم پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وصف کا لحاظ نہ رکھیں
تزکیہ نفوس کا ہمیشہ ایک فرد یا چند افراد کا مسئلہ ہے۔ اسی مقصد سے
کریں چھوٹی ہیں قدار بھی اختصاصی تربیت افراد کا لحاظ رکھتے تھے اور
موجودہ مغربی تعلیم میں بھی ذہین افراد کو خاص ٹیوٹوریل اور خاص لیباریٹریاں
مہیا کی جاتی ہیں جو سبھوں کو نہ دی جاتی ہیں اور نہ دی جا سکتی ہیں۔ ہم
وصف کی خاطر تعداد کو قربان کر سکتے ہیں لیکن کوشش یہ ہونی چاہئے کہ
زیادہ سے زیادہ افراد کو باوصف بنائیں۔

س۔ آپ انسانیاتی علوم یعنی آرٹس اور میکانکی سائنس کے درمیان
دورِ حاضر کے تقاضوں کے اعتبار سے کس کو ترجیح دیں گے؟

ج۔ سوال کا ترجیح کا نہیں ہے تقاضوں کا ہے، اجتماعی تعلیمی نظام
کی تشکیل میں تھوڑی لچک داری بھی ہونی چاہئے۔ اس وقت ہندوستان
کو سائنس کی طرف توجہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، لیکن سیاسی تعلیم
کو خالصۃً اختصاصی نہیں ہونا چاہئے۔ میں جنرل ایڈکیشن کا حامی ہوں یعنی ہمہ
جہتی تعلیم۔ آپ کسی ایک جہت پر تاکیدی نشان لگا دیں یہ اور بات ہے۔
خالص سائنس کی تعلیم خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح خالص آرٹس
کی تعلیم بھی انتشارِ ذہنی پیدا کرنے کی موجب ہو سکتی ہے۔ عصر جدید کے تعلیمی
مفکرین جنرل ایڈوکیشن کی اہمیت پر بہت زور دے رہے ہیں۔

بنیاد کا اعتبار سے میں آرٹس کی تعلیم کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں کیونکہ
میرے خیال میں آرٹس کی سرحدیں فلسفہ اور مذہب تک پہنچتی ہیں۔
بعض علوم سائنس اور آرٹس کے درمیان ہیں جنہیں سماجی سائنس کہتے
ہیں۔ عمرانیات، سیاسیات، نفسیات وغیرہ۔ مذہب بھی ایک حد
تک اپنا سائنسی پہلو رکھتا ہے، خصوصاً تربیتِ نفس کے جو طریقے اور
ضابطے ہیں وہ سائنسی ہیں۔ مذہب، جمالیات، فلسفہ اور سائنس کا
خوبصورت مجموعہ ہے۔ میں کسی دوسرے مذہب پر طنز نہیں کرتا لیکن میں
ایمانداری سے کہتا ہوں کہ اس مجموعہ خوبی کا سب سے مصفّا اور مجلّا نمونہ اسلام
ہے۔ بعض مذاہب سائنس سے کنارہ کش ہونے اور اپنے کو سائنس کی
ضد کہہ دیں یا کم از کم اُن کے پیرو یہی کہتے ہیں لیکن قرآن تو ہمیشہ تخلیق سماوات
و ارض پر غور کرنے کو کہتا ہے، تعقل، تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔
اور اعمال و افعال کے سلسلہ میں احصائیات پر زور دیتا ہے۔ قرآن نے
کائنات کی ریاضیاتی حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور دفترِ عمل میں جزو جز
کے حساب کے اندراج کا خیال پیدا کیا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کی قطعیت واضح کی
ہے اور بہت سے اور پہلو ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مسلمانوں میں سائنسی
نظر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو رویہ قرآن حکیم کا ہے نظامِ تعلیم
میں وہی رویہ ہمیں رکھنا چاہئے۔ قرآن پہلی منزل تزکیہ کی بتاتا ہے (ویزکیہم
ویعلّمہم الکتاب والحکمۃ) پر تعلیم کتاب کی (قرآن کتاب کے لفظ
کو وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے، صرف قرآن ہی نہیں بلکہ اور بھی اچھی
کتابیں یہاں مراد ہیں، صرف علم ہی نہیں بلکہ اس کی حکمت۔ یہاں مقصود
ہے۔ آپ یوں بھی سوچ سکتے ہیں یونانی کا لفظ آرٹس کے مترادف ہے یعنی
یعلّمہم الکتاب فلسفہ اور سماجی سائنسوں کے لئے، اور حکمت سائنس کے لئے۔
قرآن کو اسی لئے اُم الکتاب کہا گیا ہے کہ وہ ان تینوں کو ملا دیتا ہے، اسی
سے اس کو کتاب مبین بھی کہتے ہیں۔ بنیاد کی اہمیت اور اولیت ہمیشہ ماننی
پڑے گی۔ تزکیہ کے بغیر کچھ نہیں، ہو سکتا ہے جدید یورپ کا عیب یہ ہے کہ وہ
تزکیہ سے دور ہے اور ایشیا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم کن کن چیزوں سے
دور ہیں مگر بنیادی اقدار میں اب بھی ایشیا کو رہبری کا مقام حاصل ہے،
گو اجتماعی طور پر ہم پسماندہ ہیں۔

س۔ آپ کے خیال میں طلبا کی موجودہ بدنظمی کا حل کیا ہے؟

ج۔ اس کا سادہ سا جواب تو یہی ہے کہ اصلاح و تزکیہ کا کام
گھروں سے شروع کیا جائے اور دارالعلوموں تک پہنچایا جائے۔ تربیت و
تزکیہ از مہد تا لحد ضروری ہے۔ یونیورسٹی تو درمیانی منزل ہے۔ اس سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ داخلی تزکیہ کے لئے ماحول کو درست کرنا بھی ضروری ہے
گھر، بازار، دارالعلوم، سیاست کے میدان اور معاشی نظام۔ مجھے
یاد ہے ڈاکٹر گیان چند فرمایا کرتے تھے کہ مزمن خرابیوں کا علاج جزوی نہیں
ہو سکتا ہے، ہر پہلو کی درستگی کے لئے ایک ساتھ کوشش کرنی ہوگی اور یہ
بڑا معاملہ ہے لیکن یہ فرض بھی ہے۔

س۔ آپ کی نظر میں طلبا کے درمیان ٹیڈی ازم کی لہر کن اسباب

کا نتیجہ ہے ؟

ج ۔ سب سے پہلی وجہ سینما ہے، دوسری امریکن کومکس، تیسرے وہ معتوب مجلّے جو مغربی ممالک سے نکلتے ہیں، یہ خارجی اسباب ہوئے، داخلی اسباب اور خارجی اسباب کے لطیف پہلو بہت سے ہیں۔ مادیت صرف بدن پر زور دیا جاسکتا ہے جسم پر تاکیدی نشان اور ذہنی و روحانی کو کھلا دیں، ان اسباب کو دور کیجئے، تشدد کا رجحان ختم ہو جائے گا۔

س ۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مخلوط تعلیم اور اس سے بھی بڑھ کر مخلوط سماج، پورے معاشرے کی طرح تعلیمی اداروں میں طلبا کی بدنظمی کی بھی جڑ ہے ؟

ج ۔ بالکل صحیح ہے۔ میں نے جو امریکی تہذیب کی طرف اشارہ کیا تھا یا فلمی تہذیب کا نام جو میں نے فرض لیا تھا تو اس مادہ کی مخصوص بیماری یہی اختلاط جنس ہے۔ لیکن مخلوط تعلیم خرابی کی ایک صورت ہے اور ہماری تعلیم میں خرابی کی اور صورتیں بھی مضمر ہیں۔ ایک وجہ دوسری وجہ کو اور اُبھار دیتی ہے۔ طبی طور پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے، یعنی جسمانی، اخلاقی اور روحانی بیماریوں کے اسباب ایک دوسرے کے مددگار ہو کر زنجیری ردعمل پیدا کرتے ہیں اور ان کا دھماکا تباہ کن ہوتا ہے۔

س ۔ آپ نوجوانوں کو کوئی پیغام دینا پسند کریں گے ؟

ج ۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی سے پیغام دے لیکن فعل کے ساتھ قول کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر قول و فعل میں تضاد نہ ہو تو پیغام کا اثر ہوتا ہے۔ میں چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ موجودہ تقاضوں کو میں نے خاص طور پر سامنے رکھا ہے اور میرے سامنے اختصاصی طور پر وہ طلبا ہیں جو اردو پڑھنے والے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور فی الحال یہ لوگ مسلم ملت کے افراد ہیں :—

۱۔ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہئے کہ ہم مسلمان رہیں یا نہ رہیں اور اگر رہیں تو کیوں رہیں ؟

۲۔ اسلام ایک بہت بڑی دولت ہے لیکن اس کی خوبیوں کو جاننا چاہئے، جدید تقاضوں کی روشنی میں علوم اسلام کا مطالعہ کیجئے۔

۳۔ تعصب جاہلیت کو ترک کرنا ہوگا مگر رواداری کے ساتھ تہذیبی ضروری ہے۔ اسلام ساری انسانیت کا ورثہ ہے۔

۴۔ سادگی سیکھئے، سادہ زندگی، سادہ لباس، سادہ رہائش، ہمدردی اور قربانی کا مادہ پیدا کیجئے۔

۵۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے اور ہم اس ملک میں ہر جہت سے اعلیٰ ترین نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اسے دنیا کی رہبری کا مقام حاصل ہو جائے۔ نوجوانوں کو اس کے لئے ضبط و نظم اور قربانی سے کام لینا ہوگا۔

۶۔ تعلیم کے ساتھ کھیلئے مت اور تعلیم کے ساتھ ایماندارانہ رزق کی فکر کیجئے۔ محنت اور محنت اور محنت۔ میں ذہانت سے زیادہ محنت کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ ذہانت فطری ہے، محنت میں آپ کا بھی دخل ہے۔

۷۔ آرٹس کے طالب علموں کو سائنس سے دلچسپی لینی چاہئے اور سائنس کے طالب علموں کو آرٹس سے۔

۸۔ اُردو زبان اور ادب کو ایک بڑی فضیلت یہ حاصل ہے کہ عربی کے بعد ہماری تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ اسی کے آغوش میں ہے۔ اردو زبان و ادب کو ایک امانت سمجھئے اور اس کی بقا اور ارتقا کی فکر کیجئے۔

۹۔ تعلیمی زندگی کے دور سے ہی عملی زندگی کا پروگرام بنائیے لیکن شیخ چلی کی طرح نہیں۔ آج ہر شعبے میں پلاننگ کی ضرورت ہے۔ آپ اپنی تعلیم بھی ایک منصوبہ بندی کے ساتھ جاری رکھیں۔ آپ کو اپنی منزل گاہ کا پتہ ہونا چاہئے۔ آپ منجدھار میں یوں ہی کشتی چھوڑ نہ دیں، قطب نما بھی ساتھ لے لیں۔

۱۰۔ سوچنے کی عادت ڈالیے، ادب و شعر کے مطالعہ کے وقت، فلسفہ کے نکات سمجھتے وقت بھی اور سائنس کے معمل میں بھی۔ ان منزلوں کے علاوہ مختلف سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں سوچا کریں، جو سوچتا نہیں آدمی نہیں۔

ادارہ

پیدائش:- ۱۹ر اگست ۱۹۱۰ء میں قصبہ کاکو ضلع گیا میں پیدا ہوئے ۔

تعلیمی پس منظر:- ابتدائی درس والدہ ماجدہ سے حاصل کیا ۔ قرآن شریف مع ترجمہ، اردو، فارسی اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم والد بزرگوار اور چچا جان سے حاصل کی ۔ مونگیر ضلع اسکول سے ۱۹۲۶ء میں میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کرکے وظیفہ حاصل کیا ۔ ۱۹۲۸ء میں آئی ایس سی سائنس کالج پٹنہ سے سکنڈ ڈویژن میں پاس کرکے وظیفہ یاب ہوئے ۔ اس کے بعد ایم' بی' بی' ایس کے پہلے سال میں داخلہ لیا ۔ اور ۱۹۲۹ء میں اس کو پاس کرکے ایم' بی' بی' ایس کے دوسرے سال میں آگئے ۔ علیل ہوئے اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک علالت کے سلسلہ میں اودین ہی میں مقیم رہے ۔ صحت یاب ہوئے تو پٹنہ کالج میں بی اے آنرز انگریزی کے ساتھ داخل ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں شاندار کامیابی حاصل کرکے گولڈ میڈل اور کتابوں کا انعام لیا ۔ ۱۹۳۶ء میں اردو سے ایم' اے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا ۔ پٹنہ کالج میں ۱۹۳۸ء ہی میں اردو کے لکچرر ہوئے ۔ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایک پرمغز مقالہ لکھکر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ ۱۹۵۲ء ہی میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہوئے اور آج تک اسی جگہ پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔

شادی:- ۱۹۳۳ء کی ۲۵ر مئی کو قصبہ اردل ضلع گیا میں محترمہ شکیلہ اختر کے ساتھ شادی ہوئی ۔ چمن آرزو کو کوئی پھول نہ مل سکا ۔

تصنیفات:-

(الف) ڈرامہ - شہنشاہ حبشہ مکتبۂ اردو لاہور سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایکانکی ڈرامہ زوال کینٹش ہے۔

(ب) افسانے - منظر و پس منظر - ناشر - مکتبۂ اردو لاہور ۱۹۴۰ء

کلیاں کانٹے - " " ۱۹۴۱ء

انارکلی اور بھول بھلیاں - " اقبال بکڈپو پٹنہ - ۱۹۴۳ء

سیمنٹ اور ڈائنامیٹ - " ضلع شاہ آباد سے - ۱۹۴۷ء

کچلیاں اور بال جبریل - " ساتھی بکڈپو - ۱۹۶۰ء

(ج) ناول - حسرت تعمیر - " فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۱ء

(د) تنقیدی مجموعے - قدر و نظر - " فروغ اردو لکھنؤ - ۱۹۵۶ء

تحقیق و تنقید جدید - " کتابستان الہ آباد - ۱۹۶۲ء

کسوٹی - " رام نرائن الہ آباد - ۱۹۶۳ء

مطالعۂ اقبال - " موتی لال بنارسی داس - ۱۹۶۰ء

مطالعۂ نظیر - " موتی لال بنارسی داس - ۱۹۶۲ء

مزاج و منہاج - " موتی لال بنارسی داس - ۱۹۶۳ء

(ہ) تحقیقی تصنیف - بہار میں اردو ادب کا ارتقا ۱۹۵۸ء تک - " بنات خود - ۱۹۵۶ء

(و) شعری مجموعہ - انجمن آرزو - " سنگم کتاب گھر دہلی - ۱۹۶۴ء

زیر طبع اور زیر تصنیف کتابیں:-

(۱) کارواں (ناول) (۲) سپنوں کے دیس میں (کہانیوں کا مجموعہ، زیر طبع) (۳) تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ (۴) تازہ ترین شعری تخلیقات (جو عنقریب کتابی شکل میں شائع ہونے والی ہیں)۔

ان کے علاوہ مذہبی موضوعات پر کئی مضامین "الفضل" قادیان، وغیرہ میں شائع ہوئے، قرآن شریف کی کئی سورتوں کی تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا بیرسٹر پٹنہ کی ادارت میں ایک انگریزی رسالہ "ہندوستان ریویو" نکلا کرتا تھا اس میں شائع شدہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک تمام تبصرے انگریزی ہی کے ہیں۔ یہ تبصرے بیشتر اردو کی نئی کتابوں پر ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک "معاصر" پٹنہ کے اداریے مستقل تحریر فرماتے رہے، کئی ریڈیائی ڈرامے نشر ہو چکے ہیں۔ ادبی، سماجی، مذہبی اور قومی موضوعات پر سینکڑوں تقریریں ملک بھر میں کی ہیں۔

ساغر نئی پٹنہ

یک حقیقت بہ ہزار آئینہ تابان شدہ است

پروفیسر اختر قادری

پائندہ و زندہ باد اختر!

(۱)

یادوں کا غضب ہے تازیانہ — ماضی میں پلٹ گیا زمانہ
ہر گام پہ اک نیا نظارہ — ہر ساز پہ اک نیا ترانہ
بیدل ہمہ تیرگی جلوہ — عالم ہے کوئی نگار خانہ
سجاد خمار شب کے مارے — بھٹی کو ہیں صبحدم روانہ
فیضان جنوں سے خندہ بر لب — انداز تپاں ہے محرمانہ
ہر سمت جگا رہی ہے جادو — جوشش کی نوائے عاشقانہ
دھن اور کمال کو ہے لیکن — یہ شغل سخن ہے اک بہانہ
راسخ کو تلاش دیدہ ور ہے — ملتا نہیں ہمدم یگانہ
فریاد و امیں، آسی و نشتر — انداز ہیں سب کے عارفانہ
لبریز ہے موتیوں سے فن کے — استاد صفیر کا خزانہ
اعجاز ہے یہ آثم کے فن کا — مداح ہے اب بھی اک زمانہ
دلسوزی شاد نے غزل کو — بخشا ہے مزاج دلبرانہ
علامہ شوق نیموی کا — انداز سخن ہے عالمانہ
ہے بادۂ نو بہ جام اختر — عشرت بہ سبوئے مغانہ
آرائش بدر نے زباں کو — بخشا تب و تاب جاودانہ
آزاد کی نکتہ سنجیوں کا — دریائے سخن ہے بیکرانہ
پرواز خیال عرش پیما — اسلوب بیاں ہے معجزانہ
روشن نہ ہو کیوں ستارۂ اوج — نظمیں ہیں حیات کا فسانہ
مضطر کی متاع غم ہے کمیاب — ہر دل نہیں عشق کا نشانہ
ہیں عرش سخنوروں میں یکتا — اشعار ہیں ان کے والہانہ
کس حسن سے کرتے ہیں مبارک — گیسوئے عروس فن میں شانہ

(۲)

آیا ہے جو موسم بہاراں

چرکا ہے کچھ اور بھی دبستاں

ہیں رونقِ بزمِ خوش نوایاں — علامہ عظیم فخرِ دوراں
سرچشمۂ فیضِ عام ہیں وہ — میخانہ ہے وقفِ تشنہ کاماں
گلبانگ ہو یا نوائے بیدل — گلزار ہے کیا فضائے بستاں
ہے کلکِ سحر پر نغمہ آرا — مسلم کا کلام راحتِ جاں
نغمے ہیں ولی کے روح پرور — افکارِ جمیل سحر ساماں
بسمل ہیں سخنوروں میں محبوب — ہیں اہلِ نظر عطا پہ نازاں
چرچا ہے حمید کی غزل کا — مشہور عزیز ہیں سخن داں
پرویز سخن طراز شیریں — فرمودۂ زار حرزِ رنداں
واہی کا کلام زعفران زار — رضوی کو تلاش جامِ عرفاں
احمد ہیں بہ طرزِ نو سخن سنج — ہجور ہیں اور نوائے حجراں

(۳۳)

ہے بخت بہار کا جو یاور
ہیں ایک سے ایک یاں سخن ور

کچھ بات تو ہے کہ ہر زباں پر — ہے آج یہ ذکر اختر اختر
اللہ کی دین ہے جسے دے — ہے حسنِ قبول چیزے دیگر
برسوں کی ریاضت کا اثر ہے — کھلتا نہیں یوں کسی کا جوہر
خلوت میں وہی ہے مرکزِ شوق — جلوت میں وہی ہے زیبِ منبر
اعجاز اثر خطیب ہے وہ — باتوں میں ہے اس کی شہد و شکر
تمثیل فسانہ ناول اس کا — خوش وقت نہیں ہے کون پڑھ کر
مشہور وہ اہلِ علم میں ہے — نقاد و محقق و سخن ور
مانا مجھے حق نہیں ہے اس کا — دوں رائے کسی کے علم و فن پر
اک عمر سے اس کو جانتا ہوں — انساں نہیں دیکھا اس سے بڑھ کر
بالا قد و خوب روی و خوش خو — آئینہ جبیں، خجستہ پیکر
وہ اس کی نظر کی دلنوازی — وہ خندہ لبی روح پرور
وہ غیر کے غم پہ کڑھنے والا — احباب کا وہ رفیق و یاور

ہے دل سے دعا یہ قادری کی
پائندہ و زندہ باد اختر

ڈاکٹر یوسف خورشیدی

"خراجِ عقیدت"

ساقی وہ کام کر کہ ترا نام بھی چلے — محفل میں دورِ بادۂ گلفام بھی چلے
روشن دماغ جس سے ہو وہ جام بھی چلے — حاصل ہو کچھ سرور تو کچھ کام بھی چلے

بیٹھے ہیں رند جام بکف مدرسے میں آج
چھیڑ کا ذکر دے نور کا ظلمت کدے میں آج

ساقی اس انجمن میں کوئی باصفا نہیں — الفت نہیں کرم نہیں مہر و وفا نہیں
آواز دیجئے لاکھ کوئی بولتا نہیں — انسانیت کو چھوڑ کے دنیا میں کیا نہیں

نیکی کو ہے زوال بدی کو ہے کمال
اس میں وجودِ آدمی کا خال خال ہے

کہتے ہیں لوگ کھینچ مرقع خیال کا!! — دکھلا دے جلوہ پیکرِ علم و کمال کا
یوسف جواب کیا دے بھلا اس سوال کا — کہتی ہے عقل وقت نہیں قیل و قال کا

لیکن مصر ہے دل کی تمنا کہ بولئے
احساس فرض کا ہے تقاضا کہ بولئے

کہتی ہے یہ محبت اختر اورینوی — قرض انکی شفقتوں کا ادا کیجئے ابھی
ہر چند ہے بہار میں ہر سمت تیرگی — اس تیرگی میں بھی ہے مگر ایک روشنی

اختر ہے اس کا نام وہ تارا وطن کا ہے
اس دورِ بیکسی میں سہارا وطن کا ہے

فطرت نے اہلِ دل سے لیا عزم آہنی — اور صوفیوں سے مانگ لی ایماں کی روشنی
ایثار کی خلوص کی لے کے اک کنی — پھر گھولی اس میں عشق کی تھوڑی سی چاشنی

عقل و جنوں کا معتدل اک امتزاج ہے
اختر اورینوی کا یہی تو مزاج ہے

ارباب دل کو ان سے نئی زندگی ملی　　　فنکار کو شعور ملا آگہی ملی !!
تاریکیوں کو ذہن کی اک روشنی ملی　　　آشفتہ خو جو تھے انہیں سنجیدگی ملی

یوں کل تلامذہ پہ ہے احسان آپ کا
پھر بھی بقدرِ ظرف ہے فیضان آپ کا

ہے ذات ان کی معدنِ عرفان و آگہی　　　اک مکتبہ خیال کا اک عہد شاعری
ہیں خوش نصیب یوسفؔ و ممتازؔ زیادؔ بھی　　　جسکے رفیق وہ ہوں خوشا اس کی زندگی

یہ کم نہیں کہ عقلِ حکیمانہ ساتھ ہے
وہ ساتھ ہیں تو ایک تجانہ ساتھ ہے

شاعر بھی آپ ناقدِ شعر و سخن بھی آپ　　　گویا چمن بھی آپ بہارِ چمن بھی آپ !!
تحقیق کی نگاہ میں استادِ فن بھی آپ　　　یعنی خود اپنی ذات سے اک انجمن بھی آپ

طرزِ بیاں کو آپ کے تشبیہ کس سے دوں
تحریر اگر فسانہ تو تقریر ہے فسوں

اللہ ری ساحری کہ جو افسانہ بن گئی　　　ہر داستاں حدیثِ صنم خانہ بن گئی
فکرِ معاش بھی غمِ جانانہ بن گئی　　　جو شمع آئی سامنے پروانہ بن گئی

شعروں میں کیفیت نگہِ نیم باز کی !!
"مصرعے نہیں شکن ہیں حجاباتِ ناز کی"

اظہارِ فن و فکر میں ندرت انہیں سے ہے　　　سنگیں حقیقتوں میں لطافت انہیں سے ہے
جدت سے ہمکنار قدامت انہیں سے ہے　　　نبضِ ادب میں آج حرارت انہیں سے ہے

نکہت میں شعلگی ہے حلاوت گداز میں
روشن دیے ہیں انجمنِ سوز و ساز میں

بس جوشِ طبع طول نہ دے اس بیان کو　　　دے تہنیت بہار کو ہندوستان کو
کیا ہے جو آسمان کہا آسمان کو　　　اب کیا کہوں کہ ہوتی ہے لکنت زبان کو

نذرانہ خلوص و محبت قبول ہو
یوسفؔ کا یہ خراجِ عقیدت قبول ہو

لے ڈاکٹر ممتاز احمد شعبۂ اردو پٹنہ کالج سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو بی ان کالج۔

نیاز محمد

اختر اورینوی کا ادب دیکھتا ہوں میں
حیرت سے نظر کو بولتے جب دیکھتا ہوں میں

افسانہ، شعر، نظم، غزل، نقد، تبصرہ
تمثیل، داستان، یہ سب دیکھتا ہوں میں

انکسارِ نازِ حسن، ظہورِ نیازِ عشق
شرح و بیانِ مہر و غضب دیکھتا ہوں میں

تصویر خانۂ ادب دفن پہ ہے نگاہ
عیش و نشاط و رنج و تعب دیکھتا ہوں میں

طرزِ بیان ہے فکر و تخیل کا روبرو
نشرِ تصورات کا ڈھب دیکھتا ہوں میں

تمثیل کے وفورِ خطابت پہ ہے نظر
صنفِ غزل کی جنبشِ لب دیکھتا ہوں میں

دیوانہ کرتی ہے برلگی طلسمِ نظم کی
نغموں کا ارتفاعِ لہب دیکھتا ہوں میں

سرشاریِ ادیب ہے بادہ کشی بغیر
مستی بہ دورِ بنتِ عنب دیکھتا ہوں میں

روشن ہے کائنات، منور ہوئے ہیں ذرّے
الفاظ میں سے ذُناب وہ تب دیکھتا ہوں میں

پھر دیکھتا ہوں سازِ مجسم ہو نغمگی
پھر نغمگی میں سوزِ عرب دیکھتا ہوں میں

اختر اورینوی کے ادب میں جگہ جگہ
دستِ جنون و گردنِ شب دیکھتا ہوں میں

ہوش عظیم آبادی

اعترافِ ہنر

آتا ہے زندگی میں یہ لمحہ کبھی کبھی   سرشارِ جامِ فکر ہو جب ذوقِ شاعری
لوحِ تاثرات پہ ہے آج منجلی   نقشِ کمالِ حضرت اختر اورینوی

انوارِ علم و فن کو نمایاں کیے ہوئے
جس کا وجود صبحِ دبستاں لیے ہوئے

بزمِ ادب میں جس کا چھلکتا ہوا ایاغ   وجہِ سرورِ جاں، تو نشاطِ دل و دماغ
جس کی نگاہِ فکر ہے تنقید کا چراغ   کانٹوں میں جس نے پھول چنے درمیانِ باغ

جو رہ نمائے جذبۂ ذوقِ سلیم ہے
جو دہر شناسِ رنگِ جدید و قدیم ہے

شاعر، خطیب، شیوہ بیاں، صاحبِ قلم   عقدہ کشائے زلفِ معانی دمِ رقم
قرباں نگارشات پہ دنیائے کیف و کم   لفظوں کو تول کر جو کرے زندگی بہم

پیدا حقیقتیں ہیں فسانوں کی شان سے
کہتا ہے دل کی بات جو فن کی زبان سے

لہجہ وہ پُر وقار کہ جس میں جلالِ علم   حسنِ کلام وہ جو سراپا کمالِ علم
ہیں موشگافیوں پہ فدا قیل و قالِ علم   وہ نکتہ سنجیاں جو ہوئے ہیں جمالِ علم

کیونکر نہ چار چاند لگائیں صفات میں
سو انجمن ہے جذب اک اختر کی ذات میں

طینت ہے صاف مثلِ تجلیِ مہر و ماہ — جس میں نہیں ہے شائبۂ ریب و اشتباہ
دشمن ہو یا کہ دوست بہ دنیائے رسم و راہ — اک خاص رکھ رکھاؤ سے اٹھتی ہوئی نگاہ
شبنم، لطافتوں میں وہ نرمی مزاج کی
صبحِ چمن کی دھوپ ہے گرمی مزاج کی

سنجیدہ گفتگو میں بھی اندازِ دلنشیں — پیچیدہ مسئلوں پہ بھی ابرو پہ بل نہیں
قامت بلند اس پہ دمکتی ہوئی جبیں — اک انفرادیت ہے یہ جائیں جہاں کہیں
خوش وضعگی کو ناز ہے دامان و جیب پر
کھلتا ہے ہر لباس تنِ جامہ زیب پر

ہے اکل و شرب میں بھی نفاست کا اہتمام — شائستگیِ ذوق یہاں بھی ہے لاکلام
ظاہر ہر ایک گام پہ صد حسنِ انتظام — ہے تابناک خانۂ اختر کی صبح و شام
ہر بند و بست اپنا طریقہ لئے ہوئے
اک زندگی تمام سلیقہ لئے ہوئے

اتنے کمال پر بھی ہے اسدرجہ انکسار — دعوائے علم و فضل نہ پندار و اقتدار
کیا اس کو فکر لاکھ جہاں ہو پُر از غبار — رہتا ہے اپنی دھن میں جو ہوتا ہے مرد کار
تاریخ سازِ طبع کا رکنا محال ہے
عہد آفریں نگاہ کا جھکنا محال ہے

اہلِ وطن تمہاری یہ کاوش ہے یادگار — جو ہر شناسیوں سے اٹھا پردۂ غبار
ڈالو بصد خلوص و محبت گلے میں ہار — اختر کے روپ میں ہے تمہاری ہی تو بہار
ملتی ہے قسمتوں سے یہ دولت جہان میں
نازش ہے یہ دم ہے غنیمت جہان میں

صد شکر کچھ تو دور ہوئی اپنی بے حسی — اختر پہ اک نظر تو اٹھی ان کے جیتے جی
آتی ہے یاد دہوش بزرگوں کی زندگی — ناقدریِ وطن کا نشانہ ہوئے سبھی
ہم تو کسی کا نام بھی اب تک نہ لے سکے
حد ہو گئی کہ شاد کو بھی کچھ نہ دے سکے

بعد از ہدیہ سلام و دعا

پہلے دیباچۂ کلام سنو ۔ ۔ ۔ ہے جو منظور التزام سنو
خط تمہارا شرف کے پاس آیا ۔ ۔ ۔ اور انہوں نے مجھے بھی دکھلایا
پڑھ کے دل پر گذر گئی کیا کیا ۔ ۔ ۔ کب ہے یارا بیان کرنے کا
مختصر یہ کہ ایک تازہ خبر ۔ ۔ ۔ دے گئی یہ پیام کیف اثر
خیر سے صاحبانِ ذوق بہار ۔ ۔ ۔ "خواب خرگوش" سے ہوئے بیدار
شوق تخمہ نکالنے کا ہوا ۔ ۔ ۔ اک نئی طرح ڈالنے کا ہوا
عزم بے باک نے جو للکارا ۔ ۔ ۔ توڑ کر لائے چرخ سے تارا
پہلا اختر کا انتخاب کیا ۔ ۔ ۔ "مرد مسکیں" کو بے نقاب کیا

اف یہ تشہیر مرد غیرت دار
جائے عبرت ہے یا اولی الابصار

اس شرارت کے ذمہ دار ہو تم ۔ ۔ ۔ حق تو یہ ہے گنہگار ہو تم
حیف تم نے اسی پہ بس نہ کیا ۔ ۔ ۔ حکم لکھنے کا کچھ مجھے بھی دیا
کیا لکھے ایک شاعر مرحوم ۔ ۔ ۔ روح جس کی ہو کیف سے محروم
اہل برزخ بھی بولتے ہیں کہیں ۔ ۔ ۔ لب جاں کو کھولتے ہیں کہیں
شاعری ہے مری بہار میں دفن ۔ ۔ ۔ تھی جہاں کی اسی دیار میں دفن
اب تو میں ڈگر ماضی ہو لے ۔ ۔ ۔ خیر امر رضا پہ راضی ہوں
لکھ رہا ہوں میں نامۂ منظوم ۔ ۔ ۔ تا اشاعت سے رہے محروم

صرف احباب میں پڑھا جائے　　لطف شاید کچھ اس سے آ جائے

لکھنے والے بہت ہیں اختر پر　　ایک سے ایک ان میں بڑھ چڑھ کر

لیکن اے دوست انہیں سب کے سب　　ہوں گے مداح علم و فضل و ادب

انکا حلیہ نہ لکھ سکے گا کوئی　　ہے یہ تجویز میرے حصہ کی

کہ سراپا لکھوں میں اختر کا　　جس کا عنواں نیا ہو سرتاپا

بلکہ استاد بے نظیر ہیں وہ　　مایۂ ناز "حرف گیر" ہیں وہ

اپنے مقصد کے تکملہ کے لئے　　کام لیتا ہوں صرف ابجد سے

نفس مطلب پہ اب میں آتا ہوں
شعبدے حرف کے دکھاتا ہوں

اختر نامہ

ایک مرد جمیل ہیں اختر　　کیا جواں "شکیل" ہیں اختر

علم و فضل و ادب کے دفتر ہیں　　"شعر دل" ہیں "فسانہ پیکر" ہیں

طول قامت کا حال کیا ہو رقم　　ہے الف میں کھڑا زبر مدغم

بال سر پر کھڑے پڑے ہر دم　　زبر و زیر و پیش کا عالم

حائے حطی سے ہیں مشابہ کان　　ہیں سر جیم ابروؤں کے نشان

چشم جادو میں وہ دل آویزی　　منفعل جس سے صاد تبریزی

دال اور ذال آنکھ کے گوشے　　موئے مژگاں ہیں شین کے شوشے

پتلیاں دونوں ثابت و سیار　　نقطہ ہائے حروف نقطہ دار

ایک نتھنے کو "ہ" اگر کہئے　　دونوں نتھنے ہوئے دو چشمی "ھے"

مونچھ مقصور و مختصر ایسی　　جیسے تشدید ہو مگر الٹی

ہونٹ دونوں ہی نیچے اوپر کے　　یا سیدھی ہے ایک الٹی "بے"

دہن تنگ "میم" یا فوقی　　اور زبان گویا "لام" لا ہوتے

دانت مضبوط ہیں سخن کے امین　　متصل جیسے ہوں کئی "سین"

ریش خطی وہ روئے انور پر　　ہمزۂ بے شمار کا لشکر

کیا کلائی نے شکل پائی ہے ‌ ‌ ‌ کاف بے مرکز کلائی ہے

دیکھئے غور سے شکم اور ناف ‌ ‌ ‌ دائرہ ایک ہے تو اِک سرِ قاف

طا د ظا کے سرِ عمود بہم ‌ ‌ ‌ ہوں، تو بن جائیں ساق و پا و قدم

اب کہاں تک کروں گل فشانی
وقت کوتاہ و "جسم" طولانی

قبل اس کے کہ خط کو ختم کروں ‌ ‌ ‌ کیوں نہ تھوڑی سی معذرت کر لوں

بارے اختر کا ہے مقام بلند ‌ ‌ ‌ ہے جہانِ ادب میں نام بلند

میرے یہ چند سرسری اشعار ‌ ‌ ‌ طبعِ نازک پہ ہو نہ جائیں بار

حال میرا تباہ ہے ڈر سے
کر رہا ہوں خطاب اختر سے

اے "شمیم" ریاضِ زیبائی ‌ ‌ ‌ اخترِ آسمانِ "رعنائی"

دل ترا پُر ہے "سوز" الفت سے ‌ ‌ ‌ دوست احباب کی محبت سے

ہے یہی باعثِ قلندر بخش[1] ‌ ‌ ‌ جرم سے میرے درگذر کر بخش

اس کی پاداش میں عذاب نہ کر
"مجھ سے" للہ "اجتناب" نہ کر

طرزِ غالب میں لے خجستہ کام ‌ ‌ ‌ ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام

بال جتنے ہیں فرقِ اختر پر ‌ ‌ ‌ ضرب اتنے ہی سے انہیں دیکر

اس طرح سے جو اس کا حاصل آئے ‌ ‌ ‌ اتنے ہاتھوں میں یہ رسالہ جائے

حوصلے دل کے بارہا نکلیں ‌ ‌ ‌ ایسے نمبر ہزارہا نکلیں

ملک اختر شناس ہو سارا ‌ ‌ ‌ ضو فگن تا ابد ہو یہ تارا

چھاؤں تم کو رضا میسر ہو ‌ ‌ ‌ بعد اس کے تمہارا نمبر ہو

لکھ چکا بس مجھے جو لکھنا تھا
ختم کرتا ہوں خط فقط بیکے[1]

---

[1] شیخ قلندر بخش کا تخلص "جرأت" تھا اسی رعایت سے میں نے "جرأت" کی جگہ پر قلندر بخش کی ترکیب وضع کی ہے اور اس کی حیثیت صرف "ایجادِ بندہ" کی ہے۔

قوس حمزہ پوری (مرحوم)

یک یوسفے ست رونقِ صد کاروانِ علم

اے ارسطو بمکتبِ تو عشر خوانِ علم
سیرِ صباح کودکِ تو ہفتخوانِ علم

شایستہ خوے ڈاکٹر اختر اورینوی
تسبیح خوانِ خلقِ تو کروبیانِ علم

طرزِ نگارشِ تو دہد در ادب رواں
سحرِ خطابہ ات کند الکن زبانِ علم

شد یونیورسٹی زکمالِ تو سربلند
صد افتخار فیضِ تو بر دودمانِ علم

در فلسفہ تعقلِ تو فکرِ بوعلی
روی صفت تصورِ تو زینتِ اذانِ علم

رنگینیٔ خیالِ تو در مصرِ انتخاب
یک یوسفے ست رونقِ صد کاروانِ علم

تحقیقِ لازوالِ تو سحرِ مبین فنے
تخلیقِ بے مثالِ تو اعجاز شانِ علم

حفظِ سکندر آئینہ جام از برائے جم
شد بہرۂ تو خامہ گوہر فشانِ علم

غیر از دعا چہ قوس نگارد بمدحِ تو
اے سایۂ تو خانہ امن و امانِ علم

شعیب راہی

اختر اورینوی

(۱)

مرے رفیقو مرے دوستو بتاؤ تو
یہ کون ہے جو ابھی اس طرف سے گذرا ہے
میں جنگلوں کا پہاڑوں کا رہنے والا ہوں[1]
مرے لئے تو ہر اک فرد اجنبی سا ہے

(۲)

مرا دیار نہیں آشنا تکلف سے
میں شہر داورِ نو کے آداب سے نہیں واقف
میں ایک سادہ غریب الوطن مسافر ہوں
طریقِ محفلِ احباب سے نہیں واقف

(۳)

کسی کا لطف و کرم میری رہبری کر دے
کسی کے دستِ مسیحا سے ہو شفا میری
کوئی تو آئے مرے درد کا شریک بنے
طبیب کوئی بنے جس سے ہو دوا میری

(۴)

عظیم آباد کی گنجان شاہراہوں پر
جہاں رفیق نہ تھا کوئی غم گسار نہ تھا
کبھی تو اپنے جنوں نے مجھے سہارا دیا
کبھی خود اپنی ہی ہمت پہ اعتبار نہ تھا

[1] پلاموں جنگلوں اور پہاڑوں میں آباد ہے۔

(۵)

میں ایک مفلس و نادار علم کا طالب
کہ جس کو کوچۂ دانش وراں میں لے آئی
فرازِ کوہِ پلاموں سے کھینچ کر تقدیر
اک اتفاق کہ اس گلستاں میں لے آئی

(۶)

مرے رفیقو، مرے دوستو، مگر اکثر
مری فسردہ خیالی مجھے ستاتی تھی
میں یوں تو اپنی طلب میں تھا مستقل لیکن
مری شکستہ مقالی[عہ] مجھے ستاتی تھی

(۷)

مگر وہ دستِ عنایت کہ جس کے سائے میں
تھکے تھکائے مسافر سکون پاتے ہیں
مجھے بھی اپنے ہی سائے میں لے لیا اس نے
قدم پہ جس کے فرشتے بھی سر جھکاتے ہیں

(۸)

میں ایک ذرّہ پہاڑوں کا سنگ ریزہ تھا
اُنھی سے ذرّہ ناچیز، آفتاب ہوا
"پراس"[ےَ] رنگ تو دیتا ہے، بو نہیں دیتا
چھوا جو اُس نے تو ہم رتبۂ گلاب ہوا

(۹)

مرے رفیقو، مرے دوستو، ذرا دیکھو
وہی ہے، جو کہ ابھی اس طرف سے گذرا ہے
میں جنگلوں کا، پہاڑوں کا رہنے والا ہوں
اسی نے مجھ کو گلے سے مگر لگایا ہے

(۱۰)

زمین والوں پہ جو کوئی مہرباں ہوگا
خدا بھی اسکو نوازے گا مہرباں ہو کر
جھکا ذہی سے ہوئی ہیں بلندیاں پیدا
زمیں جو ہوگا، وہ اٹھے گا آسماں ہو کر

ےَ "پراس" ایک درخت ہے جس کا جنگل پلاموں میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ خزاں میں اس پر بہار آتی ہے۔ اس کا پھول بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہوتا ہے، مگر خوشبو نہیں ہوتی۔

عہ شعیب راہی صاحب کی زبان میں ہلکی سی لکنت ہے، گو وہ شعر اس ترتیل سے پڑھتے ہیں کہ ان کی لکنت ان کے لئے فایدے ہی کی چیز بن جاتی ہے۔ —————— ادارہ

اخترِ ادب

ظفر حمیدی

وہ آسمانِ ادب کا ہے اخترِ تاباں — جسے زمیں نے پکارا تھا ایک دن "اختر"

ملی تھی جس کو ازل سے امانتِ تخلیق — بنا وہ رشکِ دبستاں بہ فیضِ خونِ جگر

وہ رازدارِ خرد ہے مگر جنوں کا امیں — کمالِ علم کی غماز جس کی فکر و نظر

عروجِ آدمِ خاکی کا اعتماد لئے — جبیں میں اپنی جگائے ہوئے ہے نورِ سحر

ادب میں جس کے روایت کا احترام بھی ہے — عمل میں جس کے جھلکتا ہے اعتدالِ نظر

فروغِ نطق میں رقصاں ہے لحنِ داؤدی — ہے ذات جس کی ز سرتا قدم حسین پیکر

تخیلات کی دنیا سمیٹ کر جس نے — تمام صنفِ ادب کے سجا دیے دفتر

ہے خوشگوار تاثر کلام کا جس کے — ہر ایک مدرسۂ فکر کے سخنور پر

نقیبِ خیر ہے جو کارزارِ ہستی میں — جو شاہراہِ عمل کا ہے سایہ دار شجر

قدم سے جس کے لپٹتی ہے کہکشانِ ادب
ہے بزمِ ناز میں اس کی نیاز کیش ظفر

صابر آروی

جنبشِ نوکِ قلم کی ہے ضرورت پھر آج

اخترؔ اورینوی کے نام

"درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا"
ذہن پہ چھانے لگا ایسے خیالوں کا دھواں
بہتے دریا کی روانی تو نہیں تھم سکتی
چادرِ آب پہ سو جاتی ہے گو موج رواں

یوں تو کتنے رہِ ہستی سے گذرنے والے
راہبر آئے، گئے، نقشِ قدم چھوڑ گئے
محفلِ زیست میں دو پل کا اُجالا بھی ہوا
پھر بھی رشتۂ امید و وفا توڑ گئے

اُن کا غم، اِن کا گلہ، اُن کی شکایات حسیں
لوگ سنتے ہیں فقط درد کی لذّت کیلئے
پھر بھی جیتے ہیں کہ کچھ پاسِ وفا رہ جائے
غم پہ غم سہتے ہیں اک لفظ "رفاقت" کیلئے

زندگی "درد" ہے اور "درد کا احساس شدید"
رہگذاروں میں بگولے بھی ہیں ویرانے بھی
انگلیں بھرے جو دیدے ہیں بہت کم ایسے
سامنے یوں تو چھلک جاتے ہیں پیمانے بھی

اپنے احساس کی قندیل جلا کر تو نے
ادب و فن کو نئی فکر و نظر بخشی ہے
جس پہ چلتا ہے ہر اک راہرو راہِ حیات
تو نے اخترؔ وہ زمانے کو ڈگر بخشی ہے

"جذبۂ شوق" کو "پابندِ وفا" کر لینا
دیکھنے والے ترا ذوقِ ہنر دیکھیں گے
نسل در نسل تلک راہروانِ منزل
نقش پا کے لئے وہ تیری ڈگر دیکھیں گے

جنبشِ نوکِ قلم کی ہے ضرورت پھر آج
منتظر ہیں کئی عنوان فسانے کے لئے
اہلِ محفل کی نظر اٹھی ہے تیری جانب
گیسوئے وقت بھی محتاج ہے شانے کیلئے

اپنے ترکش کو سنبھالے رہیں اغیار یونہی
صید آزاد ہے تو، زد سے گذر جائے گا
گل تابندہ ہے، تابندہ رہے گا ہر دم
تو زمانے کی ہوا کھا کے سنور جائے گا

نذرِ اختر

غبارؔ بھٹی

بہرِ تقلیدِ سخن انجمنے ساختہ اند چیدہ از طرزِ تو گلہا چمنے ساختہ اند
عام شد ذوقِ پرستاری طرزِ سخنت گنجے نیست کہ زیباں وثنے ساختہ اند
تازہ کردند دگر رسمِ براہیمی را کعبۂ شعر و سخن در وطنے ساختہ اند
چوں نہ گویند کلیمِ عجمت اہلِ سخن پئے معراجِ تو طورِ سخنے ساختہ اند
از پئے دیدۂ صاحب نظراں می بینم بسرِ صفحۂ گل دیا سمنے ساختہ اند

خاکِ کوئے رہِ اخترؔ کہ دریں عہد غبارؔ
از سرِ صدق بسے ہیچ منے ساختہ اند

ظہیب صدیقی

تجھ سے حیاتِ اردو

کتنے دن گذرے ابھی بھی ہے مجھے وقت یاد — بزمِ اردو میں فروکش تھے ہزاروں افراد
شور برپا تھا کہ اب بزم کا آغاز کرو — سامعیں دینے کو تیار تھے داد بے داد
آخرش بزم میں تقریر کا آغاز ہوا
اور ہر فرد وہاں گوش برآواز ہوا
زورِ گفتار پہ تھا ناز جنہیں وہ آئے — بات ہنگی تھی اور دور کی کوڑی لائے
پھر بھی اس بزم میں ہر سمت سے ہر سامع سے — "بیٹھ بھی جایئے" "چپ رہیے" ملی یہ رائے
ایک اک کرکے سبھی جادو بیاں آتے گئے
سامعیں "داد" سے اپنی انہیں گرماتے گئے
دفعتاً بزم میں ہر سمت خموشی چھائی — سب کی آنکھوں میں عقیدت کی کرن لہرائی
میں نے اسٹیج پہ ڈالی جو نگاہِ حیرت — مسکراتی ہوئی اک صورتِ زیبا پائی
حاضریں کہنے لگے کانوں میں جھک کر صاحب!
شور مت کیجئے اب آگئے "اختر صاحب"
رخِ پرنور پہ پھر ابھری تبسم کی سحر — لب سے جھڑنے لگے الفاظ کے تابندہ گہر

سامعین نعرۂ تحسین میں بے ہوش ہوئے   آفریں! آفریں!! اے اختر اردو پرور

تیری تقریر میں کیا راز ہے کیا جادو ہے
دل ہر سامع ہی جذبات سے بے قابو ہے

ایک توگل کے چٹکنے کی سی آواز حسیں   اس پہ پھر لہجہ حسیں بات کا انداز حسیں
نغمگی ایسی تھی ہر لفظ کے ٹکرانے میں   چھیڑ دے جیسے مغنی کوئی اک ساز حسیں

سامعیں فرط عقیدت سے ہوئے مہر بہ لب
بزم میں بیٹھے رہے تہ کئے زانوئے ادب

شستہ و صاف و حسیں لفظ کا اک سیل رواں   جملۂ چست میں کتنے ہی مطالب کا گماں
موج الفاظ میں اس درجہ سلاست جیسے   سطح گنگا پہ پھسلتی ہوئی کرنوں کا سماں

ایسی برجستگی لفظ کہ اللہ اللہ!!
سب کے ہونٹوں پہ فقط فقرۂ سبحان اللہ

بزم آوازمیں غنچوں کے چٹکنے کی صدا   اور کبھی پھول پہ شبنم کے ٹپکنے کی صدا
طرز گفتار میں شیرینی و شوخی جیسے   گلستاں میں کسی بلبل کے چہکنے کی صدا

دم بخود ہو کے سبھی نغمۂ جاں سنتے رہے
یعنی اقبال کی غالب کی زباں سنتے رہے

زنگ آلود ہے گو آج مری نوک قلم   آج گو ہند میں اردو پہ ہزاروں ہیں ستم
پر تو زندہ رہے اے اختر اردو پرور   زخم اردو کیلئے تیری زباں ہے مرہم

تیری گفتار سے ظاہر ہیں صفات اردو
تو ہے اردو کے لئے تجھ سے حیات اردو

ارمان نجمی

مینارۂ روشن

اے اخترِ تابندہ تری ذات گرامی
اس دورِ فرومایہ میں ہے کتنی غنیمت

توصیف کی محتاج نہیں گرچہ تری ذات
بخشی ہے مجھے لوح و قلم نے یہ سعادت

اے تو کہ ترے دم سے ہر اک بزم میں رونق
اے تو کہ سخن میں ترے اک عالمِ لذت

مینارۂ روشن ہے تو اک علم و ادب کا
سینے میں چھپائے ہوئے عرفان کی دولت

تو ایک تمدن ہے تو اک مدرسۂ فکر
تجھ سے مری مٹتی ہوئی تہذیب کی عظمت

یہ بھی دلاویزیٔ قامت کی درازی
ہے رشک کے قابل تری مردانہ وجاہت

شخصیتِ رعنا میں تری شان غضب کی
بشرے سے ٹپکتا ہے ترے حسنِ متانت

تقریر کا میداں ہو کہ تحریر کا قلزم
دونوں ہی پہ حاصل ہے برابر تجھے قدرت

سرشار جو ہو جاتا ہے سامع تو عجب کیا
چھلکے ہے تری باتوں سے صہبائے لطافت

اک بولتا جادو ہے کہ رس گھول رہا ہے
کیا چیز ہے واللہ تری سحرِ خطابت

نظموں میں تری غنچۂ نورس کی جوانی
غزلوں میں تری عارضِ گل گوں کی صباحت

پھونکی ہے تری سحر طرازی نے ہمیشہ
افسانوں کے قالب میں بھی اک روحِ حقیقت

مضمون کی بلندی تو تخیل کی جہت میں
رہتی ہے نمایاں ترے افکار کی رفعت

اعجاز ہے اک یہ بھی تری دیدہ وری کا
آنکھوں کو دکھاتی ہے جو آواز کی صورت

ہر صنف میں ہے یوں تو ترا رنگ نرالا
لیکن تجھے بخشیں گے فسانے ابدیت

اللہ کرے تجھ کو عطا عمر ہزاری
کرتا رہے تو علم و ادب کی یونہی خدمت

ارماں کی دعا خالقِ باری سے یہی ہے
اختر کا زمانے میں رہے نام سلامت

قطعہ تاریخ

اختر ما، اورینوی نسبت | پیکر حلم، اہل فن و ہنر
مہر اوج سپہر بزم ادب | بہ ریاض سخنوری گل تر
طبع روشن، منیر صورت مہر | فہم و ادراک، جوہر انور
بہ طلاقت، نظیر او مشکل | بہ صحافت، جواب او کمتر
حسن اخلاق، از رخش پیدا | مہر و الطاف، می چکد ز نظر
صوت دلکش، ممد گویائی | سیل مضموں کشد ز بحر گہر
نظم و نثرش، امین راز ادب | دارد اقلیم علم، زیر اثر
نثر باشد جواب کاہکشاں | نظم، دلدوز مثل تیر و تبر
می نویسند از محامد او | صاحبان کمال و اہل نظر
ایکہ دارد ثنا ز سندی او | گرچہ بے مایہ باشد و احقر

دم طبع شمارہ گفت قتیل
آمد، آمد محامد اختر

١٣٨٤ ھ

جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

جناب سیّد وزارت حسین

میرا بیٹا

اختر احمد سلمہ سنہ ۱۹۱۰ء کے ماہ اگست میں بمقام کہاکو ضلع گیا پیدا ہوئے۔ یہ میرا پہلوٹھا بیٹا ہے جسے میری اہلیہ اوّل خدیجہ عرف شمسہ مرحومہ کے بطن سے ہماری شادی کے چھ برس بعد اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ بچپن ہی سے اختر احمد سلمہٗ سلیم الطبع اور ماں باپ ہی نہیں بلکہ سارے بزرگوں کے اطاعت گذار ثابت ہوتے رہے ہیں۔ یہ خوبی اُن کی والدہ مرحومہ میں بھی تھی۔ عزیز موصوف نے اپنے استادوں کی بھی ہمیشہ فرماں برداری کی۔

سنہ ۱۹۱۷ء کا ایک واقعہ ہے کہ وہ میرے اور اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ مونگیر میں تھے۔ اکثر میری پسند کی سبزی کریلہ میں گوشت ڈال کر پکایا جاتا تھا۔ مونگیر میں کریلہ کو ایک مفید سبزی سمجھا جاتا تھا اس لئے اختر سلمہ کو بھی کھانے کی تحریک کرتا تھا۔ مگر اُن کو یہ ترکاری تلخی کی وجہ سے ناپسند تھی۔ تاہم طبیعت میں اس قدر فرماں برداری تھی کہ میری تحریک پر بظاہر وہ کھاتے جاتے تھے لیکن میری نظر بچا کر اُسکو گراتے جاتے تھے۔ جب یہ بات مجھے معلوم ہو گئی تو میں نے پھر کھانا ہی چھوڑ دیا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں جبکہ اختر احمد سلمہ ہم لوگوں کے ساتھ مونگیر ہی میں تھے یہ میعادی بخار میں مبتلا ہوئے۔ ڈاکٹری علاج تھا۔ دوائیں ہر قسم کی بلا عذر پیتے رہے۔ مگر دودھ اشتہا کی کمی سے کھانا نہیں چاہتے تھے۔ معالج کا تقاضہ تھا کہ کسی طرح دودھ ضرور پلایا جائے اس لئے دوا ہی کے نام سے دوا کے چھوٹے گلاس میں دودھ دیا جانے لگا۔ اس شکل میں دودھ چار پانچ گلاس بھی بے عذر دیا جاتا تو پی جاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی یہ بھی کہتے کہ اتنی دوا ڈاکٹر کیوں پلاتے ہیں

سنہ ۱۹۲۵ء میں اُن کی والدہ مرحومہ اپنی آخری بیماری کے علاج کے لئے مونگیر ہی میں میرے ساتھ تھیں۔ اختر سلمہ وہیں ضلع اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ مجھکو مونگیر کے راجہ صاحبان کے (جن کا میں ملازم تھا) ایک ۳۰ لاکھ کے مقدمہ کی پیروی کیلئے پریوی کانسل لندن جانا پڑا۔ اختر سلمہ کی والدہ کی شدید بیماری کے سبب سے اپنا ولایت جانا میں نے اُن پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ اختر احمد سلمہٗ کو بھی اپنے ولایت جانے کی خبر مرحومہ کو دینے سے منع کر دیا تھا چنانچہ اختر سلمہ کا ایک خط مجھے لندن میں ملا تھا جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے میرا ولایت جانا دریافت کرنے کے باوجود اُن پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ اُسی بیماری میں میرے غائبانہ ہی میں رحلت پا گئیں اور مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ اختر احمد سلمہ نے میرا ولایت جانا بعد میں وفات سے پہلے اُن پر ظاہر کیا تھا یا نہیں۔

پروفیسر عبد المنّان بیدلؔ عظیم آبادی
(سابق صدر شعبہ ہائے اردو و فارسی پٹنہ کالج)

اختر سلمہ

قارئین کرام کو ان چند سطروں میں نہ اختر اورینوی کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات کی طویل فہرست ملے گی، نہ اُن کے تنقیدی مضامین پر کوئی تبصرہ، اور نہ اس فن دقیق کی کوئی تحقیق۔ ذیل کی سطروں میں اختر اورینوی کے ڈراموں اور ناولوں کا کہیں نام لکھا نہ ملے گا۔ اختر کی شاعری کی خوبیوں کے متعلق بھی ذیل کی سطروں میں آپ کچھ نہ دیکھیں گے۔ ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ ان سطروں میں ڈاکٹر اختر، شاعر اختر، ادیب و انشا پرداز اختر، ڈرامہ نگار اختر، ناول نویس اختر، پروفیسر اختر، معروف و مشہور مفکر اختر کے متعلق کوئی قابل توجہ چیز نہ ملے گی۔ ان سطروں میں تو عزیز از جان اختر سلمہ کے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ کے متعلق راقم السطور اپنے جذبات اور منتشر خیالات پیش کر رہا ہے۔

اگر آپ نے کسی کورٹ کے جج کو صرف عدالت کی بلند پایہ کرسی پر، وردی لباس میں، معنوی متانت و سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا ہے، اُن کے فاضلانہ فیصلوں کو پڑھا ہے، اُن کی قانونی موشگافیوں کا جائزہ لیا ہے تو آپ نے جج موصوف کو گویا نہیں دیکھا اور اس لئے اُن کے کردار و اطوار اور سیرت و طینت کے متعلق آپ کی رائے کا صحیح ہونا ضروری اور لازمی نہیں۔

اگر آپ نے واعظ شہر کو صرف مسجد کے منبر پر ہی دیکھا ہے، بڑے بڑے جلسوں کو بہ آواز بلند دل پسند خطاب کرتے ہوئے سُنا ہے اور اُن کی خلوت خاص میں اُنھیں جھانک کر کبھی نہیں دیکھا ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ واعظ موصوف کے اخلاق حسنہ اور افعال ستودہ کے متعلق آپ کی رائے کا دور از واقعہ اور بعید از حقیقت ہونے کا امکان صاف نظر آتا ہے۔

اس موقع پر حافظ کا ایک شعر پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے، لیجیے، آپ بھی لیجیے: ....

واعظ شہر کہ مردم ملکش می گویند
قول ما نیز ہمان است کہ او مردم نیست

اور اُسی شاعر شیرازی کا یہ شعر بھی تو آپ نے سُنا ہوگا:۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

دیکھیے اشہب قلم کدھر جا رہا تھا کہ کدھر چلا گیا! اچھا، پھر اُسی موڑ پر واپس لا رہا ہوں ——— کہہ یہ رہا تھا کہ جلوت کا انسان دوسرا ہوتا ہے اور خلوت کا دوسرا۔

کلیم الدین احمد جیسے تنقید نگاروں نے، اختر انصاری جیسے انشا پردازوں نے، احتشام حسین جیسے سخن سنجوں نے، اردو دنیائے ادب نے ڈاکٹر اختر اورینوی کو اُن کے مشہور افسانوں میں، اُن کے دلکش ڈراموں میں، اُن کے پسندیدہ ناولوں میں، اُن کے متوازن اور معتدل تنقیدی مضمونوں میں، اور اُن کی نظموں اور غزلوں میں

دیکھا ۔۔۔ مگر، معاف کیجئے ۔۔۔ مجھے کہہ لینے دیجئے کہ اس خوش نصیب یا
راقم السطور کے سوا بہت کم لوگوں نے اختر سلمہ کو جانا پہچانا ۔۔۔ یہ
شیخی نہیں، تعلی نہیں، شاعری نہیں، عبارت آرائی نہیں ۔۔۔ حقیقت
ہے ۔۔۔ مجھے فطرت نے ۔۔۔ مشیت الٰہی نے اسباب تکوینی نے حالات نے
ماحول نے، تقدیر نے، تدبیر نے، اس کا موقع دیا کہ اختر سلمہ کو نزدیک
بلکہ بہت نزدیک سے دیکھوں ۔۔۔ میں نے عزیز موصوف کو جیسا دیکھا
آپ کو بھی دکھانا چاہتا ہوں، میں نے ان کو کیسا پایا آپ کو بھی بتانا چاہتا
ہوں ۔۔۔ میں اختر اور بیوی کی سچی تصویر پیش کر رہا ہوں ۔۔۔ آپ
دیکھتے ہی ۔۔۔ سبحان اللہ ۔۔۔ کہہ اٹھیں گے ۔۔۔ انشاء اللہ۔

صائب نے ۔۔۔ یہ شعر لکھ تو دیا کہ

چوں بلائے می شود نازل حزیں جبیں بر جبیں
در بہ روئے میہمان غیب بستن خوب نیست

مگر ضرور جانتا ہوگا کہ صعوبت فراموشی، اور بلاکشی کوئی بچوں کا کھیل
نہیں، بڑے دل گردے والوں کا کام ہے، کہاں تک خود شاعر نے
اس پر عمل کیا ہوگا خدا معلوم۔ مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ اپنی زندگی میں
اختر سلمہ نے فلک کج رفتار کی بلا باریوں پر کبھی منہ نہ بنایا۔ مصائب
غیر اختیاری کو "مہمان غیب" ہی سمجھا ۔۔۔ اختر سلمہ کی زندگی کی پہلی
منزل بڑی کٹھن تھی ۔۔۔ والدہ بیمار تھیں، مہلک اور سخت خدمت
طلب بیماری طویل تھی، سعادت مند اختر مادر مہربان کی تیمارداری
کرتے کرتے خود بھی ایک شدید مرض کا شکار ہوگیا ۔۔۔ آپ سنیں گے کہ ماں
کی تیمارداری نے، اور خود اپنی بیماری نے مستقل مزاج اختر کو کیا دیا؟
تسلیم و رضا کا خوگر بنادیا ۔۔۔ صبر و ضبط کی طاقت عنایت کی، دل درد مند
دیا۔ اور امتحان و ابتلا کے وقت بھی شاد و خرم رہنا سکھا دیا۔

ذیل کا شعر اختر سلمہ کے پڑھنے کا ہے! ۔۔۔

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیش ہمت ما ہر چہ آمد بود مہمانے

اوائل عمر کی ریاضت اضطراری اور غیر اختیاری نے
اختر بلند اختر کو مرد مومن، بنادیا۔ اور سچے معنوں میں انسان
بنادیا۔

جسمانی کمزوری اور بیماری اکثر لوگوں کو چڑچڑا، اور کھردرا
بنا دیتی ہے، مگر دین و مذہب کے گہوارہ کا پرورش یافتہ اختر
باغ و بہار ہے۔ خار زار آلام سے گزر کر اختر شجر ثمر فشاں بن گیا ہے۔
خالق حقیقی کا بندۂ مطیع اختر، مخلوق الٰہی کا ہمدرد اختر، خلیق ہے،
اس کے خلق عام کا شہرہ ہے۔ اس کی خاطر داریوں سے احباب بھی
خوش اور اغیار بھی خوش۔

خدا کا شکر ہے کہ مصائب کے تسلسل نے بھی اختر کی طبیعت
تبسم آفریں پر اثر نہ کیا، ان سے ملئے تو یہ تبسم بر لب ملیں گے، گرم جوشی
سے ملیں گے، ہمدردی کرنا چاہیں گے، مدد ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ
کریں گے ۔۔۔ آپ مصیبت زدہ ہیں، غم زدہ ہیں، طالب امداد ہیں،
مگر آپ کی خواہش کے مطابق آپ کی مدد نہیں کر سکتے ہیں، آپ سے معافی
چاہتے ہیں، آپ خفا ہو جاتے ہیں، تلخ و تند گفتگو پر اتر آتے ہیں
ارادتاً نہ سہی اضطراراً ہی سہی، ایسے موقع پر بھی خندہ جبیں اختر
مسکرا کر صائب کا یہ شعر پڑھنے لگتے ہیں :۔

گفتۂ دل شکناں بہ کہ فراموش کنی
ایں گہر نیست ندارد کہ تو در گوش کنی

اختر کو بہت قریب سے دیکھنے والا جانتا ہے کہ ۔۔۔ اقربا اور اعزا
کی خاطر کرنے والا اختر، بیکسوں اور بے بسوں پر رحم کھانے والا اختر،
دوستوں کو سہارا دینے والا اختر، دشمنان بد باطن کے دلوں کو بھی
موہ لینے کی سچی کوشش کرتا رہتا ہے، اس کا ایمان ہے کہ دلوں کو فتح
کرنا اصلی جہاد ہے اور دل داری و دل جوئی حج اکبر ہے، کسی شاعر
نگار نے لکھا ہے کہ :۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

میں جانتا ہوں کہ اختر کے اوصاف حسنہ مذہبی واقفیت کی وجہ
سے پروان چڑھے، اختر کی مذہب دوستی کا نتیجہ ہے دینی ماحول
میں رہنے اور تربیت پانے کا۔ وہ نماز پڑھتے ہیں، قرآن شریف کی

تلاوت کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں انھیں یاد بھی ہیں۔ تعلیماتِ قرآن پر عمل کرتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو احکامِ دین پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور یوں بقول سعدی شیراز کا :-

او جہد می کند کہ بگیرد غریق را

لکھ چکا ہوں کہ ——

اختر کے کردار کی تشکیل و تزئین میں ہاتھ ہے مذہبی تعلیم کا، اسلامی زندگی کا، شرعی ماحول کا، مشرقی معاشرہ کا۔ اختر تعلیم و تفہیمِ اصولِ دین کے علاوہ ہیں احکامِ کلام پاک کی تلقین و تبلیغ کے شیدا ہیں۔ —— اُن کا کہنا ہے کہ —— تعلیماتِ قرآنی کو موجودہ دور کی دنیا، سائنس کی دیوانی دنیا، مذہب سے بیزار دنیا کے سامنے اس انداز سے اس خوبصورتی سے پیش کرنے کا وقت آگیا ہے کہ مذہب پر ہنسنے والوں کا منہ بند ہو جائے اور اُن کی فراست و ذہانت کی آنکھیں کھل جائیں۔ بھٹکی ہوئی اور بہکی ہوئی دنیا پھر صراطِ مستقیم پر آجائے۔

یہ بھی مذہب ہی کے اصولوں پر کاربند رہنے کا نتیجہ ہے کہ اختر میں شریفانہ جرأت اور عارفانہ ہمت ہے۔ قادرِ مطلق سے ڈرنے والا کسی اور سے کیا ڈرے گا، کیوں ڈرے گا۔ سچی باتیں کہنے میں اختر جیسی جرأت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ سنتری ہو یا منتری، کاروباری ہو یا بھکاری، شہری ہو یا دیہاتی، عالم ہو یا عامی، اختر سچی باتیں کہتے ہوئے کبھی نہیں جھجکتے۔ اور جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں —— تب ہی تو ان کی باتیں پُراثر ہوتی ہیں —— دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

حدیث شریف میں ہے —— حیا ایمان کی ایک شاخ ہے ——

قوی ایمان والے اختر کے دل میں حیا ہے، آنکھوں میں شرم ہے، اُن کی تقریر ہو یا تحریر کسی میں عریانی نظر نہیں آتی، فحاشی جگہ نہیں پاتی۔ اختر افسانہ نویس ہیں، اور افسانوں میں ایسے مقامات کا آجانا بھی ضروری ہے جہاں عریانی اور فحاشی گھس آنا چاہتی ہے مگر وہاں بھی حیادار اختر

شعورِ انتخابِ الفاظ کا کمال دکھا جاتے ہیں۔ کوئی لفظ، کوئی جملہ، کوئی کلمہ، کوئی عبارت ایسی نہیں لکھتے جس سے سفلی، حیوانی، شہوانی یا شیطانی جذبوں، خواہشوں یا خیالوں کو اُبھر آنے کا موقع مل جائے۔

اختر اورینوی میں قابلِ تعریف رواداری کا مادہ ہے اور یہ بھی مذہبی تعلیم کا ثمرہ ہے۔ دشنام طرازی کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ سخت کلامی سے پرہیز کرتے ہیں، کڑوی بات سُن لیتے ہیں، سہہ لیتے ہیں، مگر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب اختر کی صفتِ رواداری مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔

اگر کسی نے اسلام پر پھبتی کس دی، اسلامی تہذیب پر طنز کر دیا، ملک و ملت کے متعلق کوئی توہین آمیز بات کہہ دی تو اختر کا یہ حال ہو جاتا کہ یہ سوچے بغیر کہ متکلم شاہ ہے یا وزیر، حاکم ہے یا عالم، دیسی ہے یا پردیسی کڑک کڑک کر، اور گرج گرج کر، ایسے دنداں شکن جوابات کا تانتا باندھ دیتے ہیں کہ طعن و تشنیع اور طنز و توہین آمیز جملہ کسنے والا ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

اختر اورینوی نہ کسی سے خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں، نہ زبردستی اُلجھتے ہیں۔ اُن کے بگڑنے، چراغ پا ہو جانے اور آپے سے باہر ہو جانے کا موقع ہوتا ہے —— وہی اُن کے جذباتِ ملی و مذہبی کا مجروح ہونا۔ اسی کو غیرتِ ایمانی کے بیدار ہو جانے کا موقع بھی کہا جاتا ہے۔

اعتدال عنصرِ تعلیمِ اسلام ہے۔ اختر کی رفتار میں اعتدال ہے۔ دوڑ کر یا بہت تیز لپک کر نہیں چلتے۔ گفتار میں اعتدال ہے، سنبھل سنبھل کر سوچ سوچ کر مسلسل بولتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی سیلِ رواں کی تیز روی اور بے راہ روی اُن کی تقریر میں دیکھی نہیں جاتی۔

اختر شریف گھرانے میں پیدا ہوئے اسلئے اُن میں متانت ہے، شرافت ہے، اُن کی ہر ادا میں متانت ہے —— رفتار و گفتار میں متانت، تحریر و تقریر میں متانت، حد تو یہ ہے کہ ان کی شوخیوں میں بھی متانت ہے۔ اُن کی ظرافت پر بھی متانت کا غازہ لگا ہوتا ہے۔

اختر اورینوی خلفِ سید وزارت حسین، قصبہ اورین ضلع مونگیر کے رہنے والے ہیں۔ اختر کا ددھیال اورین ہوا۔ ان

بسلسلۂ ملازمت پٹنہ ہی میں قیام ہے۔ اور یہیں اپنا ذاتی مکان بھی بنا لیا ہے۔ اختر اپنے دادیہالی خاندان کے نجمِ درخشاں ہیں مگر اختر کو نیر تاباں بنا دینے والے اوصافِ حمیدہ اور اطوارِ ستودہ اپنے مشہور "نانیہال در نانیہال" سے ملے ہیں۔ اختر کی والدہ ماجدہ کے پدر بزرگوار عبدالعزیز صاحب، موضع ... کو ضلع گیا کے رئیسوں میں تھے۔ اور اختر کی والدہ مرحومہ کی والدہ ماجدہ کا نانیہال آرہ ضلع شاہ آباد ہے۔ اختر کی والدہ کے نانا کا اسم شریف تھا سید نور الحق، یہ ذات کے سید تھے اور پیشہ سرکارِ انگریزی کی ملازمت بھی منصفی کے عہدہ پر مامور تھے ـــ ان کا محبوب شغلہ دینی خدمت اور کتب بینی تھا۔

اختر کی والدہ ماجدہ کا نانیہال بحیثیت نجابت و شرافت اور اقتدار دینی اور امتیازات دنیوی بہار کے مشہور و معروف خاندانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

اختر کی چال ڈھال میں، رہن سہن میں، بول چال میں اور بہت سی اور باتوں میں جھلکیاں نظر آتی ہیں اختر کی والدہ ماجدہ کے نانیہال والوں کے اوصاف کی۔

تصنیفات و تالیفات اختر کو لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا۔ مگر اُن کی تقریروں کو جس میں اُن کی والدہ کی نانیہال کی خصوصیتیں نظر آتی ہیں، شاید چند ہزار لوگوں نے ہی سُنا ہوگا۔ اور اُن کی گفتگو کو تو شاید اس سے بھی کم لوگوں کو سُننے کا موقع ملا ہوگا۔ ان کو یہی "نانیہال در نانیہال" یعنی والدہ کی نانیہال سے ملا ہے ـــ خاص لہجہ، صاف اور دل پسند لہجہ، اندازِ گفتگو، طرزِ تخاطب، زبانِ رواں، آواز بلند مشکل، نامانوس اور الفاظِ دقیق کا صاف اور صحیح تلفظ۔ اور مناسب موقع پر مناسب الفاظ پر مناسب انداز میں زور دینے کی صلاحیت۔ اختر کے توشہ خانۂ خطابت میں ہے ـــ میٹھی زبان، واعظانہ اور حاکمانہ بیان، وہ گریہ یعقوبی کا جلوہ "تبسم فرعونی" کا نقشہ ـــ اختر انگریزی زبان میں بھی برجستہ تقریر کر سکتے ہیں اور اُردو میں بھی ـــ اس مقررِ مقبول کی تقریر آپ سُنیں گے تو دیکھیں گے یہ حضرت کبھی مینائے الفاظ میں شراب سبق آموز بھر دیتے ہیں اور کبھی خُمِ شراب معنی میں شربت ایمان افروز۔

اختر بڑے وضعدار ہیں اور وضع داری کا ترکہ بھی اُن کو اپنے ماہرِ بادوست "نانیہال در نانیہال" سے ملا ہے۔ اُنکی وضع داری کی یہ حد ہے کہ حالتِ مخالفت میں بھی حدود تہذیب سے باہر نہیں جاتے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی شرافت اور سیرت کا سچا فوٹو اصول کا خودکار فوٹوگرافر پیچھے سے لے لیتا ہے۔ اختر اختلافِ مشرب و مسلک کے باوجود کسی سے اُلجھتے نہیں اور شرافت کی حدوں سے نکلتے نہیں۔

اختر اپنے ملنے والوں سے، دوستوں سے، جان پہچان والوں سے، عزیزوں سے، بزرگوں سے اختلافِ خیالات و معتقدات کے باوجود اپنے ذاتی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔

آپنے مختصراً سُن لیا کہ اختر کیا ہیں، کیسے ہیں، یہ بھی سُن ہی لیجیے کہ وہ کیا نہیں ہیں ـــ اختر سیاست کے ماہر نہیں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ڈپلومیٹ نہیں، اسلئے کہ ہم لوگ تو ڈپلومیسی کہتے ہیں فریبِ دانشمندانہ کو، ڈپلومیٹ، بزبانِ عوام، اس کو کہا کرتے ہیں جو چرب زبان ہو، منہ زور ہو، غلط بیان ہو، جس کا ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ، جس کے وعدے تارِ عنکبوت جیسے، جس کی زبان پر الفاظ رحم و کرم اور دل میں جور و ستم ان صفات سے اختر بیچارہ محروم، خوشامد سے متنفر، خلوص کا مجسمہ، قول کا پکا، اس کے زبان و دل میں یکسانی اور محبتِ انسانی کی فراوانی۔

اختر اپنا اُلّو سیدھا کرنا نہیں جانتے۔ اُن کو بات بنا کر اپنا کام نکالنا نہیں آتا۔ خود کو بچانے کے لئے دوسروں کو ڈبو دینے کا ڈھنگ معلوم ہی نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ محض "مصلحتِ وقت" کیا چیز ہے، اور کس طرح یہ اصولِ اخلاق کو مصلحتِ وقت کی خاطر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ ابن الوقت نہیں۔ ابوالوقت ہیں ـــ اور اس کے قائل ہیں کہ ـــ

اگر زمانہ نسازد تو با زمانہ ستیز

اختر طوطا چشم نہیں ـــــ یعنی بے مروت نہیں، مروت کا مفہوم ہم آپ سب سمجھتے ہیں ـــــ بڑا جامع لفظ ہے۔ ایسا جامع اور بلیغ اور پُر معنی کہ انگریزی زبان کا دامن دراز بھی اس گوہر سے خالی ہے۔ لفظ مروت کا مرادف یا ہم معنی لفظ انگریزی زبان میں ہے ہی نہیں ـــــ لیجئے میں کیا کہہ رہا تھا کیا لکھنے لگا، گیا قلم بہک گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ اختر میں بے مروتی نہیں، اُن کے "منافق" دوستوں کو اس کا تجربہ ہے، اُن کے دغاباز رفیقوں کے پاس اس کا ثبوت ہے دورِ جدید کے چالاک اور ہوشیار لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ اختر کے دل میں درد ہے، قوتِ نفس پروری میں کمزوری ہے اور محبت میں خلوص ہے۔ اسی لئے وہ مرضِ مروت میں مبتلا ہیں۔ بعض لحاظ سے اختر دور اندیش نہیں، وہ پیسہ پیسہ پر گرہ نہیں لگاتے، مصیبت کے وقت کے لئے، ناداری کے وقت کے لئے، زمانہ پیری اور بیکاری کے لئے پیسہ پیسہ بچا بچا کر نہیں رکھتے ـــــ اتفاق حال کے علم پر چلتے ہیں اور مال و زر کو چلتی پھرتی چھاؤں سمجھتے ہیں، اُن کے دوست یا اُن کے اعزا، اُن سے زیادہ اُن کے مال و دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مذہب کے لئے، ملت کے لئے روپے خرچ کرتے رہتے ہیں اور دنیاداروں، مہاجنوں اور سرمایہ کاروں کی ترقی و ترفع پر رشک کرنے کو حکمتِ الٰہی سے نادانی تصور کرتے ہیں۔ "بدست آر و با دیگران نوش" کے قائل ہیں۔

اختر احمد کے علمی اکتسابات کے جلوے آپ کو ممتاز مقالہ نگاروں کے نگارخانہ قلمی میں نظر آئیں گے۔ اور سطور بالا میں اختر کی سیرت کی جھلکیاں دکھائی دیں گی۔

اختر کی شاعری، افسانہ نگاری وغیرہ وغیرہ کے متعلق نقادوں اور تبصرہ نگاروں کی رائیں آپ کی نظر نکتہ شناس سے گزر چکی ہوں گی اختر کے ذاتی اوصاف ـــــ مذہبی جذبات، عارفانہ تصورات اور حکیمانہ بیانات و مفید معتقدات کے متعلق راقم السطور کے خیالات سے آپ واقف ہو چکے۔ اب قلم رکھ دیتا ہوں اور اختر سلمہ کو دعائیں دینے کو دونوں ہاتھ اٹھاتا ہوں ـــــ حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس۔"

اے خداوند کریم اختر کی کوششوں اور کاوشوں کو جو اُن نے تیرے عزیز بندوں کو سدھارنے اور سنوارنے کے لئے کی ہیں قبول فرمائے۔ تو نے جس طرح دنیا پر انھیں چمکایا ہے آخرت میں بھی رشک مہر منور بنا دے۔

یا ربّ العزّت

بدی کی چھپی ہوئی راہوں کو دیکھ لینے والا اختر عقاب نظر، اہرمن کی خفیہ چالوں کو سمجھ جانے والا بیدار دل اختر، ہوشیار و عاقل اختر جگ جگ جیئے اور جب تک جیئے بندگیٔ خالق اور خدمت خلائق میں لگا رہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

بقیہ میرا بیٹا

اختر احمد سلمہ نے اپنے بچپن ہی سے دینی و دنیوی تعلیم میں کبھی غفلت نہیں کی اور نماز پنجگانہ کی ادائیگی کی عادت بھی بچپن ہی سے پیدا ہو گئی۔ انھیں اپنے ہم جولی لڑکوں سے بھی کبھی دنگا فساد یا بد زبانی کرتے نہیں دیکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ اُن پر دو جہان میں رحم و کرم فرماتا رہے۔

پروفیسر حافظ شمس منیری
سابق صدر شعبہ اُردو پٹنہ کالج

اختر اورینوی اور میں

ڈاکٹر اختر احمد اُورینوی صدر شعبہ اُردو پٹنہ یونیورسٹی میرے عزیز ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ میرے اُن کے تعلقات استاد و شاگرد ہی کے نہیں۔ بلکہ دوست اور ساتھی کے بھی ہیں۔ اسلئے کہ زمانہ طالب علمی کے بعد یہ پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں بحیثیت لکچرار داخل ہو گئے اور میرے ماتحت مدتوں کام کرتے رہے، اور جب میں اس شعبہ کی صدارت سے سبکدوش ہوا تو میری جگہ پر اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اسلئے میں نے اُن کو بہت قریب اور بہت مدت تک دیکھا ہے اور اُنکے متعلق میری رائے سرسری نہیں بلکہ عرصہ کی واقفیت پر مبنی ہے۔

اُن کی قابلیت اُردو زبان و ادب سے اُن کا شغف، اُردو ادب اور اس کے متعلقات پر اُن کی گہری اور وسیع نظر، اُنکی افسانہ نگاری، اُنکی تنقید نگاری وغیرہ کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، اسلئے کہ اُن چیزوں کے متعلق بہت سے لکھنے والے ہیں۔ اور انھوں نے کوئی گوشہ اُن کی علمی کاوشوں کا خالی نہیں چھوڑا ہے۔ میں صرف چند باتیں اُن کے متعلق بحیثیت شاگرد بحیثیت رفیق کار اور بحیثیت انسان کہوں گا۔ انکی شاگردی کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ گرچہ یہ ابتداء میں سائنس کے طالب علم تھے مگر اُردو ادب سے انھیں ابتداء ہی سے ذوق تھا اور جب یہ اُردو کلاس میں داخل ہوئے تو مجھے فوراً محسوس ہوا کہ ایک ہونہار طالب علم آگیا ہے، اور امتحان کے نتائج نے میری اس رائے کی پوری تصدیق کی۔ ایک رفیق کار کی حیثیت سے میں نے اُنھیں نہایت مستعد اور فرض شناس پایا اور مجھے اُن پر پورا اعتماد رہا۔ ساتھ ہی انھوں نے جس قدر ممکن تھا میرے کاموں میں میری معاونت کی اور مجھے بہت عافیت پہونچائی۔ بحیثیت انسان کے میں نے ان کو اعلیٰ انسانی صفات کا حامل پایا، انتہائی خلیق اور متواضع مگر خوددار، معاشرہ میں قدیم و جدید کا ایک نہایت متوازن نمونہ، ہر جہت میں زندگی اور زندہ دلی کی تصویر۔ سماجی اور سیاسی مسائل کے متعلق نہایت سُلجھا ہوا انداز تفکر، یہ اُنکی خصوصیات میری نظر میں نمایاں رہی ہیں۔

ایک عجیب و غریب نجی معاملہ میرے اور اُنکے درمیان یہ بھی رہا کہ باوجود مذہبی اختلاف عقاید کے کبھی آپس میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ گو اکثر مذہبی مسائل پر بھی گفتگو ہوا کی، اور جب حالات حاضرہ کی بنا پر اسلام اور اہل اسلام کے مستقبل کے بارے میں مجھ پر قنوطیت طاری ہوتی تھی تو اُنکی رجائیت نے ہمیشہ میری مدد کی اور میرے ایمان کو تقویت پہونچائی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بہت سی مذہبی مجلسوں سے میں اس قدر پُر اُمید ہو کر نہیں اٹھا جس قدر ڈاکٹر اختر اُورینوی کی ایمان پرور باتوں سے۔

میری دعا ہے کہ خداوند عالم اُن کو صحت و حیات کی نعمت سے عرصہ دراز تک متمتع فرمائے اور اُنھیں اُردو زبان و ادب نیز ملک و ملت کی خدمت کی بیش از بیش توفیق بخشے۔ آمین!

پرنسپل اجتبیٰ رضوی

میرے دوست اختر

یہ ہیں اختر اورینوی ـــــ ستھرے، نفیس، مہذب آدمی ـــــ اور میرے دوست۔ مزاج میں شرافت، بیان میں جرأت اور مذاق میں متعدد پہلو جن کو شخصیت کی وحدت نے بڑے سلیقے سے گوندھ رکھا ہے۔

کسی دوست کے بارے میں تعریفی کلمات کتنے ہی بخل کے ساتھ صرف کئے جائیں دوسرے ان کو مدحیہ کلمات سمجھتے ہیں کیا اتنا لکھنا اختر کی مدح سرائی ہوگی کہ انھوں نے اپنے افسانوں اپنی نظموں اور اپنے مضامین کے بل بوتے پر وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے؟ کیا یہ مدح ہوگی کہ اختر ہندوستان کے چند مشہور افسانہ نگاروں میں ایک ہیں ـــــ؟

میں اختر سے ہمیشہ ایک دوست کی طرح ملا ہوں۔ کھلے دل کا یہ آدمی بحیثیت انسان مجھے بہت پیارا ہے۔ میرا ایک عزیز جو ایک ادبی مقام رکھتا تھا ڈھاکے سے پٹنہ آکر علیل ہوا اور راہیِ ملکِ بقا ہوا مجھے علم ہے کہ اختر نے اس کی تیمارداری اور خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ شاید لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ میرے اُس عزیز کا ایک تنقیدی مضمون تھا جس میں اختر کی سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اختر کے خلوص کا یہ رویہ جو عام ہوتے ہوئے بھی ان کی شخصیت کے دستار میں دب جاتا ہے مجھے بہت عزیز ہے۔

ایک بات سنئے ـــــ اختر اس بات پر مصر ہے کہ وہ بوڑھا نہیں ہوا اس تصور کے تحت کالج کے بے تکلف دوستوں کے ایک مخصوص حلقے میں کبھی کبھی عمر کے اس حصے کی یاد اتنی شدید حسال فراموشی اور ماضی پسندی کے ساتھ منائی جاتی ہے جیسے ماضی گذرا ہی نہ ہو۔ اختر اس بات کو خوب محسوس کرتے ہیں کہ بڑھاپا جھریوں کی کتابت میں ثبت ہوتا جارہا ہے اور ان سلوٹوں کو مٹایا نہ جاسکے گا۔ لیکن شاید اختر اس بات میں اعتقاد نہیں رکھتے کہ جو وقت گذر چکا ہو اس کو گذرا ہوا تسلیم کر لینا چاہئے۔ وہ شاید اس کے قائل ہیں کہ جب تک تلخ حقیقتوں کو ٹالا جاسکے ٹالتے ہی جانا چاہئے ـــــ اچھا جی ـــــ میری دعا ہے ـــــ تم ہمیشہ جوان رہو۔

بعض دوستوں کی موت نے مجھے اس قدر شکستہ کر دیا ہے کہ میرے لئے عبارت آرائی اور گفتگو میں کوئی لطف رہ نہیں گیا۔ ایسی صورت میں میرے لئے مضمون کا لکھنا بہت مشکل بلکہ ناممکن کام تھا۔ بہ مشکل یہ چند سطریں لکھی ہیں۔

اب میری دلی تمنا یہ ہے کہ میری آخری سانس تک یہ جو چند دوست میرے ہیں خدا ان کو زندہ رکھے۔

پروفیسر سید حسن

آج سے چالیس سال اور پہلے کی بات ہے۔ جب جنوری ۱۹۲۲ء میں میں مونگیر ضلع اسکول کے چوتھے (آج کل کے آٹھویں) کلاس میں داخل ہوا تھا۔ میں اسکول میں تازہ وارد تھا۔ اس وقت کلاس اور اسکول کے تقریباً سب لڑکے میرے ناآشنا تھے۔ لیکن چند ہی دنوں میں نئے نئے دوست پیدا ہونے لگے۔ ایک دن شام کو جب میں سیر کو نکلا تو راہ میں ایک ہم جماعت سید محمد مصطفیٰ سے ملاقات ہوگئی۔ اُن کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا جس کی شکل و شباہت بڑی جاذبِ نظر تھی۔ سنہری رنگت، کھڑی ناک، چمکیلی آنکھیں، اونچی پیشانی، صاف ستھرا کپڑا پہنے، عینک لگائے، صورت سے تیزی اور ہوشمندی نمایاں۔

مصطفیٰ نے یہ کہہ کر اس کا تعارف کرایا۔ "یہ ہیں میرے چچازاد بھائی سید اختر احمد احمدی۔" اس تعارف کے بعد اختر سے میری ملاقات اکثر ہونے لگی۔ وہ مجھ سے ایک درجہ اونچی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس لئے کلاس میں میرا اُن کا ساتھ تو نہ ہوتا، لیکن ٹفن کے وقت یا پھر اسکول کے بعد ٹہلنے کے موقع پر ہم دونوں اکثر ساتھ ہوتے تھے۔ ان ملاقاتوں نے ہمیں رفتہ رفتہ گہرا دوست بنا دیا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ اول تو یہ کہ اختر اپنے کلاس کے اچھے طالب علموں میں تھے۔ سالانہ امتحان میں وہ اوّل یا دوم ہوتے تھے۔ میرا شمار بھی اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اختر میرے چھوٹے ماموں کے (جن کے یہاں میں رہتا تھا اور جو اس وقت میرے سرپرست تھے) سسرالی رشتہ دار تھے۔ تیسری اور سب سے زیادہ قوی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں رسالوں اور کتابوں کے دلدادہ تھے۔ میں نے اُن دنوں بچوں کے رسالے "پھول" (لاہور) اور "غنچہ" (بجنور) میں مضمون لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اختر نے مضمون نگاری ہنوز شروع نہیں کی تھی۔ لیکن ان کا ادبی ذوق آہستہ آہستہ پرورش پا رہا تھا۔

کلاسوں میں آگے بڑھنے کے ساتھ ہم دونوں کی دوستی بھی ترقی کرتی رہی۔ اسکول میں اور اسکول کے باہر اکثر اکٹھے ہوتے۔ کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا اور کبھی وہ میرے گھر چلے آتے۔ ان ملاقاتوں میں اسکول کے معاملات کے علاوہ رسالوں کے مضامین کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ ہم دونوں اپنی اپنی پسند کا مضمون پڑھ کر ایک دوسرے کو سناتے۔ اُس زمانے میں "ہزار داستان"، "عالمگیر" اور "نیرنگِ خیال"

اُردو کے بہت مقبول رسالے تھے۔ پطرس کا مضمون "سویرے جو کل میری آنکھ کھلی" پہلی مرتبہ نیرنگ خیال میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو پہلے اختر ہی نے دیکھا اور اسی شام کو وہ رسالہ میرے یہاں لے کر آئے اور مضمون پڑھ کر سُنایا۔ ہم دونوں نے اس مضمون سے بہت لطف لیا خصوصاً اس حصّے سے جہاں پنڈت جی علم مثلث کا کوئی فارمولا یاد کرتے نظر آتے ہیں۔ اس حصّے سے لطف اندوز ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں کا اسکول میں اختیاری سبجکٹ "ریاضی" تھا۔ ایک دوسرے کے گھر جانے کی وجہ ملاقات کے علاوہ ایک اور ہوتی تھی، ہماری پیاری مائیں۔ جن کی شفقت کا کوئی حد و حساب اور جن کی محبت کی کوئی تھاہ نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ انکی روحوں کو ابدی سکون عطا فرمائے۔ اپنے نورِ نظر و لختِ جگروں کے لئے وہ بہات سے ہر پہنچنے ناشتہ پٹاریاں بھر بھر کر بھیج دیا کرتی تھیں۔ جیسے ہی یہ خبر ملتی کہ میرے یا اختر کے یہاں ناشتہ کی پٹاری پہنچ گئی ہے، ہم ایک دوسرے کے یہاں پہنچ جاتے تھے۔ اور ناشتہ کی چیزوں پر خوب خوب ہاتھ مارتے۔ اختر شروع ہی سے کھانے کے معاملے میں بہت ہی بے تکلف واقع ہوئے ہیں۔ خصوصاً اگر کوئی عمدہ چیز ہو تو بڑے پُرخلوص انداز میں اُس پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ تعریف کئے جائیں گے، مزے مزے کی باتیں بناتے جائیں گے اور ہاتھ مارتے جائیں گے۔ اگر کسی بے تکلف دوست کے دسترخوان پر ہوں تو اس کی دوستی اور کسی کے یہاں مہمان بن کر گئے ہوں تو اس کی میزبانی سے فائدہ اٹھانے میں وہ کبھی نہیں چوکتے۔ دوست کو باتوں میں بہلا کر اور میزبان کے سامنے حُسنِ طلب کے نئے نئے انداز پیدا کر کے ان کو خوب بیوقوف بناتے ہیں۔ اب تو مزمن پیچش کے مریض ہونے کے سبب سے نہ تو وہ اس لائق ہیں اور نہ وہ اس قابل ہیں کہ مرغن غذائیں اور وہ بھی کافی مقدار میں کھا سکیں۔ لیکن اسکول کے زمانے میں جب معدہ کی مشین خوب تیز تیز چلتی تھی اور نئی ہونے کے باعث عمدہ طریقے سے کام کرتی تھی، ہم دونوں بلبین کے خوب مرغن متعدد لڈو، انچہ تیچہ، چنا کا حلوہ، میدہ کے بیسیوں خستہ ٹکیے باتیں کرتے کرتے ہی کھا جاتے تھے۔

اسکول میں اختر پڑھنے لکھنے کے علاوہ تقریر کرنے میں بھی اچھے تھے۔ انہوں نے تقسیم انعامات کے جلسوں میں نظم خوانی، تقریر اور ڈراما کا پارٹ کرنے میں کئی بار کامیابی کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ اور انعامات حاصل کئے تھے۔

اختر کا تعلق صوبہ بہار کے ایک معزز سادات خاندان سے ہے جس کا سلسلہ نسب حضرت سید احمد جاجنیری بغدادیؒ سے ملتا ہے۔ مونگیر ضلع کے اکثر سادات ان ہی بزرگ کی اولاد ہیں۔ اس ضلع میں اورین شرفا کی ایک قدیم بستی ہے۔ اختر یہیں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ اسلاف عہد سابق میں سپاہی پیشہ تھے۔ پھر کاشتکاری کی طرف مائل ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے گھرانے والے علم و فضل میں بھی ممتاز رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں مونگیر اور اس کے قرب و جوار میں قادیانی مذہب کی تبلیغ و اشاعت بہت زور شور سے ہوئی تھی۔ اور بہت سے لوگ اس مذہب کے پیرو ہو گئے تھے۔ ان ہی دنوں اختر کے والد بزرگوار مولوی سید سعادت حسین صاحب نے اس مذہب کو قبول کر لیا تھا اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ان کی شادی تبدیل مذہب سے پہلے ایک سنی گھرانے میں ہوئی تھی۔ اختر کی والدہ ماجدہ مرحومہ کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا جب وہ ہنوز اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے اختر کے علاوہ دو اور اولاد، ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑیں۔

اختر کو بچپن میں مذہبی تعلیم استوار بنیادوں پر دی گئی ہے۔ وہ نہ صرف مذہب کے تمام کلیات اور تاریخ اسلام سے پوری واقفیت رکھتے ہیں بلکہ اُن میں یہ قابلیت بھی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں مکالمہ اور مناظرہ ہر طرح سے حصہ لے سکیں۔ ہم لوگوں کے بچپن کے زمانے میں مونگیر میں قادیانی مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی تردید و مخالفت کا بڑا زور تھا۔ مونگیر ایک طرف تو قادیانیت کا تبلیغی مرکز تھا۔ دوسری طرف یہاں حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ بھی تھی۔ حضرت مولاناؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انہوں نے رد قادیانیت میں بہت سے رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ قادیانی مبلغین آئے دن شہر اور اس کے اطراف و جوانب میں تبلیغی جلسے کیا کرتے تھے۔ اُن کے توڑ میں حضرت مولاناؒ کے مبلغین بھی جگہ جگہ جلسے اور مناظرے منعقد کرتے۔

یہ تحریری معرکے اور تقریری مباحثے اُن دنوں اس علاقے کی عام چیز بن گئے تھے۔ قادیانی بہت قلیل تعداد میں تھے۔ ان کو اپنے مذہب کو نہ صرف پھیلانے بلکہ اسے باقی رکھنے کے لئے کافی جد و جہد کرنا پڑتا تھا۔ یہ تھا اُس زمانے کا ماحول، جس میں اختر کی پرورش اور تربیت ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں اگر اختر کے مزاج میں راسخ العقیدگی اور تبلیغی رُجحان پیدا ہوا تو تعجب کی بات نہیں۔

اختر کی طبیعت میں مذہبیت اور مبلّغیت پورے طور پر رچی ہوئی ہیں۔ اور ان کا اکثر اظہار ہوتا رہتا ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں تبلیغی جوش ان میں اس قدر تھا کہ وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر تبلیغ شروع کر دیتے تھے۔ وہ اپنے نام کے بعد ہمیشہ احمدی لکھتے تھے۔ اختر 'اوریوی' ہونے سے قبل 'احمدی' ہوتے تھے۔ اسکول کی زندگی کے آخری ایّام میں انہوں نے مجھ پر بھی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ اور جب وہ میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوئے تو بھی خط و کتابت کے ذریعے مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اختر کے تبلیغی خطوں میں سے بہت سے تو ضائع ہو گئے، چند محض یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ ان خطوں کے کچھ اقتباسات نمونہ کے طور پر ذیل میں درج کرتا ہوں:-

"پٹنہ۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۲۶ء

.... دیکھو، یہ بھی تقاضائے محبّت ہے کہ میں اپنے ایک دوست کو وہ چیز دکھلا دوں اور اس کے پینے کا طریقہ بتا دوں جو خدا نے مجھے عنایت کیا ہے۔ یہ تو خود غرضی ہوتی اگر تمہیں میں اس گوہر کا پتہ نہ دیتا۔ یہ انسانیت سے بعید تھا کہ میں چُھپا ہو بیٹھا اور ایک تشنہ کام کو جوئے شیر کا مرجع نہ دکھلاتا۔ برادرانہ اُلفت اس کی مانع ہے کہ ایک خوابیدہ کو میں نہ جگایا۔ پس چونکہ مجھے تم سے محبّت ہے اور تمہیں میں اپنا شریک حال دیکھنا چاہتا ہوں اسلئے میں نے اپنا فرض ادا کرنے کی بنیاد رکھی، کوئی بغض و عداوت نہیں، کوئی کین و پیکار نہیں۔ کوئی دشمنی نہیں۔ میں تو عین اُلفت کی وجہ سے تمہیں نیند سے جگا رہا ہوں۔"

ترغیب کا کتنا خطیبانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ آگے چلکر اسی خطابت کا رنگ اور نکھر تا ہے :-

"........ کابل کے سنگریزے، اس کی گھاٹیاں، اس کے بید رد پتھر اور اس کے قید خانے اس کے گواہ ہیں۔ ایران کے بے آب راستے، پُر خطر وادیاں، جنگل بھرے میدان، دشت اور ٹیلے اسی کو جانتے ہیں۔ بُخارا کے برف سے لدے ہوئے پہاڑ، دشوار گذار راستے اس کی سردی اور وہاں کے قید خانوں نے اس کو دیکھا ہے۔ جہاں عام انسانی استقلال متزلزل ہو جاتا ہے۔ وہاں مسیح موعود کے خدام ان کی قوت روحانیت کی وجہ سے ثابت قدم رہے۔ اور دُنیا کو دکھلا دیا کہ ابھی اسلام زندہ ہے۔ اس میں روح ہے۔ اس کے زندہ نشانات دیکھے جا سکتے ہیں ع:-

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں۔

پیارے سعید! خدا تمہیں ہدایت دے۔ آمین۔ اب اسلام کا روشن چہرہ قادیان ہی میں دیکھا جا سکتا ہے .... خدا اب جلوہ نمائی قادیان کی سی چھوٹی سی بستی میں کرتا ہے۔ ع

تباں ہاند مٹی اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں ..."

ایک دوسرے خط میں جو اختر نے تقریباً سوا برس بعد از یں ۲۴ر اپریل ۱۹۲۷ء کو تحریر کیا تھا، لکھتے ہیں :

"........ قبل اس کے کہ میں اپنا اصل مضمون شروع کروں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم حق پانا چاہتے ہو تو کسی دوسرے کے کھجر دیے پرست رہو۔ صرف مولویوں کے کہنے کو درست نہ سمجھو۔ یہ تمہیں جاننا چاہئے کہ رسولِ کریم (فداہ امی و ابی) کی مخالفت سب سے پہلے اس شخص نے کی جو ابوالحکم کہلاتا تھا۔ اور اسے اپنے علم پر ناز تھا۔"

تبلیغِ قادیانیت کے لئے اس طرح زمین ہموار کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"میں اس خط میں مختصراً تمہارے بعض مضامین کا جواب دے کر ختم کرتا ہوں۔ کل پرسوں مسیح موعود مہدی مسعود کی سچائی، ختمِ نبوت، حیات و ممات عیسیٰ علیہ السّلام وغیرہ مضامین پر انشاء اللہ

تمہیں خط لکھیں گے۔"

ان خطوں کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اختر تبلیغ کے لیے کتنے پرجوش اور مستعد تھے۔ ان کی تحریروں میں خطیبانہ شان اور ادبیت پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی اس خصوصیت میں کثرت مزاولت اور وسعت مطالعہ کے ساتھ زیادہ گہرائی اور پختگی آتی گئی۔ چنانچہ اب وہ ایک بڑے خوش گفتار مقرر ہیں۔ ادبی مجلسوں اور مشاعروں کے علاوہ سیرت نبوی کے جلسوں اور میلاد کی محفلوں میں تقریر کے لیے مدعو کیے جاتے ہیں۔ ان متبرک مجالس میں وہ بڑی شاندار قسم کی تقریریں کرتے ہیں۔ جن میں تاریخ، سیاست، تہذیب حاضرہ اور سیرت نبوی صلعم کے متعلق بعض نکتوں پر مخصوص انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ دلچسپ رمز و کنایہ کے ذریعے تبلیغ کا کام بھی کرتے ہیں۔ اختر کے تبلیغی جوش کے بارے میں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔

پندرہ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء کا بہار کا ہولناک زلزلہ تاریخ میں یادگار ہے۔ ان دنوں میں اور اختر دونوں پٹنہ کالج کے طالب علم تھے۔ میں انگریزی کا ایم۔ اے کے دوسرے سال میں تھا۔ اور اختر بی۔ اے فورتھ ایر کلاس میں تھے۔ یہ زلزلہ دن کو تقریباً ایک بجے واقع ہوا۔ پٹنہ میں اس کا اثر کم رہا پھر بھی بہت سے مکانات منہدم ہو گئے۔ میں ہوسٹل میں رہتا تھا، شام تک شہر میں گھوم گھوم کر بربادیوں کا منظر دیکھا۔ اعزا اور احباب کی خیریت دریافت کی، رات کو ہوسٹل میں جاگ جاگ کر وقت گزارا۔ نیند کیسے آتی تھی۔ طرح طرح کی افواہیں اڑتی تھیں۔ کہ زلزلہ پھر آئے گا۔ سب لوگ خوفزدہ تھے۔ اور اعصاب میں ایسی کشیدگی تھی کہ ذرا کھٹکا بھی ہوتی تھی تو برآمدہ سے اچھل کر صحن میں آ جاتے تھے۔ جب صبح ہوئی تو اخبارات سب بند تھے لیکن لوگوں کی زبانی مفصل سے تباہ کاریوں کی وحشتناک خبریں آنے لگیں۔ اب تب گھر کا خیال آیا کہ معلوم نہیں گاؤں میں اپنے عزیزوں پر کیا گزری بھاگم بھاگ اسٹیشن پہونچا کہ پورب جانے والی گاڑیوں کا حال دریافت کروں، کیونکہ سنا تھا کہ گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہے۔ اسٹیشن سے واپسی کے وقت اتفاق سے جس ٹمٹم پر میں سوار ہوا، اختر بھی اسی پر سوار ہوئے۔ وہ بھی گاڑیوں کا حال دریافت کرنے اسٹیشن گئے تھے۔ راستہ میں فطری طور پر زلزلہ کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ قاعدہ ہے کہ ایسی آفت و مصیبت کے وقت انسان کے مذہبی احساسات زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں پر یہی کیفیت طاری تھی۔ اختر نے فوراً تبلیغی انداز اختیار کر لیا۔ کہنے لگے

"ہمارے حضرت مسیح موعود نے ان آفتوں کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ اس قسم کے تمام آفات ارضی و سماوی کسی نبی کی آمد کا ثبوت ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ وماکنا معذبین نبعث رسولاً"

اختر کے مزاج کا مبلغانہ رجحان ان کے متعدد تصانیف میں صاف جھلکتا ہے۔ استاذی محترم الحاج قبلہ پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کی فرمائش پر نصاب میں شامل کرنے کے لیے اختر نے اقبال اور اس کی شاعری پر ایک کتابچہ "اقبال" لکھا تو اس میں بھی انہوں نے عہد اقبال کی مختلف اسلامی تحریکوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قادیانی جماعت اور اس کے تبلیغی کارناموں کی طرف بھی توجہ کی۔ افسانہ "ربیع" (منظر پس منظر) میں بھی اختر نے اپنے تبلیغی کاموں کی طرف صاف لفظوں میں اشارہ کیا ہے رانچی کے جنگلوں میں وحشی اقوام کے درمیان تبلیغی مہم کے دوران ہی میں وہ بارش میں بھیگ کر دق جیسے مہلک مرض میں گرفتار ہوئے۔ ڈرامے "شہنشاہ حبشہ" میں ڈاکٹر احمد کا کردار اسی مشنری مقصد کے ماتحت پیش کیا گیا ہے۔ اختر کا یہ نوٹ کہ ڈاکٹر احمد ایک پنجابی احمدی نوجوان تھے امداد کے لیے ہندوستان سے حبش گئے تھے۔ اسی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

"شہنشاہ حبشہ" کو اختر نے "خدا" کے نام معنون کیا ہے۔ اختر کی اسی ذہنیت نے ان کو ترقی پسند حلقوں میں داخل ہونے نہ دیا۔ "آخری الٹی" "کام"، "جینے کا سہارا"، "بیل گاڑی"، "یہ دنیا"، "آب" — "گندے انڈے"، "کٹے ہاتھ" اور "وہ واقعہ" (جس میں انہوں نے اشتراکی عقیدے کی بڑی خوبی کے ساتھ وضاحت کی ہے) ایسے افسانوں کے باوجود ان کو ترقی پسند مصنفین کے زمرے سے خارج کر دیا گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین رکاں کے ساتھ جو رویہ رہا وہ قابلِ ذکر ہے۔ اختر اپنی سرکاری ملازمت کے باعث اس انجمن کے کبھی باضابطہ ممبر نہ رہے۔ حالانکہ ان کو صوبہ بہار کی اردو شاخ کی صدارت کی پیشکش بھی کی گئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ترقی پسندی اور اشتراکیت ہم معنی الفاظ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت ہر سیاسی نقطۂ نظر کے ترقی پسند مصنفین ایک ہی پلیٹ فارم پر مجتمع تھے۔ اُن دنوں اختر نے کئی ترقی پسند افسانے اور ڈرامے لکھے جن میں انہوں نے استعمار پسندوں کے انسانیت سوز مظالم کی مذمت کی اور سرمایہ داروں کی استعمارانہ چالبازیوں کو بے نقاب کیا۔ شہنشاہ حبش میں انہوں نے اطالوی فاشزم کی دھجیاں اڑائیں۔ اور مغرب کی سرمایہ دار قوموں کی جنگ زرگری کا پول کھولا۔ تمثیلچہ 'زوال کیتھلین' میں جیفیوں پر جاپانیوں کے بہیمانہ مظالم کی خونچکاں داستان بیان کی۔ ان افسانوں اور تمثیلوں پر تحسین و آفریں کے خراج پیش کئے گئے۔ اور اختر کو نئے ادب کے معماروں کی صف میں جگہ دی گئی۔ ان ہی دنوں ترقی پسند مصنفین کی جماعت میں سیاسی نقطۂ خیال کے ماتحت انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ اشتراکی ادیبوں نے کانگریس سے نکل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک اشتراکی ادارہ بنا دیا تھا۔ اور اُس مصنف کو جو اشتراکی نقطۂ نظر کی حمایت یا اشاعت نہ کرتا ہو، اُسے اپنے حلقے سے خارج کر دیا تھا۔ اختر کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے انسانیت کو ایک ناقابلِ تقسیم وجود سمجھ کر فلسطین کی تقسیم کے خلاف اور مظلوم عربوں کی ہمدردی میں ایک افسانہ بعنوان "انہیں مُردہ نہ کہو" لکھ مارا۔ اس میں انہوں نے امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ اشتراکی روس کی بھی مذمت کی جس نے دنیا کی ایک پس ماندہ قوم کے خلاف سازش میں حصہ لیا تھا۔ اس مضمون پر ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں بڑا بھونچال آیا۔ ان کی مخالفت ہر چہار طرف سے ہونے لگی۔ انہیں رجعت پسند کا خطاب عطا ہوا۔ بمبئی میں انجمن کا ایک جلسہ ہوا جس میں باضابطہ طور پر ان کے خلاف نفرت و مذمت کا اظہار کیا گیا۔ انجمن کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ پٹنہ شاخ کو بھیجا گیا کہ اختر کی مذمت کی جائے۔ ان کے اشتراکی دوستوں نے خط لکھے جس میں ان کی رجعت قہقری پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔ اختر نے بھی ان دوستوں کو دندان شکن جواب دیئے۔ فلسطین کے باشندوں اور چین کے رہنے والوں سے ہمدردی ظاہر کر کے وہ جتنے مقبول ہوئے تھے عربوں کی حمایت نے انہیں اس حلقے میں اتنا ہی مردود بنا دیا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اختر کی خداشناسی اور مذہب پرستی ان کی شخصیت کا بڑا مضبوط اور واضح پہلو ہے۔ لیکن اس مذہبیت کے باوجود اُن میں تعصب اور تنگ نظری نہیں ہے۔ ان میں تحمل اور رواداری ہے۔ وہ اپنے مخالف کو بھی اچھی طرح برداشت کرتے ہیں۔ اور ان سے لطف و اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اُن کے دل میں انسانیت کا بھرپور درد موجود ہے۔ اور ان کی ترقی پسندی کا یہی راز ہے۔ وہ انسان کے مصائب و آلام سے نجات اور منزلِ مقصود تک اُس کی رسائی کا ذریعہ مذہب کو سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا منصب العلین و ماسکو، نہیں بلکہ 'مکہ' ہے۔

عقیدہ کے معاملے میں اختر بہت ہی پختہ انسان ہیں۔ اور جرأت کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ کسی بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ عقیدہ اور مصلحت میں مفاہمت کے قائل نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ پٹنہ یونیورسٹی نے میٹریکولیشن کے لئے اردو کا نصاب مرتب کرنے کے واسطے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس میں پٹنہ کالج کے دو سینیر اساتذہ کے علاوہ میں اور اختر اور سنڈیکیٹ کے ایک اردو داں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ مؤخر الذکر ممبر کا اس زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی پر بڑا اثر اور اقتدار تھا۔ ان کی رائے یونیورسٹی کے اکثر معاملات میں حاوی رہتی تھی۔ کمیٹی میں مسئلہ زیر غور یہ تھا کہ کتاب کے لئے کس قسم کے مضامین منتخب کئے جائیں۔ رائے صاحب یعنی غیر مسلم ممبر نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مضمون کسی اس قسم کا ہونا چاہئے جس میں تمام مذاہب کے مساوی ہونے کی تعلیم دی گئی ہو۔ تاکہ نوجوان طلبہ میں رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔ اس ضمن میں انہوں نے ہندی نصاب میں شمولہ اس قسم کے ایک مضمون کا حوالہ دیا جسے خود

انہوں نے سپردِ قلم کیا تھا۔

ابھی ہم لوگ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کس حکمتِ عملی سے اس تجویز میں ترمیم کی جائے کہ اختر نے بڑے سلیقہ اور ہوشیاری سے کہا

"رائے صاحب اس معاملے میں مجھے اختلاف ہے۔ اسلام کسی مذہب کو بُرا نہیں کہتا۔ وہ ہر مذہب کے ساتھ رواداری کا سبق دیتا ہے۔ بلکہ اس کے رہنماؤں کے احترام و تعظیم کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک تمام مذاہب کے مساوی ہونے کا سوال ہے، ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام سارے مذاہبِ عالم سے افضل و برتر ہے۔ اس لئے میں اس قسم کے مطالب کو شامل کرنے کا حامی نہیں ہوں۔ البتہ کوئی ایسا مضمون کتاب میں شامل کیا جانا چاہئے جو تعصب کی مذمت اور رواداری کی تعریف سے متعلق ہو۔"

اختر کی رائے سے سب لوگوں نے اتفاقِ رائے کیا اور اس طرح تجویز میں ترمیم ہوگئی۔

اختر نے میٹرک ۱۹۲۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد پٹنہ کالج کے فرسٹ ایر سائنس کلاس میں (اس وقت تک پٹنہ سائنس کالج عالمِ وجود میں نہیں آیا تھا) داخلہ لیا۔ آئی۔ ایس سی کلاس میں بھی وہ اچھے طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ منٹو مسلم ہوسٹل میں جو آج کل پٹنہ کالج کا جیکسن ہوسٹل ہے، رہتے تھے۔ جب میں ۱۹۲۷ء میں میٹرک پاس کرکے پٹنہ کالج کے فرسٹ ایر آرٹس کلاس میں داخل ہوا تو اکثر اختر کی ملاقات ان کے ہوسٹل میں ہوا کرتی تھی اور وہاں کتابوں، رسالوں اور شعر و سخن کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی۔ اختر نے مجھے قبولِ قادیانیت کی جو دعوت دی تھی اس نے ہماری دوستی پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالا تھا۔ ان کی تبلیغی تحریروں اور میرے تردیدی مراسلوں میں کسی تلخ گفتاری یا نامناسب جملوں کی کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ بلکہ خلوص اور پختگیٔ عقیدہ نے ایک دوسرے کو زیادہ متاثر کیا تھا۔ اور ہماری دوستی میں استواری پیدا ہوگئی تھی۔

کالج میں داخل ہونے پر اختر نے شعر کہنا شروع کردیا تھا اور ان کی تخلیقی صلاحیت ابھرنے لگی تھی۔ ان کے دو شعر جو اسی زمانے میں میں نے اس کی نوٹ بک سے اپنی بیاض میں نقل کئے تھے، یہ ہیں:

کسی کی بزم میں نہ جاؤ اختر
جگر کے ٹکڑے نکل پڑیں گے

تمہاری وحشت اُبل پڑے گی
جو اُن کے ابرو میں بل پڑیں گے

اسی نوٹ بک میں اختر کی ایک اور نظم بھی تھی جس کا عنوان تھا "دریا کے کنارے"۔ نظم نگاری کی یہ ابتدائی کوشش تھی۔ لیکن اسی سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آگے چل کر ایک اچھے ادیب بنیں گے۔ انہی دنوں سائنس کالج میں (یہ واقعہ ۱۹۲۷ء کا ہے) اردو کی ایک ادبی انجمن بنام "بزمِ سخن" قائم ہوئی تھی۔ پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم (جو اس وقت ایم۔ ایس سی کے طالب علم تھے اور جن کی قبل از وقت موت نے اردو کو ایک بے مثال ادیب سے محروم کردیا) اور اختر اس بزم کے روحِ رواں بنے ہوئے تھے۔ اختر مشاعروں کے لئے شعر بھی کہنے لگے تھے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ کے لئے مصرعِ طرح تھا "مرغِ دل آشیانہ چھوڑ دے"۔ اختر نے جو غزل کہی اس کے ایک شعر کا آخری حصہ یوں تھا "چُن چُنا نا چھوڑ دے" اس زمانے میں ڈاکٹر ابو نصر محمد علی حسن مرحوم پروفیسر عربی و فارسی منٹو مسلم ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ حالانکہ باطن مرحوم بہت ہی ہمدرد و شفیق استاد تھے۔ لیکن ان کا ظاہر بہت خشونت آمیز تھا۔ قواعد و ضوابط کی بہت سختی سے خود پابندی کرنے اور طلباء سے کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ نوجوان بورڈروں کی آزاد طبیعت ان پابندیوں کی کب متحمل ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ بورڈروں اور سپرنٹنڈنٹ میں آئے دن تصادم ہوتا رہتا تھا۔ لڑکے ان کو شرارت سے "چُن چُن" صاحب کہا کرتے تھے۔ اختر کا وہ شعر اسی شرارت کا زائیدہ تھا۔ مشاعرے میں تالی تو خوب پیٹی گئی لیکن استادوں کے سامنے اختر کو اپنی شوخی کے لئے جواب دہ بھی ہونا پڑا۔

انٹرمیڈیٹ سائنس کا امتحان پاس کرلینے کے بعد اختر پٹنہ میڈیکل کالج کے طالب علم بن گئے۔ یہاں بھی وہ اپنے ساتھیوں میں خاصے ممتاز تھے۔ لیکن ابھی تیسرے ہی سال میں تھے کہ ان پر مرضِ سِل کا حملہ ہوا۔ مجبوراً تعلیم ترک کردینی پڑی۔ علاج سے ان کو شفا ہوگئی اور وہ آرام اور سکون کی خاطر دیہات

چلے گئے۔ جہاں دو تین برس تک انہوں نے سیر و شکار اور کھیت کھلیان کے درمیان زندگی گزاری، مکمل آرام اور بے فکری نے ان کی صحت پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور وہ اس قابل ہوگئے کہ تعلیم جاری رکھ سکیں۔ لیکن سخت محنت کی اجازت نہ تھی لہذا اختر نے ڈاکٹری کی تعلیم کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اس کے بدلے نسبتہً کم محنت طلب کورس اختیار کیا۔ وہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں پٹنہ کالج کے بی۔ اے کلاس میں داخل ہوگئے۔

اختر کی زندگی کا یہی وہ دور ہے، جب ان کی فطری رومان پرستی جس نے اُن کو اسکول میں محبت کرنا اور کالج کے ابتدائی ایّام میں "دریا کے کنارے" ایسی نظمیں لکھنا سکھایا تھا۔ اپنے آب و تاب کے ساتھ نکھر آئی۔ اب ان کی شخصیت کے اس پہلو نے اظہار کی مختلف شکلیں اختیار کیں۔ انہوں نے مصوّری بھی شروع کردی تھی۔ ان کی بنائی ہوئی ایک رنگین تصویر مجھے اب تک یاد ہے۔ جس میں ایک "خواب نما دنیا" کا منظر دکھایا گیا ہے۔ ایک حسین وادی میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ایک نیم رو ندی کا کنارا، ساحل پر درختوں کے خاموش کنج، اُفق میں شفق کی کھلتی ہوئی سُرخی اور اس کے پیچھے ڈوبتا ہوا سورج جس کی سنہری کرنیں موجوں کو زعفران فام بنا رہی تھیں۔ اسی قسم کے مناظر اختر نے اپنی نظموں میں بھی پیش کئے ہیں۔ "اختر شیرانی کی طرح اختر اورینوی بھی ایک مثالی دُنیا " تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا" کی تشکیل کر رہے تھے۔ جہاں وہ عشق کے بازوؤں کے سہارے پہنچ جانا چاہتے تھے۔

اختر پر جوانی بھرپور طور سے طاری تھی۔ " افتد ودانی " کے تمام رازہائے سربستہ منکشف ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی رومان پرور طبیعت ایک ایسے فرضی فردوس کا نقشہ کھینچ رہی تھی جو ماہ پیکروں، لالہ لبوں، اور رعنا رخساروں سے معمور تھا۔ اُن کا دل حُسن کی ہر ادا پر قربان ہونے کو تیار، متاعِ صبر و قرار ہر وقت لُٹ جانے کو مستعد اور خرمنِ ہوش ہر برق پاش تبسّم سے شعلہ بداماں ہونے کو آمادہ رہتا تھا۔ خیالی نیلاؤں اور فرضی سلماؤں کے تصوّر سے اُن کی راتیں نشاط آمیز اور دن کیف بکنار رہتے تھے۔ اپنے دل کے تمنّا زار میں اصنام خیالی کو بساتے بساتے انہوں نے ایک حقیقی حور کو داخل کر لیا۔ اختر نے اس مجسّمہ مہر و وفا کو اپنی آرزوؤں کا مرکز اور اُمیدوں کا کعبہ بنا لیا۔ طالب و مطلوب دونوں ایک مقدس رشتے میں دائمی طور پر منسلک ہو گئے۔

ایک رومان پرست مزاج کو سُبک خرام ندی کا کنارا اور شوخ گفتار و تیز طرار دوشیزہ اُن کی صحبت میسر آجائے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سی جنت ہوگی۔ یہی شمر ال اَدُوا میں دریائے سون کے ساحل اور سانولی سلونی سالیوں کے جھرمٹ میں اختر کھو سے گئے۔ بھلا کون ایسا ہے جو ایسی فضا میں کھو نہ جائے۔ اس زمانے میں اختر نے نہ صرف اپنے رنگین تخیل سے حسین گلدستے سجائے، بلکہ اپنے گرد و پیش کو بھی شعریت اور شاعریت سے مالا مال کر دیا۔ کسی کو سوز عطا کیا تو کسی کو رعنائی خیال، کسی کو عذرا بنایا تو کسی کو شہلا۔ 'پام وہ' کی رومان گاہ میں اختر کی " وحشت اور اُبل پڑی"۔ یہاں انہوں نے ادب و انشا، شعر و افسانہ اور حُسن و عشق کی فضا میں بڑے رنگین لمحات گزارے ہیں۔ اختر کی کئی رومانی نظمیں اسی دورِ شباب کی یادگار ہیں۔ جن میں سے "ارمغانِ شباب" (سون کے کنارے) اسی 'عشرتِ فانی' کے تاثرات سے سرتاپیر معمور ہے۔

"سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم
سون کی وادی میں رقصاں غزالوں کا ہجوم
غنچۂ نو رس، ثمرِ تر، نونہالوں کا ہجوم
شاہدِ سرشار کے رنگین خیالوں کا ہجوم
قاتلِ جاں، عشرتِ دل نونگاروں کا ہجوم
برق خرمن سوز کا یا نو بہاروں کا ہجوم
دل، نظر، حسرت، تخیّل، شوق، جذبہ، آرزو
اک مری جاں اور اتنے بے قراروں کا ہجوم

ان رنگین دنوں کی یاد اختر کو اکثر تڑپاتی ہے۔ وہ ماضی کے ان پُر لطف لمحات کو زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظمیں "ابتکارات" اور "رومانِ رفتہ" ان ہی جلوہ ہائے گریزاں کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔

حُسن چاہے فطرت میں ہو چاہے عورت میں، اختر دونوں

ان دنوں محکمۂ سپلائی میں ملازم تھے۔ پاکستان جا رہے تھے۔ شریف کی سسرال لکھنؤ ہے اور وہ دہلی سے عازمِ سفر ہونے والے تھے۔ ان کو الوداع کہنے کے لئے میں اور اختر دونوں لکھنؤ پہنچے۔ یہاں اختر نے اُردو کی دو مشہور افسانہ نگار بہنوں یعنی خدیجہ مستور، اور ہاجرہ مسرور سے (جو اب پاکستان کی شہری ہیں) بھی ملاقات کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ہم ایک دن ان دونوں بہنوں کے گھر پہ حاضر ہوئے۔ گھر میں اس وقت کوئی مرد غالباً موجود نہ تھا۔ ایک خادمہ نے ہم دونوں کو بالائی منزل کے ایک سلیقہ سے سجے ہوئے کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ ہم دونوں کے ساتھ شریف کی سسرال کا ایک لڑکا بھی تھا جس نے ہماری رہنمائی یہاں تک کی تھی۔ ان دونوں بہنوں نے ہمیں خوش آمدید تو کہا، لیکن دونوں پردے کے پیچھے مستور رہیں۔ البتہ ان کی ایک چھوٹی بہن ہمارے لئے پان اور پیالی لے کے سامنے آتی رہی۔ اختر نے بہت دیر تک باتیں کیں ذاتی معاملات سے لے کر ادبی مسئلے تک موضوعِ گفتگو بنے۔ اختر نے بار بار اشاروں اور کنایوں میں یہ تقاضا کیا کہ درمیان سے حجاب اُٹھ جائے۔ انہوں نے بھی اس تقاضا کو سمجھا لیکن اشاروں ہی میں اپنی معذوری بھی ظاہر کی کیونکہ ان کا ہم شہری ایک لڑکا جو ہمارے ساتھ تھا! گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے والا! اگرچہ اس ملاقات سے ہم دونوں بیحد مسرور ہوئے۔ لیکن اختر کو بے پردہ نہ دیکھنے کا بیحد صدمہ و تاسف ہوا۔ اس ملاقات کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں نے تقسیمِ ہند پر گفتگو میں بہت سی طنزیہ باتیں کہیں۔ ان کے بھائی "ابا" زبردست کانگریسی تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کا یہ قول نقل کیا کہ "اب تاج محل اور لال قلعہ کے بھی حصے بخرے کئے جائیں گے۔" قیامِ پاکستان کے کچھ ہی دنوں بعد یہ دونوں بہنیں پاکستان کو ہجرت کر گئیں۔ اور انہوں نے وہاں سے اختر کو خط لکھے۔ اختر کو ان کی ہجرت پر سخت تعجب ہوا اور انہیں لکھا کہ "لال قلعہ اور تاج محل تو اپنی جگہ پر قائم رہے البتہ آپ تقسیم ہو کر پاکستان کے حصے میں چلی گئیں۔"

تقسیم کے بعد جو مسلسل روح فرسا واقعات و حادثات ہمارے

کی کشش کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس کے مشاہدے سے روحانی مسرت اور سرمدی کیف حاصل کرتے ہیں۔ حسین مسکراہٹوں، شیریں قہقہوں، رقص و نغمہ اور تصویر سے ملی جلی جمیل اداؤں، مترنم گفتاروں کے درمیان ان کا احساسِ دل بہت لذت اندوز ہوتا ہے۔ عورت کی محبت ان کے لئے نشاط و انبساط کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ وہ تسکین بخش لمحوں کے سایہ میں لمحاتِ ملاقات کو طویل سے طویل تر بنانے کے آرزو مند رہتے ہیں۔ ایسے وقت میں خود ان کی گفتگو میں رس اور لوچ شیرینیت اور رومانی خوابناکی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی باتیں شگفتہ، شوخ اور تازہ و بامزہ ہو جاتی ہیں۔ اپنے افسانہ "شادی کے تحفے" میں اختر نے خود لکھا ہے۔

"عورت زندگی کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ اگر عورت کی قربت بلکہ رفاقتوں کے ایک گوشے میں بھی زندگی کی لڑائی سے تھکے ہوئے مرد کو تھوڑی سی جگہ مل جائے تو وہ اس کے لئے نعمتِ سرمدی ہے۔ عورت کا صرف ایک نگاہِ التفات، ایک ہلکی سی یگانگی، ایک مختصر سی توجہ بھی کمھلائی ہوئی زندگی کے لئے سامانِ شگفتگی ہے۔"

ایک دوسرے افسانہ "مریض" میں عورت کی اہمیت و افادیت اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"صنفِ مقابل زنگار ہے۔ جب یہ زنگار زندگی شیشے میں لگ جاتا ہے۔ تو ہم اس میں اپنی خودی کو دیکھتے ہیں۔ مرد اپنی مخفی و جلی صلاحیتوں کو اس وقت تک رُو برو نہیں دیکھ سکتا جب تک اسے نازک و سریع الحس ہونے کا توسط حاصل نہ ہو جائے جیسے عورت کہتے ہیں۔"

اختر اسی "التفات اور یگانگی" کے ہمیشہ متقاضی رہے ہیں۔ وہ "حسنِ بے پروا" اور "محبوب در حجاب" کے قائل نہیں۔ وہ ادائے دلبری اور [illegible] بیزار ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں جب تقسیمِ ملک اور آزادیٔ ہند و پاکستان کے اعلان کے بعد ملازمانِ حکومت کی ادلا بدلی ہوئی تو ہم دونوں کے ایک مشترک دوست شریف الدین احمد عظیم آبادی جو

ملک میں رونما ہوئے اور چند سالوں تک خوف و رجا کی کشمکش میں زندگی گزارنی پڑی ہے۔ اس سے اختر کا دل بہت متاثر ہوا ہے۔ ان میں اب پہلی سی رومان پرستی نہ رہی۔ اس کے علاوہ سن کا بھی تقاضا ہے کہ فریب تخیل سے دور رہیں۔ چنانچہ وہ اب بڑی حد تک حقیقت پسند اور واقعیت پرست بن گئے ہیں۔ جوانی میں صنف نازک کے لئے جو کشش وہ محسوس کرتے تھے وہ اب باقی نہیں رہی۔ محبت اور رومان کی چنگاریاں سرد پڑ گئی ہیں۔

بی۔ اے فائنل امتحان کے دوران میں اختر پر ان کے پرانے مرض سل کا پھر حملہ ہوا۔ یہ حملہ سابق کے مقابلے میں کٹھن تھا۔ جوں توں امتحان ختم کر کے وہ پھر "بار بستر" بن گئے۔ اس مرتبہ انہیں علاج خصوصی کیلئے رانچی کی صحت گاہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں کی صحت بخش آب و ہوا اور علاج نے مسیحائی کی اور ڈیڑھ سال تک اٹکی سینا ٹوریم میں رہنے کے بعد تندرست ہو کر وہ گھر کو واپس آئے۔ سینا ٹوریم میں قیام کے دوران بیماری کو بھلانے اور صحت گاہ کی فضا کی احساس کی تلخی کو کم کرنے کے لئے اختر نے کتابوں اور رومان کا سہارا لیا۔ اس زندگی کی یادگار میں اختر نے تین افسانے لکھے ہیں۔ ایک تو "سینا ٹوریم کا فقیر" دوسرے "مریض" تیسرے "کلیاں اور کانٹے"۔ سینا ٹوریم سے واپس آنے کے بعد اختر نے پھر تعلیم کی طرف توجہ کی۔ دوران امتحان میں خون تھوکنے کے باوجود وہ بی اے کا امتحان انگریزی میں آنرز کے ساتھ پاس کر چکے تھے۔ اس مضمون میں وہ یونیورسٹی بھر میں تیسرے نمبر پر رہے تھے۔ اب اختر نے اردو میں ایم، اے امتحان کی تیاری کی اور امتحان میں شریک ہو کر شاندار کامیابی حاصل کی۔

کچھ عرصہ تندرست رہنے کے بعد اختر پر پھر دوسرے مرض کا حملہ ہوا۔ اس مرتبہ وہ وجع المفاصل میں مبتلا ہوئے۔ اس مرض نے انہیں نہ صرف جسمانی طور پر عرصہ دراز کے لیے مفلوج سا کر دیا بلکہ قلب و دماغ پر بھی برا اثر ڈالا۔ ان کا قلب کمزور ہو گیا اور دماغ جو ایک مرض سے صحت یاب ہونے کی وجہ سے بالیدگی محسوس کر رہا تھا مایوسی بادلوں میں گھر گیا۔ ان کی صحت بگڑ گئی۔ اور انہیں پھر صحت گاہ و ہسپتال

اور اسپتال کے پھیرے لگانے پڑے۔ مہینوں تک بیماری سے جدوجہد کرنے کے بعد آخر ان کی کھوئی ہوئی صحت اس حد تک لوٹ آئی کہ وہ زندگی میں دلچسپی لینے لگے، اور کاروبار دنیا کی طرف توجہ کرنے کے قابل بن گئے۔ جب تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے، ان کے علاج معالجہ پر ان کے والد نے اپنا قلیل سرمایہ صرف کر دیا۔ لیکن جب بدن میں توانائی اور قلب میں قوت آ گئی تو اختر نے خود کفیل بننے کا تہیہ کر لیا۔ اور آخر کار ۱۹۳۹ء میں وہ پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ جب سے وہ تعلیم و تدریس اور ادب اردو کی خدمت میں دل و جان سے منہمک ہیں۔ لیکن صحت کے بارے میں وہ بہت محتاط رہتے ہیں۔ رہنے کے لیے کھلی اور ہوا دار جگہ، کھانے کے لیے عمدہ، قوت بخش غذائیں۔ اکثر و بیشتر دوائیں اور ٹانک، آرام کرنے کے لیے پابندی وقت کا لحاظ۔ رات کو زیادہ دیر تک جلسوں میں بیٹھنے سے پرہیز، بارش میں بھیگنے اور زیادہ سردی میں باہر نکلنے سے ہمیشہ مخالف، زیادہ تھکا دینے والے کام سے اجتناب، غرض وہ ہر لحاظ سے محتاط اور پرہیزگار آدمی ہیں۔ اگر وہ اپنے آپ کو سنبھال کر نہ رکھیں تو نہ جانے پھر کن کن مرضوں میں مبتلا ہو جائیں۔

اختر کی پُر مصائب زندگی نے انہیں چند بیش بہا تحفے بھی دیے ہیں۔ بیماری کے دنوں میں جب مرض کی شدت اور اذیت میں کمی واقع ہوتی تھی تو وہ اپنا وقت کتابوں کے مطالعہ میں گزارتے تھے۔ اور اس طرح بیکاری کے لمحوں کو سونے کے ذروں میں تبدیل کرتے تھے۔ بستر مرض اور اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے انہوں نے مختلف موضوعات مثلاً ادب، سیاست، انتقاد، معاشیات، فلسفہ، مذہب و اخلاق کے متعلق بیسوں معیاری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ سائنس اور میڈیکل کی کتابیں کالج میں پڑھ چکے تھے، کثرت مطالعہ نے ان کے علم میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر دی ہے۔ ذہین ہونے کے سبب انہوں نے مختلف علوم کے کار آمد معلومات کو اپنے دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح سمو لیا ہے کہ وہ اس بیش بہا خزانہ کے لولو درخشاں اور گہر ہائے آبدار سے اپنے عروس سخن کی مشاطگی

کرتے رہتے ہیں۔

ان کی قوت مشاہدہ اور ادبی بصیرت جو انہوں نے ایام بیماری میں حاصل کی ہیں ان کے افسانوں اور تنقیدی مضامین سے عیاں ہیں۔ ان کی بیماری کی ساعتوں میں مختلف مسائل پر غور و فکر کا بھی موقع ملا ہے۔ اور ان سے انہوں نے مفید نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔ افسانہ "سینا ٹوریم کا فقیر" کے ابتدائی جملے میں اختر نے خود اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "فکر و خیال کے لئے سب سے زیادہ موزوں وہ لمحات ہوتے ہیں جنہیں بیکار کہا جاتا ہے۔"

اختر کی شخصیت و کردار کا ایک بہت ہی اہم پہلو اُس کی زبردست رجائیت ہے۔ اختر کے اندر زندہ رہنے کا ایک آہنی ارادہ اور استوار عزم ہے۔ ان کو عین ایام شباب میں زندہ رہنے کے لئے موت سے سالوں سال تک مسلسل جد و جہد کرنی پڑی ہے۔ وہ مرض سل کا ایک ایسے زمانے میں شکار ہوئے جب اُسے مرض الموت سمجھا جاتا تھا۔ جب اس سے بچنے کی کامیاب تدبیر نہ تھی۔ اس کا واحد علاج اے، پی تھا۔ وہ بھی جبکہ مرض ابتدائی حالت میں ہو۔ اور ایک ہی طرف کا پھیپھڑا متاثر ہو۔ لیکن اے۔ پی کا مرہون و ممنون انسان درحقیقت زندہ لاش ہی تصوّر کیا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں اختر کو اپنی زندگی کی کون سی امید ہو سکتی تھی، یا صحت یاب ہو کر ایک نارمل انسان کے مانند کاروبار زندگی میں حصّہ لینے کا خواب وہ کیسے دیکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے استقلال اور پامردی کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کیا۔ مرض کے شدائد برداشت کئے۔ اسپتال کے مرض بردامن اور کربناک و اذیت بکنار ماحول سے مطابقت پیدا کر لی، کڑوی کسیلی دواؤں کے تلخ گھونٹ فرو کئے یہ سب اس لئے کہ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ موت سے لوہا لیتے رہے، اس کو پرے ڈھکیلتے رہے اور آخر کار انہوں نے اس پر فتح حاصل کر لی۔ اس میں شک نہیں کہ ان پر محرومی یا مایوسی کا بعض مرتبہ شدید دورہ بھی پڑا۔ وہ نہ صرف اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے بلکہ خدا سے بھی نا امید ہو گئے۔ اپنی صلاحیتوں کو مٹتے، اپنی تمنّا کو خاک میں ملتے اور اپنے مستقبل کے خواب کو چکنا چور ہوتے دیکھ کر وہ مایوسی و حرماں کے اتھاہ سمندر میں غرق ہونے لگے۔ لیکن یہ کیفیت محض مختصر عرصے کے لئے ان کے دل و دماغ پر طاری رہی۔ وہ بہت جلد اس سمندر سے اُبھر آئے۔ اُمید کی کرنوں نے غم و اندوہ کے بادلوں میں چمک پیدا کی۔ یقین و اُمید، عزم و استقلال اور مہر و محبت نے حیات و ممات کی اس کش مکش میں ان کی مدد کی اور وہ متعدد بار عدم کی سرحدوں کو چھُو کر کارگاہِ ہستی میں لوٹ آئے۔

اختر کی ازدواجی زندگی یوں تو میاں بیوی کی والہانہ محبت کے باعث بڑی پُر سکون اور جنّت بکنار گزری ہے۔ لیکن اس دُنیا میں ایک زبردست خلا بھی ہے۔ ان کا نخلِ محبت ہنوز ثمر سے محروم ہے یہ ایک ایسی محرومی ہے جس پر نہ صرف ان کے اعزّا اور احباب کڑھتے ہیں بلکہ خود اختر اور شکیلہ اختر کو بھی اس کا اذیت دہ احساس ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے افسانوں میں اس احساس کی دردناک ترجمانی کی ہے۔ لیمپ کے ڈریم چلڈرن (DREAM CHILDREN) کی طرح اختر اور شکیلہ نے بھی خیال کی دنیا اور تصور کے عالم میں ان ننھے فرشتوں کو ہمکتے دیکھا ہے، جو زینت آغوش اور رونق کاشانہ ہوتے ہیں۔ اس دردناک خلا کو پُر کرنے کے لئے اختر نے پہلے اپنے چھوٹے بھائیوں اور سالے سالیوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ اور ان پر محبت و شفقت کے وہ خزانے لٹائے جو اپنی اولاد کے لئے وقف ہو سکتے تھے۔ جب یہ بھائی اور سالے سالیاں جوان و کتخدا ہو کر اپنے اپنے گھر بسانے چلی گئیں تو ان کے بال بچوں کو اپنے گھر بھر لیا۔ خصوصاً اپنے چھوٹے بھائی کے بچوں کو وہ اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔ (ابھی حال میں ایک بچّے نے داغ مفارقت دیا تو اختر اور شکیلہ کے دلوں پر جو گزری وہ ناقابل بیان ہے۔ اختر مدتوں تک آپے میں نہیں آئے۔ اور شکیلہ کا یہ حال ہے کہ آنکھیں کسی وقت آنسوؤں سے خالی نہیں رہتیں۔ اس موت نے اختر کو ایسا متاثر کیا ہے کہ وہ بجھ سے گئے ہیں۔)

اختر کا گھر بھائی بہنوں، سالے سالیوں کے بچّوں کے علاوہ اپنے عزیز رشتہ داروں سے بھی گلزار رہتا ہے۔ کبھی اور بن کا قافلہ اور کبھی

شرف عظیم آبادی

شرف الدین شرفؔ عظیم آبادی سن۳۰ سے سن۴۰ کے دوران اپنی انشائیہ نگاری کے لئے کافی شہرت رکھتے تھے۔ ادھر کئی برسوں سے بالکل گمنام تھے۔ اب ساغرِ نو کا اختر اورینوی نمبر انھیں کھود کر نکالنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ شرف صاحب اختر صاحب کے نہایت گہرے، ہمراز دوستوں میں سرِ فہرست رہے ہیں۔ وہ برسوں قبل بھی اختر صاحب کے متعلق انشائیے لکھ کر مشہور ادبی رسالوں میں چھپوا چکے ہیں۔ یہ خط رضا نقوی کے نام لکھا ہے:

(ادارہ)

پیارے رضا! السلام علیکم۔ ہنس بھیج، ممنون کار!!

تمہارا خط بغیر کسی تمہید کے یکایک مل گیا۔ میں اس کے لئے پیچ و جو... بالکل تیار نہیں تھا جب سے "بلڈ پریشر" کا (جس کا اردو ترجمہ اس مرض سے زیادہ تکلیف دہ ہے) شکار ہوں، اطبا کے مشورہ اور اپنے تجربے کی بنا پر یہاں ہر اس خط کو جو ہندوستان یعنی بھارت سے اپنے کسی عزیز یا دوست کا آتا ہے پڑھنے سے پہلے ایک دوا کھا لیتا ہوں تاکہ ان خطوں میں عام طور پر جو خبریں ہوتی ہیں ان کو پڑھ کر دونوں مگر زندہ رہ سکوں۔ اسلئے میں اپنے بھارتی عزیزوں اور دوستوں کو ہر آنے جانے والے سے کہلوا دیتا ہوں کہ بھائیو! (اور بہنو) آپ لوگ کرپا کر کے مجھے خط بھیجنے سے پہلے کسی سے اس کی پیشگی اطلاع دیدیا کریں تاکہ میں اس کے مقابلے کے لئے تیار رہوں۔ بات یہ ہے کہ ادھر دس بارہ سال سے ہوتا یہ رہا ہے کہ جب بھی وہاں سے کسی کا خط آتا ہے تو اس میں صرف دو ہی خبریں ہوتی ہیں۔ یعنی یا تو یہ کہ "عزیزی فلاں سلمہا یا سلمہا کی شادی خانہ آبادی فلاں تاریخ قرار پائی ہے۔ بڑی خوشی ہوتی اگر آپ بھی شریک ہوتے، مگر دوری اور مجبوری کو دیکھتے ہوئے کیا کہوں۔ بہرحال آپ کی دعاؤں کا امیدوار ہوں" یا پھر یہ کہ "نہایت افسوس کے ساتھ اطلاعاً عرض ہے کہ فلاں روز فلاں صاحب یکایک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون" ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی خبریں تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اسلئے تمہارا خط جب ملا تو میں نے انتہائی بدحواسی میں اسے اِدھر اُدھر سے دیکھنا شروع کیا۔ چونکہ تحریر تمہاری تھی اسلئے ایک طرف سے تو اطمینان ہو گیا مگر تم نے دوسروں کی ذمہ داری تو لی نہیں ہے، لہٰذا میری پریشانی حق بجانب تھی۔ بہرکیف جب یہ یقین ہو گیا کہ نہ تو کسی کی شادی کا بلاوا ہے نہ کسی کی روانگی کی اطلاع تو پھر میں نے تمہارے خط کو جس کو تم جانتے ہو، میں نے ہمیشہ "شرارت نامہ" سے موسوم کیا ہے۔ واقعی پڑھنا شروع کیا۔ لیکن اس کے بعد کئی روز تک مجھ پر کیا کیفیت طاری رہی اس کی تفصیل میں لکھنا نہیں چاہتا ایسی چیزیں لکھی نہیں جاتیں، محسوس کی جاتی ہیں، لیکن کیا معلوم کر اس

سترہ سال کے بعد تم میں قوتِ احساس باقی بھی رہی ہے یا نہیں۔

ہاں! تو تم نے یہ لکھا کہ بہار کے چند صاحبِ ذوق نوجوان ایک رسالہ "ساغر" نکالتے ہیں اور چونکہ اب اس کا "اختر اورینوی نمبر" نکل رہا ہے اسلئے اس میں میری شرکت بھی بے حد ضروری ہے۔ مجھے میری قبر میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ تم اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں جو تقریباً تیس سال سے بند تھیں۔ قبر کی کھڑکیوں سے دور دور تک نظر دوڑائی۔ کچھ احباب جنت میں دکھائی دیئے، کچھ دوزخ میں۔ اختر کو دیکھا کہ وہ حضرتِ رضوان کو اپنا ہم خیال بنانے کے بعد حوروں کی محفل میں بیٹھے حسبِ عادت ان بیچاریوں کو بھی "زہرِ عشق" کا درس دے رہے ہیں۔ سامنے سید حسن بھی ہیں مگر اُن میں اتنی جرأتِ رندانہ کہاں؟ اختر کی آڑ میں حوروں کو دیکھنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن جب سامنا ہوتا ہے تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ محسن بیچارے ان دونوں کی مختلف کیفیتوں کو دیکھ دیکھ کر محض مسکرا رہے ہیں۔ دوسری کھڑکی سے دیکھا تو تم اور سہیل نظر آئے اور اس طرح کہ سہیل تمہارا تعارف "ملک الموت" سے کرا رہے ہیں جو تم سے پہلے ہی سے واقف تھے۔ اور پھر تم تینوں مل کر کوئی بہت ہی خطرناک منصوبہ تیار کر رہے ہو۔ ان دلچسپ نقشوں کو دیکھ کر مجھ میں زندگی کی لہر ایک بار پھر دوڑ گئی اور میں مجبور ہو گیا کہ اختر کے لئے اگر کوئی نئی چیز نہیں لکھ سکتا تو کم سے کم کچھ پرانے ہی نسخے تمہیں بھیج دوں تاکہ خدا کے یہاں مجھے جواب نہ دینا پڑے۔ اختر کو بحیثیتِ ادیب پیش کرنے والے تمہارے ملک میں کافی ہوں گے اور بحیثیتِ شوہر تو اُن کو صرف شکیلہ ہی پیش کر سکتی ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ اختر کو بحیثیتِ "اختر" پیش کرنے کا حق سوائے میرے کسی کو نہیں پہنچتا۔ یہاں تک کہ اختر کو بھی نہیں۔

تم نے میرے اُس مضمون کی کاپی مانگی ہے جو مدت ہوئی میں نے "دیوار قہقہہ" کے عنوان سے جناب فکر تونسوی صاحب کی فرمائش پر اُن کی کتاب "خد و خال" کے لئے دلی سے لکھا تھا۔ کس قدر مشکل تھی اس فرمائش کی تعمیل! لیکن تمہاری خوش قسمتی سے مجھے اس کا مسودہ محض اتفاقاً اپنے اثاث البیت میں مل گیا۔ یہ مضمون جون سنہ ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا تھا یعنی اب سے اٹھارہ سال پہلے، لیکن اس کو پڑھنے کے بعد آنکھیں بند کیں تو اختر کو آج بھی اُسی طرح ہنستا ہوا پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں اختر کو کافی حد تک پیش کیا جا چکا ہے جو اس ظالم کی رسوائی کے لئے کچھ کم نہیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے میں اختر کی صورت کو ترس رہا ہوں اسلئے معلوم نہیں اس اثنا میں وہ اور کیا کچھ ہو چکے ہیں۔ میں نے سنا ہے "اورینوی" کے علاوہ وہ اب "ڈی لٹ" بھی ہو گئے ہیں۔ اور تمہارے خط سے تو یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے اب کسی مجبوری کی بنا پر خضاب لگانا شروع کر دیا ہے۔ بڑی غیرت ہوئی مجھے یہ سن کر۔ میں اس لحاظ سے گویا خوش قسمت ہوں کہ لندن کے پنج سالہ قیام میں اللہ نے مجھے مکمل طور پر "فارغ البال" بنا دیا۔ ثبوت میں اپنی تصویر پیش کر رہا ہوں۔

ناظرینِ و ناظراتِ "ساغر" جب "دیوار قہقہہ" کو دیکھیں گے تو مجھے یقین ہے کہ اُن کو اختر کی اس تصویر میں جو اُن کے دل و دماغ میں اب تک نقش ہو چکی ہے کچھ اور بھی خد و خال نظر آنے لگیں گے۔ وہ دیکھ لیں گے کہ جس شخص کو وہ ابتک جناب اختر اورینوی صاحب ایم۔ اے "ڈی لٹ"، صدر شعبہ اُردو پٹنہ یونیورسٹی یا ہندوستان و پاکستان کا ایک مشہور مصنف، افسانہ نگار، شاعر، مقرر، مبلغ یا خدا جانے کیا کیا سمجھے ہوئے تھے وہ کبھی ایک نہایت بلند قسم کا نوجوان تھا جس میں جرأتِ رندانہ کی صلاحیتیں سن بلوغ کو پہونچنے سے پہلے ہی نمایاں ہو گئی تھیں۔ جو ہمیشہ سے پرلے درجہ کا عاشق مزاج رہا ہے، جس نے خدا جانے کتنوں کا علی الحساب محسوس کرا کے چھوڑا ہے کہ جنستانِ رنگ و بو میں اُن کا ایک خاص مقام ہے۔ ٹی۔ بی تو ایک معمولی سی بیماری تھی جو اس کے پاس محض غلطی سے آ گئی تھی اور جب اس غریب نے دیکھا کہ اختر میں اس سے بھی زیادہ خطرناک جراثیم پہلے سے موجود ہیں تو اس نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ ہمیشہ کیلئے چلی جائے۔ دراصل اختر میں ہمیشہ ہی سے ایسے ایسے جراثیم کارفرما رہے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ اب اس کا کیا جواب ہے کہ یہ حضرت نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہوئے ایک دیہات میں پہونچے جہاں کی بیچاری معصوم لڑکیاں اپنے گھروں کی چار دیواریوں سے کبھی باہر نہیں نکلی تھیں۔ لیکن جونہی یہ کسی لڑکی سے باورچی خانہ ہی میں بھی ملتے ہیں تو وہ غریب بے ساختہ شعر کہنے لگتی ہے۔ وہ خود گھبراتی ہے کہ یہ کیا ہو گیا لیکن جب اپنی کسی سہیلی یا بہار کی ہوا، تنہائی میں "سکھی" سے کہتی ہے تو وہ ٹوکتی ہے کہ اُسکا سکھی کبھی جواب

شعر کہا میں دے رہا ہے۔ اس طرح یہ وبا سارے گاؤں میں پھیل جاتی ہے۔ اور آخر میں یہ ساری لڑکیاں خود اختر کے پاس فریاد لیکر آتی ہیں کہ

"تم ہی نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا"

لیکن اس ظالم سے آنکھیں چار ہوتے ہی اب وہ سب کی سب بجائے شعر کے بے ساختہ غزلیں سُنانے لگتی ہیں۔ پھر تو یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ہر طرف اور ہر وقت محفلِ مشاعرہ گرم ہے۔ اور مسندِ صدارت پر جناب اختر صاحب مستقل طور پر براجمان ہیں۔ اس کیفیت کی طرف خود شکیلہ نے بھی ۱۹۵۶ء میں "نقوش" کے "شخصیات نمبر" میں خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"اختر صاحب اکتوبر کی چھٹیوں میں اردل جو آئے تو ایک دم سے راجہ اندر بن کر آئے۔ وہ دن بڑے یادگار طور پر گزرے ہیں۔ ہم سب کی سب اختر صاحب کے گرد ایک گھیرا لگائے بیٹھی رہتیں۔ کسی کے ہاتھ میں بانگِ درا ہوتا اور کسی کے ہاتھ میں دیوانِ غالب۔ ہر طرف بس دیوان ہی دیوان نظر آتے تھے۔ مومن کی شاعری چھڑتی، غالب کا اندازِ بیان سمجھایا جاتا اور اقبال کے ترانوں میں ماضی پر تبصرے ہوتے رہتے۔ اختر صاحب نے ایک خالص شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہمارے دلوں کو امنگوں سے بھر دیا تھا۔ شاعری اور احساسِ شعری سے ہم اتنے ہم آہنگ ہو گئے تھے کہ اچانک طور پر ہم ساری بہنوں نے ایک ہی ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ اختر صاحب حیران ہو گئے۔ یہ سون کے میٹھے پانی کے کرامات تھے جو ایک ساتھ ڈیڑھ لڑکیاں جذباتی شعر کہنے لگ گئیں جو تعلیمی لحاظ سے بے حد کمزور تھیں۔ پام دلا پورے طور پر شعر و ادب کا گہوارہ بن کر رہ گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک بہت باتیں ہوتی رہتی مصرع طرح دیا جاتا، شعر لکھے جاتے اور محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی۔

صدارت کی کرسی اختر صاحب کے لئے مخصوص تھی اور باری باری عائشہ تمیم، شکیلہ اختر، عزیزہ نگار، رضیہ رعنا، نصیرہ راز، اور نسیم سوز اپنا کلام سُنا کر دادِ تحسین حاصل کرتیں۔ اندر سبھا کی محفلیں جمی رہتیں اور راجہ اندر اپنی جگہ پر استقامت رہتے۔"

ایک جگہ اور لکھا ہے:

"گھنٹوں وہ شیلی، کیٹس، بائرن اور براؤننگ کی نظمیں مجھے سمجھاتے رہتے۔ کبھی دیر دیر تک غالب، میر اور اقبال سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے مجھ کو انکی خصوصیات بتاتے۔ اس وقت اُن کے الفاظ اور خیالات کی روانی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ علم کا یہ سمندر کسی بہت بڑے ساحل سے ٹکرانے کو بے چین ہے۔۔۔

اور میں؟"

ہاں، تو سن لیا تم نے؟ یہ ہے اختر کے اعمالنامے کی ایک مختصر سی جھلک خود شکیلہ کی زبانی۔ اس بیچاری نے تو بہت رک رک کے لکھا ہے مجھ سے سُنو کہ ہوتا کیا تھا۔ بیچارے شیلی یا کیٹس کو تو اختر اپنی اندر سبھا میں محض اسلئے لے آتے تھے کہ اس طرح اُن معصوم گوپیوں پر اُنکی راجہ اندری کی دھونس قائم رہے۔ اسی خیال سے "بانگِ درا" کے بھی دو چار مشکل اشعار سنا دیئے جاتے تھے کیونکہ وہاں علامہ اقبال تو موجود ہوتے نہیں تھے جو اس کی گواہی دے سکتے کہ اُن کے اشعار کی صحیح ترجمانی ہو بھی رہی ہے یا نہیں۔ اس سبھا میں میر اور مومن یا غالب تو کم مگر البتہ داغ بہت زیادہ پیش پیش رہتے تھے۔ میں نے تو یہی دیکھا کہ غالب کا درس دیتے وقت بھی جناب پروفیسر صاحب ایک ایک سے باری باری پوچھ رہے ہیں کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ اس مصرعے کا مطلب کیا ہے ؎ "غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے منہ دکھا کہ یوں" ؟ اور جب کسی طرف سے اُمید افزا جواب نہیں ملتا تو پھر یہ بگڑ کر خود سے دوسرا مصرع ایک اچھے فنکار کی طرح پڑھ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے غالب نے اس سے زیادہ زوردار شعر اور کیا کہا ہوگا۔ اسی طرح جب داغ کے کلام پر تبصرہ شروع ہوتا تو کبھی ان کا وہ شعر پیش کیا جاتا جس کا پہلا مصرع ہے "ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی"؟ اور سامعین سے فرمائش ہوتی کہ اس کا دوسرا مصرع سناؤ۔۔۔ یا پھر یہ سوال پیش ہو جاتا کہ کسی کا جو وہ شعر ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اس کے دونوں مصرعے اتنے بے ربط کیوں ہیں اور اگر کوئی ربط ہے تو کہاں پر ہے؟ اور واقعی یہ بات مجھ میں بھی نہیں آتی کہ انگڑائی لینے

میں بعض لوگ اس قدر احتیاط سے کیوں کام لیتے ہیں کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ بھئی اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوا؟ آخر انگڑائی ہی تو لی تھی۔
مگر نہیں، اختر اس شعر میں بھی نئے نئے معنی پر دستے۔ چونکہ وہ تھوڑے سے ڈاکٹر بھی ہیں اسلئے بڑی تفصیل سے یہ بتاتے رہتے تھے کہ انگڑائی کی کتنی قسمیں ہیں اور کس وقت یا کس عمر میں کس قسم کی انگڑائی لی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ انگڑائی لینے والے پہ کون سی کیفیت طاری رہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس انگڑائی کے دیکھنے والے پہ کیا گزرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

شکیلہ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "یہ سون کے میٹھے پانی ہی کا اثر تھا جو ایک ساتھ ساری لڑکیاں شعر کہنے لگیں"۔ بھئی، اس سون کے پانی کی کراماتوں کو تو بس کچھ پوچھو نہیں۔ پتہ نہیں اس میں وہ کون سے کیمیاوی اجزا موجود ہیں کہ جس نے اس کا ایک بار بھی پانی پی لیا وہ کچھ عجیب چیز ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک نمایاں اثر تو یہ ہے کہ اس کو پینے کے ساتھ بچپن ہی میں شباب کی ساری رعنائیاں ابھر آتی ہیں۔
اور اگر عالم شباب میں کسی نے پی لیا ہے تو اس پر کبھی بڑھاپا نہیں آنے پاتا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ اگر کسی بڈھے کو بھی اسکی ایک خوراک مل گئی تو اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہونے لگیں۔ اختر نے برسوں سون کا پانی پیا ہے۔ مدتوں اس میں غوطے لگائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ان کو وہی ہونا چاہیے تھا جو وہ ہو گئے ہیں ورنہ ان کو اگر سون کا پانی اس فراوانی سے نہ ملتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ تمام عمر اورین کے پہاڑی گاؤں میں صبح کاندھے پہ اپنا ہل لے کر بیلوں کے پیچھے پیچھے اپنے کھیت پہ جاتے اور شام کو تھکے ماندے کسان کی طرح لوٹتے اور بجائے افسانہ لکھنے کے کوئی ملہار گاتے رہتے۔ سون سے ان کو خود بڑی محبت رہی ہے۔ بقول انہی کے ـــــ

سبزہ شاداب پر پھیلا جاڑوں کا ہجوم ۔ سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
"شاعر سرشار کے رنگین خیالوں کا ہجوم"

سون کے پانی نے ان میں کچھ عجیب عجیب چیزیں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً وہ اچھے خاصے صحیح الدماغ انسان کو باتوں باتوں میں پورا پاگل بنا دیتے ہیں۔ جس کو چاہیں جس سے عشق کرا دیں اور جب ضرورت سمجھیں اس کے عشق کو کسی دوسری طرف منتقل کر دیں اور پھر دونوں میں شادی کرا کے ہی چین لیں۔
دور کیوں جاؤ، تم جانتے ہی ہو خود میرے ساتھ اس ظالم نے کیا حرکت کی ہے۔ میں ۳۳ء میں اچھا خاصا علیگڑھ سے بی۔ اے کرکے واپس آیا۔ اور خیال تھا کہ ۳۴ء میں ایم۔ اے کے لئے بھی وہیں جاؤں گا۔ اسی اثنا میں میری والدہ بیمار پڑ گئیں اور میں نہ جا سکا۔ اسی سال یہ حضرت ڈہرہ دون سے بیرنگ واپس ہو کر سون کا پانی پینے ارول جا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں بھائی جان مرحوم جہان آباد میں کوآپریٹو بینک کے منیجر تھے۔ اور اختر کے خسر شاہ توحید صاحب مرحوم سے ان کے بے حد مراسم تھے۔ میں پٹنہ سے جہان آباد گیا ہوا تھا۔ وہیں اختر سے ملاقات ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم لوگ بے تکلف ہو گئے۔ اختر نے مجھے ارول آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ فوراً ہی بعد میں وہاں گیا۔ میں ارول میں اپنے اس قیام کو آج بھی یاد کرتا ہوں تو تڑپ جاتا ہوں۔ ہم دونوں ہر روز صبح سویرے نہر کے کنارے ٹہلنے نکلتے اور مستقل طور پر بیک وقت بولتے رہتے تھے۔ واپسی پر ڈٹ کر ناشتہ ہوتا۔ اس کے بعد ہم لوگ "پام دلا" کے ایک تاریخی درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنی گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کر دیتے اور ادھر تھوڑی دیر کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ "پام دلا" کے مختلف گوشوں سے لڑکیاں ہم لوگوں کو جھانک رہی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ایک نوجوان کی اس سے زیادہ تسکین اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جھانکا جائے۔ ہم دونوں کے معاشرے میں بڑا فرق تھا۔ میں خالص شہری اور اختر پرلے درجے کے دیہاتی۔ میں کرتے پاجامے میں سلیقہ سے کرسی پر بیٹھا ہوتا اور یہ لنگی اور بنیائن پہنے انتہائی بدتمیزی کے ساتھ کتاری چباتے ہوتے۔ ایک روز مجھے بھی باصرار اس حرکت کے لئے مجبور کیا۔ میں نے اخلاقاً کوشش کی مگر فوراً ہی زبان اور ہونٹ لہولہان ہو گئے۔ میری اس بے بسی پر بجائے ہمدردی کے اس ظالم نے میرا مذاق اڑایا۔ "پام دلا" کی چار دیواری سے نکل کر سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ایک ایسا شہری جانور آ گیا ہے جو کتاری بھی نہیں چبا سکتا۔

ایک دن اسی قیام میں کچھ رومانی گفتگو شروع ہو گئی۔ اختر نے اپنے مخصوص انداز میں بلا کسی تکلف کے ایک ایسا سوال کر دیا جس کے جواب کیلئے میں فوری طور پر تیار نہ تھا۔ سوال تھا "تمہیں کسی سے محبت ہوئی ہے یا

ہنس، "یعنی میرا مطلب ہے کسی لڑکی سے" میں نے کہا "مجھے ذرا سوچنے دو"۔ کہنے لگے "اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ کہو ہے" میں نے پھر کہا "بھئی ہو بھی تو" بولے "واہ! ایسے ایسے رنگین مضامین لکھتے ہو۔ بھلا یہ بات محبت کی چاشنی کے بغیر تھوڑی ہی آتی ہے۔ اور محبت کے لئے کسی لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔ تو پھر بتاؤ وہ ہے کون؟" ان مسلسل سوالات نے مجھ ایسا چکرا دیا کہ سوچنے لگا کہ کہیں واقعی مجھے کسی سے محبت تو نہیں ہے۔ گھبراہٹ میں ایک نام دماغ میں آیا۔ میں نے کہا "بھئی! اور تو نہیں بس ایک لڑکی کو چاہتا ہوں" کہنے لگے "بس وہی ہوگی۔ ہاں تو صورت کیسی ہے؟" میں نے کہا "معمولی سی"۔ پھر سوال ہوا "سیرت؟" میں نے کہا "بہت ہی اچھی"۔ تیسرا سوال "مضمون تو لکھتی ہی ہوگی؟" میں نے کہا "ہاں، شوق تو ہے" بس اتنا کافی تھا۔ فوراً یہ فیصلہ ہو گیا کہ مجھے کسی لڑکی سے شدید قسم کی محبت ہے اور میرے سارے مضامین کا مرکز خیال وہی ہے۔ میری بدقسمتی سے اسی زمانہ میں "نیرنگ خیال" کے سالانہ نمبر میں میرا ایک مختصر سا مضمون "تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور اتفاق سے اس کے دوسرے ہی صفحہ پر ایک لڑکی کا مضمون تھا۔ "چاند" اختر کا بے پناہ ذہانت تو جانتے ہی ہو۔ یکایک ایک پر زور قہقہہ کے ساتھ چیخ اٹھے۔ "اخاہ، تو یہ کہئے نا! ایک ہی فریم میں دونوں تصویریں لگی ہوئی ہیں" بس پھر کیا تھا۔

"فلک پر عام ہوئی، اختر سحر نے سنی"

"سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو۔ فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو"

اس کے بعد کیا کیا ہوا، یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اختر نے پھر کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ میں شعر بھی کہنے لگا، مگر میری شاعری محض اختر تک محدود تھی۔ میں اپنے اشعار کو نہ قلمبند کرتا تھا نہ کسی اور کو سناتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ کے دو تین شعر سن لو:-

میں کہاں سے لاؤں وہ ضبط دل جو پسند ان کو بھی آ سکے
مرے آنسوؤں کو جو دھو سکے جو کسی کا راز چھپا سکے
مرے نالے ایسے ہوں کیف زا جنہیں سن کے دنیا تڑپ اٹھے
مری آہ کو وہ اثر ملے کہ جو عرش کو بھی ہلا سکے
کچھ عجیب رسم و رواج تھا کہ زباں میں دونوں کی بند تھیں
نہ میں اپنی ان کو سنا سکا نہ وہ اپنی مجھ کو سنا سکے۔

اختر نے میرے لئے اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ یعنی میں اب باقاعدہ عاشق بن چکا تھا۔ یہ دور ہے ۳۲ء کا۔ میں اسی سال بہار اسمبلی میں نوکر ہوا اور دفتر کے ساتھ گرمیوں میں رانچی چلا گیا۔ وہاں کے قدرتی مناظر نے اور بھی آگ بھڑکا دی۔ اپنی مزاح نگاری تو گئی چولھے بھاڑ میں، اب میں دفتر میں بھی زیادہ تر شعر ہی کہتا رہتا تھا۔ تم جانتے ہو مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اسی زمانہ میں نیاز فتحپوری کی کتاب "شہاب کی سرگذشت" کا ہنگامہ تھا۔ میں نے اس کو ادھر رانچی میں پڑھا اور ادھر اختر نے ارول میں۔ بس پھر کیا تھا۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گذرا ہو جو میں نے اپنے آپ کو شہاب تصور کرتے ہوئے اختر کو دس دس ورق کے خط نہ لکھے ہوں اور اس شخص نے اس کے جواب میں مجھے بیس ورق نہ لکھ دیئے ہوں۔ آخر میں ہم دونوں اس نظریہ پر متفق ہو گئے کہ جس سے محبت ہو اس سے شادی نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ سچی محبت کی انتہائی توہین ہے۔ اس بلند فلسفہ کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے تو اپنے برہم چاری ہونے کا اعلان کر دیا لیکن اختر نے چونکہ اپنی رائے بدلنے کے بمصلحت حقوق محفوظ رکھے تھے اسلئے وہ بغیر کسی معذرت کے ۳۳ء میں شکنجہ سے منسلک ہو گئے۔ ادھر میرے ساتھ وہی ہوا جو ہر فلسفی نوجوان کا حشر ہوتا ہے یعنی اس لڑکی کی شادی کسی اور معقول جگہ ہو گئی اور میرا دیوان نامکمل رہ گیا۔ مجھے اختر کی شادی کی بے حد خوشی تھی۔ لیکن خود اختر میری خاموش زندگی کو دیکھ کر مستقل کڑھا رہے تھے۔ اسی زمانہ کے میرے پاس اختر کے دو محبت نامے موجود ہیں۔ جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں اور ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ایک کا مضمون یہ ہے —

"جنت سے ایک آواز"

شرف

خط خوش وقت ہوا۔ جی چاہا تھا کہ تمہارے خط کو غرق رشک کر دوں مگر دو خیال مانع ہوئے۔ ایک یہ کہ پھر تمہاری رسوائیاں تکمیل تک کیونکر پہنچتیں اور دوسرے یہ کہ تم ہی نے تو کہا تھا ؎

جن کے دل میں درد کم ہوتا ہے وہ روتے ہیں جلد

میرا دل کیوں بھلا مضطرب، کشش آنسو رہے!

اختر

دوسرا خط جو اب ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے میں تمہیں اسکی اصلی شکل میں بھیج رہا ہوں۔ خدا کے لئے اس کو بڑی حفاظت سے رکھنا میں چاہتا ہوں کہ "اختر اورینوی نمبر" میں اسکی عکسی تصویر ضرور شائع کی جائے۔ اختر کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرنے کے لئے اس سے زیادہ موزوں چیز کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

میں چھٹیوں میں اردل جاتا تھا۔ وہاں کی ہر چیز سے مجھے بے حد محبت تھی اور وہاں بھی یہ عالم تھا کہ ہر شخص مجھے اختر سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا تھا۔ میرا ہر سال کا معمول ہو گیا تھا کہ اکتوبر میں جب رانچی سے سکریٹریٹ پٹنہ واپس آتا تو میں سیدھا اردل چلا جاتا اور وہاں کی رنگین فضا میں چند روز گزار کر پھر پٹنہ آتا۔ چند سال اسی طرح گزر گئے میرے گھر والے مجھ سے مایوس ہو چکے تھے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اب میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ لیکن یہ خدا سمجھے اس شخص سے جس کا نام اختر ہے! جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، اختر کو ایک خاص جادو یہ معلوم ہے کہ وہ جس کو چاہیں جس سے عشق کرا دیں اور جب ضرورت سمجھیں تو اس کے عشق کو کسی دوسری طرف منتقل کر دیں اور صرف اسی پر بس نہ کریں بلکہ دونوں کی شادی کرا کے چھوڑیں۔ اختر نے یہی حربہ مجھ پر چلایا۔ پہلی بار تو میں بچ نکلا۔ انھوں نے پھر حملہ کیا۔ میں نے اس بار بھی خالی دیا۔ لیکن آخر کب تک؟ اس شخص کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ بیک وقت شاعر بھی ہے۔ مصور بھی اور میڈیکل کالج میں کچھ دنوں پڑھ لینے کی وجہ سے کافی حد تک ماہر نفسیات بھی۔ جب ایک حربہ کارگر نہیں ہوتا تو وہ دوسرے سے کام لیتا ہے۔ میں کوئی فرشتہ تو تھا نہیں۔ کب تک اختر کے مختلف منتروں کا اثر نہ لیتا۔ ایک دن اردل میں سون کے کنارے ریت پر ہم دونوں پڑے ہوئے اپنی اپنی رام کہانی سنانے کے موڈ میں تھے۔ اختر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا کہنے لگے "بھئی، میں نے اب اپنا نظریہ بدل دیا۔ یہ تخصیص کیوں اس سے کہ جس سے محبت ہو اس سے شادی نہ کی جائے۔ میں پوچھتا ہوں، آخر کیوں نہ کی جائے؟ کیا آزری محبت کے لئے بس ہم ہی لوگ رہ گئے ہیں؟ تو میاں شرق، میں نے اپنا بندوبست کر لیا۔ اب بتاؤ تو تمہیں کہاں ٹھکانے لگاؤں؟" تم جانتے ہی ہو اختر سوال کرنے کے بعد اس کا جواب بھی خود ہی دے دیتے ہیں۔ اسلئے وہ مسلسل مجھ سے سوالات کرتے رہے اور میری طرف سے انکا جواب بھی دیتے رہے۔

"ہاں تو کسی لڑکی کا نام لو"

میں نے کہا "اس وقت تو کوئی یاد نہیں۔"

کہنے لگے تم احمق ہو۔ ارے بھئی، وہ کون تھی جس کی تصویر میں نے تمہارے البم میں لگی ہوئی دیکھی تھی؟ وہی جس میں دو لڑکیاں بیٹھی ہیں، ایک چشمہ لگائے ہوئے اور دوسری معاذ اللہ قسم کی۔ بتاؤ تمہیں کون سی پسند ہے؟" میں نے کہا، "کوئی بھی نہیں" ارشاد ہوا "کیوں نہیں۔ میں تمہاری طبیعت سے خوب واقف ہوں۔ لمبی۔ چوڑی، بڑی بڑی آنکھوں والی مضبوط قسم کی لڑکی تمہاری کمزوری ہے۔ کیوں ہے یا نہیں؟" میں اس کے بعد کیا کہتا۔ وہ خود ہی سب کچھ کہہ چکے تھے۔ بس فیصلہ ہو گیا کہ میری شادی اس معاذ اللہ قسم کی لڑکی سے ہونی چاہیے۔ میں نے احتجاج کیا۔ منت و سماجت کی۔ کچھ مہلت مانگی، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اختر نے اسی ریت پر لیٹے لیٹے پنسل سے اسی لڑکی کا ایک اسکیچ تیار کیا جس میں اسکو بڑی شرافت کے ساتھ دوپٹے میں لپٹا ہوا دکھایا۔ مجھ پر اس آرٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اختر اپنی شکست کو بھلا کیسے گوارا کر لیتے۔ فوراً دوسرا اسکیچ تیار کیا جس میں اس لڑکی کے آنچل کو سرکتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ کہنے لگے "کم بخت کہیں کے۔ یقیناً اسی کا انتظار تھا۔ چلو تیار ہو جاؤ۔" پھر بھاگتے ہوئے شکیلہ کے پاس گئے۔ ان کو پہلا والا اسکیچ دکھایا۔ انہوں نے تعریف کی۔ پھر فوراً ہی دوسرا اسکیچ پیش کر دیا۔ جواب ملا "ہائے دیکھو، آپ دونوں کتنے بیہودہ ہیں!" غرض قصہ مختصر، کچھ ہی دنوں کے بعد میری شادی ہو گئی۔ اسی اثنا میں ایک واقعہ اور پیش آیا۔ میں گردنی باغ کوارٹرس میں رہتا تھا۔ جاڑوں کی ایک شام تھی۔ میرے وہ چند عزیز ترین احباب جن میں سب کے سب انتہائی بدتمیز ہیں، جمع تھے۔ تم بھی اس موقع پر ضرور ہی موجود ہوگے۔ اختر نے ایک عورت کا ڈھانچہ پنسل سے تیار کیا۔ اس اسکیچ کو دیوار پر لٹکایا اور پھر ایک پوائنٹر لیکر اس کے مختلف مقامات پر لکچر دینا شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا کسی فٹ پاتھ پر پوشیدہ امراض کی دوا بیچنے والا مجمع کو خطاب کر رہا ہے۔ سامعین کی

دلچسپی لے رہے تھے اور جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آتا تھا تو اختر سے سوال کرتے تھے اور اُن کے جواب کے بعد فضا میں ایک زبردست قہقہہ بلند ہو جاتا تھا۔ عین اسی وقت جب کہ اختر کا پوائنٹر نہایت تیزی کے ساتھ اس اسکیچ پر گھوم رہا تھا یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور دیکھا تو سامنے بھائی جان کھڑے ہیں۔ بس اس وقت کی کیفیت کچھ نہ پوچھو نہیں۔ بھائی جان کو میرے سارے احباب بے حد عزیز تھے اور اُن کو یہ غلط فہمی تھی کہ یہ سب کے سب بہت ہی قابل اور مہذب قسم کے "لڑکے" ہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اطہر جیسا ذہین آدمی بھی کچھ دیر کے لئے چکر میں آ گیا۔ تمنائی پسینہ پونچھ رہے تھے۔ یحییٰ بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور ہم چونکہ سب سے زیادہ مفتری ہو اور میری رسوائی کے ہمیشہ درپے رہے ہو شاید مسکراتے رہے، مگر ان سب میں ایک اختر ہی تھے جن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ کر بھائی جان سے ملے۔ بھائی جان نے کہا "خیریت تو ہے؟ اس وقت کون سا ایسا ادبی مسئلہ درپیش ہے"؟ اختر نے فی البدیہہ جواب دیا "نہیں حضور، اس وقت تو ہم لوگ اس نقشہ کی مدد سے یہ گفتگو کر رہے تھے کہ موجودہ جنگ میں (یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے جب جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی) ضروری محاذ کہاں کہاں پر ہیں"۔ بھائی جان کو چونکہ سیاست اور جغرافیہ دونوں سے کافی دلچسپی تھی اور اُن کو یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ بہار کے مخصوص نوجوان ادیبوں کی یہ مشہور و معروف پارٹی یہ بھی کر سکتی ہے جو وہ واقعی کر رہی تھی۔ دوران گفتگو میں نظر بچا کر وہ نقشہ تو دیوار سے ہٹا دیا گیا اور اس کے بعد پھر ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ اور بھائی جان جنگ کے مختلف محاذ کی تفصیل بتاتے رہے۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ تو چلے گئے اور میں نے اختر کو بہت گالیاں دیں جو اُن کے روز نئے بلند قہقہوں میں گم ہو گئیں۔ لیکن اس کے بعد ان کا لکچر پھر شروع ہو گیا۔ اسلئے کہ اسکیچ میں کچھ مقامات ابھی ایسے رہ گئے تھے جنکی تشریح باقی تھی۔

اختر کی کن کن باتوں کا میں ذکر کروں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں اس قدر شریک رہے ہیں کہ جب میں اُن کے متعلق کچھ لکھتا ہوں تو خود اپنی سوانح حیات سامنے آ جاتی ہے۔ آؤ۔ تمہیں واقعات اور سنا دوں۔ ایک کو یاد کرتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے اور دوسرے کا خیال آتا ہے تو میں اب بھی تڑپ جاتا ہوں اسلئے کہ اس میں اختر کا کچھ ایسا بے پناہ خلوص پوشیدہ ہے جو مجھے اب بھی اس کو پیار کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ تو پہلے وہ تڑپ جانے والا واقعہ سُنو۔ ۱۹۴۳ء کے جولائی سے اکتوبر تک میں دفتر کے ساتھ رانچی گیا ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں اختر اٹکی سینا ٹوریم میں موت سے کھیل رہے تھے۔ میں شروع میں تو تقریباً روزانہ اور جب انھوں نے منع کر دیا تب ہر اتوار کو ان کو دیکھنے اٹکی جاتا تھا اور زیادہ تر شکیلہ کے ساتھ شام کو رانچی واپس آ جاتا تھا۔ چونکہ ان کو مریض کے ساتھ سینا ٹوریم میں رہنے کی اجازت نہیں تھی اسلئے وہ اپنے ایک بھائی کے ساتھ رانچی میں رہتی تھیں۔ ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ رات بے حد بھیانک تھی۔ اختر کی حالت کافی تشویشناک تھی۔ میں اسی عالم میں شکیلہ کو اٹکی سے رانچی لایا اور اُن کے بھائی کے ہاں پہنچا کر جب بھیگتا اور سردی سے کانپتا ہوا اپنے کوارٹر واپس تو وہاں چند حضرات بیٹھے تاش کھیل رہے تھے مجھے دیکھتے ہی ایک صاحب نے مزاقاً کہہ دیا "کیوں صاحب، اتنی جلد فرصت ہو گئی؟" میرے لئے یہ فقرہ ایک نشتر تھا۔ میں دوسرے روز پھر جب شکیلہ کے ساتھ اختر کے پاس اٹکی گیا تو میرے چہرے پر رات کے واقعہ کا اثر موجود تھا۔ اختر بھانپ گئے۔ پوچھا "کیوں کیا ہوا؟" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اختر بلا کے ذہین ہیں۔ وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ کہنے لگے "بے وقوف کہیں کے! بس اتنی سی بات پر رو دیئے۔ تو مجھ سے سُنو۔ اگر میں تمہیں شکیلہ کے ساتھ اپنی آنکھوں سے بھی کسی قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لوں تو یہ سمجھوں گا کہ شرف فرشتہ ہے اور خود میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں"۔ اختر کے ان محبت اور اعتماد میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں زندگی میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ اسی زمانہ میں اختر نے بستر علالت پر یہ چند اشعار لکھے تھے:—

یہ بیماریاں ہیں، یہ لاچاریاں ہیں ۔ یہ غربت کا عالم، یہ مجبوریاں ہیں
چھپا جسم ہے پر کھا تڑپتی ہے بجلی ۔ یہاں زاریاں اور بیتابیاں ہیں
مرے دل کی حالت نہ پوچھو نہ پوچھو ۔ کہ میں ہوں، الم اور ویرانیاں ہیں
کہاں زندگی کی ہے اب آگ روشن ۔ یہی باقی دو چار چنگاریاں ہیں
تمنا یہ جو بن، چمن میں بہاراں ۔ ہے حسرت ہی حسرت، یہ مجبوریاں ہیں

مجھ سے نہ رہا گیا۔ بے ساختگی کے عالم میں میرے قلم سے بھی چند اشعار نکل گئے :۔

کہو تو یہ کیسی پریشانیاں ہیں ؎ بتاؤ تو کیوں ایسی بیتابیاں ہیں
تمہیں کیا ہوا ہے مرے پیارے اختر ؎ یہ کیوں خود بخود ایسی مایوسیاں ہیں
بہت ناز کرتے تھے تم اپنے دل پر ؎ یہ پھر کس لئے ایسی ویرانیاں ہیں
یہ کس نے کہا ہے کہ بیمار ہو تم ! ؎ نہ لاچاریاں ہیں نہ مجبوریاں ہیں
یہ غمزے ہیں سارے کسی خوش ادا کے ؎ جنہیں تم سمجھتے ہو خاموشیاں ہیں
ذرہ سے تغافل پہ یوں روٹھ بیٹھے ؎ وہاں تو بہت سی اداکاریاں ہیں
خموشی سے اسکی نہ تم یہ سمجھ لو ؎ کہ رحمت پہ بھی اسکی حد بندیاں ہیں
بھلا اپنے در سے وہ محبوب کو پھیرے ؎ سراسر تمہاری غلط فہمیاں ہیں
چمن میں دوبارہ بہار آ رہی ہے ؎ مسرت بنیں گی جو رنجوریاں ہیں
تمناؤں سے دل بھی لبریز ہوگا ؎ ادھر دیکھنا پھر وہی شوخیاں ہیں
طبیعت بدل دے گی خود رنگ اپنا ؎ وہی بادہ خواری وہی مستیاں ہیں
کبھی راحتیں ہیں کبھی آفتیں ہیں ؎ یہی سب زمانہ کی نیرنگیاں ہیں
یہ سچ ہے کہ ساری دواؤں سے بہتر ؎ شکیلہ کی پیاری وفاداریاں ہیں

شرف تیری خدمت کو حاضر ہے اختر
ہزاروں اگرچہ اسکی پابندیاں ہیں

اختر نے جب اُن کو پڑھا تو اپنے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ایک شعر اور پڑھا دیا ؎

ترے دل کی قیمت مرا دل ہے حاضر
شرف بے بہا تیری غمخواریاں ہیں

لو اب رولا دینے والی باتوں کو سننے کے بعد ہنسنے والا بھی ایک لطیفہ سُن لو۔

میری شادی ۳۰ر نومبر ۴۰ء کو ہوئی اور پہلا لڑکا نور الدین احمد سلمہٗ (جو اب ماشاءاللہ پورا جوان ہے اور انجینئر بن رہا ہے) واہ رے انقلاب زمانہ۔ شرف عظیم آبادی کا لڑکا اور انجینئر۔ حد ہو گئی بدمزاقی کی!) ۱۵ ستمبر ۴۱ء کو پٹنہ سیٹی کے ایک مشن ہسپتال میں پیدا ہوا۔ اختر اُس کو دیکھنے گئے۔ بچہ کافی تندرست تھا۔ کہیں وہاں کی امریکن لیڈی ڈاکٹر نے اختر کے سامنے کہہ دیا کہ "یہ بچہ پندرہ دن دیر سے ہوا ہے"۔ اختر نے شرارت کے ساتھ مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا؟ ذرا پھر تو کہئے"۔

"ڈاکٹر نے پھر کہا کہ "چونکہ یہ پندرہ دن دیر سے پیدا ہوا ہے اسلئے کافی تندرست ہے"۔ اختر نے میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھا اور کہا "یہ لڑکا جرچل سے بہت مشابہ ہے اسلئے میں اسے جرچل کہوں گا"۔ میں نے کہا کوئی تاریخی نام نکالو۔ اختر کا شریر دماغ تو کام کر رہی تھا۔ فوراً بولے "ارے اس کے لئے تاریخی نام نکالنے میں کیا دقت ہوگی۔ سیدھا تو حساب ہے۔ ۳۰ر نومبر کو شادی اور ۱۵ر ستمبر کو پندرہ دن دیر سے بچہ۔ بس کیلنڈر رکھ دو۔

تم نے "اختر اورینوی نمبر" کے لئے میری تصویر بھی مانگی ہے۔ میں فرمائش کی تعمیل تو کر رہا ہوں لیکن ڈرتا بھی جا رہا ہوں کہ نہ جانے اس کا انجام کیا ہوگا ایک زمانہ تھا جب دل چاہتا تھا کہ کوئی میری تصویر مانگے اور میں اُس کو ایک کے بجائے چار کاپیاں بھیج دوں تاکہ وہ اپنی سہیلیوں میں بھی تقسیم کر دے لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اگر اپنی تصویر کسی رسالہ میں چھپ گئی تو رہا سہا بھرم بھی جاتا رہے گا۔ بہرحال۔ جیسا بھی ہوں یا جیسا بھی ہو گیا ہوں اسکی شکایت مجھ سے نہ کرنا۔ میں اپنی تصویر کے ساتھ ایک بہت ہی تاریخی گروپ بھی بھیجتا ہوں۔ یہ تصویر اختر کی شادی کے موقع پر ۳۳ء میں لی گئی تھی اور یہ محض اتفاق ہے کہ میرے پاس اب تک محفوظ رہ گئی۔ اس ۲۱ سال کی مدت میں کیا نہیں ہو گیا۔ ۳۴ء کا زلزلہ ۴۰ء میں میری شادی (یہ بھی تو ایک واقعہ عظیم ہی ہے) ۴۲ء کا کشت و خون، ۵۴ء سے ۵۶ء تک میرا لندن کا قیام۔ مگر ہر انقلاب اور ہر موقع پر یہ میرے سینہ سے لگی رہی۔ اس میں دونوں دولہا میاں کا حلیہ ملاحظہ ہو تصویر دولہا سے کہیں زیادہ خوبصورت تو میں معلوم ہو رہا ہوں۔ مگر سچ پوچھو تو اصلی اختر اسی تصویر میں نظر آئیں گے۔ یہ اُس زمانہ کی یادگار ہے جب اختر کا رومانی شباب پر تھا اور وہ کسی گاؤں کے پنگھٹ پر وہاں کی گوپیوں کو پریم کا راگ سُناتے تھے۔ میں ساغر کے اس خاص نمبر کیلئے اس سے بہتر تحفہ اور کیا بھیج سکتا ہوں؟"

ہاں! تو اب تصویر کا ذکر ہو رہا ہے تو ایک اور دلچسپ لطیفہ بھی سن لو مضمون ذرا دراز تو ہے مگر میں لکھوں گا ضرور۔ ۳۵ء میں جب میں نے

ایم۔اے کیا تو عام روایت کے مطابق میں نے بھی گاؤن پہن کر ایک تصویر کھنچوائی اور اسکی ایک کاپی اختر کو بھیج دی جس کو بیچارے نے بڑے شوق سے اپنی میز کی زینت بنانا چاہا، مگر یہ تصویر کچھ ایسی بھیانک تھی کہ اس نے سارے اردل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ مجھے بھی اس کا احساس تھا کہ اسلئے میں نے احتیاطاً اس کے نیچے لکھ دیا تھا "میری تصویر اچھی ہے کہ میں تصویر سے اچھا ہوں؟" تم جانتے ہو اُس وقت اردل کی آبادی میں اکثریت اختر کی سالیوں کی تھی اور کوئی کام بھی ان لوگوں کی منظوری کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ تصویر کو دیکھتے ہی پہلے تو اس پر عجیب عجیب فقرے کسے گئے۔ کسی منچلی لڑکی نے اس پر میرے سوال کے جواب میں لکھ دیا "نہ یہ تصویر اچھی ہے نہ تو تصویر سے اچھا۔" کسی نے کہا "دولھا بھائی، خدا کے لئے اس کو یہاں سے ہٹائیے۔" "رات کو بچے ڈریں گے۔" کسی طرف سے آواز آئی۔ "اسکی صحیح جگہ باورچی خانہ ہے"۔ دوسری نے کہا: "ارے توبہ! ایسا نہ کرنا۔ کھانا بھی بدمزہ ہو جائے گا۔" تیسری دوڑتی ہوئی آئی: "لاؤ میں اسے غسلخانہ میں ٹانگ دیتی ہوں۔ اس کا صحیح مقام وہی ہے"۔ اختر میرے دوست تھے اور شکیلہ کو بھی مجھ سے ہمدردی تھی، مگر تم تو جانتے ہی ہو کہ اکثریت کے سامنے اقلیت کی کہاں چلتی ہے۔ شکیلہ نے اپنی بہنوں کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ اشرف صاحب اچھے خاصے دلچسپ آدمی ہیں۔ یہ تصویر اتفاق سے خراب آگئی ہے۔ اختر نے بھی بہتیرا کہا کہ "آج تم لوگ جس مردِ خدا کی توہین کر رہی ہو ہوسکتا ہے کہ کل تم اسکی ضرورت محسوس کرو" (واضح ہو کہ اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی) مگر وہاں تو اکثریت کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ اس تصویر کو غسلخانہ ہی میں ٹانگا جائے۔ اختر کی خداداد ذہانت اس وقت بھی کام آگئی۔ جب اپنی "غزالانِ اردل" میں سے ایک غزالہ اسے لے کر غسل خانہ کی طرف چلی تو اختر نے نہایت متانت کے ساتھ کہا کہ "اگر تم لوگ اسی پر تلی ہوئی ہو کہ یہ تصویر غسل خانہ ہی میں لگائی جائے تو میں کیا کرسکتا ہوں مجھے تو محض بے پردگی کا خیال تھا"۔ اس فقرے نے ایٹم بم کا کام کیا۔ تصویر اس لڑکی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دوسری لڑکیوں کی ایک چیخ نکلی اور اب جو دیکھتا ہوں تو ہر لڑکی شرم سے اپنے اپنے کمرے میں بند ہے۔

اختر کے اس قسم کے بےشمار واقعات ہیں۔ کس کس کو یاد کروں اور کہاں تک لکھوں۔ اس ظالم کی اسی شوخ اور بیباک طبیعت نے اسے ہمیشہ راجہ اندر بنائے رکھا اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی باوجود اپنی پیری کے اُن کو وہی رنگین فضا مل جائے تو یہ پھر ایک بار خود بھی جوان ہو جائیں اور اُن ساری لڑکیوں کو جوان بنا کر چھوڑ دیں جو اب ماشاءاللہ سب کی سب خود ان بچوں کی مائیں ہیں اور حد تو یہ ہوگئی کہ اُن میں سے ایک جن کو اختر کو شاعر بنانے میں بڑا دخل رہا ہے، اب خدا کے فضل سے "تیز" بچوں کی ماں بھی ہیں۔ قدرت کی یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ اُن میں سے زیادہ تر اب اختر سے بہت دور ہوگئی ہیں۔ کچھ مشرقی پاکستان میں ہیں، کچھ مغربی پاکستان میں، اور جو جہاں بھی ہے وہ اپنے شوہروں اور بچوں میں کچھ اس طرح مبتلا ہے کہ اس کے لئے اردل کی وہ رومانی دنیا اب محض خواب و خیال ہی ہو کر رہ گئی ہے۔ میں اب بھی جب اُن میں سے کسی سے ملتا ہوں تو مجھے اُسکی دونوں بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں اختر کی تصویر آنسوؤں میں تیرتی ہوئی نظر آتی ہے اور پھر میں بھی اپنی آنکھیں بند کر کے ماضی میں کھو جاتا ہوں۔

نہ جانے میں تمہیں کب سے خط لکھتا ہوں اور نہ جانے کیا کیا لکھ گیا ہوں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ تم نے مجھے اختر کے متعلق کچھ لکھنے کو کہا تھا۔ اب اس خط میں تمہیں جو چیز کام کی نظر آجائیں اُنہیں "ساغر" کے اس خاص نمبر کے لئے لے لو۔ میری طرف سے اُن نوجوانوں کو جو رسالہ نکالتے ہیں دعائیں کہو اور یہ بھی کہہ دو کہ کیا اچھا ہوتا کہ "اختر اورینوی نمبر" کے بعد وہ "ساغر" کا ایک "سون نمبر" بھی نکالیں تاکہ دنیائے ادب اُن دلچسپ ہستیوں سے بھی روشناس ہو جائے جن کو اختر بنانے میں بڑا دخل رہا ہے۔

یار زندہ و صحبت باقی! تمہارا اشرف

رضا نقوی

اختر اورینوی کا ایک ذاتی تاثر

پٹنہ کالج ایک تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے ریاست بہار میں ایک خاص حیثیت کا مالک ہے۔ قدیم ترین کالج ہے اور یہاں سے بہار کے بڑے بڑے سپوت پڑھکر نکلے ہیں۔ پٹنہ کالج نے بہار کی تہذیبی اور تعلیمی زندگی کو ہمیشہ متاثر کیا اور بالواسطہ سیاسی اور سماجی زندگی کو بھی۔ دریائے گنگا کا کنارہ، جسے ایک دفعہ بھری برسات میں دیکھکر مجاز مرحوم نے کہا تھا کہ یہ دریا نہیں سمندر ہے، سبزہ زار اور گلستاں، خوبصورت دومنزلہ عمارت مسطح فٹ بال کا میدان، لانبا کوریڈور، گول دالان، اور لانبے لانبے ستونوں کی آغوش میں بارہ لکچر تھیٹر، اور کوریڈور کے مغربی پہلو میں مسلم ہوسٹل کی شاندار عمارت — ہزاروں لاکھوں کے تصور میں ماضی اور حال میں ہمیشہ ابھرے رہے ہیں اور ابھرتے رہیں گے۔ جن دنوں ہم لوگ پٹنہ کالج میں تھے وہاں کئی انگریز پروفیسر بھی ہمارے ذہنوں کو سیراب کرتے تھے۔ پٹنہ کالج کا ایک کلچر ہے اور بہت ہی گہری اور پختہ روایتیں ہیں۔

یاد آتا ہے کہ جولائی ۱۹۳۲ء میں کالج کھلا اور مسلم ہوسٹل کے (جواب اقبال ہوسٹل کے نام سے موسوم ہے) کمرے زندگی سے جاگ اٹھے۔ پرانے پنکھ پکھیرو کے ساتھ ساتھ نئے نئے پرندے بھی بسیرا لینے کے لئے آن بیٹھے۔ ایک دن ایک کشیدہ قامت شکیل وجمیل نوجوان ترکی ٹوپی، بند گلے کا لانبا کوٹ پہنے، خوبصورت غلافی آنکھوں پر سیاہ فریم کی عینک لگائے متانت سے چلتا ہوا میرے متصل کمرے میں آکر ٹھہرا۔ شخصیت پرکشش تھی۔ اس لئے بے ساختہ ملنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن قبل اس کے کہ میں خود جرأت کرتا، بڑے پرخلوص انداز میں السلام علیکم کہتا ہوا وہ نوجوان خود میری طرف بڑھ آیا — "میرا نام سید اختر احمد احمدی ہے، ضلع مونگیر کے ایک گاؤں آرین کا رہنے والا ہوں، تھرڈ ایئر میں ابھی ابھی داخلہ لیکر آیا ہوں، آپ کی تعریف؟" وغیرہ وغیرہ

یہ تھی میری پہلی ملاقات اختر سے۔ اسی دن سے ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہو گئے۔ اس سے پہلے اختر میڈیکل کالج پٹنہ کے سال سوم کے طالب العلم تھے کہ اچانک سل میں مبتلا ہو گئے۔ دو سال تک ذہنی نزاش رہنے کے بعد جب طبیعت سنبھلی تو تعلیم کے ارادے سے پھر پٹنہ آئے لیکن ڈاکٹروں نے

مشورہ دیا کہ میڈیکل کالج کی سخت تعلیم ان کی صحت کے لئے مضر ہے۔ چنانچہ انہوں نے پٹنہ کالج کے بی۔اے کلاس میں داخلہ لیا اور مسلم ہوسٹل میں آکر مقیم ہوئے۔

اُس زمانے میں مجھے شاعری کا جنون تھا۔ کلاس روم میں بجائے لکچر سننے کے عموماً غزلیں یا کسی پروفیسر کی شان میں قصیدے لکھا کرتا تھا۔ اختر بھی شاعری کرتے تھے۔ ملاقات سے بہت قبل کبھی کبھی سائنس کالج کی بزم سخن کے سالانہ جلسوں میں اُن کو نظمیں پڑھتے دیکھ چکا تھا۔ بزم سخن اور پٹنہ کالج کی بزم ادب نوجوان طبائع کی آماجگاہ تھی۔ سالانہ جلسوں میں اساتذہ بھی تشریف لاتے تھے۔ حضرت شاد عظیم آبادی، حضرت مبارک عظیم آبادی، حضرت بیدل اور حضرت شمس منیری بھی شرکت فرماتے تھے۔ یہ جلسے بڑے دھوم دھام سے ہوتے تھے اور بارات جیسی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔ تقریبی فضا میں سکریٹری دولہا بنا ہوتا تھا۔ امنگوں اور ولولوں سے بھرے نوجوان جلسے کرتے نظر آتے، ایک جوان تخلیقی فضا ہر سو طاری رہتی۔ بڑے بڑے صنادید صدارت کے لئے تشریف لاتے رہتے۔ سر علی امام، سر ظفر اللہ خاں، مسٹر عبدالعزیز وغیرہ وغیرہ — ایک بار اختر کو بزم سخن کے جلسے میں انگریزی نظم پڑھنے کے صلہ میں طلائی تمغہ بھی مل چکا تھا۔ خیر! ایک دن میں نے کلاس روم میں ایک نامکمل نظم لکھی جس کا مطلع تھا ؎

اک روز کھیل کر جو لڑکے میں آ رہا تھا
مسرور تھی طبیعت کچھ گنگنا رہا تھا

اسٹڈی پیریڈ میں میں نے وہ نظم اختر کو دی کہ اسے مکمل کر دیں۔ مقصد امتحان لینا تھا کہ آیا حضرت واقعی خود شعر کہتے ہیں یا سادہ کاغذ پر اصلاح دینے والے کسی استاد کے شاگرد ہیں۔ دو گھنٹے کے بعد رات کا کھانا کھانے کی غرض سے جب ہم لوگ میس کی طرف جانے لگے تو اختر نے میری جانب ایک کاغذ بڑھا دیا جس پر چند اشعار لکھے تھے۔ میری نامکمل نظم مکمل ہو چکی تھی۔ اتفاق سے اب تک پنسل سے لکھے ہوئے وہ دونوں مسودے میری فائل میں محفوظ ہیں۔ ممکن ہے آئندہ کوئی محقق ان کو اپنی کسی تحقیق میں استعمال کرے۔

ہوسٹل کے جس کمرے میں اختر رہتے تھے اس کی شکل ملاحظہ ہو۔ مغربی دیوار پر ایک فریم میں شکیلہ (جو اس وقت تک شکیلہ اختر نہیں ہوئی تھیں) کا کشیدہ کاری کیا ہوا رومال جس پر لکھا تھا FORGET ME NOT آویزاں ہے۔ ہر نوجوان کے لئے جو اپنے دل میں رومانیت کی خلش رکھتا تھا یہ رومال جاذب دل و نگاہ بنا ہوا تھا۔ بہت سادہ کمرہ کے ایک ٹیبل پر جو میز پوش سے بے نیاز ہوتا، کتابیں آراستہ ہوتیں۔ ایک معمولی کرسی، پتلی سی چوکی، جس پر مسہری کا پردہ لگا ہوتا، صاف ستھرا بستر، چوکی کے نیچے ایک اسٹیل کا بکس، کونے میں ایک جوڑا جوتہ، کھونٹی پر ڈلیہ، ایک کوٹ یا شیروانی ٹنگی ہوتی۔ دریچہ پر نئی کوری صراحی اور شیشے کا گلاس — اور بس۔ ہم سبکے کمرے کچھ اسی طرح کے تھے لیکن بعض لوگ میز پر خوبصورت میز پوش بھی بچھائے ہوتے، ایک چھوٹے ٹیبل پر چائے کا سامان بھی ہوا کرتا، اسٹوو بھی رہتا، سگریٹ کے ٹن بھی ہوتے، لیکن اختر نہ تو چائے پیتے تھے اور نہ سگریٹ۔ آدمی پرہیزگار قسم کے تھے اور وقت بے وقت نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ تو غرض ہم لوگ ایک دوسرے سے ملتے گئے اور پھر گھل مل گئے اور بہت قریب آ گئے۔ ہمارا ہوسٹل ایک خاندان تھا جہاں جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے اور پیار و محبت بھی، جہاں رقابت بھی تھی، حریف اور حلیف بھی تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم چند لوگ ایک حلقۂ خاص میں منظم ہو گئے۔ اس حلقہ میں تھا، اختر، شفیع الحقانی، یحییٰ، اطہر، اور شرف عظیم آبادی، جو سب کے سب اب پاکستان باسی ہو چکے ہیں، عباس صاحب، جو انڈین ڈی۔ آئی۔ جی پولس ہیں، شاہ جہاں صاحب جو اپنے کئی گانے ریکارڈ کرانے کے بعد خاصے سیاسی آدمی بنکر ایم۔ ایل۔ اے ہیں، اور راغب الہ دانے مرحوم جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پھر حکومت بہار کے ایک محکمہ کے سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے اور چند سال قبل انتقال کر گئے۔ یہی تھے۔ ہوسٹل میں اس حلقے سے کچھ لوگوں کو یہ شکایت بھی کہ ہم لوگ ہر جگہ حتیٰ کہ گھاس پر لیٹ کر بھی ادبی گفتگو ہی کیوں کرتے ہیں۔ ویسے قہقہہ لگانے، ہنسنے اور میس میں اودھم مچانے میں ہم لوگ سبکے سب شریک تھے۔ اور

اختر کا قہقہہ تو اتنا سامعہ نواز ہوتا کہ کچھ دنوں بعد شرف عظیم آبادی نے "دیوار قہقہہ" کے عنوان سے اُن پر ایک مضمون بھی لکھ ڈالا۔ اختر، عباس اور رافع کو (DEBATE) ڈبیٹ کا بھی شوق تھا۔ ہوسٹل اور کالج میں مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اور مذاق و تفریح کے لئے تو ہوسٹل میں یہ عالم تھا کہ ہر روز سپرنٹنڈنٹ صاحب ہم لوگوں کو بلا بھیجتے تھے اور ہمیں جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب بہت دنوں بعد خود اختر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے تو انہوں نے اپنا اور ہم لوگوں کا نام سیاہ رجسٹر میں درج دیکھا۔ معلوم نہیں اختر نے اس رجسٹر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہمیں خدا معاف کرے، ہم لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بہت ستاتے تھے۔ عرصہ تک یہ عالم رہا کہ رات کے کھانے کے بعد ہم دونوں کے علاوہ اور چند احباب اختر کے کمرہ میں بیٹھ کر تصنیف نظمیں مرحوم کی شان میں کورس میں پڑھا کرتے تھے۔ بلاناغہ روزانہ دو نظمیں تیار ہوتی تھیں۔ اختر عموماً فارسی زبان میں لکھتے تھے اور میں اردو میں۔ اتفاق سے جس دن کوئی نظم تیار نہ ہوتی تو شاہجہاں صاحب خیال باکھڑی میں سپرنٹنڈنٹ صاحب آنجہانی پر اپنے دل کا بخار نکالتے۔ یا پھر رافع الہدیٰ جو تاریخ کے طالب العلم تھے موصوف کے متعلق کوئی فرضی تاریخی واقعہ لکچر دینے کے انداز میں سناتے اور عباس جنہیں تصویریں بنانے کا شوق تھا اس واقعہ کو اپنی پنسل کی مدد سے مختلف تصویروں میں ابھارنے کی کوشش کرتے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کبھی کبھی ہم لوگوں کو سزا دینے پر تُل جاتے۔ طلبا کئی پیڑھی اوپر سے انکو ایک نام سے یاد کرتے آتے تھے۔ "چُن چُن" ہم لوگ نہایت بدتمیز تھے اور اب افسوس ہوتا ہے اور ندامت بھی کہ ہم لوگوں نے کیسی بُری بُری حرکتیں کی تھیں۔ ایک بار بارہ تیرہ لڑکے سیاہ ماتمی لباس پہن کر ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم لوگوں پر فرد جرم عائد کی گئی تھی۔ وارڈن فیصلے کے لئے آئے تھے۔ اختر، شاہجہاں اور عباس نے زورِ خطابت دکھلایا، جھوٹ بولے۔ اردو اشعار کے غلط معنی انگریزی میں اسطرح سمجھائے کہ وارڈن جو بنگالی ہونے کی وجہ سے اردو بالکل نہیں جانتے تھے قائل ہو گئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خواہ مخواہ غریب لڑکوں کو ستایا ہے ورنہ ان اشعار میں سوائے ان کی تعریف کے کوئی ایسی بات نہیں جو قابل اعتراض ہو۔ مقدمہ خارج کر دیا گیا اور ہم لوگوں کی باعزت رہائی ہوئی۔

رافع نسبتاً متین تھے لیکن پھر بھی روزانہ شام کے وقت وہ اپنے کمرہ کے سامنے اوپر کی منزل پر کھڑے ہو جاتے۔ نیچے ہم لوگ ہوتے اور سب مل کر اپنی اپنی منزلوں کے چند بٹیروں کی فضیلت بیان کرتے جس کو ہم لوگ بٹیر لڑانا کہتے تھے۔ کچھ حضرات مخصوص بٹیر کی حیثیت رکھتے تھے اور جب ہم لوگ زبانی بٹیر لڑاتے تھے تو وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے ہم لوگوں کو گالیاں دیتے تھے۔ ایک صاحب اُس مخصوص قصبہ کے تھے جو سارے بہار میں عقل و خرد کے لئے مشہور رہا ہے۔ ان کے کمالات ہم لوگوں نے خوب خوب دیکھے ہیں۔ اچانک کمرے میں کرسی پر کھڑے ہو جاتے اور بلب سے سگریٹ سلگانے کی کوشش کرتے۔ ایک صاحب تھے جنہیں دن بھر نوٹس بورڈ کے مطالعہ کا شوق تھا۔ قد چھوٹا تھا۔ پھدک پھدک کر اونچی سے اونچی نوٹس پڑھنے کے درپے رہتے تھے۔ ایک صاحب تھے جنہیں دیکھ کر دنیا کے فانی ہونے کا احساس ذہنوں پر مرتسم ہو جاتا تھا۔

ذکر صرف یہ کرنا ہے کہ اختر نے سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ بہت اچھے طالب علم رہے۔ پٹنہ میڈیکل کالج میں ڈھائی سال گزارے اور وہاں بھی اول دوم آتے رہے۔ اُن کے ساتھی آج صوبہ کے بڑے سرجن اور ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے اپنے شعبوں کے صدر ہیں۔ پھر وہ بیمار پڑے اور دو سال گھر پر کھیتی کرنے کے بعد پٹنہ کالج کے بی۔اے انگریزی آنرز کلاس میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی وہ اچھے طالب علم شمار کئے جاتے تھے۔ ابتدا سے ہی منفرد تھے لیکن کبھی ان پر کتاب اور مطالعہ طاری نہیں ہوا۔ ہوسٹل کے کھلنڈرے لڑکوں میں اور مجلس آرا لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ ہم سبھوں کا عجیب حال تھا۔ صبح دریا کی سیر، شام دریا کی سیر۔ کبھی کبھی چاندنی راتوں میں چوری چھپے ہوسٹل سے بھاگ نکلنا اور پھر دریا کی سیر۔ وہاں شاعری اور مخصوص صحبت میں اپنی اپنی کامیاب اور ناکام محبتوں کی یاد میں آنسو بہانا، سرد آہیں بھرنا۔

ان سارے کاموں میں اختر ہم لوگوں کے برابر کے شریک تھے۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ حلقۂ خاص کے کم وبیش سبھی لوگ اختر سے اپنی داستان محبت بیان کیا کرتے تھے اور وہ روایتی ندیم کی حیثیت اختیار کرتے تھے۔ تمنائی کا وہ صابن کا ڈبہ جس میں سوکھا ہوا ہار رکھا ہوا تھا اور بھران کا چھلکتی ہوئی آنکھوں اور تھرتھراتے ہوئے لبوں سے قصۂ غم سنانا ہمیشہ یاد رہے گا — آہ کہ وہ محبوبائیں اب دادیاں اور نانیاں بن چکی ہیں۔ زندگی ہمیشہ بوڑھی ہوتی رہتی ہے — کاش وہ ہمیشہ بوڑھی ہی رہتی یا ہمیشہ جوان رہتی۔ اقبال کے مصرعہ کے اس ٹکڑے سے ہم لوگوں کو ہمیشہ اختلاف رہا ہے — ہر دم جواں ہے زندگی۔ اور ہم لوگ دردناک طور سے محسوس کرتے ہیں کہ یہ ٹکڑا صحیح نہیں ہے۔ جی ہاں، یہ ہمارے ندیم خاص بھی اپنی روداد محبت سناتے تھے اور پھر آئندہ زندگی نے ثابت کیا کہ محبت ان کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی اور وہ ان کے لئے بڑا سہارا بنی ورنہ اختر زندہ ہی نہیں رہتے۔

وقت گذرتا گیا۔ اختر نے بی۔ اے کے دو سال تمام کئے۔ یونیورسٹی کے امتحانات کا زمانہ آیا۔ پرچے گذرنے لگے۔ جس دن انگلش آنرز کا پرچہ تھا دفعتاً اختر کے منھ سے خون آگیا۔ آیا ہی نہیں مسلسل آتا رہا۔ ہم لوگ سخت گھبرائے لیکن اختر کا زرد چہرہ پرسکون تھا۔ انہوں نے ڈاکٹروں کو خبر نہ ہونے دی۔ بلکہ خون کی آمد کو روکنے کے لئے کہیں سے برف منگوائی۔ اس کے ٹکڑے چوستے رہے اور اسی حالت میں امتحان میں شریک ہوتے رہے۔ دیر تک سوائے چند دوستوں کے اور کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ ان کا مہلک مرض پھر ابھر آیا ہے۔ ورنہ امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہ ملتی۔ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو اختر انگلش آنرز میں ساری یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ اس بار مرض کا حملہ سخت تھا۔ ڈاکٹر نے اختر کو اٹکی سینی ٹوریم میں ایک سال کے لئے بھیج دیا۔ کچھ عرصہ تک ہم لوگ ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مجھے دو بار رانچی جانا پڑا۔ وہاں سے اٹکی سولہ میل کی دوری پر ہے۔ بذریعہ ریل آمد و رفت ہوتی ہے۔ چنانچہ دونوں دفعہ اختر کی عیادت کی غرض سے میں سینی ٹوریم گیا۔ شام کے وقت دو گھنٹے کے لئے انہیں بات چیت کرنے کی اجازت ملتی۔ دن کے بقیہ حصوں میں خاموش لیٹے رہنے کی تاکید تھی۔ شام کے وہ دو گھنٹے ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ بن کر آتے۔ اختر کا جاندار قہقہہ بات بات پر بلند ہوتا اور ہم لوگ ہوسٹل کی دلچسپ زندگی کا تذکرہ کرکے پچھلی یادوں کو تازہ کرتے اور مستقبل کے متعلق پروگرام بناتے۔

اختر کی قوت ارادی نے انہیں موت کے چنگل سے بچا لیا اور صحت یاب ہوکر وہ سینی ٹوریم سے واپس آئے۔ دفعتاً ان کے دل میں خیال آیا کہ ایم۔ اے کا امتحان دیں۔ میں عرصہ تک ناموافق حالات کے تھپیڑے کھانے کے بعد ملازمت میں آگیا تھا۔ اب پھر پرانی منڈلی کے کئی اشخاص دوبارہ اکٹھا ہوگئے۔ میں، اختر، شرف، تمنائی اور بکیؔ۔ اطہر لا کالج میں تھے اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر سید محمود صاحب کے جواں دوں وزیر تعلیم تھے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ تمنائی سنسا ڈیک ڈپو کھولے ہوئے تھے۔ شرف میرے ہی دفتر میں ملازم تھے۔ ہم سب مختلف محلوں میں رہا کرتے تھے لیکن اختر لامکاں تھے۔ وہ ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو رہے تھے۔ کبھی علی گڑھ، کبھی دہلی کی دوڑ لگاتے اور کبھی پٹنہ آتے تو خوب گرما گرم صحبتیں رہتیں۔ انہوں نے ایم اے کا امتحان دے دیا تھا۔ اور یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ زیادہ تر اردو ہی میں رہا کرتے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ تمنائی، اطہر، شرف تینوں اردو گو اور میں نہیں جا سکا۔ مجھے اب تک اس کا غم ہے کہ میں نے اردو کی بہار نہیں دیکھی اور اب شکیل اور اختر کہتے ہیں کہ میں اسی دکھ سے نہیں جاتا کہ سنا ہوا روایتی اردو مجھے یاد آئے گا اور میں اپنے دوستوں سے رقابت محسوس کرنے لگوں گا۔ شرف بھی ہم لوگوں کے بہت گہرے دوست تھے۔ وہ نہایت کم گو مگر بڑے شگفتہ مزاج، وضعدار اور ایثار پسند دوست تھے۔ بڑے دلچسپ مکتوب نگار تھے۔ ان کے دلچسپ انشائیے اور مزاحیہ خاکے اس زمانے کے مشہور رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اطہر نے چیخوف کے دو ڈرامے سلیس اور فصیح اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرائے تھے۔ تمنائی برصغیر کے اعلیٰ درجہ کے مترجم تھے۔ زندہ چین چینی کہانیوں کا ترجمہ ہے۔

سٹرلنگ کے ڈراموں کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا تھا اور ان کی
وجہ سے بہت مشہور ہوئے تھے۔ انہوں نے کئی طبع زاد نظمیں اور
افسانے بھی لکھے تھے۔ ان دنوں وہ کراچی میں کئی اور کتابوں کے
مؤلف بن چکے ہیں اور اردو رسم الخط اور ٹائپ پر کام کرنے کیلئے
بار بار یورپ کا سفر کر چکے ہیں۔ شرف بھی وہیں کسی دفتر میں بڑے
صاحب ہیں۔ اور دراصل بالزوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ اطہر کا شمار
پاکستان کے بڑے وکلاء میں ہے۔ یحییٰ نقوی بھی جو کسی زمانے میں
ایک بہت اچھے شاعر تھے، جن کی نظمیں معیاری رسائل میں شائع
ہوتی رہتی تھیں۔ نگار میں ایک نظم اعتراف شکست چھپی تھی اور بہت
مقبول ہوئی تھی۔ اب عرفانِ زوجیت میں مبتلا وہیں کراچی میں کہیں
اعتکاف میں بیٹھے ہیں۔ منزل اعتراف کے بعد منزل مکاشفات یا منزل
اعتکاف ہی آتی ہے۔

غرض یہ کہ اُن دنوں شعر و شاعری ادب و تنقید کی گرما گرمی
تھی اور ہمارا نوجوان حلقہ ذہنی طور پر سیاسیات سے بھی دلچسپی لیتا
تھا۔ اطہر کے لئے عملی دلچسپی تھی۔ تنائی اور اطہر سرخے سمجھے جاتے
تھے۔ ویسے تو ہم لوگ سب ترقی پسندوں میں شمار ہوتے تھے، لیکن
شرف ابھی وقت سے ترقی پسندی کے نام سے اُس سانڈ کی طرح
بدکتے تھے جو سرخ کپڑے کو دیکھ کر کود پھاند کرنے لگتا ہے۔ اور
ترقی پسندی کے معنی بھی شرف کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ لیکن ہم سب
لوگ ایک تھے اور ادبی تحریک یا ادبی تخلیق جہاں بھی ہو، ہم لوگ
دھنسے پڑتے تھے۔ مزاحیہ رنگ میں بھی اور سنجیدہ رنگ میں بھی۔
اس اجمال کی کچھ تفصیل سنئے۔ بزم سخن اور بزم ادب کے جلسوں میں
ایسی نظمیں لکھی اور پڑھی گئیں جو صنعت مہملی عن المعنی میں تھیں۔ ان
نظموں کی تخلیق عموماً بجاتی ہوتی تھی۔ چنادری شعر پر کا جھگڑا رہتا۔
لیکن ہر ہر شعر پر داد ملتی۔ اسی طرح ایک بار ایک بے معنی نظم
پڑھی گئی، اور پڑھنے والے نوجوان کو ایک کپ انعام میں ملا۔
اس کپ پر ہم لوگوں نے بنام حماقت کنم نامزد الکندہ کرا دیا۔ ایکبار
لکھنؤ کے ایک شاعر نانک چند تشریف لائے۔ اُن کے بارے میں
مشہور تھا کہ اردو نہیں جانتے، ہندی رسم الخط میں اشعار لکھتے ہیں۔
اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایک
مشاعرہ ہوا۔ ہم لوگ بھی مدعو کئے گئے۔ چلتے وقت رائے ہوئی
کہ نانک صاحب کی شان میں اسی قسم کا قصیدہ لکھا جائے۔ چنانچہ
مشاعرہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے میں نے، اختر، اور دوسرے دو
دوستوں نے مل کر تیس تیس اشعار کا ایک قصیدہ لکھ مارا۔ اختر
نے تشبیب کے اشعار لکھے اور میں نے مدحیہ ــــ مطلع تھا۔

خوشا وہ موسم رنگیں جو ہو بیگانۂ فطرت سے
خوشا وہ منظر گیتی بنے جو خانۂ قطرت سے

اختر نے اس قصیدہ کو بھرے مجمع میں بڑے آب و تاب سے پڑھا۔
ہم لوگوں کا یہ عالم تھا کہ منھ پر رومال رکھے گردن جھکائے ہنسی
ضبط کئے بیٹھے تھے۔ اور ہر ہر شعر پر مجمع جھوم رہا تھا۔ خود نانک
صاحب کے وجد کا عالم دیکھ کر ہم لوگوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا
تھا کہ شادی مرگ نہ ہو جائے۔ قصیدہ کے اختتام پر انہوں نے
اٹھکر اختر کو گلے سے لگا لیا اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ اہل عظیم آباد
نے آج میری جتنی قدر کی ہندوستان کے کسی مقام پر اتنی عزت
مجھے کبھی نہیں بخشی گئی۔

اب سنجیدگی کی بات سنئے۔ پٹنہ میں ملک راج آنند آئے
اور اس کے بعد نریندر دیو۔ انہی دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین
کی بنا ڈالی گئی۔ ہم سب لوگ اس انجمن کے سرگرم کارکن بن گئے۔
اس کے بعد ہندی اور اردو کی متحدہ انجمن بنائی گئی۔ برج نندن
آزاد جو آج کل انڈین نیشن کے نائب مدیر ہیں، صدر منتخب ہوئے۔
اور اختر نائب صدر۔ ملازمت کے بعد اختر کو اس عہدہ سے علیحدہ
ہو جانا پڑا۔ پھر بھی اُس دور کی ادبی تحریک، کہ ہم لوگ ترقی پسند
بتاتے ہی رہے، جس میں اختر سب سے آگے رہتے تھے۔

جب اختر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج میں اردو لکچرر کی حیثیت
سے مقرر ہوئے تو مستقل طور سے پٹنہ میں رہنے لگے۔ یہ ملازمت
بڑے معرکوں کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک پنچاتی کا زمانہ ہے۔

اپنے حلقہ کے علاوہ شہر کے سارے بھی خواہاں اور وہ اسے
اپنا CAUSE سمجھتے تھے اور جب انتخاب عجیب وغریب طریقے
سے ہوا یعنی تقریری مقابلے کے بعد، تو باہر سیکڑوں کا مجمع کھڑا تھا
اور پانچ چھ سو طلبا نے خوشی کے نعرے لگائے تھے۔ اختر زندہ باد
کے شور میں بعض حضرات نے جوش میں مسلم لیگ زندہ باد بھی کہنا
شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود بنفس نفیس موجود تھے۔ انہوں
نے دریافت کیا کہ یہ کیسے نعرے لگ رہے ہیں تو اطہر نے جو ان کے
پرائیویٹ سکریٹری تھے کہا کہ اردو لیگ زندہ باد اور اختر زندہ باد
کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمود بولے، تو یہ کہو کہ میرے اس
فیصلے سے سبھوں کو اتفاق ہے۔ اختر لکچرر ہوگئے اور خدا کے فضل
سے آج وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ زمانہ
گزرتا گیا انقلابات آتے رہے ہمارے حلقے کی بھی تقسیم ہوگئی۔
کاش ملک نہیں بٹتا، تو دل نہ بٹتا، ذہن نہیں بٹتے اور سرحدیں
نہیں بنتیں۔ اور جب دل بٹ جاتے ہیں تو سرحدیں اذیتیں بن جاتی
ہیں۔ اور اب ہم لوگوں کے لئے ابتلا اور آزمائش اور اذیت و
مصیبت کا ایک سلسلہ ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ انسانیت ٹھٹھک
کر سوچے گی اور پھر صحیح معنوں میں ہم انسان بن جائیں گے محبت کرنے والے
انسان۔ محبت ہی حاصلِ حیات ہے۔ خیر ایک دو باتیں رہی
جاتی ہیں۔ انہیں بھی آپ سُن لیں۔ غالباً ۱۹۴۰-۴۱ء کا زمانہ تھا۔
میرے ایک چچا اور والد کے درمیان تقسیم جائداد کے معاملے میں
مقدمہ بازی چل رہی تھی۔ مختلف منازل طے کرتا ہوا مقدمہ ہائی کورٹ
تک پہونچا۔ اس سلسلے میں میرے والد کو دفعتہً کئی سو روپیوں کی
فوری ضرورت درپیش ہوئی۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ وطن دور
تھا ورنہ وہاں کچھ بندوبست ہو سکتا تھا۔ چند قریبی عزیز جو اس وقت
پٹنہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، پہلو تہی کر گئے۔ اتفاق سے اس
دن اختر مجھ سے ملنے آئے تو میں نے یونہی تذکرۃً والد کی پریشانیوں
کا ذکر کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ جو میری مالی حالت ہے تقریباً وہی اختر
کی بھی ہے۔ وہ کیا مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک گھنٹہ کے بعد دیکھا
کہ اختر سونے کے وہ سارے تمغے اور کپ جو انہیں زمانۂ تعلیم میں
بطور انعام ملے تھے، لئے ہوئے پہونچے اور میرے آگے ڈال کر کہنے
لگے کہ چھیل کے تھیلے سلسلے میں پاس کہاں؟ لیکن یہ چند بیکار سی چیزیں پڑی
ہوئی تھیں۔ انہی کو فروخت کر کے والد کی پریشانیوں کو دور کرو۔
چنانچہ یہی ہوا۔ والد کی فوری پریشانی دور ہوگئیں۔

اختر کھانے کے معاملے میں بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔
دسترخوان پر ہمیشہ عمدہ اور لذیذ چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے
ہیں اور اپنی دلچسپ گفتگو میں دوسروں کو پھنسا کر پلیٹ کی پلیٹ
صاف کر جانے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ چنانچہ ذاتی تجربے کے بعد
میں ہر دعوت میں ان سے کچھ دور ہی بیٹھتا ہوں۔ ان کی سسرال
والوں کو ان کے اس ذوق کا علم بہت پہلے ہی سے تھا۔ چنانچہ ہوسٹل
میں اکثر عمدہ عمدہ حلوے اور لذیذ مٹھائیاں وہاں سے آیا کرتیں۔
عموماً ٹین کے دو بڑے ڈبوں میں یہ چیزیں آتیں۔ ایک میں معمولی قسم
کے حلوے ہوتے جو ہوسٹل کے عام لڑکوں میں تقسیم کر دئے جاتے۔ دوسرے
ڈبہ میں انڈوں کا حلوہ یا دوسری مقوی اور لذیذ چیزیں ہوتیں۔
رات کے کھانے کے بعد نمبر کمرے میں ہم چند احباب جب یکجا ہوتے
تو ان مقویات سے خلوص برتا جاتا۔

اختر کا عشق رسوائے زمانہ رہا ہے۔ اس لئے میں تفصیل
میں شکیلہ سے ان کی شادی کا افسانہ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں اتنا
ضرور عرض کروں گا کہ ہم لوگوں پر ان کے کامیاب عشق کا رعب پڑتا
تھا اور جیسا کہ اس مضمون میں اوپر کہیں لکھ چکا ہوں، جب کبھی کسی
دوست پر اچانک عشق کا دورہ پڑتا تو براہ راست اختر کے پاس
پہونچتا اور ان کی گفتگو اور ان کے مشورے سے سکون پاتا۔ عباس
صاحب ہوں، یا راشد صاحب، میں ہوں یا تمنائی، ہم میں سے ہر ایک
انہیں اپنا رازدار سمجھتا تھا۔ تمنائی جو اس زمانے میں خود عشق کئے
جانے کے قابل تھے، ہر دو چار مہینے پر بری طرح کسی کے تیرِ نظر کے
گھائل ہو جاتے۔ اس میں عمر کی قید نہیں تھی۔ چھ سال کی لڑکی سے
لیکر خود ان کی عمر سے کئی سال بڑی لڑکی تک ان کے دل کا شکار کر لیتی

تھی اور وہ بیچارے اسٹڈی پیریڈ میں کرہ بند کر کے رد یا کرتے تھے۔ اختر انہیں ڈھارس دلاتے اور شکاری کو خود شکار کرنے کی آزمودہ ترکیبیں بتاتے۔ اکثر یہ ترکیبیں تیر بہدف ثابت ہوتیں۔

اکثر ایسا ہوتا کہ ہم مخصوص احباب جب یکجا ہو کر کسی گفتگو میں مصروف رہتے تو دوسرے لڑکے خواہ مخواہ پہونچ کر مخل ہوتے۔ ایسے موقعوں کے لئے ہم لوگوں نے بے معنی گفتگو کی تکنیک ایجاد کی تھی۔ اختر بیشکن کے کسی مابعد الطبیعاتی نظریہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور ہم میں سے کوئی دوسرا، عموماً اطہر، اس نظریہ کی تردید فرائڈ کے اقوال سے کرتے۔ لینن مارکس، ہیگل سبھی کے حوالے اس روانی سے دئے جاتے کہ سامعین ایک دوسرے کا منھ تکتے رہ جاتے۔ ایک بار اسی صنف میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اتفاق سے اختر کے ایک عزیز بھی موجود تھے۔ انہوں نے واپس جا کر اختر کے گھر والوں سے شکایت کی کہ اختر سخت قسم کا دہریہ ہو گیا ہے۔

میں ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ اطہر کٹر قسم کے وہابی خاندان کی پیداوار تھے۔ ممتاز اثنا عشری نظریات پر عامل اور اختر قادیانی عقائد کے ماننے والے ہیں۔ لیکن باوجود اس اختلاف عقائد کے ہم لوگوں کے درمیان کبھی کوئی مذہبی بحث نہیں ہوئی۔ ویسے میں نے سیرۃ النبیؐ کے بعض جلسوں میں شرکت کی ہے، جن میں مختلف عقائد و مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ اختر نے بھی اپنے عقیدے کی روشنی میں پیغمبر اسلام کی سیرت پر بصیرت افروز تقریریں کی ہیں۔ اور اپنے بیان کی افضلیت کا سکہ دلوں پر بٹھا کر اٹھے ہیں۔ اختر خواہ سیرت کے جلسے میں تقریر کر رہے ہوں یا انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے اردو کی انفرادیت کو ثابت کر رہے ہوں اپنے مطالب کو اس لطیف پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ سامعین کے دل میں ایک ایک لفظ اتر جاتا ہے۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، موزوں الفاظ کی نشست و برخاست، مناسب تقرے، مدلل بحث۔ ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ مجمع کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ روشنیٔ طبع کبھی کبھی ان کے لئے بلا بن جاتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے تقریباً ہر ہفتے انہیں کہیں نہ کہیں تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے، جسے عموماً وہ قبول نہیں کرتے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض کرم فرماؤں کی ضد سے مجبور ہو کر انہیں جانا پڑتا ہے۔ اور جلسے سے واپس آکر دو چار روز تک نزلہ و بخار کی مہمانداری کرنی پڑتی ہے۔

اختر جس تیزی سے تقریر کرتے ہیں، تقریباً اسی رفتار سے لکھتے بھی ہیں۔ چنانچہ اب تک افسانوں اور تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ ایک ناول بھی چھپ چکا ہے۔ ڈی لٹ کی ڈگری لینے کے سلسلے میں ایک ضخیم کتاب "بہار میں اردو ادب کا ارتقاء" بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار نظمیں اور ریڈیو فیچرز بھی لکھ چکے ہیں۔ اور لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کی بہت کم چیزیں پڑھی ہیں، اس لئے ان کی تخلیقات پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کی ادبی تخلیقات سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی خود ان کی ذات سے ہے، جو سچائی خلوص، ایمانداری اور شرافت کا ایک مجسمہ ہے۔
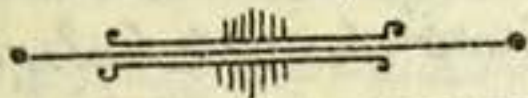
بقیہ دیوار قہقہہ

کو ٹھیس تک نہ لگ سکی، وہ کلیوں کو پھول ہوتے ہوئے دیکھ کر اس خیال سے ہنستا ہے کہ خزاں کے جھونکے ایک دن ان پھولوں کی پتیوں کو بھی منتشر کر دیں گے۔ اختر نے حقیقت کو سمجھ لیا ہے، اسلئے خزاں کے جھونکے کم سے کم اسکے رومان کو متزلزل نہ کر سکے۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ جن کھلونوں کے لئے روتا تھا، آج انہیں کھلونوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھ کر ہنستا ہے، اسلئے کہ یہی نظام قدرت ہے۔ ان کو ٹوٹنا ہی چاہئے تھا۔ اختر کی موجودہ زندگی اسکے پیہم قہقہوں میں گم ہو گئی ہے۔ لیکن ان قہقہوں میں عقل سلیم اور چشم بینا کے لئے نہ جانے کتنے سبق آموز نشتر پوشیدہ ہیں۔

● ●

شکیلہ اختر

ہمارے مہمان سرا میں صوفیا ، کرام ، مبلغین اسلام ، واعظین محترم ، جوہری توانائی کے ایک ماہر سائنس دان ، اور مجروحین کو طبی امداد دینے والے ڈاکٹر صاحبان بھی تشریف لائے ہیں ۔ ان میں حضرت نیر صاحب مرحوم و مغفور مبلغ انگلستان وافریقہ ، حضرت بھائی فضل دین صاحب مرحوم ، چوہدری غفور صاحب مرحوم ، مولانا سلیم صاحب مبلغ برما اور شام و فلسطین اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب صدر شعبۂ ریاضی لنڈن یونیورسٹی ، F.R.S. تشریف لائے ہیں ۔ ان کے علاوہ خانا کے نوجوان واقف زندگی عبدالوہاب صاحب ، جرمنی کے نو مسلم عبدالشام نو دوبکی ، صاحبزادگان میرزا وسیم احمد صاحب ، میرزا رفیع احمد صاحب مبلغ انڈونیشیا ، میرزا حنیف احمد صاحب مبلغ افریقہ بھی ہمارے غریب خانے پر مقیم رہے ہیں ۔ لیکن میں فی الحال اس کہکشاں مذہب و اخلاق کی تصویر پیش نہیں کرتی بلکہ اس کاروان ادب وشعر کی تصویر اتارتی ہوں جو یہاں سے گذرا ـــــ

اختر صاحب کو ۱۹۳۶ء کی دسمبر میں پٹنہ کالج میں لکچررشپ ملی تھی اور ایسی اچانک ملی تھی جیسے خدا نے بیٹھے بٹھائے چھپر پھاڑ کر یہ ملازمت انہیں دیدی ہو ـ ان دنوں اختر صاحب اپنے عزیز دوست شرف الدین احمد عظیم آبادی کے کوارٹر میں گردنی باغ ٹھہرے ہوئے تھے ـ میں ارول میں تھی ، وہیں ملازمت کی خوشخبری بھی ملی اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ساغر کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے پٹنہ آئے ہوئے تھے اور سید محمود صاحب وزیر تعلیم کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے انہیں اختر صاحب گاڑی پر چند گھنٹوں کے لئے گردنی باغ کے کوارٹر میں لے آیا ، جس کا مالک اب تک ایک مہمان کی طرح زندگی گزارتا چلا آرہا تھا ، اس گھر کی رکھوالی کرنیوالی ایک بوڑھی ملازمہ کے سوا اور کوئی نہ تھا ، وہی بچاری تھی اس چھوٹے سے گھر کی کرتا دھرتا تھیں اور ایک اکیلی رونق بھی ـ

وہ بڑے سکون اور بے فکری کا زمانہ تھا کم پیسوں میں بھی شرافت کا بھرم رہ جاتا تھا ۔ اشرف صاحب تمنائی صاحب رضا نقوی اور اطہر صاحب نے مل جل کر اس کوارٹر میں مشاعرے کی تیاری کی ، دو تین چھوٹی بڑی دریاں ایک کوٹھری میں چھپائی رکھیں ، ہیں سے ایک دو صاف ، اور بستر کے اندر سے کچھ میلی دلی سی چادریں نکالیں اور سیٹ سیٹ کران کو جوڑی ہوئی دریوں پر بچھادیا ، آس پاس کے کوارٹروں میں خبر ہو چکی تھی کہ اردو کا ایک بڑا شاعر اس چھوٹے سے گھر میں آرہا ہے ـ پان کی طشتریاں بھرنے میں کئی روپے زیادہ پیسے لگتے تھے اور بچاری کا بوا جنم جنم کی جائے گی شیدا پتیلی بھر جائے کے لئے پانی ، کھولانے کو خوشی خوشی تیار ہو گئیں ، مجھکو خبر ملی کہ مشاعرہ ہوا اور بڑے دھوم دھام کا ہوا ـ

لوگوں نے لہک لہک کر پڑھا اور جو پڑھ نہ سکے انہوں نے جھوم جھوم کر سنا۔ اور مجاز بچارے کا تو یہ حال تھا کہ سنائے چلے گئے مگر لوگ تھے کہ اور سننے کو مچلے جاتے تھے۔

اختر صاحب کے ارجنٹ تار پر جب میں پہلی بار دلی سے پٹنہ پہنچی تو مجھے نہ تو اسٹیشن پر اختر صاحب ملے اور نہ ان کے ٹھہرنے کی جگہ معلوم تھی۔ آخر تھک کر میں سیدھی رضا نقوی صاحب کے گھر کھٹکھٹا کر وہاں ٹھہر گئی۔ کافی دیر کے بعد اختر صاحب آگئے معلوم ہوا ابھی ان کے مکان کا افتتاح نہیں ہوا ہے۔ رضا صاحب کا مکان ان کے اپنے خاندان اور خاندانی مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، پھر بھی انہوں نے ہماری بڑی خاطریں کیں، اور بڑا اچھا کھانا کھلایا۔ دوسرا صبح کو ہم سب لوگ ایک بگھی پر سوار ہو کر مصطفے پور آئے۔ بگھی میں اندر شریف صاحب، رضا صاحب، نقوی اور طفیل احمد منظفی بھی تھے، سب کے چہرے خوشیوں سے لہک رہے تھے، طفیل صاحب عمر میں سب سے چھوٹے تھے، اسی لئے وہ سب سے زیادہ شوخ بھی ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی دولہا کی برات جا رہی ہو۔ اور باراتیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ طفیل صاحب شعر پر شعر سنائے جا رہے تھے، اب تک صرف ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے جس کو وہ بڑے پیار سے لہک لہک کر سنا رہے تھے۔

"ہر بندہ سے ٹپکا پڑتا ہے، ہر چھوٹے سے چھلکا جاتا ہے"

بے چارے طفیل صاحب اب کہاں ہیں۔ نہ جانے کے چوتھائی پرچوں میں کبھی کبھار ان کا نام نظر آجاتا تھا —— اپنی سرزمین سے کچھ ایسے گم ہو کر وہ ایسے روپوش ہو گئے ہیں کہ کبھی کبھی بے اختیار دل ان کو ڈھونڈھتا ہے۔

اختر صاحب نے سب سے پہلا مکان جو کرایہ پر لیا وہ مصطفے پور میں تھا، کافی بڑا مکان، بڑے بڑے روشن ہوادار کمرے تھے، کھلی ہوئی چھت تھی اوپر کی منزل پر بھی بڑے اچھے سے دو کمرے تھے۔ مگر اس گھر میں نہ تو لائٹ تھی اور نہ پانی کا نل تھا۔ گھر تک پہنچنے کا راستہ ایک صاف ستھری گلی سے ہو کر آتا تھا۔ گھر کے دونوں طرف کھلے ہوئے میدان تھے، جو شہر کے اندر ایک بڑی نعمت تھی۔

اس گھر میں سب سے پہلے مہمان مجاز آئے تھے۔ بزم ادب کا جلسہ رات کو ہونے والا تھا، شام کے وقت ایک فٹن سامنے گلی کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ذرا دور سے گھومتی ہوئی احاطے کے گیٹ پر آ لگی، کئی لوگ اس پر سے اترے، اتنے لوگوں میں مجاز کو میں پہچان نہ سکی تھی، صرف بندھے بندھائے بستر اور ایک سوٹ کو گھر میں آتا ہوا دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ مجاز صاحب ضرور تشریف لائے ہیں۔ تھے ہی جلدی جلدی ناشتہ چائے سے فارغ ہو کر اسی فٹن پر بیٹھ کر سارے لوگ چلے گئے۔ میں باہر کے کمرے میں گئی جہاں مجاز کو ٹھہرایا گیا تھا، وہاں جاتے ہی جی سست ہو گیا سارا سامان پھیلا ہوا تھا۔ کوئی چیز ذرا بھی ڈھنگ سے رکھی نظر نہ آ رہی تھی۔

اس وقت میرے پاس ایک بڈھا ملازم تھا، ایک باورچن تھی اور ایک چھوٹا سا لڑکا۔ ان تین عمروں کے ملازموں کے درمیان مجھی کو پسنا پڑتا تھا، ایک بہت بوڑھا دربان، ایک معصوم سا دس برس کا بچہ اور تیسری دبلی پتلی نازک سانولی سی شہری باورچن تھی جو کام کرنے سے زیادہ مسکرا مسکرا کر پان کھانا جانتی تھی۔ مجاز کے آنے پر اب یہ کام پڑ گیا تھا کہ باہر والے کمرے میں دو پلنگ کس طرح سے پہنچایا جائے۔؟ آخر سوچ بچار کر، باورچن نے دو بچھوکردوں کو گلی سے پکڑ کر لایا اور یہ مسئلہ اس طرح سے حل ہو گیا۔ ایک پلنگ پر مجاز کا بستر بچھا دیا گیا اور ایک پلنگ پر اختر صاحب کا۔

اس روز بزم ادب کا جلسہ بڑے دھوم دھام سے ہونا تھا۔ اور مجاز کو دیکھنے اور سننے کی خاطر لوگ دوسرے شہروں سے ریلوں اور موٹروں پر چڑھ چڑھ کر آئے ہوئے تھے اور بارہ بجے رات تک مجاز کی خوبصورت نظمیں اور رسیلی آوازوں پر سر دھنتے رہے تھے۔

ان دنوں اختر صاحب کے عزیز دوستوں سے پٹنہ بھرا ہوا تھا جن میں کوئی شاعر، کوئی ادیب اور کوئی نقاد تھے، اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو علی گڑھ کالج میں مجاز کے کلاس فیلو رہ چکے تھے، صبح کو ملنے ملانے والوں کی بھیڑ جب چھٹ چکی تو صرف دوستوں کی منڈلی نے مجاز پر اپنا قبضہ جما لیا، کچھ گنگناہٹیں ابھریں اور کچھ ترنم کا خمار چھایا، میں کیواڑ کی اوٹ سے لگ کر ان رسیلے گیتوں کو

سنا چاہ رہی تھی کہ اچانک مجاز کا کمرہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ میں حیران سی کھڑی رہ گئی۔ ارے یہ دوستوں کا گروپ کمرہ بند کرکے کون سی سازش کر رہا ہے۔ اختر صاحب بھی اسی کمرے میں تھے۔ اور اندر سے دبی دبی ہنسی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں کل ہی سے مجاز کو دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اب جو ذرا جھانک تاک کے دیکھنے آئی تھی تو کمرہ ہی بند کر لیا گیا تھا۔ اس بند کمرے کو دیکھ کر اچانک مجھے یاد آگیا کہ جوان ہوتی ہوئی لڑکیاں آپس میں چھپ چھپ کر کھسر پھسر کرنے یا ٹیڑھے میڑھے حرفوں میں عشقیہ خط لکھنے کو اسی طرح سے کمرے بند کر لیا کرتی تھیں۔ میں بند کمرے کے اندر جھانکنے کے لئے کیواڑ میں کسی شگاف کو ڈھونڈنا چاہا، مگر وہ کیواڑیں ایسی لکڑی کی کی بنی ہوئی تھیں کہ بال برابر بھی کوئی جھری نہ مل سکا، بند والے کمرے کا دوسرا دروازہ فضل کے کمرے میں تھا، مگر فضل میاں کے کمرے میں جانا اور جا کر جھانکنا کوئی آسان بات نہ تھی، ان دنوں وہ بڑے رنگ چڑھے ہو رہے تھے، بات بات پر ان کی سیاہ گھنی ہوئی بھنویں اور زیادہ چڑھ جاتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ اپنے بھائی جان کی ملازمت ملنے کی خوشی میں وہ ہوسٹل چھوڑ کر اس گھر میں آگئے تھے جہاں نہ تو بجلی کی روشنی تھی اور نہ ہوسٹل کا سکون۔ اب وہ آکر کھنچے رہتے تھے، اور موقعہ بے موقعہ مجھے کبھی کبھی ان کی شکن بھری پیشانی کو دیکھ کر ڈرنا پڑتا تھا۔ میں دبے پاؤں ان کے کمرے میں گئی، وہ دریچے پر کتاب رکھے پڑھ رہے تھے، پلٹ کر مجھ کو آتے ہوئے دیکھا، اور مجھے محسوس ہوا کہ ان کی بھنویں جڑ رہی ہیں۔ بلا سے۔ اب تو جو بھی ہو، لیکن میں اس بند کمرے کے اندر جھانک کر مجاز کو ضرور دیکھوں گی۔ آخر تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک اچھی سی دراز مجھے مل گئی اور میں بڑے ذوق و شوق سے جھانکنے لگی۔ سامنے ہی اطہر صاحب، رضا، یحییٰ، اقبال، مظہر، طفیل سب کے سب بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ہی مجاز اپنے بستر پر تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ دبلے پتلے سے، اونچی لمبی ناک، سانولا رنگ، تیز چمکیلی آنکھیں۔ اور کان تک لوٹتے ہوئے سیدھے بال۔ سبھی لوگ ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے، مجاز کے آگے ایک کاپی کھلی دھری تھی، اور ان کے ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا، کچھ اور لوگوں کے ہاتھوں میں بھی گلاس تھے۔ عنابی رنگ کے شربت کے گلاس۔ میں نے بڑے غور سے دیکھا اختر صاحب ذرا دور تھے اور مشرف صاحب کنارے کی ایک کرسی پر کچھ مخبوط الحواس سے گھبرائے گھبرائے لگ رہے تھے، رضا صاحب کا انداز ہی ایک تماشائی سا الگ رہا تھا، جیسے کوئی مداری ابھی اپنا کھیل دکھانے والا ہو۔ رضا صاحب اور یحییٰ صاحب کی کیفیت ایسی نظر آرہی تھی کہ بس دروازہ کھلے اور بے تحاشا بھاگ نکلیں۔

مجاز نے شربت کا ایک گھونٹ لیا، کاپی کے اوراق الٹے اور گنگنانے لگے۔

"میں آہ بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا"

ابھی دوسرا مصرعہ سننے بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے مجھے پیچھے سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"آپا۔ آپا۔ ارے بھئی ہٹئے بھی۔ ارے جناب اس بند کمرے میں شراب پی جا رہی ہے۔ شراب"۔ عزیز نے مجھے دھکیل دیا اور خود جلدی جلدی جھانکنے لگا۔ فضل نے چونک کر ذرا مسکراتے ہوئے کیواڑ کی طرف دیکھا اور میں حیرت زدہ سی رہ گئی۔ شراب؟ اس گھر میں شراب۔؟ جہاں پانچوں وقت کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ جہاں اخلاق اور مذہب پر لمبی لمبی اور بڑی اونچی اونچی باتیں کی جاتی ہیں۔ ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی سی گر پڑی ہے۔

"تو ان گلاسوں میں شربت نہیں، شراب تھی؟ اسی لئے تو کمرہ بند کیا گیا تھا نہ؟"

میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ مجاز کے آنے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی تھی۔ میں چپکے سے اپنے کمرے میں اوپر چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اختر صاحب کے آنے کی آہٹ ملی، میں نے اپنے آنسوؤں کو پونچھ لیا، اور بڑے غور سے اختر صاحب کو آتے ہوئے دیکھنے لگی، سنتی آئی تھی کہ شراب پینے والوں کے قدم لڑکھڑاتے ہیں، مگر اختر صاحب بغیر لڑکھڑائے اپنی چال سے چلتے میرے پاس آئے،

"اَرے تم یہاں ہو؟ — وہاں مجاز اپنی نظمیں سنا رہے ہیں" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی — ان کے قریب آئی — پہلے ان کے کپڑوں کو سونگھا — پھر ڈری ڈری ہوئی آواز میں بولی —

"آپ ذرا اپنا منہ کھول کر سونگھا دیجیے تو —؟" وہ زور سے ہنس پڑے —

"دماغ خراب ہو گیا ہے؟" اور ایک گہری سانس لے کر میرے منھ پر چھوڑ دیا —

"خدایا تیرا شکر ہے" — میں نے مطمئن ہو کر ان کو دیکھا اور وہ ہنستے ہوئے پھر نیچے چلے گئے —

مجاز کئی دنوں تک ہمارے گھر ٹھہرے — پٹنے کی شوخ اور چنچل لڑکیوں نے جھانک جھانک کر مجاز کو دیکھا، اندرون اور دلی سے نگار اور سوز بھی آئی ہوئی تھیں — مجاز کی جن نظموں نے ان لڑکیوں کی رات کی نیند آنکھوں سے اڑا دی تھی، اب انہی رسیلی نظموں کو وہ مجاز کی آواز اور اس کے خوبصورت ترنم میں سن رہی تھیں — شاعری کا احساس رکھنے والی لڑکیوں کے چہرے ان خمار آگیں نظموں کو سن کر گلنار کی طرح دمک اٹھے تھے، پردے کے اندر سے دبی دبی پھلجڑیاں چل رہی تھیں — ہنسیوں کی بارش ہو رہی تھی، اور گھنگھروؤں کے بجتے ہوئے بول جیسی آواز والے شاعر کو قریب سے دیکھنے کی حسرتوں کا صاف پتہ چل رہا تھا، مجاز نے شاید ان ساری پس پردہ کیفیتوں کو محسوس کر لیا تھا جب ہی تو انہوں نے اپنی یہ نظم سنائی کہ —

" ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا "

اس نظم کو سن کر پردے کے پیچھے بجتی ہوئی چوڑیاں، اچانک زنجیروں کی آواز محسوس ہونے لگی تھیں —

جس دن مجاز واپس جا رہے تھے سارے گھر پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی — سب کے چہرے اداس تھے — مجاز کا بستر جب باندھا جانے لگا تو ان کی عنابی رنگ کی گرم چادر غائب تھی، اور جب اس چادر کو ڈھونڈا جانے لگا تب معلوم ہوا کہ اختر صاحب کی چادر پر بھی کسی نے ہاتھ صاف کر دیا ہے — دونوں گرم چادریں نہ جانے گھر کے کس چھوکرے کو پسند آ گئی تھیں — مجاز پر کوئی اثر نہ تھا لیکن ہم لوگ شرم کے مارے گڑے جا رہے تھے — مجاز نے ہنس کر کہا —

"چلو اچھا ہی ہوا — وہی ایک اچھی چیز میرے پاس رہ گئی تھی — اب اس کے کھو جانے کا کوئی کھٹکا ہی نہ رہا —

غالب بڑے عقلمند تھے اسی لئے تو رہزن کو دعا دی تھی —"

مجاز چلے گئے پھر ہمیشہ کے لئے چلے گئے — مگر ان کے گائے ہوئے نغموں کی گونج، سنائے ہوئے لطیفوں کی مٹھی، اور زندہ دلی کے ساتھ لگائے ہوئے قہقہوں کی یاد ابھی تک ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں —

مصلح پور کا زمانہ بڑا پرسکون تھا — اختر صاحب کی تھوڑی سی تنخواہ میں اچھی خاصی فارغ البالی سے گزر ہو جاتا تھا — جنگ چھڑ چکی تھی، اخباروں کی سرخیاں بڑی رنگین اور پرکشش رہنے لگی تھیں — جنگ کی دہشت سے دل اگرچہ کانپ کانپ اٹھتا تھا، مگر پولینڈ، وارسا، اور ڈنکرک کی ہولناکیاں پھر بھی ہم سے بہت دور نظر آتی تھیں — سات سمندر پار — پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اپنے دیکھے بھالے لوگ بھی، آرمی جوائن کرنے لگے، انہیں دیکھ کر دل مسلا جاتا تھا، مگر ایک فریب جی کو بہلاتے بھی دے جاتا تھا کہ بھلا، اپنے شہر میں بسنے والے لوگ، اتنی دور پہنچ بھی سکیں گے؟ بس یہیں کہیں، اِدھر اُدھر چھاؤنیوں میں لفٹ رائٹ کر کرا کے، فوجی وردی پہنے واپس آ جائیں گے — وقت بیتتا گیا، اور جنگ کی ہما ہمی اس وقت ہمیں اپنے قریب محسوس ہوئی، جب میرے چچا زاد بھائی ڈاکٹر قمر الہدیٰ سارے خاندان کو روتا ہوا چھوڑ کر جنگ میں چلے گئے تھے — "ریڈ کراس کا لال نشان" ہمارے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے انہوں نے ہمیں تسکین دی تھی کہ ڈاکٹروں کی جانیں اسی لال نشان سے بچ جاتی ہیں، اور ریڈ کراس کا یہ نشان

دنیا کے ظلموں کو تھوڑی دیر کے لئے روک دیتا ہے۔

۱۹۴۰ء کی گرمی کی چھٹیوں میں ہم لوگوں نے مصلح پور چھوڑ دیا تھا، اختر صاحب بیمار تھے، ان پر ریٹیزم کا دوبارہ حملہ ہوگیا تھا، رضا صاحب نے سامان کے ساتھ ہم لوگوں کو کچھ دنوں کیلئے انجمن اسلامیہ کے احاطے میں، اپنے کسی دوست کے ایک چھوٹے سے خالی گھر میں ٹھہرا دیا تھا، ان دنوں انجمن اسلامیہ بھرے بازار میں تھا، عزیز اور فضل میرے اور اختر صاحب کے بھائی شروع ہی سے ہمارے ساتھ تھے۔ گھر چھوڑنے کی وجہ سے ان بچاروں کی پڑھائی درہم برہم ہو رہی تھی ۔۔ فضل اس الجھن کو بڑی طرح محسوس کر رہے تھے مگر عزیز میاں بڑے خوش تھے کہ چلو ۔۔ کچھ دنوں تک کے لئے تو کتابوں سے جان چھوٹی، آخر طے یہ پایا کہ اختر صاحب کو لیکر میں اردل چلی جاؤں اور یہ دونوں لڑکے اسی گھر میں اپنے چھ ماہی امتحانوں کی تیاریاں کریں گے ۔۔ خانہ داری کا سارا سامان منگا کر، روزانہ خرچ کے پیسے دے کر کھانا پکانے والا ایک نوکر چھوڑ کر میں اختر صاحب کے ساتھ یکسر موٹر سے اردل چلی گئی ۔ ہم لوگوں کو اردل آئے بس دو ہی دن ہوئے تھے کہ اچانک عزیز وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ ملازم نے ایک دن ان لوگوں کو بھوکا رکھا اور خود سیر سپاٹے میں رہا۔ رات کو کسی وقت چھپ کر آیا اور اپنی کوٹھری میں گھس کر سو رہا، دونوں لڑکے بھوکے شیر ہو رہے تھے اسکو کوٹھری سے پکڑ کر لائے اور رسی سے باندھ کر قریب ہی نالے میں ڈال دیا۔ ساری رات وہ چیختا رہا، اور اب سارا غلہ اونے پونے بیچ باچ کر فضل میاں تو مظفر پور بہن کے گھر سدھارے اور عزیز میاں اردل آگئے ہیں ۔ ان دنوں پریشانیوں کا کوئی احساس بھی نہ ہوتا اور ہر کٹھن گھڑی ماں باپ کی محبت کے سہارے ایک اداس سی مسکراہٹ میں گزر جاتی تھی ۔۔

کالج کھلنے سے بہت پہلے اختر صاحب کی طبیعت اچھی ہو چکی تھی، اس دفعہ جو ہم لوگ پٹنہ آئے تو ہمیں مہندرو میں ایک بڑا رنگین بیل بوٹوں والا، اور بجلی کی روشنی سے جگمگاتا ہوا گھر ملا تھا۔

پانی کا نلکا اور پنکھا یہاں بھی نہیں تھا ۔ لائٹ کو دیکھکر طبیعت کھل اٹھی تھی ۔ مگر ہائے رے برسات کی امس، کہ جی بھر کے خوشیاں منانے بھی نہ پائے تھے کہ گھر کے سارے لوگوں کو ایکبارگی یہ احساس ہونے لگا کہ یہ مکان ایک بڑا موٹا رنگین اور گرم لحاف ہے جس کے اندر اس بلا کی گرمی میں ہر وقت تڑپتے رہنا ہے ۔ دو ہی مہینے کے بعد ہم لوگ رانی گھاٹ کے ایک چھوٹے مگر کھلتے ہوئے اور احاطے دار کوارٹر میں آگئے تھے ۔ یہاں آکر ایسا محسوس ہوا جیسے ہم لوگوں نے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر دوبارہ نئی زندگی حاصل کی ہے ۔ کوارٹر کے پیچھے بہت بڑا کھلا ہوا میدان اور اس میدان کے بعد گنگا کا مچلتا ہوا حسن تھا ۔ سامنے کھلی ہوئی فضا اور چمکتی ہوئی سڑک تھی ۔ احاطے میں گل مہر کا درخت تھا اور چمیلی کی خوشبودار لتیں، ایسی خوبصورت اور صاف ستھری جگہ آکر ہم پھولوں کی بے پناہ یورش اور قریب ہی شمشان گھاٹ کی طرف سے آنیوالی "رام نام ست ہے" کی ہیبت ناک آواز کو بھی نظر انداز کر گئے تھے

میں ان دنوں اردل گئی ہوئی تھی، اور سارا گھر اناڑی قسم کے نوکروں پر مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا، اماں جان دل کی مریض تھیں، جب کبھی ان پر دل کا خطرناک دورہ پڑتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے اردل جانا پڑتا اور کبھی اماں جان علاج کے لئے پٹنہ خود بھی لائی جاتی تھیں۔ مجھکو خبر ملی کہ اختر صاحب کسی مشاعرے میں مظفر پور گئے تھے وہاں عبادت بریلوی، سلام مچھلی شہری اور روشن صدیقی مخصوص مہمان بلائے گئے تھے، اختر صاحب مظفر پور سے لوٹتے ہوئے سلام، روشن، اور عبادت کو بھی اپنے ساتھ پکڑتے ہوئے لیتے چلے آئے، روشن صاحب تو پٹنہ جب بھی آتے اختر صاحب کے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محسن صاحب کے یہاں ہی ٹھہرتے رہے ہیں، عبادت بریلوی اور سلام کو اختر صاحب نے اپنے گھر رانی گھاٹ میں ٹھہرایا ۔ اور صرف نوکروں کے رحم و کرم پر ان کی ایسی مہمانی شروع ہوئی کہ ایک نوکر کے بھاگ جانے پر گھر کے لوگ عزیز، فضل، خورشید، شمیم اور وسیم، ہمارے اور اختر صاحب کے بھائی بھانجوں کے ساتھ

بچارے سلام کو بھی کھانے کی پلیٹیں دھو دھو کر دسترخوان پر لگانی پڑیں۔ اور عبادت کے سپرد آم کاٹنے کا کام لگا تھا، بچارے مہمان بچے کھچے کھانے کھا کر اور ڈھیر دل قہقہے لگا کر چلے گئے، مگر جاتے جاتے اپنی حیرت کا اظہار بھی کرتے گئے کہ اختر صاحب کے کمرے میں اتنا عظیم الشان چھپر کھٹ آیا تو کیسے آیا؟ ـــ عبادت صاحب نے کہا کہ اس کمرے کی بنیاد رکھتے ہی یہ مسہری یہاں بچھا دی گئی ہوگی، مگر سلام نے کہا یہ بھی ممکن ہے کہ چھت پڑنے سے قبل ہی رسوں سے باندھ کر یہ چھپر کھٹ یہاں اتار دی گئی ہو"۔ ـــ اب بھی جب کبھی اس شاندار مسہری پر نظر جاتی ہے تو بے اختیار عبادت اور سلام مجھے یاد آجاتے ہیں۔ ـــ

میرے واپس آنے کے بعد چند گھنٹوں کیلئے حفیظ جالندھری صرف چائے پینے کے لئے ہمارے گھر رانی گھاٹ تشریف لائے تھے۔ چائے کا سامان باہر لان میں تھا، اور میں ہزار کوشش پر بھی شاہنامہ اسلام لکھنے والے حفیظ کو جھانک کر دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں نیشنل وار فرنٹ کے پروپیگنڈے کے لئے وہ سرکاری طور پر آئے تھے۔ اور کرشن گنج میں مہمان ٹھہرائے گئے تھے۔ اہل فن۔ فن پرستوں، اور کالج کے طلباء کے ایک مجمع میں گھرے ہوئے حفیظ جالندھری نے اپنی کئی بڑی اچھی اچھی نظمیں سنائیں۔ نیشنل وار فرنٹ میں شرکت کے لئے انہوں نے اختر صاحب پر بہت زور دیا مگر اختر صاحب اور آنجہانی پروفیسر دیدیا دھی جی نے شرکت سے صاف انکار کر دیا۔ ہندی کے بڑے شاعر دنکر جی بہار کے ناظم کی حیثیت سے نیشنل وار فرنٹ میں شریک ہوئے تھے۔ اس وقت جنگ بڑے زوروں پر چھڑی ہوئی تھی۔ کلکتے میں جاپان کی بمباری کا اثر بہار میں شدت سے محسوس کیا جانے لگا تھا، ۴۲ء کی ملکی ہنگامہ آرائی نے ویسے ہی ہوش اڑا رکھے تھے۔ رانی گھاٹ آکر جنگ قریب تر محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس لئے کہ رانی گھاٹ میں لا کالج کے پاس وار ٹکنیشینوں کے نئے بنے ہوئے بیرکوں میں غیر ملکی سپاہی بھرے پڑے تھے۔ روزانہ ان کے پریڈ کی لفٹ رائٹ ہوا کرتی تھی، اور بھاری بھرکم جوتوں کی گونج ہمیں جھنجھوڑ کر جگا دیتی تھیں کہ جنگ کی بھٹی اب ہم سے کتنی قریب آپہنچی ہے۔ گھر کے اندر دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں، اور روزانہ کی زندگی پر آنے والی بھیانک گرانی کا ایک ہلکا سایہ پڑنے لگا تھا۔ انہی دنوں ہندوستانی کمیٹی میں شرکت کرنے کے لئے مولانا عبدالحق صاحب پٹنہ تشریف لایا کرتے تھے۔ آپ کا قیام پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کے یہاں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار بزم ادب کے ایک سالانہ جلسے "دو دنوں کے مشاعرے" میں بھی مولانا عبدالحق صاحب شریک ہوئے تھے۔ پہلے سالانہ جلسوں میں صرف مشاعرے ہوا کرتے تھے اور شعراء ہی بلائے جاتے تھے لیکن مولانا عبدالحق صاحب کے آنے سے ناقدین اور محققین کی آمد کا بھی آغاز ہوا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے بزم کے سامنے ایک خطبہ بھی دیا تھا۔

غالباً ۱۹۴۳ء کے اوائل میں سب سے پہلی بار آل احمد سرور صاحب پٹنہ تشریف لائے تھے، آپ نے بزم کے سامنے اپنا وہ خطبہ پڑھا تھا جو تنقیدی اشارے" میں شامل ہے (موجودہ ادبی مسائل" خطبہ صدارت پٹنہ کالج)

سرور صاحب لکھتے ہیں:۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے بزم ادب کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے یاد کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ عرصے کے بعد مجھے پٹنے کے ارباب نظر اور صاحبان فن سے ملنے کا موقع ملا"۔ سرور صاحب شاید اس دور کلیم الدین احمد صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے۔ وہ زمانہ کچھ ایسا انقلابی اور جگرسوزی کا تھا کہ مجھے پورے طور پر یاد بھی نہیں کہ آپ کب آئے اور کب گئے۔ ہاں ادبی پرچوں میں جب اس نام پر نظر پڑتی تھی تو ایک خیال سا آجاتا تھا کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لا چکے ہیں۔

۱۹۴۶ء کے ستمبر میں پانچ بڑے اچھے اور پرسکون سال رانی گھاٹ میں گزار کر ہم لوگ پٹنہ کالج کے اندر مسلم ہوسٹل (جواب اقبال ہوسٹل ہے) کے سپرنٹنڈنٹ کوارٹر میں چلے آئے۔

میں نے بڑے اہتمام سے اس گھر کو سجانا شروع کر دیا۔ خوبصورت
دریچوں پر پردے ڈالتے ہوئے باہر احاطے کو بڑی حسرت سے
دیکھتی جو یہاں میری پہونچ سے دور ہو چکا تھا۔ ہوسٹل اور
گھر کے احاطے میں تین تین مالی مقرر تھے۔ لیکن میں اس گھر کے اندر مقید
کر دی گئی تھی۔ یہاں اونچی آواز میں بولنا بھی منع تھا، چھت پر اور
دریچوں کے قریب جانے پر بھی پابندی تھی۔ اس گھر میں آکر بچے
بڑے خوش تھے۔ ننھے منے ممی، نمی جب کالج کے لڑکوں کو سامنے
فیلڈ میں کرکٹ وغیرہ کھیلتے دیکھتے تو اپنا چھوٹا چھوٹا سا بال اور ہاکی
اسٹک لے کر وہاں پہونچ جاتے۔ مگر ذرا بڑی ہوتی ہوئی بچیوں پر
پابندی لگ گئی تھی اور وہ دریچوں پر بیٹھی، بڑی حسرتوں سے باہر
کی دنیا کو دیکھا کرتی تھیں۔ یہ بچے کچھ میری بہنوں کے تھے اور کچھ
میرے چھوٹے بھائی بہن تھے۔ ان دنوں فضل کی شادی میری
تیسری بہن صوفیہ سے ہو چکی تھی اور وہ مجسٹریٹ ہو گئے تھے، نمی
ان کا پہلا بچہ پیدا ہو چکا تھا، اور عزیز بی۔ اے کے آخری سال
میں تھے،

اس گھر میں آکر دنیا پرسکون نظر آتی، ہر طرف خوف و دہشت
کے احساس چھانے لگے تھے۔ آخر جلد ہی سہمی ہوئی نگاہوں نے قیامت
برپا ہوتے ہوئے دیکھ ہی لیا۔

ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ہونے کے بعد اختر صاحب کی شگفتگی کسی
حد تک مدھم پڑ گئی تھی، ان کو یہاں کے ہنگاموں، الجھنوں اور آفس کے
بیکار کاموں کی وجہ سے بڑی گھبراہٹ ہوا کرتی تھی، وقت بے وقت
لڑتے جھگڑتے طلبا جب اپنی شکایت لے کر پہونچ جاتے تو اختر صاحب
اپنے کو بھی وہی جن جن "بنا ہوا محسوس کرتے"، جو اختر صاحب کے ہوسٹل
میں رہنے کے زمانے میں یہاں کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور جن کو اختر صاحب
اور ان کے دوستوں کا گروپ ہمیشہ طرح طرح سے ستایا کرتا تھا۔
جب بھی اختر صاحب کو مولوی جن جن یاد آجاتے، وہ کسی نہ کسی بہانے
مجھ سے آکر جھگڑنے لگتے تھے کہ "اس جاہل اور بے ہنگم جگہ تم ہی نے
مجھ کو پھنسایا ہے" اختر صاحب کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ یہاں

کے فضول کام میں انہیں ادبی کاموں کا وقت نہیں ملتا۔ بڑی
مشکلوں سے تھوڑا وقت نکالنا پڑتا ہے"

اس گھر میں سب سے پہلی بار ادیبوں میں پروفیسر احتشام حسین
صاحب تشریف لائے۔ شاید یونیورسٹی کے کسی کام کے سلسلے میں
آئے تھے، میں نے صبح دس بجے کے قریب جب دریچے کا پردہ ذرا ہٹا کر
جھانک کے دیکھا تو وہ باہر برآمدے میں بڑے چپ چاپ سے اکیلے
بیٹھے ہوئے تھے۔ اونچی پیشانی، صاف کھلتا ہوا رنگ، سنجیدہ چہرہ،
اتنی دور ہی سے ان کی شخصیت بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ اختر
صاحب شاید اس وقت کلاس لینے چلے گئے تھے، احتشام صاحب
کو اس طرح سے اکیلا بیٹھا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ گھر سے
اتنی دور بیگانہ جگہ پر وہ بچارے کیسا عجیب سا محسوس کر رہے
ہوں گے؟ احتشام صاحب اسی روز شام کو واپس چلے گئے۔ شاید
انہیں پٹنہ کالج میں باہر کا وہ برآمدہ کبھی یاد بھی نہ آیا ہو۔ لیکن
میرے دل میں ان کی اس تنہائی اور اداسی کی کھٹک ہمیشہ تازہ
رہی ہے۔ دوسری بار ۱۹۵۲ء میں احتشام حسین صاحب
چھجو باغ سے ہمارے ہی تشریف لائے۔ ہلکی ہلکی سردیوں کے دن تھے،
جب اختر صاحب احتشام صاحب کو اپنے ساتھ یونیورسٹی اور
کالج لیتے چلے گئے تو میں آپ کا کمرہ خود سے ٹھیک کرنے گئی، آکر
جو دیکھا تو نوکروں نے ان کی ساری چیزیں قرینے سے رکھ دی
تھیں۔ مسہری پر اختر صاحب کا بستر ہٹا کر آپ کا بستر بھی بچھا دیا تھا،
بڑے ہلکے پھلکے سیدھے سادے سے سامان تھے، احتشام صاحب
کے بستر پر فالسئی رنگ کی ریشمی رضائی بڑے سلیقے سے نوکروں نے
کھول کر پھیلا دی تھی، میں اپنے دل میں بہت خوش ہوئی کہ رضائی
کھولنے تک کی تکلیف سے ملازموں نے ان کو بچا لیا تھا۔ میں نے
قریب آکر رضائی کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا، یہ کئی سالوں کی بنی ہوئی
اب پرانی ہو چکی تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوا کہ اوڑھنے والے نے
اسے صرف ضرورت اور آرام کی ایک چیز سمجھ کر ہی اب تک استعمال کیا
ہے۔ اور اس رضائی کو نفاست ستھرائی اور قرینے سے رکھنے کا

کبھی خیال بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اسی وقت مجھ کو اختر صاحب کا وہ لحاف یاد آ گیا جس کو میں نے بڑے شوق سے بنایا تھا مگر اختر صاحب نے اپنے تیل سے بھرے ہوئے سر سے لپیٹ لپیٹ کر اس کے ڈھنگے پن سے اس کو اوڑھا تھا کہ لحاف کا اتنا جلدی صاف کرانا مجھ پر عذاب بن گیا تھا۔ احتشام صاحب کی رضائی کو دیکھ کر مجھے ایک گونہ سکون آ گیا۔ اور میں نے سوچا کہ "چلو اس قبیلے کے آدمے کا آوا ہی بگڑا رہتا ہے" اور پھر میں نے اختر صاحب کا لحاف دھلوا کر سر کی طرف ایک کور دے دیا اور بچی ہو رہی۔ کون ان کے ان دیوانوں سے الجھے۔؟

احتشام صاحب اب بھی ہمارے غریب خانے پر آتے ہیں، اسی خلوص و محبت سے ٹھہرتے ہیں۔ کوئی تکلف نہیں۔ بھولے بھالے سے، مگر بڑے گمبھیر۔ سر سے پاؤں تک ایسا رعب چھایا ہوا کہ نگاہیں ان کے سامنے جھکی جھکی سی رہتی ہیں۔ میں نے احتشام صاحب کا سفرنامہ "ساحل اور سمندر" جب پڑھا تھا تو ان کے ایک ایک لفظ پر جھوم جھوم اٹھی تھی۔ ایک تو سفرنامے ویسے بھی مجھے اچھے لگتے ہیں کیونکہ میری فطرت میں خود ہی ایک سیاح کی روح ہر گھڑی بے چین سی رہتی ہے۔ لیکن احتشام صاحب کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ آپ اپنے مضامین اور کتابوں میں ہم سے زیادہ گھل مل کے اور زیادہ تفصیل سے باتیں کرتے ہیں۔ نہ جانے کیوں میں احتشام صاحب کی اپنائیت، سادگی اور پر خلوص باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کی شخصیت اور سنجیدگی سے بہت مرعوب ہو گئی ہوں، ویسے تو آپ جب بھی آئے بڑے گھریلو انداز میں ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں۔ فراق صاحب نے کبھی ہمارے گھر پر قیام نہیں کیا تھا۔ ایک بار وہ قمر الدین صاحب کے گھر تشریف لائے تھے۔ اختر صاحب کو خبر ملی اور وہ فراق کو چند گھنٹوں کے لئے اپنے گھر "گلاب باغ" میں لے آئے۔ میں ان دنوں بھی پٹنہ میں نہیں تھی۔ سنا کہ کھلی چھت پر مشاعرے کا بڑا اہتمام ہوا، احباب اور کالج کے طلباء نے فراق کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ایک اچھے خاصے مجمع میں یہ گھریلو مشاعرہ بڑا کامیاب رہا،

یہ جلسہ گھر پر اس وجہ سے ہوا تھا کہ اعلان کرنے کے بعد پرنسپل کے۔ پی سنہا نے فراق کو کمیونسٹ قرار دے کر کالج کے اندر جلسہ کرنے سے روک دیا تھا۔ مجبوراً گھر کی چھت پر چار انجمنوں کی طرف سے یہ جلسہ کیا گیا، جن کے نام یہ ہیں۔ بزم ادب پٹنہ کالج، حلقۂ ادب پٹنہ، بزم اردو بی۔ این کالج، اور ترقی پسند مصنفین، اس پر ایک لطیفہ یہ ہوا کہ تعارف اور تقریب جلسہ کی تشریح کرتے ہوئے اختر صاحب نے کہا کہ۔

"ایک دفعہ عرب کے چار بڑے قبیلوں میں یہ جھگڑا ہو رہا تھا کہ سنگ اسود کو کعبے کی دیوار میں اٹھا کر کون لگائے۔؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک پر سنگ اسود کو رکھا، اور ان چار بڑے قبیلوں کے نمائندوں کو کہا کہ چادر کا ایک ایک کونا آپ پکڑ کر اٹھائیں" اور اس طرح یکجہتی کے ساتھ سنگ اسود اپنے مقام پر لگایا گیا۔ "آج چار بڑی انجمنوں کی طرف سے کعبۂ اردو میں سنگ اسود کی طرح سے فراق صاحب لائے گئے ہیں"۔ فراق مسکراتے ہوئے بولے

"ہاں بھئی۔ میں بھی تو ایک سنگ اسود ہی ہوں"

اس سے پہلے پرویز شاہدی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، اور کالج کی بجائے تھیوسوفیکل ہال میں جلسہ کرنا پڑا تھا۔ پرویز شاہدی چونکہ خود ہی عظیم آبادی ہیں اس وجہ سے ٹھہرنے کی بات تو کبھی نہ ہوئی ہاں وہ جب بھی کلکتہ سے بزم ادب یا ادبی جلسوں کی شرکت میں بلائے گئے تو بڑے خلوص سے ہمارے گھر ملنے کو آتے رہے ہیں۔

جوش ملیح آبادی ویسے تو کئی بار پٹنہ تشریف لائے ہیں، مگر آپ بزم ادب میں کبھی نہ آئے، اختر صاحب نے اقبال ہوسٹل (جو ان دنوں مسلم ہوسٹل کہا جاتا تھا) کے یونین میں انہیں بلایا، جوش صاحب آئے اور آپ نے لڑکوں اور احباب کو اپنی چیزیں سنائیں۔ جوش صاحب حلقۂ ادب اور دوسری انجمنوں کی شرکت کے لئے بھی پٹنہ تشریف لاتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں وہ مجاز کے ساتھ نیشنل وار فرنٹ کی طرف سے مشاعرے میں بلائے گئے تھے۔

روش صدیقی بھی بزم ادب کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے

ہیں۔ روشن صاحب بھی اختر صاحب کے حلقۂ احباب میں ہیں آپ جب بھی تشریف لائے تو ڈاکٹر حسن صاحب کے گھر پر قیام کیا۔ ان شاعروں اور ادیبوں سے طلباء کا ہمیشہ گہرا تعلق قائم رہا ہے۔

۱۹۵۰ء میں نکلتے جاڑوں کے دن تھے، ہم لوگ گلاب باغ کی بالائی منزل پر رہتے تھے۔ کسی نے زینہ پر اختر صاحب کو پکارا۔ اختر صاحب گئے مگر آنے والے کو پہچان نہ سکے، رات کا وقت تھا اور یہ آواز کبھی ان کے گوش گذار نہ ہوئی تھی، کمرے کے اندر روشنی میں اپنے مہمان کو لے کر آئے جو بہت دبلا پتلا تھا، گرم کوٹ اور مفلر میں لپٹا ہوا ہاتھ میں ایک بیگ لئے نظر آیا۔

اختر صاحب نے مجھ کو پکار کر کہا ۔ "بھئی شکیلہ ۔ اوپندر ناتھ اشک جی تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کچھ ناشتے کے ساتھ چائے بھیج دی، اندر کمرے سے دونوں کے ہنسنے اور بولنے کی صاف آواز آ رہی تھی اور میں حسرت سے دور کا جلوہ بھی نہ دیکھ سکی۔

وہ ان دنوں الٰہ آباد آ گئے تھے اور ہندی میں خوب خوب لکھ رہے تھے، اپنی ہندی کی کتابوں کی نکاسی کے سلسلے میں پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ اشک جی کی بیگم کوشلیا اشک بھی ساتھ ہی آئی تھیں مگر افسوس کہ میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اشک جی جب تک بیٹھے رہے اپنی مسلسل خراب صحت اور اپنی رفیق زندگی کی غم گساری اور کارسازی کی باتیں کرتے رہے، پھر انہوں نے کہا کہ میں نے تقسیم سے بہت پہلے لاہور ہی میں بیدی اور کرشن چندر وغیرہ سے کہہ دیا تھا کہ بھئی ہمیں ہندی میں لکھنا چاہئے کیونکہ ہندی کا دائرہ بڑا ہے اور اب یہ بات سچ ہی نکلی۔ جب ہم پنجابیوں نے پنجابی چھوڑ کر اردو میں لکھا تو پھر اور زیادہ پھیل کر ہندی میں کیوں نہ لکھیں۔" کافی رات گئے اشک جی کھانا کھا کر واپس گئے۔

مئی ۱۹۵۱ء میں یہاں مشہور اردو کانفرنس ہوئی جس میں ریاستی انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔ محترمی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس جلسے کی صدارت کی تھی، بہار کے لئے یہ کانفرنس ایک یادگار ہو جس میں شرکت کے لئے پنڈت کیفی، عرش ملسیانی، مجاز، جذبی، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر شاہدی، جگن ناتھ آزاد، خواجہ احمد فاروقی، آنند نرائن ملا، اور سلام مچھلی شہری تشریف لائے تھے۔ بہن صالحہ عابد حسین اور حمیدہ سلطان صاحبہ نے ہماری مجلس کو رونق بخشی تھی۔ ان لوگوں میں سے اکثر کا قیام پرنس ڈی ہوٹل پٹنہ میں ہوا تھا۔

گلاب باغ کے خوبصورت مکان کے ایک حصے میں پانی کی انتہائی کمی، اور دھوپ کی تپش کی تکلیفیں اٹھا کر ہم لوگ بڑی مشکلوں سے ججو باغ کے نئے بنے ہوئے انیسرس کوارٹر میں چلے گئے۔ مکان کافی کھلا ہوا روشن اور آرام دہ تھا، پانچ کمرے تھے سب ہی کمروں میں سیلنگ فین لگے ہوئے تھے۔ واش بیسن، فلش سسٹم، اور بڑا سا احاطہ ۔ سبھی کچھ تھا ۔ مگر سامنے ہریجن کولونی جھونپڑیوں میں بسی ہوئی تھی ۔ اور محلے کی ساری گندگی اسی جگہ سے موڑ دی جاتی تھی ۔ سرکار نے اپنے افسروں کے لئے ایسی جگہ مکان کیوں بنوائے تھے سمجھ میں نہ آتا تھا، پھر خبر ملی کہ یہ گندگیاں یہاں سے جلد ہٹائی جانے والی ہیں ۔ مگر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوتا ہوا نظر نہ آتا ۔ اب جبکہ میں وہ کوارٹر چھوڑ چکی ہوں، بڑی ہی درخواست اور شور مچانے پر سامنے ایک دیوار کھینچ دی گئی ہے۔ مگر راہ چلنے والے اب بھی وہاں پر سے گزرتے ہوئے اپنی سانس روک لیتے ہیں یا ناکوں پر رومال رکھ لیتے ہیں ۔

عرش ملسیانی صاحب پٹنہ کئی بار تشریف لائے ہیں ایک دفعہ دن بھر کے لئے غریب خانے پر ٹھہرے ۔ بزم ادب کے جلسے میں آئے ہوئے تھے، طلباء نے اسٹیشن جا کر بڑے اہتمام سے انہیں میرے گھر لایا تھا، گول بھرا بھرا چہرہ ۔ بھاری جسم، صاف صندلی رنگ، درمیانہ قد، آپ صبح کی گاڑی سے آئے تھے، ناشتہ جو بھیجا تو ایک مصیبت میں پھنس گئی ۔ معلوم ہوا آپ شوگر کے مریض ہیں اور ان دنوں بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا ہے۔ ناشتے پر جتنی چیزیں گئی تھیں آپ نے کچھ بھی نہ لیا، انڈے، ٹوس، مکھن، میوؤں اور پھلوں سے

بھی پرہیز تھا۔ یا اللہ۔ اب دنیا میں کون سی چیز کھانے کو باقی بچی تھی؟۔ جلدی سے ہرا چنا منگایا، اور دو تین قسم کے ایسے ہی بگھار سے پھل آئے، اور بیچارے عرش ملسیانی اُبلی ہوئی ہری ترکاریاں کھا کر رات کو واپس چلے گئے۔ اب بھی جب آپ کا تذکرہ آتا ہے تو میں آپ ہی آپ سوچنے لگ جاتی ہوں کہ عرش صاحب کے کھانے میں ان دنوں کیا ہوتا ہوگا؟۔

فطرت نے شاید اپنی آزمائش کے لئے ہمیں بیجو باغ کے ۵ نمبر کوارٹر میں بھیج دیا تھا، جہاں ہم نے بڑی قیامت کی گھڑیاں کاٹ کاٹ کر سات سال گذارے تھے۔ سارے دروازوں اور دریچوں کو بند رکھتے ہوئے ہم لوگوں نے یہ وقت کاٹے تھے۔ اس گھر کے احاطے میں ہمارے پھول بھی کھلتے تھے، پیارے پیارے بچوں کی ٹولیاں کھیلتی ہوئی بھی نظر آتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اسی ہرکین کالونی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر اور جبیش بابو منسٹر کی جھلکی ہوئی کاریں بھی ان کے گھر والوں اور میری دوستوں اور ملنے والیوں کو لے کر آجاتی تھیں۔ جس وقت بچھوا ہوا کے ساتھ مدینہ کا بھبھوکا جھکڑ گھر کے کونے کونے میں سما جاتا تھا تو میں اپنے جہازوں کے گئے ترنم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہ تھا، یہ سرکاری مکان افسروں کے لئے ابھی نیا نیا بنا تھا اور اس کوارٹر کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا تھا۔ بیجو باغ کے اسی ۵ نمبر کوارٹر میں سب سے پہلے مہمان ہمارے محترم پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب تھے، سروری صاحب ویسے تو پٹنہ میں تین بار تشریف لائے لیکن سب سے پہلی دفعہ وہ ہمارے یہاں چند روز ٹھہرے تھے۔ آپ اورینٹل کانفرنس کی شرکت کے بعد دلی اور لکھنؤ ہوتے ہوئے عظیم آباد پہونچے تھے علم کا شوق یہاں لے آیا تھا، آپ فن کاروں، ناقدوں اور محققوں سے ملے اور یہاں کے کتب خانوں کا جائزہ لیا، عثمانیہ یونیورسٹی کے استاد شعبۂ فارسی کے پروفیسر حسینی صاحب بھی آپ کے ساتھ تھے۔

سروری صاحب بہت نیک طبیعت اور سادہ مزاج کے بزرگ ہیں۔ درمیانہ قد سانولا رنگ، بڑی بڑی غور و فکر کرنے والی آنکھیں، کم گفتار، مگر خاص اور ضروری باتوں پر اچھی طرح وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔

سروری صاحب کی وجہ سے ہمارے گھر میں چند دنوں تک بڑی رونق رہی تھی، علمی چرچے اور مذاکرے ہوتے رہے، ادبی گفتگو کے علاوہ آپ بار بار یہ کہتے تھے کہ بہاریوں کا مزاج اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ حیدرآبادیوں سے ملتا جلتا ہے۔ پروفیسر سید حسن عسکری اور اختر صاحب کے ذریعہ وہ پھلواری شریف کے مرثیوں کے چند قدیم قلمی نسخے ساتھ لیتے گئے تھے جنہیں آپنے بڑی ذمہ داری کے ساتھ پھر جلد ہی واپس کر دیا تھا۔ بڑے مخلص بزرگ ہیں انہوں نے ہمیں یاد رکھا اور آج تک ہمارے دلوں میں آپکی یاد اپنے بزرگوں کی طرح تازہ ہے،

دکن نے شمال کی طرف ہمیشہ تحفے بھیجے ہیں اور شمال سے بھی دکن تحفے جاتے رہے ہیں۔ خود اردو ادب کو دکنیوں نے پروان چڑھا کر تحفۂ شمالی ہند میں بھیجا، انہی قیمتی تحفوں میں ڈاکٹر محی الدین زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری صاحبان بھی ہیں۔ زور صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے بڑی تکلیف ہو رہی ہے، بہت خوش گفتار کشادہ دل، اور بڑے ملنسار بزرگ تھے، وہ ڈاکٹر حسنین کے "وائی وا" امتحان کے لئے غالباً ۱۹۵۶ء میں پٹنہ تشریف لائے تھے، زور صاحب جس گاڑی سے آنے والے تھے کسی وجہ سے وہ اس وقت نہ آسکے، رات تک آپ کا بڑا شدید انتظار رہا کیونکہ اور دوسرے ممتحن آچکے تھے، صبح سویرے ہی اختر صاحب کالج چلے گئے۔ میں گھر میں تھی کہ اچانک باہر سے زور زور کی تالیاں بجانے کی آواز آنے لگی، میں نے سمجھا کہ اختر صاحب کے ننہیالی رشتہ داروں میں سے کوئی آیا ہے کیونکہ تالیاں بجا کر دستک دینے کا انداز انہی لوگوں کی طرح تھا۔ میں نے دریچے کے پاس آکر دیکھا۔ اختر صاحب کے رشتہ داروں میں سے کوئی نہ تھا، باہر ایک صاحب کھڑے تھے،

جن کی پیشانی بہت اونچی تھی اور بال گردن تک لٹک رہے تھے، معلوم ہوا کہ زور صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں نے رات بھر کے پریشانی کا اظہار کیا جو آپ کے تشریف نہ لانے کی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔ کہنے لگے "میں دوسری گاڑی سے رات ہی آگیا تھا، رکشے والے سے پوچھا کہ یہاں ٹھہرنے کے لئے کوئی ہوٹل ووٹل ہے؟ پھر اسی بیچارے نے مجھے ایک ہوٹل میں پہنچادیا۔ کیا کہتے ہیں اس کو۔ بیلانی ویلانی قسم کا ہوٹل ہے" ــ پھر آپ کا سارا سامان اس بیلانی ہوٹل سے منگایا گیا ــ اور آپ نے میرے ہی گھر قیام کیا ــ

اردو ادب کے محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ہم سب لوگ زور صاحب سے واقف تھے، مگر ایک شگفتہ مزاج اور دلچسپ شخصیت کی حیثیت سے آپ کا تعارف اس وقت ہوا جب آپ پٹنہ تشریف لائے، آپ کے سر کے بال زلف نما تھے، بہت بلند پیشانی صاف صندلی رنگ، بڑی بڑی روشن ذہین آنکھیں مضبوط جسم اوسط سے نکلتا ہوا قد، لباس میں ہندوستانی، بڑی وضع داری، پان کا اتنا شوق کہ پاندان ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ آپ یہاں کے اہل ادب حضرات سے دل کھول کر ملے اور یہاں کے مشہور کتب خانوں کا گہرا مطالعہ کیا، جب بھی یہاں اہل ادب آئے اور چلے گئے تو دونوں کے بعد تکلیف دہ سناٹا بہت کھلا ہے۔ زور صاحب اپنی بیگم کا تذکرہ بہت کرتے تھے، آپ نے ہمیں اپنی بیگم صاحبہ کی نظموں کا مجموعہ بھی بھجوایا تھا۔

اس ہریجن ٹولی کے مکان میں اختر صاحب نے کس کس بلند پایہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو نہ ٹھہرایا تھا۔ جب بھی مجھے مہمانوں کے آنے کی خبر ملی تو اچانک طور پر ــ اس طرح سے کہ بس انہیں اسٹیشن سے اس گھر میں لایا جارہا ہے۔ اللہ! کیسی کیسی قیامتیں مجھ پر ٹوٹتی رہی ہیں ــ ایسا گھر ــ ایسی گندگی ــ ڈوم اور مہتروں کا سامنے پرسوز ہنگامہ "لڑائی، اٹھا پٹک، اژدہام وغیرہ" ــ اور معزز مہمان اسی گھر میں ٹھہرائے جارہے ہیں ــ میرا تو مارے غم کے جیسے دل ڈوب جاتا، یہ باہر سے آنے والے مہمان ہمارے بہار ــ کا کیسا نقشہ لے کر یہاں سے جائیں گے۔ جب بھی "پٹنہ" کا نام آئے گا ان کی نگاہوں میں اس ہریجن ٹولی کا سارا منظر پھر جائے گا ــ اگر موقعہ ملتا تو کبھی اختر صاحب سے جنگ ہو جاتی اور کبھی لڑ کر جی کا بوجھ اس نکالنے کا وقت بھی نہ ملتا تھا ــ

اسی طرح سے باہر کی ہماہمی دیکھکر مجھ کو معلوم ہوا کہ ابھی ۵ بجے کی گاڑی سے جگر مرادآبادی آرہے ہیں اور اسی گھر میں ٹھہرائے جائیں گے۔ میں دھک سے رہ گئی۔ جگر صاحب آئے اور ان کے ساتھ ایک رونق سی چلی آئی۔ حلقۂ ادب کا سالانہ جلسہ تھا، رات کو انجمن اسلامیہ میں مشاعرہ ہو رہا تھا، سارے شہر میں اس ہونے والے مشاعرہ کی ایک دھوم مچی ہوئی تھی۔ لیکن جس گھر میں جگر ایسا شاعر اور مشاعرے کا روح رواں ٹھہرا ہوا تھا اس گھر میں میرا موڈ ایسا آف تھا کہ میں نے مشاعرہ تک میں نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ کہ اچانک میرا ایک ملازم ایک کپڑے میں لپٹا ہوا برتن میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا، "مہمان صاحب نے اس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور اس بٹے میں بھر کے پان مانگ رہے ہیں"۔

میں حیران سی نوکر کو دیکھتی رہی ــ ندامت سے میرا سر جھک گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے اس گھر میں جگر نہیں ــ میرے اپنے کوئی عزیز بزرگ آگئے ہیں۔ جنہوں نے اتنے پیار سے اپنی بچی سمجھی ہماری بالکل گھریلو انداز میں میرے پاس بھیج دی ہو اور پان کے ڈبے میں مجھ سے پان لگوا کر مانگ رہے ہیں۔ جگر کی اس سادگی اور خلوص نے میری ساری شرمندگی اور خفگیوں کو پل بھر میں دور کر دیا تھا ــ جب سارے لوگ مشاعرے میں چلے گئے، تب بلا ارادہ میں بھی مشاعرے میں چلی گئی۔ اور جب انجمن اسلامیہ کے بھرے ہوئے ہال میں جگر مرادآبادی کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہوئے دیکھا تو میرا دل تھوڑی دیر کے لئے خوشیوں سے بھر گیا کہ آج یہ اتنا بڑا شاعر ہمارا مہمان ہے۔ مگر اپنے مکان اور اس کے گرد و پیش کو یاد کر کے فوراً ہی میرا جی بیٹھ گیا ــ اللہ۔ اور جو کہیں پچھوا ہوا چل گئی تو پھر ــ پھر میں کیا کروں گی ــ ؟

مشاعرے کی رات بڑی یادگار تھی۔ جگر مشاعرے سے جب واپس آئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ان کے ساتھ بہن سلطانہ حیات اللہ اور عزیزہ نقی امام بھی آگئی تھیں۔ جگر کے چہرے پر مشاعرے کی شادابی کا رنگ ابھی تک جھلک رہا تھا، اسی تابانی کو دیکھکر سبھوں نے اصرار کیا اور میکے ڈرائنگ روم میں ایک چھوٹی سی مجلس جم گئی۔ جگر نے پہلے اختر صاحب کی دو ایک چیزیں سنیں، پھر اپنی غزلیں سنانے لگے۔ ایک خود فراموشی کی کیفیت میں وہ اپنی رباعیاں غزلیں اور نظمیں سناتے چلے گئے اور ہم سحر زدہ سے، سنتے رہے اور ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھتے رہے۔ سیاہ چہرہ۔ چمکتی ہوئی روشن آنکھیں۔ جن میں مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔ بولتے، ہنستے، مسکراتے ہوئے پان سے رنگین لب۔ ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی۔ چھریرا جسم جو کبھی آگے اور کبھی پیچھے جھوم رہا تھا ــــ اور ٹوپی کے نیچے سے گردن تک لوٹتے ہوئے سیدھے سے بال۔ سلطانہ بہن ــ جگر کے ہر ایک شعر پر داد دیتی ہوئی لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں ــــ نجانے رات کتنی گذر چکی تھی، کہ اچانک عزیزہ کو خیال آیا کہ سلطانہ بہن جو ان کے گھر مہمان ٹھہری ہوئی تھیں کھانا کھائے بغیر مشاعرہ میں چلی گئی تھیں ــــ ان کو کچھ کھلا دینا چاہئے۔ جگر لہک لہک کر غزلیں سنا رہے تھے ــ عزیزہ چپکے سے اٹھیں، مجھکو اشارے سے بلایا ــ پوچھا کچھ کھانے کیلئے ہے؟ پھر ہم دونوں نے مل کر نعمت خانے میں جھانکا ــ تھوڑے سے شامی کباب۔ ڈبل روٹی کے چند سلائس اور تھوڑی اسی قسم کی اور چیزیں مل گئی تھیں ــ مگر سارے ملازم نجانے کہاں کہاں چھپ کر سو گئے تھے اور چولھا ٹھنڈا پڑا تھا ــــ ہم دونوں نے ملکر جلدی جلدی کا غذ جلا کر انڈے تلے، اور چائے کا پانی تیار کیا۔ باورچی خانے تک جگر کی آواز تو نہیں آرہی تھی مگر سلطانہ بہن کی واہ واہ ــ برابر سنائی دے رہی تھی ــ دل بے اختیار جگر کے ترنم کی طرف کھنچا جا رہا تھا اور ہم تھے کہ جلدی جلدی کاغذ جلائے جا رہے تھے ــ آخر خدا خدا کر کے پانی کھولا۔ اور جیسے تیسے دودھ گرم کر کے چائے بنی ــ سلطانہ بہن نے کچھ کھایا اور جگر کے ساتھ ہم سبھی لوگوں نے گرما گرم چائے پی جو ہم لوگوں نے اتنی جتن سے بنائی تھی ــ

جگر تین دنوں تک ٹھہرے گھر اور باہر بڑی رونق تھی ــ جب بھی وہ اپنا مرادآبادی پاندان کھول کر اپنے ہاتھوں سے پان بناتے تو سارے لوگ ان کے ہاتھوں کا بنا ہوا پان ضرور کھاتے ــ جگر کبھی اکیلے پان کھانے کے عادی نہیں تھے ــ

میں بچپن سے جگر کی غزلیں گنگناتی رہی تھی ــ اور ان کے کسی کسی شعر پر تو دل جھوم جھوم اٹھتا تھا ــ

"وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی ہے صورت وہی سراپا، وہی قیامت ہے قد بالا
نگہہ کی جنبش، لبوں کی لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں"

آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی جگر ہیں ــ حسین و رنگین، اور لطیف لفظوں میں محبت کا اتنا پیارا احساس جگا دینے والا شاعر ــــ پڑھنے والوں کے تخیل میں خود کتنا حسین نظر آتا ہے ــ مگر یہ سچ تھا کہ جگر مرادآبادی آئے تھے اور ہم لوگوں کے درمیان رہے تھے ــــ

وہ نمبر کے گرد و پیش رہی تھے ــ سڑک پر ہنگامے کچھ اور بڑھ گئے تھے، انگریزوں کے گھرانوں میں تنخواہ پانے کی خوشی میں بڑی گہما گہمی رہتی تھی ــ شروع مہینے میں لڑائی، جھگڑا، گالی گلوج ــ اور مار پیٹ اتنی بڑھ جاتی کہ پولیس تک کے آنے کی نوبت پہنچ جاتی ــ پھر بڑی بے دردی سے سوّروں کو مارا جاتا تھا، مرتے ہوئے سوّر گھنٹوں بڑی تکلیف کے ساتھ چیختے رہتے اور پھر ان چیختے ہوئے سوّروں کو آگ میں ڈال دیا جاتا ــــ تاکہ ان کے سارے بال جھلس جائیں، اس جھلسی ہوئی بدبو کی چراند ــ سوّروں کی چیخیں اور ان کی مدھم ہوتی ہوئی سسکیاں دل و

دماغ کو ایسا لرزا دیتی تھیں کہ بس یہی جی چاہتا کہ یہاں سے کہیں بھاگ جائیں۔

ایسے ہی دنوں میں اختر صاحب نے آکر بتایا کہ بزم ادب کے سالانہ جلسے میں نواب جعفر علی خاں اثرؔ تشریف لا رہے ہیں، پٹنہ میں کوئی اچھا ہوٹل بھی نہیں ہے جہاں ان کو ٹھہرایا جا سکے۔ میں چپ سنتی رہی، مگر دل دھڑکتا رہا کہ خدایا ـــــ کہیں اختر صاحب کو پٹنہ کے سارے ہوٹلوں سے بہتر اپنا گھر ہی نظر نہ آئے۔ میں نے ان کو آہستگی سے بتایا کہ یہاں کا بُرا سے بُرا ہوٹل بھی اس گندی جگہ سے یقینی بہتر رہے گا۔ وہ چپ رہے پھر مجھے بتایا کہ وہ نواب خاندان سے ہیں اور کشمیر میں فائننس منسٹر بھی رہ چکے ہیں "تب تو آپ کو اور بھی اپنی اچھی جگہ ٹھہرانا چاہیے"۔ میں نے اچھے اچھے ہوٹلوں کے نام گنائے۔ مگر اختر صاحب نے بڑی حسرت سے کہا کہ "بزم کے پاس اتنے پیسے کہاں"۔ اس جواب سے میرا جی جل گیا ـــ "جب بزم کے پاس پیسے ہی نہیں تو پھر بزم والوں کو اتنی لمبی لمبی باتیں کیوں سوجھتی ہیں"۔

اور جب بالکل اچانک طور پر نواب جعفر علی خان اثرؔ، اسی ہریجن کوٹھی کے سامنے والے سفید گیٹ پر اتارے گئے تو میں نے غم کے مارے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان دنوں میرے گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی ـــ اور یہ سے ایک بیمار رشتہ دار اپنے پورے خاندان کے ساتھ آئی ہوئی تھیں ـــ جو ملازمہ ان کے ساتھ آئی تھی اس کی بچی اسقدر چیخ چیخ کر رو یا کرتی تھی کہ بس اللہ کی پناہ ـــــ میری آنکھوں میں اپنی بے بسی پر آنسو آ گئے؛ اور میری نگاہوں میں اپنی سجی سجائی "بام ولا" کی کوٹھی گھوم گئی ـ کاش یہ اتنے اونچے اونچے مہمان اس گھر کی زینت بنتے" تو میرا دل کتنا خوش ہوتا ـ مگر یہ اپنی قسمت ہی تھی کہ ہمارے گھر ایسی ایسی شخصیتیں آئیں بھی تو کہاں ـ ایسی گندی کوٹھی میں، جس جگہ خوش ہونے کی بجائے میرا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔

پتہ نہیں کہ ان بیچارے مہمان ادیبوں اور شاعروں پر کیا گذرتی رہی تھی ـــ لیکن خدا گواہ ہے کہ ان دنوں میں سولی پر لٹکی رہی تھی ـــ مہتروں کے بچھو کردوں کو نہ جانے ٹوٹا ہوا ٹین کا بکس کہاں سے ہاتھ آ گیا تھا جس میں باری باری وہ بیٹھتے اور دوسرا بکس میں بندھی ہوئی رسی کھینچتا جاتا ـــ اور اس ٹین کے بکس کی رگڑ کھاتی ہوئی جو آواز نکلتی وہ کسی صورِ اسرافیل سے کم نہ تھی ـــ جعفر علی خاں صاحب جب تک گھر کے اندر رہتے میں ان گاڑی کھینچنے والے بچھو کردوں کو پیسے دے دے کر چپ کراتی ـ ملازمہ کی بچی جہاں رونے کو منہ پھاڑتی اس کے منہ میں مٹھائی ٹھونس ٹھونس کر اس کو بہلاتی ـ گھر کے اندر اور گھر کے باہر کنٹرول کرنا ایک قیامت سے کم نہ تھا ـ باہر احاطے میں رنگا رنگ ڈہلیا کے پھول کھلے تھے، پنک اور بنیری لہک رہی تھی ـ مگر پچھواڑے کا دھڑکا ایسا لگا رہتا تھا جو کبھی چین نہ لینے دیتا ـــ اور اس پر سے جو اگر سوّر بھی بھُنا جانے لگے تب؟ ـــــ تب کیا ہوگا؟

گھر کے اندر رشتہ دار مہمانوں کا ہجوم تقریباً ہمیشہ ہی رہا باہر کی طرف کے ایک کمرے کو کسی طرح سے ایک معمولی سا ڈرائنگ روم بنا دیا گیا تھا کرسیوں کے ساتھ ایک نیچی سی چوکی بچھا کر اسے دیوان بنانے کی کوشش کی گئی تھی، دن کے وقت، رات کی اوڑھی ہوئی رضائیاں اسی دیوان والی چوکی پر قرینے سے بچھا کر جوڑے بڑے کور سے ڈھانپ دی جاتی تھیں، اور رات کو سونے کے وقت رضائیاں نکل آتیں اور چوکی پر صرف بڈ کور پڑا رہ جاتا تھا ـــ اتفاق کی بات تھی کہ جعفر علی خاں صاحب پہلے پہل جو عشا کی نماز پڑھنے اس چوکی پر گئے تو صرف بڈ کور بچھا ہوا تھا رضائیاں نکل چکی تھیں ـــ دوسرے دن جب وہ اسی چوکی پر ظہر یا عصر کی نماز پڑھنے لگے تو رضائیوں کا گدا انہیں بڑا اچھا لگا، حساس اور شاعر تھے، اختر صاحب کو بلا کر کہنے لگے ـ

"بیٹے ماشاء اللہ ـ عزیزہ بڑی ذہین ہیں ـــ بڑی طبیعت خوش ہوئی، دیکھو کل جب میں نے رات اسی تخت پر نماز پڑھی تو اس پر گدا نہ تھا، مگر آج عزیزہ دلہن سلمہا نے میرے بوڑھے گھٹنے کا خیال کر کے اس پر اتنا اچھا گدا بچھا دیا ہے" اختر صاحب نے جب ہنستے ہنستے مجھ سے یہ بات آکر کہی تو میں کٹ کر رہ گئی کہ بیچارے نواب صاحب کو رات کتنی تکلیف پہنچی ہوگی ـــــ اس کے بعد جب تک نواب صاحب یہاں ٹھہرے ان کی عشا کی نماز کے بعد ہی سونے والوں کو رضائیاں

ملتی تھیں۔ بچارے بچے سردی کے مارے جھانک جھانک کر دیکھتے رہتے کہ "مہمان نماز پڑھ رہے ہیں کہ نہیں" ——

باہر احاطے میں بکتے بچھڑوں کو دیکھکر جعفر علی خاں صاحب بڑے خوش ہوتے، مگر جس دن وہ یہاں سے واپس جا رہے تھے تو اپنی بچھڑیوں کے درمیان اچانک گھبرا کر وہ یک بیک بول اٹھے۔

"یہ تعفن؟ —— بیٹے یہ بدبو کہاں سے چلی آرہی ہے؟

بھیڑیوں کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی —— ہائے چلتے چلاتے آخر بھپا ہوا اچل ہی پڑی تھی ——

اس گھر میں اتنے معزز مہمانوں کی آمد سے میں ہمیشہ گھبرایا کرتی تھی۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تھا اپنے گھر میں میزبانوں کو فرش راہ بنتے اور مہمانوں کی تواضع میں آسمان کے ستارے بھی توڑلاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی، ہمارے گھر میں جب بھی مہمان آنے والے ہوتے تھے تو بہت پہلے سے گھی کے کنستر، میدے اور چینی کی بوریاں منگائی جاتیں، قسم قسم کے میوے صاف کر کے رکھے جاتے، اور طرح طرح کے حلوؤں کی قابیں نعمت خانے میں طبق سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اماں جان بڑی مصروف مصروف سی لگتیں، اور اباجان اپنے عملوں کے ذریعے بہت پہلے سے مرغیاں، بٹیر، چاہے، مرغابیاں اور سون کی رہیو مچھلیوں کی فراہمی کے انتظام کراتے تھے۔ جگہ جگہ چاندنی تبدیل کی جاتی گاؤتکیوں پر غلاف بدلا جاتا، احاطے کے پتے پتے چھنے جاتے، کہیں برابر سے گھاس کاٹی جاتی، کہیں روشوں کو گیرو کے لال رنگ اور چونے کی سفید ی سے اجاگر کیا جاتا، مختلف رنگوں سے گملے رنگے جاتے یہاں تک کہ نہر سے نالہ کاٹ کر گھر کے تالاب کو پانی سے لبالب بھر دیا جاتا تھا۔ اس طرح سے گھر کے اندر اور باہر کئی دنوں پہلے سے مہمانوں کے آنے کی رونق اور ہما ہمی کسی شادی اور عید کی طرح چھائی رہتی تھی۔ مگر شہر کے اس گھر میں آکر میں حیرت زدہ سی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی کہ ہندوستان کے اتنے معزز، اتنے مشہور اور اتنے بلند پایہ لوگ ایسے ہی اچانک طور پر ہر یخنی کوٹھی کے سامنے والے ایک معمولی سے گیٹ پر بڑے

احترام کے ساتھ اتار دیئے جاتے تھے، اختر صاحب کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑتا تھا اور میں شرم سے کٹی کٹی سی نظر آتی تھی۔

غالباً ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں آل احمد سرور صاحب میرے گھر مہمان ٹھہرے، اور حسب معمول میرا جی افسردہ ہو گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اختر صاحب سے لڑی بھی اور بچارے مہمان کی قسمت پر افسوس بھی کیا۔

سرور صاحب کو میں قریب سے نہ دیکھ سکی تھی، گھر کے اندر اور باہر آتے جاتے کبھی کبھی ان کی ایک آدھ جھلک نظر آجاتی تھی۔ اور ان ساری جھلکیوں کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ سرور صاحب کا اچھا چھریرا جسم، درمیانہ قد، مسکراتا چہرہ، سفید رنگ، پان کھائے ہوئے لب ہیں، اور تیز تیز چلنے کے عادی۔ اختر صاحب کی اونچی آواز اور بلند قہقہوں میں میں نے کبھی سرور صاحب کی اونچی آواز نہ سنی۔ ان کا کوئی ہلکا ہوا قہقہہ مجھے کبھی سنائی نہ دیا۔

جب پہلی بار سرور آئے تھے اور اختر صاحب کے ساتھ کالج اور یونیورسٹی چلے گئے تو میں نے بڑے اطمینان سے جا کر اختر صاحب کے کمرے کا جائزہ لیا جہاں سرور صاحب کو ٹھہرایا گیا تھا۔ بہت ہی سادہ سامان تھا، ایک بستر، شیونگ کا ایک بڑا پرانا سٹ، یو۔ پی کے دو تین اردو، انگریزی اخبار، ایک چھوٹا سا بیگ اور ایک معمولی سا لوہے کا اٹیچی نا بکس جس کا رنگ پرانا ہو کر جگہ جگہ سے اڑچکا تھا" یہ تھی سادگی، ایک بڑے مشہور شاعر نقاد اور پروفیسر کی" "اختر صاحب بچارے کے لوہے کے بکس کو اب تک ہم لوگ خواہ مخواہ ہی بساطی کا بکس کہتے رہے تھے" میں نے اس اکیلے کمرے میں چپکے سے اپنی ہار مانتے ہوئے سوچا۔

اختر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بڑے لوگوں کو اپنی چیزوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہیں بلندیوں اور گہرائیوں پر ہوتی ہیں —— ان چھوٹی چھوٹی سطحی باتوں کو نہیں دیکھتیں"۔ تو شاید یہی بلند نظری تھی۔ جب ہی تو اختر صاحب کافی اونچی

اڑان پر رہتے ہیں، قمیض کے کوراور کف پر کبھی کبھی چکٹ بھی جم جاتی ہے۔ اور بعضوں بغیر پالش کے جوتے پیاسے پڑے رہتے ہیں، جب دیکھو الٹا سوئٹر پہنے چلے آرہے ہیں۔ اور موزہ تو کبھی آج تک اختر صاحب نے سیدھا پہنا ہی نہیں — یہ بستیوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں ان کی طرف دھیان دینے کی بیچارے کو فرصت ہی کہاں تھی؟

سرور صاحب کئی بار آتے رہے ہیں مگر جب بھی آئے بڑے مشغول سے رہے۔ کبھی بزم نے اپنے سالانہ جلسوں میں بلایا، کبھی "داتی دا" کا قصہ ہوتا اور کبھی بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں تشریف لاتے۔

ہمارے پچھو باغ کے کوارٹر میں ایک دفعہ سرور صاحب آنے والے تھے۔ ان دنوں ہریجن کولونی میں شروع مہینے کی رونق چھائی ہوئی تھی، میں نے اختر صاحب کو بڑی مشکلوں سے راضی کیا کہ خدا کیلئے سرور صاحب کو اپنی محبت کا شکار نہ بنائیے اور کسی اچھی جگہ ٹھہرائیے" اختر صاحب کچھ موم ہوتے نظر آئے مگر اب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے۔ صبح سویرے ہی انہوں نے کچھ لڑکوں کو سرور صاحب کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن بھیجا مگر لڑکے وقت پر اسٹیشن نہ پہونچ سکے اور سرور صاحب پچھو باغ کی راہ بھول کر اختر صاحب کو ڈھونڈتے ہوئے پٹنہ کالج کیمپس میں جا نکلے، کسی نے انہیں کلیم الدین احمد صاحب کی کوٹھی پر پہونچا دیا۔ ان دنوں کلیم الدین احمد صاحب پرنسپل تھے اور کالج کیمپس ہی میں بڑی شاندار لب گنگا کوٹھی میں رہتے تھے۔ اختر صاحب کو جب خبر ہوئی تو وہ، وہاں پہونچے اور یہ منظر دیکھا کہ دونوں ناقدین آمنے سامنے کرسیوں پر خاموش بیٹھے ہیں، ایک طرف سرور صاحب کا ہولڈال اور بکس رکھا ہوا تھا — شاید دونوں حضرات ایک دوسرے کی تنقید کر رہے تھے۔ اختر صاحب کو دیکھ کر جیسے دونوں کی جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کلیم صاحب اوپر چلے گئے اور چائے بھجوائی — اختر صاحب نے بڑی آہستگی سے سرور صاحب کے حالات دریافت کرتے ہوئے پوچھا "وہ کیسی گذری؟" سرور صاحب نے ہلکے سے فرمایا "علیک سلیک کے بعد بات آگے بڑھی نہیں"۔ ویسے کلیم صاحب مسکرائے، خندہ پیشانی سے پیش آئے، انہوں نے کچھ بولنا بھی چاہا مگر بات بنی نہیں، — بھئی آہستہ آہستہ بے تکلف ہوں گے اس دفعہ تو یہاں سے چلے چلو"۔ اور یہی ہوا کہ چائے کے بعد بڑی معذرت کے ساتھ اختر صاحب سرور صاحب کو اپنے یہاں لے آئے۔

پھر اسی ۵ نمبر کوارٹر میں سرور صاحب آگئے تھے۔ اختر صاحب اور سرور صاحب جب کبھی مل بیٹھتے تو پھر نجانے کہاں کی داستان چھڑ جایا کرتی تھی — سارا دن تو بیچاروں کا کام ہی کام میں گذر جاتا تھا۔ ایک دن تھکے ہارے دس بجے رات کو گھر واپس آئے۔ اسی روز چار بجے صبح پنجاب میل سے سرور صاحب کو واپس جانا تھا۔ اختر صاحب بار بار انہیں سو جانے کی تاکید کر رہے تھے، پھر بات ہی بات میں اچانک گفتگو کا رخ مذہب، سائنس اور سیاست کی طرف پھر گیا۔ اختر صاحب نے تشریح میں قرآن شریف کے حوالے پیش کئے اور پھر یہ ہوا کہ ایک بجے رات تک وہ تفسیر کبیر کی روشنی میں اور قرآن کریم کی پیشن گوئیوں اور سیاسیات عالم پر باتیں کرتے رہے اور دوسرے کمرے میں مجھے سرور صاحب بیچارے پر بڑا ترس آتا رہا جن کو اس طویل گفتگو کے درمیان کلیم صاحب کے گھر کی خاموشی کتنی اچھی لگ رہی ہوگی، اب جبکہ میں ۶ نمبر کوارٹر میں آگئی ہوں سرور صاحب کافی عرصے بعد اس گھر میں بھی دو بار تشریف لا چکے ہیں۔ ۵۶ء کے ۱۵ر اگست کو مجھے ہریجن کولونی سے چھٹکارا ملا اور میں قریب ہی ۶ نمبر کوارٹر میں آگئی۔

غلام ربانی تاباں صاحب اختر صاحب کے ساتھ رانچی کے مشاعرے سے واپسی میں پٹنہ آئے، دہلی جاتے ہوئے وہ پٹنہ رک گئے تھے۔

لمبا قد، بھاری جسم، سرخ و سفید رنگت سر کے بال سنہرے،

ہاتھ میں ہر وقت سگریٹ، آپ آئے تو شعر و شاعری کے چرچے شروع ہو گئے، بڑی اچھی آواز میں سیدھے سادے طور پر گنگنا ہٹ کے ساتھ اپنی بڑی اچھی غزلیں سنائیں ۔

ہمارے ہی غریب خانے پر ٹھہرے، یہاں وہ مکتبہ کے کام کے سلسلہ میں آئے تھے، کلیم الدین احمد صاحب ۔ ڈی ۔ پی ۔ آئی سے بھی ملے ۔ رات کو تاباں اور اختر صاحب دیر تک شعر سناتے رہے، جب وہ دلی واپس ہوئے تو اپنا ایک بہت اچھا سا تولیہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ۔ جس کو اختر صاحب نے بہت دنوں کے بعد آخر ان تک پہنچا ہی دیا ۔

پروفیسر احتشام حسین رضوی صاحب چند دنوں کے لئے ہمارے یہاں مہمان ٹھہرے تھے، نہایت ہی باوضع، خوش لباس، خوش گفتار اور وجیہہ ہیں ۔ بہت ادبی انداز میں باتیں کرتے ہیں، انکی باتیں اب تک تو میں نے دور ہی سے سنی ہیں ۔ مگر لگتا ہے جیسے تقریر سن رہی ہوں ۔ زیادہ تر علمی مسائل پر باتیں کرتے ہیں ۔ بہت ہی بے تکلف، سادہ طبیعت کے، گرم گرم روٹیاں گرم سالن، اور دوسرے اچھے پکے ہوئے کھانے آپ کو بہت پسند ہیں ۔ مگر فرمائش کبھی نہیں کرتے ۔ آپ کی شاعری، اخلاقی اور عرفانی بلندیوں تک پہنچی ہے، اخلاق تک تو خیر سمجھ میں آنے والی بات ہے مگر انکی روحانی پرواز میرے تخیل سے بہت آگے ۔ اس صورت میں، میں صرف ان کے کلام سے مرعوب ہی ہوتی رہی ہوں ———

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب بزرگانِ ادب میں سے ہیں، آپ ہمارے غریب خانے پر کئی بار تشریف لائے کبھی پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے وائیوا کے لئے اور کبھی بورڈ آف اسٹڈی کی میٹنگوں میں شرکت کی خاطر، آپ کا قیام ہمیشہ ہمارے ہی یہاں ہوتا رہا ۔ اختر صاحب اپنے کمرے کو اپنا "مستقل حجرہ" بنائے رکھتے ہیں لیکن اپنے ان ادبی بزرگوں اور دوستوں کے لئے ہمیشہ بڑی فراخ دلی سے اپنا کمرہ پیش کر دیتے ہیں اور میرے لئے یہ مرحلہ ہوتا ہے کہ ان کے کمرے کی بے ترتیبی میں مہمانوں کی خاطر ترتیب اور سلیقہ پیدا کروں، اعجاز صاحب کی آمد پر بھی بڑی پیاری رونق ہمارے گھر پر چھائی رہی ہے ۔ اور میں نے آپ کے آنے پر ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے جیسے ہمارے بزرگ تشریف لائے ہیں ۔

اعجاز صاحب کا بھی ایک لطیفہ ہے، آپ فرماتے ہیں کہ جب کبھی میں نے کہیں پہونچنے کی اطلاع دی تو اسٹیشن پر تلاش و جستجو کے بعد کبھی کوئی رہبر نہ ملا ۔ اور جب پوچھ پاچھ کے مہمان کے گھر پہنچا تو میزبان یا ان کا آدمی ہمیشہ میرے پہونچنے کے بعد ہانپتا ہوا گھر پہنچا ——— اور کہنے لگا "اعجاز صاحب تو کہیں نہ ملے ۔ انہیں اسٹیشن پر بہت ڈھونڈتا رہا ہوں شاید وہ اس گاڑی سے نہیں آسکے" اور جب انہیں خبر ملی کہ اعجاز میں ہی ہوں تو مجھے اور میزبان دونوں کو شرمندگی بھی ہوئی اور ہنسی بھی آتی رہی ۔ اور یہی حادثہ بار بار ہوتا رہا ہے ۔ جی ہاں ——— پٹنے میں بھی یہ حادثہ دہرایا گیا ۔ اعجاز صاحب صبح سویرے طوفان سے تشریف لاتے ہیں دو بار ایسا ہوا کہ اختر صاحب نے کسی کو اسٹیشن بھیجا تو وہ لانے والا بیرنگ واپس آیا اور اعجاز صاحب ہمارے گھر اس سے پہلے ہی تشریف فرما تھے ——— بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی ۔ پھر اختر صاحب بہت احتیاط برتنے لگے ۔ اور اعجاز صاحب کو اسٹیشن سے لانے کے لئے کئی آدمیوں کو بھیجتے جن کو کئی ناکوں پر بیٹھایا جاتا، اور وہ پلیٹ فارم کے اہم مقاموں پر آپکو تلاش کر کے آخر اپنے ساتھ لاتے ۔

معلوم نہیں اس کی کیا وجہ تھی، لیکن ہم لوگوں نے جو بات سمجھی وہ شاید یہی تھی کہ آپ کی صورت، وضع اچال ڈھال میں اب تک کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے طالب علمانہ کیفیت جھلکتی ہے ۔ ہنس مکھ، ہمو نجال، بے تکلف اور سادہ شخصیت کے مالک، لباس میں بڑی سادگی، کسی قسم کا دکھاوا نہیں، چہرے پر ذہانت اور بھولے پن کا ملاپ، شیروانی پر ٹوپی کبھی نہیں پہنتے اور بڑی آہستہ خرامی سے لوگوں میں گھل مل جاتے اور مجمع کا ایک حصہ بن جاتے ہیں ۔ آپ کے آنے ہی میرے گھر پر پروفیسروں اور کالج کے لڑکوں

کا مجمع لگ جاتا ہے۔ آپ سبھوں سے بڑی شفقت اور محبت سے باتیں کرتے ہیں۔ شعر و شاعری، ادب، زندگی، ریسرچ، افسانہ نگاری سارے ہی عنوانوں پر گفتگو ہوتی ہے۔ اور ایک گھریلو غیر رسمی سی فضا طاری رہتی ہے۔ آپ صبح سویرے اُٹھ کر بغیر کہے سنے کسی طرف سیر کو نکل جاتے ہیں، پھر اسی طرح اِدھر اُدھر گھوم پھر کر بڑی خاموشی سے کرسی پر آ بیٹھتے اور پھر اختر صاحب کے ساتھ مزے مزے کی باتیں کرتے اور ہنستے مسکراتے ہوئے چائے پیتے ہیں۔ اعجاز صاحب پروفیسر احتشام حسین صاحب کے استاد ہیں اس حیثیت سے اختر صاحب ان کا بڑا احترام کرتے ہیں لیکن اعجاز صاحب ہمیشہ دوستانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ اعجاز صاحب کی طبیعت میں شعر و شاعری کا بڑا لطیف ذوق پایا جاتا ہے۔ ان کے مزاج کی شیرینی ان کے کلام میں بھی ہے، بہت اصرار پر اپنی غزلیں سناتے ہیں آپ جب چلے جاتے ہیں تو گھر کی فضا بڑی سونی سونی سی لگتی ہے۔

۹ دسمبر ۱۹۶۰ء کو دو بجے میں بچوں کے اسکول، کونونٹ چلی گئی تھی، وہاں اسپورٹس کا سالانہ فنکشن تھا، بچوں کا ڈرل شروع ہو چکا تھا کہ میری نظر اپنی چھوٹی بہن عذرا پر گئی جو اسی فنکشن میں شرکت کے لئے آرہ سے ابھی آرہی تھیں، وہ میرے پاس آکر بولیں۔

ابھی میں آپ کے گھر سے ہوتی ہوئی آرہی ہوں۔ آپ کے گھر میں اس وقت اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کو دیکھا ہے"۔

میں حیران سی رہ گئی، اردو کا وہ کون سا افسانہ نگار ہوگا؟ جو اس طرح سے چلا آیا؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو اختر صاحب نے مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔ معلوم ہوا کرشن چندر جی اور سرلا بہن آئی تھیں۔ کرشن چندر اپنی بچی کو علاج کے لئے رانچی لے گئے تھے۔ اور اب بچی کو ہسپتال میں داخل کر کے واپسی میں سہیل عظیم آبادی کو خبر دے کر پٹنہ آئے تھے۔ کرشن جی پٹنہ آئے اور ہم لوگوں کو خبر تک نہ ملی؟ ــــ سہیل عظیم آبادی نے ان کو عزیزہ امام کے خوبصورت سجے سجائے مکان میں ٹھہرا دیا تھا۔ اور ابھی صرف رسمی طور پر کرشن جی اور سرلا بہن کو ساتھ لے کر ہم لوگوں سے ملانے کو لائے تھے۔ میں نے جب یہ ساری باتیں سنیں تو مارے غم کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سہیل صاحب نے ہم لوگوں سے غیریت برتی تھی، مگر عزیزہ امام کے نام نے مجھے تسکین بخشی، چلو کرشن چندر جی کسی غیر کے مہمان نہ تھے اپنی ہی چھوٹی بہن کے گھر تو تھے۔

کونونٹ کے فنکشن میں میرا جی نہ لگا میں بھاگی ہوئی آئی اور سیدھی عزیزہ کے گھر پہونچی، ــــ کرشن چندر جی، سرلا بہن اور سہیل صاحب موجود تھے۔ کرشن چندر جی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا میرے لئے یہ پہلا موقع تھا، سرلا بہن سے بھی پہلی بار مل رہی تھی۔ عزیزہ کے ڈرائنگ روم میں ہم سب اکٹھے بیٹھے ہوئے بہت سی باتیں کئے چلے جا رہے تھے۔ کرشن چندر جی اگرچہ اپنی بچی کی بیماری اور اس کی جدائی سے غمگین تھے مگر چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جیسے ہیں ان کی تصویروں میں دیکھتی آئی تھی۔ چمکیلی آنکھیں، بہت اونچی پیشانی، چندلا ہوتا ہوا سر، سُرخی لئے گورا رنگ، درمیانہ قد، ترشا ہوا چہرا، بے تکلف، دیکھنے میں بڑے سیدھے سادے اور مخلص نظر آئے۔ پہلی ملاقات کی کوئی جھجک نہ تھی، شاید اس لئے کہ ادبی رشتے بڑے پرانے اور گہرے ہوتے ہیں۔

سرلا بہن نے بھی اردو کی بہت خدمت کی ہے اور وہ بھی ایک اچھی ادیبہ ہیں۔ بچی کی بیماری اور اس کو رانچی میں چھوڑ کر چلے آنے کا دکھ ان کے چہرے سے صاف جھلک رہا تھا۔ اداس اداس سی، اجڑی اجڑی نظر آرہی تھیں باتیں کرتے کرتے اس طرح سے اچانک کھو جاتیں جیسے ان کی بھٹکی آنکھ ہیں پر کہیں گم ہو گئی ہے۔

سرلا بہن بڑے اچھے قد و قامت کی ہیں، صاف کھُلتا ہوا رنگ چہرے پر بڑی کشش، بڑی بڑی آنکھیں اور بہت پیار سے ملنے والی۔ ان دونوں بھائی بہنوں کو دیکھ کر سچ مچ طبیعت کھِل اٹھی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ آج یہاں پر مہندر ناتھ بھی ہوتے تو ان سادے ادیب بہن بھائیوں کو دیکھ کر کتنا اچھا لگتا ــــ دوسرے دن ہم لوگوں نے دوپہر کے کھانے پر ان لوگوں کو بلایا، عزیزہ امام بھی

تھیں۔ سہیل عظیم آبادی، باری ساقی، جمیل مظہری، کلیم الدین احمد، رضا نقوی، فضل اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شریک تھے، بڑی بے تکلفی سے سارے مہمان گھنٹے بھر باتیں کرتے ہوئے کھانا کھاتے رہے۔ کرشن چندر جی بڑے خلوص سے سبھوں سے ملتے رہے۔ بڑی اچھی گھریلو فضا تھی جس میں ادب کی کرنیں چمک اٹھی تھیں۔

کھانے کے بعد سارے لوگ ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے رہے اور کافی کا دور چلتا رہا، لطف و اخلاص کے ماحول میں شعر و ادب کے شگوفے کھلتے رہے، لوگ آتے گئے اور اس محفل میں شریک ہوتے گئے، ان دنوں پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب، اور ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب بھی پٹنہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کے کام تو لگے ہی رہتے ہیں۔ اعجاز صاحب شام کی گاڑی سے آئے تھے اور میرے ہی غریب خانے پر ٹھہرے، سروری صاحب قاضی عبدالودود صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔

یہ مجلس پانچ بجے شام تک میرے گھر میں برپا رہی، سروری صاحب جناب ذاکر حسین صاحب گورنر بہار سے ملنے کو چلے گئے، ڈھائی تین بجے وہ میرے غریب خانے پر آگئے تھے۔ غرض یہ کہ میرے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں کہکشاں ادب جلوے دکھا رہی تھی۔

دوسرے دن شعبۂ اردو کے سیمینار اور بزم ادب پٹنہ کالج کی طرف سے ایک عظیم تاریخی میٹنگ دربھنگہ ہاؤس میں ہوئی جس میں ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب پروفیسر عبدالقادر سروری کرشن چندر، مسز سلا دیوی، رضا نقوی، سہیل عظیم آبادی، جمیل مظہری اور اختر اورینوی شریک ہوئے۔ سلا دیوی کرشن چندر، سروری صاحب اور اعجاز صاحب نے تقریریں کیں، پھر سب کی اکٹھی تصویریں لی گئیں اور یہ خوبصورت اور تاریخی دن تصویروں میں یادگار رہ گئے۔

۳ر فروری ۱۹۶۱ء کی شام کو میرے گھر کے سارے لوگ دو موٹروں میں بھر کے پٹنہ اسٹیشن پر طفیل صاحب کے خیر مقدم کو گئے، اختر صاحب کی زندگی میں پہلا واقعہ تھا کہ وہ کسی مہمان کو لانے گئے تھے، دو دن قبل طفیل صاحب کا دہلی سے تار آیا تھا کہ وہ ہم لوگوں سے ملنے پٹنہ آرہے ہیں، طفیل صاحب کا نام آتے ہی نقوش کا پرچہ خود بخود نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جی ہاں ـــ نقوش کا خالق ـــ اردو زبان ـــ اور اردو فن و ادب کے ہر حقیقی کو اجاگر کر کے اسے محفوظ رکھنے والے طفیل، جو اردو کی خدمت کرتے کرتے شہادت کا مقام حاصل کرنے کا جوش و جنون رکھتے ہیں۔ وہی طفیل صاحب ابھی ابھی انڈیا سے پٹنہ تشریف لا رہے تھے۔

ایک پاکستانی ادیب اور ایک مشہور پرچے کے مدیر پہلی مرتبہ کی الجھنیں پار کر کے ہمارے ملک اور ہمارے گھر آرہے تھے۔ اجنبی سے جو بہار کی تہذیب اور اس کے لب و لہجہ تک سے واقف نہیں تھے۔

میں لاہور جا کر طفیل صاحب سے مل چکی تھی۔ جب کبھی لفظ کے باوجود میری زبان سے بہار کا لب و لہجہ وہ سن لیتے تو ان کو بڑی الجھن آجاتی تھی، اور وہ میری باتوں میں راگ و شر کا کئی بار تذکرہ کر چکے تھے، لیکن میں بھی جھاڑ کے کانٹے کی طرح ان کی پنجابی زبان سے الجھ کر رہ جاتی تھی ـــ اور آج مغربی و مشرقی پنجاب کی سرحدوں کو پار کر کے مشرقی پنجاب سے گزر کر دلی، اور یوپی کی خوبصورت اور ترشی ہوئی اردو زبان سے سیراب ہوتے ہوئے، وہ پہلی بار گھنی اردو زبان بولنے والے علاقے بہار میں آرہے تھے ـــ جہاں خالص گھنی زبان بھی تھی، میتھلی بھی تھی بھوجپوری اور انہیں سی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں ـــ

میں نے اسٹیشن جانے سے پہلے ہی اپنے سارے ذکروں کو کہہ دیا تھا کہ "دیکھو، یہ جو ہمارے مہمان آرہے ہیں نا، ـــ تم لوگ ذرا ان کے سامنے سنبھل کر باتیں کرنا ـــ ہاں، ان کے سامنے 'یہ ہیاں'، 'ہوآں'، اور 'لیس، دیہس' کبھی مت بولو گے۔"

بچوں نے اپنی معصوم نگاہوں سے مجھے تکتے ہوئے پوچھا۔

"امی، کیا ہمارے یہ آنے والے ماموں جان کیا اپنی کتابوں میں یہ لکھو

دیں گے کہ پٹنہ کے سارے بچے بہت خراب طرح سے بولتے ہیں؟" میں نے جب ان کی تسلی کر دی اور بتایا کہ تمہارے ماموں جان تمہیں بہت پیار کریں گے اور اپنی کتابوں میں تم لوگوں کو بہت اچھا لکھیں گے" تب سارے بچے ایک ہی دفعہ اسٹیشن جا کر اپنے ماموں جان کو لانے کے لئے تیار ہو گئے ۔

ہمارے قافلے میں رضا نقوی صاحب بھی شریک تھے، جب کسی کے انتظار کی گھڑیاں اسٹیشن پر کاٹی جائیں تو پھر بڑی مشکلوں سے وقت کٹتا ہے ۔ اللہ اللہ کر کے گاڑی آئی ۔ اور ہم ہر گزرتے ہوئے کمپارٹمنٹ کو اپنے چہرے پر خیر مقدم کی مسکراہٹ لئے غور سے دیکھتے رہے، گاڑی آخر ٹھہر گئی، اگلے ڈبوں میں کوئی پہچانی ہوئی صورت نظر نہ آئی ۔ جیسے ہی ہم لوگ پیچھے کی طرف گئے، طفیل صاحب گرم سوٹ پہنے اپنے کمپارٹمنٹ سے اتر رہے تھے ان کے ہاتھ میں ایک ہلکی پھلکی سی ٹوکری تھی، جس میں مغل سرائے اسٹیشن پر سے خریدے ہوئے مٹی اور کاٹھ کے کھلونے تھے اور ایک سنہرا خوبصورت نقاشی کا جالی دار ڈھکنے والا گلدان تھا، پھر میں نے اسی پلیٹ فارم پر تعارف کرانا شروع کر دیا ۔

اور اس طرح سے دو موٹروں پر طفیل صاحب کی برات پیچھا باغ کے آٹھ نمبر کوارٹر پہونچ گئی، ان کے آتے ہی لوگ ملنے کو آنے لگے، جن کی رونق میں طفیل صاحب کی تھکی تھکی سی صورت کہیں کہیں پر سے جھلک پڑتی تھی ۔ بھولا بھالا، بڑا معصوم سا چہرہ آنکھیں بڑی مگر پپوٹوں کی بوجھ سے جھکی جھکی سی، بے حد گھنے سیاہ ابرو، لمبا قد، بھرا ہوا جسم، اور ضرورت سے زیادہ سید ھے سادے صورت سے ایک انوکھا بچپنا ٹپکتا ہے ۔ دوسرے دن طفیل صاحب کچھ ٹورسٹ وغیرہ کے چکر میں رہے، پھر اسی طرف سے عزیزہ ان کو درھنگہ ماونٹس، فرحت صاحب کے کلاس میں لیتے چلے گئے، اختر صاحب نے نقوش کے ایڈیٹر کا اپنے کلاس میں تعارف کرایا ۔ ایک لڑکی نے بے ساختہ انہیں تکتے ہوئے بے اختیار کہہ دیا ۔ "یہی طفیل صاحب ہیں؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ کوئی بڑے بزرگ ہوں گے، یہ لمبی لمبی داڑھی

ملے گی ۔ مگر یہ ۔ یہ طفیل صاحب تو چھوٹے سے نکلے ۔ پھر اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنے بڑے بڑے کام وہ کس طرح سے کرتے رہے ہیں؟ ۔

اختر صاحب نے اتنی تھوڑی سی ملاقات میں طفیل صاحب کو بہار کی بہت سی خصوصیات اور تاریخیں بتائیں ۔ یہاں کی مشہور خدا بخش خاں کی لائبریری بھی دکھلائی ۔ اسی رات کو دس بجے ہم لوگ بکسر موٹر سے اودل چلے گئے، میرے دونوں بھائی پروفیسر عزیز احمد اور ڈاکٹر آفتاب احمد خاص طور پر طفیل صاحب کو اپنے گھر اودل لے گئے تھے ۔ طفیل صاحب کو اودل جانے اور ابا جان سے ملنے کا بڑا شوق تھا، بارہ بجے رات کو ہم لوگ وہاں پہونچے اور صبح کو ۹ بجے پٹنہ واپس ہو گئے، وہ رمضان کی دوسری تاریخ تھی، اسی روز افطار پر، پروفیسر علی اکبر نقوی نے طفیل صاحب کے اعزاز میں کچھ لوگوں کو اپنے گھر بلایا تھا، طفیل صاحب جب دعوت سے واپس آئے تو میرے گھر کی بچیوں اور بچوں نے اپنی کانونٹ اور سینٹ زیویر اسکولوں میں کھیلا ہوا انگلش ڈرامہ بڑے پیار سے اپنے ماموں جان کو دکھایا ۔ بچوں کو دس روپے انعام میں ملے، طفیل صاحب میرے گھر پر اپنے ان سارے بھانجے بھانجیوں کے ساتھ بڑے خوش رہے تھے ۔

رات گزر گئی، صبح سویرے دلی ایکسپریس سے ہم لوگ، طفیل صاحب کو رخصت کرنے اسٹیشن گئے، رضا نقوی، عذرا، اور عزیز ساتھ تھے، اختر صاحب نہ گئے تھے، انہوں نے کہا کہ دوستوں کو رخصت کرنا بڑی تکلیف دہ بات ہوتی ہے، پھر ٹرین تک پہنچانا تو اور بھی اذیت رساں منظر ہے ۔

اب بھی اسکولوں میں جب کبھی بچے ڈرامے کھیل کر واپس آتے ہیں تو مجھ سے بڑی حسرت سے پوچھتے ہیں کہ "آپا! ہم لوگوں کے ماموں جان اب، پھر کب آئیں گے؟ اس وقت میری نگاہوں میں آمنے سامنے دو سرحدیں ابھرتی ہیں جہاں دو ملکوں کے الگ الگ جھنڈے لہراتے ہیں ۔ اور جس جگہ لوہے کی سلاخوں والے کٹہرے کے اندر

ایک حشر کا نظارہ ہوتا ہے اور جہاں کے گیٹوں پر مسلح پہرے دار کھڑے رہتے ہیں۔

سنہ ۱۹۶۱ء کا ستمبر ہم لوگوں کے لئے بڑے آزمائش کا تھا، اباجان تشویشناک طور پر بیمار تھے اور ہم سارے بھائی بہن اباجان کے ساتھ پٹنہ میڈیکل کالج ہوسپٹل کے کوچ میں بدحواس تھے۔ گھربار اور اپنے بچوں تک سے بے خبر، اباجان کی خدمت اور دعاؤں میں لگے ہوئے تھے۔ اختر صاحب سے ایک دن خبر ملی کہ خلیل الرحمٰن اعظمی آئے ہیں اور میرے گھر پر ان کا قیام ہے۔ دم بھر کو، مجھے احساس ہوا کہ بجائے صرف نوکروں کے رحم و کرم پر گھر اور مہمان کا کیا حال ہوگا؟ پھر اباجان کی مسلسل بیہوشی اور ہر طرف چھائی ہوئی افسردگی دماغی ہیجان و بے چینی میں یاد بھی نہ رہا کہ گھر اور مہمان کہاں ہیں۔ اس لئے افسوس کہ میں ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتی۔

سنہ ۱۹۶۲ء کی ایک شام کو میں اختر صاحب کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک رکشہ آکر رکا، اس پر ایک بستر بھی تھا اور سوٹ کیس بھی۔ میں پچھلے دروازے سے اندر چلی آئی، اچانک باہر سے اختر صاحب کی بڑی خوشیوں بھری آواز آئی۔

ارے بھئی۔ جذبی تم؟۔ وہ شام بڑی افسردہ تھی گزری ہوئی غم کی گھڑیاں ہم دونوں یاد کر رہے تھے۔ جذبی کے آجانے سے مجھے بڑا اچھا لگا۔ اور اچانک مجھے ان کا مشہور شعر یاد آگیا۔

"جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے"

میں نے اس خوبصورت غزل کے خالق کو دیکھنا چاہا۔ مگر اس حسین غزل کا لکھنے والا شاعر وقت سے بہت پہلے تھکا تھکا سا نظر آیا، گول چہرہ، درمیانہ قد، اچھا جسم، چمکیلی آنکھیں اور چندلا سر، جذبی کو دیکھ کر سچ مچ کا جذبی سمجھنے کو جی نہ چاہا۔ جذبی کی غزلیں نہایت پیاری، بڑی رنگین، اور خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان غزلوں کا لکھنے والا شاعر اپنا وہ سارا لطیف دور گزار کر یہاں پہنچا تھا اور میں بہت دیر کے بعد اس کو دیکھ رہی تھی۔ جذبی کے آنے کے بعد اتفاق سے یہاں کے کچھ اہل ذوق اختر صاحب سے ملنے جو آئے تو اچھی خاصی ایک مجلس جم گئی دیر تک شعر و شاعری چلتی رہی۔ آخر جذبی جب اپنا کلام سناتے سناتے تھک گئے تو سہیل عظیم آبادی کے ساتھ رات کے ہلکے اندھیرے میں کہیں تازہ دم ہونے کو چلے گئے۔ یہ ملاقات بہت مختصر رہی رات گزار کر وہ سویرے کی گاڑی سے واپس چلے گئے۔

بہن صالحہ عابد حسین سے ہماری پہلی ملاقات اردو کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی تھی، صالحہ بہن اور بہن حمیدہ سلطان صاحبہ نے ہمارے جلسے کو رونق بخشی تھی، بیگم یونس صاحبہ نے ہماری ان دونوں مہمان بہنوں کو اپنے پاس گرینڈ ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ دوسری بار صالحہ بہن کو بزم اردو گیا کالج نے اپنے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے بلایا تھا، آپ پٹنہ آکر پھر ہم لوگوں کے ساتھ گیا گئی تھیں۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے بڑے گہرے مراسم ہیں (جناب ذاکر حسین جب) بہار کے گورنر رہے، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور صالحہ بہن ان لوگوں سے ملنے آجاتی تھیں، آپ جب بھی پٹنہ آئیں ہمیشہ ہم لوگوں سے ملنے ہمارے گھر آتی رہی تھیں۔ سانولی سلونی سی، بڑی ہنس مکھ اور بڑے پیارے انداز میں گفتگو کرنے والی صالحہ بہن انسانیت اور اردو ادب کی خدمت گزار ہیں۔ آپ کو اردو ادب سے بڑا گہرا لگاؤ ہے اور اس کی لگن بھی۔ صالحہ بہن دو چار دنوں کے لئے بھی گھر سے باہر جاتی ہیں تو ان کے لکھنے لکھانے کا سامان ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ آخری بار جب میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ اپنا چوتھا ناول لکھ رہی تھیں۔ کئی دفعہ ان کے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب بھی صالحہ بہن کے ساتھ ہمارے گھر آئے اور دیر تک رہے، بڑے متین اور خاموش سے، دبلے پتلے لیکن علم کے اس کہنے میں دریا بند ہے، آپ کے اندر مزاح لطیف کا احساس بہت پایا جاتا ہے، بڑے مخلص اور کرم فرما بزرگ ہیں، ان جیسے لوگوں نے

بڑے تیاگ اور قربانی کے بعد جامعہ ملیہ قائم کیا تھا۔ ایک بار صالحہ بہن اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ساتھ غلام السیدین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ مرحومہ بھی غریب خانے پر تشریف لائی تھیں ہم لوگ بہت دیر تک باہر احاطے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور کافی پیتے رہے تھے — یہ گورا چٹا سرخ و سپید جوڑا دل و دماغ دونوں روشن رکھتا تھا، اجلے پن کا اگر مجسمہ بنا ہوتا تو اسی جوڑے کا مجسمہ تراشنا ہوگا، چہرہ اجلا، تہذیب اجلی اور شخصیت اجلی —

جب تک جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بہار کے گورنر رہے ہم لوگوں پر بہت کرم فرماتے رہے، لیکن انہیں اپنے گھر بلانے کی ہمت ہمیں نہ ہوئی۔ جب آپ یہاں سے واپس تشریف لے جانے لگے اور حکومت ہند کے نائب صدر مقرر ہو گئے تو ہم لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ انہیں ودائی دعوت دی جائے، براہ نوازش آپنے ہماری دعوت قبول کی اور رات کے کھانے پر تشریف لائے، بڑا مجمع تھا باہر کا سارا انتظام فضل نے کیا تھا، شہر کے عمائدین موجود تھے ڈاکٹر صاحب قبلہ، دو تین گھنٹے تک ہمارے گھر رہے، اور خوش خوش واپس تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب، صاحب قلم صاحب فکر اور صاحب طرز بھی ہیں، ہم لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر ایک ماہر تعلیم ادیب کی کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

۹ رمئی ۱۹۶۳ء کی شام کو مجھے خبر ملی کہ جیلانی بانو اور انکے شوہر انور معظم پٹنہ آگئے ہیں اور سہیل عظیم آبادی کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سہیل صاحب خود ہی آگئے، کہنے لگے آج سات بجے شام کو یہ لوگ آپ لوگوں سے ملنے آرہے ہیں"۔ گرمیوں کے دن تھے، ہر شام باہر احاطے میں ہم لوگ روزانہ بیٹھتے ہی تھے، وہیں بیٹھے جیلانی بانو کا انتظار کرنے لگے اگرچہ سہیل صاحب نے شام کے سات بجے کا وقت دیا تھا لیکن میں جان رہی تھی کہ سہیل صاحب اپنی عادت کے مطابق ضرور دیر کر کے آئیں گے۔ آخر وہی ہوا رات کے آٹھ بج گئے اور جب ہم لوگ مایوس ہو چلے تھے اب سہیل صاحب آتے نظر آئے، اور اس طرح سے جیلانی بانو پر ہم لوگوں کی پہلی نظر پڑی —

دُبلی پتلی بھولی بھالی سی جیلانی بانو کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے ابھی ابھی یہ لڑکی اپنے اسکول سے آرہی ہے۔ بڑا پیارا خوبصورت چہرہ، متین، پرخلوص اور ذہین آنکھیں، اور سنجیدہ سے لب، رات کی ہلکی سی روشنی میں پہلی بار سفید لباس میں انہیں دیکھ کر بے اختیار مجھے جاپانی کی گڑیا، یاد آگئی — ابھی جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ سہیل صاحب نے جانے کا شور مچایا — اور بس شربت کا ایک گلاس ساتھ پی کر ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا —

دوسری صبح کو سہیل صاحب کے گھر میں پہلی بار گئی، میرا رکشا ان کے گھر کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دوسرے رکشے پر جیلانی بانو اور انور معظم کہیں جاتے ہوئے نظر آئے۔ چھجو باغ سے رکشے پر سلطان گنج جانا ایک جہاد سے کم نہیں تھا، اس پر سے پیچھے بانو صاحبہ کہیں چلی جا رہی تھیں۔ سہیل صاحب ریڈیو اسٹیشن چلے گئے ہوں گے، اور اب اگر ان کی بیگم صاحبہ نے بھی مجھے نہ پہچانا تو پھر مزہ آجائے گا — میں یہی باتیں سوچتی ہوئی رکشے سے اتر پڑی۔ سامنے ہی بڑے کمرے میں جیلانی بانو کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ سہیل صاحب کے نام سے آئے ہوئے تازہ اور پرانے پرچے بھی وہیں میز پر بکھرے پڑے تھے"۔ جیسے ہی اس کمرے میں آئی جیلانی بانو بھی واپس آگئیں، انہوں نے آتے ہی انور معظم سے تعارف کرایا اور پھر ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ انور معظم کو دیکھ کر بھی یہی محسوس ہوا کہ یہ لڑکا یقینی ابھی کسی کا "شوہر" نہیں کہلا سکتا ہے، دبلا پتلا، سانولا سا، لمبا قد، ذہین چہرہ، اور بہت بلند ارادے، مجھے انور سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ان دونوں میاں بیوی میں جو سب سے اچھی بات تھی وہ یہ کہ تکلف والا پردہ نہیں تھا اور یہی چیز ایسی ہوتی ہے جو مجھے اپنا لیتی ہے۔ یہ نئے کمسن جوڑے مجھ کو بڑے پیارے لگے۔ اسی دن شام کو کانفرنس میں تقریریں تھیں — اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب اکٹھا ہو بیٹھے تھے۔ خبر ملی تھی کہ تسنیم سلیم چھتاری بھی آگئی ہیں اور

بانکی پور کلب میں ٹھہری ہوئی ہیں ـــــ میں گھر واپس آگئی ـــ

شام کو اختر صاحب اور رضا نقوی صاحب کے ساتھ کانفرنس میں مجھکو بھی جانا پڑا ـــ کچھ تقریریں ہوئیں اور کچھ پیپر پڑھے گئے، لیکن ان سارے ہنگاموں میں مجھے تسنیم سلیم کا بڑا شدید انتظار رہا ـ ہر آنے والی نئی خاتون پر مجھے تسنیم کا شبہہ ہوتا تھا، ـــ آخر جب کانفرنس ختم ہو چکی اور ہم لوگ گھر آنے کو ہال سے نکل رہے تھے تو سہیل صاحب نے مجھے تسنیم سے ملایا جو دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ہال میں داخل ہو رہی تھیں ـ ان کے ساتھ ان کی بچی تبسم بھی تھی، معلوم ہوا کہ اسی بچی کو وہ ڈاکٹر سے دکھانے لے گئی تھیں، اسکا ٹونسل خراب ہو گیا تھا، ڈاکٹر کافی دیر سے ملے اسی وجہ سے وہ اب پہونچ رہی تھیں ـــ شام کی چھائی ہوئی شفق کی روشنی میں، میں نے بڑے پیار سے تسنیم کو دیکھا جس کو دیکھنے کی حسرت اس زمانے سے تھی جب تسنیم کا افسانہ "کسک" بہت سے دلوں کی ٹیس بن چکا تھا ـــ پر بہار دنوں میں تسنیم کے جیتے جاگتے افسانوں نے تخیل میں رنگینیاں اور خیالوں میں کیف و خمار بھر دیا تھا ـــ اور اب ایک محفل بیت جانے پر ہم ایک دوسرے سے مل رہے تھے، ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ـ افسانہ "کسک" اب ہر روز کی زندگی کا ایک مسئلہ بن کر نگاہوں کے سامنے تھا ـــ کوشش کرنے پر بھی میں تسنیم کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکی سفید جھلکتا ہوا رنگ ـــ ضرور دیکھا، پان کھائے ہوئے سرخ مسکراتے لبوں پر نظر پڑی ـ خوبصورت پیشانی، گھنگھریالے سیاہ بال پیار بھری شرارت سے چمکتی ہوئی روشن آنکھیں، دراز قد، بھرا ہوا جسم، اور ہنستا ہوا کتابی چہرہ، ابھی ہم ایک دوسرے سے پورے طور پر ملنے بھی نہ پائے تھے کہ معلوم ہوا باہر سے آئے ہوئے مہمان گورنر صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت پر جا رہے ہیں، تسنیم نے اپنی بچی تبسم کو میرے سپرد کیا اور خود سب لوگوں کے ساتھ دعوت میں چلی گئیں ـــ

تبسم میرے ساتھ آکر میرے گھر کی ساری بچیوں میں بہت جلد گھل مل گئی، دس بجے رات تک دعوت کھانے والی پارٹی میں تسنیم آئیں اور تبسم کو ساتھ لیتی گئیں، معلوم ہوا کہ صبح بہت سویرے ہی وہ جکیہ واپس جا رہی ہیں ـ

اس کے بعد تسنیم سلیم پھتاری جب بھی پٹنہ آئیں ہمیشہ مجھ سے ملنے آتی رہی ہیں ـــ تسنیم اتنے مزے کی گفتگو کرتی ہیں اور اتنے خوبصورت لب و لہجہ میں بولتی ہیں کہ جی چاہتا ہے بس سنتی چلی جاؤں ـ تسنیم جتنی پرخلوص اور سادہ مزاج خاتون ہیں شاید گھرانے میں کوئی دوسری نہ ہوتی ہوگی ـ ایک بار تسنیم میرے یہاں اپنے میاں سلیم صاحب کے ساتھ بھی آئی ہیں جو بہت ہی خوش اخلاق آدمی ہیں ـ مجھکو اچانک یہ خبر ملی کہ بہن رضیہ سجاد ظہیر پٹنہ آئی ہوئی ہیں اور ہم لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں، سنکر بے حد خوشی ہوئی، فوراً اپنی بہن صوفیہ کی کوٹھی سے ان کو فون کیا کہ آپ ضرور تشریف لائیں ـــ رضیہ بہن کو جلدی واپس جانا تھا اس وجہ سے میرے فون کے بعد وہ صوفیہ کی کوٹھی پر ہی مجھ سے ملنے کو چلی آئیں، بہن نفیسہ، مسز ریاست حسین اور بیگم مہدی امام صاحبہ بھی ساتھ تھیں، بہن رضیہ سجاد ظہیر شام کے دھندلکے میں آئی تھیں ـ ہاتھ میں انکے تازہ ناول ثمن کی ایک جلد بھی تھی ـ پہلی نظر میں رضیہ بہن مجھے ایک لیڈر سی نظر آئیں ـ مگر ان کے لب و لہجے میں جو شیرینی اور دل کو موہ لینے والی مٹھاس تھی اس نے جلد ہی انہیں لیڈری سے الگ کر دیا ـ یہ ہماری ادیبہ بہن رضیہ سجاد ظہیر تھیں جنہوں نے پریشانیوں کے آگے کبھی سپر نہ ڈالی تھی ـ اور جو زمانے کی چکی میں پس کر بھی ہماری آنکھوں کو روشنی بخشنے والا سرمہ بن چکی ہیں، ہنستی آنکھیں، مسکراتے لب، اور بڑا ہنس مکھ چہرہ ـ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رضیہ بہن نے مجھے اپنا ناول ثمن دیا ـ اور مجھے سے پہلے ناول کا پہلا باب خود سنانے لگ گئیں ـ اتنی خوبصورت طرز ادا میں وہ اپنا ناول سنا رہی تھیں کہ ہم سارے کے سارے لوگ انکی آواز، انکے الفاظ اور انکے لب و لہجے میں ڈوب کر رہ گئے ـ رضیہ بہن اپنے اسی ناول کی نکاسی کے سلسلے میں تشریف لائی تھیں ـ رضیہ بہن کے جانے کے بعد اب جب بھی "ثمن" پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار ان کی آواز کا جادو یاد آجاتا ہے ـ

رضیہ رعنا

اختر اورینوی صاحب

اختر اورینوی صاحب کی اہم شخصیت میرے خیال میں یقیناً کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موجودہ دور میں وہ ایک بلند پایہ کے مشہور ادیب، تنقید نگار اور کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تمام خصوصیات کو مزید کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔ اس لئے کہ اورینوی صاحب کی ہندوستان گیر شہرت ان حدوں سے بڑھ کر بہت آگے جا چکی ہے۔

جب کوئی فن کار اپنے فن میں کمال حاصل کر لیتا ہے تو پھر دنیا کی نظریں فن کی طرف کم اور فنکار کی طرف زیادہ دیکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اورینوی صاحب اسوقت اپنے فن کی انتہائی بلندیوں پر ایک چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح نظر آرہے ہیں۔ آفتاب کی ضوپاشیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اسیطرح اورینوی صاحب کی ذات بھی ایک اہم حقیقت ہے۔ اور حقیقت سے گریز ایک ناممکن اقدام ہوگا۔ بہرحال مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ چونکہ بہت بچپن کا زمانہ تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔ جب پہلے پہل اورینوی صاحب ہم لوگوں کی دنیا میں داخل ہوئے۔ ہم لوگوں کی دنیا سے مراد ہے اردل کا ایک معمولی سا قصبہ دیہات کا معصوم اور سادہ ماحول۔ اپنے طور پر ہم لوگ نزاکت کے ساتھ پرورش پا رہے تھے۔ بڑا سا خاندان خوش حال زندگی اور پیارے نالدین . . . ! ہم چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو اور ضرورت ہی کیا تھی؟ دن رات ادھر ادھر باغوں میں، کھیتوں پر، نوکر چاکر کی ٹولیوں میں اور کبھی کبھی بہت ہمت کر کے ابا جان کے بنگلے کی طرف بھی پہنچ جایا کرتے تھے۔ لیکن ایسی ہمتیں بہت کم ہی ہوا کرتی تھیں اس لئے کہ ابا جان کا بہت زیادہ رعب ہم لوگوں پر طاری تھا۔ اپنی تمام وحشت اور طفیل کو دکھانے کا زبردست پروگرام ہمیشہ ان کی غیر موجودگی ہی میں بنایا جاتا، یا کبھی پائیں باغ کے بالکل کنارے ویران جگہوں میں جا کر ہم لوگ دل بھر کے اپنی شرارتیں کر لیا کرتے جہاں ابا جان کے کبھی بھول کر بھی پہونچنے کا امکان نہ تھا۔

اورینوی صاحب ایک روز بالکل اچانک طور پر آئے۔ امی جان لیکن ہم لوگوں کو قبل ہی بتا چکی تھیں کہ ان کے ایک بہت "پیارے بھائی" ہیں جن سے وہ بھائی سے بھی زیادہ پیار رکھتی ہیں۔ انہوں نے بہت ہی غمگین انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ ان کی صحت ان دنوں کچھ کمزور رہنے لگی ہے۔ ڈاکٹروں نے کسی اچھے اور پرفضا دیہات میں رہنے کو کہا ہے۔ بچپن کی ذہنیت اسی روز سے ہم لوگ روزانہ اپنے ایک اچھے ماموں جان کے انتظار میں رہنے لگے۔ آخر وہ ماموں جان آ گئے۔ اور ہم لوگوں نے بے حد خوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ اس لئے کہ امی جان کے کہنے کے مطابق یہ ماموں جان بہت ہی اچھے معلوم ہوئے۔ بات بات پر ہنستے ہنساتے تھے۔ خوب خوب مزیدار قسم کی باتیں کیا کرتے۔ لطیفے اور کہانیاں تو ان کی پسند کی خاص چیزیں تھیں۔ غرضکہ کافی پر مذاق طبیعت تھی ان کی۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ ہم سارے لوگوں سے وہ بہت جلد گھل مل گئے۔ اس طرح کہ جیسے مدتوں سے ہم لوگوں کے درمیان ہی رہتے چلے آرہے ہیں۔ پھر کون مہمان تھا؟ اور کیسی مہمان نوازی؟ بہت کم ہی وقفے میں یہ سوال ختم ہو کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ بچپن کی حدیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور ہم لوگ اورینوی

صاحب سے زیادہ محبّت، ان کی زیادہ عزت، اور بہت زیادہ قدر کرنے لگے۔ یوں تو ہم لوگوں کے گھر میں ادبی ماحول کچھ کچھ قبل ہی سے تھا۔ امی جان کو اچھے ناولوں اور پرچوں، رسالوں سے انتہائی دلچسپی اور شوق رہتا تھا باوجود خانہ داری کی بے حد مشغولیت اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے بھی وہ ہر وقت رسالوں میں غرق رہتیں۔ ہر ماہ کے شروع میں وہ ڈاک کے وقت اس قدر بے صبری سے رسالوں کے انتظار میں پریشان نظر آتیں جیسے کوئی بہت ہی عزیز ہستی آ رہی ہو۔ خوبصورت رنگین ٹائٹل پیجوں میں۔ ان کی میز پہ رسالوں کا ایک ڈھیر ہوتا۔ نیرنگ خیال، نگار، ادبی دنیا، عالمگیر، عصمت، تہذیب وغیرہ وغیرہ کا ایک لمبا سلسلہ ہر ماہ کی پہلی سے ۲۰ تاریخ تک قائم رہتا۔ اور ان دنوں امی جان بہت خوش نظر آتیں۔

اورینوی صاحب کو اردو بہت پسند آیا۔ اس کی ایک ایک جگہ کی وہ اس قدر تعریفیں کیا کرتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ پہلے بھی قدیم مدت سے یہی اردو تھا۔ معمولی سا ایک بڑا قصبہ۔ پہلے کے لوگوں نے بھی دریائے سون کو اسیطرح بہتے ہوئے دیکھا تھا۔ نہر اسیطرح قائم تھی۔ دھان کے کھیت اسی رنگ میں ہرے اور شاداب ہوتے تھے۔ پگڈنڈیاں انہیں پیچ و خم سے گذرتی تھیں۔ آفتاب بالکل اسی طرح ہر روز سون کے دامن میں غروب ہوتا تھا۔ چاند ہمیشہ شیشم اور تاڑ کے جھنڈ سے طلوع ہوتا۔ معصوم چرواہے بھینس، گائیں چراتے چراتے تھکن میں چور پہلے بھی اپنی بانسری کی دھن میں کوئی رنگین نغمہ چھیڑتے۔ لیکن اورینوی صاحب نے ان تمام چیزوں کو ایک نئی زندگی بخشی! انہیں اپنی شاعرانہ طبیعت کے ساتھ نئے نئے تاثرات کے ساتھ محسوس کیا۔ بالکل اچھوتی اور انوکھی نظروں سے دیکھا اور سمجھا ایک شاعر کا ہر زاویہ نگاہ خود ہی ایک نئی تخلیق ہوتا ہے۔ مکمل کائنات!

وہ حسب معمول شام کے وقت ہر روز پابندی کے ساتھ سون کے کنارے ٹہلنے جایا کرتے۔ وہاں بیٹھ کر وہ گھنٹوں اپنے خوبصورت تخیلات میں ڈوب جاتے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر اور اُفق پہ پھیلی ہوئی سُرخ شفق سے ان کی نظموں میں جان آجاتی ہے! سون کی ہموار موجوں اور ہوا کی لطیف گنگناہٹ میں وہ اپنے دل کی تمام دھڑکنیں موجود پاتے!! اور یہی دھڑکنیں ان کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔

انہوں نے لہلہاتے ہوئے سرسبز دھان کے کھیتوں میں، اپنے نغمے بکھیر دیئے۔ سرشاری کے عالم میں وہ کہہ اٹھے "یا سبز پاش عذرا" آنکھیں ہیں میری حیران! شیشم اور تاڑ کی جھنڈ سے نکلتے ہوئے چاند کو انہوں نے اپنی خوبصورت دُلہن بنایا! کبھی حسن نقاب میں اور کبھی نقاب میں حسن ہوتا! جس وادی نے اب تک کسی "ہیر رانجھا" کی کہانی نہیں سُنی تھی، لیکن جب ہر طرف فطرت حسین ہوکر شعریت سے بھرپور نظر آنے لگی تو ان کی بانسری کی دھن میں بھی ان کی اپنی ہیر کی محبت جاگ اٹھی، ان کا دل دھڑکنے لگا اور گاؤں کی معصومیت مُسکرا پڑی۔

اورینوی صاحب بہت جلد گاؤں کے سادہ ماحول پہ چھا گئے۔ یا ماحول خود ان پر چھا گیا؟ انہوں نے اردو کی فضاؤں کو شعریت سکھائی یا فضاؤں نے انہیں شاعر بنایا؟! یہ راز نہیں کھل سکا!

بہرحال دنیا بہت تیزی کے ساتھ حسین نظر آنے لگی تھی، آہستہ آہستہ ہم لوگوں نے بھی اس کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ پہلے اچھے اچھے افسانوں کا پتہ امی جان سے ملتا تھا۔ اور اب ہر طرف افسانے ہی افسانے حقیقت کے روپ میں نظر آنے لگے۔ ادب کا شوق تو فطری طور پہ ورثہ میں ملا تھا۔ لیکن اسے اپنانے کا سلیقہ اورینوی صاحب ہی کے ساتھ ورہ کر آیا۔ اسیطرح "شعر و شاعری" کا رجحان بھی انہیں کے گرد و پیش ترتیب پانے لگا! نتیجہ یہ ہوا کہ بیت بازی کے ساتھ ساتھ ایک دو شعر کہنے کی مشق بھی ہوگئی۔ اور یہ مشق اس قدر بڑھی کہ پوری پوری نظمیں بھی جلد ہی تیار ہونی شروع ہوگئیں۔

۱۹۳۳ء کی ۲۴ مئی کو اورینوی صاحب کی شادی آپا جان، شکیلہ اختر صاحبہ سے ہوگئی۔ اسے کرۂ ارض کا ایک عظیم سانحہ کہئے یا زندگی کی ایک نہایت خوبصورت گھڑی بہر حال یہ ذرا نازک سا مسئلہ ہے۔ شکیلہ اختر صاحبہ کے نام سے کم از کم ایک دُنیا ضرور متعارف ہے۔ میں چھوٹی بہن کی حیثیت سے اس کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ وہ مجھے صرف آپا جان نظر آتی ہیں۔ اور بس۔ گرچہ قدرداں لوگوں نے انہیں کافی القاب سے نوازا ہے۔ یوں تو اورینوی صاحب پہلے بھی گھر بھر کے دلوں میں اپنی کافی سے زیادہ جگہ بنا چکے تھے۔ لیکن اس خوبصورت رشتہ اتحاد کے بعد تو وہ اور زیادہ قریب ہوگئے۔ آپا جان کی ذات کے بعد گھر کے اہم

فردوس ہی سمجھے جانے لگے تھے۔ جس طرح قدرت کی تمام فیاضیاں انہیں افراط کے ساتھ حاصل تھیں۔ اسی طرح اس کی ستم ظریفی دیکھئے کہ شادی کے بعد اور نیوی صاحب کو بیک وقت ایک ساتھ کم از کم ایک درجن "سالیوں" کو کھلے طور پر اکیلے خوش آمدید کہنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بے حد خوفزدہ اور گھبرا دینے والی تھی۔ لیکن ان کی عظیم فراخدلی اور غیر معمولی صلاحیت نے آسانی کے ساتھ اس پرابلم کو حل کر لیا۔ وہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اس بھری نگری پر چھا گئے۔ یا یہ خود ان پر چھا گیا۔ دونوں لازم و ملزوم بات تھی۔ بہر حال پھر کیا تھا، ایک طوفان رنگین نے گھر کو سر دن پر لے لیا۔ قسم قسم کی نئی نئی شرارتیں ہوتیں۔ اور وہ بچارے بڑے شوق کے ساتھ ہر ایک حملہ آور کے سپرد خود کو کر دیتے۔ بہر حال ہر وقت بلکہ ہر لحظہ یہ ہنگامہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ لیکن ان کی مخصوص فطری نیکی اور اعلیٰ ذہنی بے مثال طور پر اپنا حق ادا کرنے لگی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے پاس سوائے ان کی حوصلہ افزائیوں کے اور کوئی دوسرا جواب بھی ہے ایسی وجہ تھی کہ ان کی لطیف مسکراہٹوں نے اس خوبصورت جھنڈ کو بہت آگے بڑھنے کی ترغیب دی اور پل بھر میں ان "جنگل کی ہرنیوں" کا غول در غول اور نیوی صاحب پر ٹوٹ پڑا۔ بے بسی کا یہ عالم تھا کہ وہ بچارے کبھی ساحل سمندر سے آگے نہیں بڑھے تھے، دور ہی سے کھڑے ہو کر اپنی شاعرانہ کیفیت سے سیراب ہو لیتے۔ اوپر اوپر اڑنے والی فضاؤں سے کبھی جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہ زمین کی سطحیں آخر کتنی نیچی ہیں۔؟ اور اب یہ حال تھا کہ وہ ہر وقت مختلف تجربوں سے پیہم گزرتے رہے۔

نیو ہاؤس اور پام ولا کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے انہیں اپنے ساحل سے بھی دور پھینک دیا تھا۔ بچارا شاعر حیران تھا کہ تخیلی شعروں سے یہ جیتے جاگتے اشعار کہیں زیادہ لطیف ہونے کے باوجود بھی کس درجہ خوفناک اور مہلک ہیں۔ خدا کی پناہ! شاعری ان سے ایک حد تک گم ہو چکی تھی۔ ان دنوں وہ ایک کامیاب اور مجسم دولہا بھائی کے مختلف ریہرسل کی الجھنوں میں گرفتار رہنے لگے تھے۔ روزانہ طرح طرح کی فرمائشیں ہوتیں قسم قسم کی طبع آزمائیاں کی جاتیں۔ کبھی تو ہاتھ سے انگلیوں میں گوند لگا کر لایا جاتا اور اس تیز اسلحے سے اور نیوی صاحب کے بیگ برش کا شکار ہوتا تو کبھی لوگ ان کے چہرے پر زرد زرد ابٹن مل کر انہیں اور زیادہ خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے۔ کسی کی زبردست خواہش تھی کہ چونکہ آپکی انگلیاں کافی لمبی لمبی اور خوبصورت ہیں عورتوں جیسی، کیوں نہیں ان میں مہندی رچا کر آپکو اچھی طرح دلہن بنا دیا جائے؟ کوئی بدمذاق طبیعت ان کے اچھے خاصے صاف و سفید کپڑوں کا گندی کیچڑوں کے ساتھ ہولی کھیل کر اس کا ستیاناس کر دیتا۔ اور وہ بچارے ہنس ہنس کر اپنے یہ تمام ضروری فرائض بڑی مسرت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ لیکن غریب شاعر کا دل بچارا تو ایک ہی تھا۔ اور شوق کا یہ ہجوم! اور نیوی صاحب نے اس قسم کی الجھن والی بات کو بھی اب سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

گرمیوں کی ایک سنہری شام تھی۔ ایک دفعہ پٹنے سے آئے تو ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ "پام ولا" کی فضائیں کچھ بدلی بدلی سی تھیں۔ گھر کے سارے لوگ سراسیمہ خوف سے نڈھال ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ سبھوں کا چہرہ فق تھا۔ ڈر کے مارے کوئی لڑکی اپنی جگہ سے ہل نہیں رہی تھی۔ ایک سنسنی خیز سرگوشی انہیں محسوس ہوئی۔

سب سے پہلے آپا ناہدہ نے اس طلسم کو توڑا۔

"اختر صاحب! ذرا غور تو کیجئے یہ کس چیز کی بو ہے؟"

معاملے کی تہہ تک وہ پہنچ گئے۔ سارے گھر میں "اگر اور لوبان" کی تیز لپٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ کسی کسی کے دل سے یہ شک مٹا سکتے تھے۔ جبکہ ان کا دل بھی اچھی طرح مطمئن نہ تھا۔ انہیں بتایا گیا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے یہ حال ہے بلکہ یہ بو اور زیادہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ شروع شروع آپا زاہدہ کو یہ بو محسوس ہوئی۔ اس کے بعد آپا شمیم کو۔ آپا جان نے کافی دیر کے بعد غور کیا۔ پھر کیا تھا، گھر کا ایک ایک فرد ایک ساتھ حیرت زدہ ہو گیا! لوبان اور اگر کی بو اس زمانے کی ذہنیت میں بڑی خوفناک چیز سمجھی جاتی تھی۔ پرانے وقتوں سے پھوپھی جان اور چچی جان کے گھر میں بھی پہلی بار یہی قصہ اسی چیز سے شروع ہوا تھا۔ پھر پھوپھی جان بتاتی تھیں کہ کیا کہوں کیا کیا نہ دیکھنے میں آیا، خدا دشمن کو بھی یہ منظر نہ دکھائے! پائے کے پیچھے سے حسینہ نے ڈرتے ڈرتے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نرگس نے جلد ہی اس کا منہ بند کر دیا۔ ارے چپ! کیا اختر بابو سے نہیں ڈرتی؟ حسینہ کے آنچل سے لپٹی ہوئی اس کی چھوٹی بہن جو ہی زار و قطار رونے بھی جا رہی

تھی! یہ کیسا میلہ لگا ہوا ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو! اور نیوی صاحب کی طرف ایک
ڈانٹ کافی تھی۔ کچھ لوگ ادھر ادھر ہو گئے، لیکن ان کی بعض نیز کھسر پھسر ہنوز
قائم تھی۔ نگار، راز، سوز، سلطانہ اور صوفیہ ان میں سب سے
چھوٹی بہن شریر عذرا اپنی اپنی سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہہ
رہی تھیں

"باپ رے! جب سے بچارے دادا جان کا انتقال ہوا ہے۔
میں نے تو ان کے کمرے کی طرف سے آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے، دیکھو، دیکھو
یہی بو ہو بہو اسی قسم کی اس زمانے میں بھی ہر جگہ سے آتی رہتی تھی۔ صوفیہ
نے تائید کی لیکن سلطانہ کچھ دوسری دنیا کی باتیں سوچ رہی تھی۔ عذرا دل
سے کوئی خوفناک قصہ گڑھنے میں مشغول نظر آئی۔ پہلے کبھی جب کبھی میں
اس طرف سے گزری ہوں، تو مجھے شک سا ہوتا تھا، لیکن آج تو بھئی حد
ہو گئی، سب لوگوں نے خود ہی دیکھ لیا۔ سوز اپنی بقراطی بہر حال کئے جا رہی
تھی۔ امی جان اداس نظروں سے دیکھتی ہوئی سب لڑکیوں کو سمجھا رہی
تھیں کہ اس قسم کی باتوں کا یوں شور نہیں کیا جاتا۔ لیکن کیا معلوم کیا افتاد
پڑے؟ ابا جان کا چہرہ زرد تھا۔ اور آپا شمیم تو ڈر کے مارے بالکل
سفید ہو رہی تھیں۔ اور نیوی صاحب نے الگ الگ طور پر سب لوگوں
کے دلوں کی تشفی کرانی چاہی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ بہت زمانے سے تم
لوگوں کے تحت الشعور میں اگر اور لوبان کی بوئیں خوف و ہراس پیدا کرتی
رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت فضا میں اڑ کر یہ بو کہیں سے آ گئی ہے۔
اور اسے جتنا تیقن کے انداز سے محسوس کیا جا رہا ہے اسی قدر زیادہ
محسوس ہو رہی ہے، ورنہ کوئی بات نہیں! ایسا بھی ممکن ہے کہ درگاہ یا
کسی قبر پر لوگوں نے یہ چیزیں جلائی ہوں گی، ظاہر ہے کہ ہوا اسی طرف سے
آ رہی ہے۔ اور یہ اسی کا اثر ہو۔ اور نیوی صاحب کی عقل میں آنے والی
بات بظاہر لوگوں نے تسلیم کر لی، لیکن سچے دل سے ماننے کے لئے کوئی تیار
نہ تھا۔ وہ بچارے عجیب مشکل میں تھے۔ چہرے پر رنج و فکر کے گہرے اثرات
چھائے ہوئے تھے۔ مسکراہٹ بہت پیچھے اس وقت دور جا چکی تھی۔
لڑکیوں کی ٹولیاں آہستہ آہستہ منتشر ہونی شروع ہو گئیں۔ لیکن آپا
زاہدہ کو بڑے زور پر دھڑکن کا دورہ ہوا۔ ادھر بچارے اور نیوی صاحب
بھی ان کی رفاقت میں اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئے! بہت زور سے ان کو چکر آیا
اور ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا پی کر مایوس کن طور پر لیٹ گئے۔ دوسرے
دن اور تیسرے دن بھی کوئی چین سے نہیں رہ سکا۔ اگر، اور لوبان کے ساتھ
ساتھ کیوڑے اور گلاب کی خوشبوئیں بھی تمام فضاؤں میں پھیلی ہوئی
محسوس ہوئیں۔ گھر کے کل کمروں میں لوگوں نے بڑی عقیدت اور احترام
کے ساتھ قرآن شریف لے جا کر رکھے۔ امی جان کا یہ حکم تھا کہ رات کے وقت
کوئی کمرہ اندھیرا نہیں رہنے پائے۔ نمازیں جماعت کے ساتھ خوب پابندی
سے پڑھی جانے لگیں۔ ہنسی مذاق بالکل بند ہو چکا تھا۔ ساری لڑکیاں دم
بخود سہمی سہمی رہنے لگیں۔ بچے غریب سر شام ہی سے ڈر کے مارے سو
جاتے۔ ننھی شہلا سب لوگوں کی گود میں رہنے لگی تھی۔ اس کو بے حد ڈر
لگتا تھا۔ اپنی بھولی بھولی باتوں کو بھول کر وہ طرح طرح کے سوال کرتی۔
"آپی دان تہاں چھپے یہ بھوت آوے ہیں؟ دادا تے کمرے میں تون رہتا ہے؟"
غرضکہ وہ عجیب بوکھلائی ہوئی رہتی۔ ننھی سی ناسمجھ بچی بہت کچھ سمجھنے کے لئے
بے قرار سی ہو جاتی۔ اس کی آپی جان تھپک تھپک کے اسے سلا دیتیں
لیکن وہ نیند میں چونک چونک پڑتی۔ ایک دن آپا زاہدہ اور ابا جان کا مشورہ
ہوا کہ اس نئی مخلوق کو کیوں نہیں خط لکھ کر پوچھا جائے۔ کہ آخر ان کی کیا
خواہش ہے؟ اور نہ یہی کام کیا جائے! اور نیوی صاحب کو بنگلے پر سے بلا کر
یہ مشورہ سنایا گیا۔ لیکن وہ بچارے تو خود ہی چند روز سے سخت پریشان
پریشان نظر آنے لگے تھے۔ ہر وقت ایک گمبھیر اداسی ان کے چہرے پر
چھائی رہتی۔ اپنی نمازوں میں وہ دیر دیر تک دعاؤں میں مصروف
رہتے۔ انہوں نے بھی یہ بات پسند کی اور ایک خط جلد جلد خود ہی خوشخط
طور پر لکھ کر ابا جان کو دیا کہ دیکھو، کسی کو معلوم نہ ہو۔ چپ چاپ سے۔
جس کمرے میں تم لوگ مناسب سمجھو اس میں رکھ آؤ۔ خط میں "تو ناٹلی"
کے بعد انتہائی منت و سماجت کے ساتھ گھر چھوڑنے کی درخواست
پیش کی گئی تھی۔ نیز یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہاں کی لڑکیاں بہت زیادہ کمزور
دل کی واقع ہوئی ہیں۔ مہربانی فرما کر آپ اور کہیں تشریف لے جائیے، ویسے
ہم لوگ ہر وقت آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہیں۔" احقر الخلق۔ خط کو
نگار نے چپکے سے دادا جان والے کمرے میں لے جا کر رکھ دیا۔ لیکن جب وہ

واپس آئی تو اس کا پاؤں کانپ رہا تھا۔ اف بھابی جان کیا بتاؤں، بستر کے اوپر کسی کے بہت بڑے پاؤں کا دھبہ پڑا ہوا ہے۔ اس قدر بڑا پیر گھر میں کس کا ہو سکتا ہے؟ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

سب لوگ کمرے کی طرف امنڈ آئے۔ لیکن اندر جانے کی ہمت کسی کی نہ ہوئی۔ باہر ہی سے جھانک جھانک کر لوگوں نے مشکل سے دیکھا کہ ایک عجیب انسانی پاؤں کا سیاہ دھبہ صاف ستھری چادر پر قائم ہے۔

اب حالات بہت زیادہ تشویشناک ہو رہے تھے۔ ادریسی صاحب نے نہایت فکرمند لہجہ میں کہا۔ آثار اچھے نہیں نظر آرہے ہیں۔ اس طرح تماشہ بنانے سے کیا ہوگا؟ نجات کی تو کوئی صورت بہرحال سوچنی ہوگی! اور وہ فکر سے نڈھال ہو کر کانپتے ہوئے فوراً ہی اذان کے لئے کھڑے ہوگئے ان کی غم اندر رقت سے بھری ہوئی آواز گھر کی چہار دیواریوں سے گذر کر باہر کی فضاؤں میں ایک سنسنی پیدا کر رہی تھی۔ "اللہ اکبر" کا نعرہ جوش وخروش کے ساتھ بلند ہو رہا تھا جس کی گونج دور دور تک پہونچ کر شاید آسمانوں کو چھو رہی تھی۔ فرشتے بھی دم بخود ہو کر اس وقت حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں گے۔ ادریسی صاحب کی آذان ختم نہیں ہوئی تھی اور لوگوں کی عقیدت مندانہ نگاہیں بدستور ان پر جمی تھیں کہ اچانک امی جان نے گھبرا کر کہا۔ ارے لڑکیوں، دیکھو تو ادھر کیا چیز چھت سے آکر گری ہے؟ سب لوگ جھپٹ پڑیں۔ ہری ہری الائچیاں تھیں عطر اور گلاب میں بسی ہوئی۔ اباجان نے چند الائچیوں کے دانے ادریسی صاحب کے ہاتھوں میں رکھ دیے جسکو وہ بڑے شوق سے دیکھنے لگے۔ ہری ہری الائچیاں پھول کی طرح معطر، جیسے ابھی ابھی کسی نے جنت سے یہ نادر تحفہ بھیجا ہو! انہوں نے زیر لب کہا لیکن پھر بہت ہی جلد شاعری کا یہ خوبصورت اثر غائب ہوگیا۔ ادریسی صاحب بے چین نظر آئے۔ انہوں نے کئی بار زور زور سے لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ پڑھا۔

درمیان میں آپا جان لیکن بار بار کہتی جا رہی تھیں کہ یہ غلط ہے۔ یہ وقت لاحول پڑھنے کا نہیں ہے۔ بلکہ آپ کو خوش ہو کر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہنا چاہئے تھا۔ آپا جان کے اس طنز پہ وہ جل اٹھے۔ چند لڑکیوں کو ہنسی آگئی۔ لیکن وہ ادریسی صاحب کے ڈر سے اپنا اپنا منہ چھپا کر بھاگ گئیں

ہفتے گذر گئے تھے لیکن یہ عجیب و غریب کھیل جاری تھا۔ گھر کے تمام لوگ اب عاجز آکر تھک گئے تھے۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ، روز روز کوئی نہ کوئی پراسرار بات ضرور ہو جایا کرتی۔ آپا زاہدہ بتاتیں کہ جب کافی رات گذر جاتی ہے، تقریباً دو ڈھائی بجے، تو کسی کسی کمرے سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی۔ کبھی زور سے جیسے کوئی چیز چھن سے گر کر ٹوٹ گئی زیادہ تر کسی کی مدھم طور پہ سسکیوں کی آواز۔ ایک بار آپا جان نے بھی دیکھا کہ کوئی سفید سی شے دادا جان والے کمرے سے نکلی اور دوسرے آنگن کی طرف جانے والی راہداری میں اچانک غائب ہوگئی۔ اس وقت وہاں پر کافی اندھیرا تھا۔ آپا شمیم ہر وقت دل کو تھامے ہوئے بہت سنبھال کر خود کو سب لوگوں کے درمیان درمیان رکھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں کوئی چیز دیکھ لوں گی تو پھر فوراً ہی میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ نگار، راز، سوز، سلطانہ، صوفیہ، عذرا وغیرہ وغیرہ تمام دن اپنا اپنا ڈر مٹانے کے لئے ایک نئے پروگرام میں مصروف رہتیں۔ لیکن جیسے جیسے شام کا اندھیرا بڑھتا جاتا، ان لوگوں کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا جاتا تھا۔ ننھی شہلا آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے دن بھر اداس اداس سی خاموش رہنے لگی تھی۔

ایک دن بڑے زور کا شور ہوا۔ خط کا جواب آگیا۔ خط کا جواب آگیا۔ تمام لڑکیاں ایک زبردست چیخ مار کر ایک دوسرے سے چمٹ گئیں۔ کئی لڑکے بدحواسی میں ایک پر ایک گرنے لگے۔ دائی نوکروں کا ایک لمبا ہجوم دوسرے آنگن تک بھر گیا۔ لیکن ادریسی صاحب بڑے استقلال کے ساتھ ہاتھ میں ایک سفید کاغذ کا ٹکڑا لئے ہوئے، بیچ برآمدے میں کھڑے لوگوں کو مخاطب کرکے ان سے درخواست کر رہے تھے کہ مہربانی فرما کر آپ لوگ اس قدر شور مت کیجئے۔ ورنہ میرا دماغ بھی خراب ہو جائے گا۔ میں اب تک بہت ضبط کر رہا ہوں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میں بیمار آدمی ہوں۔ میرے لئے اس قسم کی بات کس قدر مضر ہے۔ لیکن سب کی سب بدحواس ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی اب تک لمبی لمبی سانسیں بھر رہی تھیں۔ آپا شمیم کو تو غش آگیا۔ ادریسی صاحب نے بہ ایک وقت کئی دعائیں جلد جلد پڑھنی شروع کر دیں۔ آپا شمیم کا خوبصورت چہرہ مارے خوف کے بالکل سفید ہو رہا تھا۔ اکثر لڑکیوں کی سسکیاں بندھ

گئیں۔ خط سننے سے کیا مطلب، خط کی طرف دیکھنے کے ڈر سے انہوں نے اپنی آنکھیں زور زور سے بیچ رکھی تھیں۔ لیکن امی جان کا بار بار یہ اصرار تھا کہ آخر تم خط پڑھو تو پہلے۔ دیکھنا ہے کہ آخر ہم لوگوں پر کیا مصیبت آئی ہے۔ بڑی بڑی مشکل سے اور رضوی صاحب نے اپنے تمام پریشان تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے خط بآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

خط بہت ہی خوشبودار تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زعفران اور صندل دونوں کے رنگ سے یہ عبارت لکھی گئی ہے۔ حروف اور اس کے تمام الفاظ بے حد شکستہ اور غیر مربوط تھے۔ انسان کی سمجھ سے بالکل باہر، ہزار کوشش کر کے بھی کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو جوڑ جوڑ کر کوئی ایک جملہ مشکل سے بن جاتا تھا۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ سمجھنا مشکل ہوا۔ بہت دیر تک سارے گھر میں ایک عجیب وحشت ناک سراسیمگی چھائی رہی۔ لڑکیوں کے چہرے پر خوف کی زردی صاف نظر آ رہی تھی۔ اور رضوی صاحب بے حد فکرمند ہو رہے تھے۔ چپ چاپ سے بلا کے امی جان کو انہوں نے کنارے لے جا کر کہا

"آپا جان! دیکھئے نہ معلوم خط میں کیا لکھا ہوا ہے، اور کس کسی کا مطالبہ ہے؟ وہ تو ایک الگ بات ہوئی۔ ہم لوگوں سے وہ عبارت نہیں پڑھی جا رہی ہے، ورنہ خطرہ بے حد پیدا ہو گیا ہے۔ نوکر چاکروں میں اس بات کا زیادہ ہنگامہ نہ ہو۔ ادھر ادھر جو خبر پھیلتی ہے، اس کا اثر خراب ہوتا ہے۔ آپ کسی کو اس قسم کی کوئی گفتگو کرنے نہیں دیں گی۔ نسبتی اس قدر قریب ہے۔ کیا معلوم بیچارے دولہا بھائی کی پوزیشن پر کیا اثر پڑے؟ گھر کے حالات پر اس کے کیا نتائج ہوں۔ آخر میں انہوں نے بہت آہستہ آہستہ کہا کہ آپ صدقہ، خیرات کے طور پر غریبوں میں کچھ روپے تقسیم کرا دیں تو اچھا ہے۔ دعاؤں کے لئے بزرگوں کو خطوط لکھئے۔ میں بھی لکھوں گا۔ ویسے بھی میں بہت زیادہ دعائیں کر رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی اپنی دعائیں جاری رکھئے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ ان الفاظ کو ختم کرتے ہوئے اور رضوی صاحب کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں چہرہ بیمار کی طرح اترا ہوا تھا۔ اور رضوی صاحب کی اس لمبی سرگوشی نے گھر میں ایک بے چینی سی پیدا کر دی تھی۔ سب لوگ اس فکر میں تھے کہ کب باتیں ہوئیں؟ لیکن ان کے دل بدستور دھڑک رہے تھے۔ آپا زاہدہ آپا شمیم اور آپا جان باوجود انتہائی طور پر خوف زدہ ہونے کے بھی کبھی کبھی اختر صاحب کی بے بسی دیکھ کر مسکرا پڑتیں!

دوسری لڑکیاں ایک دوسرے کو چھیڑ رہی تھیں۔ کہ تمہیں دادا جان والے کمرے میں سر کھولے ہوئے اس طرح بے ادبی سے نہیں جانا چاہئے تھا۔ لیکن نگار یہ الزام ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ اس نے اور یاد دلا دیا کہ اس روز ٹھیک جمعرات کا دن تھا اور شام کا وقت۔ سلطانہ اور صوفیہ دونوں نہا نہا کر بال کھولے ہوئے دیر تک چھت پر ٹہلتی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ رات آگئی اور خوب چاندنی پھیل گئی پھر بھی یہ لوگ چھت ہی پر رہیں۔ عذرا کو صرف سوز سے پرانی چڑھ تھی۔ وہ بار بار امی کا نام لگاتی کہ ہاں چھوٹی آپی بھی روز بہت اچھی اچھی خوشبوئیں لگاتی ہیں۔ ان کا مانگ تک بھی ہر وقت عطر کی خوشبو مہکتی ہے۔

شام کا جھٹپٹا تھا مغرب کی اذان سنتے ہی آپا شمیم، نگار، آپا جان اور ہم سب بہنوں نے بڑے احترام و عقیدت سے اپنے اپنے سروں کو آنچل سے ڈھانپا۔ نماز کی نیت تو کر لی مگر دل دھڑک رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلتا گیا اور گلی طرف سے پڑنے والے اینٹوں اور ڈھیلوں کی لڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سلام پھیرتے ہی ساری بہنوں نے آنکھوں آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا بھالا اور خوفزدہ سی سمٹی سمٹی لالٹین کی مدھم روشنی میں کمروں سے تیز چلتی آنگن میں آگئیں گرمی کے دن تھے۔ آنگن میں بچھے ہوئے پلنگوں کی سفید چادروں پر چاندنی کی یاسمین روشنی بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ مگر گھر بھر پر جو ایک خوف و ہراس چھایا ہوا تھا اس نے سب کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی تھی۔ اور رضوی صاحب گھر کے سارے لوگوں کے ساتھ آنگن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں لالٹین کی روشنی بڑی دور سے مدھم سی نظر آ رہی تھی۔ "اللہ اب کیا ہوگا۔ ؟" صوفیہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے تکتے ہوئے اچانک پوچھ لیا۔

آپا زاہدہ کا موڈ اس وقت بڑا اچھا نظر آ رہا تھا۔ کہنے

لگیں "یہ بیکار کے ڈھیلے، اینٹے برسانے کا کیا فائدہ ہے؟ میں تو سنتی آئی تھی کہ پہلے زمانے میں عمدہ سے عمدہ مٹھائیاں بھی برسا کرتی تھیں۔ آپا زاہدہ کہنے کو کہہ گئیں لیکن آپا شمیم اور نگار کے ساتھ ساری بہنیں سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ اچانک تیز خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور ایک ہی بار بار قسم قسم کی مٹھائیوں کی بارش ہونے لگی۔ بالوشاہی، اجلے اجلے پیڑے، اجلی اجلی امرتیاں اور کالے کالے رنگ کے سوکھے ہوئے شیرے والے رس گلے۔ بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اور آپا جان گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی تھیں۔ امی جان دبی دبی ہنسی میں بولیں

"بھئی! دیکھو تو، سچ مچ کی مٹھائیاں ہیں؟"

آپا زاہدہ کے ساتھ امی جان نے بھی ایک اکیا مٹھائی کو اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ اور ان کا دماغ معطر ہو گیا۔ ایک ہی ساتھ ان مٹھائیوں سے عنبر اور روز اور ایوننگ ان پیرس نے سینٹوں کی تیز بو کے ساتھ سہاگ اور عطروں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ بڑی فیاضی اور دریا دلی سے سینٹوں کی شیشیاں ان مٹھائیوں پر چھڑکی گئی تھیں۔

اب کیا ہوگا بچے اپنی آنکھوں کو موندے اوندھے منہ پڑے تھے۔ اختر صاحب نے سب سے پہلے گھٹنوں میں منہ دیئے آپا جان کو تسلی دلانی چاہی مگر وہ منہ چھپائے سسکتی ہوئی سارے جسم سے ہلتی ہوئی جلی جا رہی تھیں۔ نگار، آنہ، سوز، اور آپا شمیم ایک دوسرے کے آنچل پکڑے سہمی سہمی سی نظر آ رہی تھیں۔ امی جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا

"اب کیا ہوگا، یہ کہاں کی مصیبت جان پر آگئی ہے"

اختر صاحب نے سب کو باری باری سے تسکین دلانی چاہی۔ مگر خود ہی بڑے پریشان اور کسی بڑی الجھن میں گرفتار نظر آ رہے تھے۔ آخر سب لوگوں کا مشورہ یہی ہوا کہ دادا جان نے جس کمرہ میں انتقال فرمایا ہے اور جس جگہ زعفرانی رنگ کے خطرناک پاؤں کے خوفناک چھاپ بھی دیکھے گئے ہیں، ذرا جنات ماموں کو جگہ دیدی جائے۔ اختر صاحب اسی بند کمرے کے دروازے کے پاس گئے۔ امی جان سے لے کر ہم ساری بہنوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا بچارے

اور نبوی صاحب اپنے بھوتوں اور جنوں کے اندھیرے میں ایمان کی بس ایک ہی لو کرن تھا۔ پھر ہم ایسے وقت میں ان کو کہاں چھوڑ سکتے تھے۔

اور نبوی صاحب نے پہلے کمرے کے دروازے کے پاس جا جا کر سلام علیکم کہا۔ اور پھر ایک بڑی پرجوش اور فصیح تقریر کی۔ جس میں حضرات جن کو پر امن طور پر ہدایت کی گئی تھی اور اسلام کی تازہ روشنی کی خبر سنائی گئی تھی۔ اور نبوی صاحب نے جنوں کو اتنے پر اثر الفاظ میں سمجھایا تھا کہ گھر بھر کو بڑی تسلی اور تشفی حاصل ہوئی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ لیکن یہ تکلیف دہ ڈرامہ ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ اب طبیعت گھبرا چکی تھی۔ امی جان سخت بیزار رہنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اسی طرح واقعات ہونے چلے جائیں گے تو اختر صاحب بہت بری طرح پھر بیمار ہو جائیں گے۔ اور واقعی وہ سبھوں سے زیادہ اثر لے رہے تھے۔ ہر وقت پھول کی طرح شگفتہ رہنے والا چہرہ رنج و فکر سے مرجھا کر بالکل زرد ہو گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ کافی کمزور اور دبلے سے نظر آنے لگے تھے۔ ایک نامعلوم قسم کی الجھن ہر وقت انہیں پریشان بنائے رکھتی۔ اپنی صحت سے زیادہ انہیں ننھی منی بہنوں کے دلوں کا خیال تھا۔ اتنی نازک نازک سی لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا؟ یہ عذاب کیوں آیا؟ اور یہ کس طرح دفع ہوگا؟ دن رات یہی فکر انہیں گھلائے ہوئے تھی۔ ہفتوں سے کسی نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ گھنٹوں وہ اپنی نمازوں میں رو رو کر اس سے نجات کے لئے دعائیں کرتے۔ اذانیں اب دن بھر میں کئی بار پڑنے لگی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مکان میں صرف خوفناک بھوتوں اور بھیانک آسیبوں کا ایک پڑاؤ اتر آیا ہے۔ ہر طرف بھوت ہی بھوت، جس جگہ صرف رنگین قہقہوں کے ساز تھے، وہاں اب یہ حال تھا کہ ڈراؤنے سائے، کوئی غیر انسانی حرکت، قدموں کی چاپ، اور ایک عجیب سرسراہٹ، رقت آمیز دعائیں، دل ہلا دینے والی اذانیں۔۔ وغیرہ وغیرہ خود بخود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برف جیسی ٹھنڈی اور تیز ہوا سنسناتی ہوئی کان کے پاس سے گزر گئی۔ اپنے سایوں سے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کوٹھے پر باغ کے ہر طرف، کسی تنہا گوشے میں لوگوں نے جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ گھر کے بوڑھے ماموں پیر بخش اور

دہشت کا سا بلکہ ساتھ ساتھ ایک کپکپا دینے والا اثر نمایاں محسوس ہوتا۔ لیکن آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ان کے پیچھے کون سی حقیقت کارفرما تھی

اور نیوی صاحب بچارے کے معصوم شاعرانہ جذباتی تاثرات بالکل مختلف یہ ایک الگ بات تھی۔ شعر و ادب کی رنگین وادیوں میں سیر و تفریح کر چکنے کے بعد محترم جنات صاحب کی ملاقاتوں کے تجربے انہیں سخت گراں گزرے۔ ان کے خوبصورت فہم و ادراک پر بجائے حسین رومانوی تاثرات قائم رہنے کے ان دنوں سخت ناخوشگوار سہمے اور نئے نئے انکشافات کی بڑھتی ہوئی ہیبت ناکیاں پورے طور پر مسلط تھیں۔ بچارا شاعر حیران حیران تھا۔

آخر کار ایک رات جبکہ کافی سناٹا ہو رہا تھا، سب لوگ گہری نیند میں بے خبر سو رہے تھے، کہ آپا جان اپنے بستر پر سے اٹھ کر چپکے سے گھبرائی ہوئی آئیں اور آپا زاہدہ کو جگا کر کہنے لگیں کہ اختر صاحب کو بہت دیر سے دھڑکن ہو رہی ہے، اور وہ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اب کیا ہوگا؟؟ آہستہ آہستہ دونوں بہن کسی سخت الجھن میں گرفتار سی اور نیوی صاحب کے متعلق مشورے کرنے لگیں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس سنگین معاملے کو کس طرح سلجھایا جائے گا! دیر تک آپا زاہدہ سوچتی رہیں اور کافی غور و فکر کے بعد انہوں نے اپنا فیصلہ دیدیا کہ بس کل "ڈراپ سین" کر دیا جائے گا! اب جو اس کے نتیجے میں ہو۔ لیکن کل خاتمہ ہے۔ پھر بھی ان لوگ کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ آپا شمیم ابھی ہی سے کانپ رہی تھیں کہ کس کے ذمے یہ کام دیا جائے گا؟ مجھ سے تو نہ ہوگا! رات بھر تینوں بہنوں کو گھبراہٹ سے نیند نہیں آئی۔ صبح کا آغاز جیسے پھانسی کی خبر لانے والا ہو۔ اور نیوی صاحب کے ساتھ ان لوگوں کے دل پر بھی سخت دھڑکن کا دورہ پڑا۔ لیکن جان بچنے والی نہیں تھی۔ آپا زاہدہ کا حکم اٹل تھا۔ حالات مذاق سے بڑھ کر اب خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ یہ چیز اب مصیبت بن گئی۔

دوسری صبح آگئی اور نیوی صاحب کا چہرہ رات کی تکلیف کی وجہ سے اداس تھا۔ لیکن وہ آج پھر بھی اپنی پرانی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ آپا جان کی ہمت بڑھی اور سب لوگوں کا چہرہ بھی خوشی سے کھل گیا۔

وقت کی موزونیت سے فائدہ اٹھانے کے خیال سے آپا زاہدہ کے ذہن میں فوراً بات کا یہ پیغام یاد آیا۔ آپا زاہدہ، آپا جان اور آپا شمیم نے انہیں گھیر گھار کر بڑی دلچسپیوں کے انداز میں اپنی گفتگوؤں کے سلسلے چھیڑے۔ آپا شمیم کا دل پھر بھی دھڑک رہا تھا۔ لڑکیوں کو رات کی کاروائی کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اور وہ اس ہونے والے حادثے سے بچنے کے لئے خود کو کہاں کہاں چھپائے پھر رہی تھیں۔ امی جان کو انتظار تھا کہ نہ معلوم اختر پر کیا گزرے۔ رفتہ رفتہ آپا جان گفتگو کو اصل مطلب کی طرف آئیں اور پھر بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ ماحول اور فضا کو سازگار بناتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اور نیوی صاحب سے وہ سب کچھ کہہ گئیں۔ یہ جنات کا کرشمہ ایک ڈرامہ تھا جس میں بڑے بوڑھوں سے لے کر بچے تک اداکار بنے ہوئے تھے۔ کہنے کے بعد سب لوگوں پر ایک عجیب سکتہ طاری تھا۔ اس عجیب انکشاف نے ان کی جذباتی اور احساس طبیعت کو کس حد تک ٹھیس پہونچائی۔ اور ان کے شاعرانہ دل و دماغ کس قدر مجروح ہوئے۔ نہیں معلوم۔ لیکن ہم لوگوں نے صرف یہی دیکھا کہ وہ آپا جان کے پاس سے نہایت خاموشی سے اٹھ کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

کئی دنوں تک پھر اور نیوی صاحب کو کسی نے اپنے کمرے سے باہر نہیں دیکھا۔ آپا زاہدہ اور آپا شمیم سے آپا جان کو اکثر آہستہ آہستہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے پایا جس کے بعد تینوں کافی اداس ہو جایا کرتیں۔ ایک دن آپا زاہدہ کہہ رہی تھیں کہ اختر صاحب کو ہم لوگوں سے کافی رنج اور تکلیف پہنچی ہے، وہ بے حد خفا ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم نے جان کر میری زندگی اور میری صحت کے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ میرا مذاق اڑایا، مجھے ذلیل کیا وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے آپا جان سے بالکل بات بھی کرنی چھوڑ دی تھی۔ بچاری آپا جان تمام دن یونہی غمگین سی رہا کرتیں۔

چند سال اور ان کے ساتھ ہم لوگوں کے بڑے رنگین اور دلچسپ گزرے۔ بچپن کے مذاق کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اور نیوی صاحب کی شخصیت کچھ کچھ ہم لوگوں کے دلوں کو بھی متاثر کرنے لگی ۔ اور کبھی کبھی ہم لوگ

بھی انہیں ایک "مشہور اور قابل ادیب" ماننے کے لئے دل سے تیار ہو جاتے۔ لیکن ایک اچھے استاد کے سامنے جو نومشق شاگردوں کی صورت ہوتی ہے۔ اسی سے بالکل برعکس ہم لوگ اور تنویری صاحب ہی کے خلاف سخت احتجاج بلند کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ اور وہ ہمیشہ اسی دلیرانہ شوخلیو لاپرہ ہنس دیا کرتے۔

اور تنویری صاحب تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنی شہرت کی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور ہم لوگ اپنی خوبصورت دنیا میں محو۔ زندگی کو مختلف گلستانوں میں حسین حسین پھولوں سے سجا رہے تھے۔ تمام دنیا ایک چمکتے ہوئے بلور کے آئینے کی طرح نظر آتی جس کے ہر ذرے میں نئی نئی شکلیں ابھرتیں اور نئے نئے صبح و شام اور نئی زندگیوں کے آغاز کا رقص جھومتا ہوتا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کا فرقہ وارانہ فساد شروع ہوا۔ زندگی کی بنیادیں ہل گئیں۔ "نیو مارکیٹ" اور پام ولا دونوں کانپ گئے۔ باغ ویران ہوگیا۔ قمریوں نے گانا چھوڑ دیا۔ کلیاں مسکرانے سے قبل مرجھا کر رہ گئیں۔ تمام فضا غم آلود ہوگئی۔ فطرت نے خزاں کے گیت چھیڑ دیے مسرتوں کی حسین رقاصہ مغموم ہوگئی۔ اس کے پاؤں تھم گئے۔ گھنگھروؤں کی چھن چھن بند ہوگئی۔ اس کے تمام خواب ٹوٹ کر ادھر ادھر خلاؤں میں بکھر گئے۔ اور وہ غم اور آنسوؤں کے بوجھ سے نڈھال ایک نامعلوم سرزمین کی طرف روانہ ہوئی۔

کہاں جا رہی ہے؟ اسے نہیں معلوم۔ وہ ایک ایک قدم مشکل سے اٹھا رہی ہے۔ لیکن ہر قدم پر اپنی بے پناہ دشواریوں کا احساس ہو رہا ہے۔ اُس سے اس کا پیارا وطن چھوٹ رہا تھا، اسکی زندگی چھوٹ رہی تھی۔ ماں باپ کا پیار چھوٹ رہا تھا۔ بچپن کے گھروندے چھوٹ رہے تھے سہیلیاں چھوٹ رہی تھیں۔ مسرتیں گلے مل مل کے خیرباد کہہ رہی تھیں اور ان سب کے ساتھ ہی اس کا پیارا ہندوستان بڑے دکھ کے ساتھ اسے آشیرباد دے رہا تھا۔۔۔!

جاتے جاتے اس نے آخری بار آنسوؤں سے بھری ہوئی نگاہ، پیچھے مڑ کر ڈالی۔ بہاریں بہت پیچھے چھوٹ چکی تھیں۔ اور اداس چاند دور کی گھاٹیوں کے پیچھے آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔

نگار خانے خالی ہو چکے، حساس شاعر افسردہ تھا۔ اُسکے تمام شیشے جالے، وقت کے بے رحم ہاتھوں نے نوچ ڈالے۔ وہ فطرت کا سچا فنکار تھا۔ اور اُس نے فطرت سے مانگ کر مختلف رنگوں کی ایک خوبصورت دنیا سجالی تھی۔ لیکن یہ حسین تعمیر حیات مسمار کر دی گئی۔ اُسے ماضی کی چند سسکتی ہوئی یادیں ملیں۔

صبح بہار کی جب سب سے پہلی کرن مسکراتی ہوئی اس کی رنگین خوابگاہ میں داخل ہوتی۔ تو شاعر مسرتوں سے کھل اٹھتا۔ رات کے تمام رومانوی لمحے اس کے ذہن میں نغموں کی طرح ایک ہلکی سی گونج پیدا کر دیتے اور وہ اپنی لطیف گنگناہٹوں سے ساز کے سوئے ہوئے تاروں کو بیدار کر دیتا۔ نغمے اس کے اپنے نہیں تھے۔ گذری ہوئی بہاروں کی چند دلنواز ساعتیں تھیں۔ جنہیں زندگی نے بڑی مشکل سے چرا لیا تھا۔ جب رات کی طویل تنہائیوں میں خوبصورت چاند، چپکے سے اس کے پاس آجاتا اور تمام رات دور دور کی رنگین کہانیاں اُسے سنا سنا کر بڑے پیار سے تھپک کر سلا دیتا۔ تو شاعر بے خبر سو رہا تھا۔ لیکن اس کی پوری کائنات جاگتی ہوتی۔

اور تنویری صاحب، اس بھری دنیا میں اب تنہا تنہا سے نظر آنے لگے۔ اُن کا شاداب اسکی تاریخ چہرہ خواب و خیال بن گیا تھا۔ ہر وقت وہ فکرمند سے لگتے! ساحل سمون کے نظارے اب نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کی جگہ ہولناک کی بڑھتی ہوئی گہری تاریکی تھی۔ اور اندھی سیاستیں۔ وہ خود کو ان دنوں بے حد پوک دسر گرداں محسوس کر رہے تھے۔ ابھی جب کبھی بڑا سے سنگم پیاں سے میری ملاقات ہو جاتی ہے تو میں مسکراکر ان سے یہی کہتی ہوں کہ "نہ معلوم آپ کو کسی نے اس قدر زبردست علامہ بنا دیا ہے! ورنہ میری نظر میں تو آپ سے بڑھ کر اور کوئی بیوقوف "نہیں"۔"

وہ مخصوص طور پر ہنس دیا کرتے اور مجھے بچھڑی ہوئی پرانی باتیں یاد آجاتیں ــــــ

●●

بیگم آفاق شرف عظیم آبادی

اختر صاحب میری نظر میں

یہ شاید ۳۸ء کی بات ہے جب میں نے سب سے
پہلی بار اختر صاحب کو لکھنؤ میں اپنے مکان کی ایک کھڑکی سے
جھانک کر دیکھا تھا۔ اُس وقت شرف صاحب میرے دور کے ایک
عزیز تھے۔ یہ کسی انٹرویو کے سلسلہ میں پٹنہ سے دہلی گئے تھے۔
اور واپسی میں چند دنوں کے لیے لکھنؤ اتر گئے تھے۔ انھوں نے اپنے
چند دوستوں سے شاید یہ طے کیا تھا کہ ان کی دلّی سے واپسی
پر یہ سب ان سے لکھنؤ میں ملیں گے۔ مگر کسی وجہ سے شرف
صاحب کو دہلی میں دیر ہوگئی اور ان کے تینوں دوست یعنی اختر
صاحب، علی اظہر صاحب اور یحییٰ صاحب ان سے پہلے لکھنؤ پہنچ
گئے۔ یہ چاروں حضرات اپنے کسی دوست کے ہاں ٹھہرنے والے
تھے۔ مگر جب شرف صاحب کو اسٹیشن پر نہ پایا تو باقی تینوں نے
میرے گھر کا رخ کیا کہ شاید یہ یہاں مل جائیں۔ میرے والد
مرحوم باہر ہی بیٹھے تھے۔ دیکھا کہ تین مسافر منڈلا رہے ہیں۔
اس لئے ان کو بہت ترس آیا اور انھوں نے ان سب کو اپنے
یہاں بلا کر بٹھایا اور جب معلوم ہوا کہ یہ سب شرف صاحب کے
دوست ہیں تو ان کے ساتھ مزید محبت سے پیش آئے۔ اتنے میں
شرف صاحب بھی دلّی سے آگئے۔ انھوں نے ان سب سے کہا کہ "کل
آپ لوگ کھانا یہیں کھائیں۔" لیکن چونکہ ان لوگوں کو دوسرے
ہی دن پٹنہ واپس جانا تھا، اسلئے سبھوں نے معذرت چاہی۔ چلیے
بات ختم ہوگئی، لیکن دیکھتے کیا ہیں کہ دوسرے دن سب کے سب
پھر چلے آرہے ہیں۔ بعد میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ جب یہ
لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس گئے تو خیال آیا کہ اس دعوت کو چھوڑنا
نہیں چاہیے تھا۔ ان لوگوں نے پٹنہ کی واپسی کا پروگرام ملتوی کیا
اور اس وقت محض اسی منصوبہ کے ساتھ آئے تھے کہ کسی طرح کوئی
ایسی تمہید شروع کریں کہ میرے ابا ان لوگوں کو پھر کھانے پر بلالیں
یہ بہت ہی نازک مسئلہ تھا اور اس کام کے لیے ذہانت کے علاوہ
تھوڑی سی بے حیائی کی بھی ضرورت تھی۔ اظہر صاحب اور یحییٰ صاحب
کافی ذہین ہیں، مگر بس ذہین ہی ہیں۔ اسکے علاوہ جس چیز کی

ضرورت تھی اسلئے اہل صرف اختر صاحب ہی تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنا پارٹ ادا کیا۔ بڑے معصوم بنتے ہوئے ابا سے کہنے لگے

"حضور واپس جانے کے بعد ہم لوگوں کو بڑی ندامت ہوئی کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہ ہوسکی۔ بھلا ہم لوگوں کی کیا مجال ہے کہ آپ کی کسی خوشی کو بھی نظر انداز کریں۔ باوجود اسلئے کہ ہم لوگوں کو اب فوراً پٹنہ پہونچنا ہے لیکن محض آپ سے معافی مانگنے کے لئے ہم لوگ دو روز اور رک گئے ہیں۔"

اس دو روز کے رک جانے میں بھی ایک خاص مصلحت تھی اسلئے کہ اگر یہ کہہ دیتے کہ معافی مانگنے کے بعد اب بالکل ہی واپسی کا خیال ہے تو ڈر تھا کہ کہیں ابا یہ نہ کہہ دیں "نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں کی مجبوریوں کو میں سمجھتا ہوں۔ خیر پھر جب لکھنؤ آنا ہو تو آپ لوگ بلاتکلف میرے ہی ہاں ٹھہریں۔" ظاہر ہے کہ یہ دعوت تو جاتی ہی اور پھر آئندہ کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ اختر صاحب نے بعد میں بھی تو بتایا کہ خاطر و مدارات کسی لڑکے اور اس کے دوستوں کی اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اسکی شادی نہیں ہوتی ہو ورنہ شادی ہو جانے کے بعد کون کسی کو پوچھتا ہے۔ چنانچہ اختر صاحب اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے یعنی ابا نے اپنی دعوت کی تجدید کر دی۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اسی کا تو انتظار تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز دعوت ہوئی اور اس میں اختر صاحب نے جو جو یادگار حرکتیں کیں وہ ہم سب کبھی نہیں بھول سکتے۔ لکھنؤ والوں میں تکلف بہت ہوتا ہے، اور وہ اپنے مہمانوں سے بھی یہ امید کرتے ہیں کہ زیادہ نہیں تو کم سے کم کچھ تو تکلف ضرور کریں گے۔ مگر توبہ کیجئے، یہاں تو عجیب لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ شرف صاحب بے چارے اپنے مستقبل کو دیکھتے ہوئے ایک حد تک (گرچہ مصنوعی ہی سہی) تکلف سے کام لے رہے تھے اور ان کے علاوہ اطہر صاحب اور یحییٰ صاحب نے بھی اس کا لحاظ رکھا تھا کہ غیر جگہ آئے ہیں تو ذرا اپنے کو بنائے رہیں، لیکن بھلا اختر صاحب کہاں رکنے والے تھے۔ وہ اسی وقت اپنے صحیح رنگ میں نمایاں تھے۔ کھانے میں انہوں نے ترتیب کا بالکل خیال نہیں رکھا۔ ماموں جان صاحب نے اُن سے بہتیرا کہا کہ آپ بسم اللہ پلاؤ سے کریں لیکن اختر صاحب کو شیرمال سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ایسی صورت میں ان کو پھر مشورہ دیا گیا کہ شیرمال بالائی کے ساتھ کھائیں جسطرح ہر سمجھدار آدمی کھاتا ہے۔ لیکن اختر صاحب کو اصرار تھا کہ وہ شیرمال کباب کے ساتھ کھائیں گے اور بالائی کو صرف بالائی کے ساتھ۔ اس موضوع پر کافی بحثیں ہوئیں۔ لیکن بھلا ان سے کون جیت سکتا تھا۔ ان کا تو یہ کہنا تھا کہ یہ کس کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ آپ شیرمال صرف بالائی کے ساتھ کھا سکتے ہیں، دہی کے ساتھ نہیں کھا سکتے"؟؟ بہرحال لکھنؤ کی ساری روایتیں اپنی جگہ پر رکھی رہیں اور اختر صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی پکے بہاری ہیں۔

ہاں، تو میں نے جب پہلی بار ان کو جھانک کر دیکھا تو بڑی بری رائے قائم کی۔ عرصے سے سنتی آرہی تھی کہ یہ بڑے اچھے افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ اسلئے امید کی جاتی تھی کہ انکی وضع و قطع بھی صحیح معنوں میں ادیب کی ہوگی یعنی یہی کہ اگر سوٹ پہننے کی صلاحیت نہیں تھی تو کم سے کم شیروانی ہی ڈھنگ کی پہن لی ہوتی، مگر وہاں تو انداز ہی نرالا تھا۔ کہنے کو تو پتلون بھی تھا اور کوٹ بھی لیکن مجموعی طور پر اسے سوٹ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ٹائی کی جگہ پر انہوں نے اپنے قدوقامت کے لحاظ سے ایک بہت ہی طویل قسم کا مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ اچھے خاصے چہرے پر ایک بے ڈھنگی سی کمانی کا چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ جس کے اندر سے دو بڑی بڑی شریر آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ میں نے دل میں کہا "ارے توبہ، یہی اختر صاحب ہیں جنکا اتنا ہنگامہ تھا" اس وقت میں خود شرف صاحب کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے والی تھی۔ اسلئے کہ انسان تو اپنی صحبت ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ جس کے دوست ایسے ہوں وہ ظاہر ہے کہ خود بھی ویسا ہی ہوگا۔ مگر بڑی خیریت ہوئی کہ اختر صاحب نے دسترخوان پر اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ میں نے

اور میرے ساتھ میری ہم عمر لڑکیوں نے جب دوسرے کمرے سے چھپ کر ان مہمانوں کی گفتگو سنی تو پھر یہی اختر صاحب اپنی اسی وضع قطع میں ہم سب کو بہت اچھے نظر آنے لگے۔ ان کے قہقہے اور اسی کے ساتھ ہی ان کے چبھتے ہوئے فقروں نے محفل میں جان ڈال دی تھی۔ میں نے بھی اسکے بعد ان کے متعلق اپنی رائے بدل دی اور یہ ماننے کے لئے تیار ہو گئی کہ یہ واقعی بے حد دلچسپ چیز ہیں۔ لکھنؤ سے واپسی پر اختر صاحب نے اپنے تاثرات نظم کئے جس کا عنوان تھا " نذرِ بتانِ لکھنؤ "۔ اس میں بے چارے نے بڑی ایمانداری سے کام لیا تھا۔ مجھے بعد میں یہ سنکر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ اس سفر میں ان کو فرنگی محل کی لڑکیوں کے ہاتھوں بڑی سخت شکست ہوئی تھی۔ جب وہ اپنی پارٹی کے ساتھ اس محلّے میں کسی دوست کے ہاں مجاز سے غزلیں سن رہے تھے اور نمک پارے بھی کھا رہے تھے تو کسی طرف سے آواز آئی

" مجاز صاحب، نمک پارے ہمیں بھی کھلائے۔"

اختر صاحب نے جواب دیا

" وہیں سے فاتحہ پڑھ لیجئے "

یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ فوراً جواب ملا

" کسی کی عقل پر پڑھوں؟ "

بس اسی ہی نے بچارے کو " نذرِ بتانِ لکھنؤ " لکھنے پر مجبور کر دیا۔

شرف صاحب اپنے دوستوں کے معاملے میں کافی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ ان کے گنے گنتی کے چند دوست ہیں لیکن سب کے سب اپنی اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر واقعی بہت ہی خوب ہیں۔ اور ان میں بھی جہاں تک میں نے دیکھا اختر صاحب کا ایک مخصوص مقام ہے۔ آج سترہ سال سے یہ دونوں دوست ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے ہیں۔ لیکن آج بھی جب اختر صاحب کا نام آجاتا ہے تو شرف صاحب کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں یہ شاید اختر صاحب کا خلوص اور انکی سچی محبت ہے۔ جواب تک ڈیڑھ ہزار میل سے بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ شرف صاحب تو خیر ان کے بہت پرانے اور عزیز ترین دوست ہیں۔ اسلئے ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے اعمال سے اچھی طرح واقف ہوں گے لیکن میں نے بھی اختر صاحب کو کافی دیکھا ہے اور یہ کہہ سکتی ہوں کہ قدرت نے ان کو چند چیزیں ایسی دے رکھی ہیں، جنکی بنا پر یہ اس زمانہ کے عام انسانوں سے نمایاں طور پر بلند ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو ان کا بے پناہ خلوص ہے جس سے کوئی بھی ہو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ظاہری طور پر ایک انتہائی بے ڈھنگا انسان پھر بھی ہر شخص کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں ان دنوں کو کبھی نہیں بھول سکتی جب انہوں نے ہماری شادی کے بعد ہم دونوں کو اردل آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ پام ولا " میں چند دنوں کا قیام مجھے اپنی زندگی میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ بقول شرف صاحب " اردل ایک ایسا گاؤں ہے جہاں سے رومان کی بارش ہوتی ہے۔" واقعی وہاں کی فضائیں جو رنگینیاں میں نے پائیں ان کی مثال پھر کہیں بھی نہیں مل سکی۔ کتنی دلفریب جگہ ہے اردل اور پھر کیا بہن نے گھر کا ہر فرد بھی کتنا دلکش اور دلچسپ ہے۔ اختر صاحب خفا تو ہوں گے لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ خود ان کو اتنا دلچسپ بنا دینے میں بھی اردل کی رومانی فضا اور وہاں کے رہنے والیوں کو کافی دخل ہے۔ وہ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ ہی سے وہ ایسے ہی دلچسپ تھے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ارے وہ تو ایک نرے دیہاتی قسم کے کسان تھے جہاں ان کے تعلقات انسانوں سے زیادہ بیلوں اور بھینسوں سے رہے ہوں گے۔ دعا دیں وہ شکیلہ بہن کو جنہوں نے ان کے " پام ولا " کی چار دیواریوں کے اندر کچھ ایسی رنگینی فضا پیدا کر دی جس سے اختر صاحب کو راجہ اندر بننے میں بڑی آسانی ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی زبردستی راجہ اندر بن جائے تو بیچاری معصوم گوپیاں کیا کر سکتی ہیں۔ ان کو مجبوراً پریم کا راگ الاپنا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال، باوجود ان سہولتوں کے جو اختر صاحب کو قدرت نے مہیا کر دی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں خود بھی اپنا رنگ جمانے کی صلاحیت کافی زیادہ موجود ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۴۶ پر)

زندگی فانی ہے اور محدود، ہم لوگ اس بیکراں کائنات میں زمان و مکان دونوں اعتبار سے بے حد حقیر ہیں۔ عظیم سمندروں کی موجوں پر رات کو گرنے والا شبنم کا ایک قطرہ بھی اتنا بے بضاعت نہیں جتنی ایک آدمی کی زندگی ہوتی ہے۔ حیات کی روانی میں ایک خفیف سا اثر پڑتا ہے۔ اور بہت جلد یہ انگنت لہروں میں مکمل طور پر گم ہو جاتا ہے۔ اسی فنا اور عدم کے آبِ گہرے سے بچنے کے لئے ہمارے دل غیر فانی ہونے کی آرزومندی میں دھڑکتے رہتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں وسعت و ابدیت پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ ہم قطرے سے ہم بننا چاہتے ہیں، ہم بڑھنے اور پھیلنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ ہم اپنے آفاق بڑھاتے رہتے ہیں اپنا دائرۂ احساس و عمل وسیع کرتے ہیں۔ ناقابل فراموش بننے کا ارمان رکھتے ہیں۔ ہم درد فنا سے بچنا چاہتے ہیں۔ محدود ہونے کے دکھ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوستداری انسانوں کی نفسی، ذہنی اور جذباتی ضرورت ہے۔ دوست ہمارے لئے دبیضا بھی ہیں اور عصا بھی وہ آئینے بھی اور شجر سایہ دار بھی ہیں۔ ہمارا حقیر ذرہ دوستوں سے مل کر بیکراں صحرا بننا چاہتا ہے۔ قطرہ سمندر بن کر موازج ہونا چاہتا ہے اور ندی کنارے اگنے والی گھاس کی ایک پتی کی طرح احباب کے دریائے رواں میں جھانک کر اپنے وجود پر یقین کو محکم بناتا ہے۔ اپنے حدود خال پر نازاں ہوتا ہے اور کسی کی "عنایت کی نظر" ہونے تک اپنے کو ایک خوبصورت اور دلنواز فریب میں مبتلا کئے رہتا ہے۔

میں ماضی کے پردوں کو اٹھا کر دیکھتا ہوں تو پاتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ دوستداری اور پاسداری پسند کی۔ لیکن اس باب میں وضعداری اور احتیاط کا بھی قائل رہا ہوں۔ میرے احباب کی بہت بڑی تعداد ہے ان میں فرق مراتب بھی رہا ہے اور ان کے مختلف دور بھی گزرے ہیں۔ اس جہان فانی میں کس چیز کو قرار اور ثبات ہے۔ نہ دوستی کو اور نہ محبت کو تاہم ناتواں دلوں پر کچھ گہرے نقوش بن جاتے ہیں تو مٹائے نہیں مٹتے کم از کم نجی احساسات کی دنیا میں یہ گذران رنگین لمحات ابدی سے بن جاتے ہیں۔

بچپن میں میرے گاؤں کے دوست مجھے بہت عزیز تھے میں نے مکتب میں پڑھا تو نہیں ہاں ختم قرآن شریف کے لئے چند ہفتے گاؤں کے مکتب میں اسلئے بٹھایا گیا تھا کہ حافظ صاحب کو کچھ انعام و اکرام مل جائے۔ اس عرصہ میں بھی میرا ایک مخلص دوست پیدا ہو گیا وہ ایک غریب لڑکا تھا اس کا نام بھی اختر تھا، وہ مجھے اپنے گاؤں بوہارے مرغی کے انڈے اور گاجر مولیاں وغیرہ لاکر

دیا کرتا تھا اور میں اسے تلی، حلوے، باسمتی چوڑہ اور بسکٹ کھلایا کرتا تھا۔
بہت دنوں تک ہمارا تعلق قائم رہا، میں شہر چلا گیا وہ ڈگری کے لیے کلکتہ
چلا گیا۔ زمانہ نے ہماری محبت کو اپنی گرد کے نیچے چھپا دیا۔ عین عنفوانِ شباب
میں اختر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ گاؤں میں شام کے وقت ہم لوگ
کبڈی کھیلا کرتے تھے اور دوپہر کو بزرگوں سے چھپ کر ویران کھنڈروں
میں تاش بھی کھیلتے تھے، ان بچوں میں حلیم، موتی اور غنی میرے خاص
دوست بن گئے۔ میری دادی اماں اور والدہ بہت ہی مہذب،
محتاط اور مذہبی تھیں۔ وہ پسند نہیں کرتی تھیں کہ میں گلی کوچوں، آم
کے باغوں اور کھنڈروں میں مارا پھروں لیکن ان دوستوں کی صحبت
میں وہ کشش تھی کہ میں پاسبانِ عقل سے جان چھڑا کر کبھی کبھار تو ضرور
بھاگ نکلتا یا احباب ہی میرے گھر کے کسی محفوظ گوشہ میں آکر تاش واش
کھیل لیتے تھے، حلیم چند سال قبل فوت ہوگئے، موتی ارضِ پاک کی طرف
ہجرت کر گئے، پتہ نہیں کس حال میں ہیں، غنی اب تک اودین میں ہیں۔
میں جب اودین جاتا ہوں تو وہ مجھے ایک بانگ دیتا ہوا مرغ یا تڑپتی ہوئی
مچھلی یا خوشنما سفید انڈے لاکر دیتے ہیں۔ غنی ایک مثالی کسان ہیں، اپنے
خود سے کھیتی کرتے ہیں، ہل چلاتے ہیں، بوجھ ڈھوتے ہیں اور بیلوں کے
ساتھ نہایت مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں غنی یا تو میں تمہارا دوست
ہوں یا بیل۔ وہ کہتے ہیں ہاں ایک گدھا اور بیل میرے دوست ہیں۔
ہم اب بھی گلے میں ہاتھ ڈال کر گاؤں کی گلیوں میں چلتے ہیں۔ کھیت کے
منڈیروں پر بیٹھ کر ککڑی کھاتے ہیں۔ لڑکپن کے دن یاد کرکے ہنستے ہیں۔
اور ایک دوسرے کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ غنی نے اب ایک بیٹری ریڈیو
لے لیا ہے۔ اور ماشاءاللہ اب وہ لتا منگیشکر کے گانے بھی سن لیتے ہیں۔
میں کہتا ہوں اپنی بیوی سے ملاقات کراؤ، غنی شرما جاتے ہیں۔ اب تک
یہ ارادہ حاصل نہیں ہو سکا۔ غنی کو میں نے پٹنہ بلایا، ایک دوبار وہ خود بھی
آئے، اپنے لڑکے کی ملازمت کیلئے وہ کوشاں تھے، میں نے کہا بھائی
خدا چاہے۔ یہ نوکری تو ہو جائے گی، چلو سینما دیکھیں، غنی بولے بُری عادت
کیوں لگاؤں، اودین میں کون سینما دکھلائے گا، سنا ہے ایک دفعہ
چھپ کے انہوں نے کہیں مونگیر وغیرہ میں کچھ ایسا ہی ویسا سینما دیکھ لیا
تھا۔

مونگیر اسکول میں میرے کئی دوست تھے، سید نیل کنٹھ،
سلیمان، روبی...... اسلم اور جماعت تھی ان احباب کی اب
تو بہتوں کے نام بھی یاد نہیں۔ ہاں ان میں سے چند میرے بہت
قریب رہے اور اب تک وہ میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں
روبی، مونگیر ضلع اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے فرزند ارجمند تھے
وہ ان دنوں کہیں کلکٹر وغیرہ ہیں۔ رسم و راہ اب نہیں رہی۔ اک دور
تھا کہ ہم اور سید حسن صاحب اسکول کے احاطے میں جا بیٹھتے تھے
روبی ہمارے درمیان ہوتے تو سید حسن روزِ اول ہی سے اول آتے
رہے تھے۔ روبی بھی سید حسن کے بعد ان کے کلاس کا اچھا لڑکا تھا
سکنڈ ہوتا تھا۔ میں ان سے ایک کلاس آگے تھا، اور میں بھی کبھی
سکنڈ کبھی تھرڈ اور گاہے فرسٹ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ ہم تینوں
فلاطونیت کی عملی مشق کرتے تھے۔ کبھی خاموش بیٹھے ہیں، کبھی کچھ نقلیں
کر رہے ہیں، کبھی تقریر کی مشق ہو رہی ہے۔ یہ شغل مہینوں جاری
رہا، سید حسن صاحب آج بھی میرے رفیق ہیں اور ہم لوگ اپنی گذری
ہوئی فلاطونیت پر خوب ہنستے ہیں، نیل کنٹھ اور دیا ناتھ انجینئر بن گئے،
دیا ناتھ سے میرا مقابلہ تھا، لیکن وہ طباع قسم کا لڑکا نہایت شریف
لڑکا تھا، نیل کنٹھ کے گھر میں حساب پڑھنے جایا کرتا تھا، وہاں رامیشور
بابو ایک ماسٹر تھے وہ ہم دونوں کو حساب سکھایا کرتے تھے، نیل کنٹھ
نہایت کم سخن اور شرمیلا لڑکا تھا، آج بھی ہماری آمد و رفت جاری ہے
وہ ایک صوفی مزاج، سفید مُنہ، دردمند انجینئر بن گئے ہیں، ان کے ساتھ
بڑا حادثہ ہوا، ان کا ایک جوان اکلوتا لڑکا، سوئمنگ پول میں اوپر سے
کودتے ہوئے حادثتاً مر گیا۔ دیا ناتھ جھا بھی انجینئر ہیں اور پٹنہ میں ہیں
سید حسن صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور سلیمان
صاحب پٹنہ میں ڈیولپمنٹ کمشنر ہیں۔ اور دوسرے نہ جانے
کہاں کہاں بکھر گئے۔

۱۹۲۶ء میں میں سائنس کالج پٹنہ میں داخل ہو گیا، میں دیا ناتھ
جھا اور نیل کنٹھ تینوں سائنس کے اسٹوڈنٹ بنے اور سلیمان آرٹس کے۔

ہمارے تعلقات اور ملاقاتیں جاری رہیں خصوصاً سلیمان سے۔ اور شکر ہے کہ وہ تعلقات اب تک اخلاص کے ساتھ جاری ہیں سلیمان میں بہت محبوبیت پائی جاتی ہے۔ وہ اسکول میں بھی سرخ و سپید رنگت کے نہایت خوبصورت شخص تھے، بہت شرمیلے، بہت نفیس، نہایت لطیف، ان کے والد صاحب صرف میرے ساتھ ان کو اسکول جانے کی اجازت دیتے تھے، ہم دونوں ایک ساتھ اسکول آیا جایا کرتے تھے، آج بھی سلیمان صاحب سے احباب کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسی طرح گل نوشگفتہ کی طرح نظر آتے ہیں، آرائش مکان کا نہایت اچھا ذوق ہے، لباس کا سلیقہ، بات کرنے میں نرم خوئی، تعلقات میں شیریں مزاجی آج بھی قائم ہے۔

سائنس کالج میں بھی میں نے چند ہی دوست بنائے، ایک لطف الرحمٰن جو اندنوں سی ایم کالج دربھنگہ میں پروفیسر ہیں۔ دوسرے ابوالخیر جو معاشیات کے طالب علم تھے۔ اور تیسرے ستار جنہیں ہم لوگ "گوبو" شیکسپیر کا ایک کردار کہتے تھے۔ میں گوبو اور لطف (لطف الرحمٰن) بڑے گہرے دوست تھے، سائنس کالج سے ہر گھڑی ساتھ رہتا تھا اس طرح ہمارے روابط بڑھتے جاتے تھے، ابوالخیر مرحوم ہو چکے ہیں، ستار پاکستان چلے گئے تھے وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی اور فوت ہو گئے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ ابوالخیر مرحوم معاشیات کے طالب علم تھے اور ادب پر مرتے تھے، ہم لوگ آدھی رات تک ساتھ مل کر نگارستان پڑھا کرتے تھے اور ایک ایک منظر سے وہ لطف اور حظ اٹھاتے تھے جیسے وہ طبق لگا ہوا انگور ہے، حلوہ کا ایک لقمہ ہو یا لب محبوب ہو۔ ابوالخیر لا کالج میں تھے کہ ان کو ایک گل کتنے کاٹ لیا اور ان کی جواں مرگی آج بھی ہمیں خون کے آنسو رلاتی ہے۔ ہم چاروں منٹو مسلم ہوسٹل میں رہتے تھے، ڈے بورڈرس میں میرے ایک صاحب گہرے دوست ہے، محمد ایوب۔ زندگی ایک سیل رواں ہے، ایوب بھی مرحوم ہو گئے اور ان کا غم اس قدر گہرا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ لڑکپن میں ساتھ رہے، جوانی میں ہم گذری اور کہولت میں بھی ادب و زندگی کے مختلف مرحلوں پر ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھتے رہے۔ ایوب صاحب نہایت ہی کامیاب وکیل بنے اور ریاستی انجمن ترقی اردو بہار کے تاریخ آفریں صدر رہے۔ میں اور ایوب دونوں ڈاکٹر کارڈویل صدر شعبۂ علم کیمیا کے نہایت چہیتے شاگرد تھے۔ ایوب کیمیا کے مضمون میں کلاس میں ہمیشہ فرسٹ ہوتے تھے اور میں سکنڈ۔ ڈاکٹر کارڈویل مسلمان لڑکوں سے بہت شفقت کا برتاؤ کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ علم کیمیا مسلمانوں کا پیدا کردہ اور پروردہ علم ہے، یونان والے تو صرف نظریاتی باتیں کیا کرتے تھے، عرب مسلمانوں نے سائنس کو عملی اور حقیقی بنایا اور علم و حکمت کی دنیا میں بے انتہا ترقی کی۔ کارڈویل صاحب کئی کئی روز اپنی تمہیدی تقریروں میں عرب علماء کے فضائل بیان کرتے اور ان کے ایجاد کئے ہوئے آلات دکھلایا کرتے۔ ابن حیان کا نام اتنے اکرام سے لیتے تھے جیسے وہ اُن کے ملک کا بادشاہ ہو۔

عجب بات ہے کہ ہم میں سے بہتوں نے سائنس پڑھا لیکن وہ آخر الامر زندگی کے ان شعبوں کی طرف چلے آئے جو براہ راست سائنس سے تعلق نہیں رکھتے۔

ستار گوبو بھولی بھولی شکل گوری رنگت کا نہایت ہی خوش مزاج مگر کم سخن نوجوان تھا۔ ۱۹۲۶ء کے اواخر اور ۱۹۲۷ء کے اوائل میں بزم سخن سائنس کالج کا آغاز ہوا۔ آرزو جلیلی مرحوم اس کی روح رواں تھے۔ ہر مہینہ نشست ہوتی تھی، ایک دفعہ پروفیسر عبدالمنان بیدل صاحب نے مصرع طرح دیا ع

گیسوؤں کو سلجھانا نیں بل کھ... [illegible]

گیسوؤں کو سنو جو بڑھا نا چھوڑ دے

میری نوشقی کا آغاز اسی وقت سے ہوا۔ گوبو نے کہا کہ بھائی میرے لئے بھی غزل لکھو۔ میں نے حالات ہوسٹل پر تضمین کا تجزیہ لکھ دیا۔ اور اس میں عجیب عجیب قافئے لائے گئے تھے، گوبو نے اسے بزم سخن کی نشست میں پڑھنا شروع کیا لیکن جب نازک مقام آیا تو پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل نے آنکھیں دکھائیں۔ ستار نے منہ پھیر کے دو تین شعر اور پڑھ ڈالے۔ بیدل صاحب کی ڈانٹ پڑی تو گوبو پیچھے بنچوں پر جا بیٹھے۔

بات بہت دور تک پہنچی، ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے ستار
مرحوم کے والد بزرگوار کو لکھا۔ وہ تشریف لائے، ستار کی بڑی
سرزنش ہوئی اور یہ طے پایا کہ وہ بُری صحبتوں میں پڑ گئے، انہیں
باز آنا چاہیے۔ بہر حال وہ تعویذ بہت مشہور رہا۔ اس قصیدہ
کا دوسرا روپ چند سالوں بعد فارسی زبان میں ظاہر ہوا
اور تماشے ہوئے۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء کے اوائل تک میں میڈیکل کالج ہوسٹل
میں رہا۔ اسی دور میں میرے کئی نئے دوست ہوئے، ظفر حسن
رضا، شیتل، ونجے، داس، مبارک، قمر احسن وغیرہ۔ میرے ہمکمرہ
ظفر اور حسن رضا تھے۔ بڑے مخلص لوگ، کئی سالوں تک ہمارے
تعلقات قائم رہے۔ لیکن جب میں ۱۹۳۱ء میں پٹنہ کالج چلا آیا تو
میڈیکل کالج کی دوستیاں مدھم پڑ گئیں۔

میڈیکل کالج نہایت دلچسپ جگہ تھی۔ اور وہاں کا ہوسٹل
تو ایک ادارۂ آزادی تھا۔ اور وہاں کے کامن روم میں برائیں تک
ٹھہری ہاریں۔ اسٹڈی پیریڈ، گھنٹی، سپرنٹنڈنٹ کا راؤنڈ،
پریفیکٹ، فائن وغیرہ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بڑے بڑے
جغادری ہوسٹل میں رہتے تھے، سامنے اسپتال تھا، بیچ میں میدان
ایک سرخ لیٹر بکس کے گرد علی الصباح اینگلو انڈین نرسیں جمع
ہوتی تھیں، اپنے سادہ و رنگیں خطوط روانہ کرنے کے لئے ہوسٹل کی
بالائی منزل پر سینیئر کلاسوں کے عاشقان بیقرار جمع ہو جاتے تھے۔ ایک
صاحب نہایت شاندار طور پر مرغ کلاں کی طرح بانگ دیتے
تھے، لیکن واقعی نقل کا کمال تھا، سارا اسپتال گونج جاتا تھا، معلوم
ہوتا تھا کہ کوئی عظیم الشان مرغ بڑے جوش و خروش سے بانگ
دیتا ہو، لڑکیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں۔ ہر چند ہم جونیئر
کلاس کے طلبا کہ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل میں سے تھے۔
تاہم نہ کوئی نصیحت کرنے والا تھا اور نہ ہمارے پاس گوش نصیحت
نیوش تھے۔ ہم سب لوگ پرورش آرزو کرتے رہے، میں ان
دنوں طلبا میں پیر مستی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ میرے کمرے
کے لڑکے جب کبھی شب خون مارنے نکلتے تھے تو مجھ سے چھپ
کے جاتے تھے اور مجھے قطب سمجھ کر طلوع سحر سے بہت پہلے
واپس آجاتے تھے۔ جب کبھی کوئی راز کھلتا تو وہ ایک اور
دوست کے ذریعہ کھلتا جو باہر رہتے تھے، لیکن کیا عرض کروں
پیر مستی بھی ناکردہ گناہوں کی حسرت لیے بیٹھے تھے۔ میڈیکل کالج
کے طلبا جب فورتھ ایئر میں جاتے تھے تو حسن بن صباح کی
جنت میں ان کا گذر ہوتا تھا۔ میں تو فورتھ ایئر میں داخل ہی نہ ہو
سکا۔ تھرڈ ایئر میں تھا کہ بیمار پڑا اور میڈیکل کالج چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

محمد نواب، قمر الہدیٰ اور انعام احسن کی بہت اچھی تگڈم تھی۔
یہ لوگ مجھ سے ایک کلاس جونیئر تھے، خوب چائے پیتے تھے خوب
پڑھتے تھے اور بعد میں وادیٔ رومان میں خوب گلگشت بھی کرنے لگے
ان تینوں کو ادب کا بہت اچھا شوق تھا۔ انعام احسن، حضرت
احسن مارہروی کے بیٹے تھے، قمر الہدیٰ ارول کے رہنے والے اور
میرے رشتہ داروں میں سے تھے۔ نواب بھگا پہاڑی کے رئیسوں
کے رشتہ دار تھے اور واقعی نواب تھے۔ لیکن بڑی سادہ،
معصوم، ایثار پسند طبیعت کے مالک تھے۔ انعام احسن
کے پاس اردو شاعری کی ایک اچھی بیاض تھی۔ ہم لوگ خوب
اس بیاض سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور انعام احسن ہکلا ہکلا کر
سناتے تھے۔ ان کی ہکلاہٹ نے وادیٔ رومان میں خوب شگوفے
کھلائے۔ اور میڈیکل کالج کی زمین زعفران زار بنی رہی۔ قمر الہدیٰ انہی دنوں
ایک محبت کے مثلث کے رکن تھے۔ یا شاید مربع تھے۔ دو تین لڑکیاں
ان سے محبت کرتی تھیں۔ اور وہ انعام احسن سے شعر مستعار لے
لیکر اپنی عاشق لڑکیوں کو خط لکھا کرتے تھے۔ عندلیب شادانی اور
پریم پجاری دونوں ایک ہی رنگ میں اچھے شعری اور ادبی کاموں میں
نے قمر صاحب کی بڑی مدد کی۔ یہ شعر میرے کانوں میں ابھی تک
گونجتا ہے۔ ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

بے تکلفی، قرب اور دوستداری کی اعلیٰ ترین منزلیں شرف کے خطوں میں طے ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شرف عظیم آبادی تھے نہایت کٹر، ٹھیٹ، سچے ہوئے عظیم آبادی۔ اور میں اورینوی دیہقانی، لیکن ہم میں خوب نبھی۔ شرف کا حال یہ تھا کہ ہم لوگ شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھے کتاری کھانے کا انتظام کر رہے ہیں اور کھانا شروع کر دیا۔ انہیں ایک اشارہ دی گئی تو پہلے بڑے غور سے دیکھتے رہے پھر بے کسی سے ہم لوگوں کی طرف دیکھا اور بے چارگی میں اگلے دو دانتوں سے کتاری کی ڈنٹھل سے نوشی فعلیاں کرنے لگے۔ میں انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ کچھ دیر بعد کہا میاں دانت ٹوٹ جائیں گے۔ دیکھو چوتے سے کھاؤ اور بتا کر کہا یوں کھاؤ۔ شرف ہنس پڑے، کہنے لگے میاں ہم لوگ گنے کی گنڈیریاں کھاتے ہیں، یہ بھی کوئی بھلے مانسوں کا طریقہ ہے۔ گنے نہیں ڈنٹھے کھاتے ہیں، معاف رکھو یہ طور طریقے تم دیہقانیوں ہی کو مبارک ہوں۔

شرف ایک بار میرے ساتھ ادرین گئے۔ ان دنوں ہم لوگ بکھرا اسٹیشن پر اترا کرتے تھے اور وہاں سے تین میل کھٹولی یا بیل گاڑی یا گھوڑے سے ادرین جاتے تھے۔ ہم اسٹیشن پر اترے، باہر نکلے کھٹولی رکھی ہوئی تھی اور ایک ہی تھی، نیچے بھی بچھاون بچھا ہوا تھا۔ اور کھٹولی پر بھی باقاعدہ دری اور کمبل بچھے ہوئے تھے۔ شرف نے کبھی ایسی مشری دیکھی نہیں تھی۔ کہنے لگے اختر تم نیچے بیٹھو۔ میں اوپر بیٹھ کر چلنا پسند کروں گا وہ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے آخر بمشکل ان کو قائل کرنا پڑا کہ ہم دونوں نیچے ہی ایک ساتھ بیٹھیں گے۔ ادرین ایک گڑھ پر واقع ہے اور پاس میں پہاڑی ہے۔ بودھ پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ گاؤں کی گلیوں میں بھی بڑا نشیب و فراز ہے۔ واپسی میں دو کھٹولیاں تھیں، میں الگ اور شرف علٰحدہ۔ میرے بنگلے کے پاس سے چڑھائی شروع ہوئی۔ آگے کہار بلندی پر چڑھ رہے تھے اور کھٹولی زاویہ میں آ گئی۔ شرف میاں کی کھٹولی آگے تھی میں پیچھے تھا۔ دیکھا کہ شرف صاحب ڈھک گئے، پیچھے اور تھوڑا گرا کر اکڑوں، کھٹولی کے ایک حصہ میں بیٹھ گئے، وحشت زدہ، میں نے پکارا، کہا ڈرو، ذرا تھوڑی آزمائش کا وقت ہے۔ شرف نے بڑی رقت مگر غصہ سے جواب دیا تبرک پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ چڑھائی ختم ہوئی اور اتار ڈھلوان شروع ہو گیا۔ شرف صاحب دوسری طرف لڑھک گئے۔ اور پھر ایک نعرہ مارا لعنت ہو تم لوگوں پر۔ آخرش یہ کوہان ختم ہوا اور چورس سڑک آ گئی۔ شرف کی جان میں جان آئی۔ راستے بھر ہم لوگ بلند آواز میں خوش گپیاں کرتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔

شرف ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے، اس سے پہلے وہ کلکتہ اور دلی میں رہے اور پٹنہ میں ایک زمانہ گزارا۔ ان کا گھر ہم سب لوگوں کے لئے دارالامان تھا۔ آج بھی ہم لوگ گردنی باغ کے اس کوارٹر کو دیکھتے ہیں جس میں شرف رہتے تھے تو دل پگھل جاتا ہے اور آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں۔ وہ میرے دوسرے احباب سے بھی بڑے مخلصانہ طور پر گھل مل گئے۔

۱۹۳۶ء میں میڈیکل کالج واپس نہیں آیا بلکہ پٹنہ کالج میں نام لکھایا۔ ہمارے استاد ادیبوں کی رائے ہوئی کہ میڈیکل کالج کی تعلیم اور پیشہ در طب کا پیشہ بہت گرانبار ہوتا ہے۔ بڑا صدمہ ہوا مجھے۔ میں نے پٹنہ کالج میں انگریزی آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں نام لکھایا اور مسلم ہوسٹل میں رہنے لگا۔ یہاں احباب کا ایک نیا حلقہ پیدا ہوا۔ حلقے کی زنجیر میں کچھ کڑیاں ایسی تھیں جو اب تک گلے کا ہار ہیں۔ اور کچھ ایسی کہ ٹوٹیں اور بکھر گئیں۔ مسلم ہوسٹل میں میرا حلقہ اے۔ ایم۔ رضا نقوی، زبیر احمد تمنائی، رافع الہدیٰ، عباس، شکیل اور شاہجہان کے دم سے قائم تھا۔ باہر کے لوگوں میں شرف عظیم آبادی، کچی نقوی اور بعد میں علی اطہر وغیرہ تھے۔ انہیں دنوں میری دوستی بچن دت سے بھی ہوئی جو معاشیات کے بہترین طالب علم تھے۔ ان کے علاوہ کلاس کے اور بہت سے نوجوان میرے دوست بنے مثلاً چودھری مجیب، مرتضیٰ اور چند اور احباب بھی۔ بچن دت بہار میں مالیات کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور بہت دنوں تک رہے اور اب وہ دہلی

میں ترقی کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں، بہت ہی لانبا قد، ان پر ایک منچلے نے .... ایک پیروڈی لکھی تھی "ہیگوورس کا تیسرا سفر" بہت عمدہ گپ کرتے ہیں، بنگالی ہیں لیکن نفیس ہندوستانی زبان استعمال کرتے ہیں۔ دوستداری میں تو کمال ہے، وقت ضائع کرنے اور دوسروں کو اسی امر کی ترغیب دینے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ پتہ نہیں فرسٹ کیسے ہوتے تھے۔

مسلم ہوسٹل کی ٹولی اور اس کا پیروڈی "ٹکملا" میرے احباب کی تاریخی ٹولی ہے۔ بڑی گذران شخصیتیں گذری ہیں۔ اور بفضلہ بہت سی اب تک زندہ ہیں۔ ہوسٹل میں شاید ہم لوگوں نے غیر شعوری طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ پڑھنا لکھنا ساڑھے بائیس، نہایت ادبی قسم کی شرارتیں اور اعلیٰ درجہ کی بے ادبی روزانہ ہوا کرتی تھیں۔ ذریعہ اللہ دریائے گنگا اور ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ تھے۔ عموماً میرے کمرے میں مجلس جمتی تھی، شاہجہاں صاحب جو آج کل ایم ایل اے ہیں، اس مجلس کو نورتن اختری کہتے تھے۔ اور میں انہیں "ان سین" کہتا تھا۔ بہت اچھا گاتے تھے۔ اب بھی اسی طرح نہایت برمحل اشعار پڑھتے ہیں۔ ڈرامہ کے استاد آغا حشر کے سامنے بھی زانوئے ادب تہہ کیا، ان کی موسیقی کے کئی ریکارڈ بھی لئے گئے۔ سدا بہار آدمی ہیں، ان کا امتحان دوسرے لوگ دیا کرتے تھے، کوئی ان کی طرف سے نفسیات پڑھ رہا ہے، کوئی انگریزی، کوئی اردو۔ میری قسمت میں ان کی طرف سے اردو کی تیاری کرنی تھی۔ رافع اللہ مرحوم انگریزی پڑھ دیا کرتے تھے، سائیکلوجی کوئی اور پڑھتا تھا لیکن اس کا ایک باب نیورولوجی میرے سپرد تھا! اسی لئے کہ میں میڈیکل کالج سے آیا تھا۔ ان کمالات کے ہوتے ہوئے وہ بی اے پاس کر گئے۔ انگریزوں نے انہیں خان صاحب بنایا۔ میں تو ان کے لئے خان بہادری کا مرتبہ بھی ہاتھ کا معمولی کھیل سمجھتا ہوں۔ رضا نقوی بیک وقت بیربل بھی تھے اور ملا دوپیازہ بھی۔ اور آپ جانئے ان کی "بیربلی" اور "دوپیازیت" اب تک قائم ہے۔ مزاح و ظرافت کے وہ زعفران زار تھے اور زعفران زار ہیں۔ مجلس احباب کے وادیٔ کشمیر۔ طنز و تبسم اور واہیات کے مصنف۔ دبلے سوکھے سے آدمی (اب قدرے روغن چڑھ رہا ہے) سانولا رنگ کمرخی گال، روشن تیز آنکھیں، اوسط قد، تیز چال، جھرنے کی طرح گفتگو، آپ خیر سے موگری دوڑ میں ہمیشہ اول آتے تھے۔ چھریرا بدن، بڑا تیکھا نقشہ، برق بلا تھے۔ اور اب تک بجلی ہیں۔ انہوں کے لئے بلا، بہنوں کے لئے لطف و وفا۔ ہوسٹل کی شرارتوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہتے، ان دنوں ترقی پسند سنجیدہ نظمیں بھی کہتے تھے اور طنزیات و مضحکات بھی تصنیف فرماتے رہتے تھے۔ بہت ہی مخلص آدمی ہیں لیکن لوگ ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ ساعروں میں وہ طلباء تک کو ڈانٹ دیتے ہیں اور نثر میں ڈانٹنے کے بعد نظم میں بھی ڈانٹتے ہیں۔

یحییٰ نقوی باضابطہ بیربل کا پارٹ ادا کیا کرتے تھے بہت ہی مرغ قسم کے آدمی تھے۔ اب تک کراچی میں زندہ ہیں۔ باغ و بہار بھوٹا قد مگر بلا فتنہ و فساد، بیچارہ اس قدر [illegible] ہے کہ آپ کی اہلیہ کبھی آپ کو [illegible] سمجھتی ہیں۔ اور [illegible] بار شریف کے ساتھ میں علی اطہر اور یحییٰ نقوی لکھنؤ گئے اور فرنگی محل سے لیکر اصغر علی محمد علی کی دکان تک کی سیر کی۔ ڈولیہ گنج، بلوچ پورہ اور نخاس میں مارے مارے پھرے، احمدیہ دار التبلیغ امین آباد پارک میں ایک شب گذاری لیکن صبح کی نماز کے ڈر سے بھاگے۔ اور مختلف مقامات میں پناہ گزیں ہوتے رہے۔ ڈولیہ گنج میں شریف کی سسرال تھی۔ دریچوں سے ان کی سسرال کی ساری لطافتیں نزاکتیں، شیرینی اور نغمگی زندگی افشاں ہوتی تھی۔ حیات اللہ انصاری صاحب کے خلوت خانے کی بالائی چھتوں سے کبھی بہت ہی روح پرور آوازیں آتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ساری حیات پرور اور روحانی خوش آوازیاں یحییٰ کو مرغ کے نام سے پکارتی تھیں۔ آج تک ہم لوگ انہیں مرغ کہتے ہیں۔ یہی جناب یحییٰ المتخلص بہ مرغ عظیم آبادی نورتن کے بیربل تھے۔ انہوں نے سنجیدہ نظمیں بھی خوب خوب لکھی ہیں، بڑے ذہین و ذکی آدمی ہیں۔ نگار

میں ان کی ایک نظم چھپی تھی "اعتراف"۔ نیاز صاحب نے تعریفی
خط لکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی زوجیت میں آنے کے بعد ملازم ہونا
شروع ہوگئے، تازہ حال احوال معلوم نہیں۔ تقسیم ملک نے دنیا کو
بھی آخرت بنا دیا۔ نہ شرف کی خبر نہ سرخ کی۔ نہ اظہر و تمنائی کی۔ یہ
چاروں اُسی دیس میں جا رہے۔ کبھی کبھار شرف ایک آدھ ہرا
بھرا خط لکھ دیتے ہیں تو زندگی، دوستی اور محبت پر از سر نو اعتبار
قائم ہو جاتا ہے۔

رافع الہدیٰ مرحوم تاریخ کے طالب علم تھے۔ نوروتن کے
ابوالفضل نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ تاریخ پر گہری، سچی
اور تحقیقی نظر رکھتے تھے۔ اردو میں مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔
اور افسانے بھی "چچا پھولن" ان کا ایک افسانہ نیرنگ خیال لاہور میں
شائع ہوا تھا۔ اس میں افسانویت بھی تھی۔ مزاح لطیف بھی اور
مقامی رنگ بہت ہی شگفتہ طور پر نکھرا ہوا تھا۔ بہار کے مسلم قصبات
کی تہذیب۔ ہوسٹل میگزین کے لئے انہوں نے ایک نہایت ہی
شگفتہ انشائیہ لکھا تھا۔ مخفی کے نام سے اس میں سیرتی خاکے
غضب کے چست کئے گئے تھے۔ سلاست اور روانی کی تحسین ہوتی
تھی۔ وہ ایسے کیا زندہ دل آدمی تھے نہایت متین، لیکن اس کی
مزاحیہ فطرت طلوع سحر کی طرح نرم روشنی پھیلاتی تھی۔ میں نے
اپنی زندگی میں ایوب مرحوم اور رافع مرحوم جیسا مخلص، تقی، دانشمند
قابل اعتبار ذہین، قومی و ملی احساسات سے سرشار، خوش اور
مجلس آرا شخص نہیں دیکھا۔ دوسروں میں چند خوبیاں ہوتی ہیں، ان
لوگوں میں ساری خوبیاں اکٹھا تھیں۔ رافع اور ایوب صاحبان کی
وفات کے بعد میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا دو تہائی
دور ختم ہوگیا اور میں محض ایک ثلث زندہ ہوں۔ رافع ڈپٹی مجسٹریٹ
بنے، کلکٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ پنشن پر ریاستی حکومت
میں سکریٹری کا رہے اور یہیں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے
فوت ہوئے۔ ایوب مرحوم بھی حرکت قلب بند ہونے سے فوت
ہوئے۔ ان دونوں کو اور کوئی بیماری نہ تھی مگر دیکھا بیماری دل ـ
اتنے توانا دل والے لوگ بھی یوں مر جاتے ہیں۔ بڑے جری تھے
یہ لوگ۔ مظلوموں کی مدد میں ہیٹ رہے ـــــ لیکن ـــــ الٹی ہو
گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔

دیکھا اس بیماری دل نے کام تمام کیا

عباس سائنس کالج سے پٹنہ کالج آئے تھے۔ سائنس راس نہ آیا۔ سوشل
سائنس کے اسٹوڈنٹ بنے۔ اقتصادیات میں آنرز لیا اور پٹنہ کالج
میں پڑھنے لگے۔ میری اور عباس کی خوب بیٹھتی تھی کہ ہم دونوں
سائنس سے اکھڑے ہوئے تھے اور اب آرٹس کے دامن میں پناہ
لے رہے تھے۔ عباس کو سائنس کی بڑی باخبری تھی، نہ جانے کس
طرح انہیں سائنس راس نہ آیا۔ ہماری یونیورسٹیاں بھی تعصب
سے پاک نہیں ہیں۔ اور ہمارے تعلیمی ادارہ کی تقدیس میں ایک
آدھ ایسے تنگ نظر مل جاتے ہیں جن سے فضا مسموم ہوتی ہے۔
ڈاکٹر گیان چند عباس کو بہت چاہتے تھے اور سرن بھی۔
عباس مغل دربار کے مصوروں کی طرح بہت عمدہ تصویریں بناتے
تھے۔ کیریکچر بنانے میں کوئی ان کا جواب نہیں تھا۔ مجھے بھی ان دنوں
تصویر بنانے کا ذوق تھا۔ میں واٹر کلر سے مناظر بناتا تھا۔ اور
وہ چارکول، پنسل اسکیچ کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک تصویر بنائی
جس میں اونٹ، کھجور کے درخت اور اہرام پس منظر میں تھے۔ عنوان
دیا "فی الارض القلوپترہ" عباس نے کیریکچر بنائے، ایک پرنسپل
بی۔ او۔ دھوٹے لاک کا، ایک پروفیسر سرن کا اور ایک ڈاکٹر علی
حسن صاحب سپرنٹنڈنٹ مسلم ہوسٹل کا۔ پہلے وہ سیدھے
پرنسپل صاحب کے پاس گئے، وہ بہت خوش ہوئے اور کیریکچر
پر دستخط کر دئے۔ ہوسٹل میگزین شائع کرنے کی تیاریاں
ہو رہی تھیں۔ سرن صاحب نے بھی بڑی خوش دلی سے دستخط
کئے۔ لیکن یہ مغربی تہذیب کی دوستی تھی۔ ڈاکٹر علی حسن صاحب
کو جب ان کا کیریکچر دکھلایا گیا تو بہت جز بز ہوئے اور عباس
کو ہوسٹل سے نکالنے کی دھمکی دی، لیکن جب عباس نے پرنسپل
صاحب اور پروفیسر سرن صاحب کے کیریکچر پر دستخط دکھلائے

تو علامہ کے غصہ کا تقابلی عروج شروع ہو گیا اور وہ جھلا کر بولے جائیے میں دستخط نہیں کرتا۔

کیا عرض کروں خدا ہم لوگوں کو معاف کرے، ڈاکٹر علی حسن صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے۔ بہت اچھے آدمی تھے لیکن بعض انسانی کمزوریوں کی وجہ سے لڑکوں کے درمیان ان کے خلاف ہمیشہ ایک لہر رہی لیکن زندہ دلانہ موج اور کچھ بھی نہیں۔ بڑے بڑے لطیفے ہوئے جن میں بیشتر قصور ہم ہی لوگوں کا ہوا کرتا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ قیامت میں علامہ ہمارے دامنگیر نہ ہوں گے کیونکہ اس دنیا میں بھی وہ آخر کار تھوڑی سزا دینے کے بعد معاف ہی کر دیا کرتے تھے۔ میں خود جب اس ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہوا تو ایک دفعہ عباسی مجھ سے ملنے آئے وہ پولیس آفیسر ہو چکے تھے۔ (فی الحال وہ ڈی، آئی، جی، سیکورٹی ایسٹرن رینج ہیں اور کلکتہ میں مقیم ہیں) انہوں نے اس کمرہ کا معائنہ کیا جو سپرنٹنڈنٹ کی کرسی ہوا کرتی تھی۔ اسی کمرے میں گئے، بڑے اظہار خوف کے ساتھ مجھے دیکھا، بنظر غائر، اور بہت ہی متوحش انداز میں پوچھا تم سپرنٹنڈنٹ کب سے ہو گئے۔ وہ سارے جرائم یقیناً تم میں سرایت کر چکے ہوں گے جنہوں نے ہماری زندگیاں غارت کر رکھی تھیں۔ کمبخت اب تو تم سے ملنا بھی خطرناک ہے۔ پھر ہم لوگ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے، ہوسٹل میں گلگشت کیا، ان تمام کونوں اور زاویوں کا جائزہ لیا جہاں آزاد طالب علمی کے دن گذارے تھے۔ اور شرارتیں کی تھیں۔ پھر ہم لوگ ندی کنارے ٹہلنے چلے گئے جہاں روزانہ اور کبھی کبھی چوری چھپے رات کو بھی ٹہلا کرتے تھے، عباسی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پولیس میں ہونے کے باوجود ادب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اب تک بے ادب نہیں بنے، ادب و شعر سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہیں .... سینکڑوں شعر یاد ہیں۔ اور ہزاروں افسانے۔ وہ تو افسانے تخلیق کرتے ہیں، عملی طور پر بھی کبھی وہ افسانے کے ہیرو بنتے ہیں اور کبھی محتسب۔ آپ بیتی اور پر بیتی کا ایک خزانہ ان کے پاس ہے۔ مزاحیہ، عشقیہ، طربیہ اور المیہ۔ بلبل ہزار داستان

نورتن کے نیفی زبیر احمد تمنائی تھے۔ سانولا سلونا رنگ گھنگھریالے سیاہ بال، بیک برش کرتے تھے۔ اور سر پر لہراتی ہوئی موج در موج گھٹائیں امنڈتی تھیں۔ بڑی خوبصورت رسیلی آنکھیں، ترشا ہوا چہرہ، تیکھا ناک نقشہ، میانہ قد چھریرا بدن، کم سخن، متین، نفیس مزاج، سلیقہ شعار، ادب و شعر میں غلطاں، نہایت درد مند دل کے مالک، مزاج میں رقت بہت۔ آنکھیں یوں بھی نم آلود نظر آتی تھیں جیسے کنول کی پتیاں تالاب کے پانی کی سطح سے اوپر بھی نم آلود رہتی ہیں۔ شرمیلی پلکیں جھپکتی بہت تھیں۔ اور نازک لب، احساسات و جذبات کے بوجھ سے عموماً تھرتھراتے رہتے تھے۔ تمنائی کی خموشی داقعی گفتگو تھی۔ تمنائی رضا نقوی کی دریافت تھے، روایت ہے کہ تین بجے سہ پہر کو اپنی کوٹھری کے دروازے پر ایک صاحب، کھوئے کھوئے سے کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ بے کسی سی ٹپکتی تھی۔ رضا صاحب ان کی معصومیت اور بے کسی پر رحم کھا کر ان کی طرف بڑھے اور رفتہ رفتہ ان سے بہت قریب ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد تمنائی صاحب کی الماری میں ایک ڈبہ پایا گیا۔ اور اس میں ایک رومال ملا۔ مشکلوں سے تمنائی صاحب نے رومال کھولنے کی اجازت دی۔ رومال کے ہر تہ میں پھولوں کا ایک پژمردہ ہار تھا۔ اس ہار کے کھلتے ہی تمنائی کی آنکھیں اور زیادہ پرنم ہو گئیں۔ اس وقت تو بس اتنا احساس ہوا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ پھر جب تمنائی ہم لوگوں سے گھل مل گئے تو ہار کا راز افشا ہوا۔ وہ ایک گم شدہ محبت کی یادگار تھا۔ تمنائی سے مسلسل کئی لڑکیوں نے محبت کی۔ تمنائی سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔ عجب بے کسی اور بے بسی کے ساتھ۔ لیکن اس بے کسی اور مظلومی کا انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ محبت کرنے والیاں، ان کے بھولے پن پر صدقہ ہوتی تھیں۔ تمنائی کی محبت کا رینج بہت وسیع تھا۔ اور وہ فلاطونی محبت تک کے قائل تھے۔ بلکہ وہ "فلاطونیت جدیدہ"

کے بانی ہیں۔ ایک دن وہ میرے پاس عالم گریہ وبکا میں تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب تھی۔ میں نے پوچھا کون سی کتاب ہے اور تمہارا کیا حال ہے۔ کہنے لگے دل پر تیر گہرا لگا ہے۔ میں نے کہا کھل کے باتیں کرو۔ کہنے لگے میرے غم کا کوئی مداوا ہی نہیں۔ بہت رد و کد کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ ان کے ہاتھ میں جو "لن یوٹانگ" کا ناول "مومنٹ ان پیکنگ" ہے اس کے دو نسوانی کردار پر یہ بُری طرح فریفتہ ہو گئے۔ "موچو" اور "مولن" دو نہایت حسین چینی لڑکیاں، اب تمنائی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے کس کو ترجیح دیں۔ فی الحال یہی غم سب سے بڑا تھا۔ اور بحث کے بعد یہ بھی ظاہر ہوا کہ چین بہت دور کا ملک ہے۔ اور پتہ نہیں لن یوٹانگ نے اپنے ناول میں حقیقی کردار پیش کئے ہیں یا خیالی ہیں۔ اور ادھر عشق کا تیر کاری لگا ہے۔ تمنائی کے سارے احباب اس معاملہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ مہینوں یہ غم ستاتا رہا۔ اور ہم لوگ پریشان تھے کہ اس آفاقی اور افلاطونی محبت کا کیا بنائیں؟ اس کا کیا علاج کریں؟ چند مہینوں کے بعد اس مرض میں کچھ کمی یوں ہوئی کہ لن یوٹانگ کا ایک اور ناول شائع ہوگیا "لیف ان دی اسٹورم" (طوفان میں ایک پتہ) اس کی ہیروئن "تانیا" بڑی جاندار شخصیت کی مالک تھی۔ بڑی ترقی پسند بھی تھی۔ تمنائی اس پر ٹوٹ کر عاشق ہوئے اور اب "موچو" "مولن" کا دو بدھا ختم ہوا۔ لیکن دوسرا مرحلہ ابھی بھی موجود تھا۔ چین جانا اور سارے ملک میں "تانیا" کی تلاش کرنی۔ تمنائی کہتے تھے کہ یہ کردار یقیناً زندہ کردار ہے۔ ناول نگار نے اسے چین کے شاہراہوں میں دیکھا ہے، اس سے ملا ہے، اور اس سے باتیں کی ہیں۔ تمنائی کی خاطر مجھے اور کئی دوستوں کو یہ ناول پڑھنے پڑے کیونکہ آخر کچھ تو کرنا تھا! ہم لوگ گھنٹوں تانیا کی باتیں کرتے بیٹھتے تھے مسلم ہوسٹل کے صحن میں گھاس پر لیٹے ہوئے ہیں، ادب و شعر اور رومانیات کی کتابیں کھلی ہوئی ہیں، کبھی شیلے، کبھی ورڈسورتھ، کبھی میر اور کبھی اقبال پر گفتگو ہو رہی ہے اور کبھی کبھی چینی افسانہ نگاروں پہ تنگ

لنگ، الیتسون وغیرہ۔ کبھی رکشتی پر گفتگو شروع ہو گئی، کبھی اسلامیات پر بات نکلی، چند لوگ اس حلقہ میں ہوتے تھے، عموماً میں، عباس رضا نقوی اور تمنائی۔ یہ لوزتن کا اندرونی حلقہ تھا۔ تمنائی تو تانیا کے ایسے دلدادہ ہوئے کہ انہوں نے "زندہ چین" کے نام سے بہت سی نئی چینی کہانیوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ تمنائی شاعر بھی تھے اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کے مترجم، افسانوں کے بے مثال ترجمے کئے ہیں۔ ادبی دنیا لاہور میں ان کی ایک نظم چھپی تھی۔ اس کے چند مصرعے یاد ہیں۔ ع

مت رو بلبل، بیچارہ بلبل،
پھول گیا تو جانے دے
موسم گل پھر آئے گا
پھول بہت سے لائے گا

تمنائی اندنوں کراچی میں ہیں، انہوں نے ایران پر ایک نہایت ہی قیمتی کتاب لکھی ہے اور اب وہ اردو رسم الخط اور ٹائپ پر تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں، ان کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہو گئی تھی جو بالکل چینی گڑیا کی طرح تھی، بچے سب بھی چینی گڑیا اور گڈے کی طرح ہوئے۔ وہ بچے تمنائی کے دوستوں کو "کاؤ تاؤ" (چینی سلام) کیا کرتے تھے۔ بعد میں خبر ملی کہ کراچی میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ چند سالوں کے بعد شرف عظیم آبادی نے اطلاع دی کہ تمنائی نے کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لی۔

لوزتن کے راجہ تو ڈرل شاہ شکیل تھے، لانبے قد کے گورے چٹے آدمی، عباس اور شکیل ٹینس اچھی کھیلتے تھے، عباس تو بہت اچھے کھلاڑی تھے شکیل کو بھی اچھا ذوق تھا۔ یہ ہوسٹل میں چائے پینے کے بہت بڑے ماہر تھے اور پلانے میں بھی استاد ان کا کمرہ چائے خانہ کہلاتا تھا۔ ہر وقت اسٹوو کی آواز سائیں سائیں آتی رہتی تھی، اور کیتلی میں پانی کھولنے کی سن سناہٹ سنائی دیتی رہتی تھی۔ دور پہ دور چلتے تھے۔ ان کی اور شاہجہاں سے چھنتی یہ میرے چچازاد بھائی ہیں۔ اس لئے حلقہ میں تکلف کے ساتھ

آئے تھے۔ اندنوں وہ گیا کالج میں صدر شعبۂ اردو فارسی ہیں۔ اور اب بجھ گئے ہیں۔ ورنہ ہوسٹل میں اُن کا شمار زندہ دلوں میں تھا۔

تمنائی اور رضا ہم سے کچھ پہلے ہی ہوسٹل چھوڑ گئے ہیں نے ۱۹۳۳ء میں ہی بی اے پاس کیا اور اس سے پہلے ہی بیمار پڑا اور آخری دور میں مہینوں ہوسٹل سے غائب رہا، رضا اور تمنائی کے چلے جانے کے بعد ایک مختصر سے صاحب تھے میرے کلاس فیلو، عظیم الدین، وہ میرے ہم جلیس بنے، انہیں ہم لوگ ڈاکٹر عظیم کہتے تھے، ان کی تمنائی اور عباس سے بھی بڑی دوستی تھی۔ ٹینس کا انہیں بھی شوق تھا، انہوں نے چاندی کا ایک کپ جیتا تھا۔ نہ جانے کیوں چھپ چھپ کر اسی جام میں وہ بیئر پیا کرتے تھے۔ اور جب سرور آتا تھا تو بہت اچھی غزلیں کہتے تھے اور مزے مزے کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ آرہ میں وکیل ہیں، سنا ہے کہ اب کہیں چاٹگام میں ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں بہار کا بہت بڑا زلزلہ آیا ہم لوگ اس وقت ہوسٹل ہی میں تھے۔ صحن میں بیٹھے تھے، چھت کے اوپر کا ایک بلند چھجہ گرا اور ہم لوگ بال بال بچے، ایک صاحب شمسو بھائی تھے، جن کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ داروغہ ہو جائیں، وہ اس وقت نہایت خوش رنگ لنگی میں تنقید حیات فرما رہے تھے۔ اور کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے خطبۂ معکوس دے رہے ہیں۔ بس زلزلہ آگیا، اور ادھر دیوار گری، شمسو بھائی نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور چیخنے لگے اے اللہ معاف کر دے، ہم لوگ سبزے پر بیٹھے ہوئے تھے، سب پر خشوع، خضوع کی کیفیت طاری ہو گئی، زلزلہ تھما تو ہم سب لوگ شمسو بھائی پر برس پڑے کہ کمبخت تمہاری ہی نحش، کلائی اور عریانی سے عذاب الٰہی آیا۔ شمسو بھائی ایک کلاسیکی چیز تھے، کہتے تھے ہندوستان میں دو نوکریاں ہیں ایک وائسرائی اور ایک داروغگی، لیکن داروغگی وائسرائی سے بھی بہتر۔ ان کی دلیلیں سنئے، فرماتے تھے اور سب باتیں برابر لیکن یہ تین باتیں ایسی ہیں جو داروغہ جی کو حاصل ہیں وائسرائے کو نہیں ہم لوگ پوچھتے وہ کون فضیلتیں ہیں؟ فرماتے بڑی مدت، سوچ کر نکالا ہے یوں ہی بتا دیں۔ اچھا تو بتاتے ہیں، وہ اپنی کڑی کڑی مونچھ اینٹھتے جاتے، دھوتی کا ڈھیلا کا درست کرتے اور آگے کی چنن سنبھالتے پھر سامنے جو لوٹا پڑا ہوتا اسے ہاتھ میں اٹھا لیتے، مسلمان لڑکوں میں وہی صاحب تھے جو دھوتی پوش تھے، ہاں تو پینترا دیترا بدل کر کہتے، داروغہ روپیہ کا ۵ سیر گھی کھا سکتا ہے اور چاہے تو ایک روپیہ بھی نہ دے، وائسرائے کو یہ کہاں میسر؟ دوسری فضیلت، پیپل کے درخت کے نیچے اگھارے بدن لیٹ کر کڑوا تیل لگانا، داروغہ جی کو روزیہ آرام حاصل ہوتا ہے، وائسرائے کو کہاں؟ اور تیسری بات، سب سے بڑی.....

...... اب شمسو بھائی دونوں ہاتھوں سے مونچھ پر تاؤ دینے اور جھومنے لگتے، پھر فرماتے "داروغہ جی جس کو چاہیں گالی دے دیں کوئی سالا کچھ بول سکتا ہے؟ وائسرائے کو چند نہایت ہی فصیح گالیاں دے کر فرماتے، صاحب داب میں دونوں برابر وائسرائے اور داروگا" اور خدا نے اس گنہگار کی دعا قبول کر لی، ایک دفعہ میں مظفرپور سے آرہا تھا، سکنڈ کلاس میں نیچے کے برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ اوپر برتھ پر بھی کوئی صاحب لیٹے ہوئے تھے، رات کا وقت تھا، جب سمون پور آیا تو اوپر کے برتھ سے دو سیاہ پولس بوٹ جھولنے لگے۔ اور پھر ان میں پڑی ہوئی دو ٹانگیں جھولیں اور دھم سے کوئی کودا، ہم بھی دریچے کے اٹھے، دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ کودنے والے نے کہا "ارے اختر صاحب، ہم داروگا ہو گئے" شمسو بھائی!
اور پھر ہم لوگ لپٹ گئے۔

میں نے بی اے کا امتحان اس عالم میں دیا تھا کہ منھ سے خون آرہا ہے، دو دن سے سوائے کنولے کے عرق کے کچھ کھایا نہیں ہے، امتحان کے کمرے کے باہر شکیل کھڑے ہیں، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد برف کے ٹکڑے بھجوائے جاتے ہیں اور نارنگی کا عرق، انگریزی آنرس کا آخری پرچہ تھا اور میں خون تھوک رہا تھا، کسی طرح امتحان ختم ہوا اور میں ہوسٹل میں اپنے بستر پر جا گرا، اس کے بعد بیماریوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا، مہینہ بھر پٹنہ ہوسپیٹل

میں موت اور زندگی کے درمیان جنگ ہوتی رہی۔ اگست ۴۳ء میں انگی سینی ٹوریم بھجوا دیا گیا۔ وہاں سوا سال رہا۔ شرف، رضا، تمنائی، شکیل، عباس مجھے وہاں بھی دیکھنے گئے۔ شرف تو بار بار جاتے رہتے کیونکہ ان دنوں رانچی میں وہ ملازم تھے لیکن ان کا کیمپ گرمیوں میں وہاں رہتا تھا۔ جاڑے اور برسات میں پٹنے چلے جاتے تھے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر کہ میں سینی ٹوریم سے بھلا چنگا ہو کر ۱۹۳۵ء کے دسمبر میں پٹنہ چلا آیا اور سیدھا شرف کے کوارٹر میں گیا۔ شرف کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ رضا آئے اور دوسرے احباب اکٹھا ہو گئے۔ دوسرے دن میں اردلی چلا گیا۔ شکیلہ وہیں تھیں ویسے تو انہوں نے سینی ٹوریم میں مہینوں میرا ساتھ دیا تھا، اور ایک ویران مکان میں ایک گھر کی ملازمہ کے ساتھ بڑی دردناک زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسی ویران مکان میں ایک اور بنگالی لڑکی تھی، اس کا شوہر بھی سینی ٹوریم میں بیمار تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بوڑھا سسر رہتا تھا۔ بالکل ٹیگور جیسا، سفید لانبی لانبی داڑھی اور دیہاتی قد۔ ان دونوں دُکھ کی ماریوں نے نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ غم کی گھڑیاں گذاریں اور اپنے بیماروں کی خدمت کرتی رہیں۔

میں اردلی سے ڈاکٹروں کو دکھانے کو پٹنہ مہینہ میں ایک بار ضرور آ جایا کرتا تھا۔ شرف، رضا، تمنائی جب پٹنہ پہنچے، میرا قیام شرف ہی کے یہاں ہوتا تھا اور کبھی میں رضا کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ انہیں دنوں علی اطہر بھی پٹنے میں مقیم تھے۔ لا ریا پاس کر چکے تھے اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ ان دنوں علی اطہر کی تقریر کا شہرہ تھا۔ بلا کا مقرر، جادو بیان، فصیح اور جری مقرر، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بجلی کی طرح رواں تھا۔ درمیانہ قد، چھریرا بدن، گورا چہرہ، عقابی آنکھیں، بلند پیشانی، بڑے بھرم اور اعتماد کا آدمی۔ ان کے والد چھپرہ کے رئیسوں میں تھے، زوال کا وقت آیا، اور گھر بار سب بک گئے۔ خاندان حیدرآباد ہجرت کر گیا۔ ان کے والد مولوی علی اصغر صاحب عربی کے فاضل تھے، دور کے رشتے سے میرے نانا ہوتے تھے، اسی علم و فضل کے سہارے انہوں نے حیدرآباد میں عزت و مسرت کے دن گذارے پھر یہ لوگ پٹنے چلے آئے۔ علی اطہر کچھ دنوں A.I.C.C. کی سکریٹریٹ میں ملازم ہو کر الہ آباد چلے گئے۔ بعد ازاں جب پہلی کانگریس منسٹری میں ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیمات مقرر ہوئے تو علی اطہر کچھ دنوں ان کے پرائیوٹ سکریٹری رہے۔

علی اطہر کو ادب اور معاشیات کا بڑا گہرا ذوق تھا۔ وہ روسی ادب سے بہت متاثر تھے۔ علی اطہر اور تمنائی ان دونوں نے مل کر مجھے ترقی پسند تحریک کی طرف مائل کیا۔ اور انہیں دونوں دوستوں کے ذریعہ مجھے مارکسزم اور مارکسی ادب پر کتابیں ملیں اور میں نے خوب پڑھیں۔ علی اطہر کے دو چھوٹے بھائی علی اشرف اور علی امجد بہار کے بڑے کمیونسٹ لیڈر رہے لیکن علی اطہر نے خاندان کی پرورش کے لیے منصفی قبول کر لی اور تقسیم ملک کے وقت استعفیٰ دے کر کراچی چلے گئے۔ وہاں وکالت شروع کی اور خوب چمکے ماشاءاللہ اب وہ اشتراکی کوچہ گرد نہیں ہیں بلکہ اہل امتیاز اور اہل ثروت میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دل کے بھید خدا جانے۔ کبھی کبھی وہ ہندوستان آتے ہیں۔ جب ہم مل بیٹھتے ہیں تو دوستانہ ماحول پیدا ہوتا ہے، اور ماضی زندہ ہو جاتا ہے۔ علی اطہر نے چیخوف کے دو ڈراموں کا ترجمہ اردو میں کیا تھا شہید اور سالگرہ۔ دو ڈراموں کے نام سے یہ ادبی مجموعہ پٹنے ہی سے شائع ہوا تھا۔ علی اطہر میں بہت صبر، اعتماد نفس، ذہانت اور شرافت جمع پائی جاتی ہے۔ بڑی ہمت اور حوصلے کا آدمی ہے۔ زندگی کی مصیبتوں پر فتح پائی ہے اور اپنی اور اپنے خاندان کی دنیا بنائی ہے۔ دوست دار اور وفادار آدمی ہے۔ علی اطہر نے ملازمت کے سلسلہ میں میری اتنی مدد کی تھی کہ کوئی کیا کرے گا۔ ۱۹۳۶ء کے تین مہینے بڑے معرکہ آرا بیتے گذرے ہیں، ستمبر، اکتوبر، نومبر۔ ۸ دسمبر کو اردو لکچرار کی حیثیت سے میرا تقرر پٹنہ کالج میں ہوا لیکن اس سے پہلے میرے احباب کو عموماً علی اطہر صاحب کو خصوصاً کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں شمائی، علی اطہر اور رضا نقوی نے مل کر رسالہ شمیم نکالا۔ میں بھی اس کے لکھنے والوں میں سے تھا۔ اس سے کچھ پہلے پٹنہ میں "سورج" نسیم نام سے رسالہ بہار الدین صاحب نے نکالا تھا۔ جمیل احمد کندھانی یزدی نے بھی ایک رسالہ "کارواں" کے نام سے نکالا۔ جن دنوں شمیم نکل رہا تھا، قاضی عبدالودود صاحب، اشرف عالم آرزو جلیلی رسالہ معیار نکال رہے تھے۔ ان دنوں پٹنے میں بڑی ادبی سرگرمی تھی، شمیم کی وجہ سے ہم لوگوں کے دوستوں کا حلقہ اور زیادہ مربوط ہوگیا۔ شمائی، اشرف، علی اطہر، میں اور کئی اور دوست انہیں دنوں سہیل عظیم آبادی بھی ہم لوگوں کے حلقہ میں داخل ہوئے۔ سہیل آزاد دو، سر میں لانبے لانبے بال کو اور انگلیوں سے پر خم بنائے ہوئے، گفتگو کی ابتدا سنو سنو سے کرنے والے، مہر و بندی اور تخیل، بڑی بڑی آنکھیں اور چشمہ جیسے تھے ویسے ہیں۔ سیلانی بادل کے ٹکڑے کی طرح بیٹھے آسمان پر اڑنے والے۔ آسمان کے تاروں کو گنا جا سکتا ہے ان کے دوستوں کا شمار ناممکن ہے، پہلے وہ سہیل جمیلی تھے پھر عظیم آبادی ہوئے۔ از مالش کی حد تک بے تکلف، خط لکھنے میں بے تحاشا۔ اب تک یہ طے نہیں پا سکا کہ وہ افسانہ نگاری کے ماہر ہیں یا مکتوب نگاری کے۔ کہانی کار کی حیثیت سے ملک میں مشہور ہوئے لیکن ابھی خطوں کا مجموعہ چھپا نہیں ہے۔ اس برصغیر کا کوئی بدنصیب ادیب یا شاعر ایسا نہ ہوگا جسے سہیل عظیم آبادی صاحب نے اپنے خطوں سے نہیں نوازا ہو۔ جب سہیل صاحب دلی میں تھے تو انہیں ان خطوں کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا ہے۔ ہندوستان کے بیمار دل طرفت سے مذکرہ نوشت آپ کے گھر پر جمع ہوتے تھے اور پھر خاندان۔ علاج و معالجہ امتحان میں شرکت، اور نوکری کی تلاش، سہیل بھائی، سہیل بھائی اور بس یہ گھر میں در آنے کا پاسپورٹ تھا۔ خود سہیل صاحب نے اجابت سے انتقام لیا ہے یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔ یوں تو بیچارے چائے کی ایک پیالی اور سگریٹ کے ایک کش پر گذارہ کرتے ہیں، سادہ، بے تکلف، ہنس مکھ اور کبھی کبھی ناقابل فہم بھی۔

۱۹۳۸ء میں جب میری ملازمت ہو گئی اور شمائی نے نیا سنسار بک ڈپو کھولا، سہیل رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹر بن گئے تو پٹنہ میں ہم لوگوں کا اچھا خاصہ اڈہ بن گیا۔ میں مصلح پور میں رہتا تھا، علی اطہر رضا اور وڈیرا اللہ آئے تھے شمائی، جو پٹنے کی مسجد زیر سایہ خرابات آباد کئے ہوئے تھے۔ رضا کھنیا کنواں والی گلی میں رہتے تھے، اشرف گردنی باغ میں۔ سہیل ویسے تو لامکاں تھے لیکن غالباً ان دنوں اپنے ماموں سید جعفر امام صاحب کے ساتھ چوہٹہ پر رہتے تھے۔ کہیں نہ کہیں ہم لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور خوب دھما چوکڑی مچی تھی۔ جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کی شور و شرابت، عرفا، بحث و مباحثہ، پشکن، ⠀ تگورل اور شیکسپیئر اور شیلی، فرائڈ اور مارکس سب کچھ۔ فرائڈ کا ذکر آیا ہے۔ تو میں آپ کو محسن صاحب سے ملا دوں۔ اب آپ ڈاکٹر سید محمد محسن صدر شعبہ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی ہیں۔ میرے بھائی، میرے دوست، یہ بھی ہمارے حلقہ احباب میں شریک ہوتے تھے مگر یہ دعوتوں میں، ادبی مجلسوں میں اور یار باشی کی محفلوں میں، بڑے سنجیدہ آدمی ہیں، یوں دیکھنے والوں پر ضرورت سے زیادہ سنجیدگی طاری رہتی ہے، مگر بے تکلف مجلسوں میں کھل کھیلتے ہیں۔ لیکن لغزش افتادہ کی حدوں سے واقف ہیں۔ شعور کی سرحدوں سے نکل کر لاشعور کی اندھیاری کوٹھری میں جھانک آتے ہیں۔ لیکن تحت الشعور کی گہرائیوں میں گر پڑنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ شمائی اور اطہر نے مجھے مارکس سے ملایا، اور محسن بھائی نے مجھے فرائڈ، یونگ اور ایڈلر سے روشناس کر دیا۔ دبلے پتلے سے آدمی، اوسط قد، چھریرا بدن، بالکل نان کلاٹ کی طرح رنگ، صاحب نان کلاٹ والی اصطلاح محسن بھائی کے لئے شکیلہ کی ایک سکھی نے ایجاد کی تھی جو ان کی چچا زاد بہن تھیں۔ شمیم تخلص فرماتی تھیں۔ انہوں نے محسن بھائی کو جھانک کر دیکھا اور گلاب کی طرح کھل کر بولیں یہ تو بالکل نان کلاٹ کے دھلے ہوئے پائجامہ کی طرح معلوم ہو رہے ہیں۔ محسن بھائی خوبصورت آدمی ہیں۔ بڑی بڑی گہری آنکھیں، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑی

کی طرح لب' آواز بہت مہین' نفاست اور رعنائی ان کے ظاہر و باطن میں ہے۔ بہت ہی خیال انگیز' نازک معنی کی حامل غزلیں کہتے ہیں۔ اخلاق' پاکیزہ' نفیس' اور لطیف۔ زندگی بھی کچھ ایسے قرینے اور سلیقے سے گزارتے ہیں کہ نفاست اور لطافت کا احساس ہو۔ صاحب دل آدمی' تصنع اور دکھلاوے سے بالکل پاک' سرچشمۂ خلوص و پاکیزگی۔ میں نے ان کا تذکرہ اس مقام پر اس لئے کیا کہ وہ ہمارے احباب کے حلقے میں شامل ہو گئے' ورنہ میری زندگی میں تین بھائی مجھ سے قریب رہے ہیں اور ان کی حیثیت دوست کی بھی ہے' تینوں مجھ سے عمر میں بڑے ہیں' منصور بھائی اور مصطفٰے بھائی میرے چچا زاد بھائی ہیں ہم لوگوں نے ساتھ پڑھا لکھا ہے۔ اور اک عمر ساتھ گذاری ہے' زندگی کے دکھ سکھ ساتھ جھیلے ہیں' منصور بھائی مظفر پور میں ڈاکٹر ہیں' مصطفٰے بھائی بھی وہیں تجارت کرتے ہیں۔ ڈاکٹری دواؤں کی تجارت' نانیہال میں محسن بھائی میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں' میرے خالہ زاد بھائی ہیں' عمر میں صرف تین ماہ بڑے۔ منصور بھائی مجھ سے سات سال بڑے ہیں اور مصطفٰی بھائی تین سال لیکن ہم سب بہت بے تکلف' محسن بھائی اور میں بچپن میں اپنی پیاری ماؤں کی محبت فشاں نظروں کے سامنے کھیلتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک سال پیدا ہوئے' ایک سال میٹرک پاس کیا' ایک سال پٹنہ کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے' ایک سال شادی ہوئی' ایک سال یونیورسٹی میں پروفیسر بنے' ہم مل بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک ہی سال میں مریں گے بھی۔

محسن بھائی فلسفی ہیں' شاعر ہیں' افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اردو افسانہ نگاری میں نفسیاتی مسائل پر افسانے لکھے ہیں اور بے مثال سرمایہ اردو کو دیا۔ شاہد احمد دہلوی نے "ریزۂ مینا" افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں آپ کا افسانہ "دکھی مسکراہٹ" شریک تھا۔ معاصر پٹنہ اور ساقی دہلی میں آپ کے نفسیاتی افسانے چھپتے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ممتاز مفتی' حسن عسکری اور قدرت اللہ شہاب کے نفسیاتی افسانوں کے مقابلہ میں محسن صاحب کے افسانے زیادہ سائنٹفک اور حقیقت سے زیادہ قریب ہیں اور ان کے کئی افسانے فنکارانہ حیثیت سے بھی بہت ہی اعلیٰ درجے کے ہیں' اک فلسفی فنکار نے ان افسانوں میں نفسی عقدہ کشائی بھی کی ہے اور جمالی جلوہ آرائی بھی۔ محسن صاحب غزلیں ایسی لکھتے ہیں کہ فانی اور غالب' اصغر اور اقبال کے شہکاروں کے درمیان بھی ان کی انفرادیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ حکمت و حق کو حسن و جمال کے پیکر میں ڈھالنا' مشکل کام ہے اور عالم انفس کو عالم آفاق میں لانا کٹھن ہے' لیکن محسن صاحب جوئے شیر چٹانوں کو کاٹ کر نکالتے ہیں۔ جی ہاں' محسن صاحب ویسے بڑے فلسفی اور بڑے متین ہیں لیکن ان کے فرہادی بھی ہے' سانولا رنگ انہیں بہت مرغوب ہے شاید گوپستانوں کی رعایت سے اور آپ کی بیتاب وحشی کی کہانیاں میرے کانوں نے سنی ہیں' محسن صاحب میرے حلقۂ احباب میں خوب کھپے اور میرے دوستوں نے ان کی بہت عزت کی' شرف عظیم آبادی ان کے گرویدہ تھے' اور اطہر قائل' رضا مرغوب تمنائی مجذوب۔ تمنائی ایک آئیڈیل ذہنیت رکھنے والے آدمی تھے' وہ ہر صنف میں آگے بڑھنا چاہتے تھے' لہذا محسن صاحب کو دیکھ کر ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی بڑے فلسفی ہو جائیں اور میں کہتا تھا کہ بھائی تمنائی ارسطو ہوں یا افلاطون' سقراط ہوں یا فیثا غورث' ابن رشد ہوں یا فارابی سب کا انجام یہ ہے کہ وہ صنف لطیف کے سامنے ریشہ خطمی بن جاتے ہیں۔ تمہارے اندر کیا کمی ہے۔ تم پر حسن تو نثار ہوتا رہتا ہے۔ تمنائی کے لب تھرتھرانے لگتے اور آنکھیں جھپکنے لگیں۔

میرے احباب کا ایک ایسا حلقہ ہے جس کی کڑیاں وقتاً فوقتاً جڑتی گئیں مثلاً بہاءالدین بیانوی' اختر قادری' اجتبیٰ رضوی' پرویز شاہدی' آل احمد سرور' احتشام حسین یہ سب میرے مخلص احباب ہیں لیکن یہ لوگ پٹنے سے دور رہتے ہیں اور ان سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے۔ لیکن جب ہوتی ہے تو زندگی

نظارہ بننے کے قابل نظر آتی ہے۔ یہ سب لوگ سخن سنجی، سخن فہمی، سخن گری اور سخن سازی کے ماہرین ہیں۔ بہاء الدین کا ذوق شعر و شاعری بے مثال ہے۔ وہ شاعری کے ٹسٹنگ مشین ہیں۔ آپ کوئی غزل لکھیں بہاء الدین کو سنائیں اگر ان کا چہرہ تابناک ہو جائے اور وہ بے ساختہ داد دینے لگیں تو سمجھئے اشعار کامیاب ہو رہے ہیں لیکن اگر وہ سکوت فرمائیں تو اپنی غزل کے لئے دعائے خیر کیجئے۔ انہیں ہزاروں اشعار یاد ہیں اور اچھے ہی اشعار یاد ہیں۔ آپ گلستان ہزار رنگ کے مرتب ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے خوب لکھتے ہیں اور اداکاری میں ان کا جواب نہیں۔ اکثر ریڈیو اسٹیشن سے خود اپنے ریڈیائی ڈرامے انہوں نے ڈائرکٹ کئے۔ ہم لوگوں کے لنگوٹیا یار ہیں۔ کالج کے پہلے سال سے ساتھ ہے۔ حضرت نے رسالہ موج نسیم نکالا تھا، باغ و بہار، بذلہ سنج، بے تکلف، یار باش، نغمہ سنج۔ آپ کو موسیقی اور مچھلی مارنے کا بے حد شوق ہے۔ فی الحال آپ مظفر پور میں ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ لیکن جب ہم مل بیٹھتے ہیں تو ججی بالائے طاق پروفیسری کو طلاق کیا، کیا موشگافیاں ہوتی ہیں، غلطی سے اگر کوئی حلقۂ رنداں میں آ جائے تو بے ہوش ہو جائے۔ یا پھر دامن چاک کر کے صحرا کی طرف روانہ ہو۔ یہ صاحبان جبہ و دستار اور یہ عالم وحشت۔ لیکن کسی نے سچ کہا ہے۔ بس ایک مصرع یاد ہے ع نہ جا طمطراقِ عبا و قبا پر۔

بہاء الدین جہاں ہوں وہاں غم و فکر، تصنع، کینگی، دروغ گوئی، غیبت، حسد، مردم آزاری، کم ظرفی کی دور دور تک کوئی جگہ نہیں۔ خالص سونے کی ڈھلی ہوئی اشرفی ہیں بہاء الدین۔ تبسم قہقہے، لطیفے، شگوفے، کہانیاں، نغمے، اور نہایت میٹھی میٹھی پُرخلوص پیاری پیاری گالیاں آپ کی جلو میں رہتی ہیں۔

فی الحال پٹنہ میں ایک دائرہ بنا ہے۔ جس میں بیشتر ہم جماعت احباب ہیں۔ یعنی وہ لوگ، جو کالج کی زندگی میں ایک کلاس میں تھے یا ایک آدھ کلاس نیچے۔ اس ٹولی میں بہاء الدین شریک ہیں۔ ویسے وہ گاہے ماہے پٹنہ آتے ہیں لیکن روحانی قربت ہر وقت رہتی ہے۔ بزم رنداں کے ارکان حسب ذیل ہیں ــــ رضا کریم صاحب، معین صاحب، سلیمان صاحب، شریف صاحب، مصطفیٰ صاحب، سید حسن صاحب، محسن صاحب زین العابدین صاحب، ہم لوگ مہینے میں دو بار مل بیٹھتے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں۔ شعر و شاعری کے چرچے رہتے ہیں۔ دل کا بوجھ ہلکا کیا جاتا ہے، دماغ کی صفائی کی جاتی ہے، لامتناہی بکواس کے ذریعہ ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد دی جاتی ہے۔ اور کردہ گناہوں کے تصور کو مرہم بنا کر غم دنیا اور غم عقبیٰ غلط کئے جاتے ہیں۔ ان احباب میں کئی کا تذکرہ آ چکا ہے۔

رضا کریم صاحب پولس افسر ہیں لیکن وہ شاعر زیادہ ہیں اور افسر بہت کم۔ بڑے جذبے اور جوش سے غزلیں سناتے ہیں۔ بے حد تپاک سے ملتے ہیں۔ ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ میں انہیں کوہ نور کہتا ہوں، بہت ہی طویل القامت یعنی مجھ سے بھی تین انچ اونچے ہیں دور سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نظر آتے ہیں، بالکل چندلے ہیں کبھی کبھی حفیظ جالندھری کا بھی شبہہ ہوتا ہے۔ بعض دوست انہیں لارڈ باؤن کہتے ہیں۔ بے حد تاش کھیلتے ہیں، خوب چائے پیتے ہیں، بے تحاشہ غزلیں لکھتے ہیں، ہیرا ہیں ہیرا، اور ان کے اتنے پہلو ہیں کہ الاماں، ان کے ملنے والوں میں چپراسی بھی ہیں، موٹر ڈرائیور بھی، اختر اورینوی اور سہیل، رضا نقوی اور غبار بھٹی بھی، بے شمار شعراء، دانش اور غیر دانش، واہی اور تباہی، بہت سے مجرمین، خطاکار، گنہ گار، نابکار ان کے بنگلے پر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ پولس کی حراست میں کون لوگ لائے گئے ہیں اور کون لوگ کھینچے چلے آئے ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے ؎ سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

زین العابدین صاحب پرنسپل پٹنہ کالج ہیں۔ آج کل وہ اس کوٹھی میں رہتے ہیں جس میں مسٹر جیکنن رہا کرتے تھے۔

زو پخاری انگریز، وہاں پہنچنے میں فرشتوں کے بھی پر جلتے تھے۔ ان دنوں صوبہ بہار کا گورنر اور پٹنہ کالج کا پرنسپل ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔ زیبوا سی کوٹھی میں پٹنہ کالج کے حلقہ میں گنگا کے کنارے رہتے ہیں۔ دور سے دیکھئے تو بوڑھے انگریز کی شکل نظر آئے گی نہایت عمدہ سوٹ پہنتے ہیں، کشادہ چہرہ گورا چٹا رنگ، بلند پیشانی اور اب چندیے ہوتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انگلستان کی پارلیامنٹ کا ممبر ہے جو اب وزیر خارجہ مقرر کیا جانے والا ہے۔ عابدین صاحب نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ فن معقولات میں مہارت ہے خود سے کھانا پکا لیتے ہیں، انٹرنیشنل قسم کا، یہ اطالوی ڈش ہے، یہ فرانسیسی، یہ روسی، وغیرہ وغیرہ۔ بڑے چاؤ سے احباب کو کھانا کھلاتے ہیں اور بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کے دم قدم سے ہم لوگ اس محلخانے میں باریاب ہوتے ہیں جس میں کبھی پرنسپل بے کس بنفس نفیس قیام پذیر تھے۔ اللہ رے دبدبہ! جیتے جی ہم لوگ آزادی ہند کے طفیل داخل جنت ہوئے جاتے ہیں۔

بزم احباب کے موجودہ اراکین میں سلیمان، محسن، سید حسن، زین العابدین، رضا کریم، بہار الدین صاحبان کے تذکرے قبل ہو چکے ہیں۔ اور ایوب مرحوم کی دلگداز یاد بھی آئی اور گزر گئی۔ حلقہ کے چند اور دوست ہیں خدا سارے احباب کو زندہ اور سلامت رکھے انہیں کے دم سے زندگی زندگی ہے۔

شریف صاحب ان دنوں پٹنہ میں سینیر ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں، یہ بھی میرے کلاس فیلو ہیں لیکن میں سائنس میں تھا اور یہ آرٹس میں، کالج کے زمانہ میں زیادہ ساتھ نہیں رہا لیکن اب ہم لوگ حلقہ بند ہو چکے ہیں۔ بہت ہی خوش باش اور یار باش شخص ہیں، قوی درد رکھتے ہیں اور دوستوں کے ساتھ بہت مخلصانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ سیر کے عادی ہیں اور پارٹیوں کی تنظیم کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ کسی سیاسی پارٹی کا ذکر نہیں پکنک پارٹی کا تذکرہ ہے۔

معین صاحب بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شریف، معین اور بہار الدین صاحبان بوڑھے ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کیونکہ جوانوں کا ہے، صورت جوان، دل جوان اور معین صاحب کا تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی ان کے چندیے سر سے باز آ جائے تو پھر ایسے ایک بھولا بھالا "گلو بابو" چہرہ ملے گا۔ یا ان فرشتوں جیسا جن کی تصویریں رفائیل نے بنائی ہیں۔ یہ عہد نہفت کا فرشتہ اب تک کنوارا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ ایوب مرحوم اور معین صاحب نے کنوارے رہنے کا عہد کر رکھا تھا۔ اور ویسے تو رضا کریم صاحب بھی اب کنوارے ہو گئے۔ دو بیویوں کے گذر جانے کے بعد آدمی کنوارا نہ ہو تو کیا کرے۔ معین صاحب کشت زعفران ہیں۔ کیسے کیسے گفتنی اور ناگفتنی لطیفے انہیں یاد ہیں۔ انہیں دیکھ کر جنت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اتنا شاداب شگفتہ چہرہ ہے اور اس پر ایسا رسیلا بھولا پن طاری ہے کہ ابھی بھی لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ بہار الدین اور معین صاحبان اب انتقاماً نمازیں پڑھنے لگے ہیں اور بے تحاشا نمازیں پڑھتے ہیں لیکن ان دونوں کا خیال ہے کہ ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ نمازیں انہیں ان حرکتوں سے باز نہیں رکھتیں جن کے ہم سب مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ احباب کی نشست ہو رہی ہے سلسلہ دراز شوق کی کڑیاں بڑھتی جا رہی ہیں، اتنا کا وقت آ گیا، بہار الدین، معین اور مصطفٰے صاحبان مجلس میں بد مزگی پیدا کر کے باجماعت نماز پڑھنے لگیں گے اور سید حسن خواہ مخواہ ان کی اقتدا کرنے پر مصر ہوں گے۔ اس اصرار میں کبھی کامیاب ہوتے ہیں کبھی ناکامیاب۔ نماز ختم ہوئی مجلس پھر جم گئی بلکہ بہار الدین نے تو سلام پھیرتے ہی وہیں سے سلسلۂ کلام شروع کیا جہاں پر ختم ہوا تھا اور میں تو یہ کہوں گا

کہ نماز کے بعد ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ جن کے ارتکاب پر لوگ استغفار پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ حضرات اکثر اب استغفار بھی جمع کرتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بھائی نمازیں جمع کیا کرو یہ اچھل بے جوڑ بات کیا، صحبت احباب کا کھلا خزانہ اور نماز دل کی خلوت روحانی۔ بہرحال مجھے ان سب دوستوں کی انسانیت، ایمانداری اور خداترسی پر یقین کامل ہے۔ یہ لوگ دوزخ میں جانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ لیکن مجھے اس امر میں شبہ ہے کہ جنت میں بھی ان کا گذارا ہوگا یا نہیں۔ جنت سے بھی کوئی زیادہ دلچسپ جگہ صاحب بخشش و عطا کو بنانی پڑے گی کیونکہ نوازشیں بقدر حوصلہ و ظرف ہوتی ہیں۔ مصطفٰے صاحب کی تو پرستش ہی نہیں ہوگی۔ آپ ان کو ایک بار دیکھ لیجئے تو آپ کو ان کی معصومیت اور اپنی گنہ گاری پر یقین آجائے گا۔ انکی بے گناہی ہمیشہ آپ کو اپنے گناہوں کی یاد دلائے گی۔ بہت آہستہ چلتے ہیں۔ گداز بدن ہے۔ اور اس کے وسط میں کچھ بلندیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں۔ بہت ہی صاحب صلاحیت آدمی اور عدم تشدد کا زندہ مجسمہ۔ دوستوں کی محفل میں یہ حضرت بھی کھل کھیلتے ہیں۔ لیکن بڑے گہرے ہیں۔ صاحب تجربہ بزرگ ہیں، اخلاص و محبت کے پیکر، دردمند، غمگسار مگر تیاگی۔ سید حسن صاحب کے متعلق شرف عظیم آبادی کہا کرتے تھے کہ یہ اختلاج کمر میں مبتلا رہا کرتے ہیں، شریف صاحب پر اختلاج قلب کے دورے پڑتے ہیں اور مصطفٰے صاحب پر اختلاج فکر کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔

ایوب مرحوم، جمیل مظہری صاحب اور اجتبیٰ رضوی صاحب کے درمیان بڑی گہری دوستی تھی، جمیل صاحب اور اجتبیٰ صاحب، خدا ان کی زندگیوں کو لمبا کرے اب تک اخلاص و وفا کے تعلق میں بندھے ہوئے ہیں، ہر چند کہ میں ایوب مرحوم اور اجتبیٰ رضوی صاحب سے بے تکلف ہوا، ایوب صاحب سے تو لنگوٹیا یاری تھی، اجتبیٰ صاحب سے مہذب دوستانہ ہے۔ لیکن برادر گرامی پروفیسر جمیل مظہری صاحب سے میں ہمیشہ اسی طرح برتاؤ کرتا ہوں کہ میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ جمیل صاحب مجھ سے ۵ سال بڑے ہیں اور شاید اجتبیٰ صاحب ۲ یا تین سال، ویسے جمیل مظہری صاحب شعبے میں میرے شریک کار ہیں، روزانہ گھنٹوں کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہ مجھ پر بہت کرم فرماتے ہیں۔ اور میں انہیں فکر و عمل میں شیخ شعبہ قرار دیتا رہا ہوں، اجتبیٰ صاحب سے بے تکلفی ایوب مرحوم کے گھر ہوئی۔ رضوی صاحب بہت ہی قیمتی آدمی ہیں، لانبا قد، گورا شاہی چہرہ، حضرت عیسٰی کی اس تصویر کے مماثل ہیں جو دور احیا کے مصوروں نے صلیب پر چڑھی ہوئی بنائی ہے اور اب تو خیر سے وہ دربھنگہ ..ت کالج میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع بھی کر رہے ہیں۔

رضوی صاحب سرسید کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے محور و مدار پر یہ بھی تعلیم و تعلم کے آفتاب ہیں۔ شمالی بہار میں ان کے فیض سے علم کی صبح صادق طلوع ہو رہی ہے۔ عصر حاضر کے بہاری اردو شعراء کے عناصر اربعہ میں شامل ہیں۔ جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، پروفیسر شاہدی اور اختر قادری، ان لوگوں نے مل کر کعبۂ اردو کی چہاردیواری مکمل کی ہے۔

پروفیسر شاہدی کی تعلیم بھی پٹنہ کالج میں ہوئی۔ کالج میں کبھی ہم لوگوں کے ہمعصر تھے، سائنس کے طالبعلم ہونے کی وجہ سے میں کالج کی زندگی میں ان سے پورے طور پر روشناس نہ ہو سکا، ہاں مسلم ہوسٹل میں وہ کبھی کبھی آتے تھے اور رباعیات اور غزلیں سناتے تھے۔ پھر انہوں نے کلکتہ سے ایک ادبی پرچہ نکالا اور ہم لوگ قریب آتے گئے۔ پچھلے چند سالوں سے میں ان کے بہت قریب آگیا ہوں، ان کا وطن شہر عظیم آباد ہے مگر کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں، یونیورسٹی کے کاموں میں کلکتہ جاتا ہوں تو ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ پٹنہ آتے ہیں تو مجھ سے ملتے ہیں۔ بڑی بڑی خوبصورت

آنکھیں، گلگوں چہرہ، بے حد ذہین قیافہ، چمکتی ہوئی پلکوں سے افق کی بیتابی کا اندازہ ہوتا ہے، بے باک، جری، مخلص، بلند نظر، ایثار پیشہ انسان۔ مزاج میں بھی شعریت ہے۔ ان کی شاعری میں درد و زندگی بھی ہے اور عرفانِ حیات بھی۔ لیکن میں تو ان کی آدمیت کا قائل ہوں، کسی نے سچ کہا ہے کہ بہار میں پٹنہ کالج ہی کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اختر قادری صاحب بھی آسمان کے تارا ہیں۔ اور اندنوں شمالی بہار میں قطب بنے ہوئے ہیں۔ رافع الہدیٰ مرحوم کے نسبتی بھائی ہیں۔ اور اس نسبت سے میرے بھی بھائی۔ کالج میں ہم لوگوں کی صف کے بعد ان کی صف تھی لیکن ان سے میری رسم و راہ بعد میں پیدا ہوئی اور بڑھتی گئی۔ صوفی خانوادے کے صاحب دل اور صاحب عرفان شخص ہیں۔ ان کی شاعری میں اقبال کے رنگ و آہنگ کا لطف آتا ہے۔ طبیعت میں بہت انکسار ہے لیکن اسرار خودی سے بھی واقف ہیں۔ ان کی سیرت میں اسرار خودی کے ساتھ رموز بے خودی کی جلوہ گری ملتی ہے۔ خودی کی توانائی سے ان کے مزاج میں جرأت اور اقدام میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بے خودی انہیں مردم آزاری سے باز رکھتی ہے۔ اور کبھی کبھی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ تیزگام حضرات انہیں نقصان پہنچا بیٹھتے ہیں۔ اور یہ عالم بے خبری میں غرق رہنے کی وجہ سے تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ رضا نقوی صاحب اور اختر قادری صاحب سے خوب بنتی ہے۔ کبھی کبھی واسوخت تک نوبت پہنچتی ہے مگر ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے ہیں۔ قادری صاحب میرے بھائی ہیں میرے دوست بھی۔ ساتھ کم گذرتی ہے مگر جب ہم مل بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کی غمگساری کرتے ہیں۔ اور اگر توفیق ملے تو آرام حیات کی چارہ جوئی بھی۔

بہار کے باہر کے لوگوں میں میرے کئی دوست ہیں آل احمد سرور صاحب، احتشام حسین صاحب، مرزا ادیب صاحب اور روشن صدیقی، میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر صاحبان کو بھی اپنا دوست ہی سمجھتا ہوں لیکن ان لوگوں سے زیادہ ملنے جلنے کا موقع نہیں ملا۔ ان میں سرور، احتشام اور روشن صاحبان سے خوب ملاقاتیں رہی ہیں اور ہم لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے رہے ہیں۔ میں لاہور جا کر مرزا ادیب سے ملا ہوں لیکن ہماری دوستی بہت پرانی ہے۔ ادب لطیف کے ابتدائی دور میں ہمارا تعلق پیدا ہوا۔ وہ ایڈیٹر تھے اور میں مضمون نگار۔ برسوں خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ یہ شخص بھی کھاٹی شرافت کا پتلا ہے۔ اور بڑا صابر اور جگردار۔ تقسیم کے بعد ہمارے تعلقات کے درمیان سرحدیں قائم ہو گئیں لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ؂

گرچہ رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اب نقوش کے ایڈیٹر جناب طفیل صاحب سے تعلقات قائم ہوئے ہیں لیکن ان کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ ہندوستانی روایات کے لحاظ سے طفیل صاحب ذرا شرما جائیں گے، وہ مجھے "دولہا بھائی" لکھتے ہیں اور شکیلہ اختر صاحبہ کو آپا۔ طفیل میرے دوست تو نہیں ہو سکتے کیونکہ عمر میں بہت چھوٹے ہیں لیکن وہ دوستوں سے کم پیارے نہیں ہیں۔ کیونکہ معاملہ ساری خدائی ایک طرف .... کا ہے۔

سرور اور احتشام صاحبان میرے ہم پیشہ اور ہم مشرب و ہمقلم ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت گھلے ملے ہوئے ہیں۔ میں علیگڑھ اور الہ آباد جاتا رہتا ہوں، وہ حضرات پٹنے آتے رہتے ہیں۔ علی گڈھ کو تو میں اپنا دوسرا وطن سمجھتا ہوں۔ علیگڑھ کی عظمت اور محبت دونوں میرے دل میں قائم ہے۔ علیگڑھ کی یاد حضرت رشید احمد صدیقی مدظلہ اور وہ بھی آل احمد سرور صاحب کے محور پر رقص کرتی ہے۔ سرور صاحب سے میری پہلی ملاقات رشید صاحب ہی کے یہاں ہوئی تھی۔ پہلے ہی دن سے ہم لوگ دوست بن گئے۔ میں ان کے گھر ٹھہرا، ان کے بچوں کو

پیار کیا، کبھی علیگڈھ میں کبھی لکھنؤ میں۔ بڑے پیارے بچے ہیں۔ اور اب سب ماشاءاللہ بڑے ہو گئے۔ میں پرویز شاہدی کی بچی نہایت پیاری حسین بچی اور سرور کے بچوں کو بہت چاہتا ہوں۔ سرور کا بڑا لڑکا صدیق اور پھر منجھلا "دلو بابھاوے" ہم سب لوگ اسے دلو بابھاوے کہتے ہیں بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔ اور ہماری بٹیا جو اب ایم اے ہو گئی اور اس کے دو چھوٹے ننھے بچے ہیں، بڑا نواسا تو سرور پر حکومت کرتا ہے اور ہم لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتا، آپ تقریر فرماتے ہیں، کہتے ہیں "بھائیو، بہنو، بیٹیو! .... اور اب ختم

سرور اور احتشام یہ دونوں نام میرے ذہن میں ایک ساتھ ابھرتے ہیں۔ احتشام حسین صاحب سے میری ملاقات سرور صاحب کے ذریعہ لکھنؤ میں ہوئی اور پھر ہم لوگ دوست بن گئے۔ احتشام بظاہر بہت سنجیدہ و خشک معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے مزے دار، بے تکلف بھی ہو سکتے ہیں۔ سرور شگفتہ اور طرحدار سے معلوم ہوتے ہیں لیکن دونوں بہت اچھے دوست اور نہایت اچھے آدمی ہیں۔ مجھے ان دونوں دوستوں کی دوستی پر بڑا اعتماد ہے اور جب یہ لوگ میرے گھر آتے ہیں تو دل، روح اور ذہن باغ باغ ہو جاتے ہیں، اگر شرون عظیم آبادی ہوتے تو یوں کہتے کہ جی گارڈن گارڈن ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ ذرا انگریزیت کا رعب گانٹھے بغیر بات نہیں بنتی ہے۔ بہرکیف میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور چمن چمن بھی۔ میرے گھر بھر میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے جب یہ دونوں حضرات آتے ہیں۔ کیونکہ انکے علاوہ جو ادبی شخصیتیں ہیں وہ یا تو بزرگ ہیں یا خرد، ان سے بے تکلفی نہیں ہو سکتی۔

جب روشؔ صدیقی میرے گلے ملتے ہیں تو لوگوں کو ہنسی آجاتی ہے اور اگر وہاں پر کوئی کیریکچر بنانے والا ہو تو اسے نہایت عمدہ مواد مل جائے۔ میرا قد چھ فٹ روشؔ صاحب کا قد کتنا ہے مجھے معلوم نہیں لیکن جب ہم دونوں ہم آغوش محبت ہوتے ہیں اور میں گردن جھکا کر ان کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ان کا سر میرے سینے تک آکر رہ گیا۔ لیکن یہ سر کتنا قیمتی و اعلیٰ ہے۔ روشؔ ایک صوفی شاعر، ان کے مزاج کی شخصیت اور فن میں صوفیت ہے۔ درد و گداز کی صوفیت، لطافت و نفاست کی صوفیت، روشؔ شاعر ہیں نفیس نفیس۔ شاعروں میں نے اتنا پاکیزہ آدمی کم دیکھا ہے۔ اردو ادیبوں کے درمیان تو اتنی تعداد میں مجھے ملی نہیں۔ ان پر ہر وقت ایک عالم وجد و رقص طاری رہتا ہے۔ وہ پٹنے آتے رہتے ہیں یہاں وہ محسن صاحب سید حسن صاحب اور راس خاک رسے بہت گھلے ملے ہوئے ہیں۔ میں ١٩٦٣ء میں دلی گیا، ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی، بڑے تپاک اور اخلاص سے ملے اور نہایت شوق و خلوص سے اپنے گھر بلایا۔ بہت ہی اچھا کھانا کھلایا اور کھانے کے بعد بہت ہی نفیس و لطیف، شاعرانہ اور صوفیانہ باتیں ہوتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مارے اخلاص کے بچھے جاتے ہیں، گھلے جاتے ہیں۔ قیمتی آدمی ہیں۔

میں نہایت خوش نصیب ہوں کہ مجھے اپنے دوستوں کا بہت ہی قیمتی خزانہ ملا ہے۔ شاید مجھ جتنا دولتمند کوئی نہ ہوگا۔ سرمایہ خلوص نے مجھے مزدوری محبت عطا کر دی، نہیں، زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ مجھے میری محبت سے زیادہ وفا ملا ہے۔

غلام سرور

یہ قصہ ہے جب کا……

اکیس سال بیت گئے جب میں نے میٹرک پاس کرکے پٹنہ سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ ادبیات سے دلچسپی اسکول ہی کے زمانہ سے بھی لیکن میٹرک نہایت اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا اور زمانے کی روش یہی تھی چنانچہ ڈاکٹر یا انجنیر یا سائنس داں بننے کے شوق نے سائنس کالج میں داخلہ لینے پر اکسایا۔ اس وقت بہار بھر میں صرف ایک یونیورسیٹی تھی اور وہ تھی پٹنہ یونیورسیٹی۔ صوبہ بھر میں سائنس کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم بھی صرف سائنس کالج میں دی جاتی تھی۔ علم ریاضی، علم کیمیا اور علم طبعیات سے واسطہ پڑجاتا ہے تو ادب اور فن کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ ادب اور زندگی یا ادب اور سائنس کی بحثیں اب پرانی ہوچکی ہیں۔ اتنی بات طے ہے کہ سائنس، انجنیرنگ یا میڈیسین سے جس کا چولی دامن کا ساتھ ہو اس کو شاعری، جمالیات، ادبیات یا فنون لطیفہ سے عام طور پر دور کا بھی لگاؤ نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ انٹر سائنس میں لنگویج کمپوزیشن کا بھی ایک پرچہ ہوا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے ہفتہ میں ایک گھنٹی ہماری اردو کمپوزیشن کی بھی ہوا کرتی تھی۔ بس اسی گھنٹی نے مجھے سائنس داں، انجنیر اور ڈاکٹر نہیں بننے دیا۔ سائنس کالج میں اردو کا کوئی لکچرار نہیں تھا۔ پٹنہ کالج کے سید اختر احمد اختر اورینوی لکچرر شعبۂ اردو ہمارا کلاس لینے ہفتہ میں ایک بار سائنس کالج آتے۔ ایڈمنسٹریٹو بلاک کی عمارت میں ہمارا اردو کلاس ہوتا۔ اختر اورینوی کو پہلی بار میں نے اسی زمانہ میں یعنی جولائی ۱۹۴۳ء اور اسی حیثیت سے یعنی اردو کے استاد کی حیثیت سے دیکھا اور جانا۔ قد گیسوئے معشوق کی طرح دراز۔ ناک نقشہ ایسا کہ منہ چوم لینے کو جی چاہے۔ چہرہ میں جمال اور آواز میں جلال۔ زبان گنگا جل میں دھلی ہوئی، دودھ میں نہائی اور گلاب میں بسائی ہوئی۔ بولی شہد سے زیادہ میٹھی۔ قہقہہ لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ استاد ولایت علی خاں نے ستار کے سارے تار ایک ساتھ جھنجھنا دئے ہیں۔ چہرہ بشرہ میں جاذبیت، بول چال میں کشش، درس و تدریس میں دلچسپی و انہماک۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے پہلی نظر میں اختر اورینوی نے اپنا اثر چھوڑا وہ آج تک دور نہ ہوسکا۔ درمیان میں میرے اور اختر صاحب کے تعلقات کشیدہ بھی ہوئے، تنقید نگار غلام سرور نے اختر اورینوی کے ڈرامہ پر سخت تنقید بھی کی لیکن ایک شفیق استاد، ایک خلیق انسان اور ایک رفیق

ملک و ملت کی حیثیت سے اختر صاحب نے جو نقش چھوڑا وہ
اکیس سال بعد بھی موجود ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ سائنس کے
میدان سے ادب کی وادی میں میری واپسی نیز قومی، ملی، سماجی،
لسانی اور ادبی میدان میں میری طبع آزمائیوں میں ابتدائی مرحلے میں
جو اسباب کارگر ہوئے ان میں ایک معتدبہ حصہ اختر اورینوی
کا بھی رہا ہے تو اسے ہرگز مبالغہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اختر اورینوی
نے بھی سائنس کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ دراز قد ہوتے ہوئے
بھی اعلیٰ درجہ ذہین تھے۔ آج بھی ان کی ذہانت کا چرچا عام ہے۔
انٹر سائنس کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ وہیں پھیپھڑوں
کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ دل کا روگ بھی اسی منزل پر مول لیا۔
اس امتحان میں پورا اترنے اور موذی مرض سے نجات حاصل
کرنے کے بعد آرٹس کی طرف رجوع ہوئے اور پھر بی اے ایم اے
اور اب تو ادبیات کے ڈاکٹر بھی ہوگئے۔ اختر اورینوی کا
بچپن کیسا تھا یہ ان کے لنگوٹیا یار آپ کو بتائیں گے۔ وہ اسٹوڈنٹ
کیسے تھے یہ ان کے احباب بتا سکتے ہیں۔ میں تو ان کا اسٹوڈنٹ
تھا۔ سائنس کالج میں اردو کمپوزیشن کے استاد، پٹنہ کالج میں
بی اے میں پرنسپل اردو کے استاد اور ایم اے میں اردو کے
استاد۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۳ء تک کا دس سالہ وقفہ میں نے
اختر صاحب سے بہت قریب ہو کر گزارا ہے۔ دراصل یہ اسی وقت
کا قصہ ہے جو آپ کو سناتا ہوں۔ وہ استاد کیسے تھے یا کیسے
ہیں غالباً ان کے دوسرے شاگردوں نے اس پر قلم اٹھایا ہوگا۔ اختر
صرف ایک پروفیسر ہی نہیں، وہ محض ایک افسانہ نگار یا ادیب ہی
نہیں۔ بلکہ شخصیت رنگا رنگ ہیں۔ اردو شاعروں کے معشوق کی
طرح بت ہزار رنگ اور بت ہزار شیوہ۔ انہیں میں کے چند رنگ
میں آپ کو دکھاؤں گا۔ آپ دیکھئے اور پھر بتائیے کہ زبان، ادب،
سیاست اور انسانیت کے آسمان پر جو یہ سات رنگوں کا دھنک
بصورت اختر نظر آرہا ہے، اس کی یہ ہفت رنگی کیسی ہے۔
رنگوں کی بات آگئی تو اسی زمانہ کا ایک واقعہ یاد آگیا —

بی این کالج کی بزم اردو کا سالانہ اجلاس تھا۔ ۵۰-۱۹۴۸ء
کا زمانہ ہے۔ اختر اورینوی مائک پر ہیں اور زبان و ادب کے
موضوع پر تقریر کر رہے ہیں۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے
زندگی کی بات چل پڑی ہے۔ ازموں کا تذکرہ ہونے لگا ہے۔
سرخ اور گلابی کی تعریف کی جارہی ہے۔ سامنے سہیل عظیم آبادی
بیٹھے ہیں جو اس زمانہ میں اپنے کو ترقی پسند کہا کرتے تھے۔ اختر
صاحب نے کہا کہ میرے دوست سہیل، یہ تو نہ سرخ ہیں نہ گلابی
بلکہ پیازی ہیں۔ تہہ بہ تہہ، رنگ بے رنگ۔ آخری تہہ کھول
دو تو پھر کچھ نہیں۔ نہ مواد نہ رنگ۔ سامعین میں جو نوجوان
طلباء تھے انہوں نے قہقہہ بلند کیا اور سامنے کی صفوں میں بیٹھے
ہوئے ادب نوازوں اور سخن فہموں نے اختر کی نکتہ رسی کی داد دی۔
ادب نوازی اور سخن فہمی کا ذکر آگیا ہے تو اس دس
سالہ دور کی اردو لسانی و ادبی تحریکات کا تذکرہ بھی بے محل
نہ ہوگا۔ اس موضوع پر تفصیل سے دوسرے صاحبان قلم بھی خامہ
فرسائی کریں گے اس لئے میں یہاں چند واقعات کے ذکر تک اپنا
بیان محدود کروں گا۔ اور یہ واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ
شاید کسی نے نہ کیا ہو۔ ۴۷-۱۹۴۳ء کا زمانہ وہ تھا جب ہندوستان
کی ۳۶ کروڑ آبادی آزادی، انقلاب، مسلم لیگ، کانگریس،
پاکستان، اکھنڈ ہندوستان کے دور سے گزر رہی تھی۔ اسے
اردو ہندی ہندوستانی کے مسئلہ کا سامنا بھی ہوتا تھا تو اسی
سیاسی بھول بھلیاں میں یہ مسئلہ گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ اردو کا
رشتہ مسلم لیگ سے جوڑ دیا گیا تھا۔ ہندی سے کانگریس کے
ایک حلقہ کا سمبندھ ہوگیا تھا۔ گاندھی جی نے ہندوستانی کو گلے
لگا لیا تھا۔ آزادی کے فوراً بعد اردو، ہندی اور ہندوستانی کے
شاعر و ادیب و افسانہ نویس کے اعصاب پر پنجاب کی پانچ ندیوں
کا خون سوار ہوگیا۔ ہیر اور رانجھا کی روحوں نے فنکاروں کے دلوں
سے اپنے بسیرے اٹھا لئے۔ بنگال کا جادو ہوا ہوگیا۔ پنجاب کا
آہنگ چوکڑیاں بھول بیٹھا۔ خون کی ندیاں رہ گئیں۔ شاعروں نے انہیں کے

درد بھرے گیت گائے۔ افسانہ نگاروں نے اسی خون کی روشنائی میں اپنا قلم ڈبو کر درد بھری کہانی سنائی۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور ہٹلر کی فوجیں سوویت روس کی سرحدوں میں بھی داخل ہو گئیں تو نازی اور فسطائی طاقتوں کے خلاف جہاں اتحادی فوجوں نے تلوار سونت لی وہیں دنیا کے فن کاروں نے ان فسطائی طاقتوں کے خلاف قلم اٹھا لیا۔ انہیں ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور فن کاروں کی صف میں اختر اورینوی بھی تھے اور پیش پیش تھے۔ فن کاروں کے اس کاروان کی اگوانی دنیا کے ترقی پسند مصنفین کا منظم گروہ کر رہا تھا۔

ادھر جنگ ختم ہو گئی اور ادیبوں کی جماعت میں بھی PURGING شروع ہو گئی۔ فوجوں کی لام بندی ایک جزو لازم ہے۔ سیاست میں صف بندی (REGIMENTATION) ہمیشہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ ادب میں یہ تفریق من و تو (WATER TIGHT COMPARTMENT) ایک لمحہ چلنے والی چیز نہیں مگر انجمن ترقی پسند مصنفین کے "دنا تم" فن کاروں نے اپنی صفوں کو "رجعت پرست اور قدامت پسند" عناصر سے پاک کر دیا۔ اختر اورینوی قلعہ سے باہر نکال دیے گئے۔ وہ زمانہ تھا جب آگ، خون، قتل، بربادی، جنگ، فساد کے علاوہ شعر، ادب، مشاعرہ اور مناظرہ کی بات بھی کانوں پر گراں گذرتی تھی۔ ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ برج بانو نے ارض پاک کا سفر اختیار کیا تھا۔ برج بانو کے بھنویں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی بھی پاکستان چلے گئے تھے ہندی کو راج سنگھاسن پر بیٹھانے کے منصوبے باندھے جانے لگے تھے۔ اردو کا نام لینا اور پاکستان کی حمایت کرنا مرادف سمجھا جانے لگا تھا۔ اسی زمانہ میں عظیم آباد کے کچھ نوجوان اٹھے۔ کھڑے ہوئے اور ابھرے۔ انہوں نے اردو کا نام لیا۔ رقیبوں نے تھانے میں جا کر رپٹ لکھوائی۔ انہوں نے اردو کا نعرہ بلند کیا۔ سیاست کے گرگ ہائے باراں دیدہ کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اردو کا پرچم اونچا کیا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں بہار صوبائی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سکریٹری تھا۔ اور اس کے ہفتہ وار سرکاری آرگن "نوجوان" کا مدیر اعلیٰ۔ بہار صوبائی مسلم لیگ کے علمبرداروں نے اپنا سبز جھنڈا اتار کر اسے کفن کی سفید چادر اڑھا دی تھی اور خود مصلحتوں کی سہ رنگی چادر اوڑھ کر خاموش لیٹ گئے تھے۔ ہم بد دل ہو گئے۔ مایوسی نے آ دبوچا۔ پست ہمتی نے غلبہ کر لیا۔ لیکن رگوں میں وہ خون اب بھی دوڑ رہا تھا جو آنکھ سے ٹپک پڑنے کو بے قرار رہتا ہے۔ اختر اورینوی نے صور پھونکا اور ہم قیامت کی نیند سے چونکے۔ اختر نے کہا کہ نوجوانو یہ گھڑی محشر کی ہے اور تم عرصۂ محشر میں ہو۔ خاموش بیٹھ رہنے کا، جھنڈا گرا دینے کا، مصلحت کے نام پر بزدلی دکھانے کا نہیں عمل کے میدان میں کارگزاری کے گھوڑے پر سرگرمی کی تلوار چمکانے کا وقت ہے۔ نوجوان اٹھے۔ "حلقۂ احباب نوجوان" نام کی انجمن کی بنیاد پڑ گئی۔ اختر اورینوی رحیل کارواں کا کام انجام دے رہے تھے۔ کارواں پھر جادہ پیما ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسد حسین نظر آئے۔ ان دنوں امریکہ میں ہیں۔ سید احمد پہ نظر پڑی۔ خرطوم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ سید سعید اختر بھی تھے۔ سمڈیگا کالج کے پرنسپل ہیں۔ سید محمد عزیز ہاشمی ان دنوں موتی ہاری کے کامیاب وکیل ہیں۔ محمد شہباز حسین جو آج کل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں، سراج گیلانی ان دنوں لندن میں ہیں، ع م ساجد محکمہ تعلیم میں ہیں، سید شبیر حسن بیتیا کالج میں ہیں، سید احمد جو متھرا میں پروفیسر ہیں، مرحوم سید ظل حسین، قمر التوحید جو حال ہی میں انگلستان سے واپس آئے ہیں اور بھاگلپور کالج میں ہیں، ابرار الہدیٰ خاں جو یونیورسٹی میں ہیں، محمد خلیل الرحمٰن جو سرکاری ملازمت میں ہیں، صلاح الدین، عبد الرحمٰن، ایس ایم ہاشم، رضا دائم وی، صابر

کریمی، میاں محمد یونس، محمد عباس ہندوی، صفی احمد غنچہ، سید حسن بھیپوروی، ایس ایم اقبال، مشتاق احمد اسحاقوی، محمد طفیل مرحوم، ضیاء الرحمٰن، وغیرہ ذہین اور سرگرم عمل نوجوانوں کا ایک قافلہ نظر آیا۔ اور ہم آگے بڑھے۔ "حلقہ احباب نوجوان" نے پہلے "حلقہ ادب" کا لبادہ اوڑھا۔ پھر "حلقہ ادب بہار" بن کر بہار میں چھا گیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس ہوئی۔ ڈاکٹر سچیدانند سنہا نے اس کی مخالفت کی۔ پھر بھی کانفرنس ہو ہی گئی۔ اس موقعہ پر آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا۔ حضرت جوش ملیح آبادی میر مجلس تھے۔ اسٹیج پر حلقہ ادب کے سرگرم عمل اور دھن کے پکے نوجوان تھے۔ پردے کے پیچھے اختر اورینوی (PROMPTER) کے فرائض بہ طریق احسن انجام دے رہے تھے۔ نوجوان کا "ہم کیا کریں نمبر" شائع ہوا۔ ہم نے لکھنؤ، علی گڑھ، دلی، کلکتہ کا دورہ کیا۔ اختر صاحب نے ہمت بندھائی اور سنہ ۱۹۴۹ء ہی میں یہ نمبر منظر عام پر آیا۔ اختر اورینوی مشاعروں میں شعر پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے، نجی صحبتوں میں مشورے دیتے، اسٹیج پر ایکٹنگ کے گر بتاتے، کلاس میں درس دیتے، بند کمرے میں شطرنج کی چال سکھلاتے اور اور آڑے وقتوں سپر بن کر کھڑے ہو جاتے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں حلقہ ادب کا سالانہ اجلاس انجمن اسلامیہ میں ہو رہا ہے۔ خیر بھو روی علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو ہند کے آرگنائزر کی حیثیت سے آئے ہیں۔ انصاری ہیں، نور ہیں، ایوّب ہیں (مرحوم)، اختر ہیں، مظہر ہیں اور بیتاب بھی ہیں۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑتی ہے۔ ادھر حلقہ ادب کے مقابلہ پر بہار کی انجمن ترقی پسند مصنفین کمر کس کر میدان میں آگئی تھی تو اختر، حلقہ کے تیرہ نوجوانوں کا گروپ لے کر میدان میں اتر گئے تھے، ادھر پھر ایک جماعت مخالفت پر کمربستہ نظر آئی تو ایوب، اختر، سرور، اور بیتاب ان کے مقابلہ پر سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ حلقہ ادب کے نوجوانوں کی مسیں بھیگ چکی تھیں۔ سبزہ خط آغاز کی منزل سے آگے آچکے تھے۔ انہوں نے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور ہاتھ میں لے لی۔ میں جنرل سکریٹری، بیتاب سکریٹری، اسد سکریٹری نشر و اشاعت، سعید اختر نائب سکریٹری بنے، اختر نائب صدر ہوئے۔ مرحوم ایوب اسی موڑ پر اردو کے قافلے کے ساتھ ہوئے اور چند برسوں میں ہی روح رواں اور قائد اردو کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یعنی آزادی کے بعد دس سال تک پٹنہ کالج کے اندر اور کالج کے احاطہ سے باہر اردو کی ہر تحریک میں اختر اورینوی متحرک نظر آئے۔ بزم ادب ہو یا حلقہ ادب بہار ہو یا انجمن ترقی اردو ہر جگہ سنہ ۱۹۳۷ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۸ء تک اختر اورینوی مرکزی کردار کا رول ادا کرتے رہے۔ مولانا بیتاب جناب انجمن کے جنرل سکریٹری ہیں اور جنہیں اب مولانا اردو یا بیتابِ اردو کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ اختر صاحب کی ان سرگرمیوں کا ذکر کریں گے جن کا تعلق اردو تحریک یا انجمن اردو سے ہے میں یہاں صرف ایک واقعہ بیان کر دوں جو شاید بیتاب صاحب کے ذہن میں نہ آسکا ہو۔ پٹنہ یونیورسیٹی میں اردو، فارسی اور عربی کے شعبوں کو ضم کر کے ایک شعبہ بنانے کی اسکیم سامنے آئی۔ اختر صاحب سیماب بن گئے۔ حلقہ ادب کا میمورنڈم، انجمن ترقی اردو کا وفد، انجمن ترقی پسندوں کا احتجاج، اخباروں کے مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ پٹنہ سے دلی تک ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ دلی قریب لے آئی گئی اور آخر یہ اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ اس کامیابی کا سہرا سب سے زیادہ اختر صاحب ہی کے سر ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چاہے میمورنڈم مرتب کرنا ہو یا وفد کی تشکیل کرنی ہو یا ڈرامہ اسٹیج کرنا ہو، اختر صاحب کی ضرورت ہر جگہ محسوس ہوتی رہی اور وہ ہر جگہ مستعد نظر آئے۔ اسٹیج کے اوپر اختر کی صورت نظر آتی اور پردہ کے پیچھے اختر کی آواز ابھرتی۔

اسٹیج اور ڈرامہ کی بات آگئی ہے تو ذرا آپ کو اس

دنیا کی سیر بھی کرا دیں۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت
اختر اورینوی گویا پٹنہ کے آغا حشر ہو رہے تھے۔ یا یوں سمجھ
لیجیے کہ ایک واجد علی شاہ اختر تھے کہ ڈرامہ، ناٹک اور اسٹیج
انکی تفریح طبع کے لئے تھے۔ اسٹیج ہر وقت سجا رہتا تھا کہ کب
تاجدار اودھ کا من چاہے اور وہ اس طرف آ دھمکیں۔ اور
دوسرے یہ سید اختر احمد اختر ہیں کہ یہ خود اسٹیج سجاتے، پردہ
اٹھاتے، پردہ گراتے۔ وہی پروڈیوسر بھی تھے اور ڈائرکٹر بھی۔
وہ بزم ادب پٹنہ کالج کے صدر ہوا کرتے تھے۔ اور ہر سال
بزم ادب کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک ڈرامہ اسٹیج کیا
جاتا۔ ادبی دنیا میں اس سالانہ تقریب نے ایک خاص اہمیت
اختیار کر لی تھی۔ لوگ دور دور سے بزم کے سالانہ جلسہ میں اسی
غرض سے شرکت کرتے۔ کبھی ابلیس کی مجلس شوریٰ بیٹھتی، کبھی
گذری ہوئی روحوں کا مشاعرہ منعقد ہوتا اور کبھی جگ دنگی کا سماں
ہوتا۔ پٹنہ کالج کے جمنازیم میں ڈرامے بڑے اہتمام سے ہوتے۔
جب تک ڈراپ سین نہ ہو جاتا اختر کو قرار نہ ہوتا۔ جمنازیم میں
ڈرامہ ہو رہا ہے۔ زبان کا مسئلہ ڈرامہ کا عنوان ہے۔ صرف
پانچ کردار ہیں۔ میں پگڑی باندھے پنڈت پاکھنڈانند جی کا رول ادا
کر رہا ہوں اور سنسکرت آمیز زبان استعمال کر رہا ہوں۔ ایک جملہ
اب تک ذہن میں محفوظ ہے سن لیجیے "شانتا تو پرم سُندری اپسرا
سدرش کلپنا پورن ہے اس کی پراپتی کے لئے میں اتینت وِیگر
تھا چنتا شن ہو رہے ہوں"۔ رگھو ویری ہندی والے پنڈت
سے ہم کلام ہیں مولانا ابو العلی بغدادی۔ سید ابو نصر ان کا رول ادا
کر رہے تھے۔ اور ہم دونوں کی بات چیت میں حصہ لے رہے ہیں
عبدالحمید انصاری جو مسٹر جان بنے ہیں اور ہر جملہ میں نصف الفاظ
انگریزی کے بولتے ہیں۔ انگریزی اور ہندوستانی کی اس ادھ کچری
غلط الخط والی زبان کے مقابلہ منشی الفت رائے ہیں۔ سید
سلطان احمد منشی جی کے روپ میں صحیح 'عام فہم' سیدھی اور سہل
ہندوستانی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ وہی ڈرامہ کے مرکزی

کردار ہیں جن کی زبان سب سمجھ رہے ہیں۔ پانچواں کردار فاروقی
ہیں جو رام چیلا کا کام انجام دے رہے ہیں۔ کبھی مولانا بغدادی
کا حقہ تازہ کر رہے ہیں، کبھی پنڈت جی کو کھینی کے لئے چونا فراہم
کر رہے ہیں اور کبھی مسٹر جان کے پائپ میں سلائی لگا رہے ہیں۔
ڈرامہ سے گھنٹہ بھر پیشتر اختر اورینوی نے مجھے آواز دی۔ اور کہا
کہ سب کچھ تو ہو گیا مگر منشی الفت رائے کی پگڑی کا انتظام نہیں ہوا۔
اب اس وقت کیا کیا جائے۔ میں نے ایک دعوتی کارڈ لفافہ میں
بھرا سیدھا سامنے کے محلہ بیر پہوڑی کی طرف روانہ ہوا۔ ایک صاحب
پگڑی بردار نظر آئے۔ جان نہ پہچان جناب عالی سلام کیا۔ مان نہ
مان تو میرا مہمان بنایا۔ دعوت نامہ حوالہ کیا۔ عصا مع پگڑی مستعار
لے کر خود ان کا سہارا بنا اور انہیں لاکر جمنازیم کی اگلی صفوں میں
بٹھا دیا اور اس طرح پگڑی کا انتظام ہوا۔ انجمن اسلامیہ ہال میں
یوم غالب کے موقع پر بہار کی روحوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ حلقہ
ادب اور انجمن ترقی پسند مصنفین والے مل جل کر اس تقریب میں
شریک ہیں۔ اختر نے مکالمہ مرتب کیا ہے۔ مواد فراہم کیا ہے۔
کردار چنے ہیں اور ہدایت کاری کی ہے۔ پبلسٹی خوب ہوئی ہے۔
پوسٹروں میں یہ بھی درج ہے کہ خواتین کے لئے پردہ کا خاص اہتمام
رہے گا۔ لو آخری وقت آپہونچا اور پتہ چلا کہ چلمن کا بندوبست
نہ ہو سکا۔ اختر صاحب نے مجھ سے کہا۔ سعید اختر اور اسد حسین دوڑا بھیجے
گئے۔ گول گھر کے پاس چلمن بنانے والوں سے ملے۔ ناکامی ہوئی۔
دونوں رکشے پر سوار ہوئے اور پٹنہ سیٹی بازار حسن پہونچ گئے۔
وہاں بے پردہ چلمن والیوں سے چلمن مستعار لیا اور پردہ نشین
خواتین کے لئے پردہ کا اہتمام بھی ہو گیا۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا۔
میڈیکل کالج کے سید نذر امام ہوں یا پٹنہ کالج کے قمر التوحید یا
انجینئرنگ کالج کے محمد نسیم یا سائنس کالج کے جنید عالم یا بی این
کالج کے ظفر محمد سب زندگی کے ڈرامے کے چلتے پھرتے کردار اسٹیج
پر خود متحرک ہیں اور اسی طرح قوم اور ملت کی منجمد رگوں میں خون
دوڑانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد ہی کانگریس

دو حصوں میں بٹ گئی۔ اور سوشلسٹ پارٹی نے اپنی ڈفلی الگ
بجائی۔ پٹنہ کے لان میں جو اس وقت تک گاندھی میدان نہیں ہوا
تھا آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی سہ روزہ کانفرنس بڑے طمطراق
سے ہوئی۔ ادبی اور ثقافتی پروگرام بھی ہوئے۔ روحوں کا مشاعرہ
بھی اسٹیج کرنے کا پروگرام بنا۔ شری رام برکش بینی پوری نے اختر
اورینوی کو اور اختر اورینوی نے مجھے پکڑا۔ ہم نے میرؔ، داغؔ، غالبؔ،
مومنؔ، حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، نسیمؔ کی تلاش شروع کر دی۔
اسی درمیان شری رام دھاری سنگھ دنکر کباب میں ہڈی بن کر داخل
ہوئے۔ طے ہوا کہ کویوں کا کوی سمیلن بھی اسٹیج ہو۔ بینی پوری
سوشلسٹ مزاج رکھتے تھے کہا دونوں ساتھ ہو۔ مشترکہ مشاعرہ
و کوی سمیلن منعقد کیا جائے۔ دنکر پر اس زمانہ میں بھی ہندی آمریت
کا بھوت سوار تھا۔ اردو سے ہندی کے لٹنے کے اندیشہ نے انہیں اس
تجویز پر رضامند نہ ہونے دیا۔ طے ہو گیا کہ الگ الگ ہو۔ وہ
مصر رہے کہ پہلے ہندی والوں کا سمیلن ہو جائے پھر اردو کا فنکشن
ہو۔ ہم اس پر تیار نہ ہوئے۔ بینی پوری نے ہماری حمایت کی۔ پہلے
روحوں کا مشاعرہ ہو گیا اور میرؔ سے لے کر شادؔ تک نے خوب
خوب داد تحسین وصول کیا۔ بڑا بھلا مجمع تھا۔ ہزاروں سامعین تھے۔
پروگرام کامیاب رہا۔ پھر ڈھول آیا۔ مجیرا باجا۔ طبلہ لایا گیا۔
سارنگی لائی گئی اور کویوں کی گوشٹی آرمبھ ہوئی۔ تار باجا اور
راگ بوجھا ہم تو اخلاقاً بیٹھے رہ گئے۔ سامعین ایک ایک کر کے
سب اٹھ گئے۔ ابھی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی سرکاری زبان
کا فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن جنتا جناردھن نے اردو کی مقبولیت اور
برتری پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔ افسوس سیاست کی عینک نے
اردو کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیا۔ آج بھی سیاست کی یہ
پٹی آنکھوں پر سے اتار دی جائے تو یرقان کی بیماری رفع ہو جائے۔
اسی سیاست نے ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ تقسیم سے
پہلے بہار میں فسادات ہوئے۔ شیو جی کی جٹا سے نکلنے اور گنگوتری
سے پھوٹنے والی، کہساروں، مرغزاروں اور سبزہ زاروں سے
اچھلتی، پھسلتی، سرکتی اور بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی دریائے گنگا کا
صاف، شفاف، پوتر اور اجلا پانی سرخ ہو گیا۔ معصوموں،
بے کسوں اور بے بسوں کے خون ناحق سے بہار کی سرزمین
سیراب ہو گئی۔ شہیدوں کا خون اس سرزمین میں جذب ہو گیا
جہاں مہاتما بدھ نے اہنسا کی تعلیم دی تھی، جہاں سمراٹ
اشوک اعظم نے عدم تشدد کی مثال قائم کی تھی اور جہاں گاندھی
جی نے اپنی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ مسلمان ہراساں
و پریشاں نظر آئے۔ وہ مایوس اور بددل ہو گئے۔ ہمت ہارنے
لگے۔ ان کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ان کے
دل بیٹھنے اور نبض ڈوبنے لگی۔ اختر اورینوی نے جلال الدین
خوارزم شاہ کے واقعات پر ایک ڈرامہ ترتیب کیا۔ خوارزم
شاہ کی بیوی کی جگہ دو بچوں نے لے لی۔ مکالمہ تیار ہو گیا۔
اور ہم نے بنک روڈ میں یہ ڈرامہ اسٹیج کیا۔ مسلمان بھاری
تعداد میں آئے۔ اس ڈرامہ سے ان کی ہمت بندھی۔ ان کا
MORALE سدھرا۔ وہ ٹھٹھکے اور ٹھہر گئے۔ بھگدڑ رکی
اور مردہ رگوں میں پھر خون دوڑنے لگا۔ ڈرامہ کا آغاز
علامہ اقبالؔ کے فارسی کلام سے ہوا۔ "از خواب گراں،
خواب گراں، خواب گراں خیز"۔ میں نے بہ آواز بلند اسے
پردہ کے پیچھے سے موثر آواز میں پڑھا۔ ڈراپ سین کے
بعد پس منظر سے شاعر مشرق کی نظم کورس میں پڑھی گئی ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فضا دیکھ سماں دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

سیاست بھی عجیب چیز ہے۔ دلوں کو جوڑتی بھی ہے۔ چاہے
تو دو قوموں کو ایک کر دے اور نہ چاہے تو ایک قوم کے
دو ٹکڑے ہو جائیں۔

بات پہ بات نکلتی آ رہی ہے۔ قوموں اور ٹکڑوں کا
ذکر آ گیا تو ایک واقعہ اور درج کر دوں۔ فسادات بہار
رنگ لا کر رہے۔ خون شہیداں رائیگاں نہ گیا۔ ملک کے

تقسیم کی بنیاد پڑ گئی۔ نفرت کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ فرنگی کی چال کامیاب ہو گئی۔ اس نے ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کر دی۔ بعض علاقوں میں ریفرینڈم اور رائے شماری کا فیصلہ ٹھہرا۔ آسام میں ریفرینڈم کا اعلان ہوا۔ استاد نے کہا یہ وقت یہاں بیٹھے رہنے کا نہیں۔ چند شاگردان رشید نے کمبل کاندھے پر ڈال سلہٹ کا رخ کیا۔ نہ گھر پر خبر کی نہ تیاری کرنی پڑی۔ استاد کے دل و جگر میں ملت کا درد تھا۔ شاگردوں کے سینے میں جذبہ قومی موجزن تھا۔ استاد کی دیر بھی تعمیل میں تاخیر نہ ہوئی۔ ان لوگوں نے کتنے پالے مارے تھے یہ پلہ بھی انہیں کے حق میں رہا۔ ہندوستان کا مسلمان تقسیم سے پہلے پاکستان کے سوا اور کچھ نہ سوچتا تھا۔ اس نے پاکستان بنا کر چھوڑا۔ ہاں ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے بعد کتنے سانپوں نے کینچلیاں بدلیں، کتنے گرگٹوں نے رنگ بدلے، کتنے انسانوں نے ٹوپی بدل لی، دنیا ہی بدل گئی۔ نہ پاکستان خوابوں کا وہ ارضِ پاک ہی رہ گیا اور نہ ہندوستان رشیوں اور صوفیوں کی پوتر دھرتی ہی رہ گئی۔ پاکستان سے پاکستانی کیسے نپٹے یہ وہ جانیں، ہاں ہمیں یہاں عزیزان مصر، ہوس و اقتدار کی زلیخاؤں، چاہِ کنعاں اور بازار مصر میں برادران یوسف سے جس طرح نپٹنا پڑا ہے وہ ہمیں جانتے ہیں۔

آزادی مل گئی۔ ہندوستان اور پاکستان بھی بن گیا۔ ہندوستان میں کروڑوں مسلمان رہ گئے۔ کسی نے دن کی روشنی میں ترنگے جھنڈے کو سلامی دی اور راتوں رات بستر لپیٹ کر صبح کی خاموشی میں پاکستان فرار ہو گیا۔ کسی نے گاندھی جی کے دست ہائے دراز کا سہارا ڈھونڈھا۔ کوئی جواہر لال کی بے داغ سفید اچکن کے دامن میں پناہ لینے کو دبک بیٹھا اور کوئی چپ چاپ اپنے گھر پر کھاٹ بچھا کر اور لنگوٹ اٹھا کر لیٹ رہا۔ لیکن اس بظاہر مایوس کن ماحول میں بھی امید کی چنگاری جگنو بن کر اڑتی اور راہ بھولے ہوؤں کو اندھیاری بھادوں کی رات کی بجلی کی چمک کی طرح راہ دکھاتی رہی۔ میں نے نوجوان کا "ہم کیا کریں" نمبر اسی اندھیرے میں راہ ٹٹولتے ہوئے شائع کیا۔ میں خود سر ضیاء الدین سے ملا، نواب محمد اسمٰعیل خاں سے ملاقات کی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے تبادلہ خیال کیا، حسین شہید سہروردی اور محمد اسمٰعیل سب سے ملاقات کی۔ اسی دوران میں اختر اورینوی کا دل مضطر بھی قرار نہ پا سکا۔ جب ان کے ڈیرے پر جائیے تو معلوم ہوگا باہر گئے ہیں۔ واپس آئے تو پتہ چلا [illegible] لاری کے مسلم کنونشن میں شرکت کرنے گئے تھے۔ کبھی پتہ چلا کہ سہروردی کی طلب کردہ کنونشن میں شریک ہونے گئے تھے۔ محمد اسمٰعیل، خلیق الزماں، لاری، سہروردی اور آزاد نے اسی غرض سے اجتماعات بلائے کہ ہندوستان کے مسلمان ان بدلے ہوئے حالات میں کیا لائحہ عمل اور راہ عمل اختیار کریں۔ ہندوستان کا مسلمان روشنی کی اس کرن کی تلاش میں مدراس سے کلکتہ اور کلکتہ سے لکھنؤ مارا مارا پھر رہا تھا جس سے اسے منزل مقصود کو جانے والا راستہ صاف نظر آئے۔ اختر اورینوی ان سے بیشتر اجتماعات میں خود شریک ہوئے۔ ان کی حیثیت یہاں قائد کی نہ تھی بلکہ وہ خود قائد دیگر کی جستجو میں سرگرداں تھے۔ "اب کیا ہوگا" یہی سوال تھا جو ہر اختر میں سودا بن کر بس گیا تھا۔

یہ سوال سب سے زیادہ کب ابھرا اس کی صرف ایک مثال آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی شام ہے۔ یہیں اشرف محمد، ڈاکٹر منصور، ڈاکٹر سعید احمد عزیز اور سید ابو جعفر (ان میں سے میرے علاوہ باقی سب اس وقت پاکستان میں ہیں) انجمن اسلامیہ کی دوسری منزل پر اس کمرے میں بیٹھے ہیں جو اس وقت انجمن ترقی اردو کا دفتر ہے۔ اور جو اس وقت بہار ریاستی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا دفتر تھا اور انجمن یہ انجمن مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے حلقہ احباب نوجوان، پھر حلقہ ادب بہار، پھر نوجوان اور پھر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں منتقل ہوتا رہا۔ زبیر ملک جو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری تھے اور ان دنوں

پاکستان میں ہیں۔ بھٹنک ہوٹل میں چائے پینے گئے ہیں۔ بھٹنک
ہوٹل وہیں تھا جہاں اب انجمن اسلامیہ کے پاس قبرستان ہے۔
وہ مسلمانوں کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔ نہ
معلوم کتنی یادیں اپنے ساتھ لئے بھٹنک ہوٹل زمین کے برابر ہو گیا۔
زبیرو دوڑتے ہوئے اور ہانپتے کانپتے دفتر میں آئے اور خبر سنائی
کہ گاندھی جی مار دیئے گئے۔ سارے بدن میں تو جیسے کاٹو تو لہو
نہیں۔ دماغ سن سے ہو گیا۔ جسم سُن ہو گیا۔ میں اٹھا۔ سائیکل
اٹھائی اور سیدھا مسلم ہوسٹل پہونچا جو آج کل اقبال ہوسٹل ہے۔
میں بی اے میں انگریزی آنرز کا اسٹوڈنٹ تھا۔ مسلم ہوسٹل کے
کمرہ نمبر ۵۶ میں رہتا تھا۔ اختر اورینوی ہمارے ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ
تھے۔ پچاس سے اوپر مسلمان لڑکے اور بیس سے اوپر ہندو لڑکے
اس ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہوسٹل پہونچا تو دیکھا کہ ہوسٹل کے میدان
میں لڑکے کھڑے ہیں اور اختر اورینوی درمیان میں کھڑے دعائیں
مانگ رہے ہیں۔

"ہے ایشور! ہے خدا! ہے پرماتما! یا اللہ! یا GOD
یا معبود حقیقی ہم پر رحم کر۔ ہمارے ملک کو آفت سے
بچا لے..........."

ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ "کہیں کسی مسلمان نے تو نہ مار دیا"
"اور اگر ایسا ہی ہوا تو اب ان کروڑوں مسلمانوں کا کیا ہوگا"
"اب کیا ہوگا"۔ اختر اورینوی گھنٹہ بھر رقت بھری آواز
سے یہی دعائیں مانگتے رہے۔ آنکھوں سے آنسوں رواں تھے۔ جسم
پر رعشہ طاری تھا اور زبان پر دعائیہ کلمے جاری تھے۔ پنڈت نہرو
نے شاعری کی "ایک پاگل انسان نے باپو کو مار دیا"۔ سب سے پہلے
بی بی سی لندن، فوراً ہی بعد ریڈیو پاکستان اور بعد میں ہندوستان میں
سب سے پہلے سردار پٹیل نے یہ خبر سنائی کہ گولی مارنے والا نتھو رام
گوڈسے تھا۔ ایک ہندو تھا۔ مسلمان نہ تھا۔ گاندھی جی کے مارے جانے
کا گھاؤ تو رہ گیا لیکن دماغی کھنچاؤ کی جو کیفیت تھی وہ جاتی رہی۔ قدرے
سکون محسوس ہوا۔ جان میں جان آئی۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس
نیچے رہ گئی تھی اب سانسیں اوپر نیچے چلنے لگیں۔ اختر صاحب اپنے کوارٹر
میں آ گئے۔ وہ مسلم ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور سپرنٹنڈنٹ کا کوارٹر
ہوسٹل سے متصل ہے۔

ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کی بات آ گئی تو ایک واقعہ بھی سنا دوں۔ اختر صاحب
ان لوگوں میں تھے جو خواہ مخواہ رعب جماتے ہیں۔ اختر صاحب کا جو اثر و رسوخ
پر تھا اور طلبہ ان کی جو قدر کرتے تھے وہ کالج کے کم ہی اساتذہ کو نصیب تھی۔
وہ جو "رعب" اور "داب" کا تصور ہے وہ ان کے سر تو نہ تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہوسٹل
کے نئے لڑکوں پر تو ہوسٹل کے چیف وارڈر چھکو میاں کا رعب زیادہ تھا۔ میں
ایک بار کسی قومی کام سے باہر گیا۔ دیر سے پہنچنے کے بعد لوٹا۔ غلطی سے کمرے
میں لائٹ آف کر کے نہ گیا تھا چنانچہ روشنی جلتی رہی۔ بغیر اجازت بلکہ بلا اطلاع
گیا تھا۔ واپسی پر جب سپرنٹنڈنٹ صاحب سے مجھے سامنا ہوا تو کہنے لگے بھائی بتی تو
گل کر کے جایا کریں اگر کہیں جائیں تو۔ ان سے سب اپنائیت محسوس کرتے تھے۔
وہ لڑکے ہوں، سینیر یا جونیر یا پھر ملازم ہوں یا جی ہاں حضور کہنے والا اصغر
ہو جو ہمیں ناشتہ کراتا۔ وہ اس وقت بھی مسلم ہوسٹل کے ناشتہ کا ٹھیکہ دار
تھا جب اختر صاحب بورڈر تھے۔ پھر اس زمانے میں بھی رہا جب وہ سپرنٹنڈنٹ
ہوئے۔ اور شاید اب بھی ہے جب مسلم ہوسٹل اقبال ہوسٹل ہو گیا۔ اور نہ معلوم
کب تک رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ سب کے سب ان سے مانوس تھے۔ انہیں
اپنا سمجھتے تھے۔

جب تمام باتیں ہو رہی ہیں تو میں وہ واقعہ بھی کیوں نہ درج کردوں
جب میرے اور اختر صاحب کے تعلقات کی ریشمی ڈوری ٹوٹ گئی تھی۔ شیشے میں
بال آ گیا تھا۔ تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ میں اردو ایم اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔
اختر صاحب میرے استاد تھے۔ حافظ شمس منیری صاحب صدر شعبہ اردو تھے۔ علامہ
جمیل مظہری اور پروفیسر صدر الدین فضا میرے استاد تھے۔ اس وقت پارٹ
وَن اور پارٹ ٹو کے امتحانات الگ ہوتے تھے۔ کالج کی پوری تعلیم تو میری
قومی، ملی ہنگامی سرگرمیوں میں گذر گئی اور ریزلٹ خاطر خواہ نہ کر سکا۔
سوچا اردو زبان و ادب سے شروع سے خاص شغف رہا ہے۔ چند مہینے جی لگا کر
پڑھوں تاکہ یہ آخری زینہ بطریق احسن طے کر سکوں۔ تین مہینے محنت کر کے
تیاری کی۔ امتحان بھی دیا۔ ریزلٹ سے ایک دن پیشتر پتہ چلا کہ میں سیکنڈ

ہوگیا اور شمیم آرا، رحمٰن اور آئیں - محض حجاب و قبر کا فرق - بس میں
علی الصباح سارنگدھر سنگھ کے پاس تحریری شکایت لے کر پہونچا - وہ وائس
چانسلر تھے - ہنگامہ ہوگیا - ریزلٹ رک گیا - اور یہیں سے میرے اور
اختر صاحب کے تعلقات کشیدہ ہوگئے - یونیورسٹی چھوڑنے کی بات آئی -
کلیم الدین احمد جو وارڈن تھے ان سے شکایت کی گئی اور یہ سلسلہ مہینوں
چلتا رہا - انجام کار کلیم صاحب اور حافظ شمس الدین صاحب کے حکم
کی تعمیل میں میں ٹھہر گیا اور پارٹ ٹو کے کلاس کرنے لگا - اختر صاحب
کا کلاس ہوتا تو ہم دونوں خاموش بیٹھے رہتے - مہینوں بعد
آخر یہ سلسلہ ٹوٹا - مسلسل دو گھنٹے میں اور اختر صاحب کلاس
روم میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے - میں ان کے کوارٹر
گیا - اور سارا میل دھل گیا - شکیلہ اختر بھی مجھے جانتی،
مانتی اور چاہتی تھیں - ہم بھول گئے کہ کبھی کچھ ہوا تھا - اختر صاحب
پھر اسی طرح ایک شفیق استاد اور رفیق کار ہو گئے - میں پھر
ایک سعادت مند طالب علم اور حکم کا بندہ ہوگیا - وہ دن
ہے اور آج کا دن ہے - پھر کبھی اختر صاحب نے اور میں
نے دل میں وہ بات بھی نہ لائی - اختر صاحب کا یہ بڑپن ہے
اور بلاشبہہ انہوں نے انسانی عظمت کا عملی ثبوت گذرے
ہوئے برسوں میں پیش کیا - اختر اورینوی سے آپ کو
سیاسی، نظریاتی، فکری، ادبی اختلاف ہو سکتا ہے
مگر وہ بات چیت میں، ملنے جلنے میں، بات اخلاق میں ہرگز
ان اختلافات کو اثرانداز نہیں ہونے دیتے -

لوگ کہتے ہیں اختر صاحب قادیانی ہیں اور اپنے اسٹوڈنٹس
پر قادیانیت کی تبلیغ کرتے ہیں - میں دس سال اختر صاحب کی رگ
جاں کے قریب رہا ہوں - میں یا میرے کسی ساتھی کو کبھی یہ شکایت
نہیں ہوئی کہ اختر صاحب اپنا عقیدہ کسی پر تھوپنا چاہتے ہیں -
ان کا اپنا ایک عقیدہ ہے - ہم اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتے پھر بھی
زبان، ادب، قوم، ملت اور سماج کی سطح پر ہم جس طرح
ان کی رہنمائی میں، ان کے ساتھ اور کبھی ان کو ساتھ لے کر آج
کام کرتے ہیں اسی کا اصلی نام جذباتی ہم آہنگی ہے - میں
تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ پروفیسر اختر اورینوی،
فضل احمد ایس پی اور ڈاکٹر منصور جس طرح کے قادیانی
ہیں اور اپنی آمدنی کا جو حصہ وہ اپنے مذہب کی خاطر ماہانہ
وقف کرتے ہیں کاش ہم قادیانیوں پر لعن طعن کرنے کی بجائے
اپنے عقیدہ کے ویسے ہی پکے مسلمان ہو جائیں اور ہر ممکن جانی
و مالی ایثار و قربانی کے لئے تیار ہو جائیں تو آج ہمارے یہ
سارے قومی و ملی مسئلے یکسر حل ہو جائیں -

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی - بقول شاعر ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

حالانکہ یہاں معاملہ الٹا ہے - یعنی ذکر چھڑا اختر کی جوانی کا -
اور بات پہونچی آج کی قیامت سامانی تک - کاش ہم اب
بھی یہ سمجھ سکیں کہ یک لحظہ غافل ہونے کا مطلب صد سالہ راہم
دور شد ہوتا ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

اختر صاحب ادیب کیسے ہیں، مقرر کیسے ہیں، افسانہ
نگار اور شاعر کیسے ہیں دوسروں سے سنئے - ہم نے جو
قوس قزح آپ کے سامنے رکھا اس کے سات رنگ آپ دیکھ
چکے - وہ پروڈیوسر ڈائرکٹر ہیں، ان میں لیڈرشپ کی
صلاحیت ہے، وہ اردو کے رسیا ہیں، ایک شریف اور خلیق
انسان ہیں، ایک فاضل و شفیق استاد ہیں، ایک دردمند
دل والے ہیں اور اپنے عقیدے میں پختہ ایک قادیانی ہیں -
میرا مقصد یہی تھا کہ یہ دھنک آپ کو دکھاؤں - اور وہ آپ
دیکھ چکے -

قاضی عبدالستار

"بسٹیرہ" کے سامنے گرنے پر ساتی پانی کی میلی چاندنی بچھی تھی۔ دور بھیگی سڑک پڑی تھی۔ جیسے دھوبی نے یہاں سے وہاں تک سرمئی ساریاں سوکھنے کے لئے ڈال دی ہوں۔ بادل درختوں کی پھنگیوں پر جھول رہے تھے۔ اور ہم دونوں شطرنج کھیل رہے تھے۔ گویا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے جلالی وظیفے پڑھ رہے ہوں کہ انور کی آواز ہتھوڑے کی طرح سکوت کی بلوریں چادر پر گر پڑی

آپ انور کو جانتے ہیں؟

کچھ لوگ زندگی میں دبے پاؤں اس طرح داخل ہو جاتے ہیں، شامل ہو جاتے ہیں کہ ان کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن جب وہ اسی آہستگی سے کوئی دریچہ کھول کر نکل جاتے ہیں اور ان کے قرب سے مہکے ہوئے لمحے زہر کی بوندوں کیطرح حافظہ پر ٹپکنے لگتے ہیں، اس وقت محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اپنی کوئی قیمتی چیز کھو دی ہو۔ ہم ایسے لوگوں کو "دوست" کہہ دیتے ہیں لیکن بعض الفاظ اپنے بے پھوہڑ استعمال کے ہاتھوں اپنی قیمت یعنی اپنے معنی گم کر دیتے ہیں۔ جس طرح کرکٹ کا کھلاڑی "رن" کی غلطی سے آؤٹ ہو جاتا ہے، اسی طرح اردو کے کم از کم دو الفاظ دوست اور غم آؤٹ ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ کاغذ کے دو تاج ہیں جنہیں پہن کر ہمارا مافی الضمیر تھوڑی دیر کے لئے نوٹنکی کے ایکٹر کی طرح بادشاہ بن جاتا ہے۔ علیگڑھ کی سیکڑوں نہیں ہزاروں شامیں ہماری ہمدمی کے بوسوں سے گلبدن ہیں۔

پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے "بعض لوگ پریم چند کو معمولی فنکار سمجھتے ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ ہر بھینس بین بجانے والے کو ساجی دینے والے کے مقابلے میں معمولی آدمی سمجھتی ہے" اگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ظالم سماج میں کوئی ادیب موٹا تازہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ادیب ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں افسانہ نگار، نقاد اور شاعر سب کی سمائی ہے۔ جو لوگ شاعری کو پیغمبری مانتے ہیں اور شاعر کو ادیب سے جدا گردانتے ہیں۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر شاعری ہی پیغمبری ہے تو نثر نگاری خدائی ہے۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ مقدس کتابیں نثر میں ملتی ہیں۔ ہاں تو انور پریم چند کے قول کے مطابق ادیب ہیں۔ لمبی گردن، ذرا اونچا قد اور بڑا سر امتیاز ہے۔ اس ہیئت کا جب کوئی نوجوان کسی ادبی محفل میں شرماتا نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ انور ہیں۔ انور معظم ہیں۔ ڈاکٹر انور معظم ہیں۔ ڈاکٹر تو میں نے آپ کی وجہ سے لکھ دیا ورنہ میں تو انور معظم ایم، اے کو جانتا ہوں۔ آپ نے اکثر غزلیں اور نظمیں

ما اس مکان میں انور رہتے ہیں۔

نقوش، نیا دور اور سویرا وغیرہ میں دیکھی ہوں گی۔ ان کی غزلوں نظموں میں بھی ان کی آنکھوں کی طرح "حیا" جگمگاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ حیا جو ادب کی حرمت کے لئے اپنے وجود کی نفی تک گوارا کرے۔ اس دور اشتہار بازی اور عہد بے حیائی میں نہ صرف کمیاب ہے بلکہ قاتل بھی ہے۔ انور معظم بھی اسکے شکار ہوئے۔ ورنہ تعارف کی ضرورت نہ پڑتی۔ انور نے علی گڑھ کے تمام نوجوان شاعروں سے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ان غزلوں کی تعداد کم ہے۔ اچھی غزلوں کی تعداد کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن لوگ شاید ان غزلوں کو بھول گئے، اسلئے کہ انور نے اپنے فن پر مضمون لکھ کر اپنے منھ میاں مٹھو بننا گوارہ نہ کیا۔ نقادوں سے اپنے مقدمے کی پیروی نہیں کرائی۔ انجمن تحسین باہمی کے ممبر نہیں ہوئے۔ یعنی شعر کہنا ایک بات ہے اور شعر کی دکانداری کرکے نفع اٹھانا دوسری بات ہے۔ اور یہ دوسری بات انور کے ہاں ناپید ہے۔۔۔۔۔

ہاں تو انور نے بساط پر سے اپنی لمبی گردن اٹھا کر کہا

"کل شام کی چائے، ہمارے یہاں پینا"

"تو کیا اس شام کی بلائی جانے والی چائے کسی محلے والے کے یہاں سے آ رہی ہے"

"اماں نہیں۔۔۔۔۔ کل اختر صاحب کو چائے پر بلایا ہے"

"کون اختر صاحب؟"

"اختر اورینوی"

اور اختر صاحب کے مضامین اور غزلیں اور افسانے سب ایک ساتھ میرے حافظے میں گڈ مڈ ہوگئے۔ اور خانوں میں بٹا ہوا ادب گرنے لگا۔ شاید ہی کسی زمانے میں کسی ادب پر ایسی بپتا پڑی ہو جیسی آج اردو ادب کی مقدر ہوئی ہے۔ زبان جو ادب کا سرچشمہ ہوتی ہے، سکرات کے عالم میں ہے اور ہم ادب کی تقسیم میں لگے ہیں۔ سب سے پہلے جنوبی ہندوستان کا ادب کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ پھر شمالی ہندوستان تو بہار کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ محاذوں کے جھنجھٹ میں دہلی اور لکھنؤ بھی بٹ گئے۔ اب اپنے قبیلے اور عقیدے کی نوبت آئی۔ یہاں بھی نزدیک سے نزدیک تر کو ترجیح دی گئی۔ یعنی ادب کیا رہا، کسی لاولد کا ترکہ ہو گیا۔ اب میرے سامنے ایک سجی بنی شام کھڑی تھی۔ اختر صاحب کسی کمیٹی کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تھے۔ اور یونیورسٹی کے مہمان خانے میں مقیم تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ وہ مسہری پر آرام سے بیٹھے عام آدمیوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں بتلایا کہ ان کی کون سی کتاب پریس میں ہے۔ اور کون سی کتاب پر کس نقاد نے کیوں یہ صحیح یا غلط بات کہی ہے۔ اور پندرہ برس کی عمر میں کون کون سی تیس کتابیں پڑھ چکے تھے اور اسی عمر میں کس موضوع پر کس کس زبان اور طرح میں کھڑے کھڑے کتنی غزلیں یا مضامین گھسیٹ دیئے تھے۔ یہ تک نہیں بتایا کہ کس کس ادیب کی شہرت یا تشہیر میں روزی یا کمائی میں کس کس طرح رد کی ہے۔ بالکل "غیر ادبی" باتیں کر رہے تھے۔ کسی طرح ادیب نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نہ شراب کا ڈول ڈالا۔ نہ کپڑوں کی بے ترتیبی کا اہتمام کیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ میں نے بیگم شکیلہ اختر کے کسی افسانہ کا ذکر بھی کیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ شکیلہ اختر کے ساتھ بھی اللہ میاں نے اچھا خاصا ادبی مذاق کیا ہے۔ کوئی اچھا افسانہ پڑھا گیا، ذکر ہوا۔ کسی مسخرے نے لہجے پر دانی کی قلعی کر کے نعرہ لگایا

"اماں اختر صاحب نے لکھ دیا ہوگا۔۔۔۔۔ تبھی کیا سلوا

۔۔۔۔۔ ہم تو ادھر ہی کے رہنے والے ہیں"

چلئے چھٹی ہوئی۔ افسانے میں جڑے ہوئے سارے ہیرے جواہرات کنکر پتھر ہو گئے۔ جیسے ہم یہ جان کر ہنس رہے ہوں کہ محفل کی فلاں خاتون فلاں کے زیور مانگ کر پہن آئی ہے اور اترا رہی ہے۔ پھر جیلانی بانو چائے لیکر آ گئیں۔۔۔ "روشنی کے مینار" اور "نروان" والی جیلانی بانو اودھ کے کسی قصبے کے معزز گھرانے کی بہو بھی کیطرح کشتی لے کھڑی تھیں۔ اور ہمارے ہاتھ فائرنگ کے بعد پولیس والوں کی طرح، پٹے ہوئے مہروں کی لاشیں ڈھونڈھ رہے تھے، میز خالی کر رہے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جیلانی بانو کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ میں نے انہیں آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ کسی

"دوست" کی بیوی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ سچ پوچھیے تو میں نے
افسانہ نگار جیلانی بانو کو ستہ سے دیکھا ہی نہیں۔ میں نے انور معظم کی
بیوی کو دیکھا ہے جو میٹھی ٹکیاں بہت اچھی پکاتی ہیں، چائے بہت
عمدہ بناتی ہیں۔ گھریلو لڑکیوں یا بیویوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتیں
کرتی ہیں۔ شوہر کی ساری خامیاں شوہر کے دوستوں کے سر نہیں
تھوپتیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم لوگ رات گئے تک شطرنج
یا برج کھیلتے رہے ہیں۔ نوکر بھاگ گیا ہے۔ ان کی طبیعت خراب
ہے لیکن بغیر طلب کیے چائے اور پان بھیجتی رہی ہیں۔ میں انہیں
جیلانی بانو کو جانتا ہوتا (ورنہ ہوتا) تو ایسا ایسا معرکۃ الآرا شوہر
دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ احباب دو گھنٹے سے جمع ہیں۔ چائے کا وقت،
بے وقت ہوا جا رہا ہے۔ خود بھی پیاس لگی ہے۔ لیکن بیگم کے خوف
سے بوٹی کانپ رہی ہے۔ بڑی آہ و زاری کے بعد ایک ایک پیالی
دھوون چائے اس تکلف اور تکلیف سے طلوع ہوتی گویا ظلمات
کا سفر کر کے آب حیات کا پیالہ اترا ہو۔

اُسی شام جب میں پہنچا تو شیروانی انور کو پہنے کھڑی تھی
اور چہرہ پریشان تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"سرور صاحب کو میرا مکان معلوم ہے اور نہ اختر صاحب
کو ..... اور چار بج چکا ہے"

"تو لے آؤ جا کر"

"اگر وہ کسی دوسرے راستے سے آ گئے؟"

"ہوں ..... تو میں جاتا ہوں۔ تم گھر پر رہو"

"مگر"

"میری کوئی بے عزتی نہیں ہوگی"

اور میں نے سڑک پر گاتے ہوئے رکشے والے کو آواز دے دی۔
اس نے میوزک پروگرام ملتوی کیا اور مجھے سنبھالا۔ ڈرائنگ روم میں
اختر صاحب سرور صاحب کے پاس ہی نیاز مند بیٹھے تھے۔ ایک صاحب
اور بھی تھے، یاد نہیں کون تھے۔ میں ان تینوں حضرات کو لیے ہوئے
انور کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ رسمی گفتگو کے
بعد سرور صاحب اختر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اردو زبان کے مستقبل
کی بھول بھلیوں میں چلے گئے۔ ہم لوگ اس طرح خاموش بیٹھے ہوئے
تھے جیسے عبادت میں نمازی، قبل استاد اور سبھی کورس ہوتے
ہیں۔ سرور صاحب اور اختر صاحب دونوں گفتگو میں گلے گلے تک
ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے اور سوچ رہے تھے
اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جا رہی
ہے یعنی شکر کے کارخانے قائم ہیں اور ابھی چل رہے ہیں لیکن گنّا
بونے والے کھیتوں میں زہر گھولی جانے لگی ہے۔ گنّے کے کھیت
سکڑتے جا رہے ہیں۔ کسان گڑ بنانے پر مائل ہیں۔ اس کا
اندیشہ ہے کہ گنے کی پیداوار ایک دن اتنی کم ہو جائے کہ
کارخانے بند ہو جائیں، یونیورسٹیوں سے اردو غائب ہو جائے۔
انور اشارے سے مجھے وہ چیزیں کھانے پر اکسا رہے تھے جنہیں
جیلانی کی خاک اور افسانوی شیرینی نے اور شیریں بنا دیا تھا۔
اور میں اختر صاحب کو دیکھ رہا تھا جو بش شرٹ اور پتلون پہنے خاصے
مضبوط اور جوان نظر آ رہے تھے۔ ان کے بال ماہ و سال کی
خاکستر سے ایک حد تک پاک تھے۔ چہرہ عہد رفتہ کے قدموں
کے نشانوں سے بیگانہ تھا۔ آنکھیں ناکامیوں کی تاریکی سے بے نیاز
تھیں۔ اور وہ ہمارے یہاں اردو کے مستقبل پر گفتگو کر رہے تھے
اتنے احترام سے گفتگو کر رہے تھے گویا انہوں نے سرور صاحب
کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہو۔ اور سرور صاحب؟

سرور صاحب کو میں نے پہلی بار جولائی ۱۹۵۲ء میں دیکھا تھا
اس وقت ان کے سر کے بال تک جوان تھے۔ صرف ایک دبلی پتلی
لٹ روپہلی ہونے لگی تھی۔ جس کی لرزش چہرے پر علم و ادب کے وقار کی
روشنی پھیلا دیتی تھی۔ انہیں سرور صاحب کا پورا سر جیسے پک گیا
تھا۔ لکھنؤ کے سرور صاحب اور علی گڑھ کے سرور صاحب میں
کتنا فرق ہو گیا تھا۔ یہ وہی سرور صاحب تھے جن سے لکھنؤ کی
ادبی محفلیں روشن تھیں۔ کافی ہاؤس آباد تھا، شعبۂ اردو مشرف

تھا - ان سے ہونہار طالب علم اور نوجوان ادیب عشق کرتے تھے۔ ان کو گھیرے رہتے تھے۔ ان کی سرد مہری کے باوجود ان سے چپٹے رہتے تھے۔

جی ہاں سرور صاحب اپنی سرد مہری کی وجہ سے طالب علموں میں خاصے مشہور تھے۔ ان سے شکایت تھی کہ سلام کا جواب نہیں دیتے اس شکایت کو احتشام صاحب اور ہاشمی صاحب (ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی) کی گرمجوشی نے اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ ان تینوں پر کبھی تفصیل سے لکھوں گا

لکھنؤ میں تین طبقے تھے۔ ایک سرور صاحب کا چاہنے والا تھا۔ دوسرا احتشام صاحب کا اور تیسرا دونوں کا۔ تو علی گڈھ کے سرور صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے جنہوں نے علی گڈھ آنے سے پہلے شاید ہر تیسرے سال اردو ادب کو ایک قابل قدر کتاب دی تھی۔ ہم لوگ کسی بات پہ چپکے سے ہنس کر اپنے وجود کا ثبوت دے دیتے اور کبھی کبھی اختر صاحب کا والہانہ قہقہہ اس کمرے میں اکیلا نظر آتا اسلئے کہ سرور صاحب آواز سے کم ہنستے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لوگ منھ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ اور ساری گفتگو اُن دونوں بزرگوں نے بانٹ لی۔ جیلانی بانو نے بھی باتیں کیں۔ انور بھی بولے اور میں نے بھی ہوں ہاں کی پھر اختر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سرور صاحب سے کبھی رخصت ہو لیے اور تسنیم سلیم چھتاری سے ملنے چلے گئے۔

بقیہ اختر صاحب میری نظر میں

وہ جب بھی کسی محفل میں پہنچ گئے تو میدان ان ہی کے ہاتھ رہا۔ ایسے بے ساختہ فقرے، چٹکلے، لطیفے ہوتے ہیں کہ کبھی انسان ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور کبھی شرمانے پر۔ جوبات دماغ میں آ جاتی ہے اس کے کہنے سے وہ کبھی نہیں چوکتے پھر بھی ان کی۔ قوت کو کوئی بُرا نہیں مانتا اسلئے کہ ان کے چبھتے ہوئے فقروں میں لطافت کے علاوہ بے پناہ خلوص جو ہوتا ہے۔

اختر صاحب کی شکیلہ بہن سے راہ و رسم کب سے رہی ہے اس کے متعلق تو صرف شرف صاحب ہی جانتے ہوں گے۔ لیکن جب سے میں نے اس جوڑے کو دیکھا ہے، میرا خیال ہے کہ اختر صاحب بذات خود کوئی مکمل چیز نہیں ہیں بلکہ وہ صحیح معنوں میں اسی وقت ہوتے ہیں جب شکیلہ بہن کو بھی ان کے ساتھ پیش کیا جائے۔ سُنتی تھی کہ قدرت نے دو چیزیں یکساں پیدا نہیں کی ہیں لیکن ان دونوں کے معاملے میں یہ پُرانا نظریہ غلط ثابت ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہو لیکن اب تو یہ واقعہ ہے کہ اختر میاں نے ایک بار دو چیزیں اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانے کیلئے بالکل یکساں پیدا کر دیں۔ ان میں سے ایک کا نام ہے اختر اور دوسری کا شکیلہ۔ اسلئے جب کبھی اختر صاحب منظر عام پر آئیں گے تو شکیلہ بہن کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ اسوقت بھی جب میں اختر صاحب کے متعلق کچھ لکھ رہی

سید حسن

بقیہ - اختر اورینوی

اردو کا کارواں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اختر اور شکیلہ ان سے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ انہی کی محبت نے اختر کو پٹنہ چھوڑنے سے روکا ہے۔ حالانکہ ان کو کئی بار باہر کی یونیورسٹیوں سے اچھے عہدوں کی پیشکش کی گئی۔ میسور یونیورسٹی میں انہیں اسوقت جبکہ وہ صرف لکچرر تھے پروفیسری کی جگہ مل رہی تھی۔ پروفیسر آل احمد سرور اور میسور کے بعض معزز اشخاص نے ان پر اس عہدے کو قبول کرنے کیلئے زور بھی ڈالا۔ لیکن اختر اورینوی اور وہ دیار میں اپنے احباب کو چھوڑ کر اس قدر دور جانے پر رضامند نہ ہو سکے۔

جسطرح گھر میں اختر کو اپنے عزیزوں سے بیحد محبت ہے، اسی طرح کالج میں وہ اپنے طلباء کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کو بڑی شفقت سے پڑھاتے ہیں۔ اُن کی مشکلوں کو رفع کرنے میں دل و جان سے کوشش کرتے ہیں۔ ان پر اعتماد کرتے ہیں اور کبھی کبھی بعض کے ساتھ حد سے زیادہ پاسداری کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ اپنی شفقت و محبت اور ادبی قابلیت و پڑھانے کی عمدہ صلاحیت کے باعث وہ نوجوان طالب علموں میں بہت ہی مقبول و ہر دلعزیز ہیں

(مولانا) بیتاب صدیقی
(جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو)

بہار میں اردو تحریک اور اختر اورینوی

ساغر کے اختر اورینوی نمبر کے لئے قمر اعظم ہاشمی صاحب نے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو میں ہاں ہوں میں کچھ کنال گیا اور سمجھا کہ نجات مل گئی، لیکن ان کے بار بار کے اصرار نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر قمر اعظم ہاشمی صاحب کو یہ کیا خبط ہوا ہے جو مجھ سے لکھنے کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ نہ میں کوئی ادیب ہوں نہ مصنّف، نہ سوانح نگار نہ افسانہ نویس، نہ کبھی ریڈیو سے کوئی نشری فیچر یا خاکہ پیش کرنے کا گنہگار رہا ہوں نہ کسی ماہنامہ یا جریدہ نے کبھی مجھے پذیرائی بخشی ہے کہ میری تحریر مستند قرار دی جا سکے۔ بالآخر اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اپنے اس خلوص کا گلا گھونٹنے پر تلے ہوئے ہیں جس کا وہ میرے ساتھ اکثر اظہار کیا کرتے ہیں۔ قمر اعظم ہاشمی کے اصرار میں جب لطف الرحمٰن شہاب صاحب کو بھی شامل پایا تو اور بھی گھبرایا لیکن اسکے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ پھلواری یا پھولوں کی نرسری میں روشوں کی آرائشگی کی خاطر بانس کی قمچی لگائی جاتی ہے جسکا مصرف یہ ہوتا ہے کہ کاغذ کے ٹکڑوں پر پھولوں کے نام لکھکر ان قمچیوں میں آویزاں کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر چند کے پھولوں سے لطف اندوز ہونیوالے اور سطاب رکھنے والے بانس کی قمچی کی طرف کبھی نظر اٹھاکر بھی نہیں دیکھتے لیکن رسمِ چمن بندی میں قمچی لگانا بھی شامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساغر کے ڈاکٹر اختر اورینوی نمبر میں میری شمولیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ جب ساغر والوں سے کچھ لکھنے کا وعدہ کر لیا تو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ڈاکٹر اورینوی جیسی عظیم شخصیت پر لکھنا میرے بس کی بات نہیں، کیا میں اپنے مضمون میں ان کے ساتھ انصاف کر سکوں گا؟ گرچہ اورینوی صاحب سے گہری عقیدت رکھتا ہوں لیکن عقیدت کی نگاہیں محاسن و نقائص میں حدِ فاصل قائم نہیں ہونے دیتیں۔ اور کسی عظیم فنکار کے کارناموں کا جائزہ لینے والے شخصیت نگار کی راہ میں ایک سنگِ گراں سے کم نہیں۔ بات عقیدت کی آ گئی جسکی آج کل فراوانی ہے۔ ہر بڑی اور عظیم شخصیت سے لوگ اظہارِ عقیدت کرتے ہیں اور اس سے در اصل اپنی اہمیت جتلانا مقصود ہوتا ہے۔ اسطرح اختر اورینوی صاحب سے میری عقیدت کی بات کچھ واضح نہیں ہوتی بلکہ سخن طرازی کا پہلو پیدا کرتی ہے۔ آخر ان سے میری

عقیدت کیسی؟ کیا اس وجہ سے کہ وہ سراپا خلوص اور پیکر محبت و شفقت اور منکسر المزاج ہیں؟ ان سے ملنے جائیے تو تھوڑی دیر کی گفتگو سے دل کا سارا غبار و تکدر ختم ہو جاتا ہے اور ان کے پاس سے اٹھئے تو تمام کدورتوں سے ذہن و دماغ خالی ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیچیدہ مسائل کا پشتارہ کندھے پر لئے جاتا ہوں، کبھی شکایتوں کا انبار ساتھ رہتا ہے، اور کبھی انجمن ترقی اردو یا دیگر قومی مشکلات میں اس قدر جھنجلا ہو جاتا ہوں کہ اپنی نبض ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اختر اورینوی صاحب کے پُرخلوص مشوروں اور اصابت رائے سے ذہن و دماغ میں تازگی اور فکر و عمل میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور اختر اورینوی سے عقیدت رکھنے کے لئے یہی کافی ہے۔ لیکن دراصل بات یہ نہیں ہے بلکہ میری عقیدت کی وجہ ڈاکٹر اختر اورینوی کی وہ عظیم شخصیت ہے جو میرے سامنے مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ اور جو مجھے نہ صرف متاثر بلکہ مسحور کرتی رہی ہے۔ اسلئے کہ جو، قومی یا انفرادی سطح پر مایوسی و اضمحلال دور کر کے دلوں میں امید و مسرت کی کرن پیدا کر دیتا ہو وہ بالیقین ایک عظیم شخصیت اور ہماری عقیدت کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر اورینوی بلاشبہ ایک بڑے آدمی ہیں۔ ان کی بڑائی گرچہ موجودہ سیاست و سماج کے اصلاحی فرہنگ کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی ہو پھر بھی وہ بلا ریب ایک عظیم شخصیت، مثالی کردار کے مالک اور صاحب فکر و نظر انسان ہیں۔ ارباب فن میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور وہ اپنے اندر ایک عہد آفریں کردار کی تمام خصوصیتوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ادارہ ساغر اختر اورینوی نمبر پیش کر کے اپنا ایک فرض پورا کر رہا ہے جو یقیناً اُردو دنیا پر ایک احسان ہے، کچھ لوگوں کا نظریہ کسی شخصیت کی پذیرائی کسی فنکار کی زندگی، اس کے فنی کارناموں اور فکری سرمایہ ہائے گراں مایہ کے جائزہ لینے کے متعلق بہت محدود ہے۔ اس طبقہ کا کہنا ہے کہ کسی فنکار یا عظیم شخصیت کے فن یا شخصیت کا اسکی زندگی میں جائزہ لینا مناسب نہیں بلکہ فنکار کو احتساب و پذیرائی سے ملتبد رکھنا چاہئے تاکہ وہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو آزادانہ ماحول میں پروان چڑھاتا رہے اور اپنے افکار و نظریات کو زبان و ادب کے سانچے میں ڈھالتا رہے۔ اسی وجہ سے مغربی ممالک میں کسی فنکار کے متعلق اسکی زندگی میں ادبی جرائد اسکی شخصیت یا فن کے بارے میں کوئی نمبر نہیں نکالتے بلکہ فنکار کی موت کے بعد پوری آزادی کے ساتھ اسکے فن اور تخلیقات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتے ہیں، فنکار کا مقام متعین کرتے اور اسے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے خیالات و نظریات قابل تقلید نہیں ہو سکتے، کیونکہ مشرق و مغرب کے فنی و فکری زاویہ نگاہ میں کافی فرق ہے۔ ہمارے یہاں بالخصوص کسی کی شخصیت کو اس کے گذر جانے کے بعد تنقید و تبصرہ میں لانا ہماری روایات کے منافی ہے اگرچہ اصنام پرستی و عظام پرستی مشرق میں رائج ہیں پھر بھی پرخلوص مشرقی اخلاقی قدروں نے جہاں تک ہمیں سکھلایا ہے کہ کسی شخصیت کی پذیرائی میں مثبت نتائج کو پیش نظر رکھا جائے اور اپنے معاشرہ کی عظیم شخصیتوں کے ساتھ عقیدت کے اظہار اور انکی پذیرائی کے اسلوب میں خلوص و محبت کے دامن کو نہ چھوڑا جائے اس لحاظ سے کسی شخصیت کے ساتھ عقیدت ظاہر کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسکے حسن و قبح کو اس کے سامنے لایا جائے تاکہ اسے اپنی زندگی میں غور و فکر کا موقع ملے۔

جس طرح صحت مند تنقید فن کو نکھارتی ہے اور فنکار کی صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے۔ اسی طرح صحت مند اور مخلصانہ پذیرائی فنکار کی ذہنی توانائی اور فکری توانائی کو تقویت بخشتی ہے جس طرح مشفقانہ اور مخلصانہ مشورے، اکثر ہماری خامیوں کو دور کر دیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک فنکار کیلئے اسکی سماجی پذیرائی مشعل کا کام دیتی ہے۔ جو بہتر سے بہتر تخلیقات کا باعث بنتی ہے۔ اور شاید اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندی دوستوں نے اپنے فنکاروں کے لئے ابھی نندن گرنتھ پیش کرنے کی رسم جاری کی ہے

کی پذیرائی کی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اس طرح ادارہ ساغر اختر اورینوی نمبر کے لیے بہر طور قابل مبارکباد اور لائق تقلید ہے۔

اختر اورینوی اُردو دنیا کی چند عظیم شخصیتوں میں ایک ہیں۔ قدرت نے انہیں بھرپور تخلیقی صلاحیت کا حامل بنایا ہے۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں، ایک قافلۂ انسانی کے سالار کے لئے کافی ہیں، جو عصری اور آفاقی ثقافت کے میدان میں ایک ممتاز مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اختر اُورینوی اپنے اندر انسانی دوستی کے بین الاقوامی رجحانات کے ساتھ آفاقی تصوّرات بھی رکھتے ہیں۔ جس سے انکی عظمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اختر اورینوی اپنی تمام تر فکری جدوجہد اور قوت ناطقہ کی حسن آفرینیوں کی سحر طراز طاقتوں سے واقف ہیں اور وہ ان سے موجودہ دور میں حیات کی نئی کشمکش سے نجات حاصل کر کے رہنمائی کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں موثر طور پر کام لیتے ہیں اور وہ اس سے عوام کو مستقبل کا حیات افروز پیام بھی دیتے ہیں؂

بڑھی ہے عظمت دار و رسن اپنے ہی قدموں سے
ہمیشہ مشہور رہا اہل جنوں میں بانکپن اپنا

ڈاکٹر اختر اورینوی نہ صرف اردو زبان کے ایک کہنہ مشق اور مشہور ادیب و نقاد ہیں بلکہ موجودہ دور کی صاحب فکر ادبی شخصیتوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ایک طرف وہ قدیم ادب اور قدیم تہذیبی اذکار کے ممتاز نمائندہ ہیں تو دوسری طرف جدید اور تازہ رجحانات کو بھی انہوں نے اپنایا ہے۔ ان کی عظمت کی ایک اہم وجہ اُردو زبان و ادب سے ان کی بے پایاں محبّت و عقیدت بھی ہے۔ وہ اُردو کو ہندوستانی تمدن کا ایک مشترک سرمایہ اور مشترک قدروں کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ اسطرح اختر اورینوی ایک گنگا جمنی تہذیب کے داعی ہیں اور اردو کی پنچ شیل ثقافت کو ساری دنیا میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں جب کبھی بھی انہیں موقع ملا ہے اردو کی پنچ شیل ثقافتی حیثیت کی انہوں نے پرزور تبلیغ کی ہے۔ تاکہ عوام کو اردو کی پنچ شیل ثقافت کا عرفان حاصل ہو جائے۔

پٹنہ میں اپنے ۲۵، ۲۶ برسوں کے قیام کے دوران ڈاکٹر اختر اورینوی کو اردو زبان و ادب کی مختلف تحریکات اور سماجی و تہذیبی نشستوں میں مصروف دیکھا ہے۔ اور ہر جگہ ان کے اصلی فکری زاویہ نگاہ اور طریقہ کار سے متاثر ہوتا رہا ہوں ۱۹۴۵ء کا زمانہ ہمارے ملک میں نہ صرف سیاسی مد و جزر کا دور تھا بلکہ ادبی و لسانی سطح پر بھی کافی شورش انگیزی کا دور تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی ۱۹۴۲ء کے انقلابی اقدام کے بعد ایک آخری مرحلہ پر پہونچ رہی تھی۔ برطانوی سیاست دانوں کی ریشہ دوانیاں اپنے آخری حدود کو پہنچ چکی تھیں۔ جس کی وجہ سے ملک میں ایسے جراثیم پرورش پا رہے تھے جو پوری قوم کے مستقبل کو تاریکیوں کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ جنگ زدہ عالمی سیاست امن و جنگ کی [illegible] کشمکش کا شکار بن رہی تھی۔ گرچہ فضا [illegible] استعماری طاقتوں کے زوال اور تباہی کا بھیانک منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن میدان جنگ کی تباہ کاریوں نے نہ صرف فاتح و مفتوح بلکہ ساری دنیا کے عوام کو ایسا بدحواس بنا رکھا تھا کہ مدبرین عالم خود مختلف قسم کے تذبذب کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف عالمی سوشلسٹ سماج کے نظریات و تصورات اور دوسری طرف جمہوریت اور امن و انصاف کی بنیاد پر قائم سماجی و سیاسی نظریات ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لئے آمادہ نظر آ رہے تھے۔ اس صورت حال میں ملک کے اندر بھی ادبی و تہذیبی میلانات میں ناہمواری تھی انتشار تھا، ایک کشمکش کی سی کیفیت تھی۔ پھر بھی ملک کے اندر و باہر ادبی و تہذیبی میدان میں ایک نئی زندگی کی طرف مبہم سا اشارہ مل رہا تھا۔ لسانی سطح پر ہندی، اردو اور ہندوستانی کا دس بارہ برسوں کا تنازعہ گرچہ ابھی یکسوئی حاصل نہ کر سکا تھا پھر بھی ہندی کے پرستار ہندوستانی کو ناقابل تسلیم اور گردن زدنی قرار دے چکے تھے۔ عبدالحق اور راجندر پرشاد کی دھجیاں بکھیر چکے تھے، اردو والوں میں بھی ایک طبقہ اردو کو اسلام اور

مسلمانوں کے گلے باندھنے پر تلا ہوا تھا، دوسرا طبقہ ابھی تک ہندوستانی کو اردو کا ایک آسان اسلوب تسلیم کررہا تھا۔ اور لسانی مسائل کے منصفانہ حل کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اس وقت موخر الذکر طبقہ کے لوگوں میں شامل تھے۔ ایسے پر آشوب دور میں اہل ترہت نے ایک عظیم سطح پر اردو کانفرنس، کل ہند مشاعرہ اور ایک اردو نمائش کا پروگرام بنایا۔ حکیم شہاب ابراہیمی اور ادیب صاحب انتظامی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ راقم الحروف کو دوسرے فرائض کے ساتھ اردو نمائش کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ اس سے پہلے اس قسم کے تعمیری کاموں کا کوئی خصوصی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ پٹنہ میں اردو کانفرنسوں میں عملی طور پر شرکت کا موقع ملا تھا۔ لیکن اس دور میں عام طور پر اس قسم کی کانفرنسوں کا مقصد شور و ہنگامہ اور نشستند و گفتند و برخاستند کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا، کسی اردو کانفرنس یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یا ادبی اجتماع میں سنجیدگی کے ساتھ تعمیری مسائل پر غور کرنا اسوقت ممکن نہ تھا کیونکہ ماحول پر سیاسی بازیگروں کا جادو چلا ہوا تھا۔ گرچہ اردو کے مسائل اسوقت آج سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے، اس صورت حال نے مجھے بھی اس دور میں ہنگامہ پسند بنا دیا تھا، ترہت اردو کانفرنس منعقدہ ۲۶، ۲۷ جولائی ۱۹۵۵ء نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کیا اور میں بھاگا ہوا اختر اورینوی صاحب کے پاس پٹنہ پہنچا، ان سے باتیں ہوئیں اور ان کے مخلصانہ مشوروں کا قائل ہو کر اپنے کام میں لگ گیا، اپریل، مئی، اور جون کے اوائل تک ریاست بہار کا دورہ کرتا رہا اور نایاب و نادر قلمی نوادرات قدیم جرائد و رسائل، اور مختلف مضامین پر غیر مطبوعہ کتابوں کا مظفرپور میں ڈھیر لگ گیا کافی محنت و کاوش کے بعد کیٹلاگ اور دوسرے کاموں سے فراغت نصیب ہوئی بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے اتنی کامیاب طور پر اردو نمائش نہیں ہوئی تھی اس کے بعد پٹنہ میں ادارۂ تحقیقات اردو کے تحت چند سال پہلے ایک اردو نمائش ضرور دیکھنے میں آئی تھی جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے فرمایا تھا۔ اور انھوں نے اس نمائش کو نقش اول قرار دیا تھا۔ حالانکہ یہ نقش ثانی تھا۔ اور نقش اول سے بہتر نہ تھا۔

اس کے علاوہ کہ مظفرپور میں منعقدہ نمائش کا افتتاح ڈاکٹر اختر اورینوی نے کیا تھا۔ اور کانفرنس کی صدارت ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کی تھی۔ کسی راجیہ پال نے اسے اپنی سرپرستی و صدارت کا شرف نہیں بخشا تھا۔ افسوس کہ اسکی رپورٹ تیار نہ ہوسکی جسکی ذمہ داری جناب مولانا عبدالعلیم آسی دربھنگوی نے اپنے سر لی تھی۔ مولانا موصوف نے حسب عادت اس رپورٹ کو بھی اپنی زنبیل مقدس میں ایسا رکھا کہ آج تک اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

ترہت اردو کانفرنس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی تقریر میں کچھ ایسی باتیں کہدیں کہ اردو کانفرنس میں شریک ذہین طبقہ نے پورے طور پر برا محسوس کیا۔ خیر ہورری صاحب بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ اور عبادت بریلوی کی تقریر سے بہت برافروختہ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی بھی پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ جب اورینوی صاحب کو اپنا مقالہ پڑھنے کا موقع ملا تو دیکھا گیا کہ وہ اپنے خیالات و نظریات اور الفاظ کی عظمت چند ہی منٹوں میں دلوں پر بٹھا چکے ہیں۔ اور تکدر کی فضا ختم ہو چکی ہے۔ سارے کانفرنس نے محسوس کیا کہ وطن دوستی، قوم پرورانہ میلانات اور حریت قومی کے جذبات سے سرشار اختر اورینوی نے لسانی مسائل کو کچھ اس طرح پیش کیا گویا کوئی انسانی ارتقا کی رفتار کو تیز تر کررہا ہے۔ کانفرنس جب ختم ہوئی تو اورینوی صاحب کی تقریر کا پورے شہر میں چرچا تھا۔ جس میں انھوں نے نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز میں عبادت بریلوی صاحب کو ڈانٹ پلاکر بہار کے اردو ادیبوں کی عظمت اور اردو خدمات کا اعتراف کرنے پر ان کو مجبور کردیا تھا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کے خلوص اور ادبی و لسانی شعور و سلیقہ سے فائدہ اٹھانے کا یہ میرے لئے پہلا موقع تھا۔ جبکہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ان کی گہری محبت اور انتہاء جذبے

کو میں نے اچھی طرح محسوس کیا اور بیحد متاثر ہوا۔ ترہت اُردو کانفرنس میں ہندوستان کے مشاہیر ادبا و شعرا نے شرکت کی، لیکن بہار کی تمام قابل ذکر ہستیوں نے پہلو تہی کی لیکن اختر اورینوی نے اس کانفرنس کو پوری اہمیت دی اور ترہت جیسے پسماندہ خطّے میں اُردو کانفرنس اُردو کی ترقی اور فروغ کے لئے ضروری قرار دیا۔

جہاں تک مجھے اختر اورینوی کی ادبی و لسانی خدمات کے مطالعہ کا موقع ملا ہے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ شروع ہی سے زبان و ادب کی خدمات کے اپنے جذبۂ فراواں کو عام کرنے اور دوسروں کے دلوں میں بھی اپنے جیسی لگن پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں۔ انہوں نے ادبی و لسانی کاوشوں کے میدان میں جس شعبہ اور جس پہلو کو اختیار کیا وہاں جلد ہی ایک انجمن بنا ڈالی، اپنے ارد گرد اچھے کارکنوں کو جمع کر لینا تو ان کے لئے معمولی سی بات رہی ہے۔ آج بھی ادبی و لسانی محاذ پر کام کرنے والے خواہ نئے ہوں یا پُرانے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ڈاکٹر اورینوی سے فیضیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ریاست بہار میں تہذیبی، ثقافتی، ادبی و لسانی سطح پر کام کرنے والا کوئی ایسا فرد مل سکے گا جو اختر اورینوی کی بصیرت سے جذبۂ آگاہی نہ حاصل کئے ہوگا اس سلسلہ میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے ایک جگہ بہار میں ادبی تحریکات کا جو جائزہ لیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ نئی پود کی ذہنی تربیت اور ان کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا کس قدر خیال رکھتے ہیں، اور کس حسن و خوبی کے ساتھ ان کے اندر ادبی و تہذیبی شعور و بصیرت پیدا کرتے ہیں۔ غلام سرور ایم۔ اے کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ "پرکھ" کے تعارف میں لکھتے ہیں: "مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں ایک نئی کونپل کے متعلق اپنے خیالات پیش کر رہا ہوں، بہار میں اُردو ادب کی بہت ہی قدیم روایتیں ہیں، اور تمام قوت و حیات ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہار کی ادبی زندگی میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے، عصر جدید میں بھی ہم گلستانِ بہار میں اپنے نئے پودوں پر جوبن آتے ہوئے دیکھ رہے ہیں پٹنہ کالج کے خیابانوں میں، میں نے ایک جگہ سے زیادہ نونہالوں کی پرورش کی ہے ظاہر ہے کہ جب میں بالخصوص اس خیابان سے تعلق رکھنے والے نونہالوں کو اور بالعموم سارے گلستانِ بہار کے نوخیزوں کو پھلتے پھولتے دیکھتا ہوں تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ میں ان کی زندگی اور سرسبزی میں گویا اپنی حیات کی ایک نئی شاخ نکلتے ہوئے دیکھتا ہوں، فرد کی زندگی فانی ہے، لیکن جماعت کی زندگی ابدی ہے۔ میں اپنی امنگوں کو اگر ابدی بنا سکتا ہوں تو اس طرح کہ نوجوان دلوں میں نئی دھڑکن پیدا کر دوں۔"

سطور بالا میں اختر اورینوی نے جن پودوں کی آبیاری اور ان پر جوبن آنے کا ذکر کیا ہے ان کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں کہ آج بہار کے گلشنِ اردو میں ان کے سینچے ہوئے پودے تناور درخت بن چکے ہیں اور ان کی محنت و کاوش سعی مشکور بن چلی ہے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کی سب سے بڑی خوبی اور عظمت ان کی علم دوستی اور تعمیری جذبوں کا رچا ہوا شعور ہے جس نے ان کی ذات کے اندر اعلیٰ و ارفع قدروں کا چراغ روشن کر رکھا ہے جسکی لَو دھیمی نہیں ہونے دیتے، ان کی ایک فنکاری یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کے اندر بھی چراغ جلائے رکھنے کی مہارت رکھتے ہیں وہ ایک ایسے تہذیبی و تمدنی ماحول کے پروردہ ہیں جسکی حرارت ان کے اندر اپنی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے۔ اس حرارت سے اپنی نئی نسل کے دلوں کو گرماتے رہتے ہیں، اور ان کے ذہن و دماغ میں فکر و عمل کی ایک برقی رَو دوڑاتے رہتے ہیں۔ اختر اورینوی ادبی، لسانی، تہذیبی اور سماجی ہر میدان میں ایک پُرخلوص تعمیری جذبہ رکھتے ہیں جسکی تبلیغ ان کا شیوہ ہے۔ چنانچہ "پرکھ" کے تعارفی مضمون میں ایک

دوسری جگہ اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں
"میرے خیال میں اگر نوجوانوں کے اندر صداقت، اخلاص
جرأت، ہوشمندی، ایمانداری اور اقدام کا مادہ پایا جاتا ہے
اگر وہ اپنے جسم اور روح کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر
زندگی کے مشاہدہ اور ادب کی تخلیق میں ان کے لئے ایسے خطرے
کا کوئی امکان نہیں جو انہیں ہلاک کر دے۔"

اقتباس کے ان سطور کو پڑھئے تو اختر اورینوی
کے الفاظ اور خیالات کی عظمت واضح ہو جاتی ہے اور ان کے
لسانی و ادبی تخلیقی نقطۂ نظر کو سمجھنے کا پورے طور پر موقع ملتا
ہے۔ جس طرح بہار کی ادبی و لسانی تحریکوں میں تسلسل پایا جاتا
ہے اسی طرح اختر اورینوی کے فکر و عمل میں بھی تسلسل موجود ہے
اور وہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر ہر ادبی تحریک کے روح رواں
رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بہار ریاستی انجمن
ترقی اردو کی تاسیس سے پہلے اور تقسیم ملک کے پہلے اور بعد بھی
بہار میں تین ادبی انجمنیں دائرہ ادب، حلقہ ادب اور انجمن ترقی
پسند مصنفین ریاستی سطح پر برسر عمل رہی ہیں۔ حلقہ ادب کی
سربراہی غلام سرور کو حاصل تھی اور دوسرے دو اداروں مشترکہ
قیادت میں چل رہے تھے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں
کہ تینوں انجمنیں یا تحریکیں اختر اورینوی کے ذہن رسا کی پیداوار
تھیں، اور ان کی بصیرت افروزی سے مستفید ہوتی تھیں۔
اسی طرح انجمن ترقی اردو بہار پہلے بھی کسی نہ کسی رنگ میں خدمت
کرتی رہی ہے، اور اختر اورینوی وہاں بھی سرگرم تھے۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں پٹنہ سنیٹ ہال میں صوبائی پیمانے پر
انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام اردو کانفرنس ہوئی۔ اس وقت
کے نازک اور پیچیدہ مسائل زیر بحث تھے۔ محترمہ لیڈی انیس
امام صاحبہ، جسٹس خلیل احمد صاحب، جناب عبدالقیوم انصاری
قاضی سعید، شاہ جعفر حسین، غلام سرور اور راقم الحروف۔۔۔
سبھی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھے، مگر دلبر اختر اورینوی
یہاں بھی سرگرم اور روح رواں کی حیثیت سے پیش پیش تھے تجاویز
کی ترتیب اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل، ہر موقع پر انہوں نے رہنمائی
کی۔ اس سے بہت پہلے بھی جب انجمن ترقی اردو کے بعض کارکنوں نے
بابائے اردو مولوی عبدالحق کے طرز عمل اور ان کی پالیسی سے
انحراف کیا تھا تو اسی سنیٹ ہال میں اس مسئلہ کو حل کرنے کے
لئے ایک جلسہ ہوا تھا۔ ریاست بہار کے محبان اردو نے جمہوری
طور پر بابائے اردو کی پالیسی تسلیم کی۔ پھر بھی انجمن کے بعض کارکن
اپنے خیال پر قائم رہے اور انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند سے
قطع تعلق کر لیا۔ اس اجلاس میں بھی اختر اورینوی کو بابائے اردو
کی پالیسی اور ان کے نقطۂ نظر کی حمایت میں بہت پرجوش پایا
تھا۔ مذکورہ بالا جلسے کے بعد صوبائی انجمن ترقی اردو کی اندرونی
تنظیم اور صوبہ و مرکز کے تعلقات کا معاملہ کچھ عجیب مبہم اور
متضاد ہو گیا، اور معاملہ الجھا ہی رہا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کی اردو دوستی، اردو کے مفاد سے
گہری دلچسپی اور بے پایاں تعلق کی تہ میں، میں نے ہمیشہ یہ محسوس
کیا کہ وہ پیشہ ور سیاست داں اردو دوستوں کی طرح اردو کے
حقوق، اس کی ترقی و فروغ اور تحفظ و بقا کے مسئلہ پر صرف نعرہ
بازی کے قائل نہیں بلکہ اصول و نظریہ کے پیچھے وہ سرگرمی عمل کے
علمبردار ہیں اور مقصد کے ساتھ پوری وفاداری کے قائل ہیں۔

اب تک اختر اورینوی صاحب کی اردو دوستی اور ادب
نوازی کے سلسلہ میں جن تاثرات کا میں نے اظہار کیا ہے اس سے
میرا منشا صرف یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کا تحریک کا پس منظر میں ڈاکٹر
اورینوی کا ان مصروفیتوں اور مساعی جمیلہ کو جن کا انجمن ترقی
اردو کی لسانی سیاست سے تعلق ہے اس طرح پیش کر سکوں کہ ڈاکٹر
اختر اورینوی کے اعلیٰ کردار کا عکس واضح طور پر سامنے آ جائے۔

گذشتہ نصف صدی میں انجمن ترقی اردو کے کارنامے
ہماری لسانی، تہذیبی و تمدنی تاریخ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے ہیں۔
سنہ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اردو ترقی و ترویج کے

شعبہ کی حیثیت سے انجمن قائم ہوئی، اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رہنمائی میں ۱۹۱۲ء میں ایک جداگانہ ادارے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ بابائے اردو اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک انجمن کے معتمد رہے ۱۹۴۷ء میں ملک کی سیاسی تقسیم کے کچھ ہی دنوں بعد انجمن کی بھی تقسیم ہو گئی۔ بابائے اردو سے پہلے انجمن کے سکریٹری کے ممتاز عہدے پر ملک کے متعدد عالی مرتبت وسیع المعلومات اصحاب علامہ شبلی، نواب صفدر یار جنگ اور مولوی عزیز مرزا حیدرآبادی وغیرہ سرفراز ہو چکے تھے۔ صدارت کی ذمہ داری نواب عماد الملک، نواب مسعود جنگ، سر تیج بہادر سپرو جیسے مشاہیر کے کاندھوں پر رہی، بابائے اردو نے جیسے ہی ایک الگ شعبہ کی حیثیت سے انجمن کی ذمہ داریوں کو سنبھالا اورنگ آباد اس کا صدر دفتر بن گیا تو اس وقت سے ۱۹۳۸ء تک انجمن کا تعلق ریاست حیدرآباد مرحوم سے رہا اور وہاں کے علم دوست حضرات کی دلچسپی، ہمدردی اور تائید نے انجمن کی تنظیم کو مستحکم بنایا، انجمن وہاں سے ملک بھر میں اپنے مقاصد کی اشاعت کرتی رہی ۱۹۳۸ء میں بابائے اردو نے اس کے دفتر کو اورنگ آباد سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ جدوجہد کے میدان میں انجمن کے سامنے نئے نئے گوشے آسکیں، اب تک انجمن کی نوعیت خالص علمی رہی تھی۔ دہلی آکر ملک اور اس کے دارالخلافہ کے ماحول سے وہ اثر پذیر ہونے لگی۔

۱۹۴۷ء کا خونریز انقلاب ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ جو تباہیاں اور بربادیاں اپنے جلو میں لئے آیا اسکی لپیٹ میں مرکزی انجمن ترقی اردو کو بھی آنا پڑا، اس کا دفتر لٹ گیا جس کی وجہ سے اس کا کاروبار معطل ہو گیا۔ پھر ایک سال بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی موجودگی میں امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تحریک پر دوبارہ انجمن کی داغ بیل پڑی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (یادش بخیر) صدر اور قاضی عبدالغفار مرحوم معتمد بنائے گئے۔ نئی تنظیم کے تحت اراکین کا پہلا جلسہ مئی ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوا اور انجمن کا دفتر علی گڈھ کے علمی ماحول میں منتقل کیا گیا۔ ملک کے نئے ماحول میں انجمن کے اغراض و مقاصد مرتب ہوئے۔ اور اس کے جدید قواعد کے تحت کام شروع ہو گیا لیکن اس وقت ملک کی حالت کیا تھی اس کا نقشہ ڈاکٹر اختر اورینوی نے مجلس استقبالیہ بہار ریاستی اردو کانفرنس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل لفظوں میں کھینچا ہے۔ "آج ہمارے ملک میں اردو پر کرب و نزع کا عالم طاری ہے، ہر طرف مایوسی کا سناٹا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اردو موت کی منزل پر پہنچ جائے گی۔ تاریخ نے ہمارے لئے ایسے ہی حالات پیدا کر دیئے ہیں۔"

لیکن ڈاکٹر اختر اورینوی اس فضا میں دوسرے اردو دوستوں کی طرح نہ تو مایوسیوں کے شکار تھے اور نہ حالات کے سامنے سر جھکانے کو تیار تھے وہ اردو دوستوں کو ڈھارس بندھا رہے تھے، اگرچہ یوپی میں اردو کشی کے منصوبہ پر پورے زور و شور سے عمل ہو رہا تھا مگر بہار میں بھی حالات کچھ مساعد نہ تھے اختر اورینوی کو حالات کا پورا احساس تھا لیکن انہوں نے عوام میں حالات کی ہولناکی کے احساس کو شدید نہ ہونے دیا وہ اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں "لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ محض زندگی کے نشیب و فراز ہیں اگر ہم نے اس دور میں اردو کی ایک شاخ بار آور کو بھی بچا رکھا تو کل ہم اس سے نئی جنت تعمیر کر سکیں گے۔ رات کے بطن سے صبح نو بھی طلوع ہوتی ہے۔ اردو کے عظیم ترین پیغامبر نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ ع فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر"
میں مرکزی انجمن ترقی کی نشاۃ ثانیہ یا تنظیم نو کی بات کر رہا تھا جس کے بارے میں اختر اورینوی لکھتے ہیں کہ "باخبر حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا عبدالحق نے کراچی جانے سے پہلے انجمن ترقی اردو ہند کی نئی تنظیم کے سلسلہ میں کچھ بہی خواہانہ مشورے دیئے تھے۔ اردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والے لوگوں نے اس مشورہ پر عمل کیا اور نئے حالات کے تحت انجمن

ترقی اردو ہند کی تشکیل جدید شروع کی اور اس کوشش میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی اور اس کا مرکز دلّی کی ویرانی کے بعد علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر اور قاضی محمد عبد الغفار معتمد بنائے گئے۔ مرکزی انجمن کے ممبروں میں ملک کے جلیل القدر محبان اردو کا نام نظر آتا ہے یہی لوگ ہیں جو ہمیشہ اردو زبان و ادب کی ہر رنگ خدمت کرتے رہے ہیں۔"

حالات کی سنگینی اور نامساعدت کے باوجود بہار میں اردو کانفرنس کا خیال پیدا ہوا کیونکہ جد و جہد انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اسکی سرشت میں داخل ہے۔ اسی جد و جہد کے ہر مرحلہ پہ اختر اورینوی اردو دوستوں کو نشاط روح کا سامان مہیا کرتے رہے۔ کبھی مشاعروں اور کبھی حلقۂ ادب بہار کی مجلسوں کے ذریعہ دلوں کو گرماتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں ملک میں نئے آئین کا نفاذ ہوا اور ہندوستان سیکولر جمہوریہ قرار پایا، ہندوستان کی ۱۴ قومی زبانوں میں اردو کو بھی شامل کیا گیا جس سے مایوس دلوں کو کچھ سہارا ملا۔ اس وقت ڈاکٹر اختر اورینوی، غلام سرور اور ان کے درجنوں رفقا، کار اردو دوستوں میں بیداری پیدا کر رہے تھے، انجمن ترقی پسند مصنفین میں بھی پرجوش اردو دوست نوجوانوں کی کمی نہ تھی جنہیں اردو دوستی کی بصیرت اختر اورینوی سے ملتی رہتی تھی۔

انہیں دنوں ۱۹۵۱ء کے ابتدائی مہینے میں ایک روز یادش بخیر جناب خیر بہروری صاحب نمائندہ خصوصی انجمن ترقی اردو ہند سے اچانک اپنے کمرے میں ملاقات ہوئی۔ خوب گلے گلے ملے۔ خیر بہروری صاحب، نہ صرف میرے جانے پہچانے تھے بلکہ ۱۹۴۸ء میں تربیت اردو کانفرنس کی شاندار کامیابی میں ان کا بھی زبردست ہاتھ تھا۔ اور ان کے حسن تدبیر سے کانفرنس کے مخالفین کو شرمناک شکست نصیب ہوئی تھی۔ ان کا مصرع

"پھرتے ہیں منھ چھپائے اردو زبان کے دشمن"

تو ابھی تک مظفر پور کے اردو دوستوں کو یاد ہے۔ خیر صاحب سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ہندی پریشد کے سالانہ اجلاس میں مرکزی انجمن ترقی اردو کی نمائندگی کے لئے آئے ہیں۔ ہندی پریشد ہندی ساہتیہ سمیلن کے علاوہ ایک دوسرا ادارہ تھا جسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کا اجلاس ہندی سمیلن بھون میں ہو رہا تھا۔ دوسری وجہ پٹنہ آنے کی یہ بتائی کہ مرکزی انجمن ترقی اردو ریاست بہار میں باضابطہ اور فعال ریاستی شاخ قائم کرنا چاہتی ہے۔

خیر بہروری صاحب کے ہمراہ میں بھی ہندی پریشد کے اجلاس میں شریک ہوا، وہاں پروفیسر اختر اورینوی بھی موجود تھے۔ خیر صاحب نے ان سے اپنے آنے کی غرض و غایت بتائی۔ اختر اورینوی صاحب کے مشورے کے مطابق خیر بہروری صاحب میرے ہمراہ صوبائی انجمن ترقی اردو کے اراکین سے ملنے گئے۔ جناب قاضی سعید کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو انجمن ترقی اردو ہند کے اصول اور طرز عمل سے شدید اختلاف ہے۔ پھر بھی قاضی سعید صاحب نے قاضی عبد الودود سے ملنے کا مشورہ دیا۔ یہ بھی کہا کہ جو وہ کہیں گے وہی ہوگا۔ چنانچہ ہم لوگ قاضی عبد الودود صاحب سے ملے۔ انہوں نے گفتگو کے لئے دوسرے روز عصرانہ پر بلایا کل ہو کر ہم دونوں پہنچے، عصرانہ کے بعد جناب قاضی عبد الودود صاحب نے جناب خیر بہروری سے لے کر جناب قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین اور بابائے اردو تک سب کو خوب خوب صلواتیں سنائیں اور خیر صاحب کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ میں کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں اور مجھے حق ہے کہ انجمن ترقی اردو نام کا کوئی ادارہ بنا کر اپنی جیب میں رکھوں۔ اس گفتگو کے بعد ہم لوگ پھر اختر اورینوی صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ اور روداد گفتگو سنائی۔ انہوں نے خیر صاحب کو پوری تسلی دی اور اپنی اعانت و پرخلوص تعاون کا یقین دلایا، اور انہوں نے مشورہ دیا کہ شہر و صوبہ کے مختلف لوگوں سے وہ ملیں۔ چنانچہ خیر بہروری صاحب کے ہمراہ جناب انصاری صاحب، ڈاکٹر سید محمود، سر سلطان احمد (مرحوم) اور علمی و ادبی حلقہ کے دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اسی

جد و جہد کے دوران جناب محمد ایوب ایڈووکیٹ مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی۔ اختر اورینوی صاحب اور دوسرے حضرات سے گفتگو کی تفصیل سے ان کو آگاہ کیا گیا، مرحوم نے نہایت متانت و سنجیدگی مگر مستحکم انداز میں تعاون کا یقین دلایا۔ ہم دونوں، مرحوم ایوب صاحب کی گفتگو سے بے حد متاثر تھے۔ نیر صاحب نے مجھ سے ان کے متعلق مزید حالات جاننے کی کوشش کی، لیکن خود میری ان سے ملاقات نہ تھی البتہ ان دنوں کسٹوڈین کے ظالمانہ رویے کے خلاف عوام کی حمایت میں کمربستہ رہنے والوں میں ان کا نام سرفہرست تھا اور وہ ضرورت مند عوام اور قانونی مشوروں کے لئے مشہور تھے۔ بہرکیف انجمن ترقی اردو کی تحریک کے مسئلہ پر آگے جو کچھ ہوا ڈاکٹر اختر اورینوی کی زبانی سنئے:

"جن دنوں نیر بہرودی صاحب یہاں تشریف لائے حلقۂ ادب کا سالانہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ میں نے جناب نیر صاحب کو دعوت دی کہ حلقۂ ادب کے سالانہ جلسے کی نشست میں شرکت کریں، اور پہلے اہل الرائے حضرات کی ایک مجلس مشاورت طلب کریں جو ریاستی انجمن کی تشکیل کرے۔ جناب نیر بہرودی صاحب نے ایسے اہل الرائے حضرات کی ایک فہرست مرتب کی جس میں ہر طبقہ ہر خیال، ہر ادبی انجمن کے نمائندوں اور مختلف سیاسی عقیدہ رکھنے والے لوگوں کے نام موجود تھے۔

مجلس مشاورت کا انعقاد ۱۴ر مارچ ۱۹۵۱ء کو ہوا۔ اس مجلس میں یہ طے پایا کہ پیشِ نظر مقصد کے حصول کے لئے ایک عارضی کمیٹی بنا دی جائے۔ اس عارضی کمیٹی میں ان لوگوں کے نام بھی شامل تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے مجلس مشاورت کی نشست میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ کمیٹی کی ایک مجلس کچھ دنوں کے بعد منعقد ہوئی اور اسی نشست میں ریاستی اردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ اس کے لئے ایک عارضی خاکہ بھی بنایا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ کافی غور و اعلان کے بعد کمیٹی کی دوسری نشست انجمن اسلامیہ ہال میں کی جائے۔ تاکہ اچھی طرح مشورہ کے بعد قطعی فیصلے ہو سکیں، نیر صاحب نے خود بھی دوڑ دھوپ کی، لوگوں کو مدعو کیا۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد عارضی کمیٹی کی نشست انجمن اسلامیہ ہال میں ہوئی۔ اسی مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ بہار ریاستی اردو کانفرنس کی جائے تاکہ اردو سے متعلق مسائل حاضرہ پر غور و خوض ہو اور اردو کی ترقی و حفاظت کے لئے عملی قدم اٹھانے کی طرح ڈالی جائے۔ یہ نشست ۲۱ر مارچ ۱۹۵۱ء کو ہوئی۔ کانفرنس کے انعقاد کی یہ بھی ایک غرض تھی کہ ریاست بہار میں انجمن ترقی اردو ہند کی ایک ریاستی تنظیم فعال طور پر کسی صورت سے قائم کی جائے جس کا الحاق مرکزی انجمن سے ہو اور ریاست بھر میں اس کی شاخیں پھیلائی جا سکیں۔" (رپورٹ مجلس استقبالیہ بہار ریاستی اردو کانفرنس، از اختر اورینوی)

اسی مجلس میں کانفرنس کے انعقاد کی باضابطہ عملی کوششوں کے لئے ایک وسیع البنیاد مجلس عاملہ منتخب کی گئی جس میں ریاست کے اردو شاعروں، ادیبوں، پروفیسروں، مدرسوں، اخبار نویسوں کو نمائندہ حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور ہندوستان بھر کے اردو نظم و نثر اور تحقیق و تنقید کے ماہروں کو بھی کانفرنس میں مدعو کیا گیا تاکہ جمہوری اور اقتصادی دونوں رنگوں میں اردو کی بقا پر سیر حاصل بحث اور غور و فکر کے بعد نتیجہ خیز فیصلہ تک پہنچا جا سکے۔ اس مرحلہ پر جناب محمد ایوب ایڈووکیٹ مرحوم، غلام سرور اور جناب اختر اورینوی کے ہمراہ بے حد سرگرم عمل نظر آئے۔ پھر مرحوم کی اردو دوستانہ سرگرمیاں زندگی بھر باقی رہیں۔ اردو دوستی کا جذبہ ۱۹۵۵ء میں صدر انجمن منتخب ہونے کے بعد ذمہ داریوں کی منزل میں پہنچا اور پھر ایثار و قربانی کے مرحلہ تک بڑھتا گیا ؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را،

ایوب و اختر، دونوں ہم خیال و ہم نظریہ تھے۔ ہمیشہ دونوں بزرگوں کے خیالات میں ہمیں کامل یگانگت و یکجہتی نظر آئی دونوں ایک دوسرے کے ہم نوالہ و ہم پیالہ نہ سہی لیکن دمساز

وہ راز عزیز تھے۔ جب کبھی اردو کے مسئلے پر کوئی گتھی سامنے آئی، ڈاکٹر اختر اورینوی انہیں یاد آئے، کبھی ہم لوگوں نے کر خود اختر صاحب تک پہنچتے اور کبھی اختر صاحب کو بلواتے۔ ان سطور کے لکھتے وقت راجہ رام نرائن لال موزوں کا یہ شعر بار بار یاد آرہا ہے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

محمد ایوب مرحوم کا ذکر آیا تو رحمت امروہوی کا یہ شعر بھی بلا اختیار زبان پر آگیا ہے ؎

میخانہ کی تعمیر میں اپنا بھی لہو ہے
صہبا نہ سہی درد تہہ جام ہمیں دو

یہ ذکر بھی اب درد تہہ جام ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

آخر کار وہ وقت آگیا۔ عزیز مہمانوں اور ماہرین تعلیم و زبان و ادب کے شیدائیوں کے سامنے ہزاروں مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود ڈاکٹر اختر اورینوی اپنے رفقائے کار اور مخلصین کے جلو میں یہ اعلان کرنے میں کامیاب ہوئے کہ

"ہماری ناچیز کوششوں کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے اور ہم بفضلہ کامیاب طور پر بہار ریاستی اردو کانفرنس کر رہے ہیں اب یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ جن مقاصد کے لئے کانفرنس کا انعقاد ہوا ہے ہم ان مقاصد کو قرارداد کی منزل سے گذار کر عمل کی منزل میں لائیں"

آگے چل کر ڈاکٹر اختر اورینوی نے یہ بھی فرمایا کہ "میری رائے میں اسوقت تین اہم مسئلے ہیں۔

١- ریاست بہار میں انجمن ترقی اردو کی نمائندہ اور جمہوری تنظیم اور اس کا مرکزی انجمن سے الحاق پھر سارے صوبہ میں ریاستی انجمن کی شاخ در شاخ کا قیام اور ان کی مربوط تنظیم۔

٢- اردو زبان کی تعلیم کے سلسلہ میں جو دقتیں پیش آرہی ہیں اور جو خطرات ہمارے سامنے ہیں انہیں دور کرنے کے لیے جدوجہد اور اسی جدوجہد کو ثبات بخشنا، خطرات اور دقتیں المناک طور پر حقیقی ہیں۔

٣- اردو زبان و ادب کی توسیع و اشاعت کا فرض انجام دینا اور اس غرض کے حصول کے لئے طریقۂ کار مرتب کرنا۔

طریقۂ کار میں فرسودگی، انجماد، شکست اور پسپائی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے اسوقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی ساری روایات کو قائم رکھتے ہوئے نئے مطالبات نئی ضروریات اور نئی امنگوں کی تکمیل کے وسائل ڈھونڈیں۔"
(رپورٹ مجلس استقبالیہ صفحہ ١٠)

اس موقع پر ڈاکٹر اختر اورینوی نے سامعین کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ان کے نام ایک مکتوب ارسال کیا ہے۔ انہوں نے بابائے اردو کے مکتوب کے بعض حصوں کو پڑھ کر سنایا جس میں انہوں نے ریاستی اردو کانفرنس کے انعقاد پر مسرت ظاہر کی تھی اور تاکید کی تھی کہ جن طالب علموں کی مادری زبان اردو ہے ان کی تعلیم کے لئے کوئی صورت پیدا کی جائے، حکومت کی سختیوں کو خاطر میں نہ لائیں بعض ممالک میں زبان کے معاملے میں اس سے زیادہ سختیاں کی گئی تھیں یہاں تک کہ اس کا لکھنا پڑھنا اور بولنا قانوناً جرم قرار دیا گیا تھا۔ لیکن جن کو اپنی زبان عزیز تھی۔ وہ ان سختیوں کے باوجود اپنی زبان کے بچانے میں کامیاب ہوئے۔

بہار ریاستی اردو کانفرنس اگرچہ پٹنہ میں منعقد ہوئی تھی لیکن اس کی حیثیت کل ہند اردو کانفرنس کی تھی، اس سے پہلے اس پیمانہ پر کہیں بھی اردو کانفرنس نہیں ہوئی تھی اور بہت حد تک اسکی کامیابی کا سہرا اختر اورینوی کے سر تھا۔ اس کانفرنس کا ذکر جناب قاضی عبدالغفار مرحوم نے اپنی رپورٹ مئی سنہ ۵۱ء تا اگست سنہ ۵۲ء میں حسب ذیل الفاظ میں کیا۔

"اترپردیش کے بعد صوبہ بہار میں اردو زبان کی اہمیت ہمیشہ قابل لحاظ رہی ہے۔ اس صوبے نے ہماری زبان کے لئے بڑے بڑے ادیب اور شعراء پیدا کئے ہیں۔ اس لئے مرکزی انجمن کو پہلے ہی سے یہ خیال تھا کہ اترپردیش کے الجھے ہوئے مسائل سے

کسی قدر فارغ ہونے کے بعد صوبہ بہار میں اردو زبان کی تحریک کو منظم کیا جائے۔ چنانچہ انجمن کے نمائندے وہاں بھیجے گئے اور انہوں نے ہر طبقے اور ہر مکتب خیال کے ممتاز حضرات سے تبادلۂ خیال کر کے مقامی حالات سے پوری واقفیت حاصل کی اور یہ طے پایا کہ صوبہ کی ایک بڑی کانفرنس پٹنہ میں منعقد ہو جس میں بہار کے حامیانِ اردو کی جد و جہد کا نقشہ بنایا جائے۔

مئی کے مہینہ میں ایک شاندار اور کامیاب کانفرنس ہوئی جس میں صوبائی شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں اپنی شدید علالت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکا۔ لیکن انجمن کے کئی ممتاز اراکین نے شرکت کی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے تو اپنی پیرانہ سالی اور حد سے بڑھی ہوئی معذوریوں کے باوجود سخت گرمی کا مقابلہ کر کے دہلی سے پٹنہ تک کا سفر کیا۔ مرکزی انجمن کے رکن پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ کانفرنس میں اہل الرائے اصحاب کے علاوہ تقریباً پانچ سو ڈیلی گیٹ اور مختلف ادبی انجمنوں کے بیسیوں نمائندے شریک ہوئے۔ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر آنریبل عبدالقیوم انصاری اور جنرل سکریٹری پروفیسر اختر احمد اورینوی تھے۔ ڈاکٹر سید محمود، سر سلطان احمد، ابو الاحمد محمد نور، پارلیمنٹری سکریٹری غلام سرور ایم۔ اے جیسے لوگ کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ میں شریک تھے۔“

بہار ریاستی اردو کانفرنس میں جناب سردار لطیف الرحمٰن صدر، غلام سرور جنرل سکریٹری اور راقم الحروف جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوا۔ مجلس عاملہ میں بہ شمول مندرجہ بالا حضرات پروفیسر اختر اورینوی اور محمد ایوب ایڈوکیٹ مرحوم شامل ہوئے۔

سب سے پہلے پروفیسر اختر اورینوی کی قیادت و سرکردگی میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے میٹرک کے نصاب میں اردو کا لازمی پرچہ رکھوانے کی جد و جہد شروع کی۔ پٹنہ یونیورسٹی اکیڈمک کاؤنسل اور سنیٹ کے ۱۹۴۹ء کے فیصلوں پر عملدرآمد ہو رہا تھا جس کی رو سے ہندی کے علاوہ مادری زبان رکھنے والے طلباء کی مادری زبان کی تعلیم کا مسئلہ کھٹائی میں ڈالا جا رہا تھا۔ اردو اس کی حیثیت اختیاری بنائی جا رہی تھی۔ پروفیسر اختر اورینوی نے غلام سرور کے معرفت پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایک میمورنڈم بھیجوایا اور کوشش بلیغ شروع کر دی کہ پٹنہ یونیورسٹی اردو کشی سے باز آئے۔ اسی زمانہ میں یو۔ پی میں بھی سکنڈری اور پرائمری اسکولوں سے اردو کے اخراج کی خبریں آ رہی تھیں۔ یو۔ پی میں سمپورنانند کی وزارت اردو کشی پر تلی ہوئی تھی۔ اردو دشمنی کی لہر یو۔ پی سے بہار میں بھی پہنچ رہی تھی۔ لیکن اختر اورینوی کی مدبرانہ قیادت بار آور ثابت ہوئی اور میٹرک کے نصاب میں اردو کا لازمی پرچہ شامل ہو گیا۔ غیر لسانی پرچوں کے امتحانات میں سوالوں کا جواب مادری زبان میں دیئے جانے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔

اسی دور میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری غلام سرور کے سامنے پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے ایک الگ شعبہ کے قیام کا مسئلہ آیا، اس مسئلہ پر بھی جناب اختر اورینوی نے بڑی شفقت اور خلوص کے ساتھ غلام سرور کی رہنمائی کی اور انجمن کی طرف سے ریاستی حکومت، مرکزی وزارت تعلیم اور وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کو عرضداشتیں پیش کی گئیں۔ اختر صاحب کی رہنمائی، سربراہی اور جد و جہد اس مسئلہ میں بھی کامیاب ثابت ہوئی چنانچہ پٹنہ یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل نے اپنی نشست منعقدہ ۳۰ اپریل، یکم مئی ۱۹۵۲ء میں اردو کا ایک الگ شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اردو شعبہ کے انفرادی حیثیت اختیار کر جانے کا ثمرہ یہ ہوا ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم پر آج خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ چند برسوں سے تحقیقاتی کاموں کا سلسلہ چل

بڑھتا ہے۔ اور اس بارے میں ہندوستان کی چند ممتاز یونیورسٹیوں میں پٹنہ یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ اختر اورینوی اس سلسلے میں ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے ۱۹۵۲ء میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے دستخطی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک کی قیادت انجمن کے جنرل سکریٹری غلام سرور کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن جیسے ہی مہم شروع کئے جانے کا اعلان ہوا، اختر اورینوی صاحب اپنے کارکنوں کی فوج کے ساتھ میدانِ عمل میں آگئے، جناب ایوب مرحوم کا مخلصانہ تعاون اور عملی رہنمائی بھی انجمن کو حاصل تھی اور آخر دو برسوں کے اندر ہی دس لاکھ اردو دوستوں کے دستخط اور انگوٹھے کے نشان جمع ہو گئے۔ اس کے بعد اسے صدر جمہوریہ کی خدمت میں محضر نامہ اور مطالبات کے ساتھ پیش کرنے کا سوال سامنے آیا۔ چنانچہ جون ۱۹۵۴ء میں اردو کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ جس کے لئے فنڈ کی ضرورت تھی۔ جناب ایوب مرحوم، پروفیسر اختر اورینوی سردار لطیف الرحمٰن، غلام سرور وغیرہ کی کوششوں سے چند ہی روز میں تین چار ہزار فنڈ جمع ہو گیا اور ایک شاندار اردو کنونشن پٹنہ میں منعقد ہوا۔ کنونشن کے بعد میمورنڈم مرتب کرنے میں پروفیسر اختر اورینوی کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔

۲۴ر فروری ۱۹۵۶ء کو گورنمنٹ ہاؤس پٹنہ میں انجمن کا وفد لیڈی انیس امام ایم۔ ایل۔ سی کی قیادت میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۵ء میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے کئی وفود مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ذمہ داروں سے ملے ان میں سب سے اہم وفد ریاستوں کی تنظیم نو کی کمیشن سے ملنے والا وفد تھا جو جناب بشیر الدین صاحب بار ایٹ لا مرحوم کی قیادت میں ملا تھا۔ کمیشن کے ممبران میں سردار پانیکر اور پنڈت ہردے ناتھ کنزرو شامل تھے۔ کمیشن کے چیرمین جسٹس فضل علی مرحوم تھے، لیکن وہ بہار نہ آسکے۔ حدبندی کمیشن کی آمد سے پہلے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے ایک کامیاب رول ادا کیا۔ جس کی وجہ سے بہار کا ایک بہت بڑا علاقہ بنگال میں شامل ہونے سے محفوظ رہا۔ یہ وقت بہار کے لئے بڑا نازک تھا۔ اس موقع پر بھی اختر اورینوی نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اپنی رہنمائی اور تعاون کا زبردست ثبوت پیش کیا۔ اسی طرح بہار پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے امتحانات سے ہندی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے ختم کرانے کی تحریک اور پٹنہ بہار دوسری یونیورسٹیوں میں غیر لسانی پرچوں کے امتحانات میں سوالوں کا لازمی طور پر ہندی میں جواب دینے کے احکام کے خلاف جدوجہد کے موقع پر ڈاکٹر اختر اورینوی ریاستی انجمن ترقی اردو کی ہر تحریک میں شامل رہے۔

راقم الحروف غلام سرور ایڈیٹر "سنگم" کے مستعفی ہونے کے بعد ۱۹۵۲ء سے انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس عرصہ میں مختلف مسائل کو لیکر انجمن کے درجنوں وفود ذمہ دارانِ حکومت سے ملے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کسی ایک میں بھی شریک نہ تھے۔ لیکن ان کی رہنمائی، ان کے صائب مشورے اور ان کی بصیرت ہر موقع پر ہم لوگوں کے ساتھ رہی اور کام آئی، ریاستی انجمن ترقی اردو کی داغ بیل پڑنے کے بعد سے اب تک بے شمار مسائل ہمارے سامنے آئے لیکن اختر اورینوی کے جذبۂ اردو دوستی نے ہر مرحلہ پر ہماری جدوجہد کو تقویت اور اردو کے کاز کو استحکام بخشا۔ وفود میں شرکت سے احتراز اور اس سے بے نیازی کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں کہ وہ سرکاری حلقوں سے گھبراتے ہیں۔ بلکہ یہ ڈاکٹر اورینوی کے کردار کا وہ پہلو ہے جو ان کی عظمت ہماری نظروں میں بڑھا دیتی ہے۔ ...... بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تمام کامیابیوں کے پیچھے دو ہستیاں صاف نظر آتی ہیں۔ اور یہ دونوں ہستیاں نہ صرف اردو تحریک بلکہ تمام قومی معاملے میں

قوم وملت کے لیے نعمت عظمیٰ ثابت ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ہستی تو گذشتہ سال ۲۰؍ فروری کی شب میں پوری قوم کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگئی۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ دوسری نعمت عظمیٰ کو حوادثاتِ زمانہ کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے اور قوم کو تادیر ان سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے۔

بہرحال بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے ۱۹۵۱ء میں ذمہ داریوں کو سنبھالا تھا اور مجلس استقبالیہ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اختر صاحب نے جن بلند بانگ دعاوی کا اعلان کیا تھا۔ انجمن کے عہدوں سے الگ رہ کر بھی ڈاکٹر اختر اورینوی نے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں انجمن کی مکمل رہنمائی کی اور سب سے خوبی کی بات یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو اور اردو کی پوری تحریک نہ صرف غیر فرقہ وارانہ ہے بلکہ ایک صحت مند مشترکہ تہذیب وتمدن کے قیام کی تحریک ہے۔ چنانچہ انجمن اپنی جدوجہد کے ہر مرحلہ اور ہر منزل پر فرقہ واریت سے علیحدہ رہی۔ اگر ڈاکٹر اختر اورینوی کی بصیرت افروز نگہداری انجمن کے شامل نہیں ہوتی تو شاید اس مرحلہ میں انجمن کو سو فیصدی کامیابی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کا ذہن رسم الخط کے مسئلے میں بھی بہت ہی صاف اور واضح ہے۔ وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اردو زبان وادب کی روایات میں اردو رسم الخط کی انفرادیت بھی شامل ہے۔ خواہ اردو کی تعلیم کا مسئلہ ہو یا اردو کی توسیع واشاعت کا مرحلہ۔ دانشورانِ اردو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اردو کی تعلیم اور اردو کی اشاعت بنیادی طور پر اردو رسم الخط کے ہی ذریعہ ہونا چاہئے، ہاں سائنٹفک طور پر رسم الخط میں اصلاح کے دروازوں کو کھلا رہنا چاہئے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے انجمن ترقی اردو کی تحریک میں خواتین کو بھی اپنی رہنمائی سے محروم نہیں رکھا۔ چنانچہ یہ انہیں کی رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ شکیلہ اختر جیسی افسانہ نگار خاتون اردو زبان وادب روشناس ہوئی جن پر اہلِ بہار کو فخر ہے۔ لیکن انجمن ترقی اردو کی تحریک کے سلسلہ میں محترمہ شکیلہ اختر کے جلو میں بیگم عزیزہ نقی امام، بیگم حکیم انیس، سوز رہبان پنہاں عظیم آبادی۔ قدسیہ کاظمی، سوز عظیم آبادی اور زین عظیم آبادی وغیرہ نظر آتی ہیں۔ جنہیں اختر اورینوی کی ادبی ولسانی فیوض سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا ہے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کو ریاستی انجمن ترقی اردو کو ڈاکٹر اختر اورینوی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انجمن ترقی اردو جیسی شائستہ زبان کا سکہ چلانا چاہتی ہے وہ اختر اورینوی کی زبان ہے یا اختر اورینوی کی زبان ہی انجمن ترقی اردو کی مثالی زبان بن سکتی ہے۔

اختر اورینوی کی اردو خدمات صرف ریاستی سطح تک محدود نہیں، وہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ اور مرکزی انجمن کی کئی اہم کمیٹیوں میں ان کی شرکت انجمن کے فروغ اردو کے منصوبوں کو جاندار اور پائیدار بنا چکی ہے۔

آخر میں اظہارِ معذرت کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مضمون کسی قدر طویل ہوگیا اس لئے کہ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پھر بھی بہت سے اہم مسائل کا ذکر رہ گیا اور بہت سے اہم پہلو تشنہ رہ گئے۔ جن سے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تحریک میں اختر اورینوی کے کارنامے مزید واضح ہو سکتے تھے۔

اردو زبان پائندہ باد   اختر اورینوی زندہ باد۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون

ڈاکٹر اختر اور ریاست میسور

سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں میسور کی یونیورسٹی قائم ہوئی اور سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں استاذی پروفیسر آغا محمد عباس شوستری کا تقرر اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، پروفیسر شوستری نے سنہ ۱۹۲۷ء میں فارسی کے پروفیسر" اور سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں وظیفہ یاب ہوئے، پروفیسر موصوف کے زمانے تک ہمارا کالج میسور میں اردو، فارسی اور عربی کا ایک مشترک شعبہ تھا اور اس کے صدر پروفیسر شوستری تھے، پروفیسر موصوف نے اپنی سلامت روی اور انصاف پسندی سے اپنی پروفیسری کے آخری زمانے میں اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اپنی جگہ" اردو کے پروفیسر" کے تقرر کی حمایت کی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۲ء میں عبدالقادر سروری صاحب حیدرآبادی کا "اردو کی پروفیسری" کے لئے انتخاب ہوا، آپ کا تعلق جامعہ میسور سے ۵ر جولائی سنہ ۱۹۴۶ء تک رہا، پروفیسر شوستری فارسی کے اہل زبان اور فارسی زبان اور ادب کے مستند عالم اور صاحب تصانیف ہیں اور اگرچہ انہوں نے اپنے زمانے میں اردو کو بی۔ اے کے پاس کورس میں ثانوی زبان کے علاوہ اختیاری زبان کی حیثیت سے بھی نوازا اور اپنے اثر اور رسوخ سے اردو آنرز کی جماعت کا اجرا کیا تھا لیکن انہوں نے کبھی اپنے اردو داں بھی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور ہمیشہ اس اصول پر قائم رہے کہ کوئی اردو کا ایم۔ اے ہی اردو کی اعلیٰ جماعتوں کو پڑھائے اور اسی اصول پر مبنی کی بنا پر آپ نے ارباب جامعہ سے سفارش کی تھی کہ آپ کا جانشین اردو کا ایم۔ اے ضرور ہو۔ البتہ اس مجبوری دور میں جو اساتذہ اردو کے ایم۔ اے نہیں تھے وہ بھی اردو کی نچلی جماعتوں کو پڑھاتے رہے۔

سروری صاحب صرف اردو کے ایم۔ اے تھے اور "اردو کے پروفیسر" کی حیثیت سے یہاں بلائے گئے تھے لیکن یہاں آنے کے بعد انہوں نے فارسی اور عربی کو ایک علٰحدہ شعبے کی حیثیت سے ترقی کرنے کی ترغیب نہیں دی بلکہ خود ہی اردو، فارسی، عربی ان تینوں زبانوں کے پروفیسر کہلائے۔

اس سے ہمارا کالج میسور میں یہ روایت برابر برقرار رہی کہ پروفیسر خواہ اردو کا ایم۔ اے ہو یا فارسی کا وہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کا پروفیسر کہلائے گا۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں سروری صاحب کے اچانک حیدرآباد چلے جانے اور وہاں سے اپنا استعفیٰ بھیج دینے کی وجہ سے جامعہ نے اردو کی پروفیسری کی اسامی کا اعلان کیا اور استاذی پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے اور تری پروفیسر آل احمد سرور لکھنؤ سے انتخابی

بورڈ کے "ایکسپرٹس" (ماہرینِ خصوصی) کی حیثیت سے مئی ۱۹۴۹ء کے آخری ہفتے میں بنگلور تشریف لائے اور جامعۂ میسور کی اردو کی پروفیسری کے لئے ڈاکٹر سید اختر احمد اختر اورینوی کا انتخاب کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اختر صاحب کا ریاست میسور سے تعلق قائم ہوا، اس انتخاب کے بعد تقریباً نو مہینے گزر گئے لیکن اس طویل عرصے میں بھی اختر صاحب کو ان کے تقرر کے بارے میں کسی قطعی فیصلے کا علم نہ ہو سکا چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۰ء کو میری تصنیف "تحقیقی نوادر" کی وصولی کی اطلاع دیتے ہوئے آپ نے لکھا کہ:۔

"نوادر کی رسید اور چند اور مضامین سے میسور کی اردو تحریکوں کے متعلق آگاہی ہوئی، اس طرف مجھے آپ کے وطن سے بہت دلچسپی ہو گئی ہے، ممکن ہے تقدیر مجھے دیارِ عظیم آباد سے اٹھا کر وہاں پہنچا دے، اگر میں میسور آیا تو آپ لوگوں سے مل کر غریب الوطنی کا غم ہلکا ہو جائے گا، واللہ اعلم، میسور یونیورسٹی مجھے بلا رہی ہے یا نہیں، ماجرا کیا ہے؟ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے دسمبر میں آپ کے دارالعلوم کے رجسٹرار صاحب کو دریافت حال کے لئے لکھا تھا، اب تک جواب سے محروم ہوں۔ معلوم تو ہوا تھا کہ بورڈ نے میرا نام اول قرار دے کر مجھے منتخب کیا ہے، پھر یہ اطلاع ملی کہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے بھی اس کی تائید کی اور بعد ازاں معاملہ حکومت ریاست کے سامنے پیش ہوا، اگر آپ کو فرصت ہو تو ذرا دریافت حال کیجئے تو بڑی عنایت ہو گی اگر آپ مجھے باخبر کر دیں"

مزید چار مہینے گزر گئے اور ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء کو اختر صاحب کا ایک اور خط آیا کہ:۔

"جامعۂ میسور کی پروفیسری تو ایک معمۂ لاینحل ہو کر رہ گئی ہے، مجھے تو اب تک کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ کیا ابھی تک کوئی تقرر نہیں ہوا؟ میں تو سمجھا کہ فیصلہ ہو چکا ہوگا اور میرا آنا وہاں نہ ہوا، بہر کیف!"

اختر صاحب کے خطوط میں خط کشیدہ جملوں سے واضح ہے کہ وہ میسور آنے کے نہایت مشتاق اور جامعۂ میسور میں ان کے تقرر کے بارے میں حکومت ریاست میں جو کارروائی ہو رہی تھی اس سے بالکل بے خبر تھے، لیکن یہاں کی زبان خلق پر مختلف افواہیں تھیں۔ ایک یہ کہ اختر صاحب کو پٹنہ ہی میں پروفیسری ملنے والی ہے اس لئے وہ تنخواہ کے معاملے میں حکومت میسور سے مراسلت کر رہے ہیں۔ پروفیسری کی تنخواہ اس وقت ۴۰۰ — ۲۵ — ۷۰۰ روپے تھی۔ ایک اور افواہ یہ تھی کہ میسور سے اختر صاحب کو خطوط بھیجے گئے ہیں جن میں انہیں دھمکی دی گئی ہے کہ وہ میسور آئیں گے تو جان کی خیر نہیں اور یہ بھی افواہ تھی کہ بعض لوگوں نے اختر صاحب سے التماس کی ہے کہ وہ میسور آ جائیں، انشاء اللہ ان کے سب مطالبے حکومت سے منظور کرا لئے جائیں گے۔ ان افواہوں کے سچ یا جھوٹ ہونے کے بارے میں اختر صاحب ہی کا بیان مستند ہو سکتا ہے۔

بہر حال اختر صاحب میسور نہیں آئے اور جامعۂ میسور میں اردو کی پروفیسری پر دس برس سے زیادہ ایک ایسے شخص مامور رہے جو فارسی کے پی ایچ ڈی تو تھے لیکن بی۔ اے کے پاس کورس میں اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھی تھی۔

اس طویل عرصے میں ریاست کے اردو دانوں کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو۔جی۔سی) کی وزیٹنگ کمیٹی نے جس کے ایک رکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب بھی تھے۔ ۱۹۵۹ء میں جامعۂ میسور کیلئے ایک اردو کے پروفیسر کی سفارش کی اور اس پروفیسر کا انتخاب اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ہوا، انتخابی بورڈ میں ماہرین خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر ڈاکٹر سید اختر احمد اختر شامل تھے، لیکن اردو کی پروفیسری کے لئے درخواست داروں کا

۳۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں انٹرویو ہوا تو مذکورہ پروفیسروں کی بجائے پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین ماہرین خصوصی کی حیثیت سے بورڈ میں موجود تھے۔

جامعۂ میسور کے ایکٹ کی رو سے انتخابی بورڈ کے ماہرین خصوصی کی رکنیت کی میعاد کم از کم تین برس کی مقرر تھی، اس بنا پر مئی ۱۹۶۱ء میں انتخابی بورڈ کے فیصلے کے خلاف ایک "رٹ" میسور کے ہائی کورٹ میں داخل ہوئی۔ اس "رٹ" میں انتخابی بورڈ کے ماہرین خصوصی کی مقررہ میعاد کے اختتام سے پہلے معزولی خصوصاً جب کہ انہوں نے کبھی اپنے فرائض انجام ہی نہیں دیے تھے غیر آئینی ہونے کا بھی مذکور تھا۔ اگرچہ جامعہ میسور کے اس ایکٹ میں ۱۰ اپریل ۱۹۶۲ء کے میسور ایکٹ ۱۹ کی رو سے زمانہ گذشتہ کو شامل کرکے ترمیم کی گئی تھی کہ ماہرین کی رکنیت کی کوئی میعاد مقرر نہیں۔ جامعہ اپنی مرضی سے جب چاہے ماہرین کو بحال یا معزول کرسکتی ہے۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر اختر صاحبان کی معزولی اس ترمیم سے پہلے عمل میں آئی تھی جامعہ نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان دونوں ماہرین نے انتخابی بورڈ کی رکنیت کے فرائض سے معذرت چاہی ہے۔

"That the two specialists expressed their inability to act as members of the Board of appointments."

حاصل یہ کہ اختر صاحب جامعۂ میسور کے "اردو کے پروفیسر" کی حیثیت سے آئے مگر اردو کے پروفیسر کے انتخابی بورڈ کے ماہر خصوصی کی حیثیت سے۔

"تحقیق نوادر" میں نے انشا کی دریائے لطافت کو پی ایچ ڈی کے لئے ایڈٹ کرنے کے دوران میں بطور دیباچہ لکھی تھی۔ ہندوستان میں انشا کے بارے میں جو کچھ مواد شائع ہوا تھا اس پر میری نظر تھی لیکن ہندوستان سے باہر انشا کے متعلق جو تحقیقات ہو رہی تھی اس کی مجھے اطلاع نہ تھی میں اختر صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے آگاہی بخشی، چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"نوادر کے تحقیقی حصے کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس موضوع پر میرے ایک شاگرد صفیر الدین بشیر احمد نے مقالہ لکھا ہے۔ اور لندن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کیا ہے۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں وہ کام کر رہے تھے، پروفیسر بارنے کی نگرانی میں مقالہ لکھا گیا ہے۔ مجھ سے بھی مشورے ہوجاتے رہے ہیں۔ انشا کی ادبی و لسانی خدمات صفیر سلمہ کے پیش نظر تھیں۔ مقالے کی کوئی نقل اب تک میرے پاس نہیں پہنچی ورنہ آپ کو ارسال کردیتا۔ غالباً عزیزم سلمہ کو ڈگری مل چکی ہوگی۔ اس طرف ان کا خط نہیں آیا۔ بہرکیف آپ اپنا مقالہ ضرور مکمل کرلیں اور علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کرلیں۔ میں آپ سے واقف نہ تھا۔ ماشاء اللہ آپ خوش نویس ہیں، خاک دکن نے آمنہ، ممتاز شیریں اور صاحب تاج کو جنم دیا، اس پر وہ جتنا فخر کرے کم ہے۔ اللہم زد فزد"

پھر میں نے پروفیسر بارنے کو "تحقیق نوادر" بھیجی اور صفیر احمد صاحب کے مقالے کا مائکروفلم منگوایا۔ پروفیسر بارنے نے اپنے مکتوب ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء میں لکھا کہ:-

"آپ کی تحقیقات نے صفیر احمد کے مقالے کے سوانحی حصے میں مفید اضافے کئے ہیں چونکہ یہ پیشتر مقالہ معلوم ہوتا تھا کاش آپ کی تحقیقات پہلے ہی میسر ہو جاتیں۔ ابھی انشا کی زندگی اور تحریروں میں تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنی تحقیقات کو اور پھیلائیں گے۔ انشا کے دل و دماغ میں ادبیت اور اختراع تھی۔ میں ممنون ہوں کہ انشا کے بارے میں آپ نے جو مواد جمع کیا اور اس کا

جس طرح تجزیہ کیا ہے اس کے دیکھنے کا مجھے
موقع ملا ؟

پروفیسر ہارے نے تحقیقی نوادر کے بارے میں جو رائے دی ہے اس کے لئے میں اختر صاحب کی شکرگزار ہوں اگر آپ نے میری رہبری نہ کی ہوتی تو پروفیسر ہارے (جو اب مرحوم ہیں) سے واسطہ کے شرف سے محروم رہتی۔ علاوہ اختر صاحب کی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آپ نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔

ان سطروں کو میں اختر صاحب کے ایک مکتوب کے آخری پیراگراف پر جو آپ کی ادبی زندگی کا خلاصہ ہے ختم کرتی ہوں:-

"ا۔ احمد صاحب کی اردو تصانیف
کی تعداد بارہ ہے۔ خدمت اردو پر ۲۳
سالوں سے مامور ہیں۔ شعبہ اردو جامعہ پٹنہ
کا بوجھ انہی کے کاندھوں پر ہے۔ اللہ تعالے
بحسن و خوبی انجام خدمت کی توفیق دے!
یونیورسٹی پروفیسر ۱۹۵۹ء سے ہیں"۔
مکتوب محررہ ۲۹ دسمبر ۱۹۶۱ء

دوران

بقیہ ڈاکٹر اختر اورینوی کے آئینہ ....

کس اصول کو انسانی زندگی کے لئے باعث رحمت و فلاح تصور کرتے ہیں۔ اس بحث میں پڑنے کا مجھے حق نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ جیتے بلند، وجیہہ و شکیل، پروقار، خوش ذوق، با اخلاق اور ہمدرد انسان ہیں۔ اتنے ہی ممتاز ادیب، عظیم المرتبت نقاد اور جادو بیان مقرر ہیں۔ ان کی شاعری بھی وجدان و کیفیات و شگفتہ جذبات پر شکوہ شعور کی لہروں سے خالی بھی نہیں۔

بقیہ اختر صاحب بہ حیثیت مربی

سے کہہ اپنی صحت کا پورا خیال رکھیں، بہت احتیاط اور پرہیز سے رہیں، مشاعروں میں بھی وہیں جائیں جہاں زیادہ سے زیادہ آرام اور سہولت مل سکے۔ میں نے اختر صاحب کا پیغام مجیر صاحب تک پہنچا دیا۔ مجیر صاحب کی ذات سے اختر صاحب کی یہ ہمدردی ان کے ایک مکمل شریف النفس انسان ہونے کی بین دلیل ہے۔ جس کی تہہ میں ربوبیت کا وہی جذبہ کارفرما تھا جس کے لئے یہ سرخی قائم کی گئی ہے۔

اختر صاحب کے مربیانہ سلوک کے سلسلہ میں، میں نے جو کچھ عرض کیا، وہ دریا سے چند قطرے بھی نہیں، یہ میرے ذاتی تجربے ہیں، وہ بھی انتہائی نامکمل اور تشنہ ۔ کیا لکھوں، اور کیا نہ لکھوں۔ جس طرح اللہ تعالے کی شان ربوبیت، احاطہ تحریر میں نہیں لائی جا سکتی، اسی طرح اس کے نیک اور صالح بندے، جن کو اس نے اس صفت سے نوازا ہے، شاعروں کی فیاضیاں بھی پوری کی پوری قلم بند نہیں کی جا سکتیں۔ اختر صاحب کے ساتھ بھی تقریباً یہی معاملہ ہے، ان کی فیاضی، ان کی داد و دہش، ان کی سرپرستی اور سایہ فگنی کا ذکر جتنا بھی کیا جائے کم ہے، اس لئے کہ وہاں تو "دینا دلانا" ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس کو لکھنے والا کہاں تک لکھ سکتا ہے اور بیان کرنے والا کہاں تک بیان کر سکتا ہے۔ لیکن ان کا رویہ اور سلوک مجھ جیسے تمام لوگوں کے لئے یکساں ہے، اس میں کوئی تخصیص اور امتیاز نہیں، ہاں وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالے کے بندوں میں اس کی تمام صفتیں موجود رہتی ہیں، شان ربوبیت بھی اس کی ایک صفت ہے اور اختر اورینوی اس صفت کے بلاشبہ مظہر ہیں۔

میں نے اختر صاحب پر لکھنے کے لئے دوسرا موضوع منتخب کیا تھا "اختر ساز نو" والے، خصوصاً نقیبا لعینی صاحب متکرر یہ موضوع دیکھ کر شاید میری مفلسی کو طشت از بام کرنا چاہتے تھے، واللہ اعلم بالصواب۔ ع
تو نے کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا۔

ڈاکٹر محمد مطیع الرحمن

اختر اورینوی

ایک استاد اور نگراں کار کی حیثیت سے

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی اپنی گراں بہا علمی اور ادبی خدمات کے باعث ہندوستان گیر شہرت اور اہمیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تقریباً چالیس سالوں سے علم و فن کے مختلف موضوع پر اس قدر تسلسل اور جاندار نگارشات لکھا ہے اور ادبِ اردو کے خزانہ میں اتنا شاندار اور بیش بہا اضافہ کیا ہے کہ برِّ عظیم ہند و پاک میں جہاں کہیں بھی شمعِ اردو کے پروانے موجود ہیں وہ اُن کے نام اور اُن کی تصانیف سے ضرور واقف ہیں۔ ایک نامور ادیب، عظیم المرتبت فن کار، نازک خیال شاعر، بلند پایہ محقق اور کامیاب تنقید نگار کی حیثیت سے وہ پوری اردو دنیا میں روشناس ہیں۔ گجرات کوٹہ اور رتناگری سے بنگلور تک ہر جگہ وہ مشہور ہیں، مقبول و معروف ہیں۔

بہار میں اُنکی حیثیت ایک ایسے اخترِ تاباں کی ہے جسکی روشنی سے علم و ادب کے پرستاروں کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے بہار میں انہوں نے اردو کے نونہالوں کی اس طرح آبیاری کی ہے کہ انہیں یہاں کے اُفقِ ادبی کا مہرِ درخشاں کہنا مناسب ہے جسکی تابانی اور ضیا باری نے ذرّوں کو بھی تاروں کی طرح جگمگا دیا ہے۔

اختر اورینوی کی پُرکیف، ہمہ گیر اور نیرنگ بداماں شخصیت علم و فضل اور مہر و محبت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے سینکڑوں دل سیراب ہو چکے ہیں، اور ہو رہے ہیں۔ میں بھی اس سرچشمہ سے سیراب ہوا ہوں۔ میں گذشتہ بائیس سالوں سے انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ چھ برس تک اُن کا شاگرد رہا اور تیرہ سالوں سے ایک رفیق کار کی حیثیت سے اُنکی ماتحتی اور نگرانی میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے اُن سے بہت پایا ہے۔ اور بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ مجھے بنانے، سنوارنے اور آگے بڑھانے میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں نے اُن کو صرف ایک نہایت ہی دیانتدار، مخلص محنتی اور شفیق استاد ہی نہیں بلکہ شرافت، انسانیت اور حسنِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم، ایک ہمدرد رہنما اور لائقِ صد احترام بزرگ بھی پایا ہے۔

میری زندگی میں جب بھی خوشی کا موقع آیا ہے، اختر اورینوی کو اس سے دلی مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی ہے۔ میرے دکھوں اور مصیبتوں میں وہ برابر شریک رہے اور اسے اپنا ہی درد و غم سمجھا۔ میری مصیبتوں پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ مجھے صبر کی تلقین کی۔ مجھے سہارا دیا۔ مصائب و آلام کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں انہوں نے خلوص اور محبت کا دیا جلایا۔ میرے غم کو بانٹ لیا۔ علم و فضل کے علاوہ اُن کی شخصیت کے یہی وہ پہلو ہیں جن سے دل کی گہرائیوں میں اُنکی قدر ہے۔ میں اپنی زندگی میں اپنے جن چند اساتذہ کی صلاحیت اور خلوص سے متاثر ہوا ہوں اُن میں اختر اورینوی کا نام سرِ فہرست ہے۔

۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی کی تشکیلِ نو سے قبل بہار میں ایم اے کی تعلیم کا انتظام صرف پٹنہ کالج میں تھا یہ کالج براہِ راست حکومت بہار کی نگرانی میں تھا اور اس کا شمار ملک کی چند اہم اعلیٰ تعلیم گاہوں میں ہوتا تھا۔ پٹنہ کالج میں بی۔ اے تک اردو تعلیم کا انتظام عرصہ سے

مسٹر سید عبدالعزیز صاحب بار ایٹ لاء مرحوم کے دورِ وزارت میں ہو چکا تھا اور ۱۹۳۷ء کے اوائل میں پٹنہ کالج میں اُردو کے ایم۔ اے درجہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی پٹنہ یونیورسٹی میں ۱۹۲۹ء سے پرائیوٹ اُردو ایم۔ اے۔ امتحان کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اختر صاحب نے ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔

۱۹۳۷ء میں جب صوبوں کو خود مختاری حاصل ہوئی اور بہار میں کانگریس حکومت برسرِ اقتدار آئی تو وزیرِ تعلیمات جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بالقابہ نے پٹنہ کالج میں اُردو ایم۔ اے کی باضابطہ تعلیم کے انتظام کا فیصلہ کیا۔ اُردو کے لکچرر کا ایک نیا عہدہ منظور کیا گیا اور اس پر اختر صاحب کا تقرر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ پٹنہ کالج میں شعبۂ اُردو کے قیام اور نئے لکچرر کے تقرر کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب محترم نے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ خود اُردو زبان و ادب کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ پٹنہ کالج کے ایک کنووکیشن کلاس میں وہ اختر صاحب کے پُرزور اور شگفتہ اندازِ بیان اور طریقۂ تعلیم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پبلک سروس کمیشن کی سفارشات میں اوّل نام کو نظرانداز کر کے اختر صاحب کو نئی جگہ پر متقرر کر دیا۔ ۸ دسمبر ۱۹۳۷ء کو اختر صاحب نے اپنے عہدہ پر لکچرر کی حیثیت سے کام شروع کیا اور اسی روز سے پٹنہ کالج میں استاذی پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب شمس منیری کی صدارت اور نگرانی میں اُردو کا نیا شعبہ قائم ہوا۔ پٹنہ میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے پہلو میں گورنمنٹ اُردو لائبریری اور پٹنہ کالج میں شعبۂ اُردو کا قیام ڈاکٹر سید محمود صاحب محترم کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے اور اس پر بہار کی کانگریسی سرکار بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

اختر صاحب نے جب دسمبر ۱۹۳۷ء میں پٹنہ کالج میں ملازمت شروع کی تو اس وقت میں مظفرپور ضلع اسکول کے آٹھویں درجہ میں تھا۔ جب میں میٹرکولیشن میں آیا تو استاذی پروفیسر سید حسن صاحب کی کتاب اشعارِ جدید کے ذریعہ اختر صاحب سے روشناس ہوا۔ میٹرک کے بعد میں نے جون ۱۹۴۲ء میں پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس وقت تک اختر صاحب کی ملازمت کو چار سال سے زائد ہو چکے تھے اور وہ کالج کے نہایت ہی مقبول اور سرگرم رکن سمجھے جاتے تھے۔ وہ بزمِ ادب کے نائب صدر تھے۔ کالج میں اُن کی شہرت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوا تھا۔ اُن دنوں عربی، فارسی اور اُردو کے شعبے پٹنہ کالج کے موجودہ سائنس بلاک میں تھے۔ کالج میں میرے داخلہ سے کچھ ہی روز قبل پرنسپل ہمانشو رودھا کرشن یا قیصا مظفرپور جی۔ بی۔ بی کالج سے پٹنہ کالج میں تبدیل ہو کر آئے تھے۔ جولائی میں کالج کھلنے کے چند ہی روز بعد نئے پرنسپل نے عربی، فارسی اور اُردو کے شعبوں کو موجودہ بی۔ اے۔ بلاک میں تبدیل کر دیا۔

انٹرمیڈیٹ کلاسوں میں اختر صاحب کے نہایت ہی عزیز اور قریبی رشتہ دار زبیر احمد ہیجان دونوں ٹاٹا کالج چائباسہ میں اُردو کے پروفیسر ہیں میرے ساتھی اور دوست تھے۔ اُن دنوں سوبجیکٹ اُردو تمام طلبا کے لئے لازمی تھی اور ہفتہ میں دو بار کمپوزیشن کے کلاس ہوتے تھے۔ عموماً اختر صاحب یہ کلاس آئی۔ اے۔ بلاک کے کمرہ ۳۴ میں لیا کرتے تھے اور بڑے ذوق و شوق، بڑی محنت اور لگن سے پڑھایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پڑھانے والے کو اپنے کام سے غیر معمولی شغف اور دلچسپی ہے اور وہ اسے ذمہ سمجھ کر نہیں ٹال رہے ہیں۔ وہ نئے اور نوجوان طلبا کے ادبی شعور کو بیدار کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اور زور ادب کے باوجود طلبا اُن کے صاف اور واضح، شگفتہ اور رواں اندازِ بیان سے بیحد متاثر ہوتے تھے لیکن چونکہ انٹرمیڈیٹ میں میرا اختیاری مضمون فارسی تھا اسلئے پٹنہ کالج میں زمانۂ تعلیم کے ابتدائی دو سال میں میں اُن کے بہت قریب نہیں آسکا۔

تمام وسیع النظر مفکرین اور ماہرینِ تمدن اس بات پر متفق ہیں کہ جدید ہندوستانی تہذیب، ہندی، اسلامی اور مغربی اثرات کے تحت پروان چڑھی ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تمدن غالب عنصر کی حیثیت سے شامل ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے خوشگوار تعلقات نے ہندوستانی تمدن میں بڑی لطافت اور پاکیزگی، جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی ہے ہندوستانی تمدن کئی تہذیبوں کا سنگم اور اُن کا حسین امتزاج ہے جب کبھی اسے خالص ہندو یا خالص

اسلامی تمدن کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تہذیب اور اس کے فطری ارتقا کو شدید نقصان پہنچا ہے اور اس سے مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

پرنسپل باٹھجا اپنے زمانے کے بہت ہی قابل انسان اور تاریخ و معاشیات کے ماہر تھے۔ وہ انڈین ایجوکیشنل سروس کے ایک ممبر تھے اور اچھی انتظامی صلاحیت کے مالک تھے لیکن باوجود ان تمام خوبیوں کے وہ تندرسے زود رنج تھے اور طبیعت تنگ نظری کی طرف مائل تھی۔ بہار کی کانگریس وزارت اُن سے ناراض تھی اور وہ وزیر تعلیمات کے عتاب میں تھے۔ حکومت یا عوام کو خوش کرنے کیلئے اُن سے بعض ایسی حرکات سرزد ہوئیں جس سے متحدہ قومیت کی تحریک کو نقصان پہنچا۔ تمام اصول و ضوابط اور روایات کے خلاف انہوں نے مظفرپور کالج میگزین کا نام "روشنائی" رکھ دیا۔ مظفرپور میں اس فیصلہ کے خلاف آواز بلند ہوئی جسے انہوں نے دبا دیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب وہ پٹنہ آئے تو پٹنہ کالج میگزین کا نام بھی بدل کر "سوریان" رکھ دیا۔ پرنسپل کے اس فیصلہ کے خلاف متحدہ تہذیب کے علمبرداروں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن جیوں جیوں پرنسپل کی ضد بڑھتی گئی طلبا کے احتجاج نے بھی شدت اختیار کی۔

باٹھجا صاحب نے ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کو کالج کی اسّی سالہ جوبلی کے موقع پر ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا طلبا میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں لیکن اُردو پڑھنے والے اکثر و بیشتر طلبا نے پرنسپل کے غلط فیصلہ کے خلاف اس جشن کا مقاطعہ کیا۔ میگزین سوریان کے نام سے نکلتا رہا۔ لیکن احتجاج بھی جاری رہا۔ آخرکار ۱۹۴۵ء میں حکومت بہار کے مشیر تعلیمات کی مداخلت سے پرنسپل کو میگزین کا نام بدلنا پڑا۔

پرنسپل نے کالج میگزین کا نام بدل کر جس جذبہ کا مظاہرہ کیا تھا وہ وسیع النظر حضرات کو قطعی پسند نہیں تھا۔ اساتذہ میں پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب اور جناب اختر اورینوی کی تمام و کمال ہمدردیاں اُن طلبا کے ساتھ تھیں۔ جو سرکاری اداروں کو تعصب اور تنگ نظری سے دور رکھتے ہوئے متحدہ قومیت کے جھنڈے کو بلند رکھنا چاہتے تھے۔ اختر اورینوی پرنسپل کے غلط فیصلہ کو صحیح کہنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی میں غیر فرقہ وارانہ نظام حکومت کی منظوری سے آٹھ سال قبل انہوں نے اپنے کالج میں سیکولرزم کی حمایت میں طلبا کی رہنمائی کی اور انہیں کامیابی ہوئی۔

۱۹۴۲ء میں میں نے آئی۔ اے پاس کیا اور بی۔ اے میں داخلہ لیکر اردو میں آنرز لیا۔ آج کل کی طرح اس وقت آنرز کی تعلیم بالکل الگ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ آنرز کے اول تین پرچے پاس کلاس کے ساتھ مشترک تھے اور ان کے مشترک ہی کلاس بھی ہوتے تھے۔ آنرز کے آخری تین پرچوں کیلئے روزانہ دس بجے سے صرف ایک کلاس رہتا تھا۔ آنرز کلاس میں ہم لوگ کل چھ لڑکے تھے۔ اُن میں تین بہار نیشنل کالج سے اور تین پٹنہ کالج سے۔ پٹنہ کالج سے میرے دو ساتھی عبدالعلی اور مناظر احمد تھے۔ اب یہ دونوں پاکستان میں ہیں۔

شعبہ اردو میں تین اساتذہ تھے جناب حافظ شمس الدین احمد صاحب صدر شعبہ، پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب گیلانی اور اختر صاحب۔ اختر صاحب اپنا کلاس بی۔ اے بلاک کے شمالی مغربی گوشہ میں کمرہ نمبر ۱۱ میں لیا کرتے تھے۔ آج کل اس کمرہ میں بزم ادب لائبریری ہے۔ وہ پوری پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر پہنچتے تھے۔ اور گھنٹہ بھر بڑے جوش و خروش، بڑی محنت اور شفقت سے پڑھاتے تھے۔ دو سال کے عرصہ میں نہ کبھی وہ کلاس میں تاخیر سے پہنچے اور نہ کبھی کلاس کے قیمتی اوقات کو گپ یا کسی دوسری فضول باتوں میں صرف کیا اور نہ کبھی پڑھانے میں غفلت اور تساہل کا اظہار کیا۔ گھنٹے بھر علم و ادب کا دریا جاری رہتا اور طلبا اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہتے۔

بی۔ اے آنرز کے دو سالوں میں اختر صاحب نے افسانہ نگاری، اردو تنقید اور تاریخ ادب اُردو پر بے شمار لکچر دیئے۔ اُن کے لکچروں سے اُنکی وسیع معلومات، اُن کے تبحرِ علمی اور اُن کے عمیق مطالعہ کا اندازہ ہوتا تھا۔ تاریخ اسلام اور تاریخ تمدن پر وہ حاوی تھے۔ تہذیب انسانی کے ارتقا میں جو عناصر کارفرما رہے ہیں اور سماجی اور تمدنی قدروں کے ادب پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔

اُن دنوں اُردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر اُن کی وہ گہری نظر نہ تھی
جو آج برسوں کے مطالعہ اور تجربہ کے بعد پیدا ہوئی ہے لیکن اس کمی کو
انہوں نے تاریخ، تمدن، تنقید، لسانیات، سائنس اور معاشیات کے
مطالعہ سے پورا کر لیا تھا۔ مغربی علوم و فنون کے مطالعہ سے اُن کے لکچروں میں
ایک جدت اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی اور پھر اُن تمام خوبیوں کے علاوہ
اُن کا وہ پرجوش، شگفتہ، شیریں اور رنگین اندازِ بیان جو سونے پر
سہاگہ کا کام کرتا تھا۔

اختر صاحب کے لکچروں میں اکثر تو اُردو بھی ہوتا تھا لیکن یہ ہرزہ نہیں
انسان کا مذاق ہے اور کوئی عیب نہیں۔ وہ اپنے لکچروں میں فارسی کی
خوبصورت ترکیبیں، اچھوتی، نازک اور دل آویز تشبیہیں اس طرح
استعمال کرتے تھے کہ لکچروں میں شاعری کا لطف آجاتا تھا۔ دو سال کے عرصہ
میں اختر صاحب کے لکچروں سے میری معلومات میں بیش از بیش اضافہ ہوا۔
اُردو زبان کی پیدائش و نشو و نما اور ادب اردو کے ارتقاء کے متعلق میری واقفیت
اور اہلیت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی جس سے مجھے آئندہ بہت مدد ملی۔

بی۔ اے کلاس میں مجھ پر اُن کی خاص نظر رہی۔ [illegible] بہت محنت کی اور اختر
صاحب نے بہت توجہ سے اصلاح کی [illegible] انہوں نے مجھ پر اُردو زبان و
ادب کی خوبیاں واضح کر دیں اور میرے ادبی شعور کو بیدار کیا۔ مجھے اپنی زبان
اپنے کلچر، اپنی تہذیب اور تمدن سے محبت کرنا سکھایا۔ اُن دو سالوں
میں مجھے اختر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اُن کی شخصیت
کے بہت سے پہلو مجھ پر آشکارا ہوئے۔ اُن کو میں نے ایک صاحبِ علم و
فضل، لائق اور شفیق استاد کے علاوہ ایک نہایت ہی شریف اور
ہمدرد انسان بھی پایا۔ خدائے واحد اور اُس کی عظمت پر یقینِ کامل، اسلام
اور بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور والہانہ عقیدت، صوفیائے
کرام اور بزرگانِ دین کی بے لوث خدمات کا اعتراف اور اُن کا احترام
اُن کے کردار کے خاص جوہر ہیں جن سے وہ کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ ۱۹۴۵ء
کے موسمِ برسات میں جب کہ ایک مقامی ہائی اسکول کے ایک ٹیچر نے جنابِ
رسالت مآب صلعم کی شان میں کچھ گستاخانہ الفاظ استعمال کئے تھے۔ دوسرے
روز جب اختر صاحب کلاس میں ہم لوگوں کے ذریعہ ان کو اس کی خبر ملی تو اُن کی آنکھیں
سرخ ہو گئیں، چہرہ تمتما اٹھا۔ اور رنج و ملال کے سبب اُس روز وہ کلاس
نہ لے سکے۔ اُسی دن میں اُن سے پوری طرح متاثر ہوا اور مجھے اس کا
احساس ہے کہ اگر میں اُردو میں آنرز نہ لیتا اور اُن کے قریب نہ آتا تو جو
کچھ میں بن سکا وہ شاید نہ بن سکتا۔

بی۔ اے میں آنرز لینے کے تقریباً چھ ماہ بعد یعنی دسمبر ۱۹۴۳ء تک
غالباً اختر صاحب میرے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکے تھے۔ میرے
جن ساتھیوں کا آئی۔ اے میں اُردو بھی اختیاری پرچہ تھا اُن کو وہ اچھی طرح
جانتے تھے۔ مجھ سے اُن کی خاص واقفیت نہ تھی۔ اسی لئے اُن کے انداز
اور برتاؤ میں ایک قسم کی بیگانگی پائی جاتی تھی۔ جب دسمبر ۱۹۴۳ء میں ششماہی
امتحان ہوا۔ اور انہوں نے پرچے دیکھے تو خوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ میرے
انہماک، میرے شوق اور میری محنت سے متاثر ہوئے۔ میری ہمت افزائی
کی۔ مجھے اپنے ہونہار شاگردوں میں شمار کرنے لگے اور ہر قدم پر میری رہنمائی
کی۔ ۱۹۴۴ء میں میں نے بی۔ اے پاس کیا اور بی۔ اے اور بی۔ ایس سی۔
ملاکر یونیورسٹی میں اوّل آیا تو اختر صاحب کو دلی مسرت اور شادمانی
حاصل ہوئی۔

۱۹۴۴ء میں میں نے اُردو ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ شعبہ
میں [illegible] اس وقت تک اس انہماک اور زور و شور کے ساتھ
ایم۔ اے میں تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے۔ اُن
دنوں پورے ملک پر ایک سیاسی انتشار کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ ۱۹۴۶ء
کا ہنگامہ خیز اور فیصلہ کن الکشن ختم ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوستان سے
جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ حصولِ اقتدار کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ میں
سخت مقابلہ تھا۔ ملک کی فضا مسموم ہو رہی تھی۔ فرقہ وارانہ فساد کا سلسلہ
شروع ہو چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں اضلاع پٹنہ، سارن، گیا اور مونگیر
کے ایک وسیع علاقہ میں فساد ہوا۔ بے گناہ مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔
اختر اورینوی کا نازک اور حساس دل قتل اور خون کے لرزہ خیز واقعات
سے بہت متاثر ہوا اور وہ بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ فسادات سے کچھ دنوں
قبل وہ رانی گھاٹ کوارٹرس سے مسلم ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت
سے پٹنہ کالج کیمپس میں آگئے تھے۔ فساد کے دوران ہوسٹل کے لڑکوں کی

حفاظت کے سلسلہ میں اُن پر بڑی ذمہ داری آگئی اور اُنہیں بہت جد و جہد کرنی پڑی۔

ام۔ اے کے پہلے سال میں وہ کچھ پڑھا نہ سکے۔ دوسرے سال میں حصولِ آزادی کے بعد جب حالات کچھ پُرسکون ہوئے تو انھوں نے پھر پڑھانا شروع کیا اور اسی خلوص اور انہماک اور اسی محبت اور شفقت کے ساتھ جو اُن کی فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ ام۔ اے کے مختلف پرچوں کی تیاری کے سلسلہ میں اُنہوں نے خاص طور پر میری رہنمائی کی۔

اس زمانہ میں بی۔ اے کے رزلٹ یا صلاحیت کے لحاظ سے صرف سات لڑکوں کو سو روپیہ ماہانہ کی پوسٹ گریجویٹ اسکالرشپ ملتی تھی۔ چونکہ میں اپنے شعبہ کے علاوہ پوری یونیورسٹی میں اوّل آیا تھا اسلئے مجھے اس اسکالرشپ کے نہ ملنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ صدرِ شعبہ نے بھی پُرزور سفارش کی تھی لیکن میرے بعض احباب نے بااثر حضرات کے ذریعہ ایوانِ حکومت تک اپنے لئے سفارش پہنچائی اور مجھے نقصان پہنچانا چاہا۔ اختر صاحب کو کسی ذریعہ سے یہ خبر معلوم ہوئی۔ اُن کو تکلیف ہوئی۔ اُنہوں نے مجھے مطلع کیا اور خود بھی اس سفارش کے توڑ کی پوری کوشش کی۔ میں نے بھی اربابِ بست و کشاد تک خبر پہونچائی۔ جناب کامتا پرشاد ایڈیشنل ڈی۔ پی۔ آئی۔ نہایت ہی انصاف پرور حاکم تھے اُنہوں نے صحیح فیصلہ کیا اور اسکالرشپ جو میرا حق تھا مجھے دے دیا۔

ام۔ اے کرنے کے بعد جولائی ۱۹۴۹ء سے اگست ۱۹۵۱ء تک ملازمت کے سلسلہ میں مجھے پٹنہ سے باہر رہنا پڑا۔ اس دو سال کے عرصہ میں جب کبھی پٹنہ آنے کا اتفاق ہوا اور اختر صاحب سے ملا تو اُنکی شفقت اور محبت میں مطلق کمی نہیں پائی۔ حافظ صاحب ۱۹۵۱ء میں اپنے عہدہ سے ریٹائر کرنے والے تھے۔ اُنکی اور اختر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ میں اُنکی جگہ پر آجاؤں چنانچہ جس وقت میں ٹی۔ ان۔ جوبلی کالج بھاگلپور میں تھا۔ اور اختر صاحب ۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء کو وہاں کی بزمِ اُردو کے سالانہ جلسہ میں شرکت کیلئے تشریف لے گئے۔ اس روز میری طبیعت قدرے ناساز تھی۔ وہ میری قیام گاہ پر آئے۔ بڑی محبت کا اظہار کیا اور تاکید کی کہ کمیشن سے حافظ صاحب والی جگہ کا جلد ہی اعلان ہونے والا ہے تم درخواست ضرور دینا۔

جلسہ کی صدارت کے لئے جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیرِ ترقیات تشریف لے گئے تھے۔ میں نے جلسہ کی کامیابی کے لئے بڑی محنت کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بے حد پسند کیا تھا۔ اختر صاحب نے پارٹی میں سینکڑوں بااثر حضرات کی موجودگی میں مجھے بڑی محبت اور گرم جوشی سے ڈاکٹر صاحب سے ملایا اور اُنہیں بتلایا کہ اس جلسہ کی کامیابی کے سلسلہ میں سارا کارنامہ اس نوجوان مجرم کا ہے اور یہ آپ کی دعاؤں اور ہمدردیوں کا مستحق ہے۔ اُن چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور دل پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ تا زندگی قائم رہتا ہے۔

۱۹۵۱ء میں مسٹر کشوری پرشاد سنہا پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ اصول و ضوابط کے سختی سے پابند تھے اور بڑے رعب اور دبدبہ کے افسر تھے۔ اُن میں انتظامی صلاحیت بہت تھی لیکن ایک کمزوری یہ تھی کہ جس سے رنجیدہ ہوتے تھے اُسے کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں کسی امتحان کے سلسلہ میں وہ اختر صاحب سے رنج ہو گئے تھے۔ اس رنجش اور کشیدگی کو انھوں نے زندگی بھر قائم رکھا۔

عربی، فارسی اور اُردو کے شعبے ۱۹۳۶ء میں الگ ہو چکے تھے۔ تینوں شعبوں میں ام۔ اے کی تعلیم کا انتظام تھا۔ تینوں شعبوں کے الگ الگ صدر تھے۔ انتظامی حیثیت سے تینوں شعبوں کا ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا لیکن چونکہ تینوں شعبوں میں درجہ اوّل کے پروفیسر کی ایک ہی جگہ تھی اسلئے درجہ اوّل کے پروفیسر کو امتیاز کا طور پر تینوں شعبوں کا کوارڈی نیٹنگ ہیڈ یا سربراہ سمجھا جاتا تھا چونکہ مسٹر کے۔ پی سنہا اختر صاحب سے ناراض تھے۔ نئی یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی۔ وہ اختر صاحب کو دبانا چاہتے تھے تاکہ وہ مستقبل میں ترقی نہ کر سکیں۔ اسلئے مئی ۱۹۵۱ء میں حافظ صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے استاذی ڈاکٹر اقبال حسین صاحب کی نگرانی میں عربی، فارسی اور اُردو کے شعبوں کو پھر یکجا کر دیا اور کالج کھلنے پر اختر صاحب کو شعبہ کا صدر تسلیم نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا نقصان بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن تینوں شعبوں کو یکجا کر دینے سے اُردو اور عربی کے شعبوں کی آئندہ ترقی ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جاتی۔ اسلئے اختر صاحب اور شعبہ کے دوسرے اساتذہ کو مسٹر سنہا کے اس فیصلہ سے شدید اختلاف تھا۔

۶ اگست ۱۹۵۱ء کو حافظ صاحب والے عہدہ کے لئے میرا انٹرویو ہوا۔ ابھی میرے تقرر کا مسئلہ کمیشن کے زیرِ غور تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے بعض احباب کے ذریعہ

حکومت سے کہہ دیا کہ اُلاکہ لکچرر کا عارضی طور پر تقرر کر دیا جائے تاکہ لڑکوں کی تعلیم نقصان
نہ ہو۔ چنانچہ حکومت بہار نے ۲۶ر اگست کو مجھے پٹنہ کالج میں عارضی طور پر لکچرر مقرر
کرنے کا فیصلہ کیا اور میں نے ۲۶ر ستمبر ۱۹۵۱ء سے کام شروع کیا۔ اپنے عہدہ کا چارج
لینے کے بعد جب میں پرنسپل سے ملا تو انہوں نے مجھ پر واضح کر دیا کہ تینوں شعبہ ایک ہے
اور اُس کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب ہیں۔

پٹنہ کالج میں میرے آجانے سے اختر صاحب کو مسرت ہوئی انہوں نے بڑی
محبت سے میری پذیرائی کی مجھ پر پوری طرح اعتماد کا اظہار کیا۔ کل ہی ہو کر مجھے وہ اپنے
ساتھ ساتھ لے گئے اور مختلف شعبوں میں لے گئے اور اساتذہ سے محبت بھرے الفاظ
میں میرا تعارف کرایا۔ ۱۱ر ستمبر کو مجھے اپنے ساتھ یونیورسٹی کے دفاتر میں لے گئے اور ۱۶ر ستمبر
کو اُن کے ساتھ نیشنل کیڈٹ کور کے افتتاحی جلسہ میں شریک ہوئے۔ چونکہ میرے
متعلق حکومت کو ابھی پولیس کی رپورٹ موصول نہیں ہوئی تھی اور میں عارضی طور پر کام
کر رہا تھا اسلئے اختر صاحب کو برابر اس بات کا قلق رہا کہ میں اپنے عہدہ پر مستقل
ہو جاؤں۔ چنانچہ وہ بار بار مجھ سے پولیس رپورٹ کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔
مجھے خدا پر بھروسہ تھا۔ اور اسکی مہربانی سے حسب خواہ رپورٹ آئی۔ ۱۹ر دسمبر کو
میڈیکل بورڈ کے فیصلہ کے بعد مجھے حکومت نے ۲۶ر ستمبر ۱۹۵۱ء سے اپنے عہدہ پہ مستقل
کر دیا۔

مسٹر کے۔ پی۔ سنہا اختر صاحب سے کس قدر ناراض تھے اس کا اندازہ اس
واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب پروفیسر سنتوش کمار گھوش کلیم صاحب کی جگہ سکریٹریٹ
میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہو کر جانے لگے اور ۶ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو پٹنہ کامن روم میں اُن کے
الوداعی جلسہ کے موقع پر جب اختر صاحب نے اپنی تقریر شروع کی تو مسٹر سنہا اٹھ کر چلے گئے
۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو یونیورسٹی قائم ہو گئی اور حکومت نے پٹنہ کے سارے سرکاری اور غیر
سرکاری کالج پٹنہ یونیورسٹی کے زیر انتظام دیدیا۔ مسٹر کے۔ ایل۔ جل نئے وائس چانسلر
مقرر ہوئے۔ اُن پر مسٹر سنہا کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ۲۳ فروری ۱۹۵۲ء کو سنہا صاحب
نے جل صاحب سے فیصلہ کرا لیا کہ یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اُردو کے شعبے
ایک ساتھ رہیں گے۔ یہ شدید ناانصافی تھی کیونکہ ایم۔ اے تک تعلیم دینے والے
تمام شعبے الگ کر دیئے گئے تھے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عربی، فارسی اور اُردو کے شعبوں کو
یکجا رکھا جاتا۔ یہ اختر صاحب کے خلاف سنہا صاحب کی سب سے بڑی
کامیابی تھی۔

لیکن اختر صاحب خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ایک طرف
عجز و نیاز کے ساتھ دربار الٰہی میں دعائیں کیں اور دوسری طرف جد و جہد جاری رکھی
۳ر اگست ۱۹۵۲ء کو پروفیسر کلیم الدین اور پرنسپل کے۔ پی۔ سنہا میں آرٹس فیکلٹی
کی ڈین شپ کے عہدہ کے لئے مقابلہ ہوا۔ اسی الکشن کے نتیجہ پر شعبہ اُردو کے مستقبل کا انحصار
تھا۔ اللہ نے اختر صاحب کی دعائیں سُن لیں۔ کلیم صاحب کامیاب ہو گئے۔ اختر
صاحب کو جیوں ہی کلیم صاحب کی کامیابی کی خبر معلوم ہوئی۔ انہوں نے مسرت و
شادمانی کے اظہار سے قبل بارگاہ الٰہی میں سجدہ شکر ادا کیا۔ یہ واقعہ ذات باری تعالےٰ پر
اختر صاحب کے یقین کامل کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

دو مہینہ بعد مسٹر کے۔ پی۔ سنہا ناظم تعلیمات ہو کر سکریٹریٹ چلے گئے اور
۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو پروفیسر کلیم الدین احمد پٹنہ کالج کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے۔
ڈین کی حیثیت سے کلیم صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ ۲۳ر فروری کے غیر مناسب فیصلہ کو
تبدیل کرایا۔ ۵ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو اُردو کا شعبہ الگ قائم ہوا۔ اور اختر صاحب اس
کے صدر مقرر ہوئے۔ چنانچہ گذشتہ بارہ سالوں سے وہ شعبہ اُردو پٹنہ یونیورسٹی کے
کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں صدر شعبہ ہو جانے کے باوجود بھی وہ محض اسسٹنٹ پروفیسر
کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین استاذی ڈاکٹر اقبال حسین صاحب
پٹنہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ہ۔ ن۔ کنکردت اور ناظم شعبہ تعلیمات مسٹر کلیم الدین احمد کی
پُر زور سفارش اختر صاحب کی ہمہ گیر صلاحیت اور قابلیت، اُنکی اعلیٰ تصانیف اور
ذاتی اثرات کے پیش نظر آنجہانی ڈاکٹر مسٹر کرشن سنہا وزیر اعلیٰ بہار نے شعبہ اُردو
پٹنہ یونیورسٹی کے لئے درجہ اول کے پروفیسر کے ایک عہدہ کی منظوری دی اور ۱۹۶۰ء
کے موسم گرما میں اختر صاحب اس عہدہ پر بحال ہوئے۔ گذشتہ چار سالوں سے
یونیورسٹی پروفیسر ہو گئے ہیں۔ اور ساڑھے بارہ سو کے اسکیل میں ہیں۔ اُنکی ترقی سے
درجہ اول کے پروفیسر کی جو جگہ خالی ہوئی اُس پر استاذی ڈاکٹر سید محمد صدر الدین
صاحب کام کر رہے ہیں۔ علیگڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹی کو چھوڑ کر صرف پٹنہ ہی ایسی
یونیورسٹی ہے جہاں عربی، فارسی اور اُردو کے تینوں شعبے الگ ہیں اور تینوں الگ الگ
یونیورسٹی پروفیسر کی نگرانی میں ہیں۔ اس سلسلہ میں جہاں یونیورسٹی کے ارباب اقتدار
شکریہ کے مستحق ہیں وہاں جناب کلیم الدین احمد صاحب ناظم شعبہ تعلیمات بہار کی گراں
قدر خدمات کا اعتراف بھی ضروری ہے۔

پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب اور پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل کے مذاکرات بھی احترام میں نے بارہا دیکھا ہے اور اُن کے اس انداز سے متاثر ہوا ہوں۔ جناب کلیم الدین احمد صاحب کے نزدیک بھی وہ ادب اور احتیاط سے گفتگو کرتے ہیں۔

اختر صاحب بزم ادب پٹنہ کالج کے صدر ہیں اور ابتدا ہی سے بزم ادب کے نہایت ہی ممتاز اور سرگرم رکن رہے ہیں۔ بزم ادب ہورن صاحب پرنسپل کے زمانہ میں ۲۳ فروری ۱۹۲۷ء کو قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی اور پہلے صدر جناب ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب مرحوم اور پہلے سکریٹری جناب رضا کریم صاحب رضا کے بڑے بھائی سید ابو مظفر صاحب تھے۔ اس کا پہلا سالانہ جلسہ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو نواب سر ذوالفقار علی خاں سی۔ ایس۔ آئی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر عظیم الدین صاحب مرحوم کے بعد پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل اور پھر پروفیسر حافظ شمس الدین احمد صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے۔ حافظ صاحب کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں اختر صاحب بزم کے نائب صدر مقرر کئے گئے اور حافظ صاحب کے ریٹائر کرنے کے وقت ۱۹۵۱ء تک اسی عہدہ پر رہے۔ بزم کے نائب صدر کی حیثیت سے اختر صاحب نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بزم کے سالانہ جلسوں کی رونق بڑھ گئی۔ ملک کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر سالانہ جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ جلسوں کے موقع پر ڈرامے پیش کئے جانے لگے جو بہت کامیاب ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں جب مجتبیٰ احمد بزم کے سکریٹری تھے، سالانہ جلسہ جو فروری ۱۹۴۳ء کی کسی تاریخ کو منعقد ہوا تھا اس کی صدارت جسٹس بی۔ پی۔ سنہا (بعد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس) نے کی تھی۔ اس جلسہ میں بابائے اردو مولانا عبدالحق صاحب مرحوم بھی شریک ہوئے۔ اسی موقع پر اختر صاحب نے "دخل کا مشاعرہ" اسٹیج کرایا تھا جو بہت مقبول ہوا اور بابائے اردو نے اس جدت کو بہت پسند کیا۔ اختر صاحب اُن دنوں ریڈیائی ڈراموں کو اکثر پیش ہی کیا کرتے تھے۔ اور اس جلسہ کی کامیابی کیلئے انہوں نے بڑی محنت کی تھی۔

۲۳ فروری ۱۹۴۹ء کو جو سالانہ جلسہ ہوا تھا اس کی صدارت جناب پروفیسر آل احمد سرور نے کی تھی اور ڈرامہ رضا کا رام چند

کے پرنسپل تھے۔ اس موقع پر بھی اختر صاحب نے "فتح اسلام اور ملتین کی مجلس شوریٰ" نام کا ایک ڈرامہ پیش کیا۔ اس ڈرامہ کی کامیابی کے لئے اختر صاحب کو بڑا ایک جیتہ محنت کرنی پڑی تھی۔ اس میں ملتین کے علاوہ طارق ابن زیاد، ہسپانوی، سوئی، وغیرہ کے کردار پیش کئے گئے تھے۔ ہسپانیہ کا کردار حافظ صاحب کے داماد عبدالمجید نے اور ملتین کا کردار مولانا گیلانی کے بیٹے محی الدین نے کیا تھا۔ کمال یہ ہے کہ قد، قامت اور شکل و شباہت کے لحاظ سے بھی ایسے ہی طلبا کا انتخاب کیا گیا تھا جو اپنے کرداروں میں بالکل حقیقی معلوم ہوتے تھے۔ سب سے دشوار کام ملتین کا تھا اور اس کردار میں پیش ہونے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ آخر میں میرے دوست محمد معیز الدین صاحب نے، جو اِن دنوں ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں، اس مشکل مسئلہ کو حل کر دیا اور اس کردار کو اس کامیابی کے ساتھ نبھایا کہ وہ بزم ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس وقت جلیل الرحمن صاحب جو اِن دنوں بمبئی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں بزم کے سکریٹری تھے۔

حافظ صاحب کے ریٹائر کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں استاذی ڈاکٹر اقبال حسین صاحب بزم کے صدر، پروفیسر سید احمد صاحب اور پروفیسر سید محمد صدر الدین صاحب نائبین صدر مقرر ہوئے۔ اس دور میں بھی بزم سے اختر صاحب کی دلچسپی اور ان کا جوش و خروش حسب سابق قائم رہا۔ دراصل بزم سے ان کی بے پناہ محبت اور ان کا ذوق ادب کسی عہدہ کا محتاج نہیں۔

۱۹۵۱ء کے آخر میں اختر صاحب بزم کے صدر اور استاذی پروفیسر محمد صدر الدین صاحب نائب صدر مقرر ہوئے۔ محمد زین الدین صاحب سکریٹری تھے۔ وہ اساتذہ اور طلبا میں بہت مقبول تھے اور انتظامی صلاحیت بھی بہت اچھی تھی۔ وسط فروری ۱۹۵۲ء میں اختر صاحب نے بزم کی سلور جوبلی کا جشن بڑی شان سے منایا۔ جلسہ کا افتتاح وزیر صنعت مسٹر مہیش پرشاد سنہا نے اور صدارت پروفیسر ہادی حسن مرحوم مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے کی۔ تین دنوں تک جلسے ہوتے رہے۔ مسٹر محمد شفیع مرحوم وزیر تعلیمات عامہ اور مسٹر رام چرتر سنہا وزیر آبپاشی نے جلسوں کی صدارت کی۔ ۱۵ فروری کو "ترقی پسند مشاعرہ" نام کا ایک نہایت مقبول ڈرامہ پیش کیا گیا جس میں حبیب الحق ندوی اور جمیل الرحمن یوسفیہ نے بہت ہی نمایاں حصہ لیا۔ ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت مشہور ادیب اور شاعر جناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے کی۔ اختر صاحب کے ذوق ادب، اُن کی قوت تنظیم اور اُن کے وسیع تعلقات کے باعث ہی بزم کی سلور جوبلی کا جشن اس قدر شاندار

۲۶ فروری ۱۹۵۵ء کو مجھے بزمِ ادب کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ اس وقت سے اختر صاحب کی نگرانی میں اُن کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اختر صاحب کے کردار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں پر اعتماد کرتے ہیں اور جس کا اعتماد انہیں حاصل ہو جاتا ہے اُس پر سارا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی ادبی مجلس یا سالانہ جلسہ کی کامیابی کے لئے وہ خود بڑی محنت کرتے ہیں۔ لیکن کامیابی کی سند کا حقدار صرف اپنے ماتحت کو سمجھتے ہیں۔ وہ کسی کام کے سلسلہ میں اپنے ماتحت کی ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں کی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں اور ہر طرح اُس کے وقار کو قائم رکھتے ہیں۔ اس طرح اُنکی نگرانی میں کام کرنے والوں کا دل بڑھتا ہے۔ اُن سے محبت بڑھتی ہے اور اپنے آپ پر اعتماد بڑھتا ہے۔

—

میں نے سیتامڑھی کالج میں ایک ادبی انجمن قائم کی تھی اور پھر [illegible] ڈی۔ اے۔ وی۔ جوبلی کالج کی بزم اُردو کی حتی الامکان خدمت کی تھی۔ پٹنہ کالج میں آنے کے بعد یہاں کی بزم کے کاموں سے دلچسپی لینا شروع کی۔ میں یہاں ۸ ستمبر کو آیا تھا اور ۲۰ ستمبر کو بزم کا الکشن ہوا۔ اختر صاحب نے الکشن کا بہت سارا کام میرے حوالے کر دیا۔ فروری ۱۹۵۳ء میں بزم کی سلور جوبلی کے موقع پر اختر صاحب نے مجھے مجلس استقبالیہ کا صدر بنایا اور آگے بڑھایا۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں حبیب الحق ندوی اور سید صبیح حیدر میں بزم کے سکریٹری کے عہدہ کے لئے بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ دونوں اُمیدوار آپس میں بہت قریبی رشتہ دار تھے۔ صبیح حیدر اور اُن کے بھائی سے میرے دیرینہ اور گہرے تعلقات تھے اور میں تقریباً صبیح حیدر کے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن اختر صاحب کو میری غیر جانبداری پر قطعی شبہ نہیں ہوا اور حسبِ سابق الکشن میری نگرانی میں ہوا اور کسی فریق کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں بزم کے ممبروں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہو گئی۔ سکریٹری کے عہدہ کے لئے بڑا سخت مقابلہ تھا۔ فریقین میں مارپیٹ کی نوبت پہنچ گئی۔ ۲۴ نومبر کو الکشن کے دن ہنگامہ میں کسی نے کچھ بیلٹ پیپر غائب کر دیا۔ شکست خوردہ فریق نے مجھ پر بدعنوانی اور اختر صاحب پر پاسداری کا سخت الزام عاید کیا۔ معاملہ پرنسپل سے وائس چانسلر تک پہنچا۔ اختر اورینوی نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ تمام الزامات کو غلط ثابت کیا اور میرے وقار کو گرنے نہیں دیا۔

اختر صاحب کے احباب کی تعداد بہت کافی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی خوشی میں شریک ہوتے ہیں اور مصیبتوں میں اُن کے کام آتے ہیں۔ وہ سماجی تعلقات کو پوری طرح قائم رکھتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے اکثر پروفیسروں، ادیبوں، شاعروں اور علم دوست حضرات سے اُنکی دوستی ہے اور ان میں سے اکثر جب کبھی پٹنہ آتے ہیں تو اختر صاحب انہیں بڑی محبت سے اپنے ساتھ ٹھہراتے ہیں۔ اُن کے اعزاز میں ادبی مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور دعوتیں دیتے ہیں۔ اختر صاحب اپنے شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کو کھلانے میں لذت اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔

ریاست بہار کے اکثر بڑے اور صاحبِ اقتدار اصحاب سے اختر صاحب کی ملاقات ہے۔ اور ان میں سے بعض حضرات سے اُن کے گہرے تعلقات بھی ہیں۔ اختر صاحب اکثر ادبی جلسوں اور کبھی کبھی نیم ادبی یا نیم سیاسی جلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ ان جلسوں میں انہیں تقریر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور وہ بڑے ذوق و شوق سے تقریریں کرتے ہیں۔ اس طرح اختر صاحب عوام سے روشناس ہوتے ہیں اور اُنکی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اربابِ اقتدار سے تعلقات کے باعث بعض اصحاب کو اختر صاحب سے شکایت ہوتی ہے اور وہ اُن پر سیاست میں دلچسپی لینے اور اپنے فریق مخالف کی حمایت کا الزام بھی عاید کرتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں ریاستی انجمن ترقی اُردو دو گروپ میں منقسم ہو گئی تھی۔ اُس وقت اس قسم کی شکایت زیادہ تھی۔ لیکن اب ایسی بات نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ شکایت صحیح نہیں ہے۔ اختر صاحب سرکاری ملازمت کی تمام پابندیوں اور ذمہ داریوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ وہ [illegible] ذہنی افتاد ہیں۔ زمانہ کو سمجھتے ہیں اور ہوا کے رُخ کو پہچانتے ہیں۔ اپنے مذہب اور کلچر کی بنیادی باتوں کو قائم رکھتے ہوئے وہ وقت کے دھارے کے ساتھ چلتے ہیں۔ وہ بہت سوشل اور ملنسار آدمی ہیں اسلئے اچھے اور بڑے لوگوں سے ملے بغیر وہ نہیں رہ سکتے۔ جب آنجہانی شری کے۔ بی۔ سہائے اُن کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور وہ مسلم ہوسٹل چھوڑنے کے بعد پٹنہ میں اچھا مکان نہیں ملنے کے باعث اُن کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ اُس وقت وہ اپنی ذہانت، تیزی اور وسیع سماجی تعلقات کے باعث ہی اُن مشکلوں پر قابو پا سکے تھے۔

اختر صاحب ایک نہایت فصیح البیان اور طلیق اللسان مقرر ہیں۔ قوتِ گویائی کے سلسلہ میں فطرت نے اُن کے ساتھ بڑی فیاضی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ حضرت سید احمد جاجنیریؒ کی اولاد میں ہیں۔ پروفیسر وہاب کریم صاحب کا خیال ہے کہ جاجنیری سادات کو قوتِ گویائی خاص طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ کم از کم اختر صاحب

کے زورِ بیان اور قوتِ بیان سے اس خیال کی ضرور تصدیق ہوتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے مجمع میں بڑی آزادی اور روانی سے تقریر کرتے ہیں۔ مجمع پر چھا جاتے ہیں، سننے والا اُن کی تقریر سے مسحور ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی میلاد النبیؐ کی محفلوں اور مذہبی جلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں اور وہاں بھی شاندار تقریریں کرتے ہیں۔ ادھر صحت کی کمزوری کے باعث وہ باہر آنے جانے میں کافی احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔

اختر اورینوی میں احساسِ جمالیات بدرجۂ اتم ہے۔ وہ اپنے پہلو میں نہایت ہی حساس اور نازک دل رکھتے ہیں۔ انسانی کردار کی خوبیوں سے وہ بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ شقاوت اور بربریت سے اُن کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ ملک و ملت کی محبت کے ساتھ وہ انسانی درد اور سوز و گداز بھی رکھتے ہیں۔ وہ مجسمۂ حسنِ طبیعت اور شریف سوز دروں کی نہایت عمدہ مثال ہیں۔

بائیس سال کے طویل عرصہ میں صرف ایک بار وہ مجھ سے رنج ہوئے ہیں اور وہ بھی شعبۂ اُردو کے یونیورسٹی اور کالج کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے اور انتظامی اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کے باعث۔ شاید پٹنہ یونیورسٹی کے اربابِ بست و کشاد کو اب تک اس بات کا احساس نہیں ہے کہ کم از کم پٹنہ کالج اور سائنس کالج میں تمام تعلیمی شعبوں کا دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ایک ہی صدر شعبہ کی ماتحتی میں ہونا ضروری ہے۔ ۲۶ر فروری ۱۹۵۷ء کو پٹنہ یونیورسٹی کے کنووکیشن کے روز میری ایک کوتاہی پر انہوں نے مجھ سے اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا تھا اور میری تنبیہہ کی تھی لیکن اس رنج و ملال اور تنبیہہ کے پیچھے نفرت و حقارت کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ استادانہ شفقت کارفرما تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد جب اُن پر حقیقتِ حال آشکارا ہوئی تو اُن کا ملال قطعی دور ہو گیا۔

اختر صاحب مجھے صرف اپنا ایک شاگرد اور رفیقِ کار ہی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ایک عزیز بھی اور میری بھلائی اور ترقی کے دل و جان سے خواہاں رہتے ہیں۔ میں نے اگست ۱۹۵۵ء میں جناب پرنسپل کلیم الدین احمد صاحب کی نگرانی میں ریسرچ کا کام شروع کیا لیکن خرابیِ صحت اور ناساعد حالات کے سبب مقالہ کی تکمیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اختر صاحب کو اس کا دکھ تھا وہ چاہتے تھے کہ میں جلد سے جلد ڈگری حاصل کر لوں۔ چنانچہ ۱۰ر فروری ۱۹۶۰ء کو ایک سفر کے دوران انہوں نے میرے لئے ریسرچ ڈگری کی اہمیت پر زور دیا۔ اور کام کو جلد پورا کرنے کی سخت تاکید کی۔ فروری ۱۹۶۲ء میں جب میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا امتحان پاس کیا تو انہیں دلی مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی۔

اگست ۱۹۵۵ء سے میں دردِ شکم کی تکلیف میں مبتلا ہوا اور کبھی کبھی درد کا شدید دورہ پڑتا تھا۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۵۹ء کو جب میں پٹنہ کالج کے ناظم امتحانات کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، درد کا بڑا ہی شدید دورہ پڑا۔ کالج سے گھر پہنچنے پر میری حالت تشویشناک حد تک خراب ہو گئی۔ میں نے اس مصیبت میں اختر صاحب کو خبر کی وہ فوراً آئے اور مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے گئے اور گھنٹوں ٹھہرے رہے جب اسپتال میں میرا داخلہ ہو گیا اور انہیں اطمینان ہو گیا، اور گھر لوٹے۔

فروری ۱۹۶۲ء میں ایک بیماری کے باعث میری اہلیہ کی زندگی سخت خطرہ میں تھی، جلد سے جلد آپریشن کرانا ضروری تھا۔ زنانہ اسپتال کے کیبن میں جگہ نہیں مل رہی تھی میں سخت پریشان تھا۔ اختر صاحب اقبال ہوسٹل کے سالانہ جلسہ میں شرکت کیلئے آئے جب اُن کو میری اہلیہ کی سخت علالت اور میری پریشانیوں کا علم ہوا تو بیقرار ہو گئے اور مجھے ساتھ لیکر رات کے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک ڈاکٹروں سے ملتے رہے کل جو میرے ساتھ اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ سے ملے اور جب تک اسپتال میں میری اہلیہ داخلہ ہو گیا اُنہیں چین نہ آیا۔

۱۹۶۲ء سے قبل میں اپنے سات بچوں کی موت کے صدمات برداشت کر چکا تھا لیکن ۱۹۶۲ء کے موسم گرما میں ۴۵ روز کے قلیل عرصہ میں میرے دو بچوں کا انتقال ہو گیا۔ ان پیہم حادثات نے میری زندگی کی دھارا ہی بدل دی۔ میں سخت آزمائش کے دور سے گذرنے لگا۔ اختر صاحب پر میری مصیبتوں اور میرے حالات کا گہرا اثر پڑا۔ انہوں نے ڈھارس بندھائی بڑے پیار اور شفقت سے صبر کی تلقین کی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ بہت سی باتوں کو مان لیتا ہے اور کچھ باتیں وہ ہم سے منوانے کی اُمید رکھتا ہے۔ ایسے مصیبت میں تو ثابت قدم رہنا اور اس پر یقین کامل رکھنا ہی مناسب ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود میری مصیبتوں سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ ایک روز جب میں اُن سے ملنے کیلئے اُن کے گھر گیا تو میرے لئے وہ اپنے بے پناہ جذباتِ غم کو چھپا نہ سکے اور بے اختیار رونے لگے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی، غیر اہم اور معمولی باتیں ہیں لیکن ایک اچھے انسان کی قدر و قیمت ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ اختر صاحب کے کردار کی یہی وہ خصوصیات ہیں جو انکو دوسروں سے ممیز اور ممتاز کر دیتی ہیں اور وہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر باسدیو نندن پرشاد

مجھے یاد آتا ہے وہ وقت جب میں پٹنہ کالج میں ایم اے ہندی کلاس کا ودیارتھی تھا۔ اس زمانے میں ہندی پڑھنے والے لڑکوں کو پہلا نمبری اردو بھی پڑھنی پڑتی تھی اور اردو پڑھنے والوں کو پچاس نمبر کی ہندی پڑھنی پڑتی تھی۔ وہ زمانہ میل جول کا تھا۔ بھائی بھائی چارے کا تھا۔ ہندی اور اردو دو سگی بہنوں کی طرح ایک دوسرے سے گلے لگی تھیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور تکلیف میں شامل ہوتی تھیں۔ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آتا۔

بہرحال آج بھی یادیں اب کہانی بن چکی ہیں۔ وہ یادیں تصویریں بن کر رہ جاتا ہے۔

اُن دنوں ہمارے اردو کے کلاس میں سید اختر اورینوی صاحب ہم ہندی والوں کو اردو پڑھانے آتے تھے۔ ان کی تقریریں کچھ اتنی صاف اور دلچسپ ہوتی تھیں کہ کسی کو کسی طرح کی پریشانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ میں بچپن میں اپنے والد سے تھوڑی بہت اردو پڑھ چکا تھا، اس لئے مجھے اردو سے دلچسپی تھی۔ اور پھر اپنے استاد کی باتوں میں بڑا رس ملتا تھا۔

پہلے دن اختر صاحب ہمارے کلاس میں آئے اور ہم سب سوچ رہے تھے کہ ان کی باتوں کو ہم لوگ سمجھ سکیں گے یا نہیں۔ کیونکہ ہم لوگوں میں سے زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اردو کے پڑھانے والے کچھ ایسی زبان بولتے ہیں جسے ہندی والے آسانی سے سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن جب اختر صاحب ہم ہندی والوں کو پڑھانے لگے تو ایسی اور اردو زبان اور ادب کی بہت سی باتیں اس انداز سے بولنے لگے، ہم سب کا ڈر جاتا رہا اور ہم دوست ہو گئے۔ پہلے تو ہم ان کی اوپری رنگت اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے کہ ہم ان کی طرف اس طرح کھنچے گئے۔ جسم کے لمبے، گورے چٹے، کالے بھورے چمکتے بال، سفید پائجامہ اور بہترین شیروانی پہنے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے اور ہم سب بہت ادب سے اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ وہ دھیرے سے بولے "بیٹھ جائیے" ان کے کہنے کے ڈھنگ میں کچھ اتنی سچائی اور ایمانداری تھی کہ ہم اچانک ان کی طرف کھنچے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ بتلایا کہ ہم اردو کیوں پڑھتے ہیں اور اردو زبان اور ادب کیا اور کتنا ہے۔ انہوں نے کہا

"ہر زبان میں کچھ نہ کچھ خوبیاں اور خرابیاں ہوا کرتی ہیں اردو کے ساتھ بھی ایسی ہی بات ہے۔ ہندی اور اردو کھڑی بولی کی دو آنکھیں ہیں اور دونوں کی حفاظت ہمیں کرنی چاہئے۔ ہندی ہندوستان کی پرانی تہذیب کو لے کر چلتی ہے تو اردو اس میں چار چاند لگاتی ہے۔ اسے کسی بھی حالت میں غیر ملکی زبان سمجھنا کسی بھی طرح مناسب نہ ہوگا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ اردو صرف ہندوستانی

مسلمانوں کی زبان ہے، اُردو ہندی بولنے والے صرف ہندو ہی ہیں اس لئے کم سے کم بہار، اتر پردیش اور پنجاب کے لوگوں کو ان دو زبانوں کی جانکاری نہایت ضروری ہے۔

پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ اُردو کے عالم اور استاد اپنی تقریر میں عربی اور فارسی کے لفظوں کا استعمال کچھ زیادہ کرتے ہیں۔ اس لئے عام لوگوں کو ان کی زبان سمجھنے میں وقت اور پریشانی ہو سکتی ہے لیکن جب ہمارے استاد ورتنوی صاحب بولنے لگے تو ہم نے سمجھا کہ ہمارا سوچنا کتنا غلط تھا۔ وہ لفظوں کے استعمال میں اردو میں کہانیاں لکھ کر کافی مشہور بھی ہو چکے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی طرف میری دلچسپی بڑھی اور ادھر اُدھر سے ایک دو کہانیاں پڑھ بھی لیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ ہندی میں ہو جائے تو بڑا اچھا ہو۔ اسی خیال سے کچھ سال پہلے اپنے دوست ڈاکٹر حسنین صاحب کی رائے لے کر ورتنوی صاحب کو ایک خط لکھا۔ انہوں نے اس کا جواب دیا اور میرے ارادے کی تعریف بھی کی۔

ایک بار ورتنوی صاحب گیا کالج کی اردو مجلس کی صدارت کرنے گیا آئے اور ان سے میری ملاقات ہوئی۔ میرے سامنے ۴۷-۱۹۴۶ء کی ان کی ہنستی بولتی تصویر ایک بار پھر کھڑی ہو گئی وہی ڈھنگ، وہی انداز۔ وہ مجھے پہچان گئے اور بڑے پریم سے باتیں کیں۔

اکثر پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے بھی براڈ کاسٹ کرتے ہوئے ان کی کہانیوں کو سنا ہے تو ایسا لگا کہ وہ کافی اونچائی پر پہنچ چکے ہیں۔

ان میں دقیانوسی خیال بالکل نہیں ہے۔ بناوٹی باتوں سے وہ دور رہتے ہیں۔ سادگی، سچائی اور ایمانداری ان کی باتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں وہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی ایک زندہ مثال ہیں۔ آج بھی جب انہیں کبھی دیکھتا ہوں یا ان کا نام سنتا یا پڑھتا ہوں تو اس شاندار شخصیت کے سامنے بڑے ادب اور لحاظ سے میرا سر آپ ہی آپ جھک جاتا ہے۔ وہ ایک بے مثال افسانہ نگار، ایک اچھے پروفیسر ہیں جو اپنے شاگردوں کو ہمیشہ خیال اور یاد کرتے ہیں۔ اور کسی بھی طرح کا بھید بھاؤ نہیں رکھتے۔ ایشور کرے ان کی عمر لمبی ہو اور صحت اچھی ہو تاکہ وہ آگے آنے والے سالوں میں ہم جیسے ان کے ہزاروں شاگردوں کو راستہ دکھا سکیں۔

بقیہ اختر صاحب کو جیسا میں نے دیکھا

کچھ دے رکھا ہے مگر غرور یا تنگ نظری ان کو چھو نہیں گئی ہے۔

اختر صاحب اردو کے اچھے اور ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اپنے افسانوں کا موضوع اسی دنیا سے لیتے ہیں جہاں ہم آپ بستے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار بھی متوسط طبقے کے غریب اور مجبور انسان ہیں، ان کے بیشتر کردار جیتے جاگتے اور دیر پا اثر چھوڑ جانے والے ہوتے ہیں، ان کے افسانوں کی فضا بھی جاندار ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ محض تفریح طبع کے لئے نہیں لکھتے، جب ان کے ذہن میں کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ ان چیزوں کو ایک ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کی زبان بڑی رنگین ہوتی ہے، بلکہ اکثر جگہ تو شاعرانہ ہے۔ ان کے اسلوب اظہار میں ٹیگور، اقبال اور غالب کا انداز جھلکتا ہے، مگر اس کے باوجود ان کا اپنا ایک منفرد اور دلکش اندازِ بیان ہے۔ ان کے فکری افسانے جیسے "کچلیاں اور بالِ جبریل" "تسبیح کا دیپ" اور "محشر" کی زبان اور اسلوب بڑی سنجیدگی اور علمیت کے حامل ہیں۔ یہ افسانے ان کے عوام کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص حلقہ کے لئے ہیں جنہیں آپ با آسانی انٹلکچوئل (INTELECTUAL) کہہ سکتے ہیں۔

اختر صاحب خود ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور ساتھ انہیں اس کا احساس بھی ہے، مگر وہ دوسرے افسانہ نگاروں کے فن پر بھی جی کھول کر داد دیتے ہیں، ایک ایک فقرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، دوسروں کی عظمت و برتری کا اعتراف کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کے افسانے سن کر بھی ان کی ہمت افزائی میں کوئی

کلیم عاجز

اختر صاحب سے میری جان پہچان

جس سال جنگِ عظیم چھڑی ہوئی تھی میں مسلم اسکول پٹنہ سے پرائیوٹ طور پر نویں کلاس کا امتحان دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لال باغ یعنی کالج میں قیام تھا۔ کم عمری کیوجہ سے میرے رشتے کے ایک بھائی بطور نگراں مرے ساتھ مقیم تھے انہیں شعر و سخن کا کچھ واجبی واجبی مذاق تھا اور میں؟ . . . . . .

شاید یہ بات کچھ حیرت کے ساتھ سُنی جائے کہ نو سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے نانا جان نے جو ایک قدیم ساخت مزاج اور تجربے کے مولوی تھے۔ قاعدہ بغدادی سے آغاز کر کے آمد نامہ نسخہ، تعلیم، رقعاتِ عزیزی، گلستاں، بوستاں، انشائے خلیفہ وغیرہ ختم کر کے حضرت جامی کی مثنوی شروع کی تھی کہ ۱۹۳۴ء کا زلزلہ ٹوٹ پڑا، بعض حالات کے نتیجے میں میری تعلیم رک گئی پھر نانا جان کا انتقال بھی ہوگیا اور ان کی نجی لائبریری کی تمام اُردو و فارسی کتابیں میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم کے تصرف میں آئیں، جنہیں خود مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ان کی صحبت میں یہ شوق مجھ میں بھی اُبھرا اور میں اکثر تمام دن اور دیر تک رات گئے نانا جان مرحوم کی کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر کتابوں میں آنکھیں گڑائے مطالعہ میں مشغول رہتا۔ اور یہ کتابیں، الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش رُبا، طلسم نور افشاں، مسانۂ خورشیدی، ایرج نامہ، تورج نامہ، دیوان آتش، دیوان رند، دیوان صبا دیوان انشا، انشاء اللہ خاں، داغ دہلوی، امیر مینائی، دیوان غالب سخن شعرا (ن خ) تذکرہ گل رعنا وغیرہ تھیں۔ اور میں نے تقریباً تمام کتابیں پڑھیں اور داستانیں تو بعض ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھیں مثلاً طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں دو دو تین تین مرتبہ پڑھ ڈالیں۔ اسی میں تقریباً دو سال کا عرصہ گذرا اور پڑھنے کے دوران ہی گھر کے دوسرے لڑکوں کے درمیان دو ایک شعر۔۔ غرضیہ اس طرح کے موزوں کئے تھے

شاہ ہوں بغداد کا ہارون رشید انام ہے
خواجہ ہے مسرور جعفر کا وزیری کام ہے

(داستان الف لیلیٰ میں ہارون رشید کی شب گشتی کے دوران خواجہ سرا مسرور اور وزیر جعفر ساتھ ہوا کرتے تھے)

جی ہاں تو مقصد اس تمہید کا یہ ہے کہ جب میں نویں کلاس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا میرے ماموں زاد بھائی جو میرے گارجین تھے ان کے ایک دوست عبدالخلاق جو اس زمانے میں پٹنہ کالج کے طالب علم تھے، ملنے آیا کرتے۔ مجھ سے بھی مانوس ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہوتی۔ ناسخ اور غالب کے اشعار پڑھے جاتے ٹوٹے پھوٹے مصرعے علاوہ بھی جوڑتے۔ انہیں دنوں پٹنہ کالج بزم ادب کے سالانہ مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ مصرع طرح بھی تھا

"درد منت کش دوا نہ ہوا"

طلبا کے لئے جس پر رننگ کپ بھی تھا۔ خلاق بھائی کی تحریک ہوئی کہ طرح پر غزل کہنی چاہیے۔ دو ایک مصرعے خلاق بھائی نے کہے دو ایک شہاب الدین بھائی نے کہے اور چند اشعار میں نے کہے۔ جوڑ جاڑ کر اور ادھر ادھر سے کچھ چوری کچھ سرقہ کر کے آٹھ نو اشعار کی ایک غزل تیار ہوئی۔ غزل میری ہی رکھی گئی اور میرا تخلص تجویز ہوا شعلہ۔ مقطع تھا

یوں تو دنیا میں اور کیا نہ ہوا
پر ہوا اپنا مدعا نہ ہوا
ہم تو اب دیر کو چلے شعلہ
بت تو ہوں گے اگر خدا نہ ہوا

مقطع میر کے مقطع پر تصرف تھا۔

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بہر حال غزل تیار ہوئی اور خلاق بھائی نے کہا کہ کسی استاد سے اس پر اصلاح ہونی چاہیے۔ سب سے پہلا نام پروفیسر عبدالمنان صاحب عظیم آبادی کا، مگر خلاق بھائی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ پھر پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب کا نام آیا۔ پھر یک بیک خلاق بھائی اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو میں ایک جگہ لے چلتا ہوں۔ میں بھی تیار ہو گیا۔ غزل صاف کر کے جیب میں رکھی اور پٹنہ کالج سے ہم لوگ روانہ ہوئے۔ جگہ ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ غالباً سائنس کالج کے سامنے کھیری بازار میں کہیں تھی۔ ایک کچے مکان میں ہم لوگ پہونچے۔ سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر کی منزل میں ایک کمرے کے پاس پہونچے۔ میں تو دروازے پر رہ گیا۔ خلاق بھائی اندر داخل ہو گئے۔ غالباً زمین پر فرش تھا۔ اور چار پانچ صاحبان کچھ کتاب پر یا چند کتابوں پر سر جھکائے مصروف گفتگو تھے۔ خلاق بھائی جب قریب پہونچے تو ایک صاحب جن کی پشت میری طرف تھی گرم کوٹ پہنے اور مفلر لپیٹے چشمہ لگائے سر اٹھا کر خلاق بھائی کی طرف متوجہ ہوئے

"فرمائیے کیا ہے؟"

"ایک طالب علم ہیں اپنی غزل پر اصلاح کے خواہشمند ہیں"

"کون صاحب ہیں"

"وہ کیا پیچھے دروازے کے پاس کھڑے ہیں"

انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا بھی نہیں، اسی طرح خلاق بھائی سے ذرا خشک لہجے میں بولے

"میں اس وقت طلبا کو پڑھا رہا ہوں فرصت نہیں ہے معاف کیجیے"

اور سر جھکا کر بدستور کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور میں خلاق بھائی کا انتظار کئے بغیر شرما کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے کی طرف بھاگ چلا۔ پیچھے تیزی سے خلاق بھائی پہونچے اور ڈانٹ کر بولے

"کیا تیزی سے بھاگے جا رہے ہو؟"

"یہ آپ کون ماسٹر صاحب کے پاس مجھے لے آئے تھے۔ کسی شاعر کے پاس چلنا چاہیے تھا"

"شاعر کے اور کیا سینگ ہوتے ہیں؟ یہ ماسٹر نہیں پروفیسر ہیں"

"کون پروفیسر؟"

"پروفیسر اختر اورینوی"

"کون پروفیسر اختر اورینوی؟"

"ارے تم پروفیسر اختر اورینوی کو نہیں جانتے؟ بات دراصل یہ ہو کہ

تم ٹھہرے دیہاتی اور دیہات بھی ایسا کور دہ جو مارٹن کمپنی کے ریلوے
اسٹیشن سے بھی تین میل دور، تم بھلا کیا اور تمہاری عمر ہی کیا اور تمہاری
واقفیت ہی کیا اور تمہاری شاعری ہی کیا، بس تم گلستاں بوستاں پڑھتے
رہو۔ مکتب سے نکلے اور ایک دم سے ناینتھ کلاس کا امتحان دینے چلے آئے
...... پروفیسر اختر اورینوی کو تم نہیں جانتے اور شاعری کرنے کو آگے بڑھ
گئے۔ یہ پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں، افسانہ نگار ہیں اور
افسانہ نگار بیوی بھی رکھتے ہیں"

"اچھا ان کی بیوی بھی افسانہ نگار ہیں؟"

"جی ہاں مشہور افسانہ نگار ہیں ... شکیلہ اختر"

"جی؟ کیا نام لیا؟"

"شکیلہ اختر"

جب میں اپنے بڑے بھائی مرحوم کے ساتھ ماما جان کی لائبریری
کی کتابیں پڑھا کرتا تھا اس میں رسالے بھی تھے۔ یہ رسالے بھائی صاحب
منگواتے تھے اور پابندی سے منگواتے تھے۔ نیرنگ خیال، عالمگیر، ساقی
ادبی دنیا، رومان (اختر شیرانی) کلیم (جوش) نگار وغیرہ وغیرہ
اور انہیں میں سے کسی پرچے میں یا بعض پرچوں میں دو نام کئی بار میری
نظروں کے سامنے آئے۔ جمیلہ خاتون اردل اور شکیلہ خاتون
اردل۔ یہ دو نام خصوصیت کے ساتھ اس لیے متوجہ کرتے کہ اردل
گویا میرے دیہاتی وطن کے جوار میں تھا، ان کا نام نہیں بلکہ اردل کا نام
مجھے متوجہ کرتا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے ایک رشتے کے بھائی سید
ظفر امام مرحوم کی دادھیال بھداسی تھی۔ اردل بھداسی دونوں
متصل ہیں۔ بھداسی گاؤں کسی دوسری جگہ بھی تھا۔ اس لیے اس
گاؤں کے لیے پورا نام اردل بھداسی ہی لیا جاتا۔ ظفر امام بھائی اپنے
دادا نواب ذکی امام عرف گھپو مرحوم کے تذکرے میں برابر اردل
بھداسی کا نام لیتے۔ چونکہ وہ بھی ستھرا ادبی ذوق رکھتے۔ اس
لیے پرچے وہ بھی پڑھتے۔ جمیلہ خاتون اردل، شکیلہ خاتون
اردل کا نام مضمون نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے
دیکھ کر وہ اکثر بڑے فخر سے مجھے مخاطب کرتے کہ جانتے ہو یہ

ان ناموں سے ایک طرح کی قربت اور انس کے اسباب یہی
تو تھے۔ خلاق بھائی کی زبان پر یہ نام آتے ہی ذہن سے پردہ سا
اٹھ گیا۔

"کیا شکیلہ خاتون اردل؟"

"ہاں وہی اب شکیلہ اختر کہلاتی ہیں"

کمرے سے بھاگ کے پر افسوس ہونے لگا۔ ایک تجسس بار بار
اکساتی کہ پھر وہیں چل کر مل لو۔ لیکن اس کی ہمت نہیں ہوتی۔ خلاق
بھائی، پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب کے یہاں لے کر آئے۔
وہ اوپر کوٹھے پر تھے۔ نیچے برآمدے میں تشریف لائے۔ میری غزل
پیش کی گئی۔ غزل پڑھی۔ پھر میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا

"کیا واقعی یہ غزل انہیں کی ہے؟"

"جی ہاں! انہیں کا تخلص شامل ہے"

"اگر ان کی ہے تو بہت اچھی ہے"

پھر کچھ اصلاح فرمائی گئی وہ غزل سینٹ ہال میں پڑھی گئی
دوسرے سال جب میں میٹرک کلاس میں تھا (نویں کلاس
کے امتحان میں نمبر اچھے آنے اور میرا ڈبل پروموشن ہوا تھا) تو
ایک دن انہیں خلاق بھائی کے ساتھ کچہری سے واپس آتے ہوئے
مرادپور میں جہاں اس زمانے میں سڑک بہت تنگ تھی۔ ایک کھلی ہوئی
فٹن پٹنہ کالج کی طرف سے آتی ہوئی ٹریفک کی بھیڑ کی وجہ سے ہم لوگ کے
قریب رکی۔ اس پر ایک صاحب کو میں نے دیکھا۔ دراز قد، وجیہہ صورت
گندمی رنگ، سیاہ بال، کشادہ پیشانی، آنکھیں عینک کے شیشے کے
پیچھے چمکتی ہوئی اور کسی ایک طرف کا شانہ کسی حد تک جھکا ہوا۔ دونوں
ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر گود میں رکھے ہوئے بالکل سامنے کی طرف دیکھ
رہے تھے۔ خلاق بھائی نے کہا

"دیکھو یہی پروفیسر اختر اورینوی ہیں"

"وہی شکیلہ خاتون اردل کے شوہر"

"پروفیسر اختر اورینوی یہ ہیں۔ اور پروفیسر اختر اورینوی یہ پہلے

ہیں۔ بعد میں وہ بھی ہیں جو تم کہہ رہے ہو۔ اتنے میں گاڑی روانہ ہو گئی اور اختر صاحب اسی طرح سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ خصوصیت ان کی نشست کی اب تک ہے۔ رکشہ ہو یا فٹن ہو یا پیادہ ہوں وہ عموماً سامنے کی طرف دیکھتے ہیں یا نیچی نگاہیں رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت تماشبین نہیں ہے اور نہ ان کے مزاج میں تجسس ہے۔ ہوس، کرید اور ڈھونڈھ میں معمول سے زیادہ اعتدال ہے۔ اس لئے راہ چلتے ادھر ادھر دیکھنا عادت نہیں بس قدم کے آگے یا راستے پر نگاہ رہتی ہے۔ سامنے سے گذر جائیے اگر اشارے سے سلام کیجئے تو قرینہ اغلب ہے کہ جواب نہ دے۔ ان کی عینک کا شیشہ مائنس ہونے کی وجہ سے بہت چمکدار ہوتا ہے؟ آنکھیں کبھی نظر نہیں آتیں اور چہرے کا رخ اسی طرح رہتا ہے کہ بقول شاعر

بیٹھے ہوئے ہیں وہ محفل میں صورت تصویر
ہر ایک کو یہ گماں ہے ادھر کو دیکھتے ہیں

چنانچہ اسی "گماں" میں اکثر میں نے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں خود ہی وعلیکم السلام کہنا پڑا۔

میں نے میٹرک پاس کیا اور پھر چھ سال تک مجھے دیہات رہنا پڑا۔ فساد کے بعد پھر مستقل طور پر شہر منتقل ہونا پڑا، لیکن زندگی لوگوں سے دور دور الگ الگ گوشہ گیری، اضمحلال، شوریدہ مزاجی اور آشفتہ حالی میں گذرتی رہی۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں دماغی توازن درست ہوا۔ انجمن اسلامیہ ہال میں ایک بڑے مشاعرے کا اعلان تھا۔ میرے ایک دوست زبردستی مجھے مشاعرہ سننے لے گئے۔ اسٹیج پر جوش ملیح آبادی، بسمل شاہجہاں پوری، واقف مرادآبادی، پرویز شاہدی اور دوسرے شعراء تھے۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب سیاہ شیروانی، بیضوی سرعینک لگائے اٹھے اور مائک کے پاس آئے۔ یہ اختر صاحب تھے۔ ان تک میرے تعارفی سفر کی یہ تیسری منزل تھی۔ پہلے دن صرف کوٹ اور مفلر دیکھا تھا۔ دوسری مرتبہ دور سے ان کا چہرہ تھا۔ اس دن گفتگو سنی۔ انہوں نے مائک کے پاس آکر کہا

حضرات! اب میں ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر سے گذارش

کلام کروں گا ہوں .... اور میں انہیں ہندوستان کا بڑا شاعر کیوں کہوں میں انہیں ایشیا کا سب سے عظیم شاعر کیوں نہ کہوں؟ کون ہے آج برما میں؟ کون ہے آج انڈونیشیا میں؟ کون ہے آج جاپان میں؟ کوئی نہیں۔ آج ہندوستان ہی میں ایشیائی ادب کا آفتاب چمک رہا ہے اور وہ آفتاب جناب جوش ملیح آبادی ہیں"

آج ایشیا کا یہی آفتاب پھر ادب ہے جس کے قبالے فن پر اختر صاحب کی معتراض نقد یوں چلتی ہے جس طرح سطح سمندر کو چیرتی ہوئی نازک مچھلی گذر جاتی ہے۔

پھر میں نے بھی شاعری شروع کی اور غالباً ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ بزم اردو پٹنہ کالج کے مشاعرے میں جب میں یہ غزل پڑھ رہا تھا ......

فغاں کبھی جب کسی کی طبع نازک پر گراں گذرے
ہم ایسی بے کسی کی زندگی سے مہرباں گذرے
مبارک برق تجھ کو لالہ و گل کی تہی دامانی
کہ اب تو گلستاں سے درد مند گلستاں گذرے

تو اختر صاحب جو بالکل میرے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہوئے اپنی داہنی طرف جھک کر پروفیسر نواب کریم صاحب سے پوچھا کہ "یہ چنگاریاں کہاں سے آرہی ہیں؟" نواب کریم نے جواب دیا تیلہاڈہ (میرا گاؤں)

اس کے بعد چند بار مشاعروں میں ان کی توجہات مبذول ہوتی رہیں التفات اور شفقتیں گہری ہوتی گئیں۔ ۱۹۵۳ء میں دس گیارہ سال بعد میں نے پھر تعلیمی سلسلہ کا آغاز کیا اور پرائیوٹ آئی اے کر کے ۱۹۵۴ء میں بی اے آنرز کلاس میں داخلہ لیا اور جب پہلی مرتبہ ان کے آنرز کلاس میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آیا تو وہ مجھے [illegible] علم کی حیثیت سے دیکھ کر کچھ متعجب ہوئے۔

بہر حال تو کلاس چلا اور انہیں لکچرر کی حیثیت سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور انہیں کے لکچروں میں رہ کر ان اور ادب کا رشتہ واضح ہوا۔ اور حسرت ایک موڑ میں وہ ان سرحدوں سے گذر جاتا ہے۔ اور وہ دوسری کروٹ لے کر حقیقت کی دنیا میں واپس

چلا آتا ہے۔ ایک کمرہ حقیقت بھی ہے اور رومان بھی، ایک بنچ حقیقت بھی ہے اور رومان بھی، ایک لکچرر حقیقت بھی ہے اور رومان بھی اور ایک پروفیسر حقیقت بھی ہے اور رومان بھی......

اختر صاحب کے کلاس کا کمرہ جب ہم پہونچے تو ایک اوسط درجے کا کمرہ نظر آتا...... ایک بڑا ٹیبل چند بنچ چند کرسیاں دو تین الماریاں دو دروازے دو کھڑکیاں چند تصویریں چند طلباء اور ایک لکچرر۔ ہم لوگ خود ہی حاضری بناتے اور اختر صاحب سبق شروع کرتے .... نام سبق کا ہوتا دراصل شروع ہوتی، پہلے گفتگو اس کے بعد شاعری اس کے بعد طلسم ہوش ربا کا دروازہ کھلتا۔ مثال کے طور پر یہ سمجھیے کہ اختر صاحب یوں شروع کرتے ہیں

"ہم لوگ نے کل اقبال پر کچھ گفتگو کی تھی ..... ہم اقبال کی نظم مسجد قرطبہ پر گفتگو کریں یا ساقی نامے پر۔ انہیں کی مجلس شوریٰ پر یا خدا کی درگاہ میں لینن کے استغاثے پر.....

ضرب کلیم کی حکیمانہ سنگ خشک اور سپاٹ نظموں پر یا بال جبریل کی رنگین فلسفیانہ غزلوں پر ..... نہیں .... ہمیں الفاظ کی تہوں کو چھید کر مشاہدات اور تجربات کی گہرائیوں میں اترنا ہوگا۔ تلمیحات، استعارے اور کنائے کی راہ سے شاعر کے جذبات کی لہروں، ان کی فکر کی موجوں کے سہارے اس کے شعور کی تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں داخل ہوکر اس کے ذہن کی کشادہ اور فراخ شاہراہوں سے گزر کر اس کے نہاں خانۂ دل میں پہونچنا ہوگا۔ اور ان دریچوں اور ان بے شمار روشن دانوں سے جھانکنا ہوگا جن سے مشاہدات اور تجربات کی کرنیں چھپ چھپ کر داخل ہوتی ہیں .....

اختر صاحب کی کرسی جہاں رہتی تھی اس کے داہنی جانب بالکل متصل ایک کھڑکی تھی، جو کالج کے مختصر سے خانہ چمن کی طرف کھلتی تھی۔ یہ کہتے کہتے اختر صاحب نگاہیں کھڑکی کی طرف اٹھ جاتیں اور آہنی سلاخوں سے گزر کر اقبال ہوسٹل کی بلند دیواروں کو پھاند کر آسمان کی طرف خلا میں معلق ہو جاتیں۔

..... اور .... اور شاعر کے ذہن اور فکر کے گوشے گوشے کو منور کرتی ہیں..... یہ زمین یہ آسمان یہ مہر درخشاں اور یہ ماہ نور افشاں، یہ آنکھ مچولیاں کرتے ہوئے ستارے یہ کہکشاں یہ شہاب ثاقب ..... یہ ماہ کامل کے چہرۂ منور پہ تتنر یہی نقاب........

عینک کے شفاف شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوتی نظر آتی ..... پلکیں سمٹنے اور پھیلنے لگتیں اور انسانی چہرے پر تعلقات ارضی کے نتیجہ میں جو ایک عمومی تناؤ اور بھاری پن ہوتا ہے وہ ان کے چہرے سے غائب ہونے لگتا، اور اسکی جگہ آسودگی، شگفتگی اور سبک رنگی نمایاں ہونے لگتی اور حرکت کرتے ہوئے لب ایسی ساخت اختیار کرنے لگتے جس طرح معصوم بچوں کے ہونٹ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے الفاظ پہ قابو نہ ہونے کی وجہ کر ہونے لگتے ہیں۔ ..... دل میں خیالات کا ہجوم اور الفاظ کی کم مائیگی یا دل کا جوش اور کیفیت کا بھرپور اظہار

...... شفاف ساکن جھیل پر اس کا عکس .... یہ آبشار یہ کہسار یہ بھی شاعر کے ہمراز اور ہم نوا ہیں یہی ہم نفس اور ہم جنس ہیں ..... یہ بل کھاتے ہوئے دریا یہ انگڑائیاں لیتے ہوئے آبشار یہ گنگناتے ہوئے چشمے ... یہ سرگوشیاں کرتی ہوئی سبک ہوائیں یہ پیغمبران فطرت، یہ شاعر کے رازداں ... یہ صحرائے نجد میں مجنوں کے ہم صحبت آہوان صحرائی ہیں .... یہ زمین یہ آسمان یہ زمین یہ پورا نظام شمسی یہ کائنات کی تمام پہنائیاں ......"

اور یہ کہتے ہوئے اختر صاحب اپنے دونوں لمبے ہاتھوں کے ذریعہ خلا میں ایک مکمل دائرہ بناتے اور اس دائرے میں اختر صاحب کا کمرہ، کرسیاں، ٹیبل، الماریاں، دروازے، کھڑکیاں، پردے تصویریں کتابیں قلم پنسل کاپیاں سب کھو جاتیں اور اختر صاحب ولیم بلیک کی "مارتھا" بن جاتے اور ہم سب بچوں کی طرح مارتھا کے افسانوی رومان میں گم ہو جاتے، کانوں میں آبشاروں کے اور چشموں کی گنگناہٹ گونجنے لگتی، ستاروں کی آنکھ مچولیاں نظر آنے لگتیں۔ شہاب ثاقب ٹوٹتے اور غائب ہونے لگتے اور ہم لوگ

اختر صاحب کے ساتھ شاعری کی ہم رکابی میں اس کائنات کی پوری پہنائی میں پرواز کرنے لگتے کہ... ٹناٹن اٹناٹن!! ٹناٹن........

.... کلاس ختم ہونے کا گھنٹہ زور سے قریب ہی بجتا اور ہم سب کے پر یکایک ٹوٹ جاتے اور دھم سے اپنے اپنے بنچوں پر گر پڑتے

اختر صاحب کو فنی نقد میں تجزیہ کلام کا اتنا اچھا سلیقہ اور اس میں اتنی مہارت اور استادی حاصل ہے جو موجودہ دور کے تنقید نگاروں کو بہت کم حاصل ہے۔ تجزیاتی تنقید میں ان کے حریف اور مد مقابل بہت کم ہیں۔ اس سلسلے میں محاکاتی پہلو کا جب تجزیہ کرتے ہیں تو تصویر نگاری پیکر تراشی، قیاس بندی، صنم سازی، ماحول کشی، فضا آفرینی وغیرہ اصطلاحات پر بڑی حسین گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن جب فکر شباب پر آتا ہے تو یہ تمام حسین اصطلاحات شاعر کے کلام سے پرواز کر کے اختر صاحب کی گفتگو کا جزو بن جاتے ہیں۔ اور ہم اگرچہ شاعر کو کھو دیتے ہیں مگر شاعر گر کو پا جاتے ہیں۔ شاعر کی فکر، شاعر کا فنی اور شاعر کا پورا تخلیقی وجود اختر صاحب کا وجود اختیار کر لیتا ہے اور ہم انہیں میں سب کچھ دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اختر صاحب ہمیں لے کر شہر شہر صحرا صحرا کوہ کوہ دریا دریا وادی وادی پھرتے ہیں پہلے پہل تو ہم بہت پیچھے رہ جاتے تھے اور وہ کسی گلی میں گھس گئے کسی شاہراہ پر نکل گئے، کسی دریا میں غوطہ لگا گئے، کسی پہاڑ پر چڑھ گئے، کسی وادی میں اتر گئے۔ ہم ہکا بکا انہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان گلیوں، شاہراہوں، دریاؤں اور وادیوں سے ہم بھی آشنا ہونے لگے۔ پھر تو وہ جب باتیں کرنے کو آمادہ ہوئے تو ہم بھی گوش بر آواز ہو گئے، وہ جب اٹھے تو ہم بھی کھڑے ہو گئے، وہ چلے تو ہم بھی چلے، وہ دوڑے تو ہم بھی سرپٹ ہوئے انہوں نے پر تولے تو ہم نے بھی بازو پھیلائے، وہ اڑے تو ہم بھی اڑے پھر تو آگے آگے شہباز ہے اور پیچھے پیچھے بچہ گان شہباز، پھر وہ شکار کرنے لگے اور ہم کھانے لگے اور ہضم کرنے لگے۔

کچھ دن ہوئے بزم ادب پٹنہ کالج یوم شاد میں ایک دن شاد پر مقالے، مضامین اور تقریریں تھیں۔ پروفیسر اجتبیٰ رضوی صدر تھے۔ پروفیسر سید حسن صاحب، پروفیسر عطاء الرحمن صاحب، پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب اور اختر اورینوی صاحب وغیرہ نے مقالے پڑھے اور تقریریں کیں۔ اختر صاحب کی تقریر شاد کے فکر و فن پر تھی۔ اور گرچہ مختصر تھی مگر بڑی حد تک سیر حاصل تھی اور ان کے مخصوص انداز میں تھی۔ آخر میں پروفیسر اجتبیٰ رضوی صاحب جو خود بھی فضا آفرینی، ماحول نگاری اور پیکر تراشی میں مخصوص منفرد انداز رکھتے ہیں۔ تمام مقالوں اور تقریروں کو sum up کرتے ہوئے اختر صاحب کی تقریر کے متعلق بولے کہ میں ان کی تقریر کا بھرپور جائزہ نہ لے سکا۔ وہ اتنے بلند گئے کہ ہم تو انہیں تکا سنتے ہی رہ گئے۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا

اور پھر کہا..

رازِ نیازِ بلبل و گل ہم سے پوچھئے
نرگس کی آنکھ بن کے رہے ہیں ہم چمن میں

ہمارے اساتذہ میں موضوعات تقسیم تھے، کبھی کبھی کوئی استاد نہ ہوتے تو وہ موضوع کسی دوسرے کے کلاس میں لے لیا جاتا۔ عروض و بلاغت کا پرچہ استاذی جناب ڈاکٹر پروفیسر صدر الدین پڑھاتے تھے۔ ایک روز صدر الدین صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہم لوگ چونکہ عروض سے بالکل بے بہرہ تھے اس لئے یہ موضوع بہت اہم سمجھتے تھے۔ سب لوگ اختر صاحب کے کلاس میں گئے اور کہا کہ صدر الدین صاحب تشریف نہیں رکھتے ہیں۔ آج آپ ہی عروض کا کلاس لے لیں اختر صاحب نے کہا ضرور میں پڑھاؤں گا اور بے شک میں پڑھاؤں گا اور یقینی میں پڑھاؤں گا۔ آپ لوگ بیٹھیں اور اس کے بعد اختر صاحب نے بس یوں سمجھئے کہ یوں لکچر شروع کیا

آپ لوگوں نے عروض کے متعلق صرف یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ مصرعوں اور شعروں کے ناپنے کا پیمانہ ہے۔ ماشہ، تولہ، چھٹانک، ادھ پاؤ، پاؤ ادھ سیرا، سیرا، ادھ منا، منا وغیرہ وغیرہ.... اور قاعدے کے مطابق ان اوزان کو آپ مصرعوں کے الفاظ پر شطرنج کی گوٹی

کی طرح بیٹھاتے ہیں اور تول تول کر ٹکڑوں کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بس مسئلہ حل ہو گیا۔ عروض بھی ختم اور عروض کی بحث بھی ختم آپ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ ٹیبل جسے آپ اپنی کتابوں سے کاپیوں سے اور اپنی کہنیوں سے گھستے رہتے ہیں۔ یہ چند نقطہ تین رخ سے سامنے کا لمبا چوڑا ٹیبل یہ بھی ایک مصرعہ ہے اور یہ اپنے اندر عروض و قواعد پوشیدہ رکھتا ہے یہ کرسی جس پر آپ بیٹھے ہیں اسے گویا آپ عروض اور قاعدے کی دولت سے محروم سمجھتے ہیں۔ یہ میرا چھ فٹ کا لمبا لحیم شحیم جسم اور یہ آپ کے جناب ضیا صاحب (میرے ایک ہم جماعت) کا ساڑھے چار فٹ کا ننھا جسم یہ بھی عروضی مصرعہ ہے اور ان پہ بھی اوزان نہ بحور کی چھاپ ہے اور انہیں بھی عروض اور قاعدے کی رو سے جانچ سکتے ہیں۔ اور پرکھ سکتے ہیں۔ صحت اور عدم صحت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

...... وہ دیکھئے وہ آپ کے پیچھے جو دروازہ ہے جسے آپ سیکڑوں بار قدموں سے ٹھکراتے ہوئے آتے ہیں، اور یہ کیواڑ جو بارہا آپ کی ٹھوکروں سے نوازی جا چکی ہے۔ یہ چوکھٹ اور یہ قلابے اور یہ کھٹکے اور یہ زنجیر اور یہ چٹخنی اور یہ جھلی اور یہ جھلی کی پتلی پتلی نازک تختیاں اور یہ اس کی شاخیں اور ان میں یہ انگوٹھیاں اور کڑے اور یہ فریم اور ان پہ پورنگ اور یہ پالش اور یہ وارنش یہ سب مل کر ایک چابکدست فنکار کی غزل بنتے ہیں... ان میں کوئی مطلع ہے کوئی حسن مطلع کوئی شعر ہے کوئی مقطع ہے، کوئی قافیہ کوئی ردیف ..... اور یہ سب عروض اور قاعدے کی بنیاد پہ تخلیق کئے گئے ہیں۔ آپ عروض کو صرف شاعری سے متعلق سمجھتے ہیں۔ عروض موسیقی میں بھی ہے۔ اور مصوری میں بھی اور معماری میں بھی اور سنگ تراشی میں بھی اور صرف انہیں میں نہیں.... جوتے بنانے میں بھی عروض کی ضرورت ہے اور شیرینی خانے میں، اصطبل بنانے میں بھی اور پاک خانے میں بھی، چڑیا خانے میں بھی اور ایوانوں کی شاندار عمارت بنانے میں بھی.... اور جن لوگوں نے عروض بنایا ہے وہ خود بھی عروض اور قاعدے بنائے گئے ہیں۔ اور سب سے بڑا عروض داں اللہ تعالیٰ ہے جس کی غزلیں، نظمیں، قصیدے، رباعی، قطعے، مخمس، مسدس مستزاد۔ یہ کائنات میں پھیلی ہوئی تمام اشیا ہیں۔ جو مصور بھی ہے اور شاعر بھی جس کی شاعری جاننا سمجھنا اور شعر کی طرح لطف لینا چاہتے ہو تو اٹھا لو قرآن مجید اور لے لو کوئی سورہ۔ اور مثال کے طور پر لے لو سب سے آسان سورہ جسے تم سب لوگ پڑھتے ہو اور تم میں سب کو یاد بھی ہو گی۔

انّا اعطینٰک الکوثر ......

عروض قواعد فصاحت بلاغت تشبیہہ۔ استعارہ، کنایہ مجاز اور جتنی شاعری کی اصطلاحیں تم جانتے ہو اور دنیا جانتی ہے سب کو ذہن میں لاؤ اور ان سب کو الگ الگ اور ایک ساتھ اس سورہ میں ڈھونڈو اس میں تمہیں وہ سب کچھ ملے گا، وہ سب کچھ ملے گا جو بڑے بڑے عروض داں اور فصیح و بلیغ اور شاعر اور فنکار کہتے آئے۔ اور اس کے بعد بھی اتنا کچھ ملے گا کہ آنے والے موجدین اور ماہرین قیامت تک سوچتے سمجھتے اور سر دھنتے رہیں گے ....''

پچاس منٹ تک ہم لوگ محو ہو کر لکچر سنتے رہے۔ لکچر ختم ہوا تو اٹھے اور اختر صاحب بولے کہ جانتے ہو میں نے عروض پر لکچر دے دیا۔ حالانکہ میں عروض بالکل نہیں جانتا۔

اختر صاحب نے ابھی اپنی مطبوعہ (نقوش، آپ بیتی نمبر) میں فرمایا ہے

"مجھے بچے پیارے ہیں، دوست عزیز ہیں اور صنف نازک بہت محبوب ہیں"

یہ حقیقت ہے۔ اللہ نے انہیں کسی مصلحت سے اولاد نہیں دی اس کا ردعمل دونوں صورتوں میں ہوتا ہے، دوسروں کے بچوں سے نفرت یا غائت محبت۔ اختر صاحب پہ دوسرا ردعمل ہے۔ وہ بچوں کو واقعی بے حد پیار کرتے ہیں۔ ان کے بھتیجے بھتیجیاں بھانجے بھانجیاں ان سے اس قدر مانوس اور قریب ہیں کہ اپنے والدین سے بھی نہیں۔ اور دوستوں کا کیا حال عرض کروں، دنیا یزداں اور اہرمن کی داستان کشمکش ہے۔ جہاں ہر زندگی کی راہیں ایک طرف کانٹے ایک طرف پھول، ایک طرف شاخ گل ایک طرف

تلوار ایک طرف، رہنما ایک طرف، رہزن ایک طرف، دوست ایک طرف دشمن بھی۔ انسان ٹھوکریں کھاتا ہے، کبھی کانٹوں پر گرتا ہے کبھی پھولوں پر، کبھی شاخ گل کی آغوش میں، کبھی تلوار کے سائے میں۔ گرنا شکست نہیں، ہمت ہار دینا شکست ہے۔ اختر صاحب کی زندگی کی دو نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی ٹھوکر پر کبھی ہمت نہیں ہاری اور ٹھوکر لگانے والے کو ٹھوکر سے کبھی بدلہ نہیں دیا۔ شخصیت کی صالح تعمیر کے لئے اس سے اچھا اسلوب اور انداز اور کیا ہوگا۔ اختر صاحب کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ جس طرح ہر انسان کے ہوا کرتے ہیں، چاہنے والے بھی اور بد دعائیں دینے والے بھی، آگے بڑھانے والے بھی اور پیچھے کھینچنے والے بھی۔ مگر انہوں نے آگے بڑھانے والوں کا ہمیشہ احسان مانا اور پیچھے کھینچنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ دشمنوں کی دشمنی کا اعتبار کرنا اسے طاقتور بناتا ہے اور اس سے بے اعتنائی کرنا اس کے قوائے عداوت کو کمزور اور مفلوج کر دیتا ہے۔ اختر صاحب دوستوں کو بے حد عزیز رکھتے ہیں اور ان کا اعتماد بعض صورتوں میں اعتدال سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن وہ دشمنوں کو بھی بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میرا ان کا ساتھ کلاس کے باہر بہت کم رہا ہے۔ لیکن اکثر نازک موقعوں پر اتفاقاً میری موجودگی بھی رہی ہے۔ جب انسان حزم و احتیاط سے عمداً غافل ہو جاتا ہے اور جذبات کے بہاؤ میں لغزشیں کر بیٹھتا ہے، یہ حادثات بڑے بڑے صاحب فکر و حضرات کو پیش آتے ہیں۔ جس طرح وہ لطیفہ مشہور ہے کہ کلکتہ میں اتفاق سے چند ارباب کمال صاحبان علم و فن کا کسی جلسے میں مجمع ہو گیا۔ مشہور مقامات کے مختلف علوم و فنون کے علماء اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک صاحب اڑیسہ کے بھی تھے۔ جو اپنے صوبہ کی پسماندگی کا بڑا احساس رکھتے تھے۔ اور اسی ندامت سے اپنا وطن کبھی اڑیسہ نہیں بتاتے تھے۔ جلسہ میں سب ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ کہاں سے تشریف لائے، کہاں وطن ہے، کہاں تعلیم حاصل کی وغیرہ وغیرہ۔ سبھوں نے اپنی اپنی جو حدی تبائی مگر یہ

اڑیسہ صاحب بہادر یونہی بات ٹالتے گئے کہ میں تو بچپن سے مختلف ملکوں میں رہا۔ بمبئی میں تعلیم حاصل کی، دہلی میں پڑھا، حیدرآباد میں کچھ سیکھا لندن سے پی ایچ ڈی کیا وغیرہ وغیرہ۔ میرا کوئی خاص وطن نہیں میں تو آوارہ گرد ہوں۔ میری زبان انگریزی ہے۔ اور میرا موضوع فلاں فلاں ہے وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں نے ہر ممکن طریقہ پر بہلا پھسلا کر ان کے وطن کا پتہ لگانا چاہا مگر بات نہ کھل سکی۔ لوگوں نے ایک ترکیب کی ایک مکان میں انہیں بڑی آؤ بھگت سے کھانے کی دعوت دی اور مکان کے دروازے کے اندر کمرے سے متصل ایک مقام پر ذرا سا گڑھا کھود کر پتلے کاغذی بورڈ سے چھپا کر اوپر فرش کر دیا۔ وہ معزز مہمان بلا تکلف دروازے سے داخل ہوئے اور فرش پر قدم رکھا ہی تھا کہ گڑھے میں گرے اور گرتے ہوئے حالت اضطرار میں ان کے منہ سے ایک لفظ نکلا

(گڑھیو شالا۔

جو اڑیا زبان کی مشہور مرکب گالی ہے۔ لوگ سمجھ گئے کہ اڑیا بھائی ہیں۔ اختر صاحب کا ظرف اتنا وسیع اور ان کا اخلاص اتنا مستحکم ٹھوس ہے کہ نازک مواقع پر بھی ان پر کیفیت اضطرار طاری نہیں ہوتی اور وہ دشمن کے ہاتھ میں کبھی تلوار نہیں دیتے۔

صنف نازک انہیں کس قدر محبوب ہے اور ان کی مظلومیت کا انہیں کس قدر احساس ہے وہ ملاحظہ فرمائیے کہ جس سال میں نے بی۔ اے آنرس میں داخلہ لیا۔ ہم لوگ آٹھ نو ہم سبق تھے۔ اور سب کے سب بدقسمتی سے صنف قوی ہی کے زمرے میں داخل تھے۔ اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال کے تصور عورت سے اختر صاحب اختلاف کرتے اور اکثر ہم سب کو کہتے کہ ہاں جناب آپ حضرات تو بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ قرآن نے بھی فرما دیا ہے کہ "الرّجالُ قوامون علی النساء"۔ لیکن معاف فرمائیے میں قرآن پر جان و دل سے ایمان رکھتے ہوئے اقبال کے تصور سے ضرور اختلاف رکھتا ہوں۔ آپ "قوامون" اس لئے نہیں ہیں کہ آپ کما کر اسے کھلاتے ہیں لہذا جب چاہیں لکڑی لے کر بے چاری کی مرمت کر دیں۔ کیونکہ اگر آپ کما کر کھلاتے ہیں تو وہ بھی آپ کو پکا کر کھلاتی ہے۔ آپ "قوامون" اس لئے ہو سکتے ہیں کہ آپ اس کی نسائیت کے محافظ ہیں۔ اسلئے اپنی

حیثیت خادم کی تو ہو سکتی ہے، آقا کی ہرگز نہیں وغیرہ وغیرہ

ایم اے کے اول سال میں ہماری جماعت میں ایک طالبہ کا اضافہ ہوا۔ کالج کی طالبات کی طبعی شوخی اور بے باکی کے برعکس ہماری ہم سبق کے مزاج میں اعتدال سے کچھ زیادہ متانت، سنجیدگی، خاموشی اور علیحدگی پسندی تھی۔ اس لئے ہمارے ساتھیوں نے "تعزیہ" کا خطاب دے رکھا تھا، بایں ہمہ ان کی موجودگی کلاس میں فلسفۂ انسانیت اور رجائیت کو اکثر زیر بحث لاتی اور اختر صاحب کے بقول کلامِ اقبال میں صنفِ نازک کے ساتھ انصاف کی جس حد تک کمی رہ گئی تھی تشریح کلامِ اقبال کے دوران اختر صاحب اس کمی کو حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اتفاق سے جس دن سالِ اول اور سالِ دوم کا کلاس مشترک ہو گیا جس میں ایک خاتون ایسی تھیں جن پر "تعزیہ" کا اطلاق ممکن نہیں تھا۔ اس دن اختر صاحب کا لکچر سن کر غالب کا مصرعہ بار بار ذہن میں آتا تھا

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار

اور ہمارے ایک ساتھی نے جو بیاض آرہی تھی اس میں تو اقبال کے تصورِ عورت سے جنگ آزمائی کے لئے نصف درجن سے زیادہ جلتی جاگتی، چلتی پھرتی، مزین، مرصع اور مرقعِ شمشیریں تھیں۔ اقبال کیا افلاطون کے تصورِ عورت کے بھی پرخچے اڑا دینے کے لئے کافی تھیں۔

اختر صاحب کا کمرہ صرف ادب و شاعری کا کلاس نہیں ہوتا انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر کسی نہ کسی حیثیت سے گفتگو آتی۔ یہ تو کلاس کا عمومی نقشہ ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی ہنگامی صورتِ حال کے اثرات بھی رینگ رینگ کلاس میں پہنچ جاتے لیکن ان ہنگامی صورتِ حال پر گفتگو ہوتی بھی تو کلاس کے آداب و احترام اور ادب و زبان کے دائرے سے بہت دور نہیں جا پڑتی۔ اور بہر حال ان کا رشتہ کسی نہ کسی مقام پر تعلیمی موضوع سے جڑ جاتا۔ ہاں کبھی کبھی "رسم و آداب" کے دائرے سے بات نکل گئی ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوا ہے تو اختر صاحب کی شخصیت

کا کوئی نیا پہلو نمایاں ہوا ہے۔ مثلاً ایک دن کا واقعہ سن لیجئے

اختر صاحب نے بحیثیت انسان یا بحیثیت فنکار مرحی کر زندگی کرنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ یہ فن اکثر فنکاروں کے دسترس میں نہیں آیا ہے۔ اب اختر صاحب کی زندگی میں کوئی طوفان نہیں ہے۔ فضا ڈھلی ڈھلائی ہے۔ ان کی زندگی ایک ساختہ پرداختہ چیدہ و تراشیدہ، آراستہ و پیراستہ خانہ باغ ہے جس میں صبح و شام ایک ایک شاخ کو موزوں اور سڈول بنایا جاتا ہے۔ اس خانہ باغ میں خود رو کی نہ ملے گی۔ ان کا کیرکٹر سمندر کے سنگ بہاد سے مشابہ ہے۔ جس پر پہلی نظر میں ٹھہراؤ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس میں دریا کا جوش نہیں ہے۔ اعتدال اور توازن مزاج کی بنیادی خصوصیت ہے۔ غم و غصہ، خوشی، مسرت ہر چیز پر یکساں توازن اور اعتدال کی چادر پڑی ہوتی ہے جس کی سطح میں ہر طرف ایک عمومی ہمواری ہے۔

برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر حملہ کیا اور پوری عرب دنیا میں ایک طلاطم پیدا ہو گیا۔ سویز پر بمباریاں ہوئیں۔ جہاز ڈوبے کشتیاں تباہ ہوئیں، جانیں تلف ہوئیں۔ لوگ بے گھر ہوئے عورتیں بیوہ ہوئیں، بچے یتیم ہوئے، چیخ پکار، آہ و کراہ جو کچھ بھی ہوا ظالم و مظلوم کی کشمکش کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ وہ ہوا۔ ہمدردیاں بھی خانوں میں تقسیم ہوئیں، کسی نے خنجر ستم گاراں کو آفریں کہی۔ کسی نے صبر ستم زدگان کو مرحبا کہا۔ اس جبر اور صبر کی آواز بازگشت نہر سویز کے نزدیک اور دور تمام سنائی دے رہی تھی ایک دن پٹنہ کالج کلاس میں بھی اس جبر و صبر کی داستان چھڑ گئی ادب و شاعری کی نزاکتوں اور رنگینیوں سے بات نکل کر جنگ آگ، خون اور دھواں تک پہونچ گئی۔ ایڈن کے دبیز اور خوبصورت جسم کے اندر قلبِ سیاہ کی بات نکلی اور جنرل ڈیگال کی دراز قامتی اور پست ذہنی کا تذکرہ بھی آیا۔ ناصر کی آزاد خیالی کے ساتھ اس کے حوصلے عزم ارادہ اور استقلال کی گفتگو بھی آئی اور پھر قاہرہ کے عوام سامنے آئے۔ اسکندریہ کے مزدور ملاح اور

راہ گیر بھی قریب آئے، انکے جفاکش فطرت، مشقت کی تراشی ہوئی زندگی اور ریگستان کی
سنسناتی ہوئی ریت میں اٹے ہوئے ان کے جسم، ان کے پیرہن اور
انکی پیشانیوں سے جھلکتی ہوئی چپٹی ناکیں بھی نظر آتیں اور بمباری سے بھاگتی
گرتی، چیختی اور کراہتی ہوئی مخلوق، پھٹے
اڑے ہوئے اعضاء، زخموں سے لڑکھڑاتے ہوئے مرد، ٹھنڈی
اور گرم لاشیں ماتم کرتی ہوئی مائیں اور مردہ بیٹیوں سے چمٹے ہوئے
بے زبان بے سمجھ بچے سب آنکھوں کے آگے متحرک ہوگئے اور پھر
ہم نے دیکھا کہ جوش میں باتیں کرتے ہوئے اختر صاحب یک بیک
خاموش ہوگئے۔ اور وہ ہوا جو ہم نے تین چار سال کی مدت میں
کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور نہ ان کے مزاج اور طبیعت میں اس اچانک
انقلاب کی توقع تھی۔ اس متوازن اور معتدل مزاج کے انسان
اس آہنی عزم اور ارادے کے انسان سے وہ بات ہوئی جو ہم جیسے
کمزور طبعوں سے ہوتی ہے ...... اختر صاحب یک بیک خاموش
ہوگئے۔ ان کے دونوں ہاتھ پہلے مضبوطی سے کرسی کے دستوں پر
جم گئے، چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اور پھر اختر صاحب کی ٹھوڑی
زور زور سے کانپنے لگی، ہونٹ تیزی سے تھرانے لگے، ضبط کی
ساری طاقتیں سپر رکھ دینے پر مجبور ہوگئیں۔ اختر صاحب کا سر
جھک گیا اور ان کے دونوں ہاتھ کرسی کے دستے سے منہ پر آگئے
اور اختر صاحب زور سے رو دیے۔

اختر صاحب کے جسم ان کے قد و قامت ان کی وجاہت
میں اور آرین کی کوہستانی مٹی کا خمیر ہے۔ اور بڑی حد تک ان کے مزاج
پر بھی کوہستانی ہی فضا کا پرتو ہے .... اردل کی رومانی فضا بے شک
ان کی زندگی کو نیا موڑ دے چکی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ کسی زمانے
میں ان کے مزاج اور طبیعت کا جزو خاص رہی ہو اور اس کے اثرات
ان کی زندگی میں بہت نمایاں رہے ہوں۔ میں نہ ان کی پوری زندگی
سے واقف ہوں نہ ان کی شخصیت پر جو مضامین نقوش میں نکلے ہیں
انہیں پڑھ سکا ہوں۔ میرا ذاتی مطالعہ یہی ہے کہ اختر صاحب
پر مرض سل کا اتنا قابل ذکر حملہ اگر نہ ہوتا تو وہ جو کچھ اس سن
و سال میں بھی مجھے نظر آتے ہیں اس سے بھی بہت کچھ آگے نظر
آتے۔ اردل کے رومان نے ان کے مزاج کو ایک ہلکی سی لچک
بخش دی ہے۔ اور آرین کی پتھریلی اور ٹھوس فضا نے ان کی
رگوں میں حقیقت پسندی کا بڑا گاڑھا لہو دوڑا دیا ہے جو سل
کی راہ سے کبھی خارج نہ ہو سکا ہے۔ میں تو اس حد تک کبھی نہیں جاسکتا
کہ ان کی طبیعت کو حقیقت اور رومان کا سنگم یا حسین امتزاج
کہوں۔ لکھنے والے کے لیے آسان اور محتاط طریقہ یہی تھا۔ میں تو
یہ کہتا ہوں کہ رومان بس اختر صاحب کی زبان ہی پر ہے۔ گفتگو
ہی میں ہے لکچروں ہی میں ہے۔ اور اس کے بعد ان کی شاعری میں
ہے۔ چونکہ شاعری اردل کے پام دریا میں پروان چڑھی ہے۔ اس
لئے اس وضع داری کو نباہ رہی ہے۔ بس میں تو اسے وضع داری ہی
وضع داری سمجھتا ہوں۔ اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ حقیقتوں نے
دریائے سون، پام دریا اور وہاں کی چاندنی راتوں کی یاد کو کسی
بہت قدیم قافلے کے دھندلے دھندلے نقوش قدم سے زیادہ حیثیت
باقی نہیں رکھی ہوگی۔ حقیقت پسندی ان کے دل میں، ان کے ذہن
میں اور ان کے رگ و ریشے میں انگڑائیاں لیتی ہے۔ اگر وہ سل
کے مریض نہ رہے ہوتے تو وہ اس سن و سال میں بھی زیادہ چاق
چوبند، زیادہ جفاکش، زیادہ باہمت، مجاہد اور جان پر کھیل
جانے والے ہوتے۔ میری اپنی رائے ہے کہ رومان انسان کو بیشتر
حالات میں بزدل بناتا ہے۔ مشقت اور مجاہدے سے گریز اور
خطرات سے فرار کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ زندگی کی قدروں سے
کم لیکن زندگی سے زیادہ پیار کرنا سکھاتا ہے اور زندگی سے اس
پیار کے لئے ہمیشہ زندگی کی قدروں کو قربان کرنا سکھاتا ہے۔
اختر صاحب میں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں بزدلی نہیں، مشقت
اور مجاہدے سے پرہیز ان کے قدیم مرض سل کا رد عمل ہے۔
خطرات سے وہ نہیں گھبراتے اور زندگی سے زیادہ زندگی کی
قدروں کو عزیز رکھتے ہیں۔

نسائیت اور حسن ظاہر بے شک ان کی کمزوری ہے۔ لیکن یہ
زندگی کے چٹخارے ہی کے حد تک ہے۔ دسترخوانِ حیات پر ان
کا وجود چٹنی، اچار مربے سے زیادہ نہیں۔ لیکن حقیقت کا حسن

سیرت کا حسن، اقدار کا حسن، اصول کا حسن اداں روی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اختر صاحب غالب کے محبوب کو پسند کرتے ہیں۔ میر کے محبوب کو چاہتے ہیں اور اقبال کے محبوب پر جان دیتے ہیں۔ آٹھ نو سال قبل پٹنہ کالج بزم ادب کے جلسے میں جب روشن صدیقی نے غزل پڑھی

بحقیقت کوئی ارباب خبر سے پوچھے
کس قدر مرحلۂ بے خبری مشکل ہے
عارضِ گل کو بھی ہے غازۂ شبنم درکار
حسن ہو رسمِ تکلف سے بری؟ مشکل ہے

تو اختر صاحب گردن ہلا ہلا کر واہ واہ سبحان اللہ بہت خوب اچھی جہے خوب، کی تکرار کر رہے تھے اور بے حد تعریف کر رہے تھے اور بے حد پسند فرما رہے تھے... لیکن جب ایک شخص نے سیدھی سادھی بات غزل میں کہی

ہمارا حال اے ساقی ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا
تری محفل اگر اجڑی ترا انجام کیا ہوگا
تمہارے چاہنے والے مبارک ہوں نہیں لیکن
جو ہم نے کر دیا وہ دوسروں سے کام کیا ہوگا

تو اختر صاحب نہ واہ واہ کر رہے تھے نہ سبحان اللہ۔ لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں، چہرہ پر ایک تمتماہٹ تھی اور جوش، حیرت اور مسرت کے غلبے سے ہونٹ سکڑ رہے تھے اور پھیل رہے تھے۔ دراصل اس شخص کے اشعار میں نہ رومان کا حسن تھا نہ شاعری کا حسن وقت کی سیدھی سادھی باتیں اور سپاٹ حقیقتیں تھیں۔

چند سال پہلے اشٹ گرہ کا بھوت جب دنیا کے سر پر سوار تھا اور میں دیکھتا تھا کہ مکان کے آگے جھونپڑے پڑ گئے ہیں۔ لوگ مکانوں سے نکل کر کھیتوں کے جھونپڑوں اور خیموں میں زندگیوں کو چھپائے پھرتے تھے اور شہر کے لان میں میدانوں میں اور فٹ پاتھ پر سر شام ہی سے بستروں کی قطاریں لگ جاتی تھیں اور پورے گاندھی میدان میں رات کو سونے والوں کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں میں کلاس غیر مطمئن فضا میں ہونے تھے اور بیشتر اساتذہ خود ہمارے شعبہ کے اساتذہ کھلے میدان میں کلاس لینے پر مصر تھے۔ اور کلاس کھلے میدان میں لیتے تھے۔ اختر صاحب کا کمرہ اعتماد، یقین، ہمت اور استقلال کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز تھا۔

چند دنوں پہلے جب جمشید پور، راورکیلا اور رانچی کے فسادات کی آگ بس ابھی بجھی ہی تھی، ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ میں اختر صاحب کے گھر پر ان کے کمرے میں بیٹھا تھا اور موضوع گفتگو حالات حاضرہ ہی تھے۔ اتنے میں ان کے چھوٹے بھائی فضل احمد سپرنٹنڈنٹ پولس آئے، کچھ بات نکلی۔ اس پر اختر صاحب نے کہا کہ میں آج شام کو یا کل صبح مگدھ یونیورسیٹی کے بورڈ کی میٹنگ میں گیا جا رہا ہوں۔ فضل صاحب نے انگریزی میں کہا کہ میرے محافظوں میں سے ایک محافظ آپ کے ساتھ جائے گا

One of my armed guards will go with you

اختر صاحب نے انگریزی ہی میں جواب دیا

I don't require it

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا"

مگر فضل صاحب کا اصرار تھا۔ ممکن ہے محافظ ان کے ساتھ گیا ہو۔

بقیہ:- اختر بھیا

اور اچار اور ہر قسم کے کبھرتے۔ بھلا اختر بھیا کس طرح برداشت کر سکتے۔ بات جو کبھی ہوا انہوں نے طبی قانونوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس کی سزا انہیں ملتی تھی اور شاید ملی بھی۔ شاید اس لئے کہتا ہوں کہ خود آنکھ سے دیکھا نہیں بلکہ نوکروں کا حلفیہ بیان ہے کہ اختر صاحب ان کو کئی دفعہ "لوٹا بدست" رواں دواں نظر آئے۔

اس کے بعد جب کبھی میں جانے کا قصد کرتا، اختر صاحب کچھ دن کی رشوت پیش کرتے لیکن بُرا ہو چھٹیوں کا جو ختم ہو چکی تھیں اور مجھے اختر صاحب اور ان کی کھچڑی دونوں سے بصد حسرت و یاس جُدا ہونا پڑا

●●

اویس احمد دوراں

یہ واقعہ ۱۹۶۱ء کا ہے۔ جمشید پور میں دو بڑے مشاعرے ہونے والے تھے۔ ایک ساکچی میں اور دوسرا کو آپریٹو کالج جمشید پور کی طرف سے مجھے دونوں ہی مشاعروں کے منتظمین نے بطور خاص مدعو کیا تھا۔ پٹنہ سے برادر مہربان حضرت رضا نقوی واہی کا خط بھی موصول ہوا تھا۔ اور ان کا یہی حکم تھا "تم جمشید پور کا پروگرام ضرور بناؤ۔ میں اور اختر صاحب اورینوی دونوں ہی ساکچی اور کو آپریٹو کالج کے مشاعروں میں شرکت کریں گے۔ چنانچہ میں بھی اختر صاحب اور "شہر آتش دامن" (جمشید پور) کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ جانے پر رضامند ہو گیا۔ مشاعرہ کے ایک روز قبل بھی ظہیر ناشاد کے ساتھ میں کلکتہ سے روانہ ہوا۔ موصوف کو سید منظر امام ایڈیٹر "رفتارِ نو" (مرحوم) دربھنگہ کی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ مجھے بھی اس موقع طرب انگیز پر موجود رہنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ نوید مسرت مجھے بھی دی گئی تھی اور بصد اصرار دعوت دی گئی تھی۔ لیکن میرے لئے ایک عقدۂ دشوار یہ پیدا ہو گیا تھا کہ ساکچی کے مشاعرہ اور میرے عزیز دوست منظر امام کی شادی کی تاریخ ایک ہی تھی۔ تاریخ ہی نہیں بلکہ دونوں تقریباً کا وقت بھی ایک ہی تھا۔ مختصر یہ کہ میں جمشید پور پہنچا۔ اسٹیشن پر میرے دوست ظفیر الحسن اور چند دیگر مخلصین و احباب ریسیو کرنے کے لئے موجود تھے۔ میں ناشاد صاحب کے ہمراہ ظفیر الحسن کے ساتھ ان کے گھر قیام کرنے چلا گیا اس لئے کہ ان کا اصرار پیہم یہی تھا۔ یہاں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ برادر گرامی واہی صاحب اور میرے مابین مراسلت کے ذریعہ یہ طے پایا تھا کہ اگر وہ مجھ سے قبل جمشید پور پہنچیں گے تو اسٹیشن پہ میرا انتظار کریں گے۔ اور اگر میں پہنچا تو ان کے لئے چشم براہ رہوں گا۔ لیکن عجیب اتفاق کہ ٹرین سے اترتے ہی احباب نے میری کھینچا تانی شروع کر دی اور "میرے گھر چلو" "تمکو میرے یہاں ٹھہرنا ہے" کے نعرے کچھ اس طرح زور و شور سے لگائے کہ میں پچھلے سارے وعدے یکلخت بھول بھال گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واہی صاحب سے میری ملاقات صبح کی بجائے دوپہر کو ہوئی۔ اور جب میں حضرت کلیم عاجز اور وفا ملکپوری کے ساتھ رضیہ رعنا (محترمہ ڈاکٹر اختر اورینوی کی سالی ہیں) کے گھر پہنچا تو واہی صاحب کو اپنے لئے منتظر پایا۔ وہ مجھے اندر کمرہ میں لے گئے۔ کمرے میں عرش جیسی اونچی مسہری تھی جس پر نہایت

صاف و شفاف بستر تھا۔ اور اس بستر پہ ایک وجیہہ و شکیل دراز قد اور پر وقار ہستی بیٹھی تھی۔ سرخ و سپید چہرے کی شیو ابھی ابھی بنائی گئی تھی۔ اور رخساروں پر بگلے کے پر جیسی صابن کی سفید جھاگ اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ ابھی میں اس جاذب نظر ہستی کے مشاہدے میں محو ہی تھا کہ واہی صاحب نے فرمایا "انہیں! ان سے ملو۔ یہ اختر صاحب ہیں" میرا نام سنتے ہی اس جادو اثر انسان نے بڑی محبت سے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ محض چند ثانیوں میں میرے اندر فراوانی کے ساتھ یہ احساس پیدا کر دیا کہ مجھے ان کی قربت و عنایت و محبت سالہا سال سے حاصل تھیں۔

رضیہ بھابھی (شکیلا اختر کی بہن) اس وقت تک میرے سامنے نہ آئی تھیں۔ اختر صاحب کئی بار پکار کر کہہ چکے تھے۔ "رجو! ادھر آؤ۔ دوراں سے مل لو" مگر وہ یا تو اجنبی سمجھ کر مجھ سے ملنے میں حجاب محسوس کر رہی تھیں یا پھر وہ ضیافت کا م و دہن کی تیاریوں میں اس قدر مصروف تھیں کہ ہوں ہاں کچھ نہ کر سکیں۔ البتہ باورچی خانے سے چھناکے کی آواز آتی رہی۔ رضیہ بھابھی سالن پکاتی رہیں اور اختر صاحب کی کشش انگیز گفتگو کا کبھی نہ ٹوٹنے والا حسین سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ کھانے کا وقت ٹلنے لگا اور بھوک کا احساس شدید ہو گیا۔ عین اسی وقت رضیہ بھابھی کی آواز گونجی "کھانا لگ چکا ہے۔ آپ لوگ تشریف لے آئیں۔" اختر اور بنوی صاحب کی رہنمائی میں واہی صاحب اور میں دستر خوان پہ پہنچے جہاں انواع و اقسام کے کھانے بڑی نفاست اور سلیقے سے چن دیے گئے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا اور دوپہر کا وقت۔ تشنگی کا غلبہ بھوک کے احساس سے کہیں زیادہ تھا لیکن رضیہ بھابھی نے شیشے کی صاف و شفاف صراحیوں اور گلاسوں کی کچھ اس قدر خوشنما قطار سجائی تھی کہ اسے دیکھتے ہی پیاس بجھ سی گئی۔ کمروں کی صفائی کا تجزیہ کرتے ہوئے اختر صاحب نے کھانے کے دوران فرمایا کہ "اگر رضیہ کا بس چلے تو سارے گھر کو لانڈری بھیج کر دھلوا منگائیں اور کھانے میں وہ اہتمام کریں کہ شاہی دستر خوان شرما جائے۔" اس فقرے کو سنکر صاحبزادی نے کے ہونٹ ہلے "اگر باجی (شکیلا اختر) سن لیں گی کہ میں نے آپ کی (مخاطبت اختر صاحب سے تھی) خاطر مدارات میں ذرا بھی کمی ہے تو مجھے وہ پٹنہ بلوا کر سزا دیں گی۔"

اختر صاحب اور واہی صاحب دونوں ہی محو گفتگو تھے اور میں لطف کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اختر صاحب نفیس و لذیذ کھانوں کے ساتھ کس خوبصورتی سے انصاف کر رہے ہیں۔ تعریف کرتے جاتے تھے۔ اور ڈٹ کر کھاتے جاتے تھے۔ آخر میں دیکھا سارا دستر خوان صاف تھا۔ کیلے بھی ان کی دسترس سے نہ بچ سکے۔ موصوف نے بتدریج، تادیر اور بہ آہستہ کھایا۔ بڑے حسن اور سلیقے سے کھایا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا۔ اختر صاحب کھانے کے معاملے میں تو بڑے خوش ذوق، فراخ دل، اور سلیقہ مند ہیں۔ مگر کیا وہ زندگی کے دیگر معاملوں میں بھی ایسے ہی ہیں؟ اور مجھے اپنے سوال کا جواب ہمیشہ اور ہر موقع پہ اثبات میں ملتا رہا۔ میں نے انہیں اپنی ملاقات کے بعد سے اب تک کسی کاروبار حیات میں بد ذوقی کا شکار نہ پایا۔ ان کے ہر کام میں حسن اور سلیقے کی کارفرمائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ مگر ذرا ٹھہریئے! شاید میں نے تھوڑی سی مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ دو موقعوں پر وہ مجھے نہایت بھونڈے نظر آئے ہیں۔ ایک وہ موقع جب شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس، چھاتا اور پورٹ فولیو بغل میں دبائے کسی جشن یا تقریب میں پہنچے ہیں۔ دوسرا وہ موقع جب انہوں نے اپنے اشعار پڑھے ہیں۔ وہ کیفیت والا شعر بھی کیفیت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ جمشید پوری کا ذکر ہے جب ہم لوگ ساکچی کے مشاعرہ میں جانے کی تیاری کر رہے تھے تو اختر صاحب کو دیکھا کہ وہ شیروانی اور ٹوپی پہنے اور چھاتا اور پورٹ فولیو بغل میں دبائے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر غیر ارادی طور پہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "آپ اس سامانِ جہالت کے ساتھ مشاعرہ میں جا رہے ہیں۔" یہ سنکر وہ ہنسے۔ بڑے زور سے ہنسے، اور فرمایا "رضا (واہی) سنو! دوراں کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے اسقدر گستاخانہ جملہ اُن کی شان میں کہہ تو دیا لیکن دوسرے ہی لمحہ محسوس کیا جیسے میرے جسم کا سارا لہو خشک ہو رہا ہو۔ میں اپنے دل میں مارے ندامت کے کٹا جا رہا تھا مجھے اسقدر جلد اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم تفاوت عمر کا بھی تو لحاظ رکھنا تھا۔ میں نے شاید زندگی میں پہلی بار نہیں معلوم کس جذبۂ شرارت کے تحت ایک جلیل القدر ہستی کی شان میں گستاخی

کی تھی۔ مجھے اپنی شرارت آمیز حرکات پر حیرت بھی تھی اور تاسف بھی۔ لیکن
اختر صاحب اس پیکرِ اخلاق و انسانیت پر جس نے بجائے برا ماننے کے میرے
بچپنے سے ہنسی ہنسی کر لطف اٹھایا تاکہ مجھ پر کسی قسم کی خفت طاری نہ
ہو اور میں ان کی اور واہی صاحب کی معیت میں جمشید پور کے چند روزہ
قیام کے دوران خود کو اجنبی محسوس نہ کروں۔

اختر صاحب مجھ پر اتنے زیادہ مہربان ہوگئے اور
ملاقات کے بعد محض چند لمحوں کے اندر مجھ سے اسقدر بے تکلف
ہوگئے، اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ میں عرصہ دراز سے شدید قسم
کے اعصابی و نفسیاتی امراض میں مبتلا تھا۔ واہی صاحب سنہ ۱۹۷۰ء
میں بسلسلہ مشاعرہ مدراس کے بعد جب کلکتہ تشریف لائے تھے اور
میری ملاقات ان سے پہلے پہل ہوئی تھی تو انہوں نے میری دماغی
و روحانی و جسمانی تکالیف دیکھی تھیں اور اس عذاب کی تیز آنچ کو
محسوس کیا تھا، جسمیں میرا سارا وجود جھلس رہا تھا۔ چنانچہ وہ جب
کلکتہ سے پٹنہ پہنچے تو میرا نیز میری نفسیاتی بیماریوں کا ذکر اختر صاحب
سے کیا۔ لہٰذا اختر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ جمشید پور کے قیام
کے دوران وہ میرا نفسیاتی علاج کریں۔ مجھے ہنسنا سکھا دیں جسے
میں کئی سال ہوئے بھول چکا تھا۔ میں ان کا اور واہی صاحب کا حد درجہ
احسان مند ہوں کہ انہوں نے مل کر جمشید پور میں میرے موڈ کو خوشگوار
بنانے اور میرے اندر قوتِ ارادی کی کمی کو پورا کرنے کی تین دنوں
تک مسلسل بھرپور اور محبت بھری کوشش کی، لیکن میرا مرض تو
مرض تھا۔ دنیا کے ایک بڑے ڈاکٹر آنجہانی بی۔ سی۔ رائے کی تشخیص
کے برخلاف ذہن یا من کا روگ نہ تھا۔ اس لئے ان دو مسیحاؤں کی
مسیحائی سے بھی شفایاب نہ ہو سکا۔ مگر واہی صاحب کے علاوہ اختر
صاحب بعد کو عرصہ دراز تک میری دلجوئی کرتے اور مجھے تسلیاں
دیتے رہے۔ یہاں مجھے یہ عرض کر لینے دیجئے کہ میں نے اپنی اس مختصر
سی زندگی میں جن اشخاص کو کئی معنوں میں بہت بلند، وسیع القلب
خوش اخلاق اور دوسروں کا ہمدرد پایا ہے اُن میں رضا نقوی واہی،
سید اختر احمد اورینوی، رضا کریم رضا، رضا مظہری، سالک
علامہ جمیل مظہری، پروفیسر شاہدی
لکھنوی، قیصر شمیم اور شمس الزماں (میرے ایک ہم عمر گہرے دوست)
کے اسمائے گرامی ستاروں کی طرح میرے نہاں خانۂ دل میں جگمگا رہے ہیں
ان کے آگے میری روح جھکتی ہے اور ان کا احترام کرتی ہے۔ ان ناموں
کے علاوہ ایک اور نام صفحۂ ہستی پر ایسا ہے جس کی موجودگی سے میں نے ہمیشہ
اپنے ناتواں بازوؤں میں بے پناہ قوت محسوس کی ہے۔ یہ نام میرے
سگے بڑے بھائی احسان دربھنگوی کا ہے۔ لیکن جسطرح میں نے بڑے
جوش و خروش سے ان حضرات کی خوبیوں کا اظہار کیا ہے اسی طرح میں
یہ بات کہہ ڈالنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کروں گا کہ ان میں سے
بہ استثنائے چند کل کے کل میری ہی طرح حد سے زیادہ جذباتی ہیں
اور آپ جانتے ہیں "حد سے زیادہ جذباتی ہونا" کسقدر خراب
بلکہ خطرناک ہوتا ہے۔

ہاں تو میں اختر اورینوی کے متعلق اپنے خیالات کو لفظی جامہ
پہنا رہا تھا، لیکن بیچ میں کچھ پسندیدہ لوگ بھی موضوعِ تحریر بن گئے۔ اب
میں پھر اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹتا ہوں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی علم و ادب کی راہ میں نہایت گھنی شاخوں
والا ایک شاداب اور لہلہاتا ہوا درخت ہیں۔ جس کی ٹھنڈی چھاؤں
میں ادبی کارواں آکر تھوڑی دیر ٹھہرتا ہے اور تازہ دم ہوکر اپنی منزل
کی طرف گامزن ہوجاتا ہے۔ وہ علم و ادب کا ایک سرچشمہ ہیں جس کے میٹھے
پانی نے سیکڑوں کی تشنگی بجھائی ہے۔ کتنے ہی طلبا نے ان کی رہنمائی میں
علم و بصیرت کی راہیں طے کی ہیں اور ان کی ذات سے ادراک و شعور و علم
و آگہی حاصل کی ہے۔ انہوں نے اپنی انجمن میں بیٹھنے والوں کے درمیان
بڑی فیاضی اور دریا دلی سے علم و ادب کی روشنی تقسیم کی ہے۔ سب کے
ساتھ بغیر کسی امتیاز کے شفقت و محبت و مہربانی کا دریا بہتا دیکھا
ہے۔ آپ کو ایسے لوگ کم ملیں گے جن کو اختر صاحب سے کوئی گلہ ہو یا
پیٹھ پیچھے ان کی برائی اور عیب جوئی کرنا پسند کرتے ہوں۔

اختر صاحب کی شخصیت بڑی بھرپور اور چھا جانے والی
شخصیت ہے۔ وہ جہاں رہیں، جس بزم میں جائیں، ہر جگہ چھا جاتے
ہیں۔ بڑے بڑوں پر حاوی و طاری ہو جاتے ہیں۔ صورت و پیکر سے

رفتار و گفتار سب میں بلا کی کشش ہے۔ تقریر کریں گے تو ان کا لب و لہجہ کبھی خشک نہ ہوگا۔ اپنی تقریر و گفتگو میں وہ بہت مترنم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مگر تقریر و گفتگو میں ترنم روانی و شوخی کے ساتھ زور استدلال بھی غضب کا ہوتا ہے۔ میں نے کئی موقعوں پر ان کی تقریریں الگ الگ موضوعات پر سنی ہیں۔ اور حیران و ششدر رہ گیا ہوں، اسلئے کہ ان کی ہر تقریر عالمانہ، فلسفیانہ، دلچسپ، پُر اثر، شوخ اور مترنم ہوتی ہے۔ وہ اپنے سامعین کی تمام تر توجہات اپنی پُرکشش آواز اور اپنے باوقار مگر دلنشیں پیکر کی طرف مبذول کر لینے کا آرٹ جانتے ہیں۔ اُن کا یہ آرٹ فطری ہے۔ اس کا تعلق ان کے وجدان اور ان کی حسی کیفیات و بصیرت سے زیادہ اور کسب و ریاض سے کم ہے۔ میں نے تو کم از کم یہی محسوس کیا ہے۔ اب تک دو مشاہیر اردو ادب کی تقریروں نے مجھے کافی متاثر کیا ہے۔ یہ دو مشاہیر اختر اورینوی اور سید احتشام حسین رضوی ہیں۔ موخر الذکر بھی اپنی ولولہ انگیز و سحر آفریں تقریر سے دلوں کے اندر وجدان و کیفیات کی لہریں پیدا کر دیتے ہیں۔

اختر صاحب اورینوی کی ایک نہیں کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ بیک وقت مشہور نقاد، بلند پایہ افسانہ نگار، مانے ہوئے مقرر اور پسندیدہ شاعر ہیں۔ اتنی ہمہ گیری و ہمہ جہتی شاذ و نادر ہی کسی کا حصہ ہو پاتی ہیں۔ قدرت کا انداز نرالا ہوتا ہے۔ اسکی فیاضی بھی نرالی ہوتی ہے۔ جسکو چاہتی ہے نوازتی ہے جسکو چاہتی ہے محروم صفات رکھتی ہے۔ اس نے بڑی فیاضی سے اختر صاحب کے دلنواز پیکر میں ظاہری و باطنی رعنائیاں اور خوبیاں بھر دی ہیں۔ ان کی ذات بعض عمدہ صفات اور خوبصورتیوں کا مرکز ہے ان کو اگر میں یہاں تفصیل و صراحت کے ساتھ گنوانا بھی چاہوں تو نہیں گنوا سکتا، اسلئے کہ ان کی شخصیت کے تمام رُخ میرے سامنے کھل کر اب تک نہیں آئے۔ مثلاً میں نے ان کی تمام تر ادبی تخلیقات و تنقیدی نگارشات اب تک نہیں پڑھیں حالانکہ میں ان سے بے حد قریب ہوں۔ اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہنے کو تیار ہوں کہ اختر صاحب کی نگاہوں میں میری وہی اہمیت ہے جو ان کے خاص الخاص دوستوں مثلاً حضرت رضا نقوی واہی وغیرہ کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں انہیں اپنا دوست نہیں بزرگ سمجھتا ہوں، اسلئے کہ وہ عمر ہی میں نہیں ہر بات میں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ لہٰذا خود کو ان کا دوست کہنا یا سمجھنا میرے نزدیک بدتمیزی کے مترادف ہے۔ لیکن وہ چونکہ انتہائی پُرخلوص اور ملنسار آدمی ہیں، اسلئے میری دلجوئی کی خاطر وہ مجھے دوست ہی کی قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ایک بار خود فرمایا تھا کہ میں ان کے اہل بیت میں بعض خاص دوستوں میں شامل ہوں۔ مگر اتنا کچھ ہونے کے باوجود مجھے اس کا اقرار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میں اُن کی گراں قدر شخصیت کے تمام رُخ کو اچھی طرح نہیں پہچانتا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر نظر مضمون کے لکھنے میں مجھے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے انہیں کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اگر میں ان کی تصانیف کا بھرپور مطالعہ کیا ہوتا تو نہ صرف ان کے ذاتی خد و خال کو سکون قلب کے ساتھ تحریری شکل دیتا بلکہ اُن کے فنی کمالات یعنی ان کے تخلیقی و تنقیدی ادب پاروں کا ایک ایسا تجزیہ پیش کرتا جو قارئین کو اگر نہیں تو کم از کم مجھے ضرور مطمئن کر سکتا۔ لیکن وائے حسرت کہ میں ان کی زندگی کے سب سے اہم رُخ سے بڑی حد تک ناآشنا ہوں۔ اور یہ رُخ ایسا ہے کہ اسکو پہچانے بغیر میں اختر صاحب کو نہیں پہچان سکتا۔ میں ان کے کسی پہلوئے حیات پر گفتگو نہیں کر سکتا، اسلئے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر شعر و ادب نے کی ہے۔ ان کو یہ بلند و بالا مقام ان کی بے پایاں علمی و ادبی صلاحیتوں نے بخشا ہے۔ رسالہ "ساغر نو" ان کے نام نمبر دھوم دھام سے اسی لئے نکال رہا ہے۔ کہ ان کی ادبی شخصیت علم و فن کی تمام بلندیوں کو چھوتی ہوئی گذر رہی ہے۔ اگر اختر صاحب صرف اختر صاحب ہوتے، اختر اورینوی نہ ہوتے تو ان کی شخصیت کے ایک ایک رُخ پر مضامین نہ لکھے جاتے۔ اختر کے ساتھ اورینوی کا اضافہ یونہی نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اسکی تہہ میں وہ عظیم شخصیت ہے جسکے مالک نے تنقیدی و افسانوی ادب کی صحت مند و گراں قدر تخلیق کر کے اپنی زندگی کے ہر رُخ

کو معتبر اور توجہ کے قابل بنالیا ہے۔ ان کی خلوت و جلوت دونوں ادب و علم سے عبارت ہیں۔ اسلئے کہ ان کی شعر و ادب کے خمیر سے بنی ہے۔ انکی ہلکی پھلکی عادت میں بھی ان کے علم و شعور کی کارفرمائی ہے۔ ان کے عام اخلاق میں ان کی مجموعی شخصیت کا پرتو ہے۔ جس کے پیچھے علم و ہنر و فن کی پوری تاریخ ہمیں ملتی ہے۔ لہذا یہ کہنا یا سمجھنا درست نہیں ہے کہ اختر اورینوی کی فنی آئیڈیالوجی کا اچھی طرح جائزہ لئے بغیر ان کی سیرت و خصلت پر کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے ان کی علمی بصیرت کو نہیں پہچانا وہ اُن کے عام اخلاق و کردار کا اندازہ کیا لگائے گا۔ وہ کیونکر یہ سمجھے گا کہ گورے چٹے، وجیہہ و شکیل اور دراز قد اختر صاحب کیوں اور کن معنوں میں اہم ہیں۔

میں ان کا شاگرد بھی نہیں۔ میں پٹنے میں بھی نہیں۔ میں اُن کے روزانہ کے ملنے والے احباب میں بھی نہیں۔ اگر میں ان کا شاگرد ہوتا۔ اگر میں پٹنہ میں ہوتا۔ اگر میں ان سے روزانہ ملاقات کر سکتا، تو ممکن تھا کہ میں ان کی زندگی کے کسی پہلو کا مطالعہ پیش کر سکتا مگر ایسا ہے نہیں۔ ویسے ادبی دنیا پر یہ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ڈاکٹر اختر اورینوی کا ادبی معیار کتنا بلند ہے۔ اور وہ برصغیر ہند و پاک کی سربرآوردہ علمی و ادبی شخصیتوں میں کس ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ اہل الرائے اس بات پر متفق ہیں کہ اردو ادب میں جدید افسانہ نگاری کی بنیاد رکھنے والوں میں سے وہ ایک ہیں اور اپنی فنی بصیرت کی وجہ سے تخلیق و تنقید دونوں میدانوں میں اپنا لوہا بہت پہلے منوا چکے ہیں۔

میرے اندازے کے مطابق اختر صاحب کی دیگر خصوصیات یہ ہیں کہ ان کی زندگی میں بلا کا توازن ہے۔ انہوں نے اپنے لئے جو راہیں بنائی ہیں ان میں آپ کو بمشکل نشیب و فراز ملیں گے۔ وہ فطرتاً متوازن، اور خوش ذوق واقع ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو کھردرا یا تاریک نہیں۔ ان کی خلوت و جلوت دونوں ان کی اپنی روشنی سے منور ہیں۔ ان کی زندگی میں انتشار نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ جس کا ثبوت ان کی رہائش گاہ کے سجے سجائے نفیس کمرے ہیں۔ ان کی قیام گاہ ایک چھوٹا سا آئینہ خانہ ہے۔ اور یہ اسلئے ہے کہ ان کی ذات خود آئینے کی طرح صاف و شفاف ہے۔ بیشتر ادیب و شاعر و نقاد باعتبار فکر و فن اور بہ لحاظ درک و شعور اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں جھانک کر دیکھئے تو بجائے حسن و نفاست اور آراستگی کے آلائشیں نظر آئیں گی۔ اس طرح کے ادباء شعراء، اپنے آپ پر کچھ مصنوعی کیفیات طاری کر لیتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر دیوانہ بنتے ہیں۔ چاک در چاک پیرہن زیب کرتے ہیں تاکہ دنیا انہیں بڑے فنکار کا رتبہ دے سکے۔ وہ اپنے گھروں کے ماحول کو ایک پل کے لئے بھی آراستہ و پیراستہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ شیو بڑھی ہے تو بڑھی رہے۔ قمیص کا کالر پھٹا ہے تو ان کی بلا سے۔ آستینوں پر میل کی تہیں جم گئی ہیں تو جمی رہیں۔ وہ اپنے ہر انداز سے خود کو بے نیاز و بے پروا رکھنے ہی میں اپنی عظمت کا راز مضمر پاتے ہیں۔ ایسے فنکاروں کی منتشر و بے پروا اور گندگی سے ملوث زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اندر جمالیاتی ذوق و حس کا فقدان ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کو حسن و نفاست و تنظیم سے قریب تر لانے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ جن کے اندر خوش ذوقی و نفاست پسندی کی کمی ہوتی ہے، مجھے ان کے مذاق جمال پر شبہ ہوتا ہے۔ اور میں ان کے فنی شہ پاروں کی خوبصورتی کو فرضی و قیاسی تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ جن پر انہیں ناز و غرور ہوتا ہے۔ بغیر نکھرے ہوئے مذاق جمال کے وجدانی و حسی کیفیتیں دلوں میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ امر میرے لئے تعجب خیز ہے۔ عشقیہ جذبات ذوق جمالیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں تو انسان کی طبیعت عشق کی طرف مائل ہوتی ہے۔ رنگ و بو سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے۔ انسان کسی حسین شے سے عشق کرتا ہے اور چونکہ وہ حسین شے سے عشق کرتا ہے اسلئے اسکو پانے کی خاطر خود اپنی زندگی کو حسین بنانے کی کوشش کرتا ہے، اپنے آپ کو سنوارتا ہے تاکہ اسکی ذات دوسروں کے لئے خصوصاً اسکی مطلوبہ شے کے لئے کشش کا باعث بن جائے اور وہ اس سے محبت کرنے لگے۔ چنانچہ میرے نزدیک

وہ فنکار جو خود بھی آراستہ و پیراستہ، متوازن، پرکشش اور پسندیدہ صفات والے ہوتے ہیں۔ وہ سارے انسانی معاشرہ و ماحول کو نشاطِ روح کا پیغام دیتے ہیں۔ سماج ان کی زندگی کے حُسن سے حُسن اور ان کی مسرت سے مسرت حاصل کرتا ہے۔ ان کے ذاتی نشاط و انبساط پورے معاشرے کے لئے نشاط آفریں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی میری نظروں میں ایسے ہی نقاد و فنکار ہیں جنکی خوش وضعی اور جن کے کردار کی شادابی و تابناکی، جن کا حُسنِ سلوک، جن کی آواز کی سحر آفرینی، جنکا دل موہ لینے والا اخلاق اور جن کی محبت کرنے کی صلاحیت ہمیں نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ ہمارے دلوں میں ان جیسا بننے کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تخم ریزی کرتی ہیں۔

چند باتیں اور عرض کرنے سے رہگئی ہیں وہ یہ کہ اختر صاحب بڑے ہی بے دار اور نڈر واقع ہوئے ہیں۔ ان کے ضمیر کی قوت بے اندازہ ہے۔ وہ پبلک جلسوں سے لیکر نجی محفلوں تک تمام ہی حق بات کا اعلان بڑی بے باکی و بے جگری سے اور اونچی آواز میں کرنے کے عادی ہیں۔ گورنر موجود ہوں یا وزیر اعلیٰ، مگر وہ اپنے ضمیر اور دل کی آواز بلند آہنگ اور پُر زور الفاظ میں لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں گے۔ گذشتہ سال دسمبر کی بات ہے۔ ضلع چھپرہ (بہار) میں ملک کے مشہور سیاسی رہنما مولانا مظہر الحق کی یادگار بڑے دھوم دھام سے منائی جارہی تھی۔ ہندوستان بھر سے مشاہیر اردو ادب نے یوم مظہر الحق کے عظیم الشان جلسہ میں شرکت کی تھی۔ فراق، سردار جعفری، نشور واحدی، رضا ابن فیضی کے علاوہ حضرات اختر احمد اورینوی، رضا نقوی واہی، وفا ملک پوری، قمر اعظم ہاشمی، شہاب شمسی، طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر مظفر حمیدی اور رمز عظیم آبادی اس ادبی اجتماع میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ کلکتہ سے راقم الحروف کو اور گوہاٹی سے برادرِ محترم جناب مظہر امام کو مدعو کیا گیا تھا۔ گورنر بہار اور جناب عبدالقیوم انصاری کے علاوہ دیگر اعلیٰ حکام ریاست بھی جلسہ میں موجود تھے۔ ہجوم غفیر تھا۔ اسی موقعہ پر اختر اورینوی نے ہزاروں کی بھیڑ میں پُر زور تقریر کی اور گونجنے والی آواز میں حقائق کا کھل کر اظہار کیا۔ اسی قسم کے اور بھی کئی مواقع ایسے گذرے ہیں جہاں موصوف نے بے خوف و خطر ہو کر اُردو تہذیب کی حمایت کی ہے اور جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے اردو ادب کے مفکرین اور سیاسی بصیرت رکھنے والے مجاہدین کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز اقلیت کے دردناک مسائل کیطرف اکثریت و حکومت کی توجہات مبذول کرانے میں اپنے ضمیر کی پوری قوت سے کام لیا ہے۔

اختر صاحب احمدیہ جماعت کے ایک فرد ہیں اور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کی دکھائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں۔ وہ ایک سچے مسلمان ہیں۔ اسلام کے بنیادی قوانین کے پابند ہیں اور قرآن حکیم پر ایمان رکھتے ہیں۔ مذہب اسلام کے عالمگیر مُفید عام اصولوں کے قائل ہیں۔ وہ بڑی حد تک ان اصولوں پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ان کا دماغی سانچہ مذہبی ہے۔ مگر وہ مذہب کو عقل کی روشنی میں دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ مذہبی واہموں سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ مذہب کو زندگی کے ہر شعبہ میں رواں دواں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن واہموں اور عقیدوں کے ساتھ نہیں مادی اور دنیاوی فروغ کے ساتھ۔ ان کا مطالعہ اشتراکیت بھی بہت گہرا ہے۔ سُنا ہے وہ کسی زمانے میں اشتراکی تھے۔ (دروغ بر گردن راوی) ایک بار میں ان کے ہمراہ چھجو باغ سے رکشہ پر بیٹھ کر پٹنہ سیٹی حضرت رازؔ عظیم آبادی مرحوم کی مجلسِ چہلم میں شریک ہونے کو چلا۔ راہ میں گفتگو اشتراکیت اور مذہبی نظام کی نکل آئی۔ اختر صاحب کے نظریۂ حیات سے میں اس دن بڑی حد تک واقف ہوا۔ انہوں نے دورانِ گفتگو یہ ذہن نشین کرا دیا کہ ان کا مطالعہ اشتراکیت بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا اسلامی نظامِ حیات کا۔ ان کی بات چیت سے یہ بات کھل کر میرے سامنے آگئی کہ وہ مذہب اسلام کے دل سے شیدائی ہیں۔ اور اسکی ترویج و اشاعت کے کوشاں اور خواہاں ہیں۔ بہرحال، وہ کس نظریۂ تمدن کو پسند کرتے ہیں اور

(باقی صفحہ ۱۶۳ پر)

نذر امام

ڈاکٹر اختر اورینوی

اورینوی ہیں، اختر ہیں۔ اور ڈاکٹر ہیں۔

مریضوں کے معالج کے ڈاکٹر نہیں، تمام امراض کے ماہر — جو
سلفا ادویہ، پنسلین، اسٹریپٹو مائی سین یا ٹیٹرا سائیکلین سے نہیں۔
جو چھری، قینچی، ریڈیم یا ایکس ریز سے نہیں —— بلکہ
زبان کی مٹھاس سے
قلم کی نوک سے
سچائی کے پرچار سے
بیمار اور نڈھال کو بہلاتے اور اٹھاتے ہیں،
روگ اور گھاؤ کو چھوتے اور دھوتے ہیں،
احساس اور شعور کو جگاتے اور جلاتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی

استاد ہیں، نقاد ہیں —— مقرر ہیں، مفکر ہیں —— افسانہ نگار ہیں، ماہر گفتار ہیں —— قدیم ہیں، جدید ہیں —— طویل ہیں، شکیل ہیں

(شکیل صرف اس لئے نہیں کہ ان کی بیگم شکیلہ ہیں!)

شکیلہ اختر

برصغیر پاک و ہند کی مشہور خاتون افسانہ نگار ہیں۔ جو
آپریشن روم کی فضاؤں سے
ہسپتال کے وارڈ کے کرداروں سے
لیڈی ڈاکٹر اور نرسنگ سسٹر کے ڈھکے چھپے جذبات سے
اپنی کہانیوں کے پلاٹ بناتی ہیں —— اور
ٹرانس فیوژن سیٹ کی بوتل سے لہو کی بوندوں کو
اپنے کرداروں کی شریانوں میں بھرتی ہیں اور ان میں حیات کی بجلی
دوڑاتی ہیں —— سچ ہے!

"ذرہ ذرہ را کشد" —— "ادیب ادیب را می کشد"

اختر اورینوی کی کشش نے شکیلہ اختر کو —— اور —— شکیلہ اختر کی کشش —— نے اختر اورینوی کو ایک دوسرے کا شریک حیات بنا ڈالا

۱۹۳۹ء کا سال ہے —— جولائی کا مہینہ ہے —— سنیچر کا دن ہے
دوپہر کا وقت ہے —— سائنس کالج کی عمارت ہے —— فزکس
کیمسٹری اور میتھ میٹکس کے تھیوری اور ——
لیبوریٹری سے دور —— اردو کلاس میں ——

کم و بیش چالیس طلبا جمع ہو رہے ہیں! اپنے پروفیسر کے انتظار میں "کھل جا سم سم" کی طرح کالج کے گھنٹے کی ٹن ٹن "ٹن ٹن" بجتی ہے —— اور

جگر کی غزل سے زیادہ حسین اور حسرت کی نظم سے کچھ کم البیلا ایک شخص ——

ٹوپی، شیروانی اور پینٹ میں ملبوس

ناپ تول کر قدم رکھتے ہوئے کلاس میں داخل ہوتا ہے —— اور ایک بلند اور صاف و شفاف "السلام علیکم" کی آواز کسی گٹار کی پہلی چوٹ کی طرح اٹھتی ہے اور فضا میں گونج جاتی ہے پھر ایک خاص "اختری تبسم" کسی ملک پیما قوس و قزح کی طرح پھیلتا ہے اور ماحول میں بکھر جاتا ہے۔

حاضری لی جاتی ہے اور سب کو سالم پاکر

"بہت خوب! مرحبا!!" کی داد دی جاتی ہے —— اور پھر

نہایت صاف صاف اور منہ اجلے لفظوں اور جملوں کے ساتھ ایک تمہیدی لکچر شروع ہوتا ہے:

حضرات! آپ میں سے اکثر کو تقریباً کوفت سی ہوتی ہوگی کہ سائنسی دائرے میں اردو کی کیا ضرورت ہے! ... یقیناً یہ مسئلہ میں نے نہیں شروع کیا اور نہ گڑھ لیا ہے۔ آپ کے دارالعلوم کے بہت عظیم اور جہاں دیدہ ایجوکیشنسٹس نے بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد اس کا فیصلہ کیا ہوگا اور میں ان کے اس فیصلہ سے سو فیصدی متفق ہوں۔

کلیتاً میرا اس پر ایمان ہے کہ جس طالب علم کو اپنی مادری زبان پر مہارت نہیں حاصل ہوگی وہ دوسری زبانوں میں بھی یقیناً کورا اور لودا رہ جائے گا ... اگر آپ کی مادری زبان اردو نہ ہے تو اس سے صحیح معنوں میں آشنا ہوئیے ... اور پھر آپ کو انگلش، فرینچ، لیٹن یا جرمن زبانیں جاننے میں قرینے سے زیادہ آسانی ہوگی اس لئے کہ یہی وہ زبانیں ہیں جو سائنسی خزانوں میں آپ کے لئے ترقی کے باب کھولیں گی ..."

اس کے بعد —— دو برسوں تک، تقریباً ہر سنیچر کی دوپہر کو سرسید کے کارنامے، ڈاکٹر اقبال کے اشعار، کرشن کی بانسری رادھا کا رقص، رام کا ایمان، گیتا کی پاکدامنی، عیسیٰ کا پیغام، محمدؐ کی رہبری، انسانیت کی بلندی، قومیت کی گرمی، سائنس کی خدمات، ادب کے رجحانات، غرضکہ ——

متفرق عنوانوں، بابوں اور شعبوں کی شمعیں جلتی رہیں اور پروانوں اور پتنگوں کے دل و دماغ کو زندگی ملتی ہے اور زندگی کی روشنی پھیلتی جاتی ہے۔

کلاس کے بعد ——

پھر وہی مسکراہٹ، وہی شانتی اور سلامتی کی دعا— اور پھر پھونک پھونک کر قدموں کو ایک بھاری قافیہ اور ہلکی ردیف کی طرح اٹھاتے اور گراتے یہ "بھگوان سمان انسان" نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

۱۹۴۳ء کا سال ہے، دسمبر کا مہینہ ہے، جمعرات کا دن ہے، شام کا وقت ہے۔ میڈیکل کالج کے طویل و وسیع ہال میں، طلبا کا ہجوم ہے اور شہریوں کا اجتماع ہے۔

پیغمبر اسلام کے یوم ولادت باسعادت کی خوشی میں محفل میلاد منعقد ہے۔ ریش دراز مولوی "قدیمیت" کے راگ الاپ رہے تھے۔ ٹائی پوش صاحب "جدیدیت" کے رنگ بکھر رہے ہیں۔ اور پھر وہی انسان کھڑا ہوتا ہے اور مائک پر اس کے الفاظ و طرز بیان سے قدیمیت اور جدیدیت کے درمیان کی خلیج پر ایک پل بن جاتا ہے حبیب خدا کے فقر و قناعت، صبر و استقلال، مساوات و یکجہتی ایثار و ثابت قدمی کے مسلسل و متواتر اور دلچسپ و دل نشین تذکروں سے سامعین کو پتہ چلتا ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ عالمگیر تمدن کسے کہتے ہیں؟؟ اور عظیم انسان کردار کون سا ہے؟؟

دوران تقریر اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ

"میں کبھی اسی الما میٹر کا ایک بدنصیب طالب علم رہ

چکا ہوں۔ بدنصیب اس لئے کہ آیا تھا معالج بننے اور بن گیا۔ مریض اور تعلیم مکمل نہ کرسکا ... اور آج زندگی کے کسی اور ہی شعبہ میں اپنی زندگی گذار رہا ہوں ....."

(بڑے خوش نصیب ہیں آپ اختر اورینوی جو "یہ" ڈاکٹر نہیں بنے اور "وہ" ڈاکٹر بن گئے۔ ایم بی بی ایس یا ایم ڈی، ایم ایس کا "گاؤن" نہ پہنا اور ڈی لٹ کا گراؤن پا لیا!)

۱۹۴۷ء کا سال ہے۔ جنوری کا مہینہ ہے، اتوار کا دن ہے شام کا وقت ہے۔ لیڈی اسٹیفنسن ہال میں ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے تین ایکٹ کا ایک ڈرامہ

"شیطان اور انسان"

ڈاکٹر مبارک نواب کی ہدایت کاری ہے، ڈاکٹر ایس ایم گھوشال اور ڈاکٹر ٹی این سیٹھ کا انتظام ہے۔

ایک عجیب ڈرامہ جس میں کوئی کہانی نہیں پھر بھی — کئی کہانیوں کی ایک مسلسل کہانی ہے۔

آغاز دنیا سے لیکر دور حاضر تک کی چلتی پھرتی جھلکیاں شیطان کا آدم کی اولاد کو شکست دینے کا تہیہ، گوتم، رام اور سلام کے کارناموں کی پیش کش۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنس کا انعقاد۔ ہٹلر، مسولینی کے عروج اور پھر زوال کا تماشہ ہندوستان کی سیاسی بیداریوں کا منظر، ہندو مسلم فسادات کا پس منظر، اور آخر میں خود شیطان کا اقبال جرم اور بے بسی کی موت!

ہرہر مہادیو ہر گھامی — اوم منی پدمے اوم — اللہ اکبر۔ بھارت اکھنڈ رہے گا! — لیکے رہیں گے پاکستان!! نیشنس آف دی ورلڈ یونائیٹ

ان سب کے تاثرات کو ڈرامائی شکلوں میں پیش کیا جاتا ہے اور ڈرامہ دیکھنے والوں کے لئے یہ ایک تجربہ کی مثال بن جاتا ہے۔

جو زندگی میں بار بار قیام پذیر نہیں ہوتا۔

یہ پہلے ایک چھوٹے پیمانہ پر پٹنہ کالج کے اردو طلباء نے پیش کیا ہے۔ پھر میڈیکل کالج کے ڈرامیٹک سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر بدرالہدیٰ نے اسٹیج کرایا ہے۔ اور پھر سب سے بڑے پیمانہ پر ڈاکٹر گھوشال اور ڈاکٹر سیٹھ نے ڈاکٹر نواب اور ڈاکٹر امام کی مدد سے لیڈی اسٹیفنسن ہال میں "چیریٹی شو" کے طور پر دکھایا ہے۔ اس ڈرامہ سے تقریباً سترہ سو روپے کی آمدنی سے سرجری کے ضروری سامان خرید کئے گئے ہیں۔

یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اس میں بہتوں نے ہاتھ بٹایا ہے کتنوں نے حصہ لیا ہے — مگر

وہ مرکزی خیال؟

وہ پہلا اشارہ؟؟

وہ اولیں کرن؟؟؟

کس کی پرواز ہے؟ کس کی انگلی ہے؟؟ کس کی ذات ہے؟!

اختر! - اختر اورینوی!! — ڈاکٹر اختر اورینوی!!!

۱۹۴۸ء کا سال ہے، دسمبر کا مہینہ ہے، جمعہ کا دن ہے شام کا وقت ہے۔ یونیورسٹی سنیٹ ہال میں "مردوں" کا مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ہمارے قدیم شعراء کی روحیں بلائی جاتی ہیں۔ اپنے شہر عظیم آباد میں جو پہلے پاٹلی پتر تھا، اور اب پٹنہ ہے۔

اختر اورینوی کے داہنے ہاتھ غلام سرور اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو پٹنہ کالج، بی این کالج، سائنس کالج اور میڈیکل کالج سے جمع کرتے ہیں۔ اختر صاحب اپنے کردار میں ان کی صلاحیت کو جانچتے پرکھتے، ناپتے تولتے ہیں اور مشق و ریہرسل کراتے ہیں — پھر "میک اپ" کے برش، پینٹ اور نقلی بال وہ کمال دکھاتے ہیں کہ سامعین و حاضرین کو، ہوش وحواس اور چشم و گوش رکھتے ہوئے، وقت کی الٹی پرواز

کا احساس نہیں ہوتا۔ اور ان کے سامنے ــــ

شاد عظیم آبادی، رُ اسخ عظیم آبادی، جوشش، آزاد، اختر شوق نیموی، اجاگر چند الفت۔ کلیان سنگھ عاشق۔

اپنے اپنے ڈھنگ سے اور اپنے اپنے رنگ میں اپنا اپنے کلام سُناتے ہیں۔ داد لیتے ہیں اور پھر اپنے اگلے جنم کے پرستاروں اور دلداروں کو دعائیں دیتے ہوئے واپس شہر خموشاں کی راہ لیتے ہیں۔

[غنیمت ہے کہ یہ صرف صوبہ یا ریاست بہار کے قدیم شعراء کی روحیں ہیں ان میں کوئی اکبر الٰہ آبادی نہیں جو سامنے کی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی چند بے پردہ بی بیوں پر نظر پڑتے ہی غیرت قومی سے گڑ جائیں!]

۱۹۷۲ء کا سال ہے۔ اکتوبر کا مہینہ ہے۔ اتوار کا دن ہے صبح کا وقت ہے۔ دریائے گنگا کی لہروں پر جہاز سینوں کے سہارے بڑھتا اور بھاگتا جا رہا ہے۔ جہاز کی بالائی منزل پر تین اشخاص چائے پی رہے ہیں۔ ایک دینی عالم، دوسرے طبی ماہر اور تیسرے خود اختر اورینوی، یوں گفتگو ہوتی ہے:

طبی ماہر ـــ اجازت ہو تو میں آپ لوگوں سے ایک سوال کروں؟

اختر اورینوی ـــ ضرور، شوق سے ـــ ایک ہی کیوں، آپ کئی سوال کر سکتے ہیں، ابھی جہاز کے ساحل سے لگنے میں کافی دیر ہے۔

طبی ماہر ـــ دنیا میں ہر طرح کی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ کیا اسلام کے سبھی طبقوں کی ایک کانفرنس نہیں بلائی جا سکتی؟

اختر اورینوی ـ میں مولانا سے استدعا کروں گا کہ وہ اس پر روشنی ڈالیں۔

دینی عالم۔ بہت ہی نیک خیال ہے۔ ایسی کانفرنس ہو سکتی ہے۔ اور ہوئی بھی ہے ۱۹۱۹ء میں ایسی ایک کانفرنس بلائی گئی تھی۔ مگر تیرہ سو برس کے پرانے تفرقے تیرہ ہزار گنا بڑھ کر نظر آئے۔ اس لئے پھر اس "کارِ نیک" کے لئے ہمیشہ......"

اختر اورینوی۔ (مولانا کے جملے کو مکمل کرتے ہوئے)... استخارہ کی حاجت ہوتی رہی۔

طبی ماہر:ـ (اختر اورینوی سے) آپ سائنس، مذہب اور ادب کے سنگم ہیں۔ میرے دوسرے سوال کا جواب دینے کی آپ تکلیف گوارہ فرمائیں ... مولانا سے پوچھنے کی ہمت نہیں

اختر اورینوی۔ (اپنے خاص تبسم کے ساتھ) ہمارے مولانا ہر بات کو سننے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بہر حال آپ مجھی کو مخاطب سمجھیے۔

طبی ماہر ـ پہلے میں یہ کہتا چلوں کہ میری گفتگو میں "بندر" کے لفظ سے میرا مطلب بندر کے عام محاورے سے نہیں بلکہ زندگی کی ارتقائی منزلوں کی بدلتی ہوئی شکلوں میں سے ایک شکل ہے .... عقیدہ کے مطابق مٹی سے آدم کا پتلا بنا اور پھر زمین پر اترنے کے بعد ان کی اولاد بڑھی۔ اور بائیولوجی کے بموجب آدمی بندر کی ترقی یافتہ نسل سے نکلا ہے۔ اور ....."

اختر اورینوی۔ کہیے، کہیے، رُک کیوں گئے۔ بے لاگ تبصرے میں ہچکچاہٹ کیسی ـــ!

طبی ماہر ـ ان دونوں کے درمیان کیا صلح کی ایک صورت نہیں نکل سکتی کہ آدم کو وہ پہلا شخص مان لیا جائے جو "بندریت" اور "آدمیت" کی کڑی کو جوڑ دے؟

اختر اورینوی۔ (ہنستے ہوئے) اور پھر ہنسی کو روک کر اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے)۔ ممکن ہے۔ ارتقاء کی منزلیں کچھ اسی طور سے اور اسی دور سے گذری ہوں پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے۔ شاید جس آدم کو ہم آدم کہتے ہیں وہ خود کسی اور قبل کے آدمیوں کے بچے بچائے ہوئے ایک فرد ہوں.. اب سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے آدم "بندریت" کے دور سے قبل تھے یا بعد، آج کے آدمیوں کے لئے اس پر کسی اٹل فیصلہ تک پہنچنے کی غالباً صلاحیت نہیں۔ خود خدا سے دریافت کرنا ہوگا اور جب خدا کے ہی کہے پر تسلی کر لینی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۷۴ پر)

عبدالمعز منظر

آئینۂ صد رنگ

چہ باید مرد را طبع بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاکبینے جانِ بیتابے

کسی شخصیت پر اس کی زندگی میں بحث و گفتگو کا جواز اسی وقت نکل سکتا ہے جب لکھنے والے تحسین و آفریں کے ساتھ ساتھ عدل و قسط کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھیں۔ اور اس کے اثرات اور اجتماعی کردار کا بے لاگ جائزہ لینے کی کوشش کریں۔ لوگ مُردوں کے بارے میں تو بڑے بے باک ہو جاتے ہیں۔ مگر زندوں سے بےحد خوف کھاتے ہیں اور ان کی اس روش سے مردے کی بدنامی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اور زندہ دو فریبی میں اس وقت تک مبتلا رہتا ہے۔ جب تک کہ اسے خود کو سنبھالنے یا بدلنے کی مہلت میسر ہے۔

راقم الحروف اختر صاحب سے ایک طالب علم کی حیثیت سے بیس سال پہلے متعارف ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں صوبہ بہار کے مسلم طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد پر اختر صاحب جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اثر انداز ہوئے ہیں شاید کوئی دوسرا استاد نہ ہو سکا ہو۔ بہار کے اس مردم کُش علاقے میں اختر صاحب نے مردم سازی کا کام جس پیمانے پر کیا ہے یہ ان ہی کا حصّہ ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اختر صاحب کے بعض مخصوص عقائد و نظریات ہیں جن سے اتفاق کرنے والے کم ہیں۔ اور اختر صاحب ان مخصوص نظریات کے پُرجوش مبلغ بھی ہیں۔ مگر ان کی شخصیت کچھ ایسی دلنواز ہے کہ نظریات کے بنیادی اختلاف کے باوجود کوئی شخص ان کی ذات سے دور نہیں جا سکتا۔ اپنے ان مخصوص عقائد کی اشاعت کے اہتمام میں وہ بلکہ اس قدر احتیاط برتتے ہیں کہ اجتناب کرنے والے کو ان کی بو بھی نہ لگنے پائے۔ ۱۹۴۶ء کا ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں پٹنہ کالج کے سالِ اوّل میں داخل ہوا اور اختر صاحب سے پہلے پہل اردو کمپوزیشن کے کلاس میں نیاز حاصل ہوا تو انھوں نے غالباً تمام اردو خواں طلبا کے رجحانات کا اندازہ کرنے کی غرض سے ان سے یہ سوال کیا کہ آپ اب تک کن اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ عام طور پر لڑکوں نے کھلونا، دین دنیا، اور بیسویں صدی قسم کے رسائل کا نام لیا۔ جب اخیر میں میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں کوثر، ترجمان القرآن، زندگی، معارف جامعہ اور دوسرے دیکھتا رہا ہوں۔ اختر صاحب نے میری بڑی ہمت افزائی کی اور دوسرے ساتھیوں کو ان جرائد کی طرف بڑی خوبی کے ساتھ متوجہ کیا۔ مگر اسی ابتدائی جائزے ہی کے بعد شاید انھیں میرے رجحانات کا اندازہ ہو گیا۔ اور پھر انھوں نے مجھے کبھی ان نظریات کی طرف نہیں بلایا جن کے وہ پُرجوش مبلغ ہیں۔ ہاں ابوالفضل وغیرہ کا ذکر کبھی کبھار بےساختہ ان کی زبان پر آ جاتا تھا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اختر صاحب کی شخصیت تین اجزا سے مرکب ہے۔ ایک اختر وہ ہے جو سرتاپا ادیب ہے، حُسن پسندی اور رومان پرستی جس کے ضمیر میں داخل ہے۔ حسن جہاں کہیں اور جس روپ میں ہو اختر اس کا ادا شناس ہے۔ گیسو کی طرح اختر کی روح سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں نغموں کا ترنم اور تلاش محسوس کرتی ہے۔ پٹنہ کالج اور یونیورسٹی کے حدود میں ہم اسی جاذبِ توجہ موزوں دست اسپ ادیب اختر کو دیکھ سکتے ہیں۔ نظموں، ناولوں اور افسانوں میں بھی اسی اختر کی جلوہ ریزی نظر آتی ہے۔ (باقی صفحہ ۲۲۰ پر)

شعیب راہی

اختر اورینوی بہ حیثیت مربی

فارسی میں کہاوت ہے، ''مربی بسیار، مربہ کجور'' —
عام طور پر ہم اس محاورے کو طنزاً استعمال کرتے ہیں، لیکن الفاظ
بہ ذاتِ خود کوئی معنی نہیں رکھتے، اصل چیز ان کا استعمال ہے،
ہم طنزیہ لفظوں کو بھی سنجیدہ طور پر استعمال کر سکتے ہیں، اور
سنجیدگی کے معنی دینے والے الفاظ بھی کبھی کبھی اس طرح استعمال
ہو جاتے ہیں کہ ان سے طنز کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے' فارسی کی
یہ مثل بھی یہاں سنجیدہ طور پر استعمال کی گئی ہے، لہٰذا یہ قول
سو فیصدی درست ہے۔

مربی کی تلاش و جستجو کرنی پڑتی ہے، کبھی خود اپنے
اندر ایسی لچک، کشش اور صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ اہلِ کرم
مائل بہ کرم ہو سکیں' — پیاسا خود دریا کے پاس جاتا ہے دریا
پیاسوں کو نہیں ڈھونڈتا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت
ہے کہ ہر ہاتھ دانی نہیں ہوتا، پانی تو ہر بدلی میں ہوتا ہے' مگر
برسنے والی بدلیاں کچھ دوسری ہی ہوتی ہیں — دانی ہاتھوں اور
برسنے والی بدلیوں کی کچھ علامتیں ہوتی ہیں، ان کی کچھ خصوصیتیں ہیں،
جن کی بنا پر وہ دوسرے ہاتھوں اور دوسری بدلیوں میں امتیاز
رکھتی ہیں —

اسی کے پہلو بہ پہلو سائل اور رہروِ منزل کی بھی ضرورت
ہوتی ہے' اگر ایسا نہ ہوتا، تو رحمت کی نمائش کیسے ہوتی' دہر
صرف جلوۂ یکتائی معشوق کے لئے ہی وجود میں نہیں آیا، بلکہ
معشوق کو اپنے کرم و قہر کی جلوہ گری بھی مقصود تھی، یہی سبب
ہے کہ فطرتِ انسانیہ میں دونوں عناصر کا ترکیب موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ربوبیت بھی ہے، اس کے بندوں
میں بھی اس کی صفتیں جلوہ افروز ہیں "مگر جس نے انہیں پہچان
لیا" — اپنے نفس کی ہی معرفت تو اپنے رب کی معرفت ہے۔
مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ — اور اسی معرفت
کے بعد تو بندہ، خصوصاً ذی شعور بندہ، اپنے کو اس کی صفتوں
سے متصف کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے
پردہ غیب سے کسی اشارہ کا منتظر رہتا ہے' اس کی خوشنودی
حاصل کرنے کے لئے اس کے احکام بجا لانے کی کوشش کرتا ہے،
اسی کوشش میں زیادہ غلو، زیادہ انہماک، زیادہ استغراق معرفت
کی بلند منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے لئے دروازے
کھلتا ہے۔

کسی کی پرورش و پرداخت، مجبوروں اور بے کسوں کی
اعانت، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ سلوک، ناداروں
اور فلاکت زدوں کی حاجت روائی، اوصافِ ربانی میں

شمار کئے جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس کے نیک اور صالح بندے بھی اس کی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں۔ ذرّہ آفتاب نہیں ہوتا، مگر اس کی شعاعوں کو پھیلانے میں مدد ضرور دیتا ہے، ذرّے میں چمک آفتاب ہی کی چمک سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے ہم ذرّوں کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے، ہم سب ذرّے ہیں جن کا وجود آفتاب کے وجود سے وابستہ ہے۔ ع

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

حسن کی خود بینی و خود نمائی میں ہمارے وجود کا راز پوشیدہ ہے۔ اختر اورینوی کا شمار بھی انہیں ذرّوں میں ہے، جو آفتاب کی چمک سے منور ہوتے ہیں، جن کا نور اسی نورِ ازلی سے تابندہ ہے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

وہ جس کو چاہے نوازے، کیونکہ دینے والا تو سبھی کو دیتا ہے، یہ لینے والے کے ظرف و طلب پر منحصر ہے کہ وہ دینے والے سے زیادہ سے زیادہ کتنا لے سکتا ہے۔

جب میں ۱۹۶۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، وہ میرے لئے انتہائی عسرت کا زمانہ تھا، (اگرچہ فارغ البالی آج بھی نہیں ہے) والد صاحب قبلہ (حضرت مولانا سید محمد ایوب نسیم ندوی) نے اختر صاحب کے متعلق لکھا تھا:۔

"اختر صاحب قبلہ کی عنایتیں بھی اسی خدائے رحیم و کریم کی صفتِ رحم و کرم کی غمازی کرتی ہیں، خدا کے ساتھ ساتھ خدا کے ان نیک بندوں کا بھی انسان ممنونِ کرم ہوتا ہے، جو اس کے الطاف و اکرام کا باعث و ذریعہ ہوتے ہیں، میں ان کا بیحد ممنون ہوں"۔

مگر ہر شخص رحیم و کریم نہیں ہوتا، تا وقتیکہ وہ کریم اسے نہ نوازے، رحم و کرم کا جذبہ بھی اسی رحیم و کریم کا عطیہ ہوتا ہے، یہاں بڑھ کر ہاتھ میں مینا اٹھانے سے بات نہیں بنتی کہ وہ جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، جس کو چاہتا ہے ذلت بخشتا ہے۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ۔ اگر ایسا نہیں ہوتا، تو کچھ لوگ جہنم کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا ہی کیوں کئے جاتے۔ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں وہ نوازتا ہے اور جن میں اس کی صفتیں پائی جاتی ہیں۔ جو سب سے بڑا صفت والا ہے، اور بلاشبہ اختر اورینوی میں اس کی شانِ ربوبیت جلوہ گر ہے۔

اختر صاحب کو ایک مربی کی حیثیت میں جانچنا میرے بس کی بات نہ تھی، مگر اسے میرے ہی بس میں دے دیا گیا، گویا ایک ذرے سے ضیائے آفتاب پر دلیل طلب کی گئی ہے،

مجھے زیادہ سے زیادہ دو سال، وہ بھی طالب علم کی حیثیت میں، ان کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل رہا، اس قلیل عرصہ میں میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، ان سب کو تو قلم بند بھی نہیں کیا جا سکتا، ہاں میرے موضوع سے جو چیزیں تعلق رکھتی ہیں انہیں پیش کرنے کی کوشش کروں گا، لیکن یہ میرے بالکل ذاتی تجربے ہوں گے، البتہ اگر اپنے پر اہلِ دہر کا قیاس کیجئے تو میرے تجربے آپ کے تجربے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہاں تو ایک دریا رواں ہے، کوئی ہے جو مائل بہ کرم ہے، اگر آپ دستِ سوال دراز نہیں کر سکتے، تو نگاہوں میں التجائیں تو ضرور پیدا کرنی ہوں گی، اور میں تو مجسم سوال تھا، سراپا التجا۔

اختر صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی، جب جی ال اے کالج ڈالٹین گنج میں ہم لوگوں نے بزمِ ادب کا سالانہ جلسہ کیا تھا، اور اس موقع پر انہیں یہاں قدم رنجہ فرمانے کی زحمت دی گئی تھی۔ بس وہی دو چار گھنٹے کی ان سے دید و شنید رہی، اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں جب میں نے ایم اے میں داخلہ لینے کی غرض سے ان سے ملاقات کی تو میں ان کے حافظہ میں موجود تھا، یہ ان کے عظیم ہونے کی دلیل ہے، ورنہ ہم جیسے ہیچ مداں کو کون یاد رکھتا ہے۔

میرے والد محترم یہاں ایک مقامی غیر سرکاری اسکول میں ہیڈ مولوی ہیں۔ ایک ہیڈ مولوی کے لئے اپنے لڑکے کو پٹنہ میں رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلانی ایک خواب ہے، یہ خواب کس طرح پورا ہوا، اگر اسے لکھنے بیٹھوں تو یہ رام کہانی ہو جائے گی، جس میں آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ملے گی۔ یہاں حصول علم میں جو عملی رکاوٹیں تھیں، ان میں سب سے اہم میرا افلاس تھا۔ میں محنت سے نہیں بھاگتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ محنت کا معقول معاوضہ آج بھی نہیں ملتا، میں پٹنہ میں رہ کر اپنی تعلیم کے سلسلہ میں جو محنت اور جفاکشی کرتا تھا۔ اس کے عوض مجھے پیسے بہت کم ملا کرتے تھے، عام طور پر لوگوں کی ذہنیت سرمایہ دارانہ تھی — عموماً غریب اور ضرورت مند طلبہ کے لئے آمدنی کا ذریعہ ٹیوشن ہے، پٹنہ میں بھی یہی ذریعہ آسان اور کارآمد ہے۔ اختر صاحب، غریب اور ضرورت مند اور محنتی طلبہ سے بالخصوص محبت رکھتے ہیں، ان کی ہمت افزائی کے جتنے طریقے بھی ہو سکتے ہیں، سب برتتے ہیں، عملی معاونت بھی اور زبانی ہمدردیاں بھی۔ شکست خوردگی اور پست ہمتی کا کتنا ہی گہرا احساس کیوں نہ ہو، اختر صاحب سے گفتگو کر کے اٹھئے تو ایسا محسوس ہوگا، آپ کے سارے مسائل حل ہو چکے، اور اب زندگی کے نئے راستوں پر قدم رکھ رہے ہیں، وہ اپنے ضرورت مند طلبہ کے لئے ٹیوشنوں کا بندوبست کرتے ہیں، وزراء سے وظائف دلواتے ہیں، چانسلر اور وائس چانسلر کے یہاں بھیجی جانے والی درخواستوں پر پرزور سفارشیں لکھتے ہیں۔ اسکالرشپ کا انتظام کرتے ہیں، ہوسٹل میں رہنے کے لئے جگہ دلواتے ہیں۔ اس طرح ان کی حیثیت صرف ایک معلم کی نہیں، بلکہ ایک مربی کی ہے، ایک باپ کی ہے، جو اپنی تمام اولادوں کی تعلیم و تربیت، قیام و طعام اور تکلیف و آرام کا یکساں خیال رکھتا ہے، یہ مربیانہ جذبہ، یہ پدرانہ شفقت ان کے دل کا گداز ظاہر کرتی ہے، —— وہ بے حد نازک مزاج ہیں، لیکن آج تک میں نے انہیں برہم نہیں دیکھا، اپنی اس لطافت مزاجی اور نفاست طبعی کے باوجود اپنے گرد پھیلی ہوئی ہم جیسی کثافتوں سے کبھی بیزار نہیں ہوتے، اسی دیار میں بعض لوگ بہت نازک مزاج مشہور ہیں، انہیں طلبہ کی لغزشوں پر طیش آتا ہے، ان کی مفلسی پر رحم نہیں آتا —— اختر صاحب طلبہ کی مزاج داری کرتے ہیں، جبکہ طلبہ کا اکثر وقت بعض نازک مزاج اساتذہ کی ناز برداریوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ طلبہ کا دل ہاتھوں میں رکھنا کوئی اختر صاحب سے سیکھے۔

غالباً ۱۹۵۹ء میں، میں اقبال ہوسٹل ہی میں تھا کہ بیمار پڑ گیا، سردیاں شروع ہو چکی تھیں، بخار سے کسی طرح نجات ملی تو کھانسی نے دھر دبایا —— اُن دنوں دو جگہوں میں ٹیوشن کرتا تھا۔ خیال ہوا، اگر زیادہ دنوں بیمار رہا، تو یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ نہ جائے، اسی طرح کھانسی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر بھی جانا شروع کیا، اور کلاس بھی کرنے لگا۔ ٹیوشن کا پیسہ ملنے میں ابھی بیس دنوں کی دیر تھی، کھانسی اتنی شدید کہ کلاس میں بیٹھنا دشوار۔ اگرچہ وہاں سبھی اساتذہ موجود تھے، مگر کھانسی کے علاج کے لئے مجھے پیسہ اختر صاحب ہی نے دیا۔ خود ہی دوا بھی بتائی، اس طرح مجھے دس دنوں میں کھانسی سے نجات ملی، چنانچہ جب مجھے کھانسی ہوتی ہے تو وہ دوا آج بھی استعمال کرتا ہوں۔

اقبال ہوسٹل ہی میں مجھے جگہ بھی انہیں کی سفارش سے ملی تھی۔ ورنہ مجھ جیسے مفلوک الحال کی رسائی کا وہاں سوال ہی کیا تھا۔ حالانکہ ہوسٹل مفلوک الحال ہی کے لئے ہے، مگر اس سے فائدہ زیادہ تر مُرفّہ الحال اٹھاتے ہیں۔ جیسے ہسپتال غربا کیلئے کھولے جاتے ہیں، مگر فیض یاب امراء ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ زیادہ اونچائی تک انہیں کی رسائی ہے، —— اختر صاحب کا یہ کرم صرف مجھ تک ہی محدود نہیں، میں نے قبل ہی عرض کیا ہے کہ ایک دریا ہے جو رواں ہے، اب یہ تشنہ لبوں پر منحصر ہے کہ سیراب ہوں یا تشنہ رہیں، — میں دیکھ رہا تھا کہ ڈالٹین گنج سے ایک صاحب اور (احمد نبی) داخلہ کے لئے پہنچے۔ سب سے اہم

سوال قیام کا تھا۔ اقبال ہوسٹل میں ان کو جگہ نہ مل سکی، تو انصاری ہوسٹل میں ان کے لئے نظم کیا گیا، یہ نظم بھی اختر صاحب ہی کی بدولت اور ان کی سفارش سے ہوا۔

اختر صاحب طلبہ کے ہر دکھ درد میں شریک رہتے ہیں، میں جن دنوں اقبال ہوسٹل میں تھا، عبدالمغنی صاحب بھی وہیں تھے۔ ایک دفعہ انہیں سخت قسم کا ملیریا ہوا، اختر صاحب کو خبر ملی، تو اقبال ہوسٹل ان کی عیادت کے لئے پہنچے۔ اقبال ہوسٹل، شعبۂ اردو (پٹنہ یونیورسٹی) سے بہت نزدیک ہے، مگر دیگر اساتذہ اسی قدر نزدیک ہوتے ہوئے شاید اس کا احساس بھی نہ کر سکے — وہ طلبہ جو دور دراز علاقوں سے خاک چھانتے ہوئے، تعلیم حاصل کرنے پٹنہ پہنچتے ہیں، اختر صاحب کی ذات ان کے لئے ایک شجر سایہ دار ہے۔

مجھے اختر صاحب کی قیام گاہ پر گرمیوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، اور سردیوں میں بھی، کبھی اپنی ضرورتوں کے لئے کبھی خود انہوں نے اپنے کام کے لئے مجھے طلب کیا، اکثر مئی جون کی دوپہر میں نے ان کے دولت خانہ پر گذاری ہے، اسی طرح سردیوں میں بھی اکثر نو دس بجے رات کو ان کے یہاں سے لوٹتا تھا۔ میں جب تک پٹنہ میں رہا، انہوں نے رسالوں اور کتابوں کے لئے بہت کم مضامین اپنے ہاتھ سے لکھے، اپنے کمرہ میں، اپنی صاف ستھری مسہری پر لیٹ کر وہ زبانی مضمون بولا کرتے، اور میں لکھا کرتا، جب بھی ایسا موقع ہوتا، نہ صرف یہ کہ کھانا اور ناشتہ اپنے ساتھ کراتے، بلکہ مجھے آنے جانے کا رکشہ کا کرایہ بھی دیتے تھے — اپنی طالب علمی کے زمانہ میں میرے پاس اتنا پیسہ ہی نہ تھا کہ رکشہ یا بس کا سفر کرتا، اس بات سے اختر صاحب بھی واقف تھے، ان کے ہاتھ سے لئے ہوئے کرایے کے پیسے سے میں نے کبھی رکشہ کی سواری نہ کی بلکہ ان سے اپنی دوسری ضرورتیں پوری کیں، اس راز سے بھی اختر صاحب آگاہ تھے، مگر انہوں نے اپنے رویہ میں کوئی فرق نہ آنے دیا، ان کے نزدیک سلوک کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ وہ اپنے ضرورت مند شاگردوں کی مختلف طریقوں سے نجی طور پر مدد کرتے ہیں، بہت سے دوسرے طریقے بھی ہیں، جو رازِ درونِ میخانہ ہیں، انہیں راز ہی رہنے دیجئے تو بہتر ہے،

پٹنہ میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے دفتر میں آفس سکریٹری کی حیثیت سے تیس روپے ماہانہ پر ایک جگہ ملی تھی، میں نے اختر صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے بخوشی وہاں کام کرنے کی اجازت دے دی، اکثر دریافت کیا کہ وہاں سے پیسے ملنے میں دقت تو نہیں ہوتی — وہ اپنے شاگردوں کی ضرورتوں پر ہمیشہ نگاہ رکھتے ہیں، اور ان کی حاجت روائی کی مختلف صورتیں نکالتے رہتے ہیں۔ ایم اے کی تیاری کے سلسلہ میں جب میں آتش لکھنوی پر کام کر رہا تھا، تو اپنے مقالہ کی تیاری کے لئے مجھے تقریباً دو ڈھائی سو روپیوں کی ضرورت تھی، میں نے اس کا ذکر اختر صاحب سے کیا تو کچھ فکرمند ہوئے، کہنے لگے، چلو عبدالقیوم انصاری صاحب کے پاس چلتے ہیں، انصاری صاحب ان دنوں بہار ریاستی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیر تک باتیں ہوئیں، انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا، مگر شاید ان کے پاس اس سلسلہ کا کوئی فنڈ نہیں تھا۔ بعد کو اختر صاحب ہی نے کچھ دوسری صورتیں ایسی نکالیں کہ میری ضرورت پوری ہو گئی۔ ورنہ اتنی بڑی رقم کا انتظام تو ان دنوں میرے لئے ایک خواب تھا، اور آج بھی شاید اس خواب کی تعبیر مجھے معلوم نہیں ہو سکتی۔

اختر صاحب کا یہ سلوک، یہ ہمدردانہ رویہ، ان کے دل کا یہ گداز صرف طلبہ تک ہی محدود نہیں، ان کے دل میں ان تمام لوگوں کے لئے ہمدردی ہے، محبت کا جذبہ ہے، نیک خواہش ہے، جن سے ان کے تعلقات ہیں۔ ابھی حضرت جوہر شمسی بہت علیل ہوئے، ان کی علالت کے بعد جب مجھ سے اختر صاحب کی ملاقات ہوتی، تو نہایت تشویشناک انداز میں ان کی خیریت دریافت کی، اور کافی دیر تک ان کی علالت، علاج اور صحت کے متعلق حالات معلوم کرتے رہے، اور انتہائی دل دوز انداز میں کہنے لگے کہ جوہر صاحب

(باقی صفحہ ۱۶۳ پر)

محمد لطف الرحمٰن

پئے نافہ ہائے رمیدہ بُو

غالب نے کتنے پتے کی بات کہی ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی پر اتنی گہری اور حقیقت پسند تنقید ہے یہ کہ اس کے بعد ہستی و نیستی پر غور و فکر لاحاصل ہے۔ جب دیوانے کا خواب ہی ٹھہری یہ زندگی تو کوئی کیا سوچے سمجھے اور کیا کسی کو سمجھائے ـــ اسکے باوجود میں نے مذہب کے نظریات و افکار سے بوڑھے جب کبھی طلسم سحر و شام کی الجھی ہوئی ڈور سلجھانے کی کوشش کی تو یہی بات سمجھ میں آئی کہ کائنات کے تمام افسانے حیات کا دارومدار دراصل حادثات و اتفاقات (chances and circumstances) پر مبنی ہے۔ آپ بھی اگر اسکو کچھ دیر کے لئے تسلیم کر لیں تو پھر یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ حادثات و اتفاقات کے کھیل میں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جرم کسی کا ہو اور سزا کسی کو ملے۔ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فرد کے جرم کا خمیازہ ایک پوری قوم کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور چند افراد کی ناعاقبت اندیشیوں، لغزشوں اور کوتاہیوں کا خون بہا کتنی آئندہ نسلیں ادا کرتے رہنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ معاملہ یہاں بھی کچھ ایسا ہی درپیش ہے۔ میرا جرم بس اتنا ہے کہ کچھ اوپر تین سال ادھر سے میں ڈاکٹر اختر اورینوی کے اسم گرامی کے پہلے لفظ استاذی کا اضافہ کرنے پر اخلاقاً اور تہذیباً مجبور ہوں۔ کیونکہ سعادتمندی کا تقاضہ بھی کچھ یہی ہے۔ اور اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر مضمون بھی ہے۔ چنانچہ اب اسے پڑھئے اور یہ الفاظ دیگر میرے اس ایک اتفاقی لیکن قابل فخر جرم کی سزا آپ اٹھائیے۔

استاذ موصوف کے متعلق اگر میں اپنے تمام تر مشاہدات و تجربات، تصورات و جذبات کو رقم کرنے بیٹھوں تو اس کے لئے دفتر کا دفتر ناکافی ہو۔ اس لئے یہاں کہیں کہیں سے ان کے متعلق کچھ دیدہ اور کچھ شنیدہ باتیں پیش کر دونگا۔ ممکن ہے اسمیں بہت زیادہ ربط و تسلسل نہ ہو۔ پھر بھی ایک باطنی ربط و تعلق ان میں ضرور ہو گا۔ دوسری صورت میں بھی مجھے یہ تسلیم ہے کہ ؎

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت ز گیسوے او پریشاں گفت

بہر حال استاذی ڈاکٹر اختر اورینوی سے میرا رشتہ ربط و تلمذ تین سال کچھ ماہ اور چند دنوں کا ہے۔ ان ایام میں میں نے انہیں مختلف ہیئت و اسلوب میں دیکھا ہے، مختلف کہانیوں اور داستانوں میں سنا ہے اور مختلف افسانوں اور ناولوں کے روپ میں پڑھا بھی ہے۔ لیکن مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کی افتاد طبیعت کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے کہ میرے جیسے طالب علم صرف دور کا جلوہ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی ان سے ایک دو بار مل لے تو انکے فرط خلوص و انداز شفقت سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیگا کہ انہوں نے اسے اپنا خلوت خاص دراز دار صادق بنا لیا ہے۔ اس غلط فہمی میں انکے اکثر احباب شاگرد اور ملاقاتی ہیں۔ حالانکہ یہ ان کا ایک عام انداز ہے۔ لیکن اسے کیا کہئے کہ جو بھی ان سے ملا انکے پیکان خلوص کا شکار ہو کر لوٹا اور ان کی سادگی و شفقت کا بسمل ہو کر عجیب شخصیت ہے ان کی بھی۔ فقیری میں امیری اور گدائی میں شہنشہی کا تصور یہیں حقیقت کا اظہار لئے ملتا ہے ؎

آں نغزگر بہ تیغ صد کشور دل گیرد

از شوکت دارا بہ از فر فریدوں بہ

مختصر یہ کہ جیسا عنوان سے ظاہر ہے میں اپنے انہی گم گشتہ رواحل رسیدہ
ایام کی بازیافت میں نکلا ہوں جو مجھ سے انسان کی مجبوریوں اور بے بسیوں
کی داستانیں کہہ گئے۔ کوئی لاکھ کوشش کرے ماضی تصورات میں تو منتقل ہو سکتا
ہو سکتا ہے۔ لیکن واپس نہیں آسکتا۔ پھر بھی انسان مختار ہے۔ عجیب بات ہے۔
بہرحال ماضی کسی کا بھی ہو بڑا دلکش اور بڑا ارمان انگیز ہوتا ہے۔ آپ بھی کچھ
دیر کیلئے میرے ساتھ ان دوشیزہ یادوں کی دنیا کی طرف چلیں جدھر جذبہ بے اختیار
شوق مجھے لے جا رہا ہے۔ وہ گزرے ہوئے لمحات میرے لئے سرمایہ حیات و نقد دل
و جاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہ جیالے ہیں ان لمحوں کے تذکرے وہ جلوے
بہ مجھے بڑا اندوختہ ہے۔ گرچہ یہ جذبہ بھی قرادیت یا دوسرے لفظوں میں رومانیت
کے عناصر اپنے سینے میں رکھتا ہے اس لئے کہ یہ دونوں ایک طرح سے لازم و ملزوم
ہیں ———!

بہرحال! وہ ۱۹۶۱ء کے ماہ جولائی کا کوئی خوش نصیب دن تھا میں
استاذی اختر اورینوی کے چیمبر میں ایم۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا
اور میں بہت سے دوست تھے، جنمیں سے اکثر وقت کی طرح بے وفائی کر گئے۔
اور اب تو بس ان کی یادیں ہی یادیں رہ گئی ہیں۔ سو وہ بھی کیا؟ — بہ نیند دیر
اور وحشت خوسے —

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی

یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

ہاں! تو روم میں داخل ہوتے ہی نگاہوں نے قدم روک لئے۔ پردۂ ذہن
پہ خاکے ابھرے۔ ایک شکیل و وجیہ ہستی دیدہ زیب لباس میں ایک طرف
رکھی ہوئی آرام کرسی پہ فروکش تھی۔ کلین شیو گندمی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں
جو چشمے کی چلمن سے جھانک رہی تھیں۔ لمبی ناک، چوڑی پیشانی، پروقار چہرہ
اور اس پر متانت و سنجیدگی کی فضا ہی اور دلکش مجاذبہ۔ قدرے سپید قدرے
سیاہ بال جیسے صبح و شام گلے مل رہی ہو۔ اور اتنی ساری خصوصیات سے مرصع وہ
محترم ہستی جس کی اپنائیت سے ہم تمام نو گرفتاروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ سب لوگ
اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ کمرہ خوشی اور سکوت کی علامت بن گیا۔ مدتوں پہلے کہ
سانسوں کی آہٹیں بھی معدوم ہو گئیں۔ چند لمحے گزرے اور تب وہ ہستی ایک ملاحت
آمیز ادا سے اٹھی اور میز سے اس طرف رکھی ہوئی کرسی پہ جلوہ افروز ہوئی اور یہی تھی
وہ عظیم شخصیت جسے ہم اور آپ اختر اورینوی کے نام سے جانتے ہیں۔ قدرے ٹھہر کر
انہوں نے ہمیں مخاطب کیا اور ہمارا اتا پتہ پوچھنا شروع کیا — "آپ کہاں سے
آئے؟ کیا آنرز کے طالب علم تھے؟ کون سا کلاس حاصل کیا؟ ہابی کیا ہے؟
اور اسی طرح کے دوسرے سوالات! انداز اتنا مشفقانہ اور مربیانہ تھا کہ سہمے
ہوئے دلوں میں جسارت و جرات پیدا ہوئی۔ طلبا بے تکلف ہونے لگے۔ اور
اجنبیت کے توہمات اسوقت چاک چاک ہو گئے جب ہمارے ایک ہم درس شرف عالم
ملک نے فرمایا "اپنی ہابی کرکٹ کھیلنے کو بتائی۔ طلبا کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اختر
صاحب بھی بہت محظوظ ہوئے۔ دیر تک مسکراتے رہے اور اس شوخی پر اپنی
پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ ان کے اس طرز عمل نے ہم تمام لوگوں کے دلوں میں انکی
بے پناہ عظمت و عقیدت پیدا کر دی ———

بادلیں جلوہ اتاذ دلبا، میدہد صبر دگر انت طاقت

یہ تھی استاذ موصوف سے میری پہلی دید و شنید۔ اسکے پہلے میں انہیں جانتا
بھی نہ تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر ادب کا طالب علم نہیں تھا۔ لیکن حادثات حیات نے
کو کیا کہیے مجھی تر اعتزاز ہاشمی کے مشورے اور اصرار پر میں نے بی۔ اے میں اردو آنرز
لے لیا۔ ونت کالج اندنوں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اسمیں آنرز کی تعلیم کا کوئی انتظام
بھی نہ تھا، پڑھنے کیلئے۔ جب اس مرحلہ سے گزرا تو ایم۔ اے میں داخلہ کے بعد
زندگی جان کے ساتھ لگ گیا اور ادب جس سے میں ہمیشہ گریز پا رہتا تھا۔ اب
اسی کی گلیوں کی خاک چھاننے پر مجبور ہو گیا۔

خیر تو وقت لمحوں کا جنازہ اٹھائے گزرتا رہا۔ شام ڈھلتی رہی اور صبح
آرزو تمناؤں کے ساحل سے ماضی کے سمندر میں غرقاب ہوتی رہی۔ اس
درمیان میری نظریں استاذ مکرم کے ہر ترے خارجی و داخلی رجحانات سے روشنی
ہوتی رہیں۔ میں نے ہر حال میں انہیں ایک عظیم و برتر انسان پایا۔ یوں تو پٹنہ یونیورسٹی
کا شعبہ اردو ہمیشہ روز نگار کا مرکز ہے۔ اہل دل و صاحب بصیرت اساتذہ
کرام کی موجودگی نے اسے منبع علم و ادب اور چشمۂ عرفان و آگہی بنا دیا ہے۔ لیکن
ان تمام قابل فخر ہستیوں میں اختر اورینوی کی شخصیت نسبتاً زیادہ نمایاں اور
زیادہ تابندہ و درخشندہ ہے۔ بالخصوص طلبا کی دلجوئی، اور ہمت افزائی میں

کوئی ان کا ثانی نہیں۔ انہوں نے طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کی تربیت و پرورش میں بڑا زبردست حصہ لیا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کلاس کے اختتام کے بعد انہوں نے طلبا سے انکی افرادی تخلیقی کاوشوں کے سنانے کی فرمائش کی ہے۔ ہم میں سے جو شعر و سخن کے مارے ہوئے تھے، ان سے ان کی نظمیں اور غزلیں سنتے رہے ہیں ساتھ ہی اپنے مفید مشوروں سے نوازتے بھی رہے، یہاں جنہیں افسانہ نگاری و مقالہ نویسی کا ذوق رہا ہے انکی بھی ہمت افزائی کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی نیا ذوق کام دینے سے بھی سرشار کرتے رہے ہیں۔ بسا اوقات ہم لوگ خود بھی ایسے سنہری مواقع تلاش کر لیتے۔ کبھی کبھی کلاس کے اختتام کے بعد ہم لوگ وہیں بیٹھے رہ جاتے۔ اور استاذ محترم کسی اور کام میں مشغول ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر بعد جب ہمیں وہیں بیٹھے پاتے تو چونک کر دریافت کرتے "آپ لوگ گئے نہیں، کیا کچھ کہنا ہے؟" ادھر ہم سے کوئی دبی زبان سے اپنی خواہش کا اظہار یوں کرتا "کلاس آج قدرے تاخیر سے ختم ہوا۔ تازہ دم ہونے کی مہلت نہیں اس لئے دوسرے کلاس کے انتظار میں بیٹھے گئے۔ وہ ہمارا مقصد سمجھ جاتے۔ فوراً ہیرالال (شعبہ کا چپراسی) کو آواز دیتے اور اس کو چائے اور ناشتہ لانے کا حکم دیتے اور پھر شعر و سخن کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایسے پروگرام میں بالعموم غنی صدیقی ترنم ضیغم کا باجی تابیا میر ایرج ظفر الحق بڑی دلچسپی اور انہماک سے اس شرارت آمیز پروگرام میں ہمارے ساتھ دیتے۔ کبھی بھی ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات جلوہ گر ہوتے نہیں دیکھے۔ ایسے شفیق و کریم استاذ کی دوسری مثال شاید ہی مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ ایک استاذ میرزا فرحت اللہ بیگ بھی تھے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے ؎

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

اسمیں شک نہیں کہ ایسی شخصیتیں بھی نادر روزگار ہوتی ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ اہم شخصیتیں وہ ہوتی ہیں جو خود انجمن آفریں ہوں لیکن ایسے لوگ قرنوں میں کہیں خاک کے پردے سے نکلتے ہیں۔ اختر اورینوی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے جو اپنی ذات سے صرف ایک انجمن ہی نہیں بلکہ انجمن آفریں بھی ہے۔ بیدل نے ایسے ہی آدمیوں کے لئے کہا ہے ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

بیک وقت ایک نازک خیال شاعر، ایک اولی درجہ کا افسانہ نگار، ایک کامیاب ڈرامہ نویس، ایک بہترین ناول نگار اور ایک عظیم نقاد مل کر اختر اورینوی کی ادبی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ ادب کی ہر صنف میں نہایت پختہ کاری و چابکدستی کے ساتھ انہوں نے اپنی روشنیٔ طبع کی لازوال کرنیں پھیلائی ہیں۔ کم ہی ایسے خوش نصیب ہونگے جنہوں نے اتنی گوناگوں اور وسیع پیمانے پر اس قدر کامیابی کے ساتھ ادب و فن کی خدمت کی ہو۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ انکی سب سے بڑی صفت ایک شفیق اور کامیاب پروفیسر کی ہی ہے۔

وہ نہایت ہی اچھے خطیب بھی ہیں۔ انکی خطابت میں وہ زور، وہ جوش اور روانی ہوتی ہے کہ جب وہ سرگرم تقریر ہوتے ہیں تو سامع دنیا کی تمام رنگینیوں سے بے نیاز ہو کر انکے ترشے ہوئے ادبی جملوں کی لہروں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسکی خواہش یہی ہوتی ہے کہ بولنے والا یونہی کانوں میں رس گھولتا رہے۔ اکثر فارغ شدہ طلبا دور دور سے صرف انکا لکچر سننے کی تمنا لیکر آتے رہے ہیں۔ اور ذہن و دل کو ان کی بے پناہ تقریر کی لذت سے ہمکنار کرتے رہے ہیں۔ ؎

زہے چمن ساز جمع ذوق تبسم لعل مہر جویت
زبوئے گل تا نوائے بلبل فدائے تمہید گفتگویت

مختصر یہ ہے کہ اختر اورینوی صاحب کو ایک مرکزیت حاصل ہے۔ وہ جس بزم میں، جس محفل میں چلے جائیں گے بس چھا کر رہ جائیں گے۔ دوسرے تمام لوگوں کی انفرادیتیں، ان کی انفرادیت کے سامنے بے بس جھکنے لگتی ہیں۔ یہی رونق بزم و شمع محفل وہ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ادبی انجمن ہو یا مذہبی جلسہ یا سیاسی اجتماع، جہاں دیکھئے بلبل کی طرح چہکتے اور پھولوں کی طرح مہکتے نظر آئینگے۔ اور مخاطب خواہ واحد ہو یا مجمع ہمہ تن گوش نظر آئیگا۔ آپ انہیں یکہ و تنہا شاید ہی کبھی دیکھ سکیں۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لوگ پروانہ وار ان کے گرد نظر آئینگے۔ وہ جہاں رہتے ہیں وہاں کا عالم یہ ہوتا ہے ؎

نشہ با شادابِ رنگ و ساز با مستِ طرب
شیشہ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے۔

وہ اپنے طلبا کو آزادی رائے کے اظہار کی پوری اجازت دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ جمہوریت کے علمبرداروں میں ہیں۔ چنانچہ ان کے کلاس میں کوئی طالب علم کسی بھی ادبی مسئلے پر کھل کر تنقید و تبصرہ

کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں ان کے ٹیوٹوریل کلاسوں میں بحث و مباحثہ کے درمیان
حد سے گذر جاتا۔ یعنی ادب کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ تھا کہ اردو ادب دنیا
میں تنہا originality (اصالت) یا انفرادیت اور جدت طبع کی بڑی کمی
ہے۔ کوئی ادب کا ایسا نہیں جسکے سوچنے کا انداز بالکل اپنا ہو۔ سب ایک
دوسرے کے چبائے ہوئے لقمے چبا رہے ہیں۔ یا دوسروں کی جیب سے سکے چرا
رہے ہیں یا پرائی مہریں لگا کر پیش کر رہے ہیں ۔۔۔ ایک وجہ یہ بھی تھا کہ
اردو کے ادیب و شاعر فارسی ادبیات کی خوشہ چینی کو طرۂ امتیاز سمجھتے تھے
ایک وجہ یہ ہے کہ انگریزی ادبیات کی پیروی قابل احترام سمجھی جاتی ہے
ذہن اس وقت بھی غلام تھا آج بھی ہے۔ اسلئے اگر مجموعی طور پر اردو
ادب کا بغائر مطالعہ کیجئے تو کیا افسانے کیا ناول، کیا تنقید اور کیا شاعری،
تمام اصناف ادب میں آپ کو کھلی ہوئی دھاندلی نظر آئیگی۔ اسلئے اپنے
تنقیدی مقالات میں بہت ہی سخت انداز نظر اور درشت لہجہ اختیار
کرتا تھا۔ چنانچہ اختر استاذ محترم بڑے شیریں اور میٹھی لہجہ میں مجھے اس
انداز تنقید سے بچنے کی تلقین کرتے اور فرماتے ۔۔۔ "ادب کا تعمیری
رجحان ہی قابل داد و تحسین ہوتا ہے۔ انتہا پسندی بری چیز ہے۔ ایسے بچے
آپ کا رجحان آئندہ ادب کے لئے بہت نقصان دہ ہوگا۔" ان کی اس گفتگو کا
انداز بھی اتنا شیریں اور دلکش ہوتا کہ جیسے شگفتہ گل بائے ناز سے تعبیر
کیجئے تو بیجا نہ ہوگا۔

وہ خفا ہونا نہیں جانتے۔ طلبا ایک سے ایک شرارت کر گذرتے،
لیکن وہ ہمیشہ نظر انداز کر جاتے۔ کبھی میں نے ان کے چہرے پر غیظ و غضب
کے آثار نہیں دیکھے۔ غصہ کیا شے ہے وہ اس سے شاید واقف نہیں۔
میری طالب علمی کا ایک دفعہ ایسا بھی گذرا ہے جب میں اور چند دوست ہمیشہ
اس کوشش میں رہتے کہ انہیں کسی طرح غصہ دلایا جائے۔ تاکہ ان کے بگڑنے کا انداز
بھی دیکھنے میں آئے۔ اور اس مقصد کی برآوری کے لئے ہم نے طرح طرح کی شوخیاں
کیں۔ بلکہ اکثر گستاخیاں تک حدود میں داخل ہوگئے۔ لیکن ہمیں اپنے مقصد میں
ناکامی ہوئی۔ وہ اس معاملہ میں بالکل چکنا گھڑا ثابت ہوئے۔ کوئی کتنی ہی
بد عنوانی کر جائے ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اسلئے طلباء ان
کے مقابلہ میں زیادہ شوخ رہتے ہیں پہلے تو میں ان سے قطعی خوف نہیں
کھاتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اب ان کی خفگی کے تصور سے جی گھبراتا ہے
پھر یہ کہ اتنے بھولے بھالے آدمی کو رنجیدہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی ۔۔۔!

اختر صاحب بہت ہی زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی ہیں ہمیشہ زعفران
زار بنے رہتے ہیں۔ اپنے خادموں کے عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے ہیں
اصل نام کسی کا اسمٰعیل ہے لیکن اوتھیلو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کسی کا نام
کچھ اور ہے لیکن اب عرفیت حرامزادہ ہو گئی ہے۔ ادھر اختر صاحب
نے پکارا ۔۔۔ ابے او حرامزادے، ادھر آیا اور ادھر حرامزادہ موجود
کسی نوکر سے خفا بھی اور بگڑتے ہیں۔ کشتی کی اصلاح یا مارتے ملتے
منٹ بنا دینگے۔ اور ازاں قبیل ان کی شگفتہ مزاجی ایک مثال دیکھئے۔
شعبہ اردو کا کلرک ٹھاکر تھا۔ ایک تو وہ پان بہت کھاتا تھا اسلئے
ہر آدھ گھنٹے پر آفس سے غائب ہو جاتا۔ دوسرے اسکی بہت ساری
اور بھی مشغولیات تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ شعبہ کا بہت سا کام پیچھے پڑ جاتا
اختر صاحب بہت سمجھاتے۔ کبھی تنبیہ و وعید سے کام لیتے۔ لیکن وہ
کتے کی دم کے روایتی محاورہ کو سچ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ آخرش ایک دن
ٹیوٹوریل کلاس میں انہوں نے ہم لوگوں سے کہا۔ بھئی میں اس ٹھاکر بابو
سے عاجز آگیا ہوں۔ آئندہ ٹیوٹوریل میں آپ لوگ ایک انشائیہ لکھئے
جسکا عنوان ہو ٹھاکر بابو یا اسی عنوان پر نظمیں لکھئے۔ آئندہ کلاس میں
نے انکو اسی عنوان کے تحت ایک نظم سنائی بہت خوش ہوئے اور دیر
تک لطف اندوز ہوتے رہے۔ جیسے ٹھاکر کی غلطیوں کی سزا اسے مل گئی ہو
حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ایک لمحہ میں ٹھاکر بابو ٹھیک ہو جاتے۔ لیکن وہ اسکے
خلاف تحریری کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایسے کہ اسکی زندگی کا سوال
تھا۔ اور اختر صاحب سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن کسی کو نقصان نہیں پہونچا سکتے
کسی کی زندگی سے نہیں کھیل سکتے۔

اختر صاحب کی گھریلو زندگی بڑی قابل رشک مسرور اور بڑی
مثالی ہے۔ خصوصاً شکیلہ اختر صاحبہ کی نفاست پسندی اور حسن تدبر سے
گھر دلکش جنت نظر آتا ہے۔ باہر کا صحن رنگ برنگ کے تازہ سرسبز و شاداب
پھولوں سے گلزار ارم بنا ہوا ہے۔ کمرہ کا صفائی اور ستھرائی سے آئینہ خانہ،
ڈرائنگ روم میں بے داغ ملائم کپڑے کی جوگ وکیل سے ہوئے کتابیں بڑی نزاکت

سے الماریوں میں سجی ہوتیں۔ غرض یہ ہے کہ ہر چیز سلیقے اور قرینے سے اپنی
اپنی جگہ پر ان تمام نفاست و نزاکت میں محترمہ شکیلہ اختر صاحبہ کا ہاتھ
زیادہ سے بھی کچھ زیادہ ہی رہتا ہے۔ وہ صرف اول درجے کی ایک افسانہ نگار ہی
نہیں بلکہ مشرقی خاتون ہونے کے ناطے امورِ خانہ داری سے بھی اچھی طرح واقف
ہیں۔ بالخصوص کھانا تو بہت ہی اچھا بناتی ہیں۔ میں کئی بار ان کے بنائے ہوئے
کھانوں سے لطف اندوز ہونے کی خوش نصیبی حاصل کر چکا ہوں۔ چائے بھی
اتنا عمدہ تیار کرتی ہیں کہ پٹنہ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اختر صاحب کے یہاں جا کر
بھی اگر کوئی چائے سے محروم رہا تو اسے بلا تامل بدنصیبوں میں شمار کیجئے۔ لیکن
ان تمام خصوصیات کے باوجود ایک "نقصے" کی کمی جس نے ایک
تمام رنگینیوں پر قدرے سوگواری کے اثرات مرتسم کر دئیے ہیں۔ یہ کمی اولاد کی ہے۔
جو اکثر ان دونوں کو مغموم و متوحش کر دیتی ہے۔ یوں تو ان کا مکان بچوں کے
نغموں سے گونجتا رہتا ہے لیکن یہ بچے اختر صاحب یا شکیلہ صاحبہ کے عزیزوں
اور رشتہ داروں کے ہی بچے ہیں۔ جن سے بلا شبہ یہ دونوں بہت پیار اور محبت کرتے ہیں۔ پھر
بھی محبت کا فطری تقاضہ اپنی تکمیل کے لئے شرمندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی
کبھی اختر صاحب کی گلنار آنکھوں میں بیاباں کے دیپ جل اٹھتے ہیں۔
لیکن اختر اورینوی صاحب کی زندہ دلی و شگفتگی اور شکیلہ اختر صاحبہ کے
خلوص نفاست و سلیقہ مندی کی وجہ سے گھر گوشۂ جنت بنا رہتا ہے۔

میں اختر صاحب کی افتادِ طبع کی دو خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا
ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی چیز تو ان کا ذوقِ جمال ہے۔ وہ حسن و جمال کے شیدائی
بلکہ حقیقی پرستار بھی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حسن و جمال کی تلاش و جستجو
کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خیال حسن میں حسن عمل کا خیال رہتا ہے۔ وہ اٹھنے بیٹھنے
کے طریقوں میں گفتگو میں لباس و پوشاک میں چلنے پھرنے میں غرض یہ کہ گفتار و کردار
کی تمام اداؤں میں دلکش و دلآویز اظہارات و عبارات کے قائل ہیں۔ یہی نہیں
دوسروں سے بھی کچھ ایسی ہی توقع رکھتے ہیں۔ ایک حسین شے جتنا جلدی ان کو
متاثر کر سکتی ہے، دنیا کی دوسری کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ ایک طرح
سے آپ اسے ان کی کمزوری بھی سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ کمزوری بھی قابلِ ستائش
ہے کیونکہ اللہ جمیل و یحب الجمال۔ ان کی فطرت کی اس مخصوص کیفیت
کا بہت ہی نمایاں عکس ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔ ان کی افتاد
میں قاری ان کی اس افتادِ طبع کے اثرات کا بہت آسانی سے اندازہ کر سکتا
ہے وہ حسن کی کیفیتوں کا ذکر کرتے وقت جس قدر جذبہ احساس سے سرشار
ہو جاتے ہیں۔ اور حالات میں کم ہوتے ہیں یہی وہ نفسیاتی اثر ہے جو ان کے
فن میں ہر جگہ جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اسلوب نگارش کی سادگی، صفائی
اور دوامی طور پر رچ بس گئے ہیں۔ اس لئے ان کے فن کا جائزہ لینے سے پہلے ان کی
فطرت اور نفسیاتی افتاد کا تجزیہ میرے خیال میں بہت ضروری ہے۔ ورنہ ان
فن کے سارے حجابات کو ناقد چاک نہیں کر سکتا۔ دوسری اہم خصوصیت
ان کی میانہ روی ہے۔ وہ زندگی کے تمام معاملات میں میانہ روی کے قائل
ہیں۔ انتہا پسندی سے ہمیشہ بچتے رہے ہیں۔ گو کہ اس کی وجہ سے وہ اکثر دوسروں
کے لئے تکلیف دہ بھی بنتے رہے ہیں اپنے آپ کو نقصان بھی پہنچاتے رہے ہیں
اور دوسرے ان سے شاکی بھی رہے ہیں لیکن وہ اپنی اس روش خاص سے
نہیں ہٹے۔ دراصل وہ آدمی جن کی آنکھوں میں حد سے زیادہ مروت ہو۔ وہ کسی
بھی شخص کی بات آسانی سے نہیں اٹھا سکتا۔ ایسے آدمی کی زندگی کشمکش
کا شکار ہو جاتی ہے۔ اختر صاحب کی یہی بڑی کمزوری ہے۔ حد سے بڑھا ہوا
اخلاق اور انتہا سے زیادہ مروت نے انہیں میانہ روی کی زندگی گذارنے پر مجبور
کر دیا۔ ان کو اس کا احساس خود بھی ہے۔ ایک بار پروفیسر مظفر پور اقبال صاحب
اور میں ان کی خدمت میں حاضر تھے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ
میں زندگی اور ادب دونوں میں میانہ روی کا قائل ہوں۔ ان کی اس بات
پر میں نے عرض کیا کہ یہ تو کھلا تضاد ہوئی۔ لیکن انہوں نے میری بات کو ایک
زبردست قہقہہ میں اڑا دیا۔ بہرحال! یہ ایک بین حقیقت ہے کہ ان کے
نظریاتِ فن میں یہ رجحان جیسے ہر جگہ کار فرما ہے۔ اپنی تخلیقات میں
ان کا انداز بہت ہی معتدل اور متوازن ہوتا ہے۔ انتہا پسندی کہیں
نہیں ملتی حد تو یہ ہے کہ وہ جذباتی انتہا پسندی سے بھی خود کو محفوظ رکھتے ہیں
درحقیقت بڑے حساس اور سنجیدہ ذہن آدمی ہیں۔ ان کی ان خصوصیات کا اندازہ مجھے
اس وقت ہوا جب ان کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا۔ ان کی شفقت ہمدردی کا قائل تو میں
پہلے ہی سے تھا۔ لیکن جب مولانا مظہر الحق میموریل ٹرسٹ کے آل انڈیا مشاعرہ میں
شرکت کی غرض سے بھاگلپور گئے۔ اور دو تین ایام ساتھ ہی رہے تو ان کو قدرے
قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پٹنہ سے

سے جانے والوں میں اختر صاحب، رضا نقوی واہی، رضا کریم صاحب ہولش
عظیم آبادی، قمر اعظم ہاشمی اور میں ایک ساتھ چلے تھے۔ ان تین دنوں
میں بار بار انہیں ہمارے آرام و اطمینان کی فکر رہی۔ جیسے ہم لوگ انکے مہمان
ہوں۔ دوسری بار سمستی پور کے مشاعرے میں ہم لوگ ساتھ چلے۔ اس
قافلہ میں اختر صاحب، رضا نقوی واہی، رضا کریم صاحب اور میں تھا۔
ہم لوگ ٹیکسی سے روانہ ہوئے۔ لیکن سمستی پور پہنچتے پہنچتے ہم لوگوں
کے جسم کا عضو عضو ڈھیلا ہو گیا۔ لیکن اس حال میں بھی اختر صاحب
کو ہم لوگوں کے تھکن کی زیادہ فکر تھی۔ اس سے انکی ہمدردی اور
شفقت کے ساتھ ساتھ انکی قوت احساس اور بیدار ذہنی کا ثبوت
ملتا ہے۔

اختر صاحب اپنی خفگی کا اظہار بھی جلد نہیں ہونے دیتے۔
چنانچہ چند ایام کی بات ہے انہوں نے استاذی ڈاکٹر ممتاز احمد
لکچرر شعبۂ اردو پٹنہ کالج کی موجودگی میں مجھ سے ایک نافرمانی کی
بنا پر اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ یقین مانئے اس لمحہ سے قبل مجھے اس کا
گمان بھی نہیں تھا کہ استاذی اختر صاحب مجھ سے رنج ہونگے۔
واقعہ یوں ہے کہ ہمارے چند ماہ قبل ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ جس
کا عنوان تھا۔ جمیل مظہری کے ساتھ دو سال۔ اسی میں میں نے ایماندارانہ
طور پر استاذی مکرم جمیل مظہری کے متعلق اپنے مشاہدات و محسوسات کو
قلمبند کر دیا۔ لیکن اسکی اشاعت کے بعد کچھ ہمعصروں اور بعض بہی خواہوں نے
میرے خلاف انکے کان بھر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمیل مظہری صاحب مجھ
سے بے طرح خفا ہو گئے۔ اور مختلف لوگوں کے سامنے مجھ سے اپنی ناراضگی
کا اظہار کیا۔ اختر اورینوی صاحب سے بھی شکایات کر بیٹھے۔ اختر صاحب
نے مجھ سے فرمایا کہ جمیل صاحب تم سے کچھ خفا ہیں۔ ان سے معافی مانگ
لو۔ لیکن میں اسلئے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ میں یہ سوچتا تھا کہ اگر کوئی میرے
متعلق غلط یا [illegible] والے تمام لوگ مجھ سے ناراض ہو جائے تو مجھے اپنی
صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ جمیل صاحب نے خود میرے مضمون
کو نہیں پڑھا بلکہ دوسروں کی عینک سے دیکھا جنھوں نے اسکے تعبیر و تفسیر
میں بد اندیشیوں کو داد دی اور غلو سے کام لیا۔ میں ایک غلط اور بے بنیاد
الزام اپنے سر کیوں لوں؟ اور فرض کر لیجئے کہ اگر ایسی کوئی سخن گسترانہ
بات ہو بھی جاتی تو یہ کیا طریقہ ہوا کہ کوئی شخص ایک مضمون لکھے اور
بعد ازاں ساری دنیا سے معافی مانگتا پھرے۔ اس لئے میں استاذی
جمیل صاحب کے یہاں بطرف اس مقصد کے تحت جانے سے کتراتا رہا۔
اور اختر صاحب کو اس کا احساس دلایا جاتا رہا۔ وہ مجھے حکم دیتے
رہے اور میں اسے مختلف بہانوں سے ٹالتا رہا۔ الغرض اس دن
انہوں نے اپنی خفگی اور ناراضگی کا اظہار فرمایا تب جا کر مجھے یہ
پتہ چل سکا ورنہ انکے پہلے میرے خواب و خیال میں یہ بھی بات نہیں
تھی کہ وہ خدا نخواستہ مجھ سے رنج ہیں۔

اختر صاحب ازل سے ایک درد مند دل لیکر آئے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں
کی مجبوریوں اور پریشانیوں میں حتی الوسع دستگیری کی کوشش کرتے
ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذوق علم کا مارا ہوا کوئی غریب طالب علم
ایم۔ اے میں داخلہ لیتا ہے۔ لیکن انکے پاس اپنے سلسلہ تعلیم کو
جاری رکھنے کا ذریعہ نہیں۔ اگر اختر صاحب تک یہ بات پہونچ گئی تو
کسی نہ کسی طور پر وہ اسکی امداد ضرور کر دینگے۔ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے
کہ بعض طلبا کے پاس فیس جمع کرنے کی رقم نہیں رہی تو بلا جھجک
استاذ محترم انکے کام آتے رہے ہیں۔ بہت ہی خوشی اور آزادانہ
انداز سے طلبا سے انکی بے پناہ محبت اور شفقت ہمیشہ کیلئے انکے (طلبا)
دلوں میں ایک کسک چھوڑ جاتی ہے۔

وہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کا دل بھی دکھانے سے پرہیز کرتے
ہیں۔ بلکہ ان کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے رنجیدہ و ملول ہوتے ہیں۔
اور ایسے لمحات میں حتی الوسع ان کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہیں
ارشد کاکوی ہمیشہ اختر صاحب کی مخالفت کرتے رہے۔ اور ان کو زک
پہونچانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن گذشتہ سال جب وہ بیمار ہو کر
ڈھاکہ سے پٹنہ پہونچے اور ہوسپیٹل میں بغرض علاج داخل ہوئے
تو اختر صاحب نے اپنے تمام ذرائع انکی صحت یابی کیلئے استعمال
کئے۔ اور کئی بار ان سے ملنے ہوسپیٹل میں تشریف لیگئے۔ حالانکہ
انہیں دنوں ان کا ایک مضمون اختر صاحب کے خلاف منظر عام پر شائع

ہوا تھا۔ جو سنجیدگی و متانت تہذیب و اخلاق کی تمام حدود سے
گذر رہا ہوا تھا۔ ایک طرح سے وہ مضمون نہیں بلکہ دشنام طرازی تھی
لیکن اختر صاحب نے قطعی ان کی اس حرکت بیجا کا خیال نہ کیا اور ان کی
کھوئی ہوئی صحت کی جستجو کیلئے دن رات کوشاں رہے۔ لیکن وہ اپنی
زندگی کے دن کاٹ چکے تھے۔ جانبر نہ ہوسکے۔ اختر صاحب کو انکی
موت سے بڑا صدمہ ہوپہنچا، ایک زبردست دھکا لگا۔ کئی دنوں تک
انکے چہرے پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ وہ انکی موت سے بہت
زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ آج بھی ان کا تذکرہ بڑے درد و الم کے ساتھ
کرتے ہیں۔ یہ انکی وسیع النظری کی ایک زندہ و درخشاں مثال ہے۔

اتنے دنوں کی رسم و راہ میں اختر صاحب مجھ سے کبھی رنجیدہ
خاطر نہیں ہوئے۔ لیکن ایک بار ایک شخص نے انہیں میری طرف سے
بدگمان کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک پراسرار و پر رمز عظیم آبادی شاعر
(جنکا سرمایۂ شاعری صرف چند نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے) میری گرم
بازاری کو دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد جب میں نے اس سے
انکی واپسی کا مطالبہ کیا تو اسکی نزاکت احساس پر یہ چیز بار گراں
ثابت ہوئی۔ اور اس نے انتقاماً استاذ موصوف کو مجھ سے منسوب
کر کے چند ایسی بے بنیاد باتیں کہیں کہ جنکو حقیقت و واقعیت سے
کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ زمانہ میرے فائنل امتحان کا تھا۔ اس کمبخت
نے اپنی جگہ یہ خیال کیا کہ اسکی اس حرکت سے میرے امتحان کے نتیجے
پر کچھ برا اثر پڑیگا۔ حالانکہ استاذ موصوف کے ذہن و قلب کی وسعت
و گہرائی کچھ ادبی صفات کی حامل ہیں۔ وہ ان معمولی باتوں کو اہمیت
نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کی دوربین نظریں زیادہ عظیم و اہم مسائل کے
مشاہدہ و مطالعہ اور پھر انکے نتائج کی کارگزاریوں کے تجزیہ میں
مصروف رہتی ہیں۔ تعجب تو اس سے کہ ان پر اس دروغ بافت کی باتوں
کا کیا ردعمل ہوتا، مجھے اسکی اس مذموم حرکت کا پتہ چل گیا۔ اور
میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں اس کی باتوں کے پس منظر سے
آگاہ کیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ تم خواہ مخواہ پریشان ہوئے
میں بھی اسکی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اسی لئے میں نے
انکی باتوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ مجھے خود انکی باتوں کی
صداقت و حقیقت میں شبہہ تھا، اور اسی گفتگو کے دوران یہ بھی
معلوم ہوا کہ صرف میں ہی اس معاملہ میں اس کا شکار نہیں بنا تھا۔
استاذ مکرم بھی اکثر اس کی مہربانیوں کا ہدف بن چکے تھے۔ وہ
ان سے بھی کئی بار مختلف بہانوں سے روپے وصول کرتا رہا تھا۔
بہرحال! اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی وسیع النظری اور
غور و فکر سے معاملات کے ہر رخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور نتائج
کے استنباط میں کتنی بیداری مغزی اور استدلال ذہنی سے کام لیتے
ہیں۔ چنانچہ انکے اسی طرز فکر کا انداز ان کی تخلیقات میں ہر جگہ
نظر آتا ہے۔ بالخصوص ان کی تنقیدات میں یہ پہلو زیادہ نمایاں
ہیں۔ جو ان کو اردو کے دوسرے ناقدوں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کا حساس دل کسی کو قید غم و الم میں
نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس منظر کو سہار ہی نہیں سکتے۔ انکے دل میں
عام انسانیت کیلئے جتنا درد ہے وہ کم انسانوں میں نظر آتا ہے
وہ عالمگیر انسانیت کی فلاح، اسکی بقا اور ترقی و کامرانی کے
سچے دل سے خواہاں ہیں۔ جب بھی دنیا کے کسی حصے میں ابن آدم
پر کوئی افتاد آتی ہے تو ان کا وجود سراپا انکے احساس سے
لرز اٹھتا ہے۔ ان کی افتاد طبع کی یہ خصوصیت اور یہ رجحان
آپکو انکے افسانوں میں جا بجا نظر آئیگا۔ دوسری جنگ عظیم
اور اسکے مضر اثرات، ہندوستان کی تقسیم اور اسکے زیر اثر پیدا شدہ
قتل و غارتگری کے وہ واقعات جو دونوں سرزمین پر کھیلے گئے اور آجتک
کھیلے جا رہے ہیں، ان تمام انقلابات نے انکے ذہن و دل کو بری
طرح متاثر کیا ہے۔ ابن آدم کی مسلسل مجبوریوں اور بے بسیوں
پر ان کا نرم و نازک دل خون کے آنسو روتا رہا ہے۔ اسی لئے انکے
افسانوں کے بیشتر کردار المیہ ہیں۔ ناول حسرت تعمیر ایک المیہ ہے
ڈرامہ شہنشاہ حبشہ بھی المیہ ہے۔ اسکی وجہ انکی ذکاوت احساس
ہے۔ ایک حساس آدمی خود شرار و شعلہ کی آتش میں کم اپنے
جذبات و احساسات کی آگ میں زیادہ جلتا ہے۔ اختر صاحب

بھی ہمیشہ اس آگ میں جلتے رہے ہیں۔ اور آج بھی جل رہے ہیں۔
کاش کوئی انکی صدا بہار مسکراہٹ کے پیچھے ان غم انگیز کیفیات
کا مطالعہ کر سکتا جنہوں نے ان کے باطن کو دہکتا ہوا انگارہ بنا کر رکھ دیا
ہے اور آنکھوں کے ان طوفان کا احساس کر سکتا جو اندرونِ قلب
ہیجان برپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ اختر ہی صاحب کے دل و جگر کا کرشمہ
ہے کہ غم و الم کی مسلسل اور کڑی دھوپ میں بھی انہوں نے اپنی
شخصیت کو غیر متوازن نہیں ہونے دیا۔ گرچہ انہیں باطنی طور
پر عشق و دار کی بے شمار منزلوں سے گذرنا پڑا ہے۔ آلام و
مصائب کی کتنی صلیبوں کو چومنا پڑا ہے۔ ان کے شیشۂ دل پر رنج
و غم کی مسلسل سنگ باریاں ہوتی رہی ہیں لیکن وہ سب کچھ سہا
گئے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا۔ لیکن انہوں
نے ہمیشہ اپنے ذاتی اور نجی مصائب و آلام پر انسانیت کے دکھ
درد اور نالہ و فریاد کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان کے
ازالہ کی کوشش کی۔ گرچہ اس مرحلہ حیات میں انہوں نے اپنے
آپ پر خود ہی بڑے ستم ڈھائے ہیں۔ بڑا ظلم کیا ہے۔ لیکن
کبھی اپنے ذاتی رنج و غم سے دوسروں کو رنجیدہ نہ کیا۔ اور
نہ اس کا اظہار کسی صورت میں گوارا کیا۔ حالانکہ انہیں ان کے
سے بڑی ہی آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہے۔ اور بڑی قوت ارادی
اور شعوری کاوشوں سے کام لینا پڑا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے
ہیں جو جان بوجھ کر دیوانگی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن دیوانگی کے
تمام تقاضوں کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ یہ
سب کے بس کا روگ نہیں۔ بجا طور پر وہ اپنے متعلق کہہ سکتے
ہیں کہ —

با جنونے در جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

پچھلے سال جب ایک معمولی سی بات پر پاکستان میں فرقہ وارانہ
فساد ہوا اور بقول بعض سیاسی رہنماؤں کے جب اسکے رد عمل کے
طور پر کلکتہ سے لیکر جمشید پور تک انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے اور خون
کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کرنے لگے تو ان کے درد و کرب کا
وہ عالم تھا جس کی تعبیر سے دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ زبان کے الفاظ
و حروف بھی عاجز ہیں۔ جو شخص انسانیت کا پرستار ہو وہ انسانیت
کی یہ توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ ان دنوں ان کا ذہن
و دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ پھر بھی انہوں نے تعقل
و جنون کی کیفیات اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا۔
ہاں انکی بے تابی و بے چینی، الجھے ہوئے بال، بڑھے ہوئے گیسو
سرخ آنکھیں، بھیگی ہوئی پلکیں اور دانتوں کی کپکپاہٹ
پھول سے چہرے پہ باد خزاں کی مردنی پکار پکار کر کہہ رہی تھی
کہ اختر اورینوی کی کتنی راتیں بستر پر کروٹیں بدلتے گذری
ہیں۔ انکی ہمیشہ شگفتہ و شاداب رہنے والی شخصیت کی پژمردہ
ادائیں اس بات کی غماز تھیں ان کا سکون قلب، طمانیت
اور غیر فانی شگفتگی ان سے چھن گئی ہے۔ ان دنوں وہ
سراپا درد و مجسم الم تھے۔ تمام ہیجان و انتشار، مکمل تردد
و فکرات۔ چنانچہ اسی منتشر قلب و ذہن کے ساتھ
وہ ایک چیک کے۔ بی۔ سہائے وزیر اعلیٰ بہار کو سونپ دینے
ان الفاظ کے ساتھ دے رہے تھے۔ اسمیں سے نصف
ان بے وطنوں کیلئے ہے جو اپنے وطن میں بے وطن ہو گئے۔ اور
نصف ان غریب الوطنوں کیلئے جنکو اپنے وطن میں امان
نہ مل سکی۔ اور کے۔ بی۔ سہائے نقش حیرت بنا ہوا اس عظیم
شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ سوچ رہا ہو کہ آج
بھی رام و گوتم کے دیش میں ایسے کردار زندہ و جاوید ہیں
جو ان کے اخلاق و رواداری، اخوت و ہمدردی اور جذبہ
انسانیت پرستی کے ہوتے ہوئے درشنوں کو دہرا سکتے ہیں
بہرحال! اسی انتشاری و ہیجانی کیفیت کا رد عمل تھا
جو انکی تازہ ترین کہانی "محشر کے پیکر میں ڈھل گیا"۔
اس افسانے کو پڑھیئے اور دیکھئے اس کا خالق درد و
کرب کی کن چتاؤں میں جل رہا ہے۔ اور اپنے کن اجل رسیدہ

جذبات و احساسات کی بجلیوں کے فرش پر سونے کے لئے مجبور ہے۔ اس کے
واردات قلبی و کیفیات ذہنی کے اس تجم و پیچ کا پتہ لگائیے جو سعدی کا
یہ مصرعہ دہرانے پر مجبور ہے ؎

آسماں را حق بود گر خوں ۔ بارد بر زمیں

اور اس لئے زہرہ کو خود اس کی آنکھوں سے دیکھئے جس کی تمام
متاع حیات لٹ گئی ہو۔

جو شخص حیات کو از ابتدا تا انتہا حسن و جمال کا پیکر اور کائنات
کو از افق تا بہ افق گل و گلزار دیکھنے کا متمنی ہو، لیکن جس کی آنکھوں کو
نالۂ و فریاد کے بگولے اور اپنی رگوں میں چنگارتے ہوئے زندگی سے بھرپور
تازہ و گرم لہو پر ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی گرد جمتی نظر آئے، اور جو دوستوں
میں بنت مریم کے مقدس حسن کی ارزانی، وفی و جمہور کا دل و درد و جان
گداز سسکیاں، اور چیخیں سننے پر مجبور ہوا کیا اس کے لئے قیامت کا دن
کوئی دوسرا ہوگا۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں مملکت اسلامیہ پاکستان سے لے کر
رام گوتم کی سرزمین ہندوستان تک خاک و خون کے جو اندوہناک
ڈرامے کھیلے گئے، اس نے تمام حساس ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور
اُس کے دیرپا اثرات ذہنوں پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے، لیکن مختصر
یہ خالق پر ایک دور محشر گذر گیا یعنی انہیں درد و کرب کی اس کیفیت میں
اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مختصر یہ کہ اُن کی انسانیت دوستی اور عام انوف و ہمدردی
کی یہ معمولی مثالیں تھیں جنھوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہوگا

وہ جانتے ہوں گے کہ اختر اورینوی کے پیکر میں کتنی حسین و جمیل اور
عظیم و جلیل، کتنی ترد نازک، اور وسیع و عریض شخصیت پنہاں
ہے۔ وہ چشم نگراں بھی رکھتے ہیں اور دلِ بیدار بھی۔ وہ لذت
آہ سحر گاہی سے بھی واقف ہیں اور فغان نیم شبی سے بھی۔ مجھے
کہنے دیجئے کہ اگر اقبال کے مرد کامل کے تصور کو مکمل طور پر کبھی کسی
اسلوب اظہار کی ضرورت پیش آئی تو اُسے کسی اختر اورینوی کی تلاش
کرنا ہوگی۔ اُن کے متعلق ببانگ دہل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

باوجود اختصار کی کوششوں کے مضمون طویل ہو گیا۔ مگر آپ
اس کو ان سے میری عقیدت پر محمول کر سکتے ہیں۔

بحر فے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

مضمون کی طوالت کے بعد بھی مجھے اس کا احساس ہے کہ میں اُن کی
شخصیت کے تمام عناصر کو [illegible] نہیں کر سکا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

سخن اگرچہ دلیر است و مدعا شیریں
سخن ز عشق چہ گویم جز ایں کہ نتواں گفت

بقیہ اختر اورینوی میرے تاثرات

[illegible] بھی بہتیری پریشانیاں اور الجھنیں ہیں۔ جن پر تبسم کا ایک رنگین
لطیف، پرکیف مگر باریک غلاف چڑھا ہوا ہے۔ وہ ایک پرسکون
دریا کی طرح ہیں۔ جس کی تہہ میں سینکڑوں طوفان پوشیدہ ہیں اور
جن کے نشانات سطح پر دکھائی نہیں دیتے ۔

اطہر شیر

یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ بی۔ این کالج پٹنہ میں بزم اردو کے زیرِ اہتمام سالانہ جلسہ اور مشاعرہ تھا۔ میں ان دنوں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کا طالب علم تھا۔ شاعری کا نیا نیا شوق تھا۔ اور نیم سیاسی اور نیم رومانی قسم کی شاعری کرتا تھا۔ شعر کہنے سے زیادہ مشاعرہ میں پڑھنے کا شوق تھا۔ بہار شریف سے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آگیا۔ تقسیم انعامات کے بعد مشاعرہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں پٹنہ کے تقریباً تمام کالج کے طلباء موجود تھے۔ چند لوگوں کے بعد میری باری آئی۔ جیسے نام پکارا گیا مجھے ہلکا سا اختلاج شروع ہوگیا۔ پتہ نہیں میں طلبہ کی اس ہوٹنگ کا مقابلہ کر سکوں گا یا نہیں۔ اس زمانہ میں کسی نوآموز شاعر کے لئے ہوٹنگ سے بچ کر نکل آنا بہت بڑی بات تھی۔ میں نے غزل کا مطلع ترنم سے پڑھا۔ سامنے سے ایک آواز آئی "بہت اچھے" میں نے غور سے دیکھا ایک صاحب جن کی جوانی کی سرحدیں ختم ہو رہی تھیں کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، چشمہ لگائے ہوئے، سیاہ شیروانی میں ڈائس کے بالکل قریب بیٹھے ہوئے داد دے رہے تھے۔ پہلی ہی نظر میں مجھے ان کی شخصیت بڑی باوقار اور کشش انگیز معلوم ہوئی۔ اس وقت وہاں پٹنہ کی ادبی محفلوں کی چیدہ شخصیتیں موجود تھیں۔ باہر کے مہمان بھی تھے۔ لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص سب میں نمایاں ہے۔ جب جذبے کے ساتھ غزل پڑھ کر میں واپس آگیا تو اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ وہ جو ڈائس کے قریب بیٹھے ہیں وہ کون صاحب ہیں؟ "آپ نہیں جانتے؟ اختر اورینوی ہیں" انہوں نے اسطرح کہا جیسے اختر صاحب کو نہ جاننا ایک ادبی جرم ہو۔

"اچھا تو یہی ہیں اختر اورینوی"۔ میں نے دل میں کہا۔

اس سے پہلے اختر صاحب کا میں نے ذکر سنا تھا۔ لوگ بڑے احترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے تھے۔ میں نے رسائل میں ان کی نظمیں دیکھی تھیں۔ ان کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ غالباً کلیاں اور کانٹے بھی پڑھا تھا۔ سوچتا تھا جو شخص اتنی اچھی کہانیاں لکھتا ہے۔ کہانیوں میں اتنی پیاری زبان پیش کرتا ہے اس کی شخصیت کیسی ہوگی؟ کیا میں اس شخص سے مل سکوں گا۔ اور پھر ۱۹۴۹ء

میں جب میں نے پٹنہ کالج میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں ایم اے تک کالج کا طالب علم رہا تو اختر صاحب کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

فرسٹ ایر میں اختر صاحب ہم لوگوں کا اردو کمپوزیشن کا کلاس لیتے تھے۔ پہلے روز جب کلاس روم میں داخل ہوئے تو بہترین سوٹ میں ملبوس تھے۔ جامہ زیب اور دراز قد۔ ان کا قد دروازے کے محراب سے کچھ ہی کم تھا۔ اختر صاحب اتنے شاندار معلوم ہو رہے تھے کہ میں نے سوچا کہ اگر وہ پروفیسر نہ ہوتے تو انڈین فلم اسکرین کے ہیرو ضرور ہوتے۔ اس زمانے میں بمبئی ٹاکیز میں نجم الحسن کا بڑا دار دورہ تھا۔ لیکن مجھے اختر صاحب نجم الحسن سے بھی زیادہ شاندار معلوم ہو رہے تھے۔

بعض وقت تو وہ اسٹوارٹ گرینجر سے بہت زیادہ مشابہ معلوم ہوتے۔ پہلے روز اختر صاحب نے ہم لوگوں سے فرداً فرداً نام پوچھا۔ پھر کچھ گھریلو باتیں پوچھتے رہے۔ ان باتوں میں خلوص تھا، محبت تھی، اپنائیت تھی اور استادانہ شفقت تھی۔

ہفتہ میں صرف ایک ہی دفعہ اردو کمپوزیشن کا کلاس ہوتا تھا۔ دوسری مرتبہ انہوں نے ہم لوگوں کو مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ عنوانات بھی بڑے دلچسپ تھے مثلاً جینا بادام، چنا جور گرم، چاندنی رات وغیرہ۔ میں نے اندازہ کیا کہ اختر صاحب کی نظر اگر ایک طرف ادب کی تمام صنفوں پر محیط ہے تو دوسری طرف سماجی اور معاشی قدروں کا بھی بھرپور تجزیہ کئے ہوئے ہے۔ ایک فنکار جب تک کہ تمام جزئیات پر بھی گہری نظر نہ رکھتا۔ اس کا فن زندہ نہیں رہ سکتا۔ بادی النظر میں جینا بادام یا چنا جور گرم کو زبان یا ادب سے کوئی گہرا تعلق نہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ کم از کم یہ تو ماننا ہوگا کہ چنا جور گرم کی شاعری عوامی شاعری ہے۔ ہمارے ساتھیوں نے جو سبکے سب تازہ وارد ان میں تھے خوب خوب گہر افشانی کی۔

ایک صاحب نے چاندانی رات پر مضمون لکھا تھا۔ اختر صاحب نے اسے سننا شروع کیا۔ (اختر صاحب کا قاعدہ ہے کہ وہ طلبہ کے لکھے ہوئے مضمون خود ان کی زبان سے سنتے ہیں۔ پھر جملوں کی صحت، الفاظ کی مناسبت پر مشورے دیتے ہیں۔ اس سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ طلبہ کو ایک دوسرے کے رجحان اور انداز فکر کی واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور پھر کلاس ہی میں عملی تنقید کا موقع بھی مل جاتا ہے۔) اختر صاحب نے مضمون سننے سے پہلے ایک بات کہی۔ جانتے ہیں چاندنی رات میں دل چاہتا ہے کہ پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر کسی حسین لڑکی سے بات کی جائے! بڑی رومانی بات تھی اور خاص کر نوجوان طالب علموں کے لئے جو شباب کے جلتے اور تپتے صحرا میں ہوتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں میں صرف مزاح کی چاشنی ہے اور بس! نہ تو اس سے اخلاق پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور نہ ہی استاد اور شاگرد کے مہذب رشتہ پر کوئی ضرب آتی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے میں نے ایک مضمون اردو کے مستقبل پر لکھا تھا۔ مدرسہ سے پڑھکر آیا تھا اس لئے زبان ذرا بلیغ العلائی قسم کی تھی۔ اختر صاحب نے مضمون بہت پسند کیا مگر ساتھ ہی انہوں نے کہا آپنے جو زبان استعمال کی ہے بتایئے وہ عام فہم ہے؟ ایسی زبان لکھنے کا کیا فائدہ جسے عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اختر صاحب نے بتایا کہ زبان سیدھی، صاف اور شستہ ہونی چاہیئے۔ جملے چھوٹے چھوٹے ہوں۔ اور فضول باتیں نہ ہوں۔ اختر صاحب انگریزی ادب کے طالب علم رہ چکے ہیں اس لئے انہوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ وہ انگریزی ادب کے جدید رجحان سے پوری طرح واقف ہیں۔ اکثر میں نے ان کے ہاتھوں میں انگریزی کے کسی نہ کسی مشہور مصنف کی کتابیں دیکھی ہیں۔ چونکہ اختر صاحب سائنس کے اور پھر میڈیکل کے طالب علم بھی رہ چکے ہیں اس لئے وہ اپنے لکچر میں بوقت ضرورت ان علوم کا بھی حوالہ دے دیا کرتے تھے۔ میں نے پہلے

کہا ہے کہ اختر صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز ہے۔ اگر علمی مراتب
کے ساتھ استاذ کی شخصیت بھی سحر انگیز ہو تو پڑھنے میں بھی بڑی
طبیعت لگتی ہے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ پروفیسر، ڈاکٹر اور نرسیں
کے جاذبِ نظر ہونے سے طالب علم اور مریض دونوں ہی قسم کے
لوگوں پر بڑا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ اختر صاحب کو میں نے کبھی بھی
اداس نہیں پایا۔ بڑے سے بڑے کٹھن اور مشکل لمحات میں
بھی ان کے چہرے کی فطری مسکراہٹ کبھی زائل نہ ہوئی۔ مجرمی
چہرے سے بڑی زینت ہوتی ہے۔ اختر صاحب کو میں نے کلاس
میں بھی اکثر متبسم پایا۔ ان کی یہ مسکراہٹ بھی سبھوں سے مختلف
ہے۔ مسکراتے وقت ان کے صرف دائیں جانب کے دونوں لب
پھیل جاتے ہیں۔ رخسار میں ہلکا سا گڑھا بن جاتا ہے اور چہرے پر
ایک مخصوص زاویہ ابھر آتا ہے ایسا زاویہ جو اقلیدس کی کتابوں
میں کہیں نہیں۔ اور پھر کچھ نہ کوئی چبھتے ہوئے فقرے، کوئی مزاح
کی بات، کوئی ادبی گتھی، کوئی مفکرانہ نکتہ وہ ضرور پیش کرتے ہیں۔
اختر صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے میں سل کے مریض رہ چکے ہیں۔
جس کی جھلک ان کے افسانے "شادی کا تحفہ" میں موجود ہے۔ مگر اسکے
باوجود ان کا قہقہہ زندگی اور اس کی توانائیوں سے بھرپور ہے۔ جیسے
وہ اپنی پچھلی بیماریوں کا، زندگی کی تلخیوں کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ ایسے
اساتذہ جو درس کے درمیان صرف درسی کتابوں تک محدود رہتے ہیں
اور رٹی رٹائی باتیں دہراتے رہتے ہیں اس سے لکچر بڑا بے رنگ معلوم ہوتا
ہے۔ کبھی کبھی تو کلاس ہی میں نیند آنے لگتی ہے۔ لیکن اگر کہیں استاذ کے
شعور میں بالیدگی ہے۔ اس کے داخلی اور خارجی حسیات بھی تیز ہیں
اور وہ وقت، ماحول اور سماج کا نباض ہے۔ زندگی کے مختلف شعبے
پر اس کی گہری نظر ہے تو پھر لکچر میں بھی مزہ آجاتا ہے۔ اختر صاحب کے
لکچر میں بھی سب دلچسپی رہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ذہین طالب علموں
میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر اوسط درجے کے طالب علموں کو بھی وہ
نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ان کے افسانے سنتے ہیں۔ ان کے مضامین
پر رائے دیتے ہیں۔ انہیں تنقیدی اصول بتاتے ہیں۔ اور پھر وہ صرف
ان کی پڑھائی سے دلچسپی نہیں لیتے بلکہ فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں
میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جو طالب علم جسمانی ورزش کے شوقین
ہوتے ہیں انہیں وہ بتاتے ہیں کہ ایک اسپورٹس مین کے لئے زندگی
میں کس باقاعدگی کی ضرورت ہے۔ دوڑ کے مقابلہ میں جانے سے پہلے
کون سی چیز کھانے سے سانس پر کنٹرول رکھنے میں مدد ملے گی وغیرہ وغیرہ۔
اسی طرح اختر صاحب کو اسٹیج ڈراموں سے بھی گہرا شغف ہے۔ نہ معلوم
کتنے ڈرامے انہوں نے ڈائرکٹ کئے ہیں اور کتنے طالب علموں کو
اداکاری سکھائی ہے۔ ایک روز کی بات ہے غالباً میں تھرڈ ایر میں تھا
اختر صاحب کلاس میں داخل ہوئے اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا
"شیر صاحب! آپ کالج ڈرامہ میں کام کریں گے؟"
یہ سوال میرے لئے بالکل اچانک تھا۔ میں نے کبھی اداکاری
نہ کی تھی۔ سوچنے لگا کہ اسٹیج پر پتہ نہیں میں کام کرسکوں گا یا نہیں۔
ابھی میں سوچ ہی رہا تھا اور کچھ طے نہ کر پایا تھا کہ اختر صاحب نے
کہا "آپ کو کالج ڈرامہ میں کام کرنا ہوگا" پھر انہوں نے شعبۂ ہندی
کے ایک پروفیسر کے نام ایک خط لکھ کر دیا اور کہا آپ ان سے جا کر مل لیں
اور اپنے ساتھیوں میں جسے مناسب سمجھیں وہاں نام لکھوا دیں۔ میں کچھ خوش
کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ بہرحال شعبۂ ہندی کے پروفیسر سے ملا اور ایک روز
کردار کے انتخاب کے لئے سائنس کالج کے بی۔ اے لکچر تھیٹر میں ہم لوگوں کو جانچ
کے لئے کچھ مکالمے دہرانے کے لئے کہا گیا۔ مجھے اس وقت یہ یاد نہیں
کہ مکالموں کو میں نے کس طرح ادا کیا تھا۔ پروفیسر شرما کی یہ بات ضرور
یاد ہے جو انہوں نے اور شعبۂ انگریزی کے دو اور پروفیسر جو ڈرامہ
سے وابستہ تھے میرے متعلق کہا تھا کہ صاحب! اختر صاحب کا انتخاب
تو بہت خوب ہے۔ بہرکیف یوم جمہوریہ کے موقع پر وہ ڈرامہ پیش
کیا گیا تھا۔ اور پٹنہ کے تمام کالجوں میں نہ صرف ہم لوگوں کی اداکاری
سراہی گئی بلکہ اس سال کا وہ پٹنہ کا بہترین اسٹیج ڈرامہ قرار دیا گیا۔
اختر صاحب اس وقت نہ صرف ریہرسل ہی میں شریک ہوا کرتے تھے
بلکہ میک اپ وغیرہ میں بڑے اچھے مشورے دیا کرتے تھے۔ فائنل ڈرامہ
کے روز اسٹیج ہی پر سے میں نے اختر صاحب کو کنکھیوں سے دیکھا۔ ان کی

ثمرن فخر سے اکثر کہا کرتی تھی - اختر صاحب کو اپنے طالب علموں پر بڑا
ناز رہتا ہے - لوگوں سے وہ ان کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں - انہیں بڑے
خوبصورت انداز سے متعارف کراتے ہیں - اگر کبھی باہر سے کوئی آجاتا
ہے تو وہ اس طرح ملاتے ہیں "یہ ہیں میرے دوست مسٹر........"
شاگرد کو بہ حیثیت دوست کے متعارف کراتے ہوئے میں نے کبھی کسی
پروفیسر کو نہیں دیکھا - یہ شاید اختر صاحب کی انفرادیت ہے - دوست
کہنے سے ان کے رتبہ میں فرق تو نہیں پڑتا مگر ایک شاگرد کے لئے وہ
مقام یقینی باعث فخر ہے - وہ اپنے شاگردوں کو اپنا عزیز، اپنا شاگرد،
اپنا دوست سب کچھ سمجھتے ہیں - اور ان پر بہت بھروسہ کرتے ہیں - اکثر
اختر صاحب کے پاس لوگ اپنی یونیورسٹی سند کی نقل کی تصدیق
کے لئے آیا کرتے تھے اور اختر صاحب بغیر دیکھے تصدیق کر دیا کرتے
تھے - میں نے ایک روز اختر صاحب سے کہا بھی کہ آپ بغیر دیکھے
تصدیق کیوں کر دیا کرتے ہیں - اس میں دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے -
اختر صاحب کہنے لگے میرے شاگرد مجھے دھوکا نہیں دے سکتے - اللہ
رے اعتماد - اس دنیا میں جبکہ قدم قدم پہ دھوکے اور فریب کا جال
بچھا ہوا ہے - رسہ کشی اور سیاسی جوڑ توڑ ہر جگہ جاری ہے -
اختر صاحب کا یہ سوچنا کہ میرا شاگرد مجھے دھوکا نہیں دے سکتا -
کتنی بڑی عظمت ہے ؟ یہی وجہ ہے کہ طلبہ اختر صاحب کا نہ صرف
احترام کرتے ہیں بلکہ ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں - جس شخص کا احترام
کیا جاتا ہے بلاشبہ اس کی شخصیت بڑی اونچی ہوتی ہے مگر
جس سے محبت کی جاتی ہے اس کا مقام تو اور بھی بلند ہوتا ہے -
خوش قسمت وہ نہیں ہے جسے تخت و تاج حاصل ہے - بلکہ
خوش قسمت وہ ہے جسے لوگوں کی محبت حاصل ہے - اور اختر
صاحب کو یہ دولت یقیناً حاصل ہے - وہ دوسروں کا بھی بیحد
احترام کرتے ہیں - معاصرانہ چشمک تو ہر جگہ پائی جاتی ہے مگر میں نے
اختر صاحب کو کبھی اپنے کسی ہم عصر کو برا بھلا کہتے نہیں سنا - اپنے
کسی مخالف پر بھی کبھی انہوں نے کوئی رکیک حملہ نہیں کیا - وہ
حفظ مراتب کے قائل ہیں اور اپنے بزرگوں کا بے حد احترام کرتے
ہیں - ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کسی مفصل کالج میں بزم اردو کا سالانہ
اجلاس تھا - اختر صاحب کے پاس لوگ آئے تھے کہ وہ صدارت کے
فرائض انجام دیں - انہوں نے فوراً ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ
حافظ صاحب کے پاس جائیے، وہ اس کے لئے زیادہ موزوں ہیں -
دراصل حافظ شمس الدین صاحب ان دنوں صدر شعبۂ اردو تھے -
اختر صاحب نے حافظ صاحب کی علمی صلاحیت اور شخصیت پر تھوڑا
سا تبصرہ کیا اور ان لوگوں کو انہیں صدارت کے انتخاب کا مشورہ دیا -
کردار کی یہ بلندی کتنا گہرا اثر دلوں پر چھوڑ جاتی ہے ؟

ایک مرتبہ میں نے اختر صاحب کو اپنا ایک مطبوعہ افسانہ
سنایا - یاد نہیں وہ افسانہ عالمگیر میں چھپا تھا یا شاعر میں - بہرحال
اختر صاحب اسے بڑے غور سے سنتے رہے - افسانہ کے اختتام پر
انہوں نے کہا کہ شیر صاحب! افسانہ بہت اچھا ہے اور میرا خیال
ہے کہ میرے موجودہ شاگردوں میں اتنا اچھا افسانہ شاید ہی کوئی
لکھتا ہو - خیر یہ تو محض ہمت افزائی کی باتیں تھیں مگر ایک مشورہ
انہوں نے بہت اچھا دیا وہ یہ کہ جدید انگریزی ادب کے افسانے اور
ناول ضرور پڑھا کروں - اس سے بہت کچھ سیکھنے میں مدد ملے گی -

اختر صاحب سے ہم لوگ اکثر کھانے پینے کا بھی مطالبہ
کر دیتے تھے - گھر پر ان کے جب بھی گئے اختر صاحب کھانے
کیلئے ضرور کہتے - کبھی کہتے میری جیب میں کشمش ہے کھائیے - اکثر
کلاس میں وہ پوچھ بیٹھتے آپ لوگ چائے پئیں گے یا کافی اور ہم
لوگ کہتے تحت النقیہ بھی - اور کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز آجاتی -
میں اختر صاحب سے بہت قریب تھا اور اختر صاحب مجھے بہت مانتے
تھے مگر ہوا کچھ ایسا کہ میرے اکثر ساتھیوں نے مجھ سے فخریہ کہا کہ
اختر صاحب تو مجھے بہت مانتے ہیں - مجھے یہ چیز اچھی نہیں لگی - اسے
میری ذاتی کمزوری سمجھ لیجئے - دراصل مجھے یہ شرکت پسند نہ ہوئی
مگر یقینی یہ بات اختر صاحب کی بلند شخصیت کی حامل ہے کہ ہر ملنے
والا ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور ہر شاگرد یہی سمجھنے لگتا ہے
کہ اختر صاحب اسے بے حد مانتے ہیں -

یوں تو اختر صاحب ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ افسانہ نگار بھی، نقاد بھی، شاعر بھی اور خطیب بھی۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کی شاعری نے کبھی اپیل نہ کیا۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک آدمی ہر فن میں کمال حاصل کر لے۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ اپیل کیا وہ انکی خطابت ہے۔ میں نے پٹنہ میں اردو کے تمام چوٹی کے ادیبوں کو تقریر کرتے سنا ہے۔ احتشام صاحب، سرور صاحب، عبادت صاحب، قاضی عبدالغفار صاحب، کشن پرشاد کول صاحب اور بھی بہت سے دوسرے، مگر اختر صاحب جیسا انداز کسی میں نہ پایا۔ کسی کی آواز مدھم، کسی کی تقریر میں اُتار چڑھاؤ نہیں اور کوئی بالکل سپاٹ۔ مگر اختر صاحب جب بھی اسٹیج پر آئے ایک سکوت چھا گیا۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ پہلے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسٹیج پر قطب مینار رکھ دیا گیا ہے۔ اپنے پورے جاہ و جلال اور عظمت کے ساتھ۔ یہاں ایک بات یاد آ گئی۔ کالج کے شعبۂ ہندی میں ایک لکچرر نہایت فربہ اندام اور گول مٹول سے تھے۔ جب کبھی اختر صاحب اور وہ کوری ڈور سے گذرتے تو بعض منچلے کہنے لگتے کہ قطب مینار اور گول گھر دونوں ساتھ ساتھ متحرک ہیں۔ ہاں تو اختر صاحب جب اپنی پرشکوہ آواز کے ساتھ بولنے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا آبشار ہو۔ رواں دواں، تیزی اور تندی کے ساتھ۔ آواز اتنی اونچی کہ مائکروفون کی بھی ضرورت نہیں۔ انداز میں بے ساختہ پن۔ پھر اختر صاحب حاضرین کی نفسیات سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ انجمن اسلامیہ ہال میں مشاعرہ تھا۔ ہندوستان کے بہت سے چوٹی کے شاعر موجود تھے۔ جوش، فراق، سلام، پرویز، جگن ناتھ آزاد اور بھی نہ جانے کون کون۔ مشاعرہ پورے شباب پر تھا کہ ایک مرتبہ ہوٹنگ شروع ہو گئی۔ لوگ صرف اساتذہ کا کلام سننا چاہتے تھے اور نوخیز شاعر جہاں آئے درگت بن گئی۔ اس وقت مجمع کو کنٹرول کرنا بڑا مشکل تھا۔ اختر صاحب کھڑے ہوئے۔ اور کہنا شروع کیا "آپ لوگ خاموش ہو جائیں"۔ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور ایک اعتماد۔ "یہ آپ ہی لوگوں کا مشاعرہ ہے۔ اور آپ کے شہر کی عزت کا سوال ہے۔ ابھی تو میرے ترکش میں بہت سے تیر ہیں، جوش، پرویز، سلام ...." مجمع سے آواز آئی "جگن ناتھ آزاد"۔ دراصل لوگ آزاد کو دوبارہ سننا چاہتے تھے۔ اختر صاحب نے آزاد کا نام چھوڑ دیا تھا۔ مجمع کا رنگ دیکھ کر برجستہ کہا "اور وہ میرے ترکش کا آخری تیر ہوگا" اور پھر مجمع پر سکوت چھا گیا۔ مشاعرہ کی کارروائی جاری رہی اور کامیابی کے ساتھ مشاعرہ ختم ہوا۔ لیکن مشاعرہ تو نام ہی ہے ہنگامہ خیزی کا۔ یہ کوئی محفل میلاد تو ہے نہیں کہ خشوع خضوع کے ساتھ سنتے رہیے۔ مشاعرے میں اگر ہوٹ ہوٹ نہ ہو، ہوٹنگ نہ ہو، ہنگامہ نہ ہو تو وہ مشاعرہ نہیں بلکہ محفل وعظ ہے۔ اس ہوٹنگ میں اختر صاحب بھی حصہ لیتے ہیں لیکن بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔ ایک مرتبہ پٹنہ کالج میں اثر لکھنوی کے زیر صدارت ایک مشاعرہ تھا۔ کالج کا جمنیزیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مشاعرہ عروج پر تھا۔ ایک صاحب ڈائس پر آئے اور نظم پڑھنا چاہی۔ مگر وہ نظم کا عنوان ہی بھول گئے۔ ایک مرتبہ مائک پر نظم کا عنوان بتایا پھر دوبارہ اس کی تصحیح کی۔ مگر شاید کھڑے کھڑے پر نہ بیٹھا سہ بار پھر نظم کا ایک دوسرا عنوان بتایا۔ مجمع آپے سے باہر ہو گیا۔ نظم شروع ہوئی۔ ترنم سے پڑھنے لگے۔ مگر شاید ترنم ان کے بس کی چیز نہ تھی۔ بالکل کریہہ معلوم ہونے لگا۔ ایک گوشے سے آواز آئی "بور ....!" اور پھر بور بور ....!" ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ شاعر نے جوں توں نظم ختم کی اور آکر بیٹھ گئے۔ اختر صاحب نزدیک ہی تھے۔ گھبراہٹ سے پسینہ آ گیا تھا جسے انہوں نے رومال سے جذب کیا۔ اختر صاحب ان کی طرف ذرا جھکے اور نہایت سنجیدگی سے کہا "نظم بڑی کامیاب تھی"۔ اس طنز سے ان پر اور خجالت طاری ہو گئی۔ پسینے بھی چھوٹنے لگے۔ اس مرتبہ شاعر نے خوب اچھی طرح سے رومال سے اپنا پسینہ جذب کیا۔ مگر خود اختر صاحب کو میں نے کبھی کسی مشاعرے میں ہوٹ ہوتے نہیں دیکھا۔ اختر صاحب مشاعرے میں ہمیشہ محفل کا رنگ دیکھ کر نظم یا غزل پیش کرتے ہیں۔ پٹنہ کالج میں ہر سال ایک دفعہ طلبہ اور اساتذہ گنگا پار

کرکے ریڈیو کے میدان میں پک نک منانے جاتے ہیں۔ اس موقع پر کھیل کود، گانا ناچنا، قوالی ہر طرح کا پروگرام رہتا ہے جس میں طلبہ اور اساتذہ سبھی حصہ لیتے ہیں۔ اختر صاحب نے ایک نظم پیش کی۔ نظم کا عنوان تھا "اپنے وطن میں کیا نہیں پیارے"۔ نظم کا پس منظر ہندوستان کی خوبصورت وادیاں، سرسبز و شاداب میدان، حسین ندیاں، لامحدود وسائل، ترقی کے تاریخی موڑ اور نئے ہندوستان میں لوگوں کا قومی شعور۔ ٹیپ کا بند تھا "بچے بچے الیٹو، اللہ اکبر اللہ اکبر بچے بچے الیٹو"۔ اختر صاحب جب ٹیپ کا بند پڑھنے لگتے تو مجمع پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے بچے بچے کا راور نعرۂ تکبیر کے درمیان پوری ہندوستانی قوم تعمیر و ترقی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ ملک کے تحفظ کی ساری ذمہ داریوں کے ساتھ۔ وہ لوگ بھی جو اردو سے نابلد تھے نظم سے بے حد متاثر ہوئے اور اس روز کا میدان اختر صاحب کے ہاتھ رہا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اختر صاحب کی شاعری نے مجھے خاص اپیل نہیں کیا مگر مشاعرہ میں وہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ پٹنہ میں بعض منجھے ہوئے شاعروں کو چوٹ ہوتے دیکھا۔ مگر اس ہوٹنگ میں جب بھی اختر صاحب مائکروفون کے سامنے آئے تو خاموشی چھا گئی۔ شاید اس میں ان کی شخصیت اور ان کی پرشکوہ آواز کو بہت بڑا دخل ہے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ اختر صاحب لوگوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ہمت افزائی میں بعض وقت مدح سرائی بھی آجاتی ہے۔ ایک فنکار کے لئے تعریف و توصیف اس کے فن میں جلا پیدا کر دیتی ہے۔ اور پھر اس کے فن میں نئے نئے نقوش ابھرتے ہیں۔ فنکار اپنے فن کی قدر و قیمت سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر نئے حوصلے کے ساتھ فن کی بلندیوں کو چھونے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ اور پھر یہ خراج تحسین اسے کتنی مسرت بخشتی ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے کوئی لازوال دولت مل گئی ہے۔ اکثر میں نے پختہ کار فنکاروں کو بھی داد تحسین سے جھوم اٹھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اختر صاحب کے تعریف و تحسین کا طریقہ بھی سب سے نرالا ہے۔ وہ اتنا شاعر کو پھلا دیتے ہیں کہ پھر وہ کسی اور دنیا میں کھو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حلقۂ ادب بہار کا سالانہ جلسہ تھا۔ جگر صاحب کو بڑی مشکلوں سے ہم لوگوں نے بلایا تھا۔ میں حلقۂ ادب کا سکریٹری تھا۔ اس لئے مہمانوں کی دیکھ بھال میرے ہی ذمہ تھی۔ جگر صاحب کو ہم لوگوں نے اختر صاحب کے گھر ٹھہرایا تھا۔ مشاعرے کے روز تقریباً تین بجے دن میں مجھے کچھ ضروری باتوں کے سلسلے میں جگر صاحب سے ملنا تھا۔ میں جب اختر صاحب کے گیا، تو ظاہر ہے پہلے اختر صاحب سے ملا اور جگر صاحب سے ملنے کی غرض بتائی۔ جگر صاحب دوسرے کمرے میں تھے۔ پھر میں اختر صاحب کے ساتھ جگر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت غنودگی کے عالم میں تھے۔ کچھ دیر تک ہم لوگ بیٹھے رہے۔ جگر صاحب عالمِ لاہوت کی سیر کر کے واپس آچکے تھے۔ ہم لوگوں کی طرف ایک نظر دیکھا۔ اختر صاحب نے باتیں شروع کی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اختر صاحب جگر صاحب کی غزل گوئی پر اتر آئے۔ اب جگر صاحب بالکل بیدار ہو کر اٹھ بیٹھے۔ اختر صاحب نے ان کی بڑی تعریفیں کی اور پھر کہا جگر صاحب! اس وقت ہندوستان میں آپ جیسا عظیم شاعر کوئی نہیں۔ بات کسی حد تک سچی بھی تھی۔ غزل میں تو ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ مگر اختر صاحب نے کچھ اس انداز سے تعریف کی کہ میں نے محسوس کیا کہ جگر صاحب بھی بھول گئے۔ اور پھر اپنی شاعری کے وہ وہ رموز و نکات بیان کئے کہ بیان سے باہر۔ اختر صاحب ان کی ہر بات پر اس طرح داد دیتے رہے جیسے مشاعروں میں اچھے اشعار پر داد دئے جاتے ہیں۔ اور میں حیران تھا کہ اختر صاحب کتنی خوبصورتی سے لوگوں کو پھلا دیتے ہیں۔

ایک اچھا فنکار ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ اسکے اندر انسانیت اور اخلاق کی تمام اعلیٰ قدریں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔ اختر صاحب بھی ایک اچھے فنکار ہونے کے ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ اخلاق اور مروت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مگر بعض دفعہ ان کی مروت سے کچھ غلط اور بے محل باتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ چیز غیر شعوری طور پر ہو جاتی ہو۔

●

اختر صاحب

"اختر اورینوی صاحب ملک کے مشہور افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں ـــــ"

"تنقید نگاری میں اختر صاحب کا ایک خاص مقام ہے۔"

"اختر صاحب ایک خوش فکر شاعر ہیں۔"

"اختر صاحب کے مزاج میں بے حد نفاست ہے۔"

"اختر صاحب طلبہ کے استاد ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہیں۔"

اختر صاحب کے بارے میں اتنی ساری باتیں اسی وقت کان میں پڑ چکی تھیں جب ادب سے "شناسائی" تو ہو چکی تھی۔ "آشنائی" نہیں ہوئی تھی۔ اور ظاہر ہے جس شخص کے متعلق یہ باتیں ناپختہ ذہن سن لے اس کے لئے دل میں جذبۂ عقیدت پیدا ہوگیا اور اس کی شخصیت کا تجسس فطری امر ہے اسی تجسس کا نتیجہ تھا کہ اختر صاحب کی کہانیوں نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ گو یہ کہانیاں اس وقت واجبی ہی ڈھنگ سمجھ میں آتی تھیں مگر اختر صاحب کی شخصیت کے رعب سے انہیں پڑھتا رہا۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کہانیوں کے کرداروں میں خود کو فٹ کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اختر صاحب کی کوئی غزل یا نظم بھی کسی رسالے میں ہاتھ لگ گئی اور میں مزے لے کر اپنی بے ہنگم آواز میں اس کے اشعار گنگناتا رہا۔

اختر صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے بارہ سال قبل ہوئی۔ میں سی۔ ایم کالج دربھنگہ کی بزم اردو کا سکریٹری تھا۔ سالانہ انعامی مقابلہ اور مشاعرہ کا پروگرام بن رہا تھا۔ مشاعرے میں اور حضرات کے علاوہ اختر اورینوی کو بھی مدعو کرنے کی رائے ہوئی۔ اور یہ ذمہ داری مجھے دی گئی۔ کہ میں پٹنہ جا کر اختر صاحب کو شرکت کیلئے راضی کر دوں ـــ چنانچہ میں پٹنہ گیا۔ اختر صاحب سے پہلے کی ملاقات تھی نہیں، ارادہ تھا منظر شہاب صاحب کے ساتھ جو اس وقت پٹنہ کالج میں ایم اے کر رہے تھے۔ اختر صاحب سے مل لوں گا۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ وہ بھی پٹنہ سے باہر تھے۔ ان کے ہم جماعت جناب کلام حیدری نے اختر صاحب کے گھر کا پتہ بتایا اور میں دل کڑا کر کے تنہا ان کے گھر پہونچ گیا۔ خوش قسمتی سے اختر صاحب گھر ہی پر تھے۔ باہر نکلے اور ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ میرے تخیل نے اختر صاحب کا جو خاکہ بنایا تھا اس سے وہ بہت زیادہ مختلف نہیں تھے۔ گندمی رنگ نکلتا ہوا قد، چوڑی پیشانی، پُر وقار چہرہ اور اس پر موزوں لباس۔ سوچنے لگا کس طرح گفتگو شروع کروں غالباً اختر صاحب نے بھی اس کا اندازہ کر لیا۔ اور خود ہی پوچھا "کہئے کیسے آنا ہوا؟" میں نے مدعا بتایا اختر صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔ "دیکھئے ان دنوں مصروفیتیں بہت ہیں لیکن جب آپ آئے ہیں تو جانا بھی مناسب ہی ہے مگر میں مشاعرے کی شام کو پہونچوں گا۔ اور دوسری صبح کو رخصت ہو جاؤں گا ـــ" ان کے حسن تکلم سے ان کی نفاست طبع اور دل آویز شخصیت جھلک رہی تھی۔ یہ پہلی ملاقات ایک طویل عرصے کے بعد بھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔

درس و تدریس کے علاوہ اختر صاحب نے ناول اور کہانیاں لکھی ہیں۔ تنقیدی مضامین اور ڈرامے تحریر کئے ہیں۔ اور نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ اختر صاحب صرف خود "فعال" نہیں دوسروں کو بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگاتے ہیں۔ اور کام پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیچھے باشعور جوانوں کا ایک کارواں آگے بڑھ رہا ہے جن سے شعر و

ادب کی بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ بعض اوقات
ہمت افزائی میں وہ حدِ اعتدال سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن میرے خیال
میں ایسا ارادتاً نہیں ہوتا بلکہ "ہونہار بروا" کے "چکنے چکنے پات" دیکھ کر
اختر صاحب ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اختر صاحب ایک ایسے شجرِ سایہ دار
ہیں جس سے ہر وہ شخص فیض یاب ہوتا ہے جو اس کے نیچے پہونچ جاتا ہے ان
کی ذات برگد کا وہ درخت نہیں جس کے سایہ میں کوئی چیز پھل پھول نہیں سکتی

اختر صاحب کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن ان
کی کہانیاں ترقی پسند رجحانات کی حامل ضرور ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کچھ
کہانیاں تو بالکل "انقلابی" ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اختر صاحب
کمیونسٹ ہیں۔ ان کی سیمابی طبیعت کو دیکھ کر کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو
سکتی ہے۔ لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اختر صاحب نے بڑی "ایمان
داری" سے کمیونزم کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس پر کچھ "افسانے" بھی لکھے ہیں۔
ان کے خیالات ترقی پسندانہ ضرور ہیں جن میں ماحول کا عکس نظر آتا ہے۔
لیکن موجودہ دور کی بے راہ روی کا گذر ان کے یہاں نہیں۔ میرا خیال ہے
مذہب سے وابستگی نے ان کے مزاج میں بڑا اعتدال اور توازن پیدا کر دیا
ہے۔ ممکن ہے اسلاف کی اخلاقی تعلیم اور "بود وصیت" کا بھی اس میں ہاتھ ہو

ذکر اختر صاحب کی کہانیوں کا تھا۔ ان میں جہاں ہمیں روایت کی
پرچھائیاں ملتی ہیں وہاں بغاوت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ زندگی
کی بنیادی قدروں کے ساتھ ساتھ اس کی تغیر پذیر حقیقت سے بھی
واقف ہیں۔ اسی لئے ان کی کہانیوں میں ماضی کی جاندار روایت کی بنیاد
پر حال کی تصویریں ملتی ہیں۔ اور مستقبل کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے
نئے تجربے بھی۔ ان تجربوں کا تعلق مواد اور ٹیکنیک دونوں سے ہے۔
موضوع کے ساتھ الفاظ، شاعرانہ اندازِ بیان اور جیتے جاگتے کردار
انہیں اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں
بھی وہی تنظیم، متانت اور وقار نظر آتا ہے۔ جن سے ان کی
زندگی عبارت ہے۔

اختر صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بیماریوں کی خاطر مدارات
میں گذرا ہے۔ مگر انھوں نے جس اولوالعزمی، خود اعتمادی اور زندگی
سے بے پناہ عشق کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی
بیماری و نامرادی کی کیا مجال جو ان کی فطرتِ بے باک پر قابو پا سکے
اور اپنا دھونس جما کر ان کو پست کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے
لوگ ان کی بیماریوں سے فکر مند رہتے تھے۔ لیکن ان کا یہ حال تھا کہ مسکرا
مسکرا کر بیماری کو بھی پانی پانی کر دیتے تھے۔ سینی ٹوریم میں بھی یہ نچلے نہ
بیٹھ سکے ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی ان کی قوتِ ارادی پر حیرت تھی

اختر صاحب کے سینے میں ایک بڑا پُر خلوص اور دردمند دل ہے
وہ اپنے مقدور بھر ہر ایک کے کام آتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ
ان کے یہاں پہونچتے ہیں اور اختر صاحب نہ صرف خندہ پیشانی سے ان
کی باتیں سنتے ہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ان کی ضرورتیں بھی پوری
کرتے ہیں ـــــ خلوص کا حال یہ ہے کہ اپنے ملنے والوں کو یہ ہمیشہ یاد
رکھتے ہیں اور ان کی ہمت افزائی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ میں اپنے
تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اتفاق سے اگر کبھی مجھے ان کے کلکتہ آنے کی
اطلاع نہ ہو سکی یا کسی وجہ سے ملاقات کو نہ پہونچ سکا تو خود اختر صاحب
نے خبر بھجوائی اور ملاقات کا موقع نکالا۔

ایک بار انجمن ترقی اردو کلکتہ نے انہیں ایک جلسے کی صدارت کے
لئے مدعو کیا۔ اس وقت انجمن کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لئے
ہم ان کی خدمت میں اتنی رقم بھی نہ پیش کر سکے جو مصارفِ آمد و رفت
کیلئے کافی ہوتی۔ مگر اختر کی عالی ظرفی کا یہ عالم کہ عام روش کے منافی
برا ماننا تو بڑی بات ہے انھوں نے بغیر کچھ پوچھے ہوئے رقم رکھ لی اور
جب ہم نے معذرت کی تو کہنے لگے "مجھے تو اس کی خوشی ہے کہ آپ
لوگ کچھ کام کر رہے ہیں ـــــ"

اختر صاحب کو اردو سے عشق ہے۔ وہ اس کی خدمت فرض
سمجھ کر کرتے ہیں۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا"۔ وہ اردو
کے مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ اس کی ترویج و اشاعت کیلئے لائحہ
عمل بناتے ہیں۔ اور اپنے معاصرین حلقہ کو اس پر عمل کی ترغیب دیتے ہیں

ان کی اردو دوستی صرف پیشہ ورانہ یا یونیورسٹی کی حدود تک محدود نہیں اور ان کا اردو اوڑھنا بچھونا ہے۔ لیکن اردو سے اختر صاحب کا یہ عشق محض جذباتی نہیں بلکہ فطری ہے۔ وہ اردو کی ترقی کو ملک و قوم کی ترقی سمجھتے ہیں۔ یہ ایک تہذیبی ورثہ ہے جس کا نقصان تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کا نقصان ہے۔

اختر صاحب بڑے باغ و بہار آدمی ہیں وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں موضوع کچھ بھی ہو۔ جب بولنے پر آتے ہیں تو بس ان کی باتیں سنتے جائیے۔ شگفتہ اور پر وقار انداز بیان فردوس گوش ہوتا ہے برجستہ جملے اور بیچ بیچ میں چست فقرے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مزاح کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اور نجی صحبتوں میں ان کا یہ جوہر کھلتا ہے۔

اختر صاحب کے بارے میں وہاب اشرفی نے بالکل صحیح لکھا ہے "جیسے دودھ میں شکر گھل کر اسے شیرینی بخشتی ہے اسی طرح اختر اورینوی کے پیکر میں خلوص کی خوشبو پھیل گئی ہے۔ یہ خوشبو پاؤں کے ناخن سے اٹھ کر دماغ تک چلی گئی ہے۔ اس لئے ان کے ارد گرد خوشبو رچی بسی ہے۔ اس خوشبو کو استوار کرنے میں سون کی سوندھی مٹی بڑا کام کر گئی ہے۔ جہاں ان کی جوان امنگوں نے اپنی منزلیں پائی ہیں۔ کچھ کھوئے بغیر بہت کچھ پالیا ہے۔"

اختر صاحب مشہور افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ خوش فکر شاعر ہیں۔ مستند نقاد ہیں، یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہیں مگر سب سے بڑھ کر اختر صاحب ایک انسان ہیں ـــــ پر خلوص انسان ـــــ

بقیہ :- آئینہ صدرنگ

دوسرا اختر وہ ہے جو سیشنر کی محفلوں اور اجتماعی ادبی پلیٹ فارموں پر نظر افروز ہوتا ہے۔ یہ اختر بڑی جاذبیت کے ساتھ اسلام کے ہمہ گیر تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح کی محفلوں میں اس کے مخصوص عقائد و نظریات کی نشاندہی کرنا بڑی مشکل ہے۔

تیسرا وہ اختر ہے جو مخصوص صحبتوں میں اور اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر یا بیرون پٹنہ سے باہر پایا جاتا ہے۔ یہ وہ گوشۂ تنہائی ہے جہاں مخصوص لوگوں کے سامنے مخصوص عقائد و خیالات پر بغیر کسی تکلف کے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس احتیاط پر کس کو اعتراض ہو سکتا ہے؟۔ ان مخصوص صحبتوں میں اختر صاحب کسی اور حضرت کی کرامت و مکاشفہ کے ایسے ایسے اسرار و رموز بیان کرتے نظر آئیں گے کہ نامحرم اسرار مبہوت ہو جائے۔

ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ شخصیت کتنی سادہ مگر کس قدر پر پیچ ہے۔ شاید یہی وہ منزل ہے جہاں ماننا پڑتا ہے کہ رقیبانِ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ ادب اور روحانیت اور احمدیت کا یہ مرکب کچھ اس قدر پہلو دار ہے۔ کہ آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کا اصلی رُخ کدھر ہے۔ مگر ہر رُخ اس قدر مصفّیٰ اور مجلّیٰ ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی

اختر صاحب کے بعد ادیبوں کو افسوس ہوگا کہ ان کا سرخیل نہ رہا۔ شعراء ہاتھ ملیں گے کہ ایک دل والا رخصت ہوا۔ تنقید نگار نوحہ کریں گے کہ فخر تنقید کا ایک شناور اٹھ گیا۔ محقق ماتم کریں گے کہ میدان ادب میں بہار کو متعارف کرانے والا چل بسا، مگر مجھے دکھ ہوگا کہ ایک ایسا شفیق استاد، ایک ایسی دلنواز مردم ساز شخصیت جس سے اختلاف کرنا ممکن ہے، مگر اس سے دور رہنا ممکن نہیں اور جس کے احسانات سے ایک دنیا کی دنیا گراں بار ہے، نہ رہی۔

خدا اختر صاحب کی عمر میں برکت دے اور ان کی ذات سے لوگوں کو بہت دنوں تک مستفید ہونے کا موقع عنایت کرے۔

زبیر بھاگلپوری

برائے تمہید کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی پڑے گا، چاہے خود بیانی ہی کیوں نہ ہو۔ بہر کیف اختر صاحب سے میری ملاقات کا طویل قصہ مختصر یوں ہے کہ ۱۳ رجون ۱۹۴۴ کی رات کو قاضی جی شمیر عقد سے اس خاکسار کی آزادی کا بھٹہ کا کر چکے تھے۔ لوگ باگ جو مجھے بیوقوف بنانے کی سازش میں شریک تھے۔ اب کھل کر ایک دوسرے سے مبارکباد ی وصول کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے نرغے میں میں اپنے آپ کو شادی کے عجوبہ روزگار لباس میں بالکل مجبور و بے کس پا رہا تھا۔ بار بار میرے کان میں ایک ہمدردی کی آواز کہ "اب وہ مستی کنوارپن کی گئی۔ ہر لمحے کا نا رہے سہرا" آ رہی تھی۔ دل میں آیا کہ یہاں سے سرک جاؤں اور کسی گوشہ عافیت میں بیٹھ کر سہرے اور پگڑی کے بوجھ سے نجات پاؤں اور ان لوگوں کو "دعا" دوں جن کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔ اس مقصد سے بھیڑ سے ہجوم سے نکلا ہی تھا کہ کسی نے شانے پر شفقت سے تھپکی دی اور کہا۔

"ارے بھائی زبیر صاحب"

پلٹ کر دیکھا تو ایک صاحب اس انتہائی بے تکلفانہ انداز تخاطب کے لئے داد طلب تھے۔ نکلتا ہوا قد، بھرا بھرا بدن، چشمہ کے اندر بڑی بڑی آنکھیں، خد و خال میں وہ کیفیت کہ پہلی دفعہ دیکھنے والے کو بھی چہرے سے جان پہچان اور مانوس ہونے کا دھوکہ ہو۔

یہ تھی اختر صاحب سے میری پہلی مکمل ملاقات۔

شاید یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ بزرگوں اور ہمدردوں کی متفقہ گہری سازشوں کی بدولت (جس کا واحد مقصد میری شخصیت کی نیم کتری کو نصف بہتری سے روشناس کرانا تھا) کچھ عرصے سے میں اختر صاحب سے نصف ملاقاتوں میں معروف تھا۔

ان ملاقاتوں سے پہلے میں اختر صاحب کا محض نادیدہ پرستار تھا۔ انہیں ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے اختر صاحب کی عقیدت کے جراثیم مجھ میں بچپن ہی سے پائے جاتے تھے میں اکثر ان کی نظم

قدم آگے بڑھاتا چلا جا

عزائم کے پرچم اڑاتا چلا جا

پڑھا کرتا تھا۔ پھر ان کے افسانوں سے دلچسپی بڑھی۔ ان کے افسانوں میں وہ کونسی کشش تھی جو مجھے بار بار پڑھنے پر مجبور کرتی۔ اور اختر صاحب کے تصور کو عقیدت تک پہنچا دیتی۔ اگر آپ یہ سوال مجھ سے اس وقت پوچھتے جب میں نے ان کے افسانوں کو پڑھنا شروع کیا تھا تو میں ایک غبی طالب علم کی طرح لاجواب سا ہو کر سر جھکا لیتا۔ مگر اب مجھے اس سوال کا جواب کچھ حد تک مل چکا ہے۔ آپ بھی سنئے

بچپن میں جب کبھی دادی اماں یا نانی اماں کی زبانی کوئی کہانی سنتا تو وہ کہانی ملک یونان یا ملک چین کے بادشاہ یا لکڑہارے کے

متعلق ہوتی۔ ہندوستان کے کسی شخص کی ہرگز نہ ہوتی۔ اسی طرح جب کبھی کوئی افسانہ پڑھتا تو ماحول، کردار، زبان، رسم و رواج کسی جگہ کے تو ضرور ہوتے۔ مگر ہمارے کسی علاقے کے نہ ہوتے۔ اور مجھے پڑھ کر سخت کوفت ہوتی۔

اختر صاحب کے افسانوی تجربوں میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول سوبہ بہار کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ بغیر کسی تصنع اور احساس کمتری کے۔ ان کے افسانوں کے کردار بہار کے دیہاتی متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ اختر صاحب ان سے وہی باتیں کہلواتے ہیں جو کہ وہ اپنی مخصوص بہاری معاشرت کے تحت عادی ہیں۔ اختر صاحب کی تحریروں میں نہ مجھے صبح بنارس ملی اور نہ شام اودھ۔ نہ انہوں نے اپنے کرداروں سے ٹکسالی زبان بلوانے کی مشقت لی اور یہ بہت غنیمت ہوا۔ ورنہ اختر صاحب کے افسانوی کردار کیا تھے مجھے خود اختر صاحب پر بھی رحم آتا۔

جب ان کی تحریروں کے مطالعے کے دوران "سوپ" اور "پسارنا" جیسے گھریلو الفاظ اور "آگے آگے میں پیچھے پیچھے ندیا، سرونا کہاں بھول آئی بیاری ننددیا" جیسے عوامی گیت نظر آتے ہیں تو یقین آجاتا ہے کہ یہ کہانی زندگی کی کہانی ہے۔ "جیتے جاگتے"، چلتے پھرتے اور اپنی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت انسان کی کہانی ہے۔ لکھنے والا احساس عظمت کی عینک لگا کر اور علمیت کے آسمان پر بیٹھ کر نہیں لکھ رہا ہے بلکہ اپنے کرداروں کی زندگیوں میں جھانک کر اور ان ہی کی دکھ سکھ بھری سطح پر آکر ہمیں ان سے ملا رہا ہے اسی لئے میں نے ہمیشہ ایسا محسوس کیا ہے جیسے ان کا ہر افسانہ خود میری زندگی کا ایک تجربہ ہے اور ان کے اکثر کردار میری اپنی شخصیت کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔

قارئین میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نہ تو کوئی نقاد ہوں، نہ شاعر نہ افسانہ نگار نہ کسی اخبار کا مدیر کہ اس قدر جرأت سے اتنی باتیں لکھ جاؤں۔ صرف خلق خدا کی بہبود کی خاطر یہ چند سطریں لکھ ڈالیں کہ ضروری ہے۔ ہے وقت

ضرورت کام نہ لیں۔ کیوں کہ میں خود بھی ایک ہم ظرف ہوں۔ اختر صاحب سے پہلی تکمیلی ملاقات بڑی مختصر تھی۔ رخصتی کے بعد میں نے اپنی راہ لی اور اختر صاحب نے اپنی۔ لیکن یہ مختصر ملاقات اپنے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے طویل مختصر کہی جاسکتی۔ وہ یوں کہ اس سے پہلے مجھے بڑی غلط فہمیاں لاحق تھیں۔ اختر صاحب کو میں بہت بڑا ادیب سمجھ کر ان کی بھی زندگی کا تصور بھی کافی بلند و بالا کئے ہوئے تھا۔ میرے لئے یہ احساس خاصا پریشان کن تھا۔ کہ اتنے بڑے ادیب سے مجھ جیسے ہیچمداں و حقیر فقیر قسم کے آدمی کی باتیں کس طرح ہوں گی۔ اور کس موضوع پر رٹا ہے چند عشقیہ اشعار اور کسی ڈرامے کے چند مکالمے رٹ کر محبوب سے گفتگو میں اکثر اہل دل کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر یہ اختر صاحب خدا جانے ادب کی کس صنف پر گفتگو کریں گے جیسا یا تو ... کی نسل، ہمنگانی اور ٹرین کے سفر یا شعاری پر گفتگو کروں گا یا پھر بیکاری کے متعلق اپنی ناقص معلومات کا اظہار۔ جواب میں اختر صاحب مقدمہ شعر و شاعری کا حوالہ دیں گے یا اردو افسانے پر دوسری جنگ عظیم کے اثرات پر لکچر دیں گے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اتنی مشہور شخصیت سے باتیں کرنے کے لئے ذخیرہ الفاظ کہاں سے آئیں گے۔ وہ یقیناً بات بات پر فارسی کے اشعار پڑھیں گے جن کا مطلب سمجھے بغیر مجھے سر دھننا ہوگا۔ لیکن پہلی ہی ملاقات نے ان تمام خدشات کو مایوسی کی حد تک دور کر دیا۔ یعنی اختر صاحب تو بات چیت میں بالکل ٹھیٹھ اختر بھیا نکلے۔ اور انہوں نے مجھے ذرا بھی محسوس نہ ہونے دیا کہ میں اس انسان سے مخاطب ہوں جس کا ماحول خالص علمی ہے جس کے اوقات کا بیشتر حصہ ادبی محفلوں، مشاعروں اور مختلف سمپوزیم میں اپنے جیسے دیگر دانشوروں کے ساتھ علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے میں گذرتا ہے۔ ... دن سے مجھے اختر صاحب کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کا موقع ملا۔ نتیجہ؟ اپنے دل میں اختر صاحب کی جو تصویر بنا رکھی تھی، دھندلی ہوتی چلی گئی۔ ... اس کی جگہ بالکل اپنے لوگوں کی تصویر ابھرنی شروع ہوئی۔

وہ کیسے؟

میں نے سوچا تھا کہ اختر صاحب شاعر ہیں لہذا اُن کا حلیہ بھی روائتی شاعروں جیسا ہوگا۔ کھوئے کھوئے سے، شاید بڑھا ہوا سر کے بال شانے سے بے نیاز۔ جسم پر ایک شیروانی ہوگی جس کے بٹن کھلے ہوں گے۔ مگر توبہ کیجیے یہ تو خاصے نفاست پسند، ہوشیار اور جامہ زیب کیا دیدہ زیب نکلے۔ رہنے سہنے کا انداز بالکل زمیندارانہ جیسا۔ سارے کا سارا گھر چمن بنا ہوا۔ نازک ہری بھری کھپچیوں سے لدی بیلیں جو کمروں کی دیواروں تک پر چھائی ہوئی کسی کے جمالیاتی ذوقِ حسن کی نشان دہی کرنے کے علاوہ پورے ماحول کو شگفتہ و شاداب بنائے رکھتی ہیں۔

یہ رہا اختر صاحب کا کمرہ۔ بھلا اس کمرہ کی سج دھج دیکھ کر اس پر اردو کے کسی روائتی شاعر کے کمرہ ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔ تین طرف دیواروں میں بنی بڑی الماریاں کتابوں سے سجی ہیں۔ مگر یہ وہ کتابیں نہیں ہیں جنہیں آج کل اکثر اہلِ توفیق ڈرائنگ روم کی زینت بنا کر دیکھنے والوں پر اپنی حیثیت اور علمیت کا سکہ جماتے ہیں۔ (اگرچہ ان کتابوں کے ورق تک نہیں کٹے ہوتے) یہاں تو ہر ہر کتاب کا ہر ہر صفحہ اختر صاحب کی انگلیوں اور شوق بھری نظروں سے آشنا ہے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک جہازی سائز کی مسہری پڑی ہے جس سے لگی ہوئی ایک میز ہے اور میز کے ساتھ مسہری کی جسامت کے اعتبار سے ایک آرام دہ کرسی۔ ماحول کی مشرقیت برقرار رکھنے کے لیے مسہری اور آرام کرسی کے تناسب سے ایک مخملی مسند اگالدان کی سوبھ ہے۔

قبل اس کے کہ کسی کو خوش فہمی یا غلط فہمی لاحق ہو کہ اختر صاحب نے مشرقیت برتنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے میں خبردار کردینا چاہتا ہوں کہ یہ اختر صاحب مشرقی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان زمینداروں میں دو "محل" رکھنے کا رواج عام ہے۔ تو بھلا ہمارا ہیرو اس معاملہ میں کہاں پیچھے رہ سکتا تھا۔ یہاں بھی دو "محل" ہیں۔ فرق صرف "شریکِ زندگی" اور "طرزِ زندگی" کا ہے۔ انہوں نے طرزِ زندگی میں دو محل رکھا ہے۔ مشرقیت سے انہوں نے باضابطہ سہرا باندھ کر بزرگوں کے سامنے شادی رچائی ہے۔ اور مغربیت سے انہوں نے ضرورت کے تحت صرف نکاح کیا ہوا ہے۔ ایک کو یہ عزت، محبت اور خاندانی وقار سمجھتے ہیں اور دوسری کو یہ وقتی ضرورت کے تحت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ڈرائنگ روم ان لوگوں کے لیے باعثِ تسکین ہے جو دیارِ مشرق میں اپنے موجودگی کو محض حادثۂ پیدائش سمجھتے ہیں یا جن کی نظر میں زندگی کا مقصدِ تخلیق کی بجائے تقلید ہے۔ خوبصورت قالین، دیدہ زیب پردے، دیواروں پر تصویریں۔ یہاں تک کہ ریڈیوسیلون کے دلنواز نغمے بھی موجود نہیں۔

مگر اس ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر آپ اختر صاحب کو قریب سے نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں قریب سے دیکھنا اور سمجھنا ہے تو آئیے یہاں سے کھسک چلیں۔ وہ دیکھیے کرتا پائجامہ میں ملبوس اختر صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے اپنے منہ چڑھے نوکر کو فلک شگاف انداز میں آواز دے رہے ہیں

"اسماعیل۔ اسماعیلا۔ ابے او حرامزادے۔ مردود"

یہ ٹھیٹھ زمیندارانہ انداز اختر صاحب کا اصلی روپ ہے۔ مگر اس روپ سے کبھی غرور اور تمکنت نہیں بلکہ پیار کی بو آتی ہے۔ اسماعیل اختر صاحب کا نوکر بھی ان کی طرح اپنی ایک علاحدہ شخصیت کا مالک ہے اس کی شخصیت کا خمیر اگرچہ انتہائی حماقت، بے ڈھنگے پن اور سادہ لوحی سے اٹھا ہے۔ مگر اختر صاحب کی توجہ، شفقت، ڈانٹ، پھٹکار اور تمسخرانہ تنبیہہ نے اسے عجیب دلکشی بخش دی ہے۔

اسماعیل ایک صدی قبل کا وہ فانوس ہے جس کے قدرداں ان دنوں بہت کم رہ گئے ہیں۔ آج کل کی برقی روشنی میں بھلا اس مشرقی اور فرسودہ فانوس کا کیا کام۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی خاص ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے تمام لوازمات کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ قصہ مختصر، اس بے تکے فانوس کو اس کے آقا کی شخصیت کی شمع نے منور کر رکھا ہے۔

اختر صاحب کو جب اپنے خدمت گار اسماعیل عرف اسماعیلا پر پیار آتا ہے۔ تو وہ اپنی گونج دار آواز میں ڈانٹ ڈپٹ کی تمام تیم

و جدید شکنک بیک، وقت استعمال کرنے لگتے ہیں ۔ اور تال عموماً اس قسم کی شاباشیوں پر ٹوٹتی ہے ۔

"مردود، ہر وقت غائب رہتا ہے ابے لے یہ پیسے اور دیکھ آ سینما، کمبخت بڑی شادی کردیں گے سمجھا۔"

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر اختر صاحب پہلی جنگِ عظیم سے قبل کے معاشرے سے تعلق رکھتے تو ضرور تالی بجا کر نوکروں کو آواز دیتے۔ اختر صاحب مجسم "کوئی ہے" قسم کے آدمی ہیں ۔

دیکھا گیا ہے کہ بڑے شاعر اور ادیب قسم کے لوگ (جن کے متعلق عموماً کہا گیا ہے ۔ کہ علمیت جھڑ گئی ہے) گھر والوں کے لئے مصیبت بنے رہتے ہیں ۔ بات مت کرو کہ ذہن میں آیا قافیہ بجائے جلوہ کے حلوہ ہو جائے گا۔ آہستہ چلو، جنس ست، اونچی آواز سے کسی کو نہ پکارو، ہماوا زیرِ تکمیل افسانے کا ہیرو بھاگ جائے۔ "پیاری ترے لئے میں دنیا کی دولت پر لات مار دوں گا۔" کہنے کے "پیاری دولت کے لئے تجھے لات مار دوں گا" کہہ دے یا ہیروئن ہیرو کی جدائی کے غم میں زہر کھانے کی بجائے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گنا چوسنا شروع کر دے ۔ مگر یہ اختر صاحب نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں ۔ گھر آتے ہی اند اہلِ خاندان کے دل بیٹھتے ہی ان تمام مسلمہ ادبی روایات کی اینٹ سے اینٹ بجانے لگتے ہیں ۔

یوں تو سارا گھر کا گھر ہی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے ۔ لیکن اختر صاحب کی بات ہی اور ہے ۔

وہ ٹھہرے میر کارواں ۔ مجال ہے کہ وہ موجود ہوں اور آپ کے چہرے پر سنجیدگی برقرار رہے ایک سے ایک دلچسپ (مگر علوماتی) موضوعِ گفتگو اور تفریحی مشغلے ان کے اسٹاک میں ہر وقت موجود ۔ سنائیں گے بھی اور سننا بھی پسند کریں گے ۔ گرمی کا موسم ہو تو اختر صاحب گھر بھر کو ساتھ لئے مکان کی کھلی چھت پر موجود ہیں ۔ خود بھی شعر سنا رہے ہیں اور چھوٹے بڑے سبھی سے فرمائش کر رہے ہیں ۔ کہ جو نظم بھی یاد ہو سنانا ہوگا ۔ باقاعدہ بزمِ طرحی مشاعرے کا سامان ہوتا ہے ۔ خاکسار بھی ایک ایسی ہی محفل میں شرکت کا شرف حاصل کر چکا ہے ۔ حسن اتفاق سے ذہن پر زور دینے کے باوجود

"رب کا شکر ادا کر بھائی" اور "ایک لڑکی بگھارتی تھی دال" کے سوا اور کوئی نظم یاد نہ آسکی ۔ بہرحال میری باری آنے سے پہلے ہی نماز کا وقت آپہونچا ۔ مجلس برخواست ہوئی ۔ اختر صاحب امام بنے اور سب لوگوں نے ان کے پیچھے نماز ادا کی ۔ چلتے چلتے ایک راز کی بات بتا دوں ۔

ہر انسان کی ایک نہ ایک کمزوری ہوتی ہے ۔ میں اختر صاحب کی کمزوری کی جستجو میں کافی سرگرداں رہا مگر کچھ پتہ نہ چلا ۔ تاہم ایک واقعہ بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ دراصل

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

والا معاملہ ہے ۔

واقعہ یوں ہے کہ میں پٹنہ سے روانگی کے لئے تیار تھا ۔ سواری آئی عین اسی وقت جبکہ لوگ "فی امان اللہ" "خدا حافظ" ، ضرور لکھئے گا (گر چہ مطلب کچھ نہ ہو) قسم کے جملوں کی گردان سے اظہارِ محبت فرماتے ہیں ۔ اختر صاحب نے نہایت سنجیدگی اور رازداری سے فرمایا

"زبیر صاحب، آج تو کھچڑی پکی گی ۔ بڑا مزہ آئے گا ۔ آج جانا ملتوی کر دیں تو کیسا ہے"

نجانے اس کھچڑی میں کیا اعجاز تھا کہ میں نے واقعی جانا ملتوی کر دیا ۔ اور اس کے بعد جب دسترخوان پر کھچڑی مع دیگر لوازمات کے آئی تو لوگوں نے بغیر ایک دوسرے کو "بسم اللہ کیجئے" کہے ہلا بول دیا ۔ خود اختر صاحب جو بلحاظ پیشہ کسی ناصح یا محتسب سے کم نہیں ، طبیبوں کی تمام نصیحتیں بھول گئے اور خوب خوب دادِ شجاعت دی ۔ ان کا پرہیزی کھانا جو دو چپاتی اور بغیر مرچ کے پکی ہوئی بھنجیا پر مشتمل تھا ۔ اسی دستر خوان پر الا اللہ کرتا رہ گیا ۔ دراصل اختر صاحب نے ہم لوگوں کی مشغولیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ۔ کسی کو خیال ہی نہ رہا کہ محترم پروفیسر اختر الحق اورینوی کو کہتا کہ "حضور آپ بڑی زیادتی کر رہے ہیں" بھلا فرصت کسے تھی سبھی ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ مگر ناظرین اگر وہ قصہ صحیح ہے کہ آدم صرف گیہوں جیسی چیز کو کھانے کی خواہش نہ روک سکے تھے تو پھر یہاں تو گرم گرم کھچڑی تھی ۔ چٹخارے دار چٹنیاں

(باقی صفحہ ۲۸۷ پر)

پروفیسر آصفہ واسع

اختر اورینوی

میرے تاثرات

حال ہی میں جب مجھے معلوم ہوا کہ رسالہ "ساغرِ نو" کے ایڈیٹر "اختر نمبر" شائع کرنے والے ہیں، تو میرے دل میں ایک خواہش اُبھری کہ اس نمبر کے لئے میں بھی ایک مضمون لکھوں۔ سب سے بڑا سوال جو میرے سامنے اُٹھ کھڑا ہوا وہ یہ تھا کہ اختر صاحب کے بارے میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ ان کو اتنے دنوں سے جانتی ہوں اور ان کے بارے میں اتنی باتیں معلوم ہیں کہ ایک مضمون میں ان باتوں کو سمیٹنا آسان نہیں۔ گزشتہ دس سالوں سے میں ان سے فیض حاصل کر رہی ہوں۔ چار سال تک ان کی اسٹوڈنٹ رہی اور اب پانچ چھ سالوں سے ان کی نگرانی میں تحقیق کا کام کر رہی ہوں۔ اس عرصہ میں ان کی شخصیت اور کردار کا مختلف رخوں سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ لہٰذا یہ مشکل آن پڑی کہ مضمون کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم۔ بہرحال ایک مختصر مضمون پیش کر رہی ہوں جس میں ان کی شخصیت کے چند نقوش کی جھلکیاں ہیں۔ اس مضمون میں جو کچھ پیش کرنے والی ہوں، یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں۔

اختر اورینوی کا نام کب سے میرے ذہن نشین ہے مجھے یاد نہیں کیونکہ جب ہوش سنبھالا تو احساس ہوا کہ اس نام سے میں بہت قبل سے واقف ہوں۔ لیکن صرف نام سے۔ آہستہ آہستہ نام کے ساتھ ان کی خصوصیات سے بھی واقفیت ہوئی۔ چونکہ میری پھوپھی کی شادی اختر صاحب کے رشتے میں ہوئی اس لئے باتوں کے درمیان جب ان کی سسرال کا قصہ چھڑ جاتا تو ساتھ ہی اختر صاحب کا بھی کبھی کبھی ذکر آ جاتا۔ اختر صاحب کی خوش مزاجی، خوش مذاقی اور خوش طبعی کے بڑے چرچے ہوتے۔ بچپن کی ان سنی سنائی باتوں سے میرے ذہن و دماغ میں ان کا ایک خیالی پیکر تیار ہو چکا تھا۔ یہ خیالی پیکر جب مٹ ہدے کی دنیا سے ٹکرایا تو ایک دوسری شکل نمودار ہوئی۔

دن گزرتے گئے۔ اور میٹرک کلاس میں آ گئی۔ میرے نصاب میں دوسری نظموں کے ساتھ اختر صاحب کی ایک نظم "انکارِ جنت" بھی تھی۔ اس نظم سے نہ جانے کیوں میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اور اس کے تاثرات میرے ذہن پر اب تک قائم ہیں۔ اس نظم کے علاوہ اختر صاحب کے کئی افسانے بھی پڑھے تھے جن پر ایک ٹھہرا ہوا سکون مزاح کی ہلکی چاشنی کے ساتھ غالب تھا۔ زندگی کا وسیع مشاہدہ انسانی زندگی کی باریکیاں، نفسیاتی پیچیدگیاں اور تجربے کے ایسے نمونے ملے، جنہیں پڑھ کر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں

ان افسانوں کے خالق کو دیکھ سکتی ۔ لیکن اب تک اس کا موقع نہ ملا تھا۔ یہاں تک کہ میں انٹرمیڈیٹ پاس ہوئی اور بی۔ اے میں داخلے کے ساتھ آنرز کا سوال اٹھا۔ میرے والد صاحب کی دلی خواہش تھی کہ میں اردو میں آنرز لوں۔ میری دلی ہوئی یہ خواہش تھی کہ اس طرح اختر صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ سر اٹھانے لگی اور میں نے اردو آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ بڑی تمناؤں اور امیدوں کے ساتھ میں پہلے روز آنرز کلاس کے لئے (مگدھ مہیلا کالج) سے پٹنہ کالج گئی۔ روٹین دیکھتے ہی میری امیدیں مایوسیوں میں تبدیل ہو گئیں، کیونکہ کئی روز تک اختر صاحب کا کوئی کلاس نہ تھا۔ تین چار روز کے بعد اختر صاحب کے کلاس کا دن آیا۔ پٹنہ کالج میں اختر صاحب کا مخصوص کمرہ دو کمروں کے درمیان تھا۔ ہم لوگ بڑے ہال سے گذر کر اختر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے کی کرسی پر نظر گئی تو کرسی خالی تھی۔ اختر صاحب کہیں باہر گئے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد دیکھا کہ ایک گورے رنگ اور دراز قد کا انسان دروازہ سے کمرہ میں داخل ہوا۔ جس کی صورت سے ایک قسم کا رعب اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ ہم سب تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پہ ایک نرم مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم سبھوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئے۔

پہلے روز پڑھائی کچھ خاص نہ ہوئی۔ ادھر اُدھر کی گفتگو میں پیریڈ گذر گیا۔ لیکن مجھے اسی دن یہ اندازہ بخوبی ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی پڑھائیں گے اس میں دلچسپی کا عنصر ضرور غالب ہوگا۔ ان کا پہلا لکچر مجھے آج بھی یاد ہے۔ ان کی آواز کی گونج، اُتار، چڑھاؤ اور مخصوص انداز اس طرح میرے ذہن نشین ہو چکا ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کی باتیں ہوں۔ گرچہ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مترادف اور پرشکوہ الفاظ کی کثرت کی وجہ سے میرا ذہن الفاظ میں اکثر الجھ جاتا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ احساس ہونے لگا کہ ان کے لکچر کا معیار اعلیٰ ضرور ہے۔ لیکن طرزِ بیان کی دلکشی مشکلات کو آسان کر کے معنی تک رہنمائی کر لی۔ محض ادنیٰ اور معمولی باتوں میں بھی اسلوب اظہار کے سہارے پار چاند لگا دیتے اور غیر دلچسپ باتیں بھی مزیدار اور پرلطف بن جاتیں۔ تفصیل ان کی فطرت میں داخل ہے۔ کوئی بات ہو اسے واضح اور مفصل طور پر پیش کرتے جس سے ایک قسم کا قصہ پن پیدا ہو جاتا۔ شاید ان کے اس مخصوص ہنر نے ہی انہیں ناول نگاری کی طرف مائل کیا ہو۔ اپنی گفتگو کو واضح کرنے کے لئے مثالیں عام اور گھریلو دیا کرتے۔ ان مثالوں کے درمیان ان کی کمزوریاں بھی ظاہر ہوتیں۔ پیرلی، انڈے کا حلوہ اور آم کا ذکر اتنی مرتبہ کلاس میں آیا کہ ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ تینوں ان کی پسندیدہ چیزیں ہیں۔ ان کی باتوں سے پتہ چلتا کہ وہ کھانے کے بیحد شوقین ہیں۔ ہر چیز کی پرکھ اس طرح کرتے جیسے وہ نمونہ ادب و فن پر تنقید کر رہے ہوں۔ پھلوں کے ذائقہ، رنگت، خوشبو اور لذت کو اس طرح بیان کرتے کہ سننے والوں کی زبان چٹخارے لینے لگتی۔ جب کھانوں کا تذکرہ کرتے تو اکثر ایسے اقسام گناتے کہ جن کے نام تک سے ہم سب واقف نہ تھے ان تذکروں سے وہ اپنے لکچر کو دلچسپ اور پر مزاح بنایا کرتے۔

مزاح کا عنصر ان کی فطرت میں شامل ہے۔ جس کی جھلکیاں ان کی عام گفتگو اور لکچر کے درمیان بھی ملتی ہیں۔ فن میں جب انہیں کوئی غیر مانوس اور بے جوڑ چیز نظر آتی تو اس کی تشریح کے لئے ایسی مثالیں پیش کرتے جنہیں سُن کر ہمیں بے ساختہ ہنسی آجاتی مثلاً " شیروانی کے ساتھ دھوتی یا پتلون کے ساتھ مملی کا کرتا۔

ان باتوں کو اس انداز سے پیش کرتے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر پھر جاتی۔ ان کی باتوں سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ حسن کے شیدائی ہیں، فطرت کی نیرنگیاں، قدرت کے حسین اور رنگا رنگ مناظر انہیں بیحد پسند ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی ایک تصویر جو شعبہ میں ٹنگی ہوئی تھی ان کے ذوقِ جمال کا پتہ دیتی ہے۔ اس میں فطرت کے حسین مناظر کو اپنے قلم کے جادو سے ایک زندگی بخش دی ہے۔

اسی طرح ایک سال گذر گیا اور میرا بی۔ اے کا فائنل ایر آ چکا تھا۔ جو رعب ابتدائی دنوں میں ہم سب پر قائم ہوا تھا وہ بتدریج کم ہو گیا۔ وہ اپنی شخصیت کے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آ چکے تھے۔ جہاں

خلوص، نرمی، نیکی اور شفقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان کی شخصیت میں سنجیدگی کے ساتھ ظرافت اس طرح گھلی ملی نظر آئی کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کلاس کی عام خشکی اور بے کیفی ان کے دلچسپ انداز سے دلکش بن چکی تھی۔ باتوں اور لکچروں کے درمیان یہ بھی انکشاف ہوا کہ اختر صاحب کو نہ صرف اردو ادب پر عبور حاصل ہے، بلکہ انگریزی ادب، اقتصادیات، نفسیات، سیاسیات وغیرہ پر بھی کافی دسترس ہے۔ لیکن کبھی ان پر روشنی رعب گانٹھنے کے خیال سے نہیں ڈالتے۔ وہ ایک ثمردار درخت ہیں جس سے ہم سب نے بہت کچھ حاصل کئے ہیں۔ ان کا دل سوز و گداز سے بھرا ہوا ہے اور انسانی ہمدردی کے جذبہ سے لبریز ہے۔ ان میں شان و شوکت، غرور و نخوت، احساس برتری اور رعونت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ ان کی یہ خصوصیات ان کی عظمت کی ضامن ہیں۔

بارہا ان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ ان کے گھر پر عموماً احباب اور ملنے والوں کا مجمع لگا رہتا۔ اختر صاحب سبھوں کے ساتھ یکساں طور پر خلوص، تپاک اور انکساری کے ساتھ ملتے۔ کبھی کبھی ان کی مشغولیتیں دیکھ کر حیرت ہوتی کہ کس طرح اپنے مزاج کی شگفتگی کو یکساں طور پر برقرار رکھتے ہیں۔ اور تصنیف و تالیف کے لئے کب موقع نکالتے ہیں۔ نہ تو چہرے پر کبھی تھکن اور ناگواری کا اثر پایا جاتا، اور نہ کبھی کسی کے ساتھ بے رخی کے ساتھ پیش آتے۔ خواہ ملنے والا کتنی دیر کیوں نہ بیٹھے کلاس کی خوش مذاقی گھر پر بھی بدستور قائم رہتی۔

اختر صاحب طبیعتاً بہت ذکی الحس ہیں۔ شاعر ہونے کی وجہ سے شاید وہ اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی کسی بات کا بہت جلد اثر قبول کرتے ہیں۔ لیکن یہ اثر جلد ہی زائل بھی ہو جاتا ہے۔ بظاہر جو باتیں عام انسان کے لئے ادنیٰ اور معمولی ہیں ان کے لئے اہم بن جاتی ہیں۔ سب کچھ محسوس کرتے ہیں لیکن خوبی یہ ہے کہ اس کا اظہار نہیں کرتے۔ بات ناگوار بھی معلوم ہوتی، تو ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن چہرے کے تاثرات سے ان کی دلی کیفیات جھلک ہی جاتیں۔ اپنی بیماری میں وہ حد درجہ مضمحل اور مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں ایم۔ اے کی طالبہ تھی اختر صاحب شدید بیمار ہو کر پٹنہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ دریا کنارے کا بلاک لیا تھا۔ شعبہ گئی تو بیماری کا حال معلوم ہوا۔ اسی وقت میں اپنی ایک ساتھی کے ساتھ انہیں دیکھنے بھی گئی۔ وہ کیا بیمار تھے مجھے اب تک نہ معلوم ہوا۔ صرف پتہ تھا تو یہ کہ وہ بیمار ہیں۔ کافی روز اسپتال میں رہے۔ ایک دن میں اپنی ایک دوست شمیم کے ساتھ ان کی عیادت کو گئی۔ شمیم سے وہ پہلے سے واقف تھے۔ ہم دونوں کا استقبال مسکراہٹ کے ساتھ کیا، لیکن ان کے چہرے کی چھپی ہوئی بےچینی، اضطراب اور مایوسی ہماری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ہم دونوں نے ادھر ادھر کی باتوں میں انہیں بہلانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا دھیان کہیں اور تھا۔ بظاہر وہ شگفتہ نظر آنے لگے، ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ ہم سبھوں کو یہ فریب دینا چاہتے تھے کہ ان پر بیماری کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مگر ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی گفتگو اور تبسم کے پس پردہ کون سا کرب چھپا ہوا ہے۔ گھر واپس آنے کے بعد میری طبیعت پر بھی ایک اضمحلالی کیفیت طاری تھی۔ بار بار ان کا مایوس چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ ان کا یہ کہا ہوا جملہ "خدا سے دعا کیجئے اچھا ہو جاؤں" دماغ میں گردش کر رہا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ان کی بیماری کی نوعیت کیا ہے۔

دوسرے دن شعبہ گئی تو خبر ملی کہ ان کی طبیعت نسبتاً بہت اچھی ہے۔ اور ذہنی طور پر وہ مطمئن ہیں۔ اس واقعہ سے ان کی شخصیت کا یہ پہلو ہمارے سامنے آیا کہ اتنا ہنسنے اور ہنسانے والا انسان جس کے لبوں پر ہر وقت تبسم کھیلتا ہے، جس کی باتوں میں مزاح ہے جس کی طبیعت میں شگفتگی ہے، جو دوسروں کو ہمت نہ ہارنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کبھی اپنی بیماری میں اس قدر مایوس ہو سکتا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو تھا جس کا اندازہ اس سے قبل نہ ہو سکا تھا۔ اب تک ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ پریشانیوں میں گھر کر بھی افسردہ اور غمگین نہیں ہو سکتے۔

بظاہر اختر صاحب ایک ہنس مکھ، زندہ دل اور خوش طبع انسان ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہر طرح کی خوشیاں حاصل ہیں لیکن غائر مطالعہ کے بعد اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی زندگی

(باقی صفحہ ۲۱۱ پر)

شہزاد معصومی

اختر اورینوی — ایک پروفیسر، ایک ادیب اور شاعر

کسی فنکار کی شخصیت اس کے فن سے الگ نہیں ہوتی ۔ اس کی انفرادیت اس کی تخلیق میں بعض اوقات اس قدر واضح ہوتی ہے کہ ساز یا جا راگ بجا رہے کی مثل پیش نظر ہوتی ہے ۔ یہ غالب کا اندازِ بیان ہے یہ کرشن چندر کی اسٹائل ہے ۔ یہ سہگل کی آواز ہے ۔ یہ جملے منہ سے خود بخود نکل پڑتے ہیں جب ایسی کوئی غزل، نثر، اور آواز گوش گزار ہوتی ہے یا نظر سے گزرتی ہے ۔ اگر غزل واقعی غالب کی ہے، نثر کرشن کی اور آواز سہگل کی تو ان حضرات کی انفرادیت کا کیا کہنا ، مگر طرز اندازِ رنگ ، طرزِ غور و فکر ان کے ہیں اور فنکار کوئی اور تو اس تخلیق کے خالق کی انفرادیت کو خاص کہنا آسان نہیں ۔ کیونکہ اس کی شخصیت کا امتیاز مختلف طرز ادا اور رنگوں کی آمیزش میں کرنا مشکل ہے یہ اور بات ہے کہ آج نقالی بھی ایک فن ہے ۔ مگر تقلید کرنے والوں کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی ۔

بہت سے پھول گلزارِ ہستی میں ایسے کھلتے ہیں جن کے رنگ و روپ تو یکساں ہوتے ہیں ۔ مگر ان کی بو جدا جدا ہوتی ہے ۔ جس کے امتیاز ہی سے ہم ان پھولوں کو الگ الگ نام دیتے ہیں ۔ جس طرح پھولوں کو نسبت ان کی شمیم سے ہے ، اسی طرح ہر فنکار اس کے فن سے الگ نہیں ۔ کسی فنکار کی انفرادیت کے لئے اس کی تخلیق میں اس کے فطری جوہر کی جلوہ باری ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اس کا طرزِ بیان ، خیال و مشاہدات اور اس کے اندازِ غور و فکر ندرت و جدت طرازی کے ساتھ ساتھ انوکھے اگر نہیں ہوئے تو اس کی تخلیق میں اس کی فنی شخصیت واضح نہیں ہو پائے گی ۔ کسی فنکار کے فنکاروں کی روشنی میں اس کی شخصیت کا خاکہ مرتب کرنا تو کام کسی اچھے ناقد ہی کا ہو سکتا ہے ۔ جو اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور خوبیوں کا سماجی ، نفسیاتی و منظریاتی تجزیہ کر سکتا ہے ۔ اور اس کے فن پاروں کو ملکی و بین الاقوامی معیارِ فن پر پرکھنے کے بعد ان کا ایک مقام مقرر کر سکتا ہے ۔ میں تو صرف یہی کہوں گا کہ حسرت نعیم، کلیاں اور کانٹے ، سمنٹ اور ڈائنامائیٹ ، بجلیاں اور بالِ جبریل ، شہنشاہ حبشہ کے خالق کا عرفان اس کی تخلیقات کو پڑھنے اور ان کا دوسرے فن کاروں سے تقابل کرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے ۔

دبستانِ اردو میں ڈاکٹر سید اختر اورینوی کی شخصیت اظہر من الشمس ہے ۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا موجودہ صدر مدرس اعلیٰ صرف مشہور و معروف شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ ایک بہترین مقرر بھی ہے میں جناب ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کی فنی صلاحیتوں اور شخصیت پر کوئی تفصیلی مقالہ یا تنقید لکھنے کا فی الحال ارادہ نہیں رکھتا ۔ آپ کی ذات خصوصی سے متاثر ہو کر میرے ذہن نے جو بت تراشا ہے اس کا ایک عکس البتہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا ذکر بھی کہیں کہیں پر ضمنی طور پر آجائے ۔

سنہ [illegible]ء میں جب میرا داخلہ پٹنہ کالج میں ہوا تو پہلی بار ایک طویل قامت دو ہرے بدن ، سر و قد ، کشادہ پیشانی ، اونچی ناک رکھنے والے حسین و جمیل ، وضعدار جسم پر دیکھنے سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ہلکے بادامی رنگ کی شیروانی ، سفید لٹھے کے پائجامہ اور اسی شیروانی کے کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی میں ملبوس آنکھوں پر خوشنما فریم کی عینک چڑھائے ایک ہوادار کمرے میں ایک کرسی پر شاہانہ ادا کے ساتھ

بیٹھا ہوا جلوہ افروز نظر آیا۔

میری جماعت کے لڑکوں نے زیر لب بتایا کہ یہی اختر اورینوی صاحب ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی موصوف کے لبوں پہ مخصوص مسکراہٹ کھلنے لگی۔ پہلی صدا جو ہمارے کانوں سے ٹکرائی وہ السلام و علیکم کی تھی۔ پھر ہمیں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کا اشارہ آپ کے داہنے ہاتھ نے سامنے رکھے ہوئے سگریٹ کا ٹیبل سے ذرا اٹھا کر کیا۔ آپ کا رنگ گورا اور چہرہ بہت شگفتہ نظر آتا تھا۔ جب ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر "تشریف فرما" ہوئے تو آپ نے فرمایا۔ آپ لوگوں کو تو کالج کی روٹین نے مجھ سے متعارف کرا دیا ہوگا۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت اختر اورینوی کا کلاس ہے۔ حاضری کے رجسٹر میں آپ لوگوں کا نام تو یقینی طور پر درج ہے۔ مگر صورت آشنائی اور کچھ تفصیلی معلومات تو نام پکارنے پر ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے رجسٹر کھولا اور نام پکارنا شروع کیا۔ ہر نام پر جو لڑکا "یس سر" کہہ کر کھڑا ہوتا اس کی طرف چند ساعت کیلئے متوجہ ہوتے۔ اور ایک مختصر سا تعارف لیکر اس سے متعارف ہوتے۔ میری بھی باری آئی اور مجھ سے بھی چند سوالات کئے گئے۔ اس کے بعد آپ نے بال جبریل کی ایک نظم، مسجد قرطبہ، پڑھنے کیلئے مجھ سے کہا۔ دوسرے لڑکوں سے چند الفاظ کے معنی پوچھے اور پھر اقبال کی اس نظم کی خصوصیت پر اظہار خیال کیا۔ اور بتایا کہ اقبال کی نظموں میں یہ نظم بڑی بلند اور کامیاب ہے۔ اس کی اتقان اور ارتقا پر بھی باتیں کیں۔ جب گھنٹی ختم ہوئی تو آپ نے مجھے روک لیا۔ مجھے کچھ تحیر سا ہوا۔ کہ یہ نظر عنایت مجھ پر ہی کیوں؟ مجھ سے آپ نے پوچھا۔ "کیا آپ نے فری شپ اور یا کسی اسکالرشپ کیلئے کوئی درخواست دی ہے۔" میں نے بتایا کہ فری شپ کیلئے درخواست تو دی ہے مگر اسکالرشپ کے متعلق ابھی کچھ سوچ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس کالج میں کون کون سے وظائف جاری ہیں۔ آپ نے مجھ سے فرمایا "بی بی محمدی جان اسکالرشپ کیلئے ایک درخواست ضرور دے دیجئے۔" اس کے بعد مجھے جانے کی اجازت آپ سے مل گئی۔ کیونکہ اس درمیان دوسرے سال کے لڑکے کمرہ میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں

بہ نگاہ تشکر السلام علیکم کہتا ہوا کلاس روم کی طرف چلا گیا۔ مجھے اس وقت اس بات کا احساس ہوا کہ پروفیسر اختر اورینوی ایک نہایت شفیق اور قیافہ شناس شخصیت ہے۔ میں جس وقت پٹنہ کالج میں داخل ہوا تھا اس وقت قطعی بے سہارا تھا۔ میرا کوئی رشتہ کسی بھی لیکچرار یا پروفیسر سے نہیں تھا۔ اور نہ تو کسی نے میرے متعلق کوئی سفارش جناب اختر اورینوی صاحب سے کی تھی۔ آپ کی یہ نظر عنایت محض قیافہ شناسی کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ میری وضع قطع اور میری مختصر گفتگو ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے میری حیثیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اختر صاحب کے کلاس میں صرف پڑھائی نہیں ہوا کرتی تھی۔ بعض اوقات کلاس کے مخصوص مضمون سے الگ مضامین پر بھی گفتگو نکل جاتی۔ کوئی روز سنجیدہ ادبی لطیفہ بازی اور ہنسنے ہنسانے میں گزر جاتا۔ وہ اس وقت ایک بہترین معلم ہی نہیں ایک اچھے دوست بھی نظر آتے۔ اگر کوئی لڑکا کوئی بے ہنگم سا سوال کر بیٹھتا تو موصوف اپنی بذلہ سنجی کے ساتھ اسے ایسا معقول جواب دیتے کہ اسے اس وقت سوائے شرمندگی، منہ چھپنے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ آپ کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اقتصادیات اور سائنس جیسے دقیق فن میں بھی آپ کو اچھی دستگاہ ہے۔ غالباً کسی موقعے پر آپ نے بتایا تھا کہ آپ پہلے سائنس کے طالب علم تھے۔

اتفاق سے میرے پرانے کاغذات کے بنڈل میں کچھ کاپیاں اس زمانے کی ملی ہیں۔ جب میں پٹنہ کالج میں پڑھتا تھا۔ ان میں ایک کاپی خوش قسمتی سے ایسی بھی مل گئی ہے جس میں موصوف کے چند لیکچرز نوٹ کئے گئے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار، ناول و ڈرامہ نویس اور شاعر ہیں بلکہ آپ میں اچھی تنقیدی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ آپ کے شائع شدہ تنقیدی مقالوں سے قطع نظر آپ کے ان خیالات کو میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ جو میں نے آپ کے لیکچرز کی کاپی میں نوٹ کئے ہیں۔

آپ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "اردو تنقید نگاروں کی صف میں

کلیم الدین احمد کی شخصیت بڑی اہم ہے۔ انھوں نے اردو تنقید میں وہ باتیں کہی ہیں جنہوں نے سبھوں کو چونکا دیا ہے۔ کلیم نے اردو شعراء ادبا کا اکسرے لیکر ان کے مرض کی تشخیص کی ہے۔ جو اردو تنقید نگاری کے باب میں اضافہ ہے"۔ دوسری جگہ میر، اقبال اور نظیر اکبرآبادی کے متعلق آپ نے کہا ہے کہ "۔۔ میں مخلصانہ طور پر محسوس کرتا ہوں کہ میر کی شاعری میں محض درد و گداز، حرف یاس و حسرت فقط آہ و بکا نہیں بلکہ زندگی کے ان گنت تجربوں کا فن کارانہ اظہار بھی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں موضوعات سخن کی رنگینیاں اور عوامی زبان ہی نہیں بلکہ حقائق زمانہ کی تصویر کشی ہے۔ اقبال کی شاعری محض ملت بیضا کے تجربوں کی شاعری نہیں ہے بلکہ زمانے کی نیرنگ سامانی کی تعمیری فنکاری بھی"۔ فنکاروں کے مطالعے کے سلسلے میں آپ فرماتے ہیں "میرا خیال یہ ہے کہ فنکاروں کی انفرادیت سب سے بڑی فیصلہ کن قوت ہے۔ وہ نہ تو دبستان کے کٹھڑے پر بیٹھتا ہے اور نہ دوروں کے چرخ پر چڑھتا ہے۔ فنکار زمانے کے اجتماعی دھاروں میں بھی نہیں بہتا ۔۔۔۔۔۔ اس میں کیا شک ہے کہ وہ ماحول معاصر دور اور اجتماعی تحریکوں سے گہرے طور پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی للکاری و گل طرازی، اس کا رنگ و نکہت، اس کی عطر بیزی و جلوہ باری، اس کی داخلی انفرادیت سے وجود میں آتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔ فن کے اندر جو قیمتی شے ہے وہ روح فنکار میں پرورش پاتی ہے اور یہی وہ خلوت خانہ تخلیق ہے جہاں اعلیٰ قدریں پیدا ہوتی ہیں فن اور فن کاروں کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہیے کہ ہم اس حیثیت کو روشن طور پر دیکھ لیں جو ہر گلے "رنگ و بوئے دیگر" ست سے ظاہر ہوتی ہے"۔ اختر اورینوی کی انفرادیت بھی ایسی ہی امتیازی خصوصیت کی حامل ہے۔ میں آپ کی تخلیقات کو دل سے اس لئے بھی پسند کرتا ہوں کہ آپ کا انداز غور و فکر پیارا اور اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے نظریاتی جھمیلوں سے پاک و صاف ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں لڑکے آپ کے لہجے کا کیریکچر ادا کرتے تھے۔ کچھ الفاظ جو دوران گفتگو میں آپ کثرت و بیشتر استعمال کرتے تھے ان کو آپ کا تکیہ سخن تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس ادا کو تکیہ سخن کی ایک قریبی منزل غالباً کہا جا سکتا ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔ لازوال، بے مثال، کرشماتی، عظیم الشان وغیرہ۔ آپ کی پڑھائی اور دل پسند تقریر سے سبھی لڑکے متاثر تھے۔ کالج کی بزم کے تحت جو بھی تنظیم تھی وہ آپ کی سرپرستی سے مالا مال تھی۔ آپ کی پرسنالٹی کا کوئی شخص اس وقت کالج میں نہیں تھا۔ آپ کی غیر موجودگی میں کسی بھی جلسہ کے موقع پر شدت سے محسوس کی جاتی تھی۔ کسی مشاعرے کے موقع پر اگر سامعین ہڑبونگ مچاتے تھے اسی وقت موصوف کی آواز باوقار اس پر فوراً قابو پا لیتی تھی۔ آج بھی ڈاکٹر اختر اورینوی اپنی نظم و غزل یا تقریر سنانے کیلئے کسی بھی جلسے میں جب کھڑے ہوتے ہیں تو سب سے پہلے سامعین آپ کی جامہ زیب، جاذب نظر، خد و خال رکھنے والی شخصیت کا نظارہ کرنے میں کچھ ساعت کیلئے محو ہو جاتے ہیں۔ اور مجمع کا شور و غل تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ خموش ہو جاتے ہیں۔ دفعتاً پھر تالیاں گونج اٹھتی ہیں۔ آپ کے شعر پڑھنے کا انداز خالص تحت اللفظ ہوتا ہے آواز میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ تقریر شروع میں ٹھہری ٹھہری اور پھر دھواں دھار ہونے لگتی ہے۔

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ آپ عالم باعمل مسلمان ہیں۔ نظریاتی طور پر قادیانی عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر دل فرقہ وارانہ تعصب سے پاک و صاف ہے۔ شیعہ و سنی، وہابی عقائد سے کٹر لوگ جو خود بڑے درجے کے متعصب ہوتے ہیں۔ بھلے آپ پر پاسداری اور کٹرپن کا جھوٹا الزام دھر سکیں میں نے آپ کے ظرف اعلیٰ کو اچھی طرح دیکھا اور سمجھا ہے۔ جس پر کوتاہ چشمی اور فرقہ وارانہ عصبیت کی ایک چھینٹ بھی نہیں پڑتی ہے۔ اسلام کے اصول کے مطابق پہلے گھر والوں کا پھر پاس پڑوس کا اور بعدہٗ ساری دنیا کی برادری کا حق آپ اپنے اوپر نزدیک و دور کا لحاظ رکھتے ہوئے واجب سمجھتے ہیں۔ جہاں تک دل کو دل سے راہ ہونے کی بات سامنے آتی ہے اس سلسلے میں کمی اور فاصلے کے امتیاز کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ میری نظر میں یہ کمزوری نہیں بلکہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ کسی سے اس کی شکایت بالکل

(باقی ص ۲۳۸ پر)

ایس ایم عمر فرید

اختر اورینوی سے ایک ملاقات

بوئے گل

نالۂ دل

دودِ چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

رہگزاروں پر، دکانوں میں، دفتروں میں اور مکانوں پر روزانہ ہزاروں اشخاص سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ سیکڑوں افراد سے تعارف و رفاقت کے ذریعہ نئی شناسائیاں ہوتی ہیں، کتنے ہی افراد ایسے ملتے ہیں جن کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ہم بالکل فراموش کر جاتے ہیں، کتنے ایسے ملتے ہیں جن کی شخصیتیں حافظہ پر اپنی تصویر کا ہلکا سا عکس چھوڑ جاتی ہیں جو از خود گردش زمانہ کے ساتھ حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے اور بہت کم افراد ایسے ملتے ہیں جن سے ایک بار بھی شرف ملاقات حاصل ہو چکنے کے بعد عرصہ تک دل و دماغ پر ان کی شخصیتوں کا نقش ثبت رہتا ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کی شخصیت بھی اپنے ہی عظیم انسانوں کی شخصیتوں جیسی ہے۔

کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں بہت عرصہ سے ڈاکٹر اختر اورینوی کی شخصیت سے غائبانہ متعارف تھا، ان سے متعلق کئی کہانیاں اور افسانے سن چکا تھا، ان کی شخصیت کی عظمت کا بارہا تذکرہ ہو چکا تھا، متعدد مرتبہ میرے کچھ احباب نے انکے گوناگوں فضائل سے مجھ کو روشناس کرایا۔ اختر اورینوی نہ صرف پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی آبرو بلکہ ایک عظیم افسانہ نگار، کامیاب ناول نویس و ڈرامہ نگار، مستند نقاد اور شاعر کے علاوہ کئی یونیورسٹیوں کے اکزامینر بھی ہیں سے میرا شوق ملاقات روز افزوں بڑھتا رہا، لیکن شرف ملاقات کے حصول کا یہ جذبہ اندر اندر سلگتے رہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا، لیکن ——— ایک بار ایک اہم ضرورت درپیش آئی، اس مسئلہ کا حل اختر صاحب ہی کے پاس تھا۔ میں سنتا آیا تھا کہ اختر صاحب کی شخصیت بڑی ترنم ریز اور نفع بخش ہے۔ آج تک جو بھی اپنے حل کئے جانے والے مسئلہ کو لیکر اختر صاحب کے یہاں گیا خوش و خرم لوٹا، کسی کو اختر صاحب نے نہیں جھڑکا، اپنی ہمہ دانی کا رعب کسی پر نہیں بیٹھایا اور اپنی شخصیت کی عظمت کو غرور سے کبھی ملوث نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود مجھے تنہا وہاں چلے جانے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ چونکہ اس سے قبل ان کے یہاں کبھی نہ گیا تھا اس لئے یہ حجاب بھی مانع تھا کہ اپنی ضرورت پیش آ گئی تو اس کے لئے وہاں گیا۔ آخر انسان ہوں، لاکھ خرابیوں کے باوجود مطلق خود غرض تو نہیں۔ جانے میں بڑے تکلف کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا کہ اختر صاحب کے کسی "ملاقاتی" کو شامل کر لیا جائے، یا کم از کم ایسے کسی شخص کا

ایک خط ہی تعارف کے لئے لیتا چلوں ۔ مگر اپنے اخبار "قومی تنظیم" کے سلسلہ میں ایک ایسا معاملہ در پیش تھا کہ ایسے کسی ملاقاتی کی جستجو یا خط کی تلاش میں تاخیر ہو جانے کا امکان تھا ۔ بالآخر میں نے اللہ میاں کا نام لیا اور پھلواری کی طرف دل ہی دل میں دعا و توبہ کرتا ہوا روانہ ہوا ۔

"اسلام وعلیکم" میں نے اختر صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ کر بہت ہی مودبانہ سلام عرض کیا ، موصوف نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیا ۔ مجھے کچھ تقویت حاصل ہوتی ، دیوار حجاب میں شگاف پڑا ، میں نے اپنا تعارف کرایا ، اختر صاحب نے توقع کے مطابق مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا ۔ رفتہ رفتہ چند ہی لمحوں کے اندر میرا یہ احساس قوی ہو گیا کہ اختر صاحب تکلفات کے قائل نہیں ۔ مجھے ایسا جان پڑا کہ جیسے اختر صاحب سے میری ملاقات بہت پہلے سے ہو ۔ وہ کچھ اس انداز سے پیش آرہے تھے کہ میرے اس احساس کے پیدا نہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا ۔ میں جس وقت وہاں پہنچا تھا ، اختر صاحب کسی ضروری کام کے سلسلہ میں باہر تشریف لے جانے والے تھے ، لیکن محض میری وجہ سے دیر تک اپنی قیام گاہ پر رکے رہے ، اسی درمیان میرا کام بھی ہو گیا اور کئی دیگر مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے میرے کام کو جس طرح اہمیت وا ولیت دی اس کا اثر آج تک تازہ ہے ۔ اس دور میں جب کہ ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا ، ایسی عظیم شخصیتوں کا موجود ہونا سارے ملک و قوم کے لئے باعث فخر ہے ۔ اور آخر کار وہی ہوا جس کا تذکرہ سنتا آیا تھا ، یعنی اختر صاحب کے اخلاق و عادات اور شخصیت کی عظمت کا باضابطہ اسیر ہو کر رہ گیا ۔ ؎

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

آپ اختر صاحب سے ملئے تو یقین ہو جائے گا کہ صرف روشناسی ہی نہیں دل شناسی بھی ہو رہی ہے ۔ اختر صاحب کی روش بڑی پاک و صاف ہے ۔ وہ دل میں نفاق و کینہ رکھ کر کسی سے نہیں ملتے ، دشمن سے بھی بڑی صاف گوئی سے ملاقات کرتے ہیں ۔ ان کی شخصیت بڑی سحر نگار و سحر خیز ہے ۔

ادیب ، انسانیت کا بڑا اہم جزو بدن ہے ۔ ادیب کی شخصیت عام انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور برتر و بہتر تسلیم کی جاتی ہے ، ادیب میں وہ خامیاں ، وہ کجرویاں یا وہ برائیاں نہیں ہوتیں جو عام انسانوں میں ہوا کرتی ہیں ۔ ادیب انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں اور دنیا کی فلاح و ترقی کے لئے انسانوں کے مابین بہتر تعلقات کے راستے ہموار کرتے ہیں ۔ اسی لئے سماج میں ادیب کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے ۔ وہ طبقہ واریت ، فرقہ پرستی ، نسل پرستی اور تنگ نظری جیسے فرسودہ خیالات سے بہت دور ہوتا ہے ۔ اعلیٰ اخلاق و کردار کے ساتھ اس کے اندر بے مثال ذہنی و فکری رہنمایانہ شان ہوتی ہے ۔ اختر صاحب میں یہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں ۔ آج جب کہ ادیب کے اخلاق و کردار بھی اعلیٰ قدروں کے حامل نظر نہیں آتے اور بیشتر ادیب مختلف قسم کی سماجی لعنتوں میں ملوث دکھائی دیتے ہیں ، اختر صاحب جیسی شخصیت کا موجود ہونا بسا غنیمت ہے ۔ اختر صاحب بڑے ادیب کے ساتھ ایک عظیم انسان بھی ہیں ، جس کے پہلو میں انسانوں سے محبت کرنے والا ایک گداز دل ہے اور جس کی دوربیں نگاہیں فروعی مسائل کی طرف دیکھنے کی بجائے ، انسانی فلاح و بہبود کے مسئلوں پر ہیں ۔ اختر صاحب نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے ۔ اس لحاظ سے موصوف کے کارناموں کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے ۔

بدرالنسا

اختر صاحب کی شخصیت بڑی ہی متنوع قسم کی واقع ہوئی ہے۔ میں تو انہیں صرف چند سال ہی سے جانتی ہوں۔ ویسے میں نے بچپن سے ان کا نام اور ان کے متعلق اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ میرے ذہن نے ان کا ایک پیکر تراش لیا تھا؛ اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ ذہنی پیکر ان سے بجنسہ ملتا جلتا ثابت ہوا۔

جب میں مگدھ مہیلا کالج میں سکنڈ ایئر آرٹس کی طالب علم تھی؛ اس وقت تھرڈ ایئر اور آنرز کی لڑکیوں سے اختر صاحب کے متعلق مزے مزے کی باتیں سنی۔ وہ سب کی سب متفقہ طور پر کہتیں "اختر صاحب کیا اچھے انداز میں پڑھاتے ہیں، ان کے کلاس میں جی تو گھبرا ہی نہیں سکتا، وہ پڑھانے میں دماغ کو بوجھل نہیں کرتے بلکہ تازگی بخشتے ہیں۔" میری تمنا تو پہلے ہی سے ان کو دیکھنے کی تھی، ان لوگوں کی باتوں نے میرے اشتیاق کو اور بھی بھڑکایا۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ میں سائیکولوجی میں آنرز کا پورا ارادہ رکھتے ہوئے بھی نہ کر سکی اور اردو کو اعزازی مضمون کی حیثیت سے لے لیا۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ میرے سبھی استاد مشفق و مہربان ثابت ہوئے۔

آنرز کلاس کا پہلا دن کس قدر کٹھن تھا میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ گھر کی فضا سے نکل کر لڑکوں کے ہجوم میں آ جانا ایسا ہی لگتا تھا جیسے دل بجائے سینے کے حلق میں آ گیا ہو۔ پروفیسر صمدالدین صاحب کا پہلا گھنٹہ تھا؛ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ باتیں کیں، گویا وہ گھنٹہ محض تعارف میں گزر گیا۔ دوسرا گھنٹہ اختر صاحب کا تھا۔ ان کے کلاس میں داخل ہوتے وقت دل کی دھڑکنیں پھر تیز ہو گئیں۔ ان کی عظیم اور باوقار شخصیت نے پہلی جھلک میں سارے کلاس کو متاثر کیا۔ وہ اس وقت اپنی میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے جس کو ہماری آمد نے روک دیا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر زیر لب مسکرائے اور کہا بیٹھئے!

ہم سب کے سب سمٹے سمٹائے اپنی اپنی جگہ پر مؤدب بیٹھ گئے۔ انہوں نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ سب نے اردو میں اعزاز حاصل کرنا چاہا ہے تو ذرا محنت کی ضرورت ہے، یہ نہ سمجھئے گا کہ یہاں نااہلوں کو فرسٹ کلاس مل جاتے ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے تہذیب و کلچر پر ایک بہت عمدہ لکچر دیا۔ ہم سب کے سب دھیان سے سنتے رہے لکھنے کو کسی کا بھی دل نہ چاہا، سبھی خاموش نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں اور دل و دماغ ان کی ساری باتیں مان لینے پر رضامند۔

اختر صاحب ہم لوگوں کو مومن پڑھاتے تھے، شاید ان سے بہتر اور کوئی مومن پر لکچر دے بھی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ مومن کی

لطافت، نفاست اور رومانیت خود ان کے مزاج کا ایک جزو ہے۔
سب سے بڑی مصیبت (جو آج نعمت نظر آتی ہے) یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں
کو صرف پڑھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہمارے اندر ادبی ذوق پیدا
کرنے کے خواہشمند تھے۔ وہ ہم سب سے باری باری غزل کو پڑھواتے
اور اگر کوئی شخص بحر سے ذرا ہٹ کر ایک ٹکڑا بھی پڑھتا تو اسے
اس طرح معصومیت کے ساتھ چوٹ کر دیتے کہ ہم سب کے لئے
ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو جاتا۔ صنفِ نازک کا ذرا خیال رکھتے تھے
مگر پھر بھی میں انہیں جانبدار نہیں کہہ سکتی۔ اس لئے کہ تشریح و تنقید
کرنے میں وہ کسی کو بھی نہ بخشتے تھے ساتھ ساتھ ہمت افزائی بھی اس قدر
کرتے کہ محنت کی طرف طبیعت راغب ہوتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ
ان کے کلاس میں بور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے
کہ اگر ان کے شاگرد پڑھنے کے موڈ میں نہ ہوں تو وہ زبردستی بھی نہیں
کرتے۔ میں ایک واقعہ سناتی ہوں، جب ہم لوگ ایم۔ اے فائنل
میں تھے، تو جاڑے کے زمانہ میں خوب بارش ہو رہی تھی۔ سردی کی
شدت کا یہ عالم تھا کہ سب کے ہاتھ پیر شل۔ قلم پکڑنا بھی دشوار تھا۔
دوسرے، بارش نے کچھ ایسی شاعرانہ فضا پیدا کر دی تھی کہ کتاب اور
وہ بھی کورس کی بے حد بور معلوم ہو رہی تھی۔ میرے خیال میں بارش کے
موسم میں چائے اور گپ سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔ ہاں تو اختر صاحب
نے اس دن ہم سب کو چائے پلوائی اور پھر بڑے دوستانہ انداز میں
اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو شعر و شاعری سے
بھی دلچسپی ہے۔ چند لوگوں نے اپنے اشعار سنائے، اچھے اشعار پر
انہوں نے اپنے شاگردوں کی پیٹھ ٹھونکی اور جی بھر کر داد دی۔ افصح
کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے جس کو انہوں نے بار بار پڑھوایا اور
خوب خوش ہوئے، وہ یہ تھا ؎

قیس و فرہاد و منصور کی شکل میں
سینکڑوں بار ہم آزمائے گئے

وہ اپنے شاگردوں سے بے پناہ ہمدردی رکھتے ہیں اور میں
یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ان کے شاگرد بھی ان سے بے حد
محبت کرتے ہیں۔ وہ سارے اسٹوڈنٹس سے اس طرح اخلاص
برتتے ہیں کہ ہر شخص اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہی سب سے
زیادہ قریب ہے۔ اختر صاحب اپنے شاگردوں کا ساتھ صرف
کلاس ہی میں نہیں دیتے، بلکہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔
غریب طلباء کی امداد کو وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کتنوں کی امتحان
فیس انہوں نے اپنی جیب سے جمع کی ہے اور لطف یہ ہے کہ کبھی
احسان نہیں جتاتے اس طور پر بھی کسی کو کچھ نہیں دیتے کہ لینے والا
احساس کمتری اور شرمندگی کا شکار ہو۔ کسی کو بطور انعام کچھ بخش
دیا، کسی سے کوئی چھوٹا موٹا کام کرا کے اسے معاوضہ کہکر رقم
حوالے کر دی۔ یہی ساری باتیں مل جل کر ان کے شاگردوں پر ایسا
گہرا نقش چھوڑتی ہیں جو تغیر زمانہ کے ہاتھوں بھی شاید ہی مٹے۔

یہ تو تھی پروفیسر اختر اورینوی صاحب، بڑی خوش نصیبی
کہیے کہ وہ ہماری خالہ سے منسوب ہیں۔ رشتہ داری کی بنا پر میں
ان سے اور بھی زیادہ بے تکلف اور کسی حد تک شوخ رہی ہوں۔
بی۔ اے کے امتحان کے زمانہ میں ہم لوگوں نے (میں اور میری بہن
سلطانہ) ان سے انگریزی پڑھی۔ رشتہ داری کے باوجود بھی بی۔ اے
کے فائنل ایر سے پہلے میں ان کے گھر کبھی نہیں گئی تھی۔ شام کو چار بجے
اپنے کالج سے فرصت پاکر جب ان کے یہاں گئی تو وہ کھانے کی میز
پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے روغنی روٹی اور ایک پلیٹ میں قیمہ
رکھا تھا۔ ہم دونوں سے کہا۔
"آؤ بھئی ساتھ دو" گھر پر ان سے ملنے کا پہلا اتفاق تھا،
لہٰذا تکلف دامنگیر ہوا اور میں نے جھٹ کہہ دیا کہ ذرا بھی بھوک
نہیں ہے۔ پھر پوچھا "چائے پیو گی" ؟ میں نے پھر انکار کر دیا۔ مگر
سلطانہ نے شاید ان کے خلوص کو پہچان لیا تھا اس لئے فوراً کہا
"ضرور پیوں گی" اختر صاحب ان کی بے تکلفی پر بہت خوش ہوئے
اور میری عظیم آبادیت کا خوب مذاق اڑایا۔ چائے سے فراغت
پانے کے بعد انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ انگریزی میں صلاحیت
پیدا کرنے کے گر سمجھائے۔ اس کے بعد سے تو آنے جانے کا سلسلہ

چلتا رہا جو خدا کے فضل سے آج تک قائم ہے۔ میں انہیں کی نگرانی
میں تحقیق کا کام کر رہی ہوں، اس لئے اکثر اوقات ان کے گھر جا کر بھی
کام کرتی ہوں۔ میں کسی وقت بھی چلی جاؤں، وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر
میری طرف توجہ دیتے ہیں، اور بڑی ہمدردی سے سب کچھ سمجھا دیتے
ہیں۔ میں نے ان کو آج تک غصے کے عالم میں نہیں دیکھا، میرا خیال ہے
انہیں غصہ آتا ہی نہیں اور اگر آ بھی گیا تو خدا نے ان کے دل میں اتنی
وسعت دی ہے کہ وہ ظاہر نہیں ہو پاتا۔

اختر صاحب طبیعتاً بھی رئیس واقع ہوئے ہیں۔ سادگی ان کی
فطرت ہے۔ گھر پر بے حد سادہ لباس پہنتے ہیں۔ آرام کے اوقات میں
لنگی اور بنیائن۔ گویا سارے تکلفات سے بری رہتے ہیں۔ شعبہ سے
واپس لوٹنے کے بعد کھانا اور پھر دو گھنٹے آرام سے آنکھیں بند کر کے
لیٹنا انہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ ان کے آرام کے اوقات میں کوئی
ملنے والا آتا ہے تو زیادہ تر اسے بیڈروم ہی میں بلا لیتے ہیں۔ کبھی کبھی
کسی کا یوں بے وقت آنا انہیں ناگوار بھی ہوتا ہے۔ مگر کیا مجال جو
اس ناگواری کا اظہار وہ کسی بھی رنگ میں کر دیں۔ ویسے ہی مسکرا
مسکرا کر باتیں کرتے رہیں گے۔ مزاج میں اتنی شگفتگی ہے کہ پہروں
ان سے باتیں کئے جائیے طبیعت نہیں گھبراتی۔ اپنے احباب کے درمیان
خوب قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو اس میں شریک کرتے ہیں۔

انہیں بچوں سے بے انتہا پیار ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی
دیکھئے کہ ان کے گھر اولاد نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنا سارا پیار بھائی
کے اور سالیوں کے بچوں پر صرف کر دیا ہے۔ وہ انہیں لوگوں کو اپنا
بچہ سمجھتے ہیں، ان بچوں کی ذرا سی بیماری سے ایسے گھبراتے ہیں جیسے
یہ سب انہیں کی اولاد ہوں۔ مگر کبھی ان کی خلش کبھی کبھی جھلک جاتی
ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے میں گھر کے سارے بچوں کو اتنا پیار
کرتا ہوں اگر اپنی اولاد ہوتی تو شاید اسے فریم کر کے رکھتا۔ ویسے
عام طور پر وہ اولاد کے نہ ہونے سے مغموم نظر نہیں آتے، انہوں نے
ہر حال میں خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔

مذہب کے متعلق اختر صاحب کا نظریہ بڑی وسعتوں کا حامل
ہے۔ انہوں نے اسلام کی عظمت اور گہرائیوں کو سمجھا ہے۔ اور شاید
اسی لئے وہ حقوق العباد کی ادائیگی میں کسی طرح کا کوتاہی نہیں برتتے۔ میں
نے ان کو کبھی کسی شخص کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے نہیں دیکھا۔ قرآن
کی تفسیر جیسی میں نے ان سے سنی اور سمجھی ویسی شاید ہی کسی سے سن سکوں۔
یہ احمدی فرقہ سے تعلق ضرور رکھتے ہیں مگر دوسروں کو برا نہیں کہتے۔ ابھی
اگست کا واقعہ ہے کہ جعفر حسن صاحب شعبۂ اردو کے سیمینار میں تقریر
کر رہے تھے، اتفاق سے مسلمانوں کے احمدی فرقے کا بھی ذکر آ گیا
جس کے متعلق جعفر صاحب نے یہ فرمایا کہ اس فرقے کے مسلمان کہے جانے
میں بھی بعض لوگوں کو اعتراض ہے۔ اختر صاحب برابر میں بیٹھے سب
کچھ سن کر بھی یوں مسکراتے رہے جیسے مذاہب کے ان جھگڑوں سے
بہت بلند ہوں۔ ان کی جبیں پر ہلکی سی شکن بھی تو نہیں ابھری۔ یہی
باتیں ان کی انہیں اور لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

گپ کرنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ ہے۔ انہیں بچوں کے پاس
بٹھا دیجئے یا بوڑھوں کے وہ سب سے اتنی ہی دلچسپی سے باتیں کریں گے۔
گھر کے نوکر چاکر سے بھی گپ کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کا رعب ہر جگہ
قائم رہتا ہے۔ ان کی اتنی شفقت ملنے پر بھی شاید ہی کوئی ان سے
شوخی کر سکے!

پھولوں سے انہیں بےحد شوق ہے۔ کیاری کے کنارے ڈنڈیوں میں موسم
کے رنگ برنگے پھول لگے ہوتے ہیں۔ گرمیوں کی شام عموماً سہانی ہوتی
ہے، مگر ان کے گھر تو مسحور کرنے والی شام آتی ہے۔ ان کے بیڈروم
کے دریچوں سے بیلے کی کلیاں جھانکتی ہیں اور پھر مسکرا کر سارے کمرے
میں خوشبو بکھیر دیتی ہیں۔ صبح و شام ان کے لکھنے کی میز پر ایک ڈبیا میں
پھول رکھے رہتے ہیں۔ ان کی تمام چیزیں اپنے کمرے میں بڑے سلیقے سے
رکھی رہتی ہیں۔ کسی کی مجال نہیں جو چیزوں کو ذرا اِدھر سے اُدھر کر دے
شاید اسی وجہ سے وہ اپنے کپڑے تک خود سے نکالتے ہیں۔ کسی کو بھی اپنا
بکس چھونے کی اجازت نہیں دیتے۔ صفائی اور قرینے سے رہنا انکی فطرت
ہے۔ اس کے باوجود بھی جب وہ غریبوں کے گھر جاتے ہیں تو یوں بے تکلف
بیٹھتے ہیں جیسے وہ کسی آسائش کے عادی نہیں ہیں۔ خدا نے انہیں بہت

(بقیہ ص ۱۷۱ پر)

ظہیر ناشاد

ایک واقعہ

میری زندگی کا سرمایہ

انسان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو ہمیشہ اس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ میری زندگی میں بھی بہت سارے حادثات و واقعات پیش آئے ہیں جنہیں میں کم و بیش بڑی تیزی کے ساتھ بھولتا جا رہا ہوں۔ مگر آج سے چار سال پہلے کے ایک واقعہ کی یاد ہنوز میرے دل و دماغ میں کچھ اس طرح درخشندہ و تابندہ ہے جیسے کہ وہ واقعہ آج ہی پیش آیا ہو۔ اور میں آج بھی اس واقعہ کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

دس اپریل ۱۹۷۶ء کو کلکتہ سے میں سید منظر امام کی شادی میں شرکت کی غرض سے جمشید پور گیا ہوا تھا۔ اسی موقع پر کوآپریٹیو کالج جمشید پور کے طلباء کی جانب سے ایک شاندار اردو سمپوزیم اور مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا مجھکو بھی بزم مشاعرہ میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ میں جس وقت مشاعرہ گاہ میں پہونچا ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب اردو زبان کی ترویج و ترقی اور مشاعرہ کی اہمیت پر نہایت فصیح و بلیغ زبان میں مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔ جلسہ گاہ میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ اور سامعین ہمہ تن گوش بنے ہوئے موصوف کی تقریر سے مستفیض ہو رہے تھے۔ میں اس حیات آفریں اور خیال افروز تقریر سننے سے پہلے موصوف کو صرف شاعر، نقاد اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اختر صاحب اتنے اچھے اور قادر الکلام مقرر بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر سننے کے بعد مشاعرہ کی کارروائی شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے کرسی صدارت سنبھالتے ہوئے شاعر کے نام کا اعلان کیا۔ مشاعرہ میں ہم نے اختر صاحب کو ہر ایک شاعر کے کلام پر داد دیتے ہوئے پایا۔ اور دوسروں کو بھی داد دینے کی ترغیب دلاتے ہوئے دیکھا۔ ایک شاعر کو بہت کم داد ملی تھی ڈاکٹر صاحب نے فوراً اعلان کیا کہ شعرائے کرام کی دلجوئی اور مشاعرہ میں دلچسپی پیدا کرنے کیلئے سامعین اور شعرائے کرام دونوں ہی سے درخواست کرتا ہوں کہ بلا کسی جانب داری کے ہر شاعر کے کلام پر کچھ نہ کچھ داد دیتے رہیں۔

اعلان نامہ کو سننے کے بعد اچانک غیر شعوری طور پر یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ یہ شخص بڑی معصوم طبیعت کا مالک ہے۔ اور مکمل اخلاق و شرافت کا مجسمہ ہے جب ہی تو اس جانب داری کے دور میں عوام سے عموماً اور شعرائے کرام سے خصوصاً اس طرح کی اپیل کرتا ہے۔ شاید اس شخص کو یہ نہیں معلوم کہ آج کے دور میں ہر اس شخص کو سادہ لوح اور بیوقوف سمجھا جاتا ہے جو بلا کسی غرض و غایت کے دوسروں کی امداد کیلئے ہاتھ بڑھاتا ہے اور دوسروں کی بھلائی کے بارے میں سوچتا ہے۔

رات بارہ سے تجاوز کر چکی تھی اور اس وقت تک بہت سے شعرائے کرام پڑھنے کو باقی تھے۔ منتظمین نے بیرونی شعرائے کیلئے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ رضا نقوی صاحب ادیس احمد دوراں اور میں ایک ساتھ کھانے کیلئے بلائے گئے۔ چنانچہ جب ہم لوگ کھانے پر بیٹھ گئے تو پتہ چلا کہ اختر صاحب

کو بھی اس صف میں بلا لیا جائے۔ رضا نقوی صاحب اختر صاحب کو مشاعرہ
گاہ سے ملانے کیلئے گئے اور چند منٹ بعد واپس آکر انھوں نے کہا کہ اختر
صاحب کرسی صدارت چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ رضا صاحب کی بات کو سن
کر میرا گمان یقین میں بدل گیا کہ اختر صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ان کا
اخلاق ہے اور وہ اپنے اسی اخلاق کی وجہ سے اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اختر
صاحب کے اخلاق کا ذکر بہت مشہور ہے۔ ایک ذکر مجھ سے بھی سنتے چلئے۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد رضا صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف
کرایا۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ ملے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران فرمایا۔
کہ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ابھی اس کا موقع نہیں ہے
کل صبح مجھ سے میری قیام گاہ پر ملئے۔ صبح کے ناشتہ پر آپ کا انتظار کروں گا
صبح کے وقت بستر سے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی اس لئے جلدی
جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر میں اور سید احمد شمیم اختر صاحب سے ملنے
کیلئے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں شمس فریدی سے ملاقات ہوئی اور وہ بھی ہمارے
ساتھ ہو لئے۔ تاخیر ہو جانے کے باوجود میں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ ابھی ڈاکٹر
صاحب آرام فرما رہے ہوں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ ان کو ہم سے مزدوروں
کی طرح سے تھوڑے ہی وقت کی کمی ہے؟ یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی
انتہا نہ رہی کہ وہ ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی ہماری آمد کا انتظار کر رہے ہیں
مجھ کو بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔ اور دل ہی دل میں اختر صاحب سے
متعلق جو کچھ سوچا تھا اس کے لئے پشیمان بھی ہوا۔

رضا نقوی صاحب نے کہا کہ ہم لوگ پہلے ناشتہ کر لیں پھر بعد میں گفتگو
کریں گے۔ ورنہ اختر صاحب کی لچھے دار اور دلکش انگیز گفتگو میں دیر
ہو جانے سے ناشتہ کی رعنائی ختم ہو جائے گی۔ اور خواہ مخواہ رضیہ
رعنا صاحبہ کے دل کو ٹھیس پہونچے گا۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے
اٹھے اور ناشتہ کا سامان اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت
قاسم صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ اس لئے میزبانی کا کام بھی ڈاکٹر صاحب
ہی انجام دینے لگے۔ رضا صاحب بھی اٹھ کر گئے اور ڈاکٹر صاحب کے
کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اس طرح سے ان دو بزرگوں نے نوکر کی موجودگی
میں ہاتھوں سے ہم نوجوانوں کی مہمان نوازی کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بزرگوں کو
کس طرح سے نوجوانوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنا چاہئے۔ ناشتہ
کی میز پر میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے کسی پکنک پارٹی میں شریک ہوں۔
اول تو ناشتہ لذیذ تھا۔ دوئم رضا صاحب جیسے بذلہ سنج انسان کا
موجود ہونا اور تیسرے اختر صاحب جیسے نکتہ فہم اور پربہار طبیعت کے
مالک یہ سب خوبیاں جہاں موجود ہوں وہاں کی دلچسپی کا اندازہ لگانا
آسان نہیں۔ دنیا بھر کے ناشتہ کی خصوصیات پر تنقید و تبصرہ کا
ایک طوفان اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور ہم لوگ مزے لے لے کر ناشتہ ہضم
کرتے رہے۔ اس طرح سے ایک دلچسپ اور پر مذاق فضا کے درمیان
کام و دہن کی آزمائش کا دور ختم ہوا۔

ناشتہ کے بعد ہم لوگ رات کے مشاعرہ کے متعلق گفتگو کر رہے
تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد رضیہ رعنا صاحبہ نے فرمائش کی کہ شعر و سخن
کا دور شروع کیا جائے۔ محترمہ رضیہ رعنا نے بھی اپنی ایک پیاری غزل
سے ہم لوگوں کو لطف اندوز فرمایا۔ اور ہم لوگوں نے بھی یکے بعد دیگرے
اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ میری غزل کے اس شعر پر ؎

اس طرح گنگنا رہا ہے دل
عشق میں کامیاب ہو جیسے

اختر صاحب نے کچھ اس طرح سے داد دینی شروع کی کہ میں بالکل
حیران ہو گیا کہ کہیں معاملہ الٹا تو نہیں ہے۔ موصوف نے کئی بار مجھ
کو اس شعر کے پڑھنے کیلئے کہا اور میں ان کے حکم کی تعمیل کرتا گیا
آج مجھے جب بھی اپنا یہ شعر یاد آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ اختر صاحب
کی یادیں میرے دل و دماغ میں تازہ ہو جاتی ہے۔

شعر خوانی کا دور ختم ہونے کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب سے
سوال کیا کہ آپ رات مشاعرہ میں ہر شاعر کے کلام پر خواہ مخواہ داد
دے رہے تھے۔ کیا آپ کی نگاہ میں ہر شاعر کا کلام داد کے قابل
تھا۔؟ موصوف نے جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی گڑگڑا کر مسکین نگہہ داد
طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھے اور میں اس کو داد نہ دے سکوں تو

اس سے بڑھ کر غیر اخلاقی فعل اور کیا ہو سکتا ہے۔ ویسے میں عام طور پر مشاعرہ میں دی گئی داد کو داد ہی سمجھنے کا قائل ہوں۔

میں نے موصوف کی صحبت میں یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ آپ حالات حاضرہ پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ انسان کے سینہ میں ایک ایسا دردمند دل ہے جو دوسروں کی مشکلات کا حال سن کر بے ساختہ ابل پڑتا ہے۔ رضا صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں مزدور لیڈر بھی ہوں۔ شاید اسی خیال کے پیش نظر اختر صاحب نے بڑی فنکارانہ چابکدستی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادبی گفتگو کا رخ مزدوروں کے موضوع کی طرف پھیر دیا اور مجھ سے گھنٹوں مزدوروں کے مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ دوران گفتگو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے چند ایسے اہم سوالات کیے جن کے متعلق میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک کامیاب مزدور رہنما بھی مشکل ہی سے تشفی بخش جواب دے سکتا ہے۔ جس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ڈاکٹر صاحب کو محنت کش طبقہ کی خستہ حالی کا بخوبی اندازہ ہے۔ اور مزدوروں کیلئے اپنے دل میں بڑی محبت رکھتے ہیں

مجھے جب کبھی اس یادگار صحبت کی یاد آتی ہے تو میرے دل و دماغ میں اختر صاحب کی ہمہ گیر اور پہلو دار شخصیت کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ اور جب کبھی میں ان کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے دل کے گوشے سے یہ آواز نکلتی ہے کہ اختر صاحب سرچشمہ محبت ہیں۔ مجسمہ اخلاق، علم و ادب کے شیدائی، مظلوموں کے حامی، انسانی جذبات کے مترجم، ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ اور جانب داری کے کٹر مخالف

ایک اور خاص بات جو مجھ کو اختر صاحب کے اندر دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ وہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے ہیں اور دوسرے ہندوستانیوں کی طرح کسی پرائی ڈگری، جاہ و حشمت اور شہرت و عظمت کا رعب جمانا سراسر کفر سمجھتے ہیں۔ دراصل میرے ناقص خیال میں اختر صاحب کا بھی یہی نظریہ ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک بڑا آدمی نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے سے چھوٹے اور کمتر انسان کے جذبات کی قدر کرنا نہ جانے۔ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے اخلاق و مقاصد کو بھینٹ نہ چڑھا دے۔ ڈاکٹر صاحب کے اندر ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے محض جاہ و منصب کی بنا پر ملنا نہیں چاہتے اور یہ ایک ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اپنے ہمعصروں میں سب سے جداگانہ اور ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

بقیہ:- اختر اورینوی ایک پروفیسر، ایک ادیب اور ایک شاعر

فضول ہے۔

میں کالج چھوڑنے کے بعد جب کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں آپ اپنی انہیں شفقتوں کے ساتھ مجھ سے ملے ہیں جن کی یادیں میری طالب علمی کے زمانے میں ہوا گیں ہیں۔ آپ نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی ہے اور اپنے ہر ایک ایسے طالب علم کے ساتھ محبت و مروت سے پیش آتے ہیں جن کی ذات سے ان کو ہونہار ہونے کا اندازہ آپ کی قیافہ شناس نگاہوں نے لگایا ہے۔ جنہوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے وہ آپ کے خلوص پہ ایمان رکھتے ہیں۔

یہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ موصوف کے سینے میں صرف ایک طرف کا پھیپھڑا کام کرتا ہے کیونکہ آپ کی شکل و صورت سے اس کا کوئی اندازہ نہیں لگتا۔ آج اس عمر میں سوائے سر کے بالوں کے کچھ سفید ہو جانے اور ڈھلنے کے دوسرا کوئی نقش خزاں چہرے کے خد و خال اور ڈیل ڈول میں نمودار نہیں ہوتا ہے۔ یہ آپ کی باقاعدہ زندگی، پرہیزگاری اور نفس مطمئنہ ہی کا صرف ثمرہ نہیں بلکہ آپ کی طبیعت کی شادابی اور شگفتگی میں آپ کی رفیق حیات شکیلہ صاحبہ کی خوش سلیقگی کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ محترمہ کی بے پناہ محبت اور دست وفا کا کرشمہ ہے جو اختر اورینوی کی صحت و تازگی کی ضمانت ہے۔

شرف عظیم آبادی

[یہ "اسکیچ" فکر تونسوی صاحب، ایڈیٹر "ادب لطیف" لاہور کی فرمائش
پر ان کی کتاب "خدوخال" کے لئے لکھا گیا۔ شرف، دہلی ۱۰ر جون ۱۹۴۷ء]

اختر: یعنی پروفیسر سید اختر احمد اورینوی میرے لئے ہمیشہ
اختر ہی رہے۔ اور میں نے بھی انہیں محض اختر ہی کی حیثیت سے جاننے کی
کوشش کی۔ اس اثنا میں وہ "اورینوی" بھی ہوئے اور "پروفیسر"
بھی۔ اور اس کے بعد ہندوستان کے ان چند مخصوص افسانہ نگاروں میں
بھی مان لئے گئے جو جدید اردو کے لئے مایہ ناز سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن
سچ کہتا ہوں، میں نے ان کی پروفیسریت کو اہمیت دی نہ اورینویت
کو۔ اور سب سے زیادہ ستم ظریفی تو شاید میں نے یہ کی آج تک اختر کے
افسانوں کو بھی کبھی دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس
سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے اختر کے افسانے پسند نہیں۔ پسند اور ناپسند
کا تو سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میں نے ان کے یا کسی کے بھی
افسانوں کو پڑھنے میں اپنا وقت برباد کیا ہو۔ افسانے، افسانے
ہی ہیں۔ پھر ان کو پڑھنا، ان پر تبصرہ کرنا، کبھی ہنسنا، کبھی رونا،
کہاں کی عقلمندی ہے۔؟ پھر مجھے قلمی افسانوں کی اس لئے بھی ضرورت نہیں
رہی کہ اپنی زندگی میں (زندگی میں اس لئے لکھتا ہوں کہ اب زندہ نہیں
ہوں!) میں اور اختر بہت زیادہ ساتھ رہے ہیں اور میں نے دیکھا کہ ان کی
شخصیت بذات خود ایک مستقل زندہ افسانہ ہے۔ جس میں عام افسانوں
سے بہت زیادہ رومانیت پائی جاتی ہے۔ اور اگر کسی انسان میں
خود بھی شعریت موجود ہے تو اسے اختر کی زندگی میں ہنسنے کی بھی چیزیں
مل جائیں گی۔ اور رونے کی بھی۔ آئیے میں اختر کو محض اختر کی حیثیت سے
آپ کے سامنے پیش کروں۔

اختر کے بچپن میں اس کے بزرگوں کا خیال تھا کہ اسے ڈاکٹر
بنایا جائے۔ چنانچہ ضروری امتحانات پاس کرنے کے بعد اسے میڈیکل کالج
میں داخل بھی کر دیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر بننے سے پہلے اسے خود مریض بن جانا
پڑا۔ اطبا نے اسے مسوری بھیج دیا۔ عام مریضوں کو وہاں صحت ہو جاتی
ہے۔ لیکن اختر ۔۔۔؟ اس کے مرض کو بیچارے ڈاکٹر کیا خاک سمجھتے۔
آخر میں ایک "تجربہ کار" شاعر کی طرف رجوع کیا گیا۔ اس نے اشاروں
ہی اشاروں میں اختر کے مرض کو پہچان لیا۔ اور اسے ایک خاص گاؤں کے
ایک خاص گھر میں رہنے کی ہدایت کی۔ اس نسخہ نے بڑا کام کیا۔ مسوری کی
ٹھنڈک نے جو نہ سکا گاؤں کی گرمی جہنم سے کم نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اختر کو
وہاں صحت ہوگئی۔ یہ تھا وہ نقطہ جہاں سے اختر کی کہانی شروع ہوتی
ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کی رومانی دنیا نے اختر کو ان کی آن میں
وہ سب کچھ بنا دیا جو آج وہ ہے ۔۔۔ شاعر، آرٹسٹ، افسانہ نویس

اور شعر ہے۔ لیکن یہ اسکی زندگی کا دیباچہ تھا۔ جس میں صرف رومانیت ہی نہیں بلکہ دیوانگی تھی۔ تبسم نہیں قہقہہ تھا۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا۔ سینا ٹوریم کی حسرتناک عمارت میں اختر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ لیکن آخر کار اس نے مرنے سے انکار کر دیا۔ سامنے اسی گاؤں کی بھابی کی گرمی میں اختر کو خود بخود صحت ہو گئی تھی۔ ایک لڑکی اپنے خود ساختہ تبسم میں اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یعنی اختر کا پُرانا دوست بھی، پہنچا جسکی محبت انگیز زندگی اختر کے انسانوں کے لئے ہمیشہ بہتیرے اسباب جراحت مہیا کرتی رہی ہے۔ یہ دونوں شاید دنیا کے سب سے بڑے ایکٹر ہیں۔ ان کے دلوں کے ٹکڑے جب زخم و محن کے طوفان میں گھر کر فضا میں بکھرنے کے لئے بے چین ہوتے ہیں تو یہ دونوں اللہ کے بندے ساری دُنیا کو قہقہہ میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ دُنیا ان کے نشتروں سے متاثر ہو کر روتی ہے۔ اور یہ دُور سے قدرت کی بدمزاقی اور دنیا کی تنگ نظری پہ ہنستے ہیں۔ مگر ہاں، گاؤں کی وہ لڑکی ان دوستوں کے رُلانے سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسکو اپنی اشک آلود آنکھوں میں انکے ریزہ ریزہ لخت ہائے دل باوجود قہقہۂ پیہم کے صاف نظر آ جاتے ہیں۔ کیا آپ شکیلہ اختر سے ابتک واقف نہیں؟

وہ دوسرا دَور بھی ختم ہو گیا۔ اب تیسرا یہ ہے کہ اختر ایک "مرکزی" کالج میں پروفیسر ہیں۔ اور روز گھنٹہ دو گھنٹہ پڑھا کر گھر چلے آتے ہیں۔ وقت کی فراوانی اتنی زیادہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ افسانوں کے مجموعے شائع ہوتے جاتے ہیں، لیکن عدیم الفرصتی نصیب نہیں ہوتی۔ شکیلہ باورچی خانے کے انتظامات اور مہمانوں کی دیکھ بھال میں وقت ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن وقت کی طوالت ان کی مصروفیت سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے تازہ افسانے تقریباً سب کے سب باورچی خانے کی گرما گرم فضا میں لکھے گئے ہیں۔ اتفاق سے ان لوگوں کے ہاں کوئی ہنستا کھیلتا یا روتا دھوتا "جانور" بھی تو نہیں جو کم سے کم ان کی کتابوں ہی کو منتشر کرتا رہتا اور ان کے درست کرنے ہی میں ان لوگوں کا کچھ وقت صرف ہو سکتا۔ ہاں، اختر کا وہ دوست عرصہ ہوا مر چکا اور اب اسکی مختلف قبریں پٹنہ، کلکتہ اور دہلی کے سکیریٹیٹ میں قدرت کی بدمذاقی کا ایک زندہ نمونہ پیش کر رہی ہیں۔ اور اسکی رُوح پُکار پُکار کر کہہ رہی ہے ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

اختر کو ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ادبی دنیا میں کونسی جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کا فیصلہ تو اس دور کی ادب نواز ہستیاں ہی کر سکتی ہیں۔ لیکن میں جب اس کے کامیاب افسانوں کے مختلف پلاٹ کو دوسروں سے سُنتا ہوں تو اسکی زندگی کے پہلے دونوں دَور میری آنکھوں کے سامنے پھر آ جاتے ہیں۔ اختر کے تخیل میں مسوری کی دلفریب فضا اور وہاں کی بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والوں کے رُومان کو کوئی اہمیت نہیں بلکہ اس کے قلم کی جنبش پڑھنے والوں کو خود بخود گاؤں کے اس کوئیں کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے جو وہاں کا رزارِ حُسن و عشق کا واحد اور بہترین مرکز سمجھا جاتا ہے ـــــ اور کیوں نہ ہو۔ اختر کی زندگی کا زیادہ حصّہ صحرانوردی اور دشت پیمائی ہی میں صرف ہوا ہے ـــ گاؤں کی ہر چیز کو شاعرانہ نظروں سے دیکھتا، دریائے سون میں روز کئی بار نہاتا اور وہ بھی اُس وقت جب گاؤں کے ہر مکان کی ہر کھڑکی پوری بے چینی کے ساتھ کُھلی ہوئی ہو۔ اُس روایتی کوئیں کا صبح و شام طواف کرنا اور وہاں کے جاتریوں کی شان میں کھڑا کھڑا فرداً فرداً ایک نظم کہہ ڈالتا۔ گاؤں کے ہر گوشہ میں رومانیت اور وہاں کی ہر چیز میں شعریت محسوس کرتا اور پھر ان تمام "مصیبتوں" کو اپنے افسانوں میں پیش کر کے ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اختر کو زندہ رکھ لینے والے گاؤں میں ہر وقت رومان کی بارش ہوتی ہے۔ وہاں کے درختوں میں پھول اور پھل نہیں ہوتے، شعر اور افسانے ہوتے ہیں۔ وہاں کا ذرہ ذرہ شاعر ہے اور انسانوں کے علاوہ وہاں کے جانوروں میں بھی کسی افسانے کا کیرکٹر بننے کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ماسوا، اور اس سرزمین میں وقت کی روانی کا کوئی اثر وہاں کے بسنے والوں کی عمروں پر نہیں ہوتا۔ تبھی جب سے اختر کی آمد و رفت وہاں شروع ہوئی اس گاؤں میں

کوئی بڑھا ہی نہ سکا۔ لہٰذا میں اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ اختر کی یہ خاص کرامت افسانوی دنیا کو شاید ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھ سکے گی۔

اختر کے آرٹ نے اسکی زندگی پر یا اسکی زندگی نے اسکے آرٹ پر کیا اثر ڈالا ہے، اس پر تبصرہ کرنے کی میں جرأت نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کے آرٹ سے نہیں بلکہ صرف انکی زندگی سے واقف ہوں جو میرے لئے بذاتِ خود ایک افسانہ ہے۔ ہاں، میں یہ کر سکتا ہوں کہ اس افسانہ سے کسی حد تک لطف اندوز ہونے کے لئے یہ بتا دوں کہ "پروفیسر اختر احمد اورینوی" کی صورت کیسی ہے، وہ بولتے کسطرح ہیں، کھاتے کس طرح ہیں، پیتے کسطرح ہیں، چلتے کسطرح ہیں (رونے کا تو سوال ہی نہیں کیونکہ ان کے قہقہوں میں آنسوؤں کے جراثیم بھی مر چکے ہیں۔) اور رہتے کسطرح ہیں؟ اختر کی صورت ویسے تو کافی دلکش ہے اور خصوصاً آنکھیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو ان کی طوالت ان کی جسمانیت کا سب سے نمایاں عنصر ہے۔ اور اس پر جب وہ اپنی اسلامیت ثابت کرنے کے لئے ایک فٹ اونچی ٹوپی بھی چڑھا لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قطب مینار چلا آ رہا ہے۔ لباس کے متعلق اب تک نہ تو وہ خود فیصلہ کر سکے ہیں کہ کون سے کپڑے ان کو پسند ہیں اور نہ دوسروں ہی کو اس نتیجہ پر پہنچنے دیتے ہیں کہ کونسا لباس انہیں زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پائجامہ اور پتلون کا سلسلہ چاہے اوپر جا کر ملتا ہو لیکن نیچے ان دونوں میں امتیازی فرق ہے مگر مسٹر اختر نے ان میں اب تک کوئی تفریق ہونے ہی نہیں دی۔ جب دل چاہا پائجامے کو پتلون سمجھ لیا اور پتلون کو پائجامہ۔ چاہے وہ خود اس کے لازمی اثرات کو محسوس نہ کریں لیکن ہوتا یہی ہے کہ کالج میں پڑھاتے وقت یا تو وہ پتلون پر شیروانی زیب تن کئے ہوئے پائے جاتے ہیں یا پائجامے پر کوٹ۔ ٹائی[1] کی بندشوں سے ان کی گردن ہمیشہ محفوظ رہی۔ ہاں جاڑوں میں وہ بہت ہی طولانی مفلر گلے سے لگائے رہتے ہیں۔ اور اوور کوٹ جس کے نیچے چھوٹا کوٹ یا شیروانی نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق قمیص سے بلاواسطہ ہوتا ہے ان کی ایک نمایاں چیز ہے۔ یعنی میں پھر وہی کہوں گا کہ جیسے کسی نے قطب مینار کو اوور کوٹ پہنا دیا ہو یا کسی "اینٹی ایر کرافٹ" (ANTI AIRCRAFT) پر غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ اختر کے جوتے ایک تو ویسے ہی ان کے قد و قامت کے لحاظ سے کافی بڑے ہوتے ہیں۔ اور اسپر وہ آج تک کبھی شرمندۂ پالش نہیں ہوئے۔ اور موزے تو جیسے عاشق کے دل کی طرح چھلنی ہوتے ہی ہیں۔

اگر کسی کو اختر کے گھر جانا ہو تو اُسے صرف اتنا جان لینا چاہئے کہ پٹنہ شہر کے فلاں حصہ میں رہتے ہیں۔ بس وہاں پہونچ کر اگر وہ ان سے کچھ بھی واقف ہے تو خود محسوس کر لیگا کہ اختر کا مکان یہی ہو سکتا ہے۔ یعنی کھڑکیوں کا نمایاں طور پر منتشر ہونا[2]، ٹیبل کلاتھ پر مختلف روشنائیوں کے متعدد دھبے۔ صاحب خانہ کی ادبی مصروفیت کا ثبوت دیتے ہوئے ملیں گے اندر سے اختر کی خود آواز آتی ہو گی اور پھر ہر منٹ پر اُن کا پُر زور قہقہہ۔ اندر جا کر دیکھئے تو ایک بہت بڑے کمرے میں، وہاں کی ہر چیز پر کتابوں کا انبار اور بیچ میں ایک بہت بڑی مسہری پر لحاف کے اندر اختر جلوہ گر نظر آئیں گے (اس نشست کے لئے ان کے نقطۂ نظر سے جاڑوں کی کوئی خاص قید نہیں) جو لحاف آج تک کبھی تہہ کرنے کے قاعدے سے رکھا نہیں گیا ہے۔ میں نے ایک بار اس نکتہ کی طرف اختر کی توجہ مبذول کرائی تھی تو انہوں نے کہا کہ "جب ہر شام کو اس کے اندر داخل ہو جانا ہی ہے تو پھر صبح کو اسے خواہ مخواہ تہہ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟" یہ جواب اتنا برجستہ اور معقول تھا کہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ اُنکی مسہری کو ان کے گھر میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس پر سونے کے علاوہ وہ بیٹھتے بھی ہیں۔ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ کھاتے بھی ہیں اور چہل قدمی بھی فرماتے ہیں۔ پہلے وہ نوار سے بنی ہوئی تھی لیکن جب اس قسم کے زلزلوں کی وہ متحمل نہ ہو سکی تو اس میں فولادی کا فریم لگا دیا گیا۔ اور اسپر موٹا گدا جس کے اندر بہ صحت آل انڈیا مسلم لیگ کا ہیڈ آفس بھی قائم ہے۔

اختر کھاتے کیا ہیں اور کس وقت کھاتے ہیں، اسکے متعلق میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کیا نہیں کھاتے اور کب نہیں کھاتے؟ کبھی ڈاکٹر نے انہیں کہہ دیا تھا کہ اپنے کھانے کا خیال رکھنا۔ اس نصیحت کو وہ کسی وقت بھی بھولنا نہیں چاہتے۔ صبح سویرے مکھن، روٹی، اور بہت سے پھل۔ تھوڑی دیر کے بعد کالج جانے سے پہلے کچھ میوے۔ پھر کیا

---

۱ اختر صاحب اب بڑی عمدہ اور نفیس ٹائیاں استعمال کرتے ہیں (ادارہ)

۲ اب اگر کوئی ان خصوصیات کے نشانہ پر اختر صاحب کے گھر پہنچنا چاہے تو اسے محرومی کا منہ دیکھنا پڑے گا (ادارہ)

اچھے کیس ہی بھلی ہو سالم جاتے ہیں جو کالج پہنچنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ دوپہر کو کھانے میں روٹی، چاول، سالن اور خدا جانے کتنی قسم کی ترکاریوں کے علاوہ تقریباً آدھ سیر ٹماٹر اور اس سے کچھ ہی کم پیاز بھی دسترخوان پر ضرور رہتی ہے۔ اور وہ خدا کے فضل سے کسی چیز کو بھی محروم نہیں کرتے۔ اگر کسی نے دسترخوان کی کسی چیز کے فوائد کے متعلق استفسار کر دیا تو ان کے لئے جملہ نباتات و جمادات کے فوائد و فضائل پر ایک زبردست تقریر کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ پھر شام کو بھی تفریحاً بہت سے بسکٹ، بہت سی پوریاں اور بہت سی مٹھائی۔

اس کے بعد رات کو تو ظاہر ہے کہ دن سے بہتر کھانا ضروری ہے۔

اب ان کے پینے کے متعلق بھی سُن لیجئے۔ صبح سویرے آدھ سیر بھینس کا دودھ (پینے اس "ماڈل" میں گاندھی جی سے بھی زیادہ پابند ہیں) پھر ناشتہ کے ساتھ چائے۔ کالج جاتے وقت ٹماٹر یا سنترے کا عرق۔ کالج میں دو بار لمنیڈ۔ شام کو پھر چائے یا شربت اور رات کو کھانے کے بعد پیالے کا دودھ۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پیتے — یعنی سگریٹ بھی نہیں۔

اختر کا انداز گفتگو بھی دنیا سے نرالا ہے۔ رسمی تعارف کے بعد کسی نئے آنے والے کے ساتھ چند منٹ تک تو پُرامن سلوک ہوتا ہے اور وہ غریب یہ سمجھتا ہے کہ پروفیسر صاحب نہایت متین و سنجیدہ قسم کے انسان ہیں اور وہ کبھی گاڑھے قسم کی ادبی گفتگو فرماتے ہیں۔ لیکن فوراً ہی آپ یہ دیکھیں گے کہ یہ دونوں بے تکلفی کے تمام مدارج طے کرنے کے بعد "عشق و محبت کا تعلق روح سے زیادہ ہے یا جسم سے" اس قسم کے موضوع پر نہایت روانی کے ساتھ اظہار خیال فرما رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اختر جو کہ معشوقہ سے ڈاکٹر بھی ہیں اس لئے عاشق اور معشوق دونوں کا پوسٹ مارٹم اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

اختر ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں کی "بھاشا" دلّی اور لکھنؤ کی اردو سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی تحقیق نے اردو الفاظ میں کچھ اضافہ ضرور کر دیا ہے۔ ایک روز کسی لکھنوی ادیب سے یہ الجھ پڑے۔ پوچھا "بانس کی آپ کے ہاں کتنی قسمیں ہیں، اور ان کے لئے الگ الگ کونسا لفظ ہے؟" بیچارے نے جواب دیا "ایک تو بانس اور دوسرا لاٹھی (غلطی) ہے۔" اختر نے کہا بس؟ اب میری زبان میں سُنئے — بانس، کنپی، چھیپٹی، پیکا، ڈنڈا، لاٹھی، سونٹا اور ان سب کا جدّ امجد بونگ" اور اسکے بعد ہر کی وجہ تسمیہ بالتفصیل بیان کی۔ اس طرح ایک دوست کی بی بی کے شاندار قد و قامت پر اظہار خیال کی ضرورت پڑی۔ کسی نے کہا

"قد و قامت ترا قیامت ہے" کسی نے کہا

"معاذ اللہ!" آپ نے کہا

"یہ بھی کوئی نہیں۔ کہئے معاذ اللہ کی پناہ!"

چنانچہ اختر نے اردو ادب پر احسان کیا ہو یا ظلم، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی چیزوں میں بہت سے فقرے ایسے لکھتے رہتے ہیں جو ادبی نقطۂ نظر سے گو کہ بلند پایہ نہ ہوں لیکن اپنی جگہ پر ہوتے خوب ہیں۔

لیکن ان تمام لطیف خصائل کے علاوہ اختر کی زندگی کا سب سے زیادہ رنگین پہلو کچھ اور ہی ہے۔ اختر نے نہ جانے تو اپنی زندگی میں ایک بار سے زیادہ کبھی آگ میں کودنے کی جرأت نہیں کی۔ اور جب اس میں ایک بار بھی کود پڑے تو زیادہ مجروح نہ ہو سکے۔ لیکن اب ان کو آگ کے شعلوں سے کھیلنے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ وہ انہیں بھولا سمجھ کر اپنی بے ساختگی میں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اور جب ان کے گرم گرم کانٹے اپنی پوری برقی لہر کے ساتھ انکی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو پھر ان کے لئے دست برداری کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ لیکن اختر کے اعتراف شکست میں پسپائی کی ندامتیں نہیں ہوتیں ابدا ت رندانہ کی مسرّت ہوتی ہے۔ اور اب تو آگ کے وہ شعلے بھی ان سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ ان کو جلاتے نہیں بلکہ ان کی دنیا کو لالہ زار بناتے ہوئے خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اختر اسی لحاظ سے واقعی بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کے دیکھتے دیکھتے چنگاریاں شعلہ بنیں اور شعلے جل کر راکھ ہو گئے۔ لیکن اس "ظالم" کی دو اینٹ

باقی صفحہ ۸۰ پر

رضا کریم رضا

وقت کے ہاتھ میں گو تو ہے گرفتار مگر
تیرے افسانوں میں ہے تیری محبت پنہاں
دامن فکر کا جو تار ہے خوں گشتہ ہے
ہر زمانہ تری تعظیم کرے گا تا حشر

موج دریائے ادب ہے پئے رفتار مگر
تیرے ہر نقد و نظر میں ہے صداقت پنہاں
تیرا ہر نغمہ تری تخلیق سے وابستہ ہے
موج احساس کی تکریم کرے گا تا حشر

....

کون سا غم ہے جسے تو نے غم دل نہ کہا
نقشہائے غم دل روئے حسیں پر دیکھے
جن کو تو نے غم دوراں میں چھپا رکھا ہے

کون سا رنج ہے جس کو سم قاتل نہ کہا
ہم نے ایسے بھی محن تیری جبیں پر دیکھے
یعنی اپنے لب خنداں میں چھپا رکھا ہے

....

تجھ کو غم دوست کہوں یا کہ رفیق مخلص
کون سا قصۂ غم ہے جسے تو نے نہ پڑھا
تو نے خود قصۂ غم سب کا سنا ہے ایسے

تجھ کو دمساز کہوں یا کہ شفیق مخلص
کون افسانۂ غم ہے جسے تو نے نہ لکھا
تجھ کو احساس غم و درد ہوا ہے ایسے

اس طرح جیسے کبھی چاند پہ بادل چھائے
جیسے کشکول کو بھر لے کوئی بھوکا سائل
خوش نما چاند نظر آیا مگر ہائے اداس

جس طرح چشمِ سیہ میں کبھی کاجل چھائے
یا کہ پھر چھٹ گئے جب ابرِ سیاہی مائل
خوش نما چاند ابھر آیا مگر ہائے اداس

....

یاد ہے جب کہ ترے دن بھی تھے بے رنگ اداس
یاد ہے جب تری راتیں بھی تھیں کالی کالی
تیرے محبوب کی زلفیں تھیں پریشان بہت

ماسوائے غمِ دل کچھ بھی نہ تھا تیرے پاس
جیسے بے برگ خزاں میں رہے سوکھی ڈالی
خود تری ذات سے وابستہ تھے ارمان بہت

....

ایسی ہی راتوں نے فنکار بنایا تجھ کو
تو نے کلیوں کو بھی کانٹوں کے قریں دیکھا ہے
بجلیوں کو بھی بنا ڈالا ہے بالِ جبریل
کوئی اختر نہیں دیکھا رخِ انور جس کا
تو نے دنیا کو دکھایا نہیں ہنستے ہنستے
تیری تقریر کے تحریر کے صدقے اختر
تجھ کو چونتیس برس پہلے کبھی دیکھا تھا

خود تری زیست نے شہکار بنایا تجھ کو
تو نے دنیا کی ہر اک شئے کو حسیں دیکھا ہے
دیر میں اور حرم میں بھی سجائی قندیل
کوئی منظر نہیں دیکھا پس منظر جس کا
تو نے دنیا کو رلایا نہیں ہنستے ہنستے
تیری اس حسرتِ تعمیر کے صدقے اختر

....

آج چونتیس برس بعد بھی دیکھا ہے تجھے

....

تو ہی اک محوِ تماشائے لبِ بام ملا
تو ہی ہر بزم میں چھلکتا ہوا جام ملا

اختر پاک نہاد کی تعلیمی زندگی

۱۹ ۶ ۶۵

از ولادت تا حجز ملازمت

۱۳ ھ ۸۴

از وفا طلب ابو اللسان محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاردی ۔ گیاوی

۱۳ ھ ۸۴

ولادت، سنہ ۱۹۱۰ء

اوترین اک گاؤں کی چمکی جو قسمت
تو چمکا اختر برج سعادت
سر دش غیب نے مژدہ سنایا
"چراغ خانداں" سال ولادت

۱۹۱۰ء

میٹریکولیشن، سنہ ۱۹۲۶ء

دیکھ کر ان کا جوہر قابل
خرم و شادماں تھا سارا گھر
جب بتدریج نیچے درجوں سے
میٹرک تک پہنچ گئے یکسر
کامیابی یہ بولا ہاتف غیب
میٹرک آج ہو گئے اختر

۱۹ ۶ ۲۶

بی۔ اے، سنہ ۱۹۳۴ء

جو میٹرک سے نکلا یہ خوش خو جواں
تو بی اے میں بھی ہو گیا کامراں
یہ تاریخ ہے بے سر اشتباہ
کہ "اختر بی۔ اے کر کے ہیں شادماں"

۱۹ ۶ ۳۴

ایم۔ اے، سنہ ۱۹۳۶ء

بی اے سے ہو کے ام۔ اے میں جو پہنچا یہ بلند اختر
وہاں سے بھی یہ نکلا کامیاب و کامراں ہو کر
ہوا خواہوں نے جب تاریخ پوچھی کامیابی کی
تو ہاتف بولا "ام اے پاس کر کے شاد ہیں اختر"

۱۹۳۶ء

ملازمت، سنہ ۱۹۳۸ء

ملازم جب ہوئے کالج میں اختر
تو رتبہ ہو گیا کالج کا برتر
سر افلاک سے ہاتف یہ بولا
سنین عیسوی میں "شغل بہتر"

۱۹۳۸ء

ڈی لٹ، سنہ ۱۹۵۷ء

جو علم و ادب میں ہوئے باکمال
تو اب یہ ادیب و سخنور ہوئے
یونیورسٹی میں ہوا غل تمام
مبارک ہو ڈی لٹ بھی اختر ہوئے

۱۹۵۷ء

دعائیہ ادیب العصر اختر اورینوی زندہ باد

۱۹ ۶ ۶۵

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

اختر تابندہ

۱۹۲۱ء کی ہنگامہ خیز تحریک ترکِ موالات نے ایک سخت جھٹکے کے ساتھ اس بندھن کو جو تعلیمی، علمی اور بڑی حد تک ذہنی زندگی کو باندھے ہوا تھا توڑ دیا اور میرے تقریباً سارے تعلقات منقطع ہو گئے لیکن پھر دار المصنفین کی عزلت و رہبانیت کے بعد ایک حسین اور رنگین رشتہ رفاقت نے ایسا جکڑا کہ پکے دھاگے میں بندھے پھر پٹنہ آنا پڑا۔ اس دہ سالہ وقفے میں پرانی مجلسیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ افرادِ زمین و آسمان کا انقلاب پیدا ہو رہا تھا اور ہر جگہ ایک نئی زندگی، ایک نئی چہل، ایک نئی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اسی زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ بہار کے آسمان افق پر ایک چھوٹا سا تارہ ابھر ہی نہیں رہا ہے بلکہ اس کی پرشوخ چشمک زنی اس طرف اشارہ کر رہی تھی کہ وہ نچلا بیٹھنے والا نہیں ہے بلکہ اپنی کرنوں سے تخلیقی ادب کے متعدد گوشوں کو منور کرے گا۔ میرا یہ خیال صحیح نکلا۔ اور بحمد اللہ اس کی ضیا پاشیوں نے تخلیقی دنیا سے آگے بڑھ کر تنقیدی اور ادبی تاریکی زاویوں کو بھی اپنی ضیا پاشیوں سے روشن و درخشاں کر دیا۔ اور آج اردو کی ادبی و تعلیمی دنیا اسی ستارے کو ڈاکٹر اختر احمد اورینوی کے نام سے جانتی ہے۔

یہ ستارہ ابتدا ہی میں "سرخ" تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ اس کی ساری ادبی تابانی خونِ جگر اور لختِ دل سے پروردہ تھی۔ پھر علالت کے زمانے میں اسپتال کے طویل قیام نے نہ صرف یہ کہ اس کو خاموش مشاہدوں کے انگنت مواقع دیا کئے بلکہ وہیں جا کر غمِ جاناں غمِ زندگی اور الم دوراں بن گیا۔ اس مرض آباد میں بھی جہاں ایک طرف موت و حیات کا محشر بپا رہتا ہے ایک طرف ان کو کرب و بلا کی چیخیں سنائی دیں تو دوسری طرف یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں بھی ایک حد تک کیوپڈ کی شوخیاں مرنے والوں کے سوکھے ہونٹ پر بھی حیات بخش تبسم پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر حصولِ صحت و طاقت کے لئے ارول جیسے رومان انگیز مقام کا قیام جہاں ہر طرف حسینہ اور جمیلہ ہی نظر آتیں۔ ان کی آئندہ علمی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے لئے خاموشی سے زمین استوار کرتا رہا۔ علالت ہی کے سلسلے میں ان کا مطالعہ بھی ہمہ جہتی اور وسیع تر ہوتا گیا۔ وہ سائنس کے طالب علم تھے۔ طب کے ابتدائی مراحل بھی انہوں نے طے کئے تھے اس لئے جب وہ ادب کی دنیا میں داخل ہوئے تو حقیقت، صداقت اور صحت بیان کی دوربین ان کے دماغ کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ ان کے

عزم راسخ اور ولولۂ حیات کا اس سے زیادہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مرض و موت سے ایک مومن کی طرح ہمیشہ سکون اور زیرِ لب تبسّم سے مقابلہ کیا ہے اور فاتحانہ دونوں کو شکست دے کر سلطنتِ ادب میں داخل ہو گئے اسی وقت سے وہ اس دربار میں ایک ممتاز جگہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ میسور یونی ورسیٹی میں صدر شعبۂ اردو کی جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے مجھ سے استفسار کیا میں نے ان کو رائے دی کہ آپ ضرور درخواست دے دیجئے کہ اختر کی تابانی اور بہاری اردو دوستوں کی حکومت کا حلقہ ہمالیہ کے دامن سے لے کر میسور کے ساحل تک پہنچ جائے لیکن شاید قضاء قدر کو ان کو اپنے ملک ہی میں تختِ صدارت پر جلوہ افروز کرنا تھا اس لئے انہوں نے درخواست دینے کا ارادہ ترک کر دیا اس یوسفِ ادب کو سلطنتِ ادب میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لئے وطن سے دور نہ جانا پڑا اس کے ساتھ ہی اس کو وطن ہی میں اپنی زلیخا بھی مل گئی کتنا خوش قسمت ہے وہ انسان جسے رفیقۂ حیات کی حیثیت سے ایک جیسا ادب جو ذہنی حیثیت سے ہم خیال اور ہم ذوق ہو مل جائے چنانچہ اس ادبی سفر میں بھی رفاقت کا پورا حق ادا ہو رہا ہے اور بحمداللہ وہ اپنی "منزل" سے مطمئن اور خوش ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جہاں اختر صاحب کے افسانے اسپتال سے شروع ہوتے ہیں وہاں ان کی رفیقۂ حیات کا افسانہ بھی اسپتال ہی کی فضا میں گھل جاتا ہے فرق صرف اتنی ہے کہ وہاں ایک نرس ہے اور یہاں میڈیکل کالج کی ایک طالبہ علم۔

میں اختر صاحب کی علمی، ادبی، تحقیقی کارناموں کے سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ مجھ سے زیادہ لائق بالغ نظر اور وسیع المطالعہ اس کام کو انجام دیں گے۔ میں تو ان کو صرف یہ دعا دوں گا کہ اللہ کرے آسمانِ ادب پر یہ ستارہ روشن سے روشن تر ہوتا رہے اور ان کو مخاطب کر کے کہوں گا کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بقیہ:۔ اختر صاحب

کہ جس نے خود کو پہچانا اور اپنی حقیقت کو پہچانا۔ وہ بڑے دعوے نہیں کر سکتا۔

ڈھ لگانے پر معلوم ہو کہ ان کے پسندیدہ ادیب ملٹن، ایلیٹ، رلکے، کیفکا، اسٹین بک، خلیل جبران، لطفی المنفلوطی، ٹیگور، نظیر اکبرآبادی، انیس، غالب، اقبال، شاد عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، مرزا رسوا، پریم چند، محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، منٹو، اختر شیرانی ـــــ اور ـــــ جوش، نیاز فتحپوری، کلیم الدین احمد، کرشن چندر، بیدی، قرۃ العین حیدر، اور احمد ندیم قاسمی ہیں۔

یہ ساری یادداشتیں وہ ہیں۔ جو میں ان سے اچک لایا تھا انہیں ہضم کر کے لکھنے کی ضرورت تھی، ان سے کھل مل جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا جاتا۔ وہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ مگر میں کیا کروں۔ اختر اورینوی نمبر میری مزید ملاقاتوں کے لئے رک نہیں سکتا۔

اس نمبر میں میری شرکت ضروری تھی۔ خواہ صورت وہی کچھ ہو کہ جو یوسف علیہ السلام کی خریداری کے سلسلے میں روئی کی انٹی والی بڑھیا کو پیش آئی تھی۔

پروفیسر سید شاہ ہدی

عزمِ حیات

ہندوستان کے چند اہم صوبوں کی طرح بہار بھی بہت زرخیز صوبہ ہے۔ یہ زرخیزی معدنیات یا کھیتوں کی موسمی نعمتوں ہی تک محدود نہیں۔ اسی زمین سے بیدل کے فنکار بھی اگے، وہ آسیح اور شاد کے نغموں کی شادابی بھی یہیں کے مٹی کا سوندھاپن اپنے ریشہ ریشہ میں چھپائے ہوئے ہے۔ علمار، حکمار اور صوفیائے کرام کی آوازیں آج بھی ماضی کے گنبدوں سے گونج رہی ہیں۔ بہار کا پرشکوہ ماضی اپنی بساطِ عظمت سمیٹ کر چلا گیا۔ لیکن بعد میں آنے والے زمانوں کے لئے کچھ گراں قدر روایتیں بھی چھوڑ گیا۔ کچھ حوصلہ آفریں بشارتیں بھی دیتا گیا۔ یہ انھیں روایتوں اور بشارتوں کا فیض ہے کہ اگر ایک طرف قاضی عبدالودود جیسا عظیم محقق تحقیقی موشگافیوں سے اردو ادب کی تاریخ کو صحت اور صداقت کی راہ دکھانے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ تو دوسری طرف کلیم الدین احمد جیسا ذہین نقاد اپنی تنقیدی بصارت سے فنِ تنقید کو "چشمِ بینا" کے منصب بلند تک پہونچانے کی کوششوں میں بلا خوف تردید و اختلاف رائے منہمک دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ایک طرف جمیل مظہری جیسے صاحبِ عظمت شاعر کے جذبات کی سرشاری، افکار کی بلندی اور پرواز کی شگفتگی ملتی ہے تو دوسری طرف اجتبیٰ رضوی جیسے بلند فکر منفی ماورائیت کے وہ نغمے بھی سنائی دیتے ہیں جو حیاتِ ارضی سے بلند ہونے ہوئے بھی اس کے ساتھ غداری نہیں کرتے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو سارے ہندوستان اور پاکستان میں بقدرِ مراتب شہرت اور وقار حاصل کر چکی ہیں۔ انہی کے صف میں اختر اورینوی بھی شریک ہیں۔

اختر اورینوی ایک لیسیار پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، انشاپرداز، محقق، معلم ادبیات، مقرر اور مبلغِ اسلام سب کے سب ایک ہی شخصیت کے گونا گوں عکس ہیں۔ ایک ہی چہرے کی تصویریں ہیں۔ جو مختلف زاویوں سے لی گئی ہیں۔ یہ تنوع حیثیات عکس ہے۔ دل کے اس مبارک کرب کا جو زندگی ایک حوصلہ مند فنکار کو بطور تحفہ دیتی ہے۔ جب اس کرب کو اظہار کا کوئی مناسب اور موزوں پیرایہ ملتا ہے اس وقت دل کی دھڑکنیں مترنم ہو جاتی ہیں۔ اور فنی شہ پارے وجود میں آتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ احساس کی شدت وسعتِ شوق کی بسیار رخی سے فکر اکر خستہ اور نحیف ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر فنکار کسی مخصوص صنف کی آواز "کاش کہ تم میرے ہوتے" سن لیتا تو شاید دنیا کو زیادہ فائدہ پہونچتا۔ غالب "محرم تماشا" ہونے کے شعور سے اس لئے دیتے ہیں کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو" لیکن کثرتِ نظارہ "سے وفاداری بشرطِ استواری" کی صداقت پر حرف نہیں آتا۔ ادب میں ایک زندگی کا اصول اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ اختر اورینوی صاحب نے مختلف بلکہ تقریباً

تمام اصناف ادب پر توجہ صرف کی ہے۔ اور ہر ادبی نمونہ ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کا مظہر ضرور ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک صنف سے وابستگی پر قناعت کر لینا اختر صاحب کی وسعت ذوق پر ظلم ہوتا۔ ان کی فطانت "خوب سے خوب تر" کی جستجو ترک کر کے افسردہ اور مضمحل ہو جاتی۔ تاریخ کے اوراق متنوع الاذواق مشاہیر کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اختر صاحب کو دامن سمیٹنے کا مشورہ دیا جائے۔ اختر صاحب نے کس کس صنف میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ان کے پڑھنے والوں میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ کسی کو ان کی تنقیدیں پسند ہیں، کوئی ان کے افسانوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے کوئی ان کی شاعری کا مداح ہے۔ غرض یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق اختر صاحب کی ادبی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔ میں اس وقت اس تفصیل طلب بحث میں حصہ لینا نہیں چاہتا۔ انشاء اللہ کبھی اور موقع پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت میرے سامنے صرف وہ تاثرات ہیں جو اختر صاحب سے ملنے اور ملتے رہنے کے بعد میرے دل میں پیدا ہوئے۔ اور میں اس وقت اپنی باتوں کو انہیں تاثرات تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

اختر صاحب مجھے بہت عزیز ہیں۔ ایک بلند انسان کی حیثیت سے بھی اور ایک مخلص خادم ادب ہونے کے لحاظ سے بھی میں نے کبھی ان کے متعلق اپنی رائے کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ان کی شخصیت میرے لئے بہت جاذبیت رکھتی ہے۔ میرے اس احساس میں اور کتنے اختر شناس شریک ہیں پر احساس کی نفسیاتی جڑیں تلاش کرنے سے کیا فائدہ؟ تحت الشعور کی پیچ در پیچ گلیوں کی خاک چھاننے سے کیا فائدہ؟ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" ختم بحث کیلئے کافی ہے۔ لیکن جب "ساغر نو" کے ادارے نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اختر اورینوی صاحب کے متعلق اپنے تاثرات اختر نمبر کیلئے بھیجوں اس وقت جی چاہا کہ صرف یہ لکھ کر روانہ کر دوں کہ حضرات! اختر اورینوی مجھے دل سے عزیز ہیں۔ اور عزیز رہیں گے کیوں؟ یہ نہ پوچھئے ع۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔ کسی سے جذباتی وابستگی کاروباری طور پر جانچ پڑتال کر کے پیدا نہیں ہوتی۔ کسی شخص کے متعلق تاثرات دوسرے کے دل میں اوصاف حمیدہ اور خصائل ستودہ کی مستند دستاویز لئے ہوئے داخل نہیں ہوتے۔ جذباتی لگاؤ میں مہاجنی حساب نہیں چلتا لیکن پھر اس خیال سے کہ ساغر نو کا ادارہ کہیں مجھے عدم دلچسپی کا الزام نہ دے بیٹھے "شریک کارواں" ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس فیصلہ پر پہونچتے ہی میں نے محسوس کیا کہ حافظے کی متعدد کھڑکیاں کھل گئیں۔ چند نقوش وقت کے دھندلکے سے نکل کر پردۂ ذہن پر حرکت کرنے لگے

میں تو سنہ ۵۰ء میں پٹنہ چھوڑ کر بلکہ ترک وطن کر کے کلکتہ چلا آیا تھا۔ پٹنے میں میری کالج کی زندگی سنہ ۳۳ء ہی میں مکمل ہو چکی تھی۔ کلکتہ آنے کے بعد بھی میں گرمی اور دسہرے کی چھٹیوں میں پٹنہ جاتا۔ عزیز رشتہ داروں اور احباب کی ملاقات سے تازہ دم ہو کر واپس آتا۔ چھبیس، ستائیس سال پہلے کی بات یاد آ گئی۔ میں اپنے چچا زاد بھائی سید شاہ جعفر حسین صاحب کے ساتھ پٹنہ کالج کے بیکر ہوسٹل میں ان کے چھوٹے بھائی سید شاہ اصغر حسین صاحب (اب پٹنہ ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ہیں) سے ملنے کیلئے ان کے کمرے میں پہونچا۔ گفتگو میں اختر اورینوی صاحب کا ذکر آ گیا۔ اختر صاحب کا نام سن چکا تھا لیکن جب اصغر سلمہٗ نے مجھے ان کی زندگی اور ادبی دلچسپیوں پر روشنی ڈالی تو شوق ملاقات پیدا ہوا۔ یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ اختر صاحب بھی بیکر ہوسٹل میں کسی سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اصغر سلمہٗ کے جانے پر وہ بھی ان کے کمرے میں چلے آئے۔ ان کے ساتھ پٹنہ کالج کے ایک خوش ذوق اور ذہین طالب علم طفیل احمد خاں بھی تھے۔ اختر صاحب سے باضابطہ تعارف کرایا گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے واقف تھے

اور تھوڑی دیر پہلے ہی اصغر شلہ نے ان کے متعلق جو باتیں بیان کی تھیں وہ اچھے تاثرات کیلئے مناسب پس منظر تیار کر چکی تھیں۔ اختر اُرینوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ ایک کشیدہ قامت نوجوان اضمحلال کے باوجود آنکھوں میں ذہانت کی چمک، ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم جو شکست و فتح کی طویل آنکھ مچولی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ خدوخال سے ابھرتی ہوئی انفرادیت کی علامتیں نمایاں، گفتگو میں ایک متوازن بے ساختہ پن۔

ان کے تشریف لانے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کس طرح ایک طویل مدت تک سیر دق خون تھوکتے رہے۔ کس طرح ٹی۔ بی جیسے مہلک مرض سے ایک مرحلے تک پنجہ کشی کرتے رہے۔ موت کے خون آلود جبڑے سے اپنی زندگی کو کیوں کر بچانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے حوصلۂ حیات کو محترمہ شکیلہ اختر کے حسن رفاقت نے کس طرح سہارا دیا۔ یہ سب باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ وہ زندگی اور موت کی اس بے رحم کشاکش میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے۔ انکی تخلیق اس وقت بھی موت کے آگے شکست کا اعتراف نہیں بنی۔ وہ انتہائے یاس میں بھی زندگی کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے۔ آخر موت پر فتح پا کر رہے۔ میرے دل میں یہ سب باتیں سنکر اختر صاحب کیلئے جو جذبۂ رحم پیدا ہوا تھا اس وقت ان کو اپنے سامنے ایک فتح مندانہ شان سے مسکراتا دیکھ کر جذبۂ احترام میں بدل گیا۔ میں زندگی کے ایک فاتح سپاہی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ممکن ہے اس وقت بھی ان کے زخمی احساس سے خون رس رہا ہو۔ لیکن حوصلہ مند تبسم کا پردہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے زخم احساس کی تازگی بے نقاب نہ ہو سکی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ بات شعر خوانی پر ٹوٹی۔ دو گھنٹے بہت دلچسپ گزرے۔ نشست ختم ہونے کے بعد ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے میں گھر لوٹ کر بھی دیر تک اختر صاحب سے متعلق سوچتا رہا۔ ان سے مل کر میں متاثر ہوا تھا۔

اس کے بعد اختر صاحب سے ملاقات ہوتی رہی۔ جب بھی میں پٹنہ جاتا تو ان سے ملنے کی کوشش کرتا۔ اکثر مشاعروں میں بھی ملاقات کا موقع ملتا رہا۔ ہر ملاقات میں فاصلہ دور ہوتا گیا۔ وہ قریب سے قریب تر آتے گئے۔ قریب سے دیکھنے کے بعد میں بہت خوش ہوں۔ اختر صاحب کی توانائیاں بھی میرے پیش نظر ہیں۔ اور ان کی معذوریاں بھی۔ وہ عصر حاضر کے تقاضوں اور نئے رجحانات کا احترام کرتے ہوئے بھی کافی حد تک روایت پرست ہیں۔ اپنے مذہبی عقائد میں کٹر ہیں اور روایت پرست ہوتے ہوئے بھی وہ آزادی افکار کو "ابلیس کی ایجاد" نہیں سمجھتے۔ دینی ادبی زندگی میں حدود کے اندر رہتے ہوئے خود بھی آزادئ فکر سے کام لینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اپنے مذہبی عقیدے کو کسی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہ ہر جگہ اس موضوع پر اپنی تبلیغی انشائیوں سے کام لیتے ہیں۔ اتنی ملاقاتوں کے بعد بھی مجھے یاد نہیں آتا کہ اختر صاحب نے کبھی میرے سامنے کوئی مذہبی بحث چھیڑی ہو۔ یہ توازن، یہ اعتدال ان کو اس توفیق زندگی سے ملا ہے۔ جو فن شناس فطرت زندگی سے محبت کرنیوالے فن کاروں کو دیتی ہے۔ مجھے تو اختر صاحب کے دل و دماغ کا یہ تضاد بہت حسین نظر آتا ہے۔ اس تضاد کے بغیر زندگی یک صوت اور یک رخی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جذب و فکر کی بوقلمونی باطنی تضادات ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میرے سیاسی اور سماجی نظریات اختر صاحب کے افکار کی ضد ہیں۔ لیکن یہ اختلافات دونوں کے باہمی قرب کو متاثر نہیں کرتے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر اختلاف رائے قابل احترام ہوتا ہے۔ اور بقول شخصے مکمل اتفاق رائے دو احمقوں ہی کے درمیان ہو سکتا ہے۔ دلی لگاؤ ذہنی ہم آہنگی سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر صاحب خواہ روایت پرست ہوں یا روشن خیال اپنے سینے میں ایسا دل ضرور رکھتے ہیں جو اپنی بیڑیاں توڑنا چاہتا ہے۔ جس کی دھڑکنیں،

احساس انسان دوستی کی ساری موسیقی اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی ہیں
کئی ایک مواقع ایسے بھی آئے جب میں اختر صاحب کے سامنے غیر ارادی
طور پر اپنی آپ بیتی کے چند وہ حصے دہرانے لگا جو جگ بیتی میں شامل نہیں کئے
جا سکتے اور نہ ان سے کسی دوسرے کو دلچسپی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن میری
حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اختر صاحب میرے
مسئلہ کو بھی اپنا ہی ذاتی مسئلہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اتنا بے ریا اور بے ساختہ
خلوص آج کی دنیا میں بہت کم نظر آتا ہے۔

اختر اورینوی کی شخصیت سے متعلق محترمہ شکیلہ اختر کی تحریر بہت
اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں جہاں شوہر کی بے پایاں محبت پر ناز کرنے والی
بیوی کے نکھرے ہوئے جذبات ملتے ہیں، وہاں کچھ باتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن
سے اختر صاحب کی انسان دوستی کا دوست پروری، احباب پرستی
وغیرہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ انداز تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ شکیلہ اختر
صاحبہ کی باتیں صداقت پر مبنی ہیں۔ اور زیب داستان کیلئے مبالغہ
آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اگر کہیں یہ فتح مندانہ احساس ملتا ہے کہ اختر
صاحب کی شخصیت نے سنگھانے میں ایک فرض شناس اور وفا پرست بیوی
کی جذبات آرا مشاطگی نے بھی اپنا کمال دکھایا ہے۔ وہاں ان کا بھی اعتراف
ملتا ہے کہ خود شکیلہ اختر صاحبہ کی تشکیلِ ذوق کافی حد تک انہی کے رفیق
غالب کے حسن صنم تراشی کی رہین منت ہے۔

بیگم شکیلہ اختر کی تحریروں اور احباب سے سنی ہوئی باتوں سے
قطع نظر جب میں اپنے تجربوں کی روشنی میں اختر صاحب کی شخصیت کا
جائزہ لیتا ہوں تو مجھے چند چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اختر صاحب
کا دل وادیِ اضطراب سے گذر کر ایک ایسی منزل اضطراب میں پہنچ گیا ہے جہاں
ناآسودگی میں بھی آسودگی ہے۔ کرب میں بھی سکون ہے۔ محرومیاں بھی
کامرانیاں ہیں۔ اس منزل اضطراب تک ایک فنکار کے سوا کوئی نہیں پہنچ
سکتا۔ اختر صاحب کے ذوق کی رنگا رنگی اسی سعادت اضطراب کی
بزم آرائی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجھے یہ نظر آیا کہ اختر صاحب صرف
خود بلند ہونا نہیں چاہتے وہ دوسروں کو بھی بلندی تک لے جانے کی
کوشش میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ معتبر اور مستند ادیبوں اور
شاعروں کے علاوہ نو واردان بساطِ ادب کی بھی ایک بڑی تعداد اختر
صاحب کی تنقیدی توجہ سے بہرہ مند ہوئی ہے۔ اپنی مسلسل زندگی کی
طویل مدت میں سینکڑوں نوجوانوں کے ذوق کی رہنمائی کی ہے۔ آج
ان کے ایسے شاگرد بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جو دنیائے ادب میں خود اپنی
جگہ بنا چکے ہیں۔ تیسری بات جو میرے خیال میں سب سے زیادہ اہم ہے
وہ یہ ہے کہ اختر صاحب کو زندگی اور زندگی کے تمام مظاہر سے محبت
ہے۔ یہی محبت انسانی عظمت کا راز ہے۔ یہ محبت روایت پرستی سے
مجروح ہو جا سکتی ہے۔ لیکن مغلوب نہیں ہو سکتی۔ یہ تو موت کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دینے کی جادو علم ہے۔ یہی زندگی ہے۔ محبت کرنے
والوں کو عظیم سمجھتا ہوں۔ ہر وہ شخص جو زندگی پر جان چھڑکتا ہے
وہ اس کا مستحق ہے۔ کہ میں اس پر جان چھڑکوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں
کسی کو زندگی کی بے کلاہی کا قصیدہ فراز دار پر لکھتے ہوئے پاتا ہوں اس
وقت میں اپنا سر بلند ہوتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ جو شخص زندگی سے
بھاگتا ہے۔ وہ میرے قریب نہیں آ سکتا۔ وہ کسی کے قریب نہیں جا سکتا۔
محبتِ حیات ہی عظمت انسانی کے پرکھنے کی واحد اور معتبر کسوٹی ہے۔
جانچنے پرکھنے کے دوسرے طریقے سب اسی کسوٹی سے مانگے گئے ہیں
نہ ہو کہ جیسی میری نگاہ میں زندگی کی محبت اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ تو
پھر یہ کیوں کر ممکن ہو کہ اختر صاحب جیسے پرستارِ زندگی سے محبت نہ کروں
ان کی شخصیت کو بلند پایہ نہ سمجھوں

دعا گو ہوں کہ اختر صاحب کے دل میں زندگی کی یہ محبت مزید وسعت
اور شدت اختیار کرکے ایک بحر بے کنار بن جائے، جس کی موجوں سے نوجو
دلوں کے طوفان ہمیشہ کھیلتے رہیں۔ یہ دعا صرف اختر صاحب ہی کیلئے
نہیں میں اپنے لئے بھی مانگ رہا ہوں۔ کاش زبان میں اثر رکھنے والے اس پر
نظر "آمین" میں بخل سے کام نہ لیں۔

سہیل عظیم آبادی

اختر — ایک محبوب شخصیت

"یہ ہیں اختر — اور یوزی اور یہ ....."
ہم دونوں کے عزیز دوست زبیر احمد تمنائی نے ہمارا تعارف کرایا۔

اب سے لگ بھگ تیس سال پہلے کی بات ہے۔ رمضان کی آخری تاریخیں تھیں۔ عید آنے والی تھی۔ اختر مراد پور کی دکان سے سیاہ مخمل کی ٹوپی خرید رہے تھے۔ اور عید منانے کے لئے گھر جانے والے تھے۔ اختر سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ان کا نام سنا تھا۔ اُن کے افسانے، مضامین، نظمیں اور غزلیں پڑھ چکا تھا۔ اور یہ بھی سُن چکا تھا کہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے کہ دوسروں کو موت کے منھ سے بچائیں۔ لیکن خود دق کے شکار ہو کر اٹکی سینی ٹوریم میں موت سے زور آزمائی کر رہے تھے۔ خوشی کی بات یہ تھی، کہ وہ موت کو شکست دے کر پھر سے اپنی زندگی کو سنوارنے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ وہ زمانہ آج سے بہت مختلف تھا۔ چند ہی نئے لکھنے والے ابھر رہے تھے۔ انہیں سے کچھ تو ابھرنے سے پہلے ہی خاموش ہو چکے تھے۔ اور کچھ لوگ ادب کے میدان سے الگ ہو کر نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔

ان نئے ابھرنے والوں میں اختر سب سے ممتاز تھے۔ اُن کی بیماری سے ادبی حلقے میں بڑی تشویش تھی۔ اور صحت یابی سے اتنی ہی خوشی۔ معلوم نہیں کہ اختر نے اس وقت میری کوئی تحریر دیکھی بھی تھی یا نہیں، یہ پوچھنے اور جاننے کی کبھی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ لیکن وہ ملے بڑے اخلاق سے۔ اور اس سرسری ملاقات میں ہم لوگ کچھ اس طرح ملے کہ جب الگ ہوئے تو اجنبیت باقی نہیں رہی تھی۔ میں اختر کی سادگی، سنجیدگی اور پر خلوص انداز گفتگو سے بے حد متاثر تھا۔ اور اختر کے لئے میرے دل میں جگہ تھی۔

لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہم لوگ جلد ہی دوست بھی بن گئے۔ دوستی قائم ہونے میں بہت کافی دن لگ گئے۔ اور یہ ہم دونوں کے حالات کا تقاضہ تھا۔ اختر شاید ایم اے کی تیاری کر رہے تھے۔ اپنی صحت کی وجہ سے بڑی احتیاط اور وقت کی پابندی کرتے تھے۔ اور میں کئی سال تک کلکتہ کی خاک چھاننے کے بعد پٹنہ آیا تھا۔ کچھ ادیب، کچھ انقلابی اور کچھ سیاسی کارکن بننے کے خبط میں مبتلا تھا۔ صبح کے وقت جو ناشتہ کر کے اٹھتا تھا

تو دس بجے رات سے پہلے کبھی گھر واپس نہ آیا تھا۔ کانگریس
سوشلسٹ پارٹی اور کسان سبھا کا چکر تھا۔ ہم دونوں کی راہ
الگ الگ تھی۔ مشغولیتیں الگ الگ تھیں۔ صرف ادب سے دلچسپی
ایسا نقطہ تھا۔ جہاں ہم دونوں آکر ملتے تھے۔ اختر جس ہوسٹل
میں رہتے تھے۔ وہ میری قیام گاہ سے بہت ہی قریب تھا۔ ہوسٹل
کے احاطے کی دیوار اور میری قیام گاہ کے درمیان ایک پتلی سی
سڑک تھی۔ اس ہوسٹل سے میرا کچھ جذباتی تعلق بھی تھا۔ اور وہ
یوں کہ جس مکان میں میں پیدا ہوا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ کر اسی ہوسٹل
میں کسی طرح کھو گیا تھا۔ اب اس مکان کی زمین پر ہوسٹل کا کوئی
حصہ ہے۔ کبھی کبھی ہوسٹل کی طرف جاتا بھی تھا۔ لیکن شاید ہم دونوں
وضع دار تھے۔ نہ تو میں اختر سے کبھی ملنے ہوسٹل میں گیا۔ اور نہ
کبھی اختر میری قیام گاہ پر آئے۔ پہلی ملاقات کے بعد جان پہچان
ہو گئی تھی۔ اور کبھی کبھی سرِ راہ ملاقات بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ان کا
سارا وقت تعلیمی مصروفیتوں میں گزرتا تھا۔ اور میرا وقت ایسے
کاموں میں کہ جن کو اب سعیِ رائگاں کہنا ہی پڑتا ہے۔ اس طرح
ہم لوگ ایک دوسرے کو جاننے کے باوجود بہت نزدیک نہ آسکے۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک صورت نکل آئی۔ تمنائی علی گڑھ
چھوڑ کر پٹنہ آگئے۔ اور انہیں کتابوں کی اشاعت اور تجارت
کا خبط ہوا۔ پٹنہ کالج کے پاس ہی ایک دو منزلہ مکان کا
بالائی حصہ انہوں نے کرایہ پر لیا۔ اور منصوبہ بندیاں شروع
ہو گئیں۔ کتابوں کی اشاعت اور تجارت تو کیا خاک ہوتی۔
البتہ ان کی قیام گاہ دوستوں کی ملاقات کا مرکز اور ہنگامہ
آرائیوں کا اڈہ ضرور بن گیا۔ اس زمانے میں ہم لوگوں کے لئے
پٹنہ سچ مچ آباد تھا۔ شرف، اطہر، یحییٰ، رضا، تمنائی اور اختر
کے علاوہ اور احباب بھی تھے۔ اور سب اپنے اپنے رنگ میں
رنگے ہوئے۔ بے فکری، خوش گپیاں، ادبی سرگرمیاں، تنقیدیں،
تعریفیں اور چھیڑ چھاڑ۔ اور اس طرح وقت گزار دینا۔ اطہر نے
اپنے اوپر فرض عائد کر لیا تھا۔ کہ ہر ایک کو لکھنے پر مجبور کریں۔
اور سختی برتتے۔ وہ مضامین، افسانوں اور نظموں کا مطالبہ اس
سختی سے کرتے تھے، جیسے سود خوار کابلی قرضہ کھانے والوں
سے سود کا مطالبہ کرتا ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ
سخت۔ ہزار بات بنا کر نکلنے کی کوشش بے سود۔ بات بنانے
میں اطہر سے جیتنا آسان کام نہ تھا۔ وہ خود ہزار میں ایک بات نہ
لکھنے کا وعدہ کرنے کے بعد نہ لکھنے پر وہ جملہ بازیاں کہ سن کر تلملا
جائیے۔ اور آسانی اسی میں نظر آتی کہ جو بن پڑے لکھ کر ان سے جان
چھڑائیے۔ شرف کا سنجیدہ مذاق، یحییٰ کی پرگوئی۔ رضا کی شرارتیں اور
جملہ بازیاں جس نے بعد میں ترقی کر کے انہیں سنجیدہ شاعر سے مزاح نگار
بنا دیا۔ تمنائی کے ترجمے، اختر کی ہمہ گیری۔ جب محفل جم جاتی
تو پھر مزا آ جاتا۔ اب تو ان کو بیان کرنا بھی آسان نہیں۔ کیا کیا
شرارتیں ہوتی تھیں۔ ان کو یاد کر کے بے ساختہ اقبال کا مصرعہ
یاد آتا ہے ؎

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اس دور کی سب سے دلچسپ شرارت پنچایتی شاعری تھی۔ کہیں
مشاعرہ ہونا طے پایا۔ طرحی یا غیر طرحی۔ پنچایت بیٹھی شرکت کا
فیصلہ کیا گیا۔ اور پنچایتی غزل تیار کی گئی۔ ایک ایک دو دو
مصرعے سب کے۔ اور اس غزل میں بڑی بڑی صنعتیں برتی جاتیں۔
ہر مصرعہ بلند آہنگ اور خوبصورت۔ تراشی ترشائی استعارے
خوبصورت، بندش چست۔ لیکن خوبی یہ کہ ایک مصرعے کو دوسرے
مصرعے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور شعر بالکل بے معنی۔ غزل پڑھنے
کی خدمت مظفر نقوی کیف کے سپرد تھی، جو ہم لوگوں میں سب سے کم
عمر تھے۔ خوش رو اور خوش الحان تھے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ
مشاعرے میں غزل سناتے۔ سمجھنے والے دم بخود رہ جاتے کہ یہ کیا
ہے۔ اور بے سمجھے داد دینے والے جھوم جھوم کر داد دیتے۔ اور پنچایت
ایک طرف بیٹھی لطف اندوز ہوتی۔ داد دینے والوں کی سخن فہمی کی
داد دیتی۔ اب یہ جان کر کیا کریں گے کہ داد دینے والوں میں کون
کون سے سخن فہم تھے۔ اسے راز میں رکھا جائے تو بہتر ہے۔ پھر مشاعرے

کے بعد دیر تک تبصرے کئے جاتے۔ اور لطف اٹھایا جاتا۔ ایک ضروری بات کہہ دینی ضروری ہے۔ اس پنجابی غزل میں میرا حصہ سننے اور داد دینے سے آگے کبھی نہ بڑھا۔ طبیعت کی غیر موزونی کی وجہ سے پنجابیت کو چھوڑ کے میں کبھی ایک مصرعہ بھی نہ دے سکا۔

اس ٹولی کے علاوہ ایک اور ٹولی تھی۔ جو ادبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ گرچہ اس ٹولی میں رضی عظیم آبادی جیسے خوش گو شاعر اور رام برکش بینی پوری جیسے افسانہ نگار اور انشا پرداز موجود تھے۔ لیکن پھر بھی یہ ٹولی زیادہ سیاسی تھی۔ اور میرا زیادہ وقت اسی ٹولی میں کٹتا تھا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں ادب میں ترقی پسندی کی تحریک نے دونوں ٹولیوں کو ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا۔ صرف چند وہ احباب جن کے گلے میں سرکاری ملازمت کا پھندا پڑ چکا تھا۔ شریک نہ ہو سکے۔ اختر بھی شریک تھے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اختر اور دوسروں میں کیا فرق تھا۔ دوسرے لوگ جوش میں بہت دور تک جانے کو تیار تھے۔ لیکن اختر کے اپنے خیالات تھے۔ وہ ادب میں ترقی پسندی کے قائل تو ضرور تھے۔ لیکن اپنے خیالات میں پختہ تھے۔ وہ قائل تھے کہ ... لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل۔ جب بھی کوئی بات ان کے خیالات سے ٹکرائی تو وہ بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ اختلاف کرتے۔ اور اس پر بحث بھی کرتے۔ اس وقت ہم میں سے اکثر لوگوں کو ان کی طرف سے مایوسی ہوتی تھی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ شاید اختر ہم لوگوں سے پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ "پس دیوار کچھ اور بھی ہے" اور وہ ذرا اور دور رہنے لگے۔ گرچہ دوستوں کے ساتھ وہی برتاؤ، وہی خلوص، وہی تعلقات رہے۔

پھر جیسے ہوا پلٹ گئی۔ اختر پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔ اطہر منصف ہو گئے۔ تمنائی بابائے اردو کے ساتھ دلی چلے گئے اور میں رانچی۔ ساری محفل ہی منتشر ہو گئی۔ پٹنہ میں صرف بھی، رضا اور اختر رہ گئے۔ بس اتفاقات ملنے کا موقع دیتے تو ملاقات ہو جاتی ورنہ سب اپنے اپنے دھن میں۔ پھر بھی دوستی کی گرہ اتنی مضبوط پڑی تھی کہ شاید کوئی بھی ایک دوسرے کو نہ بھول سکا۔ اور جہاں تک اختر کا تعلق ہے۔ انہیں تو بھولنے کا سوال پیدا ہوتا ہی نہیں۔ اختر کی ذات میں کچھ ایسی کشش اور محبوبیت ہے کہ ایک بار ملنے کے بعد انہیں کوئی بھول جائے ممکن ہی نہیں۔

اختر پروفیسر ہیں، افسانہ نگار ہیں، نقاد ہیں، شاعر ہیں۔ اور ان حیثیتوں میں ان کو جاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان کے علاوہ اختر کی ذات میں ایسی خوبیاں ہیں۔ کہ اس زمانے میں عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔ اتنی ساری خوبیاں ایک ذات میں بڑی مشکل سے اکٹھا ہوتی ہیں۔ اور میں انہیں خوبیوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

اختر اپنے باپ کے بے حد سعادت مند بیٹے ہیں۔ اتنے سعادت مند کہ اب اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ چھٹی ملی اور اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر۔ خواہ ایک ہی دن کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ حاضری ان کا جزو ایمان۔ رشتہ داروں سے ایسی محبت کہ کچھ نہ پوچھئے۔ فرصت ملی اور ایک ایک سے مل آئے۔ خود ان کا گھر ایک بڑا مسافر خانہ ہے جہاں ہر روز ایک قافلہ آتا ہے۔ اور ایک جاتا ہے۔ اگر کسی سے ملاقات میں زیادہ دیر ہو گئی۔ تو اختر صاحب فکر مند۔ کوئی رشتہ دار یا دوست یا جانا پہچانا بیمار ہوا۔ تو اس کے لئے فکر مند۔ عیادت کو جانا اور دلاسا دینا تو معمولی بات ہے۔ دوستوں کی فکر ان کو۔ کون کس حال میں ہے۔ اور شاگردوں کا خیال ان کو۔ آخر کون کہاں جائے گا۔ اور کیا کرے گا۔ دوست ان کی کمزوری۔ اگر کسی سے رنج بھی پہنچا تو مسکرا کر ٹال گئے۔

تعلقات کو نباہنا اختر کا فن ہے۔ جس سے تعلقات ہو گئے۔ اس کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نباہنے کا سلیقہ اختر کی طرح کم لوگوں کو آتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ نقصانات بھی اٹھاتے ہیں۔ جو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دوسرے کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اختر مذہبی خیالات میں بڑے سخت ہیں۔ لیکن دوستیوں میں

مجاز جیسا رند خرابات بھی تھا۔ مجاز اختر کے ساتھ ٹھہرتے تھے اور شغل جام و مینا میں مصروف بھی رہتے تھے۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ اختر کو اپنے اوپر کتنا جبر کرنا پڑتا ہوگا۔ لیکن اختر تھے کہ برداشت کرتے تھے۔ اور یہ بھی چاہتے تھے۔ کہ کاش مجاز شراب چھوڑ دے۔ مجاز کی بات بھی چھوڑئیے۔ اس میں بھی عجیب بات تھی۔ احباب اس کی بہت سی زیادتیوں کو بخوشی برداشت کر لیتے تھے۔ اختر کا سلوک سارے دوستوں کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہے۔ اختر نے بہتوں کی زیادتیاں برداشت کی ہیں۔ اور آج بھی اُن سے اسی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مذہبی عقائد یا خیال کے اور اختلافات کو وہ دوستی کی راہ میں ہرگز نہیں آنے دیتے۔ اپنے مذہبی خیالات میں شدت رکھنے کے باوجود کبھی دوسروں کے مذہبی عقائد سے بحث نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک دو بار خود ان کو تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹھیک اسی طرح وہ دوستوں کے سیاسی خیالات سے بھی بحث نہیں کرتے۔ اگر کبھی کسی مسئلے پر بحث نکل بھی آئی تو اختر اسی وقت تک بات کریں گے جب تک بحث علمی اور عقلی سطح پر ہو۔ جہاں جذبات کو چھونے والی بات آگئی۔ تو اختر اس بحث ہی کو ختم کر کے دوسری بات چھیڑ دیں گے کہ تلخی پیدا نہ ہو۔

اختر کے دوست اختر کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو کسی حال میں بھی رنج پہنچانا نہیں چاہتے۔ وہ وقت اختر کے لئے شاید سب سے زیادہ تکلیف اور اس کے ساتھ بدحواسی کا ہوتا ہے۔ جب اُن کے دو دوستوں میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے۔ میں نے ایک دو بار محسوس کیا ہے کہ اختر کس کرب کے عالم میں ہوتے ہیں، اور اختلاف کو ختم کرنے کے لئے کسطرح بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت تک انہیں چین نہیں آتا جب تک اختلاف ختم نہ ہو جائے۔

اختر کی ذات قدیم و جدید اعلیٰ قدروں سے مرکب ہے۔ بزرگوں کا احترام، دوستوں سے محبت اور خلوص، عزیزوں کے ساتھ شفقت۔ ہر لمحہ دوسروں کے جذبات کا خیال۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں، جو مٹتی جا رہی ہیں۔ لیکن اختر کی ذات میں بھرپور ہیں۔ اور شاید ہر روز ان خوبیوں میں عمر کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جو لوگ اختر سے ملے ہیں۔ ان کو اندازہ ہے کہ اختر کی ذات میں کتنی محبوبیت ہے۔ جتنا زیادہ ملئے اتنی زیادہ ان کی محبوبیت نکھرتی نظر آئے گی۔ میں تو جب بھی اختر کی شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو حافظ شیراز کا شعر دماغ میں گونجنے لگتا ہے۔

حق نمی یابم مجال اے دوستاں
گرچہ او دارد جمالِ بس جمیل

تاریخ اشاعت

سید ظفر الدین شمس گیاوی مینائی

برس رہا ہے جو اعزاز ساغر نو سے
۱۹۶۵

وہ آب نیساں ہے اختر اورینوی نمبر
۱۹۶۵

دعائیہ تاریخ

ہاتف نے دی صدا لبِ بامِ فلک سے شمس
دائم رہیں جہان میں اختر اورینوی
۱۹۶۵

محمد طفیل

اختر صاحب

"اپنے ہیرو کے قریب نہ جاؤ۔ اُس کی عظمت
مداحوں کے قُرب کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

مذہب ——— اور ——— رومان!

انہی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آیئے انہیں ڈھونڈ نکالیں۔

ویسے تو یہ پروفیسر ہیں اور نامور پروفیسر، میں ادب کا ایک طالب علم ہوں اور گمنام طالب علم، اس لئے میں ایک ایسی ہستی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جسے پڑھنے کے لئے علم کی کتنی سیڑھیاں طے کرنی پڑیں ——— اور پھر جانچنے کے لئے؟ ——— اس کے لئے تو اس سے بھی زیادہ ڈگریاں چاہئیں۔ شخصی پرکھ کی ڈگریاں!

دانا کہتے ہیں کہ کتابیں نہیں پڑھ سکتے تو انسانی چہرے پڑھو۔ میں کہتا ہوں۔ کتابیں پڑھنے کے باوجود انسانی چہرے نہیں پڑھے جاتے۔

مجھے اختر صاحب سے "کیمپی یا کالجی" درس لینے کا تو موقع نہیں ملا۔ مگر ذہنی طور پر میں انہیں استاد مانتا ہوں۔ امام مانتا ہوں۔ استاد علم کے معاملے میں، امام کسی اور معاملے میں!

بات طالب علم اور استاد کی چل نکلی ہے، اس لئے میں بھی اختر صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے پہچاننے کی کوشش کروں گا۔ صرف کوشش، جو نامکمل بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی۔! تصور کر لیجئے۔ اس وقت ایک محقق کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے اور وہ بڑے طنطنے کے ساتھ بول رہی ہے:۔

ابتدائی تعلیم کا زیادہ حصہ اورین (وطن) اور مونگیر میں طے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسکالرشپ ملی۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک سائنس کالج پٹنہ میں رہے۔ اسکالرشپ ملی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۴ء تک ام۔ بی۔ بی۔ اس کی ابتدائی ڈگریاں لیں اور بی اے آنرز کیا۔ گولڈ میڈل ملا۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے اُردو کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہوئے۔ گولڈ میڈل ملا۔ ڈی لٹ ۱۹۵۷ء میں کیا۔

یہاں حلول شدہ محقق کی روح سے معذرت کئے لیتے ہیں۔ تاکہ آپ میری باتیں بھی سن سکیں۔

اگر مندرجہ بالا واقعات میں ایک دو اور واقعات کا اضافہ

کر دیا جائے تو ان کی سوانح عمری مکمل ہو جائے گی۔ مثلاً ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک انگلی سینی ٹوریم میں رہے اور درس و تدریس کی ملازمت ۱۹۳۶ء سے کی تو بس' اختر اورینوی کی زندگی کے موٹے موٹے واقعات آگئے اور اگر ان کی کچھ عادات پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہو تو یہ جان لیجئے کہ انہیں وٹامن کھانے کا ہوکا ہے۔ خود بھی کھاتے رہتے ہیں اوروں کو بھی کھلاتے رہتے ہیں۔ مجلس آرا ہیں۔ مگر کبھی کبھی گوشہ نشینی کو اپنی جان کے بچاؤ کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ زندگی سے کبھی تو مطمئن ہوتے ہیں اور کبھی ناآسودہ۔ شاگردوں کو جگر کا ٹکڑا سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ بہت اکھڑ و نکتہ سنج ہیں۔ دوسروں پر فقرے چست کرتے رہتے ہیں اور اگر کوئی ان سے مذاق کرے تو بگڑ جاتے ہیں۔ ویسے دوستوں کے درمیان اپنے اوپر پھبتی پر بھی ہنس لیتے ہیں۔ احباب سے یہ خوش ہیں اور احباب ان سے خوش!

کھانے میں، لباس میں، آرائش میں، ان کی پسند کچھ اس قسم کی دریافت ہوئی ہے:۔

کھانے میں — بھنا ہوا چنا، ہرا چنا، کاجو، بسنی روٹی، انڈے کا حلوا، بھنا ہوا مرغ، [illegible] کھچڑی، فروٹ پڈنگ، فرنی!

— لباس میں — صاف عام پسند کپڑے، جن میں شیروانی بھی شامل، سوٹ بھی شامل — آرائش میں — صاف ستھرا کمرہ، جس میں کسی قسم کی آرائش نہ ہو، پھول بہت پسند ہیں، ایشیائی بھی، مغربی بھی!

دیکھ لیجئے میں نے چند ہی سطروں میں کتنی معلومات فراہم کر دیں۔ تعلیم کا حال لکھ دیا۔ عادات لکھ دیں۔ پسندیدہ اور مرغوب چیزوں کے بارے میں لکھ دیا۔ ہو گیا نا مضمون مکمل؟

لیجئے وہی محقق کی روح پھر آن نازل ہوئی۔ گویا ہوئی:۔

"برخوردار محمد طفیل کی معلومات ناقص ہیں۔ یہ دکھ اس وقت اور بھی سوا معلوم ہوتا ہے۔ جب ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ برخوردار کے اختر صاحب کے گھرانے سے قریبی تعلقات ہیں۔ خاکے

طور پر صرف چند کوتاہیوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ مثلاً — اختر صاحب کو ۱۹۱۶ء میں ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ جس میں یہ چالیس دن تک مبتلا رہے تھے۔ پھر ۱۹۲۰ء میں انہیں ناسور ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں کالا آزار، ۱۹۲۵ء میں وجع مفاصل، ۱۹۳۱ء میں پھیپھڑوں کی کمزوری، غالباً سل، پھر ۱۹۳۴ء میں دوبارہ سل کا اور ۱۹۳۷ء میں (دوبارہ) وجع مفاصل کا حملہ ہوا، مگر ان کے مضمون میں اس کا کہیں ذکر نہیں اور کہتے ہیں — مضمون مکمل ہو گیا — "چہ خوب"!

میں اس مضمون میں ایسی واقعاتی باتوں کو کم سے کم لانا چاہتا تھا۔ مگر کچھ روایتی تقاضوں کی خاطر، اور کچھ "دو اور دو چار" قسم کے حضرات کے لئے کہیں کہیں اس بدعتِ حسنہ سے کام لینا پڑے گا۔ اجازت ہے؟

ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اختر صاحب جو کچھ ہیں اور جیسے کچھ ہیں۔ وہ تو مندرجہ بالا سطروں میں آگئے ہیں۔ چونکہ ہمیں کچھ اور کچھ اور کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس لئے میں بھی بال کی کھال اتاروں گا۔ خواہ سلیقہ ہو نہ ہو۔

بچپن میں انہیں کبڈی اور فٹ بال سے دلچسپی تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اختر صاحب آج بھی کبڈی اور فٹ بال سے شوق فرماتے ہوتے تاکہ دیکھنے والوں کو لطف آتا۔ ہم سب بڑے عجیب واقع ہوئے ہیں۔ جو کام ہمیں اسی عمر میں کرنے چاہئیں۔ وہ ہم پہلے کر کے دوستوں کے لئے مسرتوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ بچپن میں برابر بیمار رہے۔ شرارت جو بچوں کا حق ہے۔ اس کے لئے انہیں فرصت ہی نہ ملی۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی سے نہ بچے لطف اندوز ہوئے نہ بوڑھے۔

کالج میں پہنچے تو اور لڑکوں کی طرح ہا ہا ہُو ہُو ان کا بھی روزمرہ تھا۔ یہ عمر وہ ہوتی ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ ہر چونکانے والی بات کی دھن، مرکزِ نگاہ بننے کی آرزو، ہر شرارت پر طبیعت آمادہ، ہر ذمہ داری سے آزاد — یہ دور کیا دلچسپ ہوتا ہے۔ جس میں مسرتوں کا ارتباط، ہر بے راہ روی سے منسلک ہوتا ہے۔

انہوں نے بھی مقدور بھر "کالجیٹ" بننے کی کوشش کی۔ بن ٹھن کے رہتے تھے۔ لڑکیوں کی طرف سے مطمئن تھے؟ کالج کے ہیرو جیسے ہیں۔ اس خوش فہمی کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے خلاف فارسی اور عربی میں نظمیں لکھیں جب شاہ جہاں ہال کو سن اور پھیروں میں اپنی گالیاں دیں۔ اس لیے کہ وہ راستے کا روڑا تھے۔

ان کے ایک "یار کارٹونسٹ" تھے۔ جو ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے اور وہ تصویریں لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ جن پر ہنگامے بھی ہوتے تھے۔ تالیاں بھی پٹتی تھیں۔

نوجوان جو تازہ تازہ عشق فرماتے تھے۔ وہ سب کے سب ان کے پاس جا کر روداد بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی آشیرواد لیا کرتے تھے۔ تسکین پایا کرتے تھے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو بھلا آپ یہ خود کیسے خاموش رہتے۔ یہ بھی اپنے معاشقوں کی داستانیں سنانے لگے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ نوجوان، ہر اس نگاہ کو، جو ان پر اچانک پڑ گئی ہو۔ اپنے معاشقے کی ابتدا سمجھ لیتے ہیں ــــ لہٰذا معاشقوں کی کمی بھی کیا ہوگی۔

اختر صاحب میں جتنے بھی اوصاف تھے۔ وہ سب کے سب اچھے تھے۔ جو کالج کے لڑکوں کو بھاتے ہیں۔ اگر کوئی ان خوبیوں میں ہر دلعزیز ہوتا ہے یا مرکزیت کا درجہ حاصل کرتا ہے تو وہ اختر صاحب کا ہی شاگرد ہوتا ہے یا اختر صاحب کسی ایسے ہی استاد کے شاگرد ہوتے ہیں محض قابلیت، محض شرافت، تازہ خوں کو راس نہیں آتی۔

جی چاہتا ہے کہ ان دنوں کا ایک واقعہ بھی سنا ہی دوں!

جن دنوں یہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے وہاں کی نرسیں سب کی سب اینگلو انڈین تھیں۔ جوانی لڑکیوں پر بھی آتی ہے۔ لڑکیوں پر بھی "حسن چلے" یہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہوتی ہیں ــــ ماحول بڑا خوش نظر ہو، حالات امید افزا "ہوں" اور دو دلوں میں لڈو پھوٹنے کا ہو تو ایسے میں کسی ایک فریق کو شرارت سوجھے تو خود سوچ لیجیے کیا کیا لطف نہ آتا ہوگا۔ میرا خیال ہے اس ضمن میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سبھی مجھ سے زیادہ "باعلم" ہوں گے۔

پہلے زنیتیوں میں چھوٹی چھوٹی شرارتیں چلیں۔ کبھی کسی کا پلڑا بھاری رہا، کبھی کسی کا۔ اچانک ایک دن نرسوں کی طرف سے انگریزی میں ایک نظم آئی۔ جس میں سپرنٹنڈنٹ کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اختر صاحب کے سپرد اس نظم کا جواب دینا ہوا۔ ان سے انگریزی میں جواب بن نہ پڑا۔ اردو میں نظم لکھی۔ جو غالباً ان کی پہلی نظم تھی ع

خالِ رخِ حور لیسنے، حسنِ رخِ ڈیوڈسنے

حسبِ توقع یہ نظم خوب چلی۔ لڑکوں کی نرسوں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ ان آفت کے پرکالوں سے کترا کے نکل جاتیں۔ کس میں ہمت تھی۔ جو ترنم میں یہ سنتی ــــ خالِ رخِ حور لیسن ــــ

جیسے گھر والوں کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہو ــــ برخوردار تو لڑکیوں کے حسن کی تعریفیں بھی کرنے لگے۔ چنانچہ انہیں نے ان کی شادی کی سوچی۔ یہ ارطنکا ایسا ہے کہ بڑے بڑوں کے بل نکل گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی شادی کر دی گئی تاکہ یہ برخوردار فرہاد و وامق کی برادری میں اضافہ نہ کرے۔

باتوں باتوں میں اختر صاحب نے بتایا کہ ان دنوں انہیں ایک نہایت مشرقی بیوی کی تلاش تھی۔ جس میں مذہبی میلانات ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ رومانیت کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب میں بھی ایک طرح کی رومانیت ہے۔

یہ زندگی میں ہمیشہ دو دھاری تلوار سے کھیلتے رہے اور وہ تلوار تھی مذہب کی اور رومان کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انہیں بیوی مذہبی بھی ملیں اور رومانی بھی ــــ ورنہ الہ آباد وغیرہ صاحب کے بنگلے کے سو بہانے تھے۔

باتوں ہی باتوں میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں نے ان سے پوچھا۔ "کیا آپ خوفناک قسم کا بھی سچ بول سکتے ہیں"؟

"بفضلِ خدا"!

اب اس بفضلِ خدا قسم کے جواب کے بعد ہمت تو نہ تھی کہ کسی شرارت کی گنجائش ہوتی۔ مگر بات منہ سے نکل گئی ــــ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کیوپڈ آپ پر بڑا مہربان تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

استاد تو یہ ہیں ہی، فوراً پینترا بدل گئے ——— "ہاں میں نے بعض مذہبی شخصیتوں سے محبت کی ہے۔ لیکن اللہ میاں سے اب تک محبت نہیں ہو سکی۔ حضرت محمد صلعم کو بہت چاہتا ہوں۔ ملک کے قائدین میں پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کو بہت چاہا۔ دوستوں میں رضا نقوی، شرف عظیم آبادی، علی اطہر، زیڈ۔ اے۔ تمنائی، علی عباس اور محسن سے محبت کی ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے صاف جُل دے گئے۔ پوچھا کچھ، جواب کچھ۔ یہی وجہ تھی کہ کہنا پڑا ——— پیر و مرشد! آج تو میں آپ کا قائل ہو گیا ہوں۔

انہوں نے میرا منشا تو پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا۔ محض تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے میرے قائل ہونے والی بات کے جواب میں کہا ——— اچھا تو سنو!:—

"تمہارے اصرار پر ایک معصوم سی یاد ابھر آئی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں تھوڑا محل شملہ میں احمد شمسی صاحب (ماموں جان) کے یہاں قیام تھا۔ ان کے فلیٹ کے نیچے ایک بنگالن ۱۳، ۱۴ سال کی رہتی تھی۔ تین مہینے تک اس کو بے حد چاہا۔ کبھی ملے نہیں ——— صرف گیت سنتے تھے۔ جب شملہ سے واپس ہوئے تو برسوں اس کے فراق میں روتے رہے۔ ——— اس کے بعد شکیلہ کو چاہا اور چاہا گیا ——— البتہ اس ناگفتنی[1] ——— مت کریدو نہیں، وہ مردوں کے لئے ——— اگر محبوب بنتے رہے اور محبت کا جواب محبت کی زبان میں دیتے رہے۔"

میں نے ان باتوں سے محسوس کیا کہ اختر صاحب بڑے کھرے آدمی ہیں۔ جھوٹی بڑائی کے قائل نہیں۔ اپنی خامیوں پر بھی نظر ہے۔ اپنی خوبیوں سے بھی آگاہ ہیں۔

دیکھ لیجئے ایک دور وہ ہوتا ہے جب آدمی جھوٹے معاشقوں کا حال بیان کرتا ہے اور ایک دور وہ آتا ہے کہ سچی باتوں پر بھی زبان نہیں کھلتی۔

ویسے اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک بات پر تڑپ سکتے ہیں، بات بات پر الجھ سکتے ہیں۔ ذرا تڑپنے اور الجھنے والی بات کی وضاحت کر دوں تاکہ معاملہ قابو میں رہے۔

تڑپنے والی بات تو یہ ہے کہ سارے جہان کا درد ان کے جگر میں ہے۔ دنیا میں کہیں کوئی ظلم ہوا ہو — درد کی ٹیسیں ان کے جگر میں اٹھیں گی۔ الجھنے والی بات یہ ہے کہ بس ذرا جواہر لعل کی طرح اچکن میں پھول اٹکا لینے کے عادی ہیں ——— اس کے علاوہ ریکارڈ بہت اچھا ہے۔

لیجئے! بچپن کے دن اور جوانی کی راتوں کے قصے ختم ہو گئے۔

ساری دنیا اختر اورینوی کے رشتے سے شکیلہ اختر کو جانتی ہے۔ مگر میں نے اختر صاحب کو شکیلہ اختر کے رشتے سے پہچانا۔

ادبی حلقوں میں ان کی دھاک ربع صدی سے ہے۔ میں بھی ان کے نام سے واقف تھا۔ خط و کتابت بھی تھی۔ مگر جب ۱۹۶۰ء میں شکیلہ بہن ملیں تو اختر صاحب سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ یہ اعجاز بہن کا تھا کہ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اختر صاحب کی تصویر اتار کے دکھا دی۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں میرا رانچی جانا ہوا تو شکیلہ کے لکھنے پر پٹنہ بھی جانا پڑا۔ ابھی میں پٹنہ سے ایک دو اسٹیشن ادھر ہی تھا کہ آرہ کے اسٹیشن پر ایک صاحب ملیں۔

"بھائی صاحب! السلام علیکم!"

"وہ جی!"

"میں شکیلہ کی بہن عذرا ہوں۔"

"اچھا اچھا!"

"مجھے آپا نے لکھا تھا کہ بھائی آ رہے ہیں۔ اس لئے تم انہیں اسٹیشن پر ضرور ملنا۔"

"آپ نے کیسے پہچان لیا کہ میں ہی طفیل ہوں؟"

"واہ بھائی کو پہچاننا بھی کوئی مشکل بات ہوتی ہے!"

لیجئے صاحب! ابھی پٹنہ آیا نہ تھا کہ شکیلہ کے خلوص کا جادو چلنے لگا۔ پٹنہ آیا تو گھر کے بہت سے افراد کے ساتھ اختر صاحب کو بھی دیکھا۔

---

[1] اس ناگفتنی کا بھی کچھ حال مجھے معلوم ہے۔ مگر جو باتیں یہ خود چھپانا چاہتے ہوں۔ اس کے لکھنے میں لطف بھی کیا۔

شکیلہ نے کہا، "آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کے استقبال کے لئے اختر صاحب بھی آئے ہیں - ورنہ یہ تو کسی کے لئے نہیں آتے۔"

پہلے ہی مرحلے پر، اختر صاحب کی عنایت اور قربت کا احساس دلا دیا گیا۔ ملے بھی بڑے پیار سے، میں نے دیکھا — لمبے قد کے خوبصورت سے آدمی، جو قطعاً ادیب نہیں لگتے - بلکہ کوئی آئی سی ایس افسر معلوم ہوتے تھے - یونانی کٹ چہرہ، دودھ جیسی رنگت، جو بہاریوں کو کم نصیب ہے (ویسے عورتوں کی بات دوسری ہے) کلین شیو، لب و لہجہ دلآویز، آواز میں کھنک، زبان فرفر!

یہ سارے رنگ ڈھنگ ایسے تھے جو جلد ادب کی تلقین کر رہے تھے - مگر میں بھی ایسا کھردرا انسان ہوں کہ کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا - خواہ زبان سے کچھ نہ کہوں - دماغ ہی کہتا ہے — ہنھ!

اب میرے سامنے اختر صاحب ہیں اور میں ہوں — اختر صاحب کا کمرہ کوٹھی کے ایک کونے میں ہے - گھر سے متعلق بھی، گھر سے الگ بھی، مطلب یہ کہ جیسا ماحول بنانا مقصود ہو ویسا بنا لیا جائے۔

یہ جو ادیب لوگ ہوتے ہیں - بڑے دلچسپ ہوتے ہیں - یہ من کی دنیا میں اتنے محو ہوتے ہیں کہ انہیں گھر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی - بیوی بچوں کو بھی یہ ایسے ہی سمجھتے ہیں - جیسے گھر کی کوئی دوسری چیز مثلاً میز، کرسی، بہت ہوا تو بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھ لیا۔

اختر صاحب بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھتے ہیں یا کرسی، میں کیا جانوں، خیریت ہے تو یہ کہ شکیلہ بھی مشہور افسانہ نگار ہیں - اب ان دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں کیا تاثرات ہوں گے۔ اللہ ہی جانے، ہو سکتا ہے - یہ دونوں ہی ایک دوسرے کو صوفہ سیٹ سمجھتے ہوں۔

ان سے باتیں ہوئیں - ادب پر، سماجیات پر، مذہب پر، ہر موضوع پر سمندر کی سی روانی کی طرح بہے، یہ بولتے گئے - میں سنتا گیا - تقریر کا سلیقہ، لہجہ میں تازگی، میں نے بڑے بڑے مقرر دیکھے ہیں، باتوں سے موم کر لینے والے، مگر ان میں بھی یہ مجھے کم نظر آئے۔

خواہ مخواہ ذہن ابوالکلام، ظفر علی خاں، بہادر یار جنگ اور عطاءاللہ شاہ بخاری کی طرف چلا جاتا ہے۔

اختر صاحب کی مقررانہ خوبیوں کے ساتھ، جی چاہتا ہے کہ اپنی بھی ایک "خوبی" کی اطلاع بہم پہنچا دوں - میری اس خوبی کی تشہیر سے، ان کی شرارت آمیز باتوں کا بھی تو حال کھلتا ہے۔

جن دنوں میں اختر صاحب کے "نرغے" میں تھا - ان دنوں پہلے تو یہ مجھے اپنے کالج لے گئے اور اپنے شاگردوں سے جا کر کہا۔ "دیکھ لو بھئی - یہ ہیں وہ چیز جس کے دیکھنے کی آپ کو بھی تمنا تھی۔"

اختر صاحب کے ان ریمارکس پر طالب علم مسکرائے - لڑکیاں ہنسیں - اگر مجھے علم ہوتا کہ اختر صاحب میرا تماشہ لگانے والے ہیں تو میں کبھی ان کے ساتھ نہ جاتا - انہوں نے تو اتنا کہا تھا۔ "ذرا کالج تک چلو"۔ میں سمجھا گھمانے پھرانے لے جا رہے ہیں - مگر انہوں نے کلاس میں جا کر کھڑا کر دیا — یہ ہیں وہ!

ستم پر ستم یہ کہ اُسی دن چار بجے شام کو کہا، "چلو چلیں۔"

"کہاں"!

"انجمن تماشائے ادب" نے آپ کے اعزاز میں دعوت کی ہے۔"

"نہیں جناب! میں نہیں جاتا۔"

"صرف چائے کی دعوت ہے سوال کوئی مقالہ وغیرہ نہیں پڑھنا ہوگا - بفرضِ محال اگر کوئی سوال پوچھے تو جواب دے دینا"

"اُس دعوت کو گول کیجئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے - میں نے وعدہ کر لیا ہے، شکیلہ نے بھی۔"

جی چاہا کہ ابھی اپنا سوٹ کیس اٹھاؤں اور واپس چل دوں اس لئے کہ میں ہنگاموں سے گھبراتا ہوں - وہ اور لوگ ہوتے ہیں - جو "زبانی" ہوتے ہیں۔

ناچار ساتھ ہو لیا - مگر اس عرصے میں کہ یہ کپڑے وپڑے بدلتے - میں نے دو چار سطریں لکھنے کی کوشش کی کہ اگر سر پر پڑ ہی گئی تو کچھ کہہ بھی سکیں۔

قلم لے کے بیٹھا تو سب سے پہلے مجھے رشید احمد صدیقی کا وہ فقرہ یاد آیا۔ جو انہوں نے ایک جلسے میں کہا تھا ـــــ گھر سے جو کچھ یاد کر کے آیا تھا۔ وہ یہاں آ کر بھول گیا ہوں۔

اس کے بعد جو کچھ لکھا۔ وہ دیگر یادداشتوں کے ساتھ محفوظ رہا۔ اُسے نقل کئے دیتا ہوں۔

دوستو!

"قبلہ اختر اورینوی صاحب، جن کے بارے میں آپ کا خیال ہو گا کہ نہایت معقول آدمی ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ انہوں نے ابھی ابھی مجھے یہ خبر سنا کر بُلا دیا کہ تمہیں تماشائے ادب کے جلسے میں جانا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑے اور کہا۔ خدا کے لئے مجھے نہ لے جائیں۔ اس لئے کہ میں بہو بیٹیوں کی طرح پلا ہوں۔ دوسرے میری زندگی کا غذ اور قلم کی معیّت میں گزر رہی ہے۔ اس لئے مجھ سے بولا بھی نہ جائے گا۔ مگر یہ نہیں مانے اور یوں میرے جذبات کو گھسیٹ کے یہاں لے آئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا اور چیز ہے اور اپنی لسّانی کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کو مسخر کرنا اور چیز۔ میں نہ تو لکھا پڑھا، نہ لسّان، میری تو دوہری شامت آ گئی ہے۔ مرنا بھی تھا تو یہ کیا ضروری تھا کہ گنگا کے کنارے آ کر مرتا۔ ویسے تو گنگا کے کنارے کر مرنا، اچھا شگون ہے، بشرطیکہ میں رامچندر کے خاندان میں سے ہوتا۔

میں نے اختر صاحب سے پوچھا کہ بھائی جان ذرا یہ تو بتا دیجئے کہ انجمن تماشائے ادب میں تماشے کے علاوہ کیا کچھ ہوگا تو انہوں نے فرمایا تھا۔ وہ لوگ آپ سے سوال پوچھیں گے۔ جواب دے دینا۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کو بھی جواب دینا، شرفا کے نزدیک کبھی بھی مستحسن نہیں رہا۔ اس لئے میں شرفا میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی کسی کو جواب دینا پسند نہیں کرتا تھا۔

ویسے مجھے اختر صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمہیں وہاں "پاکستان میں اردو کے مستقبل" پر بات چیت کرنی ہو گی۔ بظاہر یہ سوال معصوم سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا جواب عرض کرنا آسان نہیں۔ اس لئے کہ ہم پاکستانیوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اردو کے لئے بھی سوچنا چاہیے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اُردو کی پوزیشن کچھ ایسی ہو گئی ہو کہ جیسے کوئی کنواری لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ گئی ہو ـــــ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کو نہ ہندوستان والے قبول لیتے ہیں اور نہ پاکستان والے، یوں تو ہماری سرکاری زبان اردو بھی ہے۔ مگر ابھی نہیں جانتے ہوئے انگریزی دلربا ادائیں نہیں بھولیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مغرب سے پاکستان اس لئے آتا ہے کہ اردو سیکھ آؤں تو وہ انگریزی سیکھ کر واپس جاتا ہے۔ غرض اُردو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سہی، مگر ابھی پاکستان میں ایسے اللہ والے موجود ہیں، جو اسے اپنی ہی ماں بہن سمجھتے ہیں۔

مجھے زیادہ وقت نہیں ملا کہ میں اس مرحلے سے نپٹنے کے لئے تیار ہو کر آ سکتا۔ یہ سراسر اختر صاحب کی شرارت اور آپ کی محبت ہے جو میں یہاں موجود ہوں۔ بھلا وہ بھی کیا آدمی ہوا۔ جو دیہیں اور لہیں نہ بول سکتا ہو۔

پہلے میرا ارادہ نہ تھا کہ اختر صاحب پر مضمون لکھوں گا۔ مگر ان کی چند ایک شرارتیں یاد آئیں تو سوچا ـــــ یہی وقت انتقام کا ہے۔

ویسے کہیں میں نے یہ بھی پڑھا ہے ـــــ جو شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ اس جد و جہد میں دوسروں کے اتنے عیبوں کا کھوج نہیں پاتا۔ جتنے کہ خود اپنے عیب عریاں کر دیتا ہے ـــــ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں اپنے ہی عیوب سے پردے سرکا رہا ہوں۔ ایک لحاظ سے یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لئے کہ اختر صاحب میرے لئے غیر نہیں۔ وہ رسوا ہوئے تو میں رسوا ہوا۔

مجبوراً میں پھر ان کے ابتدائی دنوں کی طرف لوٹتا ہوں۔ وہی محققانہ تقاضے پورے کرنے کے لئے۔

ممکن ہے آپ کو یہ گُمان ہو کہ میں ان کا سنِ پیدائش بتاؤں گا۔

یہ بھی بتا دوں گا کہ کہاں پیدا ہوئے۔ یہ سب کچھ بتانا میرا کام نہ تھا۔ ویسے اگر میں یہ بتا دوں تو کچھ حرج بھی نہیں۔ ہاں تو سنئے۔ یہ ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء میں مقام ۔۔۔ ضلع گیا پیدا ہوئے۔ یہ ان کا ننھیال ہے۔

میرا خیال ہے۔ یہاں پر دو چار اور بھی گرہیں کھولی جا سکتی ہیں۔ یوں ان کی شخصی پہچان کے ساتھ کچھ تاریخ و جغرافیہ کے اسباق بھی پڑھ لیں گے۔ مثلاً یہ کہ یہ کن کن استادوں سے متاثر ہوئے۔ کون کون کتابوں سے متاثر ہوئے۔ کن لوگوں سے متاثر ہوئے۔ کن واقعات سے متاثر ہوئے وغیرہ وغیرہ!

یہ باتیں بظاہر تھکا دینے والی ہیں۔ دلکشی بھی ان میں کچھ نہیں۔ مگر اختر صاحب کے بارے میں کچھ جاننے والے، ممکن ہے یہی کچھ سننا چاہتے ہوں اور وہ باتیں جو میرے نزدیک اہم ہیں، سننا ہی نہ چاہتے ہوں۔ اس لئے اختصار چاہوں اور دار کئے لیتا ہوں۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم تو اپنی والدہ سے پائی۔ اردو، فارسی، انگریزی اور قرآن حکیم اپنے والد سید وزارت حسین صاحب سے پڑھا۔ قرآن شریف با ترجمہ اور تفسیر اور دوسری مذہبی کتابیں اپنے چچا سید ارادت حسین صاحب اور حکیم خلیل احمد صاحب سے پڑھیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور استادوں کے نام بھی بتائے تھے۔ چند ایک کے نام لکھتا ہوں۔ مثلاً نواب علی سادھو خاں، چارلس رِیڈ، چودھری حیدر علی خاں، پروفیسر جے۔ ایل۔ ہل، فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر گیان چند[1] ــــ بقول ان کے، یہ سب ایسے مشفق استاد تھے کہ جنہوں نے انہیں مٹی سے سونا بنایا ــــ ویسے اتنا اندازہ تو میں نے بھی لگا لیا کہ انہوں نے اپنے استادوں کا ذکر بڑے فخر اور رقت کے ساتھ کیا تھا۔

جن کتابوں سے متاثر ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں:ــ

قرآن حکیم، احمدیت اور حقیقی اسلام، اسلام کا اقتصادی نظام اور نظامِ نو (یہ تینوں کتابیں جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد کی تصنیف ہیں) اینا کرینینا (ٹالسٹائی) اسپرٹ یوم (ایلیا اہرن برگ) ودمن اِن لو (لارنس) فاریوم دی بیل ٹولز (ہیمنگوے) مومنٹ اِن پیکنگ (لن یوٹنگ) بانگِ درا اور بالِ جبریل (اقبال) نگارستان، جمالستان (نیاز فتحپوری) الماموں (شبلی) اقبال کی ساری فارسی کتابیں، مثنوی مولانا روم، جوش اور اختر شیرانی کی رومانی نظمیں۔

دیکھ لیا آپ نے متاثر ہونے والی کتابوں میں پہلا نام تو انہوں نے قرآن حکیم کا لیا اور آخری ــــ جوش اور اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا ــــ ان ہی دو جذبوں کے اندر اختر صاحب بند ہیں۔ اور ان جذبوں میں جو بُعد ہے۔ وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ ایک طرف خدا سے رشتہ، دوسری طرف اس کے "خاص" بندوں سے ــــ اور یہ دونوں جذبے ان کے ہاں بڑے شدید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انہی جذبوں کی لَٹک اور کھٹک کے سہارے اپنی زندگی کو معطر بنائے ہوئے ہیں۔

اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے تو یہ فرفر جواب دیتے ہیں:ــ

وفات یافتوں میں ــــ حضرت محمد صلعم، حضرت ابراہیم، حضرت موسٰی، حضرت عیسٰی، میرزا غلام احمد، بودھ، کرشن، سعدی، اقبال، سیکسپیئر، بابر، محمد بن قاسم، مہارانا پرتاپ سنگھ، ٹیپو سلطان، میر قاسم، شاہ ولی اللہ، پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح!

زندوں میں ــــ میرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ، ونسٹن چرچل، پروفیسر بگو بیٹے تو ۱۲ اے (مصنف ہومین ہسٹری) اور سارے احباب، شکیلہ اختر اور اردلی[2]۔

اور تو ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ مگر لیجئے یہ تو اپنی بیوی سے بھی متاثر نکلے۔ یہ عجب والی بات، ذرا کم ہی سننے میں آتی ہے۔ خواتین تو مارے زوجیت کے کہہ دیتی ہیں کہ میں اپنے شوہر سے بڑی متاثر ہوں۔ مگر ان کی زن پرستی کا حال اب کھلا۔ مبارک ہو صاحب!

میرا خیال ہے کہ یہ تھوڑے میں جا ہیں۔ اس لئے ان سے لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ لیا جاتا ہے کہ ــــ آپ کن کن واقعات سے متاثر

---

[1] یہ ڈاکٹر گیان چند وہ نہیں۔ جنہوں نے اردو کی نثری داستانیں لکھ کر شہرت حاصل کی
[2] اردلی، شکیلہ اختر کی خدمتگار ہے۔ مگر اختر صاحب اسے ایک شخصیت ہی سمجھتے ہیں۔

ہوتے ہیں ـــــ اس سوال کے بعد ہم ان سے کچھ نہ پوچھیں گے۔ صرف اپنی کہیں گے ـــــ "ہاں تو جناب آپ وہ واقعات بتائیں گے جن سے آپ متاثر ہوئے۔"

کیا مصیبت میں جان کر رکھی ہے۔ اچھا سنئے! میں متاثر ہوا ہوں ـــــ جنگ بدر، جنگ قادسیہ، جنگ یرموک، واقعہ کربلا، فتح سندھ، جنگ پانی پت، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، تقسیم ہند ۱۹۴۷ء، انقلاب فرانس، اپنی والدہ کی موت (جب اختر صاحب ۱۴ سال کے تھے) چچا کی موت، اپنے بھتیجے اعجاز کی وفات ـــــ اور اپنی شادی سے!

لیجئے صاحب ہم لوگ ان بھول بھلیوں سے نکل آئے۔ جو محض ریاضی کے سوال تھے۔ اللہ تیرا شکر، جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک کپ چائے پی جائے تاکہ حواس ٹھکانے لگیں۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ سُن لیجئے تاکہ ذہن کو ذرا سی آسودگی ملے۔ عام طور پر ان کی زندگی بڑی دلچسپ گزری اور بن کے جنگلات اور دریا میں سیر و شکار، مرغابی سے لے کر شیر تک، دریائے سون میں تیراکی، کم و بیش روزانہ پکنک، تصویریں بنانا اور لڑکیوں سے بیوقوف بننا۔ مثلاً:-

لڑکوں اور لڑکیوں نے اندر میں سازش کی کہ ایک کمرے پر جنات کا سایہ ہے۔ پٹنہ سے اختر صاحب آئے تو انہیں بیوقوف بنانے کے لئے پوری فضا تیار تھی۔ رات آتے ہی کھلی چھت پر لمبے تڑنگے سفید پوش جن تشریف لائے اور غائب ہو گئے۔ لڑکیاں چیخیں اور بے ہوش ہو گئیں، سزا لچیوں کی بارش ہوئی مٹھائیوں کی ڈلیاں برسیں، اختر صاحب متاثر ہوئے۔ مگر بظاہر دلیری کا اظہار کرتے رہے۔ سسرال اور سالیوں کے درمیان شگفتگی اور بہادری کا مسئلہ جو درپیش تھا۔

پھر یہ ہوا کہ زعفرانی تحریر میں خط آنے لگا۔ ہر روز رات کو یہ سوانگ ہوا کیا۔ دنگے ٹھوٹے ہوتے رہے۔ لڑکیاں ایکٹنگ کرتی رہیں۔ بالآخر اختر صاحب نے اپنی مذہبیت سے فائدہ اٹھایا اور ایک دن جنات کو عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ میں ایک خطبہ دے ڈالا اور نصیحت فرمائی کہ اہل اسلام کو مت ستاؤ۔

کچھ دنوں کے بعد لڑکیاں پھوٹیں۔ کھل کھل ہنسیں۔ انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو محض ڈرامہ تھا تو یہ بڑے خفیف ہوئے شرمندگی اور خفگی کے مارے کئی دنوں تک اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑے رہے۔ آخر سالیوں نے منالیا۔ جنوں کا سایہ تھا۔ پریوں نے دور کیا۔

بہ حیثیت علم و فضل، ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔ ہزاروں نے ان سے فیض اٹھایا ہوگا۔ مگر یہ ہی کہ اپنے منصب سے مطمئن نہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز اور ہے یہ تو درس و تدریس کے مشغلے ہی سے خوش نہیں۔ یہ تو یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر بن کر یورپ اور امریکہ جاتے اور تبلیغ اسلام کرتے۔ یہ ہے ان کی وہ آرزو جو پوری نہ ہوئی۔ چونکہ درس و تدریس کی "دلدل" میں پھنسے ہوئے ہیں، اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ نہیں نہیں۔ یہ منصب بھی میری آرزوؤں کے مطابق ہے۔

ان تمام آرزوؤں کے علاوہ ان کی ایک تمنا اور بھی ہے وہ یہ کہ چپ چاپ بستر پر لیٹے رہیں اور کوئی بھی انہیں پریشان نہ کرے۔

عموماً یہ بیماری ایسے لوگوں کو لاحق ہوتی ہے، جو اپنے من کی بات دوسروں سے نہ کہہ سکتے ہوں۔ یوں وہ تنہائی میں خیالوں کی محفلیں منعقد کرتے ہیں ـــــ اور انہیں خود کلامی میں لطف آتا ہے۔

جہاں تک انہیں میں نے پڑھنے کی کوشش کی، پتہ یہی چلا کہ یہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتے۔ اب جبکہ یہ اپنی یونیورسٹی میں اپنے شعبے کے ہیڈ ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ میں اگر ڈاکٹر بنتا اور آزادانہ پریکٹس کرتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اگر یہ واقعی ڈاکٹر ہوتے تو یہ کہتے۔ میں کہاں آ پھنسا۔ یہ اپریشن، یہ گلی سڑی بیماریوں کی تشخیص اپنے بس کی بات نہیں۔

ایک وقت میں یہ کہتے تھے کہ مجموعی طور پر شکیلہ سے اچھی نبھتی ہے ۔ یہ بڑی ایثار پسند اور وفا شعار ہیں ۔ لیکن مزاج میں تیزی اور سخت قسم کی انفرادیت ہے ۔ جو ابھرتی ہے ـــــ بفرضِ محال ان کی شادی شکیلہ سے نہ ہوئی ہوتی تو اب تک سنیاس لے چکے ہوتے ۔

یہ اپنے معمولات میں بڑے باضابطہ ہیں ۔ زندگی مقررہ سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہے ۔ بیماریوں نے اور بھی زیادہ با اصول بنا ڈالا ۔ پروگرام میں ذرا بھی تبدیلی ہو جائے تو چڑچڑا جاتے ہیں ۔ لیکن کبھی کبھی بے ضابطہ بھی ہو جاتے ہیں ۔ مگر صرف احباب کے ساتھ ۔ ورنہ زیادہ تر شوق ، جا نماز بننے کا ہی ہے ۔

طبیعت میں بہ درجہ سنجیدگی اور باضابطگی کے ساتھ خوش مزاجی اور ظرافت کی بھی چاشنی ہے ۔ ہر وقت بذلہ الکلام بنے ہنس بیٹھے رہتے ۔

کاہلی کی حد تک آرام طلب ہیں ۔ مسہری کے دونوں طرف اگالدان پڑے ہیں ۔ جیسے ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

گزشتہ صفحات میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑی ہوگی ۔ مگر ان کے مذہبی خیالات اور ادبی رجحانات پر ابھی کچھ مزید لکھنے کی ضرورت ہے ۔

اگر ہم مذہب کے بارے میں ان کے خیالات جاننا چاہیں گے تو اس سلسلے میں بڑی بے باکی سے ساتھ کہیں گے ۔ تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ مذہب سمجھتا ہوں ۔ زندگی گزارنے اور آفاقی تنظیم انسانیت کے لئے مذہب کو ضروری سمجھتا ہوں ۔ اخلاق کا وسیع اور پائیدار تصور بغیر مذہب کے ناممکن ہے ۔ معمولی سطح پر بغیر مذہب کے بھی قیام ممکن ہے ۔ لیکن رفعت و لطافتِ اخلاق جس کو روحانیت کہا جاتا ہے ۔ صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے اسلامی تصور سے حاصل ہو سکتی ہے ۔

یہ غیر مذاہب کے لوگوں سے بھی نفرت یا جانبداری اور تعصب نہیں برتتے ۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اسلام تعصب سے منع کرتا ہے ۔ لا اکراہ الا فی الدین اور لا اکراہ الا فی العزم ان کا عقیدہ ہے ۔ رشتہ داروں اور احباب میں شیعہ ، سنی ، وہابی ، حنفی ، دہریہ ، اشتراکی ، ہندو ، عیسائی سبھی ہیں اور سبھوں سے اچھے تعلقات ہیں ۔ عقیدتاً بھی دیگر مذاہب کے لوگوں کو واصلِ جہنم نہیں کرتے ۔ نجات کا معاملہ صرف خدا اور بندے کا معاملہ سمجھتے ہیں ۔

سیاسی اعتبار سے یہ اسلامی جمہوریت اور خلافتِ اسلامیہ کے قائل ہیں ۔ اسلامی اقتصادی نظام جس میں اشتراکیت کی خوبی اور آزادانہ حصولِ دولت کی سہولتیں بھی موجود ہوں ۔ حُبِ وطن کے قائل ہیں ۔ مگر وفاقِ عالم ضروری سمجھتے ہیں ۔ وطنیت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر گنگناتے رہتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور حکومتِ وقت کی اطاعت بھی ضروری سمجھتے ہیں ۔ مگر تنقید اور حریتِ ضمیر کے ساتھ !

میں آپ کے صبر و تحمل کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے باغ و بہار قسم کے آدمی کے بارے میں ، میری ژولیدہ نگاری کو برداشت کیا ۔ مگر ابھی میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑے سے صبر سے اور کام لیں ۔ تاکہ کچھ ان کے ادبی نظریات اور پسند کے بارے میں بھی بات چیت ہو جائے ۔

ہر آدمی کے بارے میں یہ جاننا شاید ضروری نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو کتنی اہمیت دیتا ہے ۔ مگر ایک ادیب کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے ـــــ اس سوال کی روشنی میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے آپ کو بھی خاصی اہمیت دیتے ہیں ۔ لیکن کبر نہیں ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ تنقیدِ صحیح کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی تخلیقات کو بھی کم قیمت نہ سمجھا جائے ـــــ اور یہ بھی

(باقی ص ۲۷۲ پر)

مولانا انور اصلاحی

صدر مجلس
ایک خوشگوار یاد

محب عزیز قمر اعظم ہاشمی   سلام و رحمت

مضمون کیلئے آپ کے تقاضوں نے مجبور کرنا شروع کر دیا ہے۔ زندگی کی گاڑی اب سفر کے آخری مرحلے کی حد میں داخل ہے۔ لکھنے کی مشق نہیں۔ لکھنا بھی ہے تو کس شخصیت پر؟ اس پر، جس کی حیثیت علمی ادبی دنیا میں مانی ہوئی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ کچھ نہ کچھ مطالعہ کی لت ہمیشہ سے رہی ہے۔ اور اسی لت کے طفیل متعدد علمی و ادبی شخصیتوں سے کم و بیش واقفیت رہی ہے۔ جن سے واقفیت ہے ان میں دیدہ بھی ہیں اور نادیدہ بھی۔ دم تحریر حافظے کے پردے پر ماضی میں دیکھی ہوئی متعدد علمی و ادبی شخصیتوں کے عکس ابھر رہے ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، عبدالسلام ندویؒ (مصنف اسوۂ صحابہ)، نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، عبدالماجد دریابادی، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، فانی، اصغر، جگر، صفی لکھنوی، اقبال سہیل اور بہت سی دوسری جنہیں آج تک نہ دیکھ سکا۔ ان کے دیکھنے کے مجھ سے زیادہ کم ہی لوگ متمنی ہونگے۔ پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر اختر اورینوی صاحب کے ایک دو افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت ذہن نے تصور میں اختر صاحب کی ایک تصویر بنائی تھی۔ تصویر یہ تھی کہ اختر صاحب ایک قدرے دراز قد، سانولی رنگت کے نوجوان ہوں گے۔ کھدر اور چپل پہنتے رہتے ہوں گے۔ ویسے بھی اختر صاحب کے تذکرے علمی و ادبی حلقوں میں برابر ہوتے رہتے ہیں۔ اور اتفاق کہ میں

بھی ان مجلسوں میں اکثر شریک رہا ہوں۔ مگر کوئی دستاویزی قسم کا ذریعہ معلومات اختر صاحب کے بارے میں کبھی ہاتھ نہ آیا۔ ۶۶ء کا ذکر ہے ایک زاہد خشک قسم کے دوست کے یہاں ایک تقریب تھی۔ موصوف نے مدعو کیا تو چلا گیا۔ بنگلے کے ایک کمرہ میں مجھے ٹھہرا دیا۔ نہیں رکھ دیا تھا۔ "چلئے ناشتہ تیار ہے۔" ناشتہ کر کے آئے اور کمرہ میں محفوظ ہو گئے۔ کھانے پر آپ کا انتظار ہے۔ ڈنر مار کر کے آئے اور بستر پر دراز ہو گئے۔ پڑے پڑے طبیعت گھبرا گئی۔ ایک آئی ہوئی طرح پر غزل لکھنے کی ٹھانی تو موڈ نے کہا "اس غیر شاعرانہ ماحول میں خود تو اپنا اچار ڈال رہے ہو۔ مجھے کیوں گھسیٹتے ہو"۔ کہا۔ جا بھئی تو دفعان ہو۔ وقت گزاری کے طور پر نگاہیں رہ رہ کر پلنگ کے سرہانے کی الماری کا جائزہ لے لیا کرتی تھیں۔ ایک بار ذرا غور سے جائزہ لیا تو ٹھٹک گیا۔ ایک موٹی سی کتاب پر نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔ آگے کو جھک کر کتاب کا نام پڑھا۔ اس پر لکھا تھا "نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر" شخصیات کا مطالعہ میری کمزوری ہے۔ کتابوں کی قطار سے رسالہ کھینچ ہی رہا تھا کہ میرے زاہد خشک میزبان آ گئے۔ کہنے لگے "گھبراتے تو نہیں ہو۔ گھبراؤ نہیں بس آج شام تک کا ہنگامہ ہے۔" میں نے کہا تقریب کی میعاد اب دو دن اور بڑھا دو۔ کیوں؟ ہنس کر پوچھا۔ یہ رسالہ جو مجھے مل گیا ہے۔ میں نے کہا۔ اسے گھبراؤں گا۔ وہ فرمانے لگے۔ کیا کہوں اپنے چھوٹے بھائی کو۔ پڑھنا لکھنا تو تھا کہ نہیں۔ بس اسی طرح کے پرچے اور کتابوں سے اسے دلچسپی ہے۔" میں معترض

کیا۔ خاک تو پڑھنے کی چیز بھی نہیں۔ کتابیں جیسی بھی ہوں بہرحال پڑھنے
ہی کیلئے لکھی اور چھاپی جاتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ چلتے وقت نقوش
اپنے ساتھ لیتا آیا۔ اور پڑھنے میں جٹ گیا۔ جو خاکے یا مضامین پہلے
پڑھ چکے ان میں محترمہ شکیلہ اختر کا اختر صاحب پر لکھا ہوا مضمون یا خاکہ
بھی تھا۔ لکھنے کا انداز اتنا دلکش کہ ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ پھر
وہی تصویر بنی جو پہلے بن چکی تھی۔ البتہ اب اس اضافہ کے ساتھ کہ اختر
صاحب اور بھی ٹھہرے ہوں گے۔ اور مزاج میں تندی بھی ہوگی۔ اور یک
گونہ اپنی روزمرہ زندگی میں بے خبر بھی واقع ہوں گے۔ مضمون تو پڑھ
لیا لیکن اس تمنا کا کیا علاج کہ اختر صاحب کی زیارت کی کیا صورت
ہوگی۔ [illegible] عمر اب وہاں ہے جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
سال اور دن گزرتے گئے۔ اور ہزاروں خواہشوں کی طرح اس
خواہش پر بھی دم نکلنے کی نوبت آتی رہی۔ لیکن خدا بھلا کرے مخدومی
رضا کریم صاحب کا کہ ان کی بدولت ایک بڑا ہی حسین موقع ہاتھ آگیا
مارچ [illegible] میں گرہرا (متصل بروہی، مونگیر) میں ایک اعلیٰ پیمانہ کے
مشاعرہ کا پروگرام مرتب ہوا۔ یہ پروگرام وہاں کی قومی رضاکار کمیٹی کی
جانب سے ترتیب دیا گیا تھا۔ رضا کریم صاحب ان دنوں بیگوسرائے میں
بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ اور مشاعرہ کے انعقاد سے خصوصی دلچسپی
لے رہے تھے۔ فروری [illegible] کی ایک شام کو ممدوح کا ایک مکتوب ملا جس
میں مشاعرہ میں شرکت کی جانب متوجہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دعوت نامہ
منظور کر لینا۔ دربھنگہ کے مختلف شعراء مدعو تھے۔ اس سلسلہ میں رضا کریم
صاحب نے کچھ ذمہ داریاں بھی مجھ پر ڈال دی تھیں۔ مقررہ تاریخ پر
شعراء و ادباء کا یہ قافلہ یہاں سے روانہ ہوا تو یہ خاکسار بھی ان حضرات
کے ساتھ بقدر ضمیمہ منسلک تھا۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

مجھے مسرت اس بات کی تھی کہ رضا کریم صاحب کے بیرونی احباب کی بھی
جو اس مشاعرہ میں مدعو تھے۔ زیارت نصیب ہوگی۔ اندازہ صحیح نکلا۔
محترم رضا نقوی واہی، اویس احمد دوراں، احسان دربھنگوی،
ہوش عظیم آبادی، رضا ملک پوری، شہاب شمسی اور عارف عباسی بھی
وہاں موجود تھے۔ کھانے پر چائے کے دور میں احباب سے ملنے
ملانے کا سلسلہ جاری رہا۔ تقریباً نو بجے شب کو منتظمین کی جانب سے
مشاعرہ میں چلنے کو کہا گیا۔ اور ہم سبھی مشاعرہ گاہ پہونچے۔ سامعین کا
کا بے پناہ ہجوم مشاعرہ کے آغاز کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔
ڈائس پر بیشتر شعراء پہنچ چکے تھے۔ ہندی شعراء کی بھی خاصی تعداد تھی
باقی شاعروں کا انتظار تھا۔ ہم، شاداں فاروقی، شہاب
شمسی، محبوب انور اور جناب عارف عباسی صاحب ایک ہی جگہ
بیٹھے۔ عارف صاحب نے دلچسپ گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہم
لوگ انکی باتوں سے لطف لے ہی رہے تھے کہ اچانک ہلکی سی ہلچل پیدا
ہوئی۔ نظر اٹھی تو دیکھا کہ وقار و متانت کا ایک مجسمہ چند سیاہ
شیروانیوں کے جلو میں ڈائس کے اگلے حصہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میانہ
پیشانی، ستواں ناک، کتابی چہرہ پر متانت، آنکھوں میں آسودگی
اور وقار کی جھلک پورا سراپا ایک خاص تمکنت اور شکوہ کا آئینہ
دار۔ لب بے اختیار ہل گئے

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ اختر اورینوی صاحب قبلہ تھے۔ تحریک و تائید صدارت کے بعد اختر
صاحب مسند آرائے صدارت ہوئے۔ نظامت کے فرائض کو دیکھنے
والے عمر قریشی صاحب نے سنبھالے۔ اور مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ [illegible]
ہندی اور اردو شعراء باری باری مائک کے سامنے آتے رہے۔ قریشی
صاحب شعراء کا تعارف کراتے ہوئے نثر میں نظم کا سماں باندھ رہے تھے
عارف صاحب داد و تحسین کے ساتھ تحت لب گفتگو کا سلسلہ بھی
چھیڑے ہوئے تھے۔ ہم ایک جگہ بیٹھنے والوں کے کان شعراء کے کلام سے
بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور عارف صاحب کی گفتگو سے بھی۔
میری نگاہیں صدر محترم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ مدت دراز کے
بعد ایک باوقار علمی و ادبی ہستی نگاہوں کے سامنے آئی تھی۔ گفتگو
داد و تحسین، نشست و برخاست میں پہلو بہ پہلو ظاہر انداز سب

منفرد اور جداگانہ تھا۔ ہر شاعر کے اچھے شعر اور بند پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ مگر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔ میرے تخمینات کے مطابق کا بے پناہ ذوق ہی تسکین پا رہا تھا۔ مگر "واہ واہ، سبحان اللہ" کے ہنگامے خلل ڈال رہے تھے۔ پھر بھی ہنگامے اپنا کام کئے جا رہے تھیں

ادھر میرا یہ حال ادھر مشاعرہ کی کارروائی اس موڑ پر پہونچ چکی تھی جہاں مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید میرا نام اب جلد ہی پکارا جائے۔ اور یہ اندازہ صحیح نکلا۔ یعنی ناظم ولسن صاحب فوراً میرے نام کا اعلان کیا۔ مجھے جو غزل پڑھنی تھی وہ اس مشاعرہ کیلئے "قومی دفاع" کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ چند تمہیدی کلمات فرمائے۔ میں غزل کی شان نزول بیان کر رہا تھا اور دماغ پیشگی ریمارک دے رہا تھا۔ کہ "سادہ لوح بزم کے اہل ذوق یہ بھدی اور بے مزہ غزل سن کر اپنے دل ہی کیا کہیں گے۔" ہائے محبی! اس موقعہ پر آپ دیکھتے اور نہ میری کشمکش اور اضطراب کا عالم دیکھئے۔ جی کڑا کر کے غزل شروع کی مگر حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ مطلع اول ہی پر تمام اہل ذوق کے ساتھ صدر محترم نے بھی اس طرح میرا حوصلہ بڑھایا کہ میں نے ایک دم سے خود کو غزل پڑھنے کیلئے تیار پایا۔

محبی! شعر میں مشاہدہ داخلی اور لفظی و معنوی رعائیتوں کا معاملہ رنگ رہا۔ میرا ناچیز خیال ہے کہ شاعر کو اگر اس کے شعروں کی اشاریت کی پوری داد مل جائے تو یقیناً اس کو اس کی فکر کی دشواری کا صلہ مل جاتا ہے۔ اس مشاعرے کے سامعین کے مجمع کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی جو بعض اشعار کی رمزیت کی طرف ایک ہلکا اشارہ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس لئے میں جہاں مناسب سمجھتا تھا اشارے کرتا جاتا تھا۔ ایک جگہ "اہل وفا" سے خطاب تھا۔

سر خود کوئی کبھی ہو نقش وفا تو ابھرے
قتل عشاق کے الزام کا یہ وقت نہیں

ایک شعر اور تھا۔ پڑھنے سے پہلے عرض کیا کہ اس میں خطاب ایک سادہ دل سے ہے اور یہ سادہ دل ہم سب کا محبوب ہے۔

کیسے سمجھاؤں تجھے نزاکت عشق کی بات
سادہ دل اپنا مزہ پیام کا یہ وقت نہیں

محترم صدر مجلس کی داد و تحسین کا انداز بتا رہا تھا کہ ان دونوں اشعار کی اشاریت پوری طرح ان کے ذہن کی گرفت میں ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں دیگر شعرائے کرام اور اہل ذوق حضرات کی انصاف پسندی کا اعتراف نہ کر دوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جناب صدر کی حوصلہ افزائی سب پر بالا تھی۔ پڑھنے والا مطمئن ہو کر چلو محنت ٹھکانے لگی۔

مشاعرہ تقریباً ۳ ½ بجے شب میں ختم ہوا۔ قیام گاہ پر آکر پاؤں سیدھے کر پائے تھے کہ رضا کریم صاحب آ دھمکے۔ حکم ہوا کہ بیگو سرائے چلنا ہے۔ اور ابھی چلنا ہے۔ میں چلا ہوں اور تم طالب کو ہمراہ لیکر آؤ۔ گاڑی وہ کھڑی ہے۔ شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ (راقم) یہیں ٹرین سے نکل بھاگنے کی تاک میں ہے۔ اے محترم! پولس والوں کے تعاون سے ایک امباسڈر میں بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ مشاعرہ پر ڈرائیور صاحب کا تبصرہ سننے میں ملا۔ ڈر کے مارے گاڑی میں دبے ہوئے تمام شعراء (ڈرائیور صاحب کی زبان) میں ہاں ملا رہے تھے۔ اس لئے تبصرہ بے لاگ تھا۔ قیام گاہ پر وفا صاحب اور جوش صاحب وغیرہ پہلے سے آئے ہوئے موجود تھے۔ اختر صاحب کا قیام بھی رضا کریم صاحب ہی کے یہاں تھا۔ رضا صاحب سے میں نے پوچھا۔ "اس خاطر آؤ کا مطلب؟" فرمایا "دنیائے شب کی بچی کھچی مے سحر کے ساغر میں ڈھلنے کا پروگرام ہے۔" ایک تو محفل شاداب دوسرے انتظار اس پر شب بیداری کا کسل کو ہوش نہ تھا منہ ہاتھ دھو کر ذرا لیٹے ہوئے تو نیند نے آ دبوچا۔ دس بجے بیدار ہوئے تو ایک نشست ترتیب پا گئی۔ شاداں مرحوم، جوش صاحب، وفا صاحب، محبوب الٰہی، خورشید صاحب طالب، اختر صاحب قبلہ اور خاکسار وغیرہ۔ مجلس ہر قسم کے تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ کچھ دیر سننے سنانے کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر شریک بزم کیطرح اختر صاحب

بھی ملے بے تکلف رہے۔ مگر اس بے تکلفی میں بھی میں نے دیکھا کہ توازن
کا دامن ہاتھ میں ہے۔ میں مشاعرہ کی بہ نسبت یہاں زیادہ یکسوئی کے
ساتھ اختر صاحب کا جائزہ لے رہا تھا۔ اختر صاحب کا ہر حال میں
متوازن انداز ان کی شخصیت کے مطالعہ کی میرے لئے بنیاد بن گیا۔

پھر کو اتفاق سے کئی بار پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اور پٹنہ کے
ان سفروں میں جب اور جہاں بھی اختر صاحب کی زیارت ہوئی، یہی
توازن ان کی ہر ادا میں نظر آیا۔ ڈاکٹر سید منظر امام کے ہاں نشست میں
رضا صاحب کی قیام گاہ پر، پٹنہ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں، خود اختر
صاحب کی قیامگاہ پر، غرضکہ ہر جگہ اختر صاحب متوازن اور معتدل
نظر آئے۔ بکھرے ہیں۔ مگر معتدل ہیں۔ بینائی پر الجھنوں کے اندر ہیں پھر
بھی متوازن ہیں۔ اب تو کہنے کو کئی ملاقاتیں بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن نقوش
کے شخصیات نمبر کے مطالعہ کے بعد ہی سے میں اختر صاحب کا گھر اور ان کی
گھریلو زندگی کے دیکھنے کا متمنی تھا۔

مجبی! یاد کیجئے پہلی بار میں آپ اور پروفیسر لطف الرحمٰن کی
معیت میں اختر صاحب کے گھر گیا تھا۔ یاد ہی ہوگا کہ ہم ان کے پاس جب
ہم لوگ پہونچے تھے تو اختر صاحب خواجہ احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی)
کے ہمراہ رکشہ پر سوار ہو کر کہیں کے ارادے سے چل چکے تھے۔ اور اس صورت
حال کے پیش نظر ہم لوگ ذرا تعجب سے بے تعلق سے بن گئے تھے۔ گویا ہم لوگ
اختر صاحب صاحب کے یہاں نہیں کہیں اور جا رہے ہوں۔ دوسری بار
جب ہم تینوں کے علاوہ محترم سید رضا نقوی صاحب بھی تھے۔ اختر صاحب
گھر کے ایک ملازم یا مالی کے ہمراہ گملوں میں لگے ہوئے پودوں کی دیکھ ریکھ
میں مصروف تھے۔ حیران رہ گیا۔ ایک مختصر سے صحن میں کس سلیقہ کی
چمن بندی کر رکھی ہے۔ ایک ذرا سی جگہ اس میں رنگ برنگے پھول!
زمین سے اگے ہوئے پھول، گملوں سے سر نکالے ہوئے پھول! اس طرح کہ
مختلف ترکاریوں کی بھی کاشت کی ہوئی۔ رحمتا مقصد دلکشی کا ایک
جلوۂ صد رنگ تھا جس کا ہر رنگ نگاہوں کو دعوت نظر اور روح
کو فرحت و انبساط سے مالا مال کر رہا تھا۔ میرا تاثراتی ہیجان کچھ
دیر کے بعد جب کم ہوا تو دماغ نے پھر اپنا کام شروع کیا۔ گھر کے بیرونی
حصہ کی ہر چیز اب آنکھوں کے سامنے تھی۔ ہر ایک سے نفاست اور
سلیقہ ٹپک رہا تھا۔ اس میں اسی توازن کی کارفرمائی نظر آ رہی تھی۔
جس کا مشاہدہ اختر صاحب کی پہلی زیارت کے موقع پر ہوا تھا۔ ذہن ایک
نیا تجربہ کر رہا تھا۔ توازن ہی سے اصول بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مہمانوں کی
خاطر تواضع ہو، ملازموں کی آمد و رفت ہو، کوئی حکم اور اس کی تعمیل ہو
اور چاہے مہمانوں سے ملنے اور ان سے گفتگو کا انداز ہو، کوئی چیز بھی
بے اصول اور بے ضابطہ نہ دیکھی۔ جتنی دیر اختر صاحب کے یہاں رہے
اتنی دیر تک زندگی کے خاص سبق اور اصول سیکھتے رہے۔

مجبی! کسی ادیب، نقاد یا صاحب علم کے بارے میں یہ تصور کہ
وہ ایک مرتب اور منظم زندگی بسر کرتا ہوگا، محض افسانوں اور ناولوں
میں پڑھنے کی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ پریم چند کی "گئودان" میں پرو
فیسر مہتہ نام کا کردار دیکھئے۔ کتنی معیاری اور منظم زندگی تھی۔
پروفیسر مہتہ کی۔ اتنی معیاری کہ جس نے مس مالتی (گئودان کا ایک
کردار) جیسی لاابالی اور مغربی تہذیب میں بہی جانے والی نوجوان لڑکی
کو زندگی کا ایک مقصد اور معیار دیا۔ لیکن اس عالم آب و گل کی چلتی
پھرتی صورتوں میں نہ کوئی مہتہ نظر آتا ہے۔ نہ کوئی مالتی۔ چند ماہنامے
اٹھا کر لیجئے اور ورق گردانی کیجئے پھر دیکھئے! تقریباً ہر افسانے میں رومان
لڑانے والا ہر نوجوان اپنے وقت کا مہتہ ہے۔ باتیں کیجئے تو اتنی اونچی کہ

از منطقِ بام تا بہ ثریا اذان تو

کا گمان ہو۔ لیکن ان کے گھروں کا جو ذرا جائزہ لیجئے تو پتہ چلے کہ کتنی
منظم اور معیاری زندگی یہ لوگ بسر کرتے ہیں۔ یادش بخیر ہمارے
فنکاروں بالخصوص شاعروں اور افسانہ نگاروں کا تو کہنا ہی کیا۔
آپ کی سراسیمگی بجا ہے۔ جی! ماہناموں اور جریدوں کے مدیران
کراچی کی اکثریت بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ بکھرے اور الجھے ہوئے بال، بالوں
پر گرد و غبار کی تہہ پر تہہ جمی ہوئی، لباس اور پوشش کثیف اور
بے ڈھنگی، گریبان چاک مگر بے شعور جنوں، چہروں پر اڑتی ہوائیاں

مگر سوزِ ہجراں سے نا آشنا، بستر اور ہینگر پر لٹکے ہوئے کپڑوں سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ایک طائرانہ جائزہ لیجئے۔ مجال کیا جو کوئی چیز اپنی جگہ پر سلیقہ سے موجود نظر آئے۔ معلوم ہوگا ابھی کوئی طوفان ادھر سے گزر رہا ہے۔ اور وہ جو شعری اور افسانوی مجموعوں کے نام کی ایک چیز چھپ کر ہمارے اور آپ کے ہاتھوں میں آتی رہتی ہے۔ اس کے انتساب والے صفحے کے بالمقابل ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا ایک تصویری خاکہ نظر آئے گا۔ بس دیکھئے اور دیکھتے رہ جائیے۔ کچھ ایسا نظر آئے گا گویا دنیا بھر کے اہلِ دخت کی سربراہی آپ اور صرف آپ ہی کی اجارہ داری ہے۔ ہم آپ روتے ہیں۔ ادب جمود کا شکار ہوا جا رہا ہے یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ کہ ادب ادیبوں کی زندگیوں کے تضاد کا شکار ہوا جا رہا ہے۔

اس افراتفری کے دور میں اگر کوئی ادیب اپنے فن اور زندگی کو اس ناہمواری سے بچالے جاتا ہے تو یقیناً اس کا فن اور اس کی زندگی ایک مثالی فن اور ایک مثالی زندگی ہے۔ اور اس لحاظ سے اختر صاحب کی شخصیت ایک مثالی شخصیت ہے —— مجیبی! اس کے آگے والی بات تو مستقبل میں اختر صاحب پر کام کرنے والوں کیلئے چھوڑ دیجئے۔ البتہ اتنی بات اس موقع پر مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ تحقیق و تنقید یا ادب و فن کے میدان میں بہت ممکن ہے اختر صاحب سے بھی بڑی اور بلند شخصیت رکھنے والے افراد موجود ہوں لیکن ایک ایسا صاحب نقد و نظر یا ادیب و فنکار جس کی زندگی اس کے فن کی اور اس کا فن اس کی زندگی کا آئینہ دار ہو، اختر صاحب کے علاوہ مشکل ہی سے ملیگا

مجیبی! میں آپ سے یہ تو نہ کہوں گا کہ اختر صاحب ایک تعمیری ذہن رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس بدیہی حقیقت سے ہم آپ اور اختر صاحب کے سبھی جاننے والے واقف ہیں۔ اور مان لیجئے کوئی واقف نہیں لیکن تعمیر کی ہر اینٹ تو واقف ہے۔ واقف ہی نہیں گواہ ہے۔ کہ اس کو یہ حسنِ ترتیب اور گراں مائیگی کس معمار نے بخشی ہے؟ البتہ میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ اختر صاحب کے پاس ایک تعمیری ذہن اس لئے ہے کہ ان کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اور یہ دھڑکتا ہوا دل دھڑکتا ہوا ہی نہیں تڑپتا ہوا دل بھی ہے۔ احساس نے سوز و دردمندی کا ایک چمن اگا رکھا ہے۔ گلہائے رنگ رنگ کا چمن، نکہت صد رنگ کا چمن، پھولوں کا چمن، کلیوں کا چمن تربیت یافتہ اور تعمیر شدہ شاگردوں کا ایک عظیم گروہ جو آج ملک اور بیرونِ ملک کے متعدد اور مختلف تعلیمی اور تصنیفی اداروں میں تربیت اور تعمیر کا وہی فرض انجام دے رہا ہے جیسے خود اختر صاحب یونیورسٹی میں انجام دے رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو آج اپنی اپنی جگہوں پر ایک قابلِ فخر معیار ہیں۔ اور کتنے ہیں جو دل میں تمنائے تعمیر لئے فرضِ تعمیر کے انجام دینے کیلئے ساز و سامان سے لیس ہو رہے ہیں۔

مجیبی! آپ ابھی نوجوان ہیں۔ خدا وہ دن جلد لائے جب آپ کی روح کا وجدان آپ کو بھی وہی تماشا دکھائے جیسے اختر صاحب کا روحی وجدان انھیں آج دکھا رہا ہے۔ مجیبی! کاش میرے بس میں ہوتا کہ میں اپنی بوڑھی آنکھیں آپ کو دیدیتا۔ پھر آپ دیکھتے کہ ایک نو تعمیر شہر کی آباد کاری کے بعد، اس کے معمار کی آنکھوں میں کون سی نئی جوت جھلکتی ہے اور اس کے سینے میں اس کے دل کے ساتھ اور کون سا رقصاں ہوتا ہے۔ ہو سکے تو اس کی آنکھوں میں جھانکئے اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیجئے کہ وہ اس وقت عظمت انبساط و نشاط کی کس شہنشاہی پر فائز اور کس مسند پر متمکن ہے۔ اس کی روح کی طمانیت و مسرت، اور اس طمانیت و مسرت کا اندازہ خود اسی معمار کو پورے طور پر ہو سکتا ہے۔ جس کے ایک دستِ تعمیر نے ہزاروں دستِ تعمیر پیدا کئے ہیں۔ اور جس کے ایک چراغ سے ہزاروں چراغ فروزاں ہو اٹھتے ہیں۔ لیکن ٹھہرئیے! ذرا میں اپنے مطالعہ کی بنیاد کی یاد ایک بار پھر تازہ کر لوں۔ اگر اختر صاحب کا تعمیری ذہن باہمہ درد و سوز مندی توازن کی راہ پر چلتا تو آج (بے ادبی معاف) اختر صاحب وہ عظیم کارنامہ اپنے شاگردوں کی شخصیت کی تعمیر کا انجام نہ دے سکتے۔ جسکو انھوں نے انجام دیا۔ اور دے رہے ہیں اور جسکی

آج کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔

اختر صاحب کے لائق اور ہونہار شاگردوں کی ایک مختصر
تعداد ہے جو بھی متعارف ہوئے۔ غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی
پروفیسر منظر شہاب، پروفیسر لطف الرحمن، پروفیسر
قمر اعظم ہاشمی اور پروفیسر علیم اختر حالی وغیرہ۔ میں نے ان دوستوں
کی صلاحیتوں پر شدید بار غور کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کے بارے
میں غیب بھی غور کیا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب ایسی
صلاحیتوں کے مالک ہیں کہ اگر یہ چاہیں تو عظیم سے عظیم علمی، ادبی
اور تحقیقی کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں
ایسی ہیں کہ یہ آج کے بحرانی دور میں بھی اگر ادب و صحافت کا رخ ایک
متوازن و صحت مند سمت کی طرف موڑ دیں تو جائے تعجب نہیں اس
لئے کہ ان کے عظیم مربی نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں یا ان
کی مدد ہی کی ان کو کام کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔ مجھے ان ہی
چند افراد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اختر صاحب کے وہ تمام لائق
شاگرد حضرات بھی جن سے بدقسمتی سے میں پوری طرح واقف نہیں
بہت بلند پایہ کے اللہ جن سے مراسم نمایاں ہیں۔ کن اعلیٰ اور عمدہ صلاحیتوں
کے مالک ہو گئے۔

مجھے جہاں تک میری محدود واقفیت ہے۔ اس کے پیش نظر
عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ ماضی میں شخصیات کی تعمیر اور صلاحیتوں
کو ابھارنے اور ان کو راہ پر لگانے کا عظیم کارنامہ جن شخصیتوں نے
انجام دیا تھا ان میں دو نمایاں نام ہیں۔ ایک تو خود شبلی
نعمانی اور ایک ان کے جانشین اور لائق ترین شاگرد سید سلیمان
ندوی۔ ان دونوں جیسی مکمل مثال میرے علم میں نہیں۔ ہاں انکار
نہیں ہے کہ ان دو کے علاوہ اوروں نے یہ کام انجام دیا ہی نہیں
ہے۔ دیا ہے اور ضرور دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ دو
بزرگوں نے جتنے مکمل طور پر اور ایک منصوبے کے تحت یہ کام کیا
ہے۔ اس طرح دوسرا شاید نہ ہو سکا۔ دونوں کے سامنے ندوہ کی

ممالک اور نونہال نوجوان تھے۔ لیکن اس حلقے سے باہر کے باحوصلہ
اور باصلاحیت لوگوں کی بھی یہ دونوں بزرگ رہنمائی اور حوصلہ
افزائی کرتے تھے۔ بالخصوص علامہ شبلی کا دائرہ کار تو اس سلسلہ میں
بہت وسیع تھا۔ انکی نگاہوں اور ان کے کاموں کی وسعت کا اندازہ اسی
سے لگایئے کہ اس اعلیٰ مقصد (علمی و ادبی شخصیتوں کی تعمیر) کیلئے انھوں
نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔ جو آج ایک عظیم تصنیفی
اور تحقیقی ادارہ ہے۔ شبلی کی تعمیر کردہ شخصیتوں میں عبدالسلام ندوی
(شعرالہند اور اسوۂ صحابہ والے) پروفیسر عبدالباری ندوی اور خود
ان کے جانشین اور سب سے بلند شخصیت رکھنے والے شاگرد سید سلیمان
ندوی ہیں۔ ندوہ سے باہر کی شخصیتوں میں مہدی الافادی مرحوم کا
نام بطور مثال کافی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی تعمیر کردہ شخصیتوں کی
تو ایک بہت بڑی تعداد آج نظر آرہی ہے۔ ابوالحسنات ندوی،
یونس فرنگی محلی مرحوم سید نجیب اشرف ندوی، سید ریاست علی ندوی
شاہ معین الدین ندوی (موجودہ ناظم دارالمصنفین اور مدیر معارف)
سید صباح الدین عبدالرحمن، حاجی معین الدین ندوی مرحوم (سابق
پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ) مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید
ابوالحسن ندوی وغیرہ۔ یہ بات کہ کس کس نے کہاں کہاں اور کس نوعیت
کا کام انجام دیا؟ بجائے خود ایک مستقل مقالہ کا محتاج ہے۔ مجھے یہاں
صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مذکورہ دو بزرگوں نے جس انداز کے کام کئے ہیں
ان کی مثال ان کے بعد نہیں ملتی۔ معلوم نہیں پاکستان کا کیا حال ہے؟
لیکن اپنے ملک کا جائزہ لیتا ہوں تو اب کہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں
دیتی۔ لیکن اختر صاحب سے نیازمندانہ تعارف کے بعد میری دلچسپی ان
کی ذات اور ان کے کاموں سے جوں جوں بڑھتی گئی ان کے مطالعہ کا دائرہ
وسیع ہوتا گیا، اور جوں جوں وسیع ہوتا گیا میری حیرتوں میں
اضافہ ہوتا گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اختر صاحب محض ایک علمی آدمی ہیں
اور مختلف میدانوں میں تصنیفی اور تحقیقی کارنامے انجام دے رہے ہیں
مجھے اس کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس طرح کا ایک عظیم کارنامہ وہ اور بھی

انجام دے رہے ہیں۔ یعنی اپنا ہی جیسا دوسروں کو بھی بنا رہے ہیں۔
اختر صاحب اگر ایک مصنف، محقق اور نقاد ہوتے تب بھی ان کی
عظمت کے لئے یہ بات کافی تھی کہ وہ ایک عظیم اور دردمند معمار ہیں۔ فن کی
تخلیق ایک عظیم کارنامہ ضرور ہے۔ لیکن فن کے ساتھ ساتھ فن کار کی تعمیر
کا کام بھی جو انجام دے رہا ہو اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

مجی! اختر صاحب یہ کام کس ڈھنگ سے کرتے ہیں یہ میں نہیں کہہ سکتا
اس لئے کہ بدقسمتی سے میرے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں۔ لیکن میں اپنے
ان احباب کو جو اختر صاحب کے شاگردوں میں ہیں، دیکھتا ہوں تو مجھے
تعمیر شخصیت والے کام کے سلسلہ میں دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) ایک یہ ہے کہ اختر صاحب اپنے شاگردوں کی تعمیر کرتے ہوئے ان
کے ذاتی نظریوں سے تعرض نہیں کرتے۔ وہ محض ان کی مخصوص اور منفرد
صلاحیتوں سے سروکار رکھتے ہیں۔ اور انھیں کو راہ پر لگانے کی کوشش
کرتے ہیں۔ جیسا پہلی بار میرے ذہن نے یہ اندازہ کیا تو مجی! اس کی تصدیق بھی
کر دی۔ ذہن نے کہا "ایک شخص جو زندگی کے ہر شعبے میں توازن کے اصول پر
عمل پیرا ہو یقیناً شاگردوں کی تربیت کے سلسلہ میں بھی یہ زریں اصول۔
توازن و اعتدال۔ پیش نظر رکھتا ہوگا۔ تعمیر کے سلسلہ میں اس اصول کے
برتنے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ تربیت پانے والے کے ذاتی
نظریئے کا ٹیڑھا پن بھی راہ پر لگ جاتا ہے۔ اور مجی! یہ اپنا ذاتی تجربہ بھی
ہے۔ حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ذاتی طور پر جو ذہنی رجحانات ہیں۔ ان کو اپنے
حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور صلاحیتوں کو راہ پر لگاتے ہوئے فکری و عملی
ذمہ داریوں کے احساسات کو بھی بیدار کر دیا جائے۔ یا بیدار کر کے ہی فرض
کا احساس دلایا جائے۔ تربیت پانے والے کا ذہن خود ہی صحیح راہ تلاش
کرنے لگا۔

۲ ــ دوسری بات جس کا اندازہ ہوا یہ تھی کہ اختر صاحب کی بھاری
بھرکم شخصیت دوسری ہلکی پھلکی شخصیتوں کے ابھرنے میں کبھی رکاوٹ نہیں
بنی۔ یہ حالانکہ یہ شخصیتیں انھیں کے زیر سایہ پنپیں، پلی ہیں۔ اور اختر صاحب
کی تنہا یہ خصوصیات ان کے جذبہ تعمیر کے خلوص کی سب سے بڑی پہچان
ہے۔ مجی! ابھی قریب میں بعض مضامین کے پڑھنے سے ایک تلخ اور
افسوسناک حقیقت کا انکشاف ہوا ہے جو "عبدالمجید اردو" اور "والد
بزرگوار اردو" قسم کی ہستیاں گزری ہیں ان میں سے بعض ایسی بھی تھیں
جن کی تناور شخصیتوں میں اچھی اچھی صلاحیت شخصیتیں دب کر رہ گئیں۔
حالانکہ ان بزرگوں کے خلوص و دردمندی کا دنیا بھر میں ڈنکا پٹا ہوا ہے۔
دل خون کے آنسو رو دیا ان بیچاروں پر جن کا جوہر جوش گریہ تناور حضرات
اور تناور ہوتے گئے۔ اور وہ بن کھلے غنچے کی طرح مرجھا کر رہ گئے۔ جس دنیا
کا یہ حال ہو اس میں جب اختر صاحب کی سی چھتنار اور سایہ دار شخصیت
کا علم اور احساس ہوتا ہے۔ تو ڈوبتا ہوا دل ایک دم ابھرتا ہوا محسوس
ہوتا ہے۔ اور ایک خوشگوار ذہنی تکان کے ساتھ بے اختیار آنکھیں بند
ہونے لگتی ہیں کہ ع

یہی تو اک شجر سایہ دار ہے ساقی

مبارک ہیں وہ نونہال جو اس تناور شخصیت کے سایۂ شفقت و درد
مندی میں پروان چڑھے اور چڑھ کر آج خود ایک تناور درخت بن گئے
اور بنتے جا رہے ہیں ـــ مجی! میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا محض ایک
اندازہ ہے اس لئے اختر صاحب کی اس فضیلت و خوبیت کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے تامل ہو رہا تھا۔ لیکن جب خود شاگردوں کے باب میں ان کی
دردمندی، خلوص، شفقت اور لگن کا علم مجھے انھیں کے ایک
مضمون "ایک تعارف" سے ہوا تو وہ دل کو بے اختیار حافظ شیراز
یاد آ گئے ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نکرد

دعا ہے کہ اختر صاحب نے سوز و درد مندی کی جو مشعل جلا رکھی
ہے، وہ مدت دراز تک ان کے ہاتھوں تاباں و فروزاں رہے۔
آخیر میں ایک بات کہنے کی اجازت دیجئے اور یہی درخواست اختر صاحب
سے بھی ہے کہ ـــ مجی! کوئی شخصیت کتنی ہی جامع اور ہمہ گیر ہو
وہ اپنی زندگی اور مقاصد زندگی کی تکمیل میں کم از کم کچھ وفادار اور

باصلاحیت رفیق کی محتاج فرد ہوتی ہے۔ میرا تو ناچیز خیال ہے کہ جو آدمی جتنا ہی زیادہ عظیم ہوتا ہے اتنا ہی وہ ایک پرخلوص اور باوفا رفیقہ کا محتاج ہوتا ہے۔ دل کی دردمندی جہاں دوسروں کو ڈھارس دیتی ہے وہاں وہ اپنے لئے بھی ایک دل دردمند کی احتیاج شدت سے محسوس کرتی ہے۔ تاریخ کی کم از کم دو چار شخصیتوں کی مثالیں آپ اپنے ذہن میں تازہ کرلیں۔ اختر صاحب کی عظمت ایک مسلم حقیقت ہے۔ لیکن معاف کریں آپ اور خود اختر صاحب بھی، کہ یہ جو اتنی حسین اور منظم زندگی کی نعمت اختر صاحب کو حاصل ہے وہ تنہا ان کے بس کا روگ نہیں تالی بجا لیجے یا گاڑی چلا لیجے۔ بہرحال ایک دوسری ہتھیلی اور دوسرے پہیئے کے بغیر تالی بج سکے گی اور نہ گاڑی ایک انچ آگے بڑھ سکے گی۔ اختر صاحب کے گھر کا جب پہلی بار جائزہ لینے کا اتفاق ہوا تھا تو دماغ بہت بہت متحیر تھا اور اس تحیر نے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بھی ابھار دیا تھا۔ یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے، کیا یہ تنہا اختر صاحب کی سلیقہ مندی کا کرشمہ ہے؟ —— رضا نقوی صاحب قبلہ اور اختر صاحب باتوں میں مصروف تھے۔ اور ہم لوگ سننے میں، سنتے سنتے مجھے یاد آتا ہے کہ ہم سب بور ہونے لگے تھے۔ شام سرمئی ہو چلی تھی۔ ہواؤں کی خنکی ایک تقاضہ کر رہی تھی۔ اور وہ تقاضا تھا، چائے کا۔ مگر کہے کون؟ رضا نقوی صاحب اس صورت حال سے دوچار تھے۔ بارے انھوں نے یہ مشکل حل کی۔ اختر صاحب خود ہم لوگوں کو مکرر چائے پلانے کیلئے فکر مند تھے۔ ایک دور پہلے ہی چل چکا تھا سوال شکر کا تھا۔ اور یہ جنس ان دنوں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھی آج کل نایاب ہی سمجھئے۔ بڑی بی (خادمہ) کو آواز دی۔ ان کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ ان کی نگاہ احتساب شکر کے باب میں بڑی کڑی ہے اختر صاحب نے مکرر چائے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے نہ جانے کون سی تکنیک استعمال کی کہ چند منٹوں میں چائے کی لب سوز و لب دوز پیالیاں ہم لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ میرے ذہن نے پھر ایک بار اپنے ڈھب پر کام کرنا شروع کر دیا۔ "یہ تو بڑی بی کی سلیقہ مندی ہے۔" ابھی تو پورا گھر پڑا۔ ذہن میں کریدیہ جاری رہی۔ مگر پوچھنے کی ہمت کسی سے نہ ہوئی۔ رضا نقوی صاحب قبلہ سے بھی نہیں۔ خدا کا کرنا کہ اس سوال کے جواب کا موقع بھی چند مہینوں کے بعد ہاتھ آ گیا۔

میں آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کی دعوت پر اس کی جانب سے ہونے والے ایک مشاعرہ کی شرکت کی غرض سے پٹنہ گیا ہوا تھا۔ رضا نقوی صاحب کی معیت میں اختر صاحب سے ملنے چلا گیا۔ اختر صاحب نے رخصت ہوتے وقت واہی کا صاحب قبلہ کو اور مجھکو اگلے روز کے عصرانہ میں شرکت کی دعوت دے دی۔ یہ عصرانہ آل احمد سرور صاحب اور سید نجیب اشرف صاحب کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ اگلے روز عصرانہ میں شریک ہوئے۔ حضوری مہمانوں کے علاوہ پٹنہ کی نمائندہ علمی ادبی اور سماجی شخصیتیں بھی عصرانہ میں شریک ہوئیں۔ علامہ جمیل مظہری، قبلہ سہیل عظیم آبادی، عطا کاکوی صاحب، مولانا بتیاب صدیقی صاحب، غلام سرور صاحب وغیرہ۔ میں اور رضا نقوی صاحب قبلہ تو تھے ہی۔ مجھی! اچھی طرح یاد ہے کہ آپ اور پروفیسر لطف الرحمن صاحب بھی مدعو تھے۔ غروب آفتاب سے ذرا پہلے تفکہات کا سلسلہ پوری طرح ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نماز مغرب کا وقت آ گیا۔ میرا کرتہ ٹھہرا ذرا لمبا۔ کرتے کی آبرو نباہنے کی فکر ہوئی۔ نشست سے اٹھ کر میں باہر چلا آیا۔ وضو پہلے ہی کر لیا تھا۔ اب تلاش تھی جائے نماز کی کسی نے ملازم کو جائے نماز کیلئے آواز دی۔ یاد آتا ہے کہ وہ اختر صاحب ہی تھے۔ وہ تو آواز دے کر اندر چلے گئے۔ میں جائے نماز کے انتظار میں کھڑا رہا۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ دروازے کے پردے کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور ایک لپٹی ہوئی جائے نماز خود بخود پردے سے باہر نکلی پڑ رہی ہے لپک کر جائے نماز ہاتھوں میں لے لی اور بچھا کر نماز شروع کر دی۔ غلام سرور صاحب مقتدی ہوئے۔ ہم دونوں فرض سے فارغ ہو کر سنتیں پڑھنے لگے کہ ایک صاحب نماز کیلئے اور آ گئے۔ ہم دونوں کی جائے نماز پر تیسرے کی گنجائش نہ تھی۔ اسے حضور تب تک دوسری جانماز بھی جانماز

باقی ص۲۷۵ پر

خالد رشید صبا

اور جب دفتر میں اخبار کی ایک کاپی بھی نہ بچی!

صحافت کو میں سیاست، ادب، خطابت اور کسی حد تک عامیانہ پن کا ایک حسین اور دلکش مجموعہ سمجھتا ہوں۔ سیاست اس کی بنیاد ہے، ادبی غازہ اس میں تابندگی اور تنوع پیدا کرتا ہے، خطابت سے اس میں زور جوش اور طنطنہ پیدا ہوتا ہے۔ اور عامیانہ پن کی وجہ سے عوام اسے چاہتے اور پیار کرتے ہیں۔ دراصل یہی وہ عناصر ہیں جن کی ظہور سے اسے زندگی ملتی ہے۔ اور یہی اجزا جب پریشان ہو جاتے ہیں تو صحافت کی موت ہو جاتی ہے۔

اخبار اپنی زندگی کے ساتھ زبان بھی علیحدہ رکھتے ہیں۔ اور اس کی زبان ادبیت اور بازاریت کا امتزاج بھی ہوتی ہے۔ اگر اس میں صرف ادب ہو تو کچھ خاص قسم کے لوگ ہی اسے پڑھ کر منہ کا مزہ بدل لیں گے۔ لیکن اخبار نکالنے والوں کو اپنے ان قارئین کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جو بازاروں میں کھوکھے چلاتے ہیں۔ بیڑیاں بناتے ہیں۔ اور پان میں لال اور سفید مسالحوں کی آمیزش سے ہمارے اور آپ کے ہونٹوں کو رنگین کرتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے قارئین صرف چلتی پھرتی خبریں یا زبان پسند کرتے ہیں کچھ خبریں اخباروں میں ایسی بھی ہوتی ہیں جو عام نہیں ہوتی ہیں لیکن وہ اپنے اندر اتنی جاذبیت اور دلکشی رکھتی ہیں جن کی طرف ہمارے قارئین بے اختیار کھنچے چلے جاتے ہیں۔

صحافت سے میرا تعلق اس وقت سے ہے جب کہ میں سکنڈ ایر کا طالب علم تھا ان دنوں کی باتیں کچھ ایسی اہم نہیں جن کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ البتہ گذشتہ پانچ یا چھ برسوں میں ایک ایسا واقعہ ہوا

جسے میں کبھی بھلا نہیں سکتا، وہ واقعہ کیا تھا؟ آپ سن لیجئے:-

دسمبر کا مہینہ تھا میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ کالج کے کینٹین میں بیٹھا ہوا گرم چائے پی رہا تھا، سگریٹ کے مرغولے زنجیریں بناتے ہوئے کینٹین کی چھت کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو ایک دوستوں کی نگاہیں تھوڑی دور بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے لبوں کی پنکھڑیوں کی گولائی پر رقص کرتی ہوئی اور اٹھ اٹھ کر زلف کے پیچ و خم میں الجھتی چلی جا رہی تھیں ان کا موضوع سخن انکی صراحی دار گردن اور سرمگیں آنکھوں سے نکل کر نہ جانے کہاں کہاں تک پہنچ رہا تھا جن کی ہاں میں ہاں ملانا چاہئے تھا اور ہمارے قہقہے سے کینٹین کے سکھ مالک نے اب منہ بنانا شروع کر دیا تھا، میں اسی میں مگن تھا کہ کسی نے مجھ سے کہا کہ اختر صاحب نے تم کو بلایا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوا اختر صاحب کے روم کی طرف بڑھا اور کمرے میں داخل ہونے والا تھا کہ دیکھا ہمارے کلاس کی ایک برقعہ پوش ساتھی کمرے سے باہر نکل رہی تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ کلاس میں ہم لوگوں سے کچھ انہیں شکایت ہو گئی ہو۔ میں نے

ان کا موڈ جاننے کیلئے انہیں ٹوکا۔ اور وہ ایچ ہاں ہوں کرنے کے بجائے
کچھ زیادہ بولنے لگیں۔ پھر مجھے اطمینان ہوا اور میں بلا کسی خوف و خطر کے اختر
صاحب کے روم میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ اختر صاحب خاموش اپنی آرام
کرسی پہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے ماتھے پر شکنیں ابھری ہوئی ہیں۔ اور ایک ہتھیلی
سے اپنے چہرے کے آدھے حصے کو چھپائے ہوئے ہیں۔ میں دو سکنڈ تک کھڑا
رہا۔ پھر اختر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ اور بڑی شفقت سے مجھے
بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میں پریشان ہو رہا تھا کہ بات کیا ہے؟ کبھی میں
اختر صاحب کے چہرے پر پھیلی ہوئی گمبھیرتا کو دیکھتا اور کبھی ان کی پیشانی
پر بڑی ہوئی شکنوں کو دیکھتا جو ہمارے لئے سوالیہ نشان بن رہی تھیں۔ آخر وہ
خود مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "مولا صاحب! اس الکشن میں مسلمان غلط راستہ
پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن معلوم اس میں ہو کہ مسلمانوں کو کانگریس
ہی کا ساتھ دینا چاہئے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس مسئلے پر اخباروں میں مضامین
آنے چاہئیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ اگر کوئی صاحب مضمون لکھیں، تو اس وقت اس
سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے مزید کہا کہ آپ ہی کیوں نہیں کوئی مضمون
لکھتے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ اس طرح کے مضامین پر میرا
لکھنا اچھا نہیں ہوگا۔ پھر میں نے اپنی حقیر رائے دی کہ آپ اپنے نام سے نہ لکھیں
کوئی فرضی نام ہی دے دیں۔ اختر صاحب بولے "اچھا ہے۔" اور پھر رضامند
ہو گئے۔ چنانچہ یہ پروگرام طے ہوا کہ کل وہ مجھے مضمون املا کرا دیں گے۔ اور میں
قسط وار اسے ساتھی میں شائع کر دوں گا۔

پھر میں جب ان کے کمرے سے نکلا تو دیر تک اسے سوچتا رہا کہ اس
شخص کے دل میں قوم کا کتنا درد ہے۔ جہاں قوم کے بچوں نے غلط راستے پر
جانے سے وہ بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ وہیں وہ بزرگوں کے غلط فکر سے
بھی بے کل ہو اٹھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اختر صاحب اتنا سب کچھ
کیسے کر لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ کسی معمولی شخصیت کے مالک
سے ہونا ناممکن ہے۔ کسے یقین ہوگا کہ دس بجے سے بارہ بجے تک میر و غالب
کی شاعری سے لے کر نوٹی فائیڈ بورڈ کے نوٹسوں تک میں الجھا رہنے کے باوجود
یہ بھی سوچے کہ مسلمانوں کا انداز فکر کیا ہے۔ اور کیا ہونا چاہئے؟

میں ان خیالات میں کھویا ہوا دفتر چلا گیا۔ اور مقررہ وقت پر نوٹ
بک لیکر حاضر ہو گیا۔ اختر صاحب نے مضمون املا کرانا شروع کیا میں لکھتا
رہا۔ تاریخ، سیاست، ادب، خطابت چاروں رنگوں میں شرابور مضمون
ہوتا جا رہا تھا۔ اور قوموں کی تاریخ اس کے عروج و زوال کی کہانی ادبی
چاشنی، خطابت کا زور اور موجودہ سیاسی رنگ چاروں نے مل کر اس مضمون
کو بہترین حکیمانہ اور مفکرانہ سیاسی مضمون بنا دیا۔ میں خوشی خوشی
دفتر لوٹا اور مضمون کے سلسلے میں ضروری ہدایت دیکر اسے کتابت کیلئے دے
دیا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس سے کتنی غلط سے اردو پڑھنے والے خصوصاً مسلمان
کتنے چونک پڑے۔ جب میں حسب معمول اختر صاحب کے مضمون کی دوسری
قسط لیکر دفتر پہونچا تو دفتر کے سرکولیشن مینیجر نے ہمارے کمرہ میں آکر پوچھا کہ
کیا بات ہے۔ آج اخبار بازار، ایجنٹوں اور ہاکروں سے لینے کے علاوہ لوگ
دفتر سے لینے آرہے ہیں۔ میں ان سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی فون
دفتر جمعیۃ العلماء سے تھا۔ کوئی صاحب پوچھ رہے تھے ابھی دفتر میں آج کا
اخبار مل سکتا ہے کہ نہیں، شام میں دو ایک ایم ایل اے حضرات پہونچے اور اخبار
لے گئے۔ جماعت اسلامی کے دو ایک مولوی صاحب بھی اخبار خریدنے پہونچے۔
اس کے علاوہ کتنے سفید ٹوپی والے دفتر میں آئے اور گئے۔ میری نزدور لگی
کے کتب کے سوا سنہری باغ کے وکیل صاحب سب لوگ ایک دو اخبار خریدے
نکلتے جا رہے تھے۔ اور میں اپنے ٹیبل پر کہنیاں ٹیکے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور
جب آخر فائل کی بھی ساری کاپیاں ختم ہو کر صرف دو کاپیاں رہ گئیں تو
چپراسی نے ان دو اخباروں کو ہماری میز پر لاکر رکھ دیا۔ میں ان کاپیوں کو
محفوظ کرنے کی بات سوچ ہی رہا تھا کہ دفتر کے بغل کا عطر فروش ننگی پیٹھ کمرہ
میں داخل ہوا اور اپنی گول بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے اور پیلے پیلے بڑے بڑے
دانت نکالتے ہوئے بولا کہ آج سنا ہے اچھا مضمون آپ کے اخبار میں نکلا
ہے۔ ایک اخبار مجھے بھی دلوا دیجئے۔ میری آنکھیں ان دو بچے ہوئے اخباروں پر
لگی ہوئی تھیں۔ جو میری میز پر پڑے ہوئے تھے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا
کروں کہ عطر فروش نے پھر اپنے پیلے پیلے دانت کو نکال کر کچھ کہنا چاہا اور میں نے

بلا کچھ سوچے سمجھے ان ان دو کاپیوں میں سے ایک کاپی جو تھا سے والی کے
حوالے کرکے اس سے پیچھا چھڑایا ۔ اور بقیہ صرف ایک اخبار کو تہ کرکے جیب میں
کر دیا کہیں کوئی صاحب یہ نہ پوچھ بیٹھیں ۔ ابھی ڈرا اور سہا نہ کر نے
پایا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ جی سوکھ گیا ۔ کہ کہیں اس وقت پھر نہ شامت
آئے ۔ میرا اندازہ صحیح تھا ۔ ٹیلیفون ابا جان کا تھا ۔ حکم تھا چپراسی سے
ایک اخبار فوراً بھجوا دو ۔

میں نے بڑی حسرت سے پیر ڈرا اور کھولا دل پر پتھر رکھ کے اس اخبار کو
بھی چپراسی کے حوالے کرکے اسے چلتا کیا ۔ اور اب دفتر میں اس دن کی ایک
کاپی بھی باقی نہ بچی ۔ میں دیر تک سوچتا رہا ۔ کہ کیا کروں آخر میں میں
مشین روم میں چلا گیا ۔ اور ردی اخباروں کے ڈھیر کریدنے لگا ۔ آخر مجھے
اس دن کا دوہرا چھپا ہوا ایک اخبار مل گیا ۔ جس کا پہلا ، آخری صفحہ
ایسا چھپا ہوا تھا جس کے سارے حروف دوہرے تھے ۔ البتہ دوسرا اور
تیسرا صفحہ خیر سے اچھا تھا ۔ جس پر وہ مضمون شائع ہوا تھا میں نے خوشی
خوشی اٹھایا اور اپنے سرکولیشن منیجر کے حوالے کیا ۔ جو اس کا منہ تکتے
بیٹھے تھے ۔ کہ آج کی ایک کاپی بھی فائل میں نہیں تھی ۔ آپ یقین فرمائیں
جب تک وہ مضمون قسط وار اخبار میں شائع ہوتا رہا ایجنٹوں نے کاپیاں
بڑھا دیں اور قارئین نے زیادہ اخبار لینا شروع کر دیئے ۔

اور آج بھی جب میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو ہمارے سامنے مشین روم
کا پھینکا ہوا اخبار فائل میں لگا ہوا میز پر پڑا ہے میں اس دوہرے
چھپے اخبار کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے اختر صاحب کی کشادہ پیشانی پر
پڑی ہوئی وہ بے چین شکنیں یاد آ رہی ہیں ۔ جن میں غالب اور میر کی شاعری
کی عظمت کی دلیلیں بھی تھیں طالب علموں کے ڈسپلن کا معاملہ بھی ۔
سینٹ کی بحثوں کی سرگرمی بھی ۔ افسانوں کے پلاٹ اور تنقید و تحقیق کا
گراں باری بھی ۔ کلاس کے ایجنٹ کا سوال بھی ۔ نوٹس بورڈ پر لگنے والے
نوٹس کا مضمون بھی ۔ پھر لال چپراسی کے دیر سے آنے کا غصہ بھی اور ان
سب کے علاوہ قوم کے مسائل کا حل بھی جن میں ہماری قوم کبھی الجھتے کبھی
الجھاتی رہتی ہے ۔ اور وہ کوئی راستہ نہیں متعین کر پاتی کہ ہم کیا کریں — ؟

بقیہ:- ایک خوشگوار یاد

کے قاعدے پر پردے سے باہر نکل رہی تھی ۔ اب میرے ذہن کو اس
سوال کا جواب مل چکا تھا ۔ اب جاکر معلوم ہوا کہ اس گھر کے اتنے کسے
ہوئے نظم کا سررشتہ کن انگلیوں میں ہے ؟ ۔ عجیب ہیں یہ انگلیاں
کہ اتنے لمبے چوڑے اور با سلیقہ خانگی نظم کا دوڑ کے ساتھ ، ایک گرہ نیز
اور گل کا بھی بکھرے ہوئے ہیں ۔ یہ محترمہ شکیلہ اختر ہی ہیں ، جن کے
قلم نے اختر صاحب کی عظمت سے مجھے روشناس کیا اور اختر صاحب کے
مطالعہ کیلئے مجھے اکسایا ۔ ایک جز رس خاتون ، ایک عظیم قلم کار خاتون
بھی ہوں ، یہ سعادت زور بازو سے زیادہ کسی بخشنے والے کے کرم کا مظہر ہے

ابھی ! میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا ذہن یہ بحث چھیڑے
ہوئے ہے کہ اختر صاحب کی شخصیت اور زندگی کی آسودگیوں کی تکمیل
میں محترمہ شکیلہ اختر صاحبہ کی تکمیل میں اختر صاحب کا — میں اپنے
ذہن کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ دونوں ہی کا ہاتھ ایک دوسرے
کی رفاقت اور تکمیل کا حق ادا کر رہا ہے — ابھی ! ایک آسمانی صحیفے
میں یوں لکھا ہوا ہے کہ " هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ
لَّهُنَّ " (عورتیں تمہاری پردہ اور تم (مرد) ان کا پردہ ہو) آپ کا
جی چاہے تو اردو محاورے میں یوں کہہ لیں ۔ " تمہارا ان کا چولی دامن
کا ساتھ ہے " اور یہی محاورہ توبۃ النصوح والے نذیر احمد نے دیا
ہے ———— دعا ہے کہ اختر صاحب کا سازِ دل محترمہ شکیلہ
اختر کیلئے ، اور شکیلہ اختر کا ، اختر صاحب کیلئے کیف و نغمہ کا نور
برساتا رہے ۔ دونوں کے دل مدت دراز تک دھڑکتے رہیں ، اور دونوں
کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوتی رہیں ۔ کہ ان سے کئی بڑے فرائض انجام
پا رہے ہیں ۔ ع

اور درویش کی دعا کیا ہے ؟

ڈاکٹر سید فخر الدین احمد

پروفیسر سید اختر احمد صاحب اورینوی سے میری باقاعدہ جان پہچان تو اُن دنوں ہوئی جب پٹنہ کالج، فرسٹ ایر میں میرا داخلہ ہوا۔ اور وہ میرے استاد ہوئے۔ لیکن اختر صاحب سے میری پہلی واقفیت اس وقت ہوئی تھی جب کالج کی منزل مجھ سے بہت دور تھی۔ میرے ماموں اختر صاحب کو "اختر تاباں" کہا کرتے تھے۔

ارول اور بلاسی

ارول کے پاس ہی بلاسی ہے جہاں میری ننہیال ہے یہیں حضرت نورالدین شہید رحمتہ اللہ کا مزار ہے اور یہاں سے تھوڑی دور پر موضع شیر (ایں) حضرت بی بی بارکہ رحمتہ اللہ علیہا (مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی پوتی) کی قبر ہے بلاسی اسی سون ندی کے کنارے بسا ہوا ہے جس پر اختر صاحب کا محبوب گاؤں ارول واقع ہے۔ دونوں گاؤں یا قصبے آبادی میں اور رقبہ کے لحاظ سے بہت بڑے ہیں۔ اپنی اپنی خصوصیات، روایات، نام و نمود اور رونق کے لحاظ سے علاقے بھر میں بڑی اہمیت اور شہرت رکھتے ہیں۔

میرے ماموں سید مظہر حسین صاحب مرحوم اور سید شاہ توحید صاحب مرحوم کے درمیان ذاتی دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔ ان دنوں آج کی طرح پنچایتی نظام تو نہیں رائج ہوا تھا۔ مگر یہ دونوں حضرات، اپنی پوزیشن اور عزت اور احترام کی بنا پر اپنے اپنے گاؤں اور علاقے کے مکھیا نہیں سرپنچ تھے۔ کوسوں دور تک کے علاقے میں کوئی واقعہ ہو جائے، خواہ واردات قتل ہو یا کسی بڑی جائداد کے وارثوں میں نزاع۔ انکی تحقیقات یا ثالثی "مجو بابو" (میرے ماموں موصوف) کو "یا شاہ صاحب" کو کرنی ہوتی تھی۔ پولیس کے اعلیٰ افسر اور دوسرے حکام ان کا لحاظ اور احترام کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ زمینداری کے خاتمے کے دنوں میں بھی ان حضرات کو خاص وقار حاصل تھا۔

میرے ماموں صاحب نے اختر صاحب کو اورول میں "پام ولا" میں دیکھا تھا، اور وہ اختر صاحب کے بڑے مدّاحوں میں ہو گئے تھے۔ میرے ماموں شاعر تو نہ تھے مگر حافظ و خیام کے شیدائی تھے۔ کسی کی تعریف کرنے لگتے تو ان کی شاعرانہ طبیعت اس میں دل کشی اور رنگینی پیدا کر دیتی۔ ہم نو عمروں پر اُن دنوں ان کی تعریف کا اثر جادو کے ایسا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اورول سے پلاسی واپس آئے تو اختر صاحب کے "پھر بیمار" پڑ جانے کی خبر لائے اور اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اختر صاحب کے جمالِ ظاہری اور محاسنِ باطنی کا ذکر کرنے لگے — ان کی شاعری، ان کا انگریزی ادب سے شغف، اسلام پر فریفتگی، اس کی اشاعت کی فکر وغیرہ وغیرہ۔ ان کی نگاہ میں اختر صاحب غیر معمولی اوصاف کے حامل انسان تھے۔ ایک ایسے آئڈیل نوجوان جس پر فطرت اگر ایک طرف بڑی فیاض ہوئی تھی — اسے حسنِ قامت اور جمالِ فکر و نظر بخشا تھا۔ تو دوسری طرف اتنی ستم ظریف کہ عنفوانِ شباب ہی میں اسے ایک ایسا روگ لگا دیا جو جان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

میرے ماموں صاحب مزاحاً کہا کرتے تھے کہ ایک زمانہ میں اورول میں کاغذ بنتا تھا، اروی کاغذ مشہور تھا، اور اورول والے کاغذی مشہور تھے۔ اور اب اورول میں کاغذ نہیں بنتا ہے۔ مگر اختر کی ضو فشانی سے اب یہاں گھر گھر میں "شعر نغمہ" اور شعر و سخن کا ایسا چرچا ہو گیا ہے کہ یہاں کی لڑکیاں بھی خوبصورت افسانے اور حسین نظمیں لکھتی ہیں، لگتا ہے جیسے اختر نے اورول کی نہر میں شعر گھول دیا ہے۔

یہ سب سُن کر اختر صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی تمنّا پیدا ہو گئی تھی جس کی تکمیل اس وقت ہوئی جب ۱۹۴۲ء میں پٹنہ کالج میں میرا داخلہ ہوا اور اختر صاحب کے کلاس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ کمپوزیشن کے کلاس میں خواہ اردو ہو یا ہندی، پڑھائی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال تھا، مگر اختر صاحب کے کلاس میں جو شاندار لکچر ہوتے تھے ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان میں شریک ہو چکے ہیں۔ اُن کی خطابت کا اعجاز ہم لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا تھا — سرسید، حالی، شبلی، عظیم الدین، اقبال، مجاز وغیرہ وغیرہ اُن کے عہد، ان کی شاعری اور اس کے محرکات کا ذکر ایک طرف، تو دوسری طرف ملٹن، شکسپیر، شیلے، کیٹس، بائرن وغیرہ وغیرہ کا ذکر۔ اور پھر داستانِ محمود و ایاز، فردوسی کے شاہنامے کا ذکر حسین اور اس پر ان کا دلکش اندازِ بیان، ہم سب کے سب مسحور و مبہوت ہو جاتے تھے، اور ہم لوگ ان کے گرویدہ و فریفتہ ہو گئے تھے۔ ان دنوں سے لے کر آج تک کے طویل عرصہ میں، میں اختر صاحب سے برابر ملتا رہا ہوں، انکی محبّت اور اُستادانہ شفقت میرے لئے بڑی ہمّت افزا اور باعثِ تقویت رہی ہے۔

اختر صاحب کو بہت قریب سے، انتہائی بے تکلفی کے عالم میں دیکھنے کا موقع ڈراموں کی تیاری کے سلسلہ میں ملا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ پٹنہ کالج میں بزم ادب کے سالانہ مشاعرے بڑے معرکہ آرا ہوا کرتے تھے مگر تبدیلیِ زمانہ کے ساتھ یہ مشاعرے اپنی افادیت اور اپنا حُسن کھو بیٹھے، اختر صاحب نے ان مشاعروں کے پھیکے پن کو تیزی سے محسوس کیا اور ادبی ڈراموں کا ایک نیا سلسلہ چلایا۔ چنانچہ بزم ادب کی سالانہ تقریب کے موقع پر مشاعروں کی جگہ ڈرامے ہونے لگے۔ اس کی ابتدا "روحوں کا مشاعرہ" سے ہوئی۔ اس ڈرامہ میں اختر صاحب نے میر، غالب، حالی سے لیکر اقبال، مجاز اور ن۔م۔ راشد تک سبھی شعرا کو اُن کے خط و خال کے ساتھ اسٹیج پر لا بٹھایا تھا۔ شعرا، ماضی و حال، ان کی آپسی چشمکیں اور ان کی شاعری کے

نقطۂ نظر کے فرق کو اپنے دلکش فنی حُسن کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے جن میں ہندوستان کے عظیم ادیب، فنکار اور نقاد بھی شامل ہیں، سب کے سب اختر صاحب کی ڈرامہ نگاری اور اس کے اسٹیج کرنے کی اعلیٰ صلاحیت کی داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ ایک دو ڈراموں میں بابائے اُردو، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اور آل احمد سرور صاحب بھی ناظرین کی حیثیت سے شریک تھے۔ ڈراموں کی تیاری میں اختر صاحب کا انہماک اور ان کی دلچسپی قابل دید ہوتی تھی۔

ریہرسل کا دور ہو، خواہ اسٹیج تیار کرنے کا مسئلہ، میک اپ کا سوال ہو، یا لباس اور اسٹیج کے سامان مہیا کرنے کا پروبلم، غرض یہ کہ ڈرامہ لکھنے سے لیکر اس کے اسٹیج ہونے کی منزل تک، اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات سے لیکر فنی مسائل کی باریکیاں اور ان کی نزاکتیں، ہر بات پر اختر صاحب کی گہری نظر رہتی تھی اور ان کی فنی نکتہ سنجی کارفرما ہوتی تھی، سُنا کرتا تھا اختر صاحب کو اپنے آرام کا خیال رکھنے کی ہدایت اور سخت تاکید کی گئی ہے، لیکن ڈراموں کی تیاری میں دن دن بھر کالج کینٹین کی بجائے پلی کردہ لوگوں سے کام لیتے ہی نہیں بلکہ خود طلبا کیطرح بے تکلف سارے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

سُنا کرتے تھے کہ چارلی چپلین، کہانی، مکالمہ سب خود ہی لکھتے، خود ایکٹ کرتے، ڈائرکشن دیتے اور خود ہی فلم تیار کر کے پیش کیا کرتے، اس سے حیرت ہوتی تھی، مگر اختر صاحب کو دیکھ کر حیرت جاتی رہی۔ اختر صاحب ہم لوگوں کے "چارلس چپلین" تھے۔ ہم لوگوں کو یقین کامل تھا اور اب بھی ہے کہ اختر صاحب کی ہدایت کاری میں کامیاب فلمیں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔

ڈراموں کے ریہرسل اختر صاحب کے گھر پر بھی ہوا کرتے تھے اور وہاں ریہرسل کرنے والوں کی خاطر بہترین چائے اور ناشتے سے ہوا کرتی تھی۔ سید شاہ عزیز احمد میرے کلاس کے ساتھی تھے۔ اور یہ اختر صاحب ہی کے ساتھ رہا کرتے تھے امتحان کے دنوں میں کچھ مضامین جیسے جغرافیہ وغیرہ کی تیاری، میں، عزیز اور جعفر نقوی، تینوں ملکر ایک ساتھ اختر صاحب کے والی گھاٹ کے کوارٹر میں کیا کرتے تھے، اور آپا شکیلہ کی نوازش سے ہم لوگوں کو جب ضرورت ہوتی چائے اور لذیذ ناشتے ملا کرتے تھے۔ یہ فیاضی اختر صاحب کے گھر کی ایک عام سی بات ہے جس سے بہرہ ور ان کے ہر خاص و عام شاگرد ہوا کرتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۱ء میں چیکوسلوواکیہ سے ڈاکٹر یان مارک اپنی علمی تحقیقات کے سلسلہ میں ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ "تاریخ ادب فارسی در ہندوستان" کے لئے مواد کی تلاش میں پٹنہ کی خدا بخش لائبریری بھی دیکھنے آئے حکومت ہند کی ایما پر، پٹنہ یونیورسٹی ان کی میزبانی کر رہی تھی وہ یونیورسٹی گسٹ ہاؤس میں ٹھہرائے گئے تھے۔ یونیورسٹی نے، اردو کے رشتہ سے، ڈاکٹر مارک کی خبرگیری پروفیسر اختر احمد صاحب کے ذمہ کر دی تھی۔ گسٹ ہاؤس کے انتظامات کو تشفی بخش نہ پا کر اختر صاحب، یان مارک صاحب کو اپنے گھر لے آئے۔

ڈاکٹر مارک ماہر لسانیات ہیں اور ادارۂ علوم شرقی پراگ کے شعبۂ ہندوستانیات میں استاد ہیں اور اردو پڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چارلس یونیورسٹی میں، جو یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں ہے، فارسی زبان و ادب بھی پڑھاتے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سیمینار اور سمپوزیم میں، ڈاکٹر مارک نے کئی تقریریں گھنٹوں فصیح و بلیغ اردو میں کیں۔ اپنے ملک میں علوم مشرقی کے مطالعہ کا حال بتایا۔ یہ جان کر لوگوں کو حیرت ہوئی کہ چیکوسلوواکیہ گو جسامت کے لحاظ سے بڑا ملک نہیں ہے۔

جس کی آبادی صرف سوا کروڑ ہے مگر علم و فن میں کسی سے کم نہیں ہے۔ خاص کر مشرقی علوم کی وہاں اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے، عربی فارسی میں تو بڑے پیمانہ پر ریسرچ ہوتے ہیں اور آج کل وہاں اردو کافی مقبول ہو رہی ہے، اس کے پڑھنے والے اور ماہروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

چیکوسلواکیہ کے ماہران علوم مشرقی زمانہ دراز سے ہندوستانی تہذیب و تمدن سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ کالیداس کی تخلیقات کا چک زبان میں ترجمہ ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۲۱ء میں چیکوسلواکیہ گئے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ان کی تصانیف سے وہاں کے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ ٹیگور کے گیت، پریم چند کے ناول اور کرشن چندر کی کہانیاں وہاں بڑی مقبول ہیں۔ خود ڈاکٹر یان مارک نے، پہلے تو جامی کی بہارستان کا ترجمہ کیا لیکن اب انہوں نے اقبال اور فیض احمد فیض کی طرف توجہ کی ہے اور اقبال کے پیام مشرق اور فیض کی نظموں کا انہوں نے چک زبان میں ترجمہ کیا ہے جو پراگ سے شائع بھی ہو چکا ہے۔

اختر صاحب سفر کرنا کم پسند کرتے ہیں مگر ایک ایسے مہمان کی خاطر جو وسطی یورپ میں ہندوستانیات پڑھاتا ہے اور اُردو زبان و ادب کی گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ انہوں نے اپنے آرام کا بالکل خیال نہ کیا اور مارک صاحب کی مخدوم الملک سید شرف الدین احمد یحیٰ منیری سے دلچسپی دیکھ کر انہیں خود منیر شریف لے گئے، مخدوم صاحب کی جائے پیدائش کی زیارت کرائی، خانقاہ منیر کے سجادہ نشین جناب شاہ عنایت اللہ صاحب اور ان کے برادر شاہ مراد اللہ صاحب سے انہیں ملایا اور وہاں کے دیگر مقامات مقدسہ کی بھی زیارت کرائی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مارک صاحب کو بودھ گیا، آثار نالندہ یونیورسیٹی اور راجگیر وغیرہ بھی دکھلایا۔ سارے سفر میں مارک صاحب کو بڑی عافیت اور راحت ملی اور وہ ان عافیتوں کو آج تک جذبۂ امتنان کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ وہ اختر صاحب کے ادبی شغف، علمی زندگی، ان کے اعلیٰ اخلاق، ان کے گھر کے لوگوں کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی سے بے حد متاثر ہوئے اور آج صرف یان مارک اور ان کے خاندان کے افراد ہی اختر صاحب سے محبّت اور ان کا احترام نہیں کرتے، بلکہ ادارہ علوم شرقی اور چارلس یونیورسیٹی کے طلباء اور اساتذہ بھی اختر صاحب کی دلکش شخصیت سے متعارف ہو گئے ہیں، اور ان سے ملنے کی تمنّا رکھتے ہیں جس کا اظہار مارک صاحب نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے۔

متاع درد کا کرشمہ

اختر صاحب کو قدرت نے ایک درد مند دل عطا کیا ہے۔ متاع درد انکی شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسروں کے درد سے اُن کا دل دکھتا ہے اور وہ لوگوں سے ہمدردی ہی نہیں کرتے بلکہ پریشان حال میں ان کے شریک و سہیم بن جاتے ہیں۔ میں اپنی علالت کے طویل عرصہ میں ان سے اکثر ملا ہوں، ان سے پہروں باتیں ہوئی ہیں۔ کبھی کبھی دریا کنارے ان کے ساتھ میں نے سیر بھی کی ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اختر صاحب پٹنہ کالج مسلم ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ایک دن موسم خراب تھا، اختر صاحب نے لال املی کا سفید پوری آستین کا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ ہم دونوں دریا کنارے ٹہلنے ساتھ گئے۔ دریا کنارے کی سیر سے واپسی پر اختر صاحب کے کوارٹر میں بیٹھ کر باتیں ہونے لگیں۔ اس دن میری طبیعت پریشان تھی، مجھ پر اپنی بیماری کے جان لیوا ہونے کا احساس شدّت سے کارفرما تھا۔ اس دن اختر صاحب بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، میری تسکین و تسلّی کی خاطر

اپنے تجربات سنائے۔ آخر میں انھوں نے کہا: "ہم لوگ کُن کُٹے گھڑے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ حسین صراحی رنگین و منقش گلاس باتوں ہی بات میں بس چھن سے ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن کنکٹا گھڑا ٹھیکنے پر بھی اکثر نہیں ٹوٹتا۔" اختر صاحب کی فطری خوش طبعی اور ظرافت کا سوتا کبھی نہیں سوکھتا۔

وطن سے، اپنے چمن سے کس کو محبت نہیں ہوتی، اس کے حُسن، اس کی دلکشی پر سب فدا ہوتے ہیں، اس سے پیار کا دعویٰ سب کرتے ہیں لیکن جب موسم بگڑ جاتا ہے کالے بادل پانی کی جگہ شعلے برسانے لگتے ہیں تو چمن کے بڑے بڑے شیدائی بھی پابہ رکاب ہو جاتے ہیں اور بہت سے تو چمن کو خیرباد ہی کہہ جاتے ہیں۔ مگر اختر صاحب اُن لوگوں میں نہیں ہیں وہ تو سخت سے سخت طوفان اور بے تحاشہ بجلی گرانے والے موسم میں بھی اپنے چمن کی محبت میں سرشار چمن میں ثابت قدم رہنے والوں میں ہیں۔ اختر صاحب برق کے دامن سے آشیاں پیدا کرنے کے قائل ہیں۔

پامردی، وسیع النظری، شرافت اور بلند انسانیت اس متاعِ درد کا کرشمہ ہے جس کا وافر حصہ اختر صاحب کو برسوں جانکاہ اور جان لیوا مرض کے آلام میں تپتے رہنے اور اپنے عزم راسخ اور زندگی سے بے پناہ پیار کی بدولت اس پر فتحیاب ہونے میں حاصل ہوا ہے۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

(عُرفیؔ)

شمیم حنفی

اختر صاحب — چند تاثرات اور یادیں

(اختر صاحب؟)

اس وقت جب میں اختر صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کیلئے بیٹھا تو پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ میں اختر صاحب کے بارے میں بھلا جانتا ہی کیا ہوں جو اُن پر قلم اُٹھاؤں!

یوں اگر کرشن چندر کی اس بات کو مان لیا جائے کہ "ایک ادیب کی شخصیت اُس کی تصنیف، اس کا قلم اور اس کا خیال ہے — اس کی وہ ساری خواہشیں ہیں، آرزوئیں، حسرتیں اور یادیں، وہ خواب، وہ آنسو اور وہ تبسم ہیں جنھیں اُس نے دانہ دانہ کرکے زندگی کی فضاؤں میں چنا ہے اور اپنی کہانیوں (یا اپنی تخلیقات) میں پڑھنے والوں کی تفریح کے لئے بکھیر دیا ہے — یہی تو اس کا عمل ہے اور یہی اس کا صحیح کام!"

تو میں یقیناً اختر صاحب کو جانتا ہوں کہ اُن کی تخلیقات کے وسیلے سے میں نے اُنھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اختر صاحب کے مضامین، افسانوں اور اشعار سبھی کا لطف اُٹھایا ہے۔ اُن کی تقریریں اور اُنکے نشریے سُنے ہیں۔ اُن کے بارے میں لوگوں کی باتیں بھی سُنی ہیں اور محترمہ شکیلہ اختر کے وہ شخصی مضامین بھی دیکھے ہیں جن میں انھوں نے گھر کے بھیدی کا رول ادا کیا ہے گرچہ لنکا ڈھانے کی کوئی بات ان مضامین میں نہیں تھی۔

اور یہ بھی کیسے بھول سکتا تھا جب کہ اختر صاحب عمل اور خیال دونوں کی دنیا میں ایک ایسے راستے پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے ہم مختصراً لاک — (LOCKE کا WAY OF COMPROMISE یا درمیانہ راستہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے یہاں تذبذب کی کوئی کیفیت نہیں اسلئے اپنے فکری سفر میں اُن کے قدم بھٹکتے نہیں۔ وہ انتہا پسند نہیں ہیں اس لئے اُن کے پاؤں کی چاپ سے کبھی سہما ہوا ہوں کا دل نہیں دھڑکتا اور آتے جاتے لوگ اُن پر حیرت و استعجاب کی نظریں نہیں ڈالتے۔ در و بام متزلزل نہیں ہوتے اور فضاؤں کی آنکھیں نمناک نہیں ہوتیں کیونکہ اختر صاحب اپنا ایک شخصیت رکھنے کے باوجود عام انسانوں کے لئے ڈاکٹر جانسن یا میراجی یا منٹو کی طرح اجنبی نہیں ہیں۔ بظاہر ان میں کوئی ایسی بات نہیں جو انہیں ایک LEGEND یا روایت بنا دے اور لوگ ان کی باتیں اس طرح کریں گویا کسی گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان کے بجائے کسی محیر العقول یا ماورائی شے کا ذکر کر رہے ہوں جس پر ہر لمحہ سننے والے چونک پڑتے ہوں اور آنکھوں کے دائرے حیرت سے پھیل جاتے ہوں اور تنفس کی رفتار تیز ہو جاتی ہو۔ اختر صاحب قطعاً ایک نارمل (NORMAL) انسان ہیں۔ سیدھے سادے، متوازن، خلیق اور ملنسار۔ ان کی شخصیت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں پھر بھی ———— خود اختر صاحب ہی کے الفاظ میں ؎

من ایں دانم نگاہش می دہد پیغام بیتابی
دلِ سرشار اختر ہیچ الہامے نمی داند

خود اختر صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اُن کے والدین کے فیضِ تربیت نے اُن میں "استقامتِ راہ" پیدا کی۔

"جلوے" کے مصنف اور اختر صاحب کے عزیز دوست پروفیسر [illegible] درانی نے "مذہب" کو اختر صاحب کی "بڑ" کہا ہے۔ "اٹھتے بیٹھتے مذہب،

بات بات میں مذہب۔" خود میں نے بھی غیر شعوری طور پر یہ بات اس وقت
محسوس کی تھی جب پہلی ملاقات میں بڑے نیاز مندانہ انداز میں میرے
"آداب عرض" کہنے پر اختر صاحب نے اپنی دبیز، روشن اور تبسم بداماں
نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب میں انتہائی بیساختگی کے ساتھ اپنی بھاری
پُر وقار اور سامعہ کی حدوں سے گزر کر دل کے دروازوں پر دستک دیتی
ہوئی آواز میں "وعلیکم السّلام" کہا تھا۔ "وعلیکم السلام" اور ایک ایسے شخص
کے منہ سے جس نے میڈیکل کالج کے آسولیشن وارڈ اور آپریشن روم میں
خالق کائنات کے ہاتھوں وجود میں آنے والی حقیقتوں میں سب سے
اہم اور اٹل حقیقت یعنی "موت" سے نبرد آزمائی کی تربیت حاصل کی ہو،
جس کی شخصیت کے خارجی عناصر پر اردو زبان و ادب کا معلم ہونے کے
باوجود "مولویت" کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہ آتی ہو اور جو کرتے پاجامے
اور شیروانی میں بھی بقول شوکت تھانوی مرحوم "تعلیم یافتہ" دکھائی دیتے۔
اور وہ بھی ایسے "ترقی یافتہ" دور میں جب ہم جیسے فرزندانِ مشرق "پس
چہ باید کرد" کے دلدل سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر چلا رہے تھے اور پڑھے لکھے
لوگوں کی صحبت میں ان الفاظ پر اس طرح چونک پڑتے ہوں گویا فرسودہ
رسوم و روایات کے کسی ایسے بچھو نے ڈنک مار دیا جسے بزعمِ خویش ہم کب
کے ختم کر چکے تھے ------ لیکن اختر صاحب نے اس قسم کے ہر سوال کا تشفی
بخش جواب یہ کہہ کر دیا کہ اس "کوثر" نے انہیں ٹیکہ لگانے کا موقع دیا ہو۔
واقعہ یہ ہے کہ شب و روز کے کسی بھی لمحے میں اختر صاحب اس ٹیک یا
سہارے کا دامن فکر و شعور کے ہاتھوں سے نہیں چھوڑتے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ "استقامتِ راہ" کے اس جذبے
نے انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور مسائل کے مدوجزر کی طرف سے بے نیاز
رکھا ہو۔ ٹکسن کے الفاظ میں "فن میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ
فن کار کے دل و دماغ میں جبلّی صلاحیتوں کے علاوہ ہنگامہ پرور جذبات
بھی موجزن ہوں اور اسے صبر آزما مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا ہو۔
یہی چیزیں اس کی زندگی کی منازل متعین کرتی ہیں۔ ان کے بغیر وہ تخلیق
نہیں کر سکے، محض قلم گھسیٹتا رہے گا۔" اختر صاحب نے تو زندگی بھی موت کی
آغوش میں گذاری ہے۔ دل شکستگی نے انہیں بے یقینی، کفر اور لادینی کی
منزلوں تک بھی پہونچایا ہے، کفر و اسلام، اقرار و انکار، یگانگی و بیگانگی،
غرضکہ ہر اونچ نیچ کے سیلاب میں وہ ڈوبتے ابھرتے رہے ہیں۔ اپنے ہی
الفاظ میں انہوں نے "زندگی میں روح اور مادہ دونوں کو ہر وقت
برسرِ پیکار دیکھا ہے" اور ان تجربات کی بنا پر سوچتے رہے ہیں کہ "شاید
یہ ساری کائنات ایک مادّی روحانی جدلیات کے چکر میں ہے" تشکیک و
تجسس کے ایسی ہی جذبات نے غالب کے دل میں "سیر" کے لئے "کسی
اور فضا" کی آرزو کو جنم دیا تھا۔ اختر صاحب کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے
بھی مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ خوابوں کی آرزو سے خالی نہیں۔ اور خواب
وہی آنکھیں دیکھتی ہیں جو حقیقتوں کے طوفانوں سے گذرنے کا تجربہ رکھتی ہوں۔
جس نے زندگی ہی کو ایک خواب سمجھا ہو اس کی روح مزید خوابوں کی متلاشی
کیسے ہو سکتی ہے اور وہ یہ کیسے جان سکتا ہے کہ خیال و خواب کی بنیادیں
کس طرح تعمیر حقائق کی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اختر صاحب
کی تحریروں میں وہ جنس گرانمایہ بھی ملتی ہے جسے ملٹن نے "زندگی کا لہو"
کہا ہے، اور حقیقتوں کے شانہ بشانہ کچھ سمجھے بوجھے لیکن ان دیکھے خوابوں کی
جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ انداز ان کے تنقیدی مضامین اور تقریروں
میں بھی نمایاں ہے اور افسانوں اور اشعار میں نسبتاً زیادہ واضح اور
مربوط خط و خال کے ساتھ نظر آتا ہے۔

اختر صاحب فطری طور پر شاعر ہیں۔ ماضی کی ریت پر اپنی زندگی
کے نقوشِ قدم کا جائزہ لیتے وقت بھی وہ آدرین کی سنگلاخ سرزمین،
پرانے کھنڈروں، اونچے گڑھوں، خشک پتھریلی پہاڑیوں، سکوت
میں ڈوبی ہوئی کہانیاں سناتے ہوئے کہستانی سلسلوں اور آب رود
گنگا کے سینے پر حرکت و رفتار کے نغمے چھیڑتی ہوئی لہروں کا ذکر اس
احساسِ قرب و ہم آہنگی کے ساتھ کرتے ہیں گویا ذی روح و متحرک کرداروں
کی عکاسی کر رہے ہوں۔ اس طرح چھوٹا ناگپور کی تہذیبِ نو کی کمندوں
سے آزاد اور ماضی کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی فضائیں، وہاں کے کہسار،
ٹیلے اور ہوائیں، اودھ کے آم کے باغ، شیشم کی قطاریں، سرو و چنار سے
بھی بلند و بالا تاڑ کے جھنڈ اور دریائے سون کی سرگوشیاں بھی ان کے
مزاج میں رچ بس گئی ہیں جس کا اظہار بالواسطہ یا اشاروں اور کنایوں

کے پردے میں اُن کی تخلیقات میں ہوتا رہتا ہے۔ دوسری طرف جدید سائنس
کی تعلیم (اگرچہ نامکمل) اشتمالیت کی کتابوں کے مطالعے، مارکس کے اثرات،
"راہ جنوں میں سعی خرد کو سب سے بڑا فریب حیات سمجھتے ہوئے بھی اسی
فریب کی صداقت میں یقین" اور خواب و حقیقت کو دو باہم متضاد قوتیں
سمجھنے کے بجائے ایک ہی تار رشتۂ زنجیر کی دو کڑیاں سمجھنا، یہ اور ایسے ہی
دوسرے عوامل و محرکات نے اُنھیں زندگی کے ٹھوس حقائق اور خیال کے
مادی پس منظر کو سمجھنے میں مدد دی۔

لیکن ان کے شعور کی بساط پر بظاہر دو مختلف بلکہ کسی قدر متضاد
کیفیات کی نمائندگی کرنے والے مہرے ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں۔ یہ
ضرور ہے کہ اکثر وہ ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور
ایک کا رنگ دوسرے پر کبھی کبھی غالب آجاتا ہے۔ ایک رنگ میں دوسرے
رنگ کی آمیزش نے ان کی تحریروں میں کہیں کہیں بڑی دلکشی پیدا کر دی
ہے۔ تنقید کا کھردرا پن افسانے کی رنگ آمیزی سے ختم ہو جاتا ہے اور
کہانیوں کی افسانوی فضا میں مادے کی اہمیت اور احساس کے باعث
مقصدیت کا التزام! اور ایک گہرے سیاسی، سماجی، معاشی و [illegible]
شعور کی کارفرمائی سے ایک صحت مند اور مثبت تصور حیات کا عکس
واضح ہو جاتا ہے۔ مگر اس منزل پر پہونچنے کے بعد جہاں تنقید اور دوسری
اصناف ادب کی زبان اور لب و لہجہ ایک دوسرے سے کسی قدر الگ ہونے
کے متقاضی ہوتے ہیں اختر صاحب کے قاری کو کبھی کبھی قدرے تشنگی کا احساس
ہوتا ہے۔ تنقیدوں پر افسانویت کے دھندلکے تنقید کی دلآویزی میں اضافہ
ضرور کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں ان دھندلکوں میں تنقید کی روح کا حصہ نمایاں
نہیں ہو پاتی۔ اس طرح افسانوں میں تنقید کا آہنگ فضا میں زیادہ سنجیدگی
کی آمیزش کر دیتا ہے اور کہانی کسی قدر بوجھل ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب
ہرگز نہیں کہ اس طرح اختر صاحب کی تحریریں گنجلک یا ان کا مطمح نظر
غیر واضح اور مبہم ہو جاتا ہے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اختر صاحب
کے یہاں زندگی کا ایک تعمیری اور مثبت تصور ملتا ہے اور خیال و عمل ہر لحاظ
سے انھوں نے زندگی کے ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کی ہے۔ تاریخی شعور،
بین الاقوامی تصورات اور شخصیت کی انفرادیت، یہ تینوں چیزیں جب
ایک وحدت کی شکل اختیار کرتی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان تینوں
کی مقدار میں توازن قائم رہے اُسی وقت اعلیٰ ادب پارے کی تخلیق ہوتی
ہے۔ اختر صاحب نے زیادہ تر اس توازن کو قائم رکھا ہے۔ البتہ خال
خال ایسی منزلیں ضرور آئی ہیں جہاں شاعرانہ شدت احساس نے اس
توازن کو متزلزل کر دیا ہے۔ اختر صاحب کے ادبی زاویۂ نگاہ کے سلسلہ میں
یہ سوال بھی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ کہکشاں کے پل کے اس طرف ہیں یا اُس
طرف یعنی متعفن، اندھیری، افلاس و بدحالی کے کفن میں لپٹی ہوئی
زندگیوں کے ساتھ ہیں یا پل کے دوسری طرف جہاں اطلس و کمخواب کے پردوں،
سکوں کی کھنک، مسرت کی شراب میں نہائے ہوئے قہقہوں اور رقص و [illegible]
بلند و بالا اور مفلس پر طنز کرتی ہوئی عمارتوں کی خوابناک فضا ہے؟ انسان
اور فطرت سے والہانہ لگاؤ اختر صاحب کی ہر تحریر میں نمایاں ہے اور
ان کا مزاج کسی بھی قسم کے استحصال کو قبول نہیں کر سکتا اس لئے ظاہر ہے
کہ ان کی ساری ہمدردیاں اور کوششیں ان کے ساتھ ہیں جو اس استحصال
کی گرفت سے آزاد ہونے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔

کسی بھی اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق اپنے خالق یا فنکار سے جن اہم
ترین خصوصیات کی طالب ہوتی ہے اُن میں، جیسا کہ مذکورہ بالا سطور
میں کہیں عرض کیا جا چکا ہے، تاریخی شعور اور بین الاقوامی تصورات کے
ساتھ ساتھ تیسری اہم خصوصیت فنکار کی شخصیت کے انفرادی خد و
خال ہیں۔ اسی انفرادیت کا احساس "انا" کہلاتا ہے جس کا اعتدال
کے ساتھ اور مناسب و متوازن استعمال و اظہار اچھے فنی پارے کا
جز و لازم ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجتماع کے
موقع پر ٹیگور نے جو پیغام بھیجا تھا اس میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اچھے
ادب کی تخلیق کے لئے ادیب کا "انا" کی کیچلی سے نکلنا ضروری ہے کیونکہ
احساس ذات کے قید خانے میں محبوس انسان باہر کی دنیا کی "چاندنی
کے سہانے پن اور ہوا کی لطافت" سے نا آشنا رہ جائے گا۔ یہ بات ایک حد تک
یقیناً درست ہے کہ انفرادیت کا ایک حد سے زیادہ احساس ادیب کی
فکری کائنات کو سمیٹ کر اس مرکز پر اکٹھا کر دیتا ہے جہاں اُسے اپنے
سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا لیکن یہ احساس اُس وقت جب اجتماعی شعور

میں ضم ہو کر اپنی بات کے بجائے ساری دنیا کی بات بن جاتا ہے تو فکر و فن کو نئے آفاق سے روشناس کراتا ہے۔ مشہور فرانسیسی مصنف والٹیئر (VOLTAIRE) نے اس خصوصیت کو انانیت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ انانیت جب تعمیری راستوں پر گامزن ہوتی ہے تو فرسودہ کہنہ روایات کی زنجیریں توڑ کر فکر و عمل کی نئی راہیں متعین کرتی ہے لیکن اس کی زیادتی خود اپنے ہی لئے نہیں بلکہ پورے ماحول کے لئے تخریب کا سامان پیدا کرتی ہے اور ساری فضا کو مکدّر کر دیتی ہے۔ اختر صاحب نے اپنی کہانیوں اور اشعار میں اپنی اسی 'انا' کو برقرار رکھا ہے۔ اور بڑے توازن و اعتدال کے ساتھ۔ اپنی طویل بیماریوں، اپنی انفرادی محرومیوں اور اپنے ذاتی مسائل کا جو ردعمل انہوں نے قبول کیا ہے اُسے کہیں بھی اپنی تخلیقات پر اس طرح مسلط نہیں کیا کہ وہ محض ایک خبر نامہ یا سرگذشت بن کر رہ جائیں۔ اس طرح وہ فضائیں، وہ ماحول، وہ مسرتیں اور وہ تلخیاں جن کے حصول نے انہیں مسرور و متکیّف کیا ہے یا جن کے خمیر سے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے انہیں بھی وہ احاطۂ تحریر میں اس طرح نہیں لاتے کہ وہ صرف انہیں کی جاگیریں نظر آئیں۔ اُن کی انفرادیت نے جو معرکے سر کئے ہیں وہ زندگی کی صحت مند اقدار کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔

اپنے تنقیدی مضامین میں وہ جن نظریات کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرتے ہیں وہ نظریات کسی ایسی ذاتی پسند و ناپسندیدگی کے ترجمان نہیں جس کی صد رنگ کرشمہ سازیوں سے چند مغرب زدہ ادیبوں نے اپنے مخصوص حکمانہ انداز میں احکام اور فتوے صادر کئے ہیں، تنہا اپنے اخذ کردہ نتائج کو صحیح اور بقیہ سب کو بیک جنبشِ قلم غلط قرار دیا ہے، صرف اپنے محبوب و پسندیدہ شاعر کو شاعر اور دوسروں کو "تنگ بند" وغیرہ قسم کے القاب سے نوازا ہے۔ اختر صاحب کے نظریات ذاتی پسند و ناپسندیدگی کے بجائے قدروں کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں اور قدریں کسی فرد واحد یا مخصوص فرقے یا مذہب یا قوم کی ملکیت نہیں ہوا کرتیں۔ ان کا لہجہ کبھی جارحانہ نہیں ہوتا۔ اُن کی تعریف نہ تو محض ستائش ہوتی ہے اور عیب پوشی۔ وہ بڑے دھیمے، متین اور دلآویز انداز میں اپنے شعور کی ترتیب یافتہ قدروں کے پیمانے پر کسی بھی ادبی تخلیق کے مصائب و محاسن اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ اور اپنے پڑھنے والوں پر یہ دباؤ نہیں ڈالتے کہ اُن کے اخذ کردہ نتائج کو کلی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ غالباً ان کی مزاج کی صلح پسندی ہی انہیں بیباک ہو کر ان باتوں کے اظہار سے بھی روکتی ہے جن کی عدم موجودگی ان کے اس قاری کو جو پہلے سے اُن کے مطمحِ نظر سے ناواقف ہو کبھی کبھی تشکیک کی اس منزل پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں اس کیلئے اختر صاحب کے اندازِ نظر کی سمت کا تعین تھوڑی دیر کے لئے ایک مسئلہ بن جاتا ہے اور وہ اُن سے اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریات کے اظہار میں کاش اس درجہ محتاط نہ ہوتے۔ غیر جانبداری یقینی طور پر مزاج و کردار کا ایک قابل احترام وصف ہے لیکن گالز ورذی جیسا غیر جانبدار ادیب بھی اپنے مشہور ڈرامے (STRIFE) میں سرمایہ و محنت کی کشمکش کا جائزہ قطعی غیر جانبدار اور خاموش تماشائی کی حیثیت سے لیتے لیتے بالآخر ایک منزل پر اپنے ایک کردار فراسٹ (FROST) کی زبان سے سب کچھ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔

انفرادی شخصیت کو اجتماعی شعور سے اس طرح ہم آہنگ کرنا جس سے اپنے تصورات اور نظریات صرف اپنی ذات تک محدود نہ رہ جائیں، اس سلسلے میں بجا طور پر یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر انفرادیت کی شناخت آخر کس وسیلے سے ہو سکے گی؟ یہی مسئلہ وہ منزل ہے جہاں فکر کے بعد فن کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں مختلف ادبی تحریکات کے ردعمل کے طور پر ایسے متعدد مکاتیبِ فکر وجود میں آئے ہیں جن میں ہر مکتب کے اپنے مخصوص مقاصد و نظریات ہیں جن پر اُس مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والا ہر ادیب کم و بیش یکساں طور پر ایمان و اعتقاد رکھتا ہے اور انہیں مخصوص مقاصد و نظریات کی ترویج و اشاعت کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ بالعموم کسی ایک ہی خیال یا نظریے یا مسلک کا صدقِ دل سے قائل ہونے کے باوجود مختلف افراد کے نزدیک اس ایک خیال، ایک نظریے یا ایک مسلک کا خاکہ اپنے مزاج کے انفرادی خد و خال کی بنا پر کسی قدر مختلف بھی ہو سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں

بھی اس خیال کی بنیاد ایک ہی رہے گی۔ وہ بات جو یکساں عقائد و
نظریات کے دو ذہنوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے اسلوب ہے
خیال کی یکسانیت کا امکان تو ہو سکتا ہے مگر اسلوب کی یکسانیت تقریباً
ناممکن ہے۔ اصنافِ شعر کے سلسلے میں تو یہ اتفاق ہوتا ہے کہ ایک ہی
واقعے کا ردِ عمل یا ایک ہی خیال دو مختلف ذہنوں میں یکساں خدوخال
کے ساتھ ابھرا اور اس کا اظہار بھی دونوں کے یہاں ایک ہی طرح ہوا۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ ردیف و قافیہ اور بحر و وزن کی قیود اور تشبیہہ
استعارات و اصطلاحات کے ڈھلے ڈھلائے سرمائے نے اظہار کی کچھ
مخصوص راہیں متعین کر رکھی ہیں۔ توارد انہیں حدود کے باعث
وجود میں آتا ہے۔ استادی اور شاگردی کی روایت نے بھی کبھی کبھی
کسی استاد اور اس کے شاگرد کے رنگِ سخن میں اتنی یکسانیت پیدا
کر دی ہے کہ ان کے اشعار کی شناخت میں بعض اوقات دھوکا ہو جاتا
ہے۔ لیکن نثر میں یہ چیز تقریباً ناممکن ہے۔ آزاد۔ شبلی۔ حالی۔ سرسید
غالب۔ پریم چند۔ کرشن چندر اور دوسرے متعدد ادیبوں کی نثر کو
ایک آئیڈیل سمجھ کر چند لوگوں نے ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش
کی ہے۔ اسلوب کو کارلائل (CARLYLE) نے مصنف کی جلد کہا ہے
جس کا اتارنا ناممکن ہے۔ اسی طرح اسلوب ہی کسی مصنف کا سب سے
زیادہ قابلِ اعتماد شناختی کارڈ ہو سکتا ہے۔ اختر صاحب کا بھی
اپنا ایک اسلوب ہے جس پر ان کی انفرادیت کی مہر لگی ہوئی ہے۔
مجھے یہ علم نہیں کہ وہ بالواسطہ طور پر کن مشاہیرِ ادب کے اسالیبِ بیان
سے متاثر ہوئے ہیں اور انھیں شعوری طور پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔
البتہ ان کی شخصیت کے خارجی و داخلی خدوخال کا عکس واضح طور پر
ان کے اسلوب میں نظر آتا ہے۔ ان کی گفتگو کا انداز بڑا دلآویز
شگفتہ ہے اور یہی شگفتگی اور دلآویزی ان کے اسلوب کا بھی
نمایاں ترین وصف ہے۔ جس طرح کوئی مصور ہر رنگ کو دیکھ کر
ان رنگوں کے نفسیاتی پہلو پر غور کر کے بہت سنبھل سنبھل کر انھیں
استعمال کرتا ہے، اسی طرح اختر صاحب بھی الفاظ کے انتخاب،
دروبست، جملوں کی ساخت، تشبیہوں، استعارات، اصطلاحات
اور تراکیب کے استعمال میں بڑی فنکارانہ بصیرت کا ثبوت دیتے
ہیں۔ ان کے اسلوب میں بڑا رچاؤ اور سلیقہ نظر آتا ہے۔ اپنے
تنقیدی مضامین میں بھی وہ جابجا مختلف مناظر کی خاکہ کشی اور
مختلف کیفیات و احساسات کی عکاسی کا سہارا لے کر اپنے مافی الضمیر
کو ادا کرتے ہیں۔ آتش نے شاعری کو مرصع سازی کہا تھا۔ اختر صاحب
نے نثر میں بھی اس گُر کو اپنایا ہے۔ لیکن اس مرصع سازی پر وہ ادبِ
لطیف کی تحریک پروردہ نثر نگاروں کی طرح اتنی توجہ نہیں صرف کرتے کہ
صرف رومانیت ہی رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریروں کو محض
پڑھا سمجھا ہی نہیں بلکہ کسی نغمے کی طرح سنا اور کسی منظر کی طرح دیکھا بھی
جا سکتا ہے۔

غرض کہ یہ ہیں وہ اختر صاحب جنھیں میں نے ان کی مختلف شعری و
نثری تخلیقات کے آئینے میں دیکھا ہے۔ یوں ان سے دوبدو گفتگو اور
ملاقات کے موقعے مجھے بہت کم ملے ہیں اور وہ بھی بہت تھوڑی دیر کے لیے
لیکن بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ایک لمحے کی قربت میں بھی ملنے
والے کے دل و دماغ پر ایسے نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو یادگار بن جاتے ہیں
اور ان نقوش کو کاروانِ وقت کے دھندلکے خواہ دھندلا کر دیں لیکن یکسر
مٹا دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اختر صاحب کی شخصیت نے مجھ پر کچھ
ایسے ہی نقوش چھوڑے ہیں۔

اگست ۱۹۶۱ء کی ۱۲ تاریخ تھی۔ شام کو میں یونہی چہل قدمی کرتا
ہوا استاذی المحترم ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے "نشیمن" (اعجاز صاحب
کے گھر کا نام) پر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ پر تقریباً نیم دراز
ایک بے حد صاف و شفاف، نکھرے نکھرے سے اور زندگی کی تابناکیوں سے
سرشار بزرگ نظر آئے عمر یہی کوئی پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔ آنکھیں
بے حجاب اور روشن اور چہرے کے ترشے ہوئے خطوط سے نفاست اور
خوش طبعی اُمڈتی ہوئی۔

میرے "آداب عرض" کہنے پر انھوں نے بہت نپے تلے انداز میں "علیکم السلام"
کہا۔ ایک لمحے کے لیے میں کچھ چونکا پھر قریب ہی پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا
"یہی ہیں اختر صاحب" اعجاز صاحب اپنی مخصوص دھیمی خوابناک

اور بھرائی ہوئی آواز میں بڑی شفقت کے ساتھ بولے۔ "یہ میرے ایک بڑے عزیز شاگرد ہیں۔ شمیم صاحب، جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ خنجی جوڑ کر کسی قدر نامعقولیت کا ثبوت بھی دیا ہے۔"

اعجاز صاحب کی بات سن کر اختر صاحب کی روشن آنکھیں کچھ اور چمک اٹھیں، ہونٹوں نے تبسم کا زاویہ اختیار کر لیا اور وہ بڑی سادگی سے بولے۔ "بہت خوب!"

"تو یہی اختر صاحب ہیں!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یوں عرصہ قبل میں اُن کی ایک تصویر دیکھ چکا تھا لیکن وہ اس زمانے کی تھی جب اختر صاحب اس حد تک "فارغ البال" نہیں ہوئے تھے اس لئے مجھے پہچاننے میں کچھ دیر لگی۔

اختر صاحب کے لہجہ میں کچھ ایسی شفقت آمیز خلوص اور آواز میں اتنی اپنائیت تھی کہ میں نے بہت جلد اپنی اس فطری جھجک پر قابو پا لیا جو اکثر پہلی ملاقات میں مجھے ملنے والے سے قریب ہوتے ہوئے بھی دور رکھتی ہے پھر گفتگو کا سلسلہ چھڑ گیا۔ اختر صاحب اپنی علمیت یا ادبی حیثیت کے احساس سے بالکل بے نیاز بڑے سیدھے سادے انداز میں مجھ سے میری موجودہ مشغولیت اور مصروفیات کے بارے میں پوچھنے لگے۔ یہ باتیں کسی قدر رسمی تھیں لیکن بعض اوقات رسمی باتیں بھی کس قدر دلفریب ہو جاتی ہیں۔ اکثر یہی باتیں پہلی بار ملنے والے دو افراد کے درمیان حائل پردۂ اجنبیت کو آہستہ آہستہ چاک کر دیتی ہیں۔ اختر صاحب سوالات کرتے رہے اپنے اُس مخصوص تبسم کے ساتھ اور بھاری لیکن مترنم آواز میں۔ اور میں جواب دیتا رہا۔

دھیرے دھیرے موضوعات کا دائرہ پھیلتا گیا اور مختلف منزلوں کو طے کرتی ہوئی گفتگو ہندی اور اُردو کے لسانی رشتوں اور سیاسی پیچیدگیوں کے مرکز پر آ کر ٹھہر گئی۔ اختر صاحب اپنی باتیں کہنے کے ساتھ ساتھ ایک ناپختہ ذہن طالب العلم کی باتیں بھی اس انہماک کے ساتھ سن رہے تھے گویا وہ اُن کے نزدیک بڑی اہم رہی ہوں۔ بیچ بیچ میں چھوٹے موٹے لطائف و ظرائف بھی کہے گئے اور یہ سلسلہ کھانے کی میز پر بھی جاری رہا۔ مرحوم ڈاکٹر محی الدین قادری زور بھی اس وقت آ گئے تھے۔ زور صاحب نے اسی زمانے میں حیدرآباد کو چھوڑ کر کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر کی جگہ سنبھالی تھی۔ نئی فضا سے بہت مطمئن اور مسرور نظر آتے تھے۔ کیونکہ اُنکی گفتگو میں بار بار کشمیر کی جنت بداماں وادی میں غالباً ڈل کے آس پاس واقع اپنے اس خوبصورت سے بنگلے کا ذکر آ رہا تھا جو خود اُنہیں کے الفاظ میں "وائس چانسلر کی رہائش گاہ کے بعد اپنی آرائش، جائے وقوع اور ساخت کے اعتبار سے یونیورسٹی سے متعلق دوسرے تمام اساتذہ یا عہدیداران کے رہائش گاہوں سے بدرجہا بہتر تھا۔" اعجاز صاحب اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ میں بڑی خاموشی سے زور صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن اختر صاحب ــــ خاموش نہ رہ سکے اور غالباً تیسری بار جب زور صاحب نے وہی ذکر چھیڑنا چاہا تو اختر صاحب یکبارگی بول پڑے ــــ "بہت خوب زور صاحب! اب کچھ اور فرمایئے۔ یہ بات تو ہم لوگ کئی بار سن چکے!"

زور صاحب ایک لمحے کے لئے چونکے، کچھ سنبھلے اور گفتگو کا رخ بدل کر اچانک پھر زبان و ادب کے مسائل پر آ گئی۔

اعجاز صاحب کی نیم وا آنکھوں سے چھلکتا ہوا معنی خیز تبسم، زور صاحب کے بلند آہنگ قہقہے اور اختر صاحب کے ترشے ہوئے خوبصورت جملے اور لطائف! اس وقت صحیح معنوں میں مجھے یہ احساس ہوا گویا زمانے کے چکر کے ساتھ ہانپتی کانپتی اور مسائل کے بوجھ سے تھکی ہاری زندگی کو حقیقی سکون و مسرت اور فراغت کے چند لمحے میسر آ گئے ہیں۔

دس بجتے بجتے یہ صحبت ختم ہوئی۔ اختر صاحب کا قیام "نشیمن" ہی میں تھا۔ زور صاحب دوسری جگہ ٹھہرے ہوئے تھے چنانچہ مجھے اُنہیں اُن کی قیام گاہ پر چھوڑنے کے بعد اپنے ہاسٹل جانا تھا۔ ہم لوگ باہر نکلے، کچھ ہی دیر پہلے پانی برس کر رکا تھا۔ فضا بھیگی بھیگی سی تھی اور آسمان پر آوارہ پھرتے ہوئے ابر پاروں کی چلمن سے اکا دکا ستارے جھانک رہے تھے۔ میں نے زور صاحب

کو اُن کی قیام گاہ پر چھوڑا اور اس کے بعد ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیتے ہوئے چند گھنٹوں کی یاد کے ساتھ اختر صاحب بھی یاد آتے رہے۔ اُن کی تحریروں کی دل نواز سادگی اور افسانوی سامت مجھے اُن کی شخصیت میں بھی نظر آئی تھی۔

دوسرے دن اچانک ہاسٹل کی بزم ادب کے افتتاحی جلسے کا پروگرام بن گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اختر صاحب اور ندر صاحب کے علاوہ اس دن محترمی پروفیسر آل احمد سرور، استادِ گرامی پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے مشاہیر ادب بھی حسن اتفاق سے الہ آباد یونیورسٹی میں یکجا ہو گئے تھے۔ اعجاز صاحب کے یہاں سب سے پہلے اختر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے جلسے میں شرکت کی درخواست کی۔ مجھے شبہ تھا کہ یونیورسٹی کی دن بھر کی مصروفیات کے پیش نظر ہو سکتا ہے کہ اختر صاحب اس پروگرام کو بار خیال کریں لیکن انہوں نے مزید اصرار کا موقع دیئے بغیر درخواست قبول کر لی۔

شام کو اعجاز صاحب کی معیت میں سرور صاحب، احتشام صاحب اور اختر صاحب تشریف لائے۔ ہاسٹل میں قدم رکھتے ہیں۔ اختر صاحب کی نظر سامنے لان پر پڑی اور بے تحاشہ بڑھی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولے۔

"کیوں حضرت! یہ ہم لوگوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھی کیا؟"

سبھی ہنس پڑے۔ پھر ہم لوگ یونین ہال کی طرف بڑھ گئے۔ جلسہ ہوا، تقریریں ہوئیں۔ اختر صاحب سے میں نے ہندی اور اردو کے لسانی رشتوں اور سیاسی پیچیدگیوں کے اس موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کی درخواست کی جس کی ابتدا پچھلی رات "نشیمن" میں ہوئی تھی۔ اختر صاحب نے بھی فی البدیہہ تقریر کی، بڑے مستحکم لہجے اور بڑے اعتماد لہجے میں۔ اس کے بعد ادب کے طلباء نے اپنے محبوب و محترم ادیبوں کے ساتھ چائے کا لطف اٹھایا اور سب لوگ رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن اختر صاحب بھی پٹنہ چلے گئے۔ اس کے بعد بھی وہ غالباً دو بار الہ آباد تشریف لائے اور پھر واپس چلے گئے۔ لیکن بعض لوگ جانے کے بعد بھی اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں اور اس طرح اپنے یاد کرنے والوں سے دور رہ کر بھی قریب رہتے ہیں —

اختر صاحب کو میں اس وقت بھی جب کہ وہ پٹنہ میں اپنے طلباء کے شعور کی زیبائش کر رہے ہوں گے اور میں الہ آباد میں اُن سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کر رہا ہوں، اپنے آپ سے قریب ہی پا رہا ہوں کہ تصور کی زنجیر کی ایک کڑی میں یہ جغرافیائی فاصلے سمٹ آئے ہیں اور دل کی خیال میں ان یادوں کے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ جن کا مرکز اختر صاحب کی پرسحر، شفیق اور دلنواز شخصیت ہے اور یادیں ہمیشہ سخت جان ہوتی ہیں —!

مولوی محمد سلیم (مبلغ اسلام برما، فلسطین و مصر)

اختر اورینوی کی مذہبی حیثیت

اختر اورینوی سے ہمیں غائبانہ تعارف تو خیر بہت پہلے سے حاصل تھا لیکن روبرو ملاقات، بالمشافہ گفتگو اور آپ کے افکار و آرا کا مطالعہ اس وقت میسر آیا۔ جب کہ ۱۹۴۳ء میں آپ مہاتی گھاٹ محلہ پٹنہ میں مقیم تھے۔ اور ہمیں اپنی تبلیغی مہمات کے سلسلہ میں کئی روز تک آپ کے پاس ٹھہرنے کا موقع ملا۔ آپ ان دنوں کمیونزم سے کافی متاثر تھے بلکہ اس کے مداح بھی۔ چنانچہ روزانہ آپ سے خوب تبادلۂ خیالات ہوتا اس نیز اسی قبیل کی دوسری تحریکات کے محاسن و معائب زیر بحث آتے۔ اور موجودہ زمانہ کے پیش آمدہ سماجی، معاشی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی اور ہر قسم مسائل کو حل کرنے کیلئے مذہبی نگارشات بالخصوص تعلیماتِ اسلامی پر پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ غور ہوتا۔ نیز ہمارا ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ ہے کہ ان مباحث میں اسلامیات کی بہتری و اسوۂ نبوی کی بلندی اور مشاہیر اسلام کی عالی ظرفی، اختر اورینوی کے لئے بے انتہا لطف اندوزی کا موجب ہوتی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی حکومت کے زیر سایہ قائم شدہ درسگاہوں اور کالجوں میں مروجہ تعلیم کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے غالباً بہت سچ کہا تھا کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان درسگاہوں اور ان کے لوازمات نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور کلچر کی بساط الٹ کر رکھدی ہے۔ چنانچہ جن حرکات و سکنات اور ملبوسات کو کبھی ننگ دوا سمجھا جاتا ہے آج وہ آرٹ اور فیشن کے نام پر ہمارے معاشرہ کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اور نوبت بایں جا رسید کہ تمام مذہبی قدریں داستان پارینہ اور دقیانوسی خیالات ہو کر رہ گئی ہیں۔

بایں ہمہ اختر اورینوی لادینیت ایک چٹان ہے۔ جو اس کفر و الحاد اور دہریت کے طوفان میں پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ اپنی جگہ پر ثابت قدم ہے۔ آپ کا دل و دماغ اسلامی تعلیمات سے مطمئن اور ان کے تفوق پر یقین رکھتا ہے۔ آپ کی ذہنیت شکست خوردہ ذہنیت نہیں ہے کہ مغربی فلسفہ کے آگے سپر ڈال دے۔ یا ہر غیر مذہبی زد میں بہہ کر بے دست و پا ہو جائے۔ آپ کسی لادینی تحریک سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی آئے دن جنم لینے والی نت نئی چھوٹی بڑی اسکیموں سے دبتے ہیں۔ بلکہ ہر مشکل کا حل دین و ایمان اور ہر مرض کا مداوا اسلام و بانیٔ اسلام صلعم کے اسوۂ حسنہ میں موجود پاتے ہیں۔

ہمیں بارہا آپ کے لیکچر سننے کا موقع ملا ہے۔ جن میں آپ نے ضرورت مذہب، امن عالم، اتحاد امم، باہمی رواداری، عالمگیر برادری، صلح و سلامتی، ہستیٔ باری، توحید الٰہی، سوانح پیشوایان مذاہب اور

سیرت النبی صلعم وغیرہ متعدد مضامین پر اظہار خیال آیا ہے۔ اور ہر موقعہ پر بے تکلف قرآن کریم، احادیث نبویہ، اسوۂ رسول اور تاریخ اسلام کے حوالے پیش کئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اسلام و اسلامیات کا خلوص و عقیدت کے ساتھ گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور آپ کو دین و ایمان بالخصوص با دین فطرت یعنی اسلام سے سچا لگاؤ اور انتہائی وابستگی نصیب ہے۔ اور آپ ہر مسئلہ کا حل خواہ حل اسلام کی تعلیم میں مہیا پاتے ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے بالکل بجا فرمایا ہے۔ کہ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اس ضرب المثل کی تصدیق کیلئے پوری ذمہ داری کے ساتھ اختر اورینوی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو مذہبی اور شدید مذہبی ہونے کے باوجود وسعت نظری، فراخ حوصلگی اور عالی ظرفی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ کیسا ہی نازک مسئلہ ہو آپ کسی کے جذبات سے نہیں کھیلتے اور اگر کوئی دوسرا ایسی حرکت کرے تو آپ کے ماتھے پر بل نہیں آتا۔ کیونکہ آپ کے دل و دماغ اور رگ و ریشہ میں اسلامی تعلیمات رچی بسی ہیں۔ جو در حقیقت خیالات میں توازن پیدا کر کے انسان کو شگفتہ مزاج اور بردبار بنا دیتی ہے۔ اور وہ اپنے تئیں نہایت قوی دلائل و براہین سے مسلح اور حصار اسلام میں محفوظ و مامون یقین کرنے لگتا ہے۔ اس لئے نہ تو اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے۔ اور نہ وہ کسی حملہ سے خائف ہوتا ہے۔ بلکہ پوری دلجمعی اور سکون و اطمینان کے ساتھ مخالف کو ڈھیل دے دے کر پکڑتا اور بزبان حال کہتا ہے کہ

ایاز قدر خود بشناس

فی زمانہ دین و مذہب کے ٹھیکیداروں یعنی ملاؤں، پنڈتوں مہنتوں، پادریوں اور ان کے پیشواؤں نے اپنی تنگ نظری سے مذہب کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف کفر و الحاد کی یورش ہے تو دوسری طرف بقول اقبال "دین ملائی سبیل اللہ فساد" کی اندرونی سازشیں نتیجہ یہ کہ ہماری نئی پود مذہب سے بیزار و بددل ہوتی جا رہی ہے۔ اور ایشیا جو کبھی مذہبی رہنماؤں کا مردم خیز خطہ تھا، آج جبکہ اس کا سب کچھ لٹ چکا ہے اب اس ردو بدل سے دوچار ہے کہ اس کا مذہبی سرمایہ بھی لٹا چاہتا ہے۔ لیکن اگر مغربی علوم سے بہرہ یاب ہونے والے مسلمان اختر اورینوی کی طرح اسلامی تعلیمات کو اپنا لیں، انہیں اجاگر کریں۔ اندھی تقلید کر کے نہیں بلکہ اعلیٰ وجہ البصیرت اسلامی فلسفہ کو اپنے دل و دماغ میں بسا لیں اور دینی و لادینی قدروں کو عدل و انصاف کے ترازو میں تول تول کر اہل عالم پر دین و مذہب کی برتری ثابت کرتے ہیں اور خدائے برتر کا فضل و کرم بھی شامل حال رہے تو دین و مذہب کے درخشاں مستقبل کی یقینی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔

قریشی عبدالحق فضل

اخترؔ اورینوی صاحب کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں

جناب ڈاکٹر اختر اورینوی نہایت ذکی الحس شخصیت کے مالک ہیں۔ ذہنِ اخاذ اور نقطہ نواز آپ نے پایا ہے جو ہر مقصود کو بہت جلد پا لیتے ہیں اور بسرعت علم و حکمت کے جدید و نادر گل و لالہ بکھیرنے لگتے ہیں۔

آپ بیک وقت علم و ادب کے باغ و بہار بھی ہیں، مذہب و فلسفہ کے دقائق نگار اور شعورِ سیاست سے بہرہ ور بھی —— جملہ علوم کا محور اسلام ہے۔ اور اسلام ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں پہنچ کر تمام خطوط جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے آپ کا مطمحِ نظر آپ کو قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے اس کا بشدت احساس ہوا ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی کبھی مرعوب نہیں ہوتے۔

آپ جب ایک ایسے مجمع میں تقریر کر رہے ہوں جس میں اہلِ ادب کے علاوہ سائنس داں، فلاسفر، اقتصاد و تمدن کے ماہرین، تاریخ و جغرافیہ کے دلدادہ اور اربابِ حل و عقد و سیاست موجود ہوں، اس میں امراء بھی ہوں اور غربا بھی اور وہ سب مختلف مذاہب پر یقین رکھتے ہوں۔ تو یہ سبھی آپ کی سحر بیانی سے متاثر و محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ تقریر میں تحریک کی بجائے تعمیری اجزاء کی فراوانی ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک دلکش انداز میں مجمع سمیت نکتۂ اتحاد کی طرف مارچ کر رہے ہیں۔

اہلِ ادب کے علاوہ اہم شخصیتوں سے آپ جو ملاقاتیں کرتے ہیں، ان میں یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ملاقاتوں کے لطیف نکات کو من و عن حیطۂ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ البتہ اپنی معلومات کے مطابق مختصر کوائف ان ملاقاتوں کے درج کر دینا ہیں تاکہ آپ کی زندگی کا یہ پہلو تشنہ نہ رہے۔

۱۔ گاندھی جی

اوائل ۱۹۴۷ء جماعت احمدیہ کا ایک وفد گاندھی جی سے ملاقاتی ہوا اس موقعہ پر جناب اختر صاحب نے قرآن حکیم اور اسلامی کتب پیش کیں اور دعوتِ اسلام دی، خصوصاً آپ نے اسلام کی برتری کا یہ پہلو پیش کیا کہ اسلام نے صلح کل

اور بین المذاہب اتحاد و تعاون پیدا کرنے کے لئے تمام اقوام کے روحانی رہنماؤں کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اس حقیقت کو بالوضاحت بیان فرمایا ہے۔ کہ دنیا کی ہر قوم میں خواہ کسی بھی ملک و علاقہ میں آباد ہو۔ اللہ تعالیٰ کے رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ لہذا اس صلح کل کی تعلیم کو اپنا کر دنیا میں امن و آشتی قائم کرنے کی سعی کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں آپ نے قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات پیش کیں۔

۱۔ وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر

۲۔ لکل قوم ھاد

۳۔ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا

۲۔ جناب جواہر لعل نہرو

دسمبر ۱۹۴۶ء میں بمقام پٹنہ ملاقات ہوئی۔ آپ نے اس موقع پر "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "نظام نو" (یہ دونوں کتب حضرت امام جماعت احمدیہ کی دو تقریروں پر مشتمل ہیں) دو کتب پیش کیں۔ اور اسلامی معاشی نظام پر نصف گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی۔ آغاز ملاقات میں پنڈت جی نے اسلام کا اقتصادی نظام ہاتھ میں لے کر فرمایا:-

"کیا یہ وہ اقتصادی نظام ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل پیش کیا گیا تھا۔"

"ہے تو وہی لیکن اس کارگاہ عالم کی اکثر چیزیں ایسی ہیں جو آج سے ہزاروں سال قبل بھی جس انداز و پہلو سے مفید تھیں وہ آج بھی اس انداز و پہلو سے اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ جیسے پانی پیاس بجھانے کے لئے۔"

یہ جواب پاکر پنڈت جی بہت محظوظ ہوئے۔ اور شکریہ کے ساتھ کتب رکھ لیں۔ پھر جب ۱۹۶۰ء میں پٹنہ تشریف لائے تو آپ نے انگریزی ترجمۃ القرآن کا گراں قدر تحفہ موصوف کو پیش کیا۔ جسے ایک مجلس میں نہایت اکرام کے ساتھ پنڈت جی نے قبول کیا۔

۳۔ جناب راجہ گوپال اچاریہ

موصوف ۱۹۴۷ء میں پٹنہ تشریف لائے تھے۔ جناب اختر صاحب نے دوران ملاقات ٹیچنگز آف اسلام اور متعدد اسلامی کتب کا تحفہ پیش کیا۔ الہام کی نوعیت و تقسیم پر گفتگو ہوتی رہی۔ موصوف نے کچھ اعتراضات بھی پیش کئے۔ آپ نے اسلامی براہین سے تشفی بخش جوابات ان اعتراضات کے دیئے۔ یہ دلچسپ ملاقات نصف گھنٹہ تک جاری رہی۔

۴۔ جناب لیاقت علی خاں مرحوم

۱۹۴۶ء بمقام پٹنہ موصوف سے آپ نے ملاقات کی بین الملی سیاسیات اور روابط کے بارے میں آپ نے متوجہ کیا۔ نیز اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشیات و اقتصادیات کے پلان و پروگرام مرتب کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ موصوف بڑی توجہ سے سنتے رہے۔

۵۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین

موصوف جب گورنر بہار تھے تو آپ سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ مسلم تعلیم کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ تفسیر قرآن کے نکات پر علمی اور دلچسپ گفتگو ہوئی۔

۶۔ جناب جے پرکاش نرائن

موصوف سے سیرت کے جلسہ میں آپ کی ملاقات ہوئی۔ لا اکراہ فی الدین، اور اسلامی نظام پر جناب اختر صاحب کی تقریر تھی۔ تقریر کے بعد موصوف نے آپ کی تقریر میں بیان کردہ لا اکراہ فی الدین اور اسلامی اقتصادیات کے نکات پر بڑی دلچسپی اور خوشی کا اظہار کیا۔ اور تقریر کے بعد دیر تک دونوں صاحبان

کے درمیان پر لطف گفتگو جاری رہی۔

۷۔ جناب چھاگلہ ـــــ جناب آئنگر گورنر بہار

ان دونوں صاحبان سے گذشتہ سال راج بھون پٹنہ میں آپ نے ملاقات کی۔ یہ ملاقات بے تکلف دوستی کے سلسلہ میں تھی۔ دوران گفتگو گورنر صاحب نے تعلیم رو پنی شد کی خوبیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ قدرے خاموشی کے بعد جناب اختر صاحب نے قرآن کریم کی آیات پڑھ کر اپنے مخصوص انداز میں تطبیق دینا شروع کر دی۔ مثلاً:۔

ا۔ گورنر صاحب نے ایک نکتہ یہ بیان فرمایا کہ لفظ "اوم" ایک طبعی آواز الف سے شروع ہوتا ہے اور میم جو تکمیل کا اشارہ کرتی ہے اس پر ختم ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا "بجا لیکن قرآن حکیم میں ا، ل، م آیا ہے اور درمیان میں لام کا اضافہ کر کے بتایا گیا ہے کہ انسان کے آغاز و انجام کے درمیان ایک مرحلہ "عمل" کا بھی ہے۔ جسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ب۔ جناب گورنر صاحب نے یہ نکتہ بھی بیان فرمایا کہ اوپنی شد کی تعلیم کی رو سے صرف دو ہی اقسام کے انسان پیدا کئے گئے ہیں۔ برہمن اور شودر یعنی اچھے اور بد باقی سب ان کی فروع ہیں۔ جناب اختر صاحب نے قرآن حکیم کی آیت و لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کی تلاوت کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن کریم کی رو سے انسان کی پیدائش صرف ایک ہی قسم پر ہوئی ہے۔ یعنی "احسن تقویم" پھر وہ ماحول سے متاثر ہو کر برا بھی بن سکتا ہے۔ اس موقع پر آپ نے آیت فطرت اور حدیث "یہودانہ" بھی پیش کی۔

۸۔ ممالک غیر کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں

امریکن، جرمن، چیک، اور اسرائیلی علماء اور ریسرچ اسکالروں سے آپ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پیراگ کے پروفیسر زیان مارک آپ کے ساتھ قیام پذیر ہوئے۔ ان سب کو اسلامی لٹریچر پیش کیا گیا۔ اور اسلامیات پر گفتگو ہوتی رہی۔ عرب لیگ نے کئی پروفیسروں کو خدا بخش لائبریری میں ریسرچ کی غرض سے بھیجا جو کتب کے فوٹو بھی لیتے رہے۔ ان سے بھی آپ کی اسلامی مسائل اور اسلامیات پر دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔

ایک تازہ ترین ملاقات حال ہی میں اسرائیل سے آنے والے ایک یہودی ریسرچ اسکالر سے آپ کی ہوئی۔ جن کا نام "یوحنان فریدمان" جیروزیلم یونیورسٹی سے انہوں نے عربی میں ایم، اے کیا ہے، اب مونٹریل یونیورسٹی کینیڈا میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ حضرت احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ تعصب بھی رکھتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر اختر صاحب نے موصوف کی غلط فہمیاں دور کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور قرآن کریم اور احادیث کی وہ پیشگوئیاں بیان فرمائیں جن میں یہودیوں کے مستقبل کی خبریں دی گئی ہیں۔ خصوصاً سورہ بنی اسرائیل کو بالوضاحت بیان فرمایا۔ چنانچہ یہ یہودی ریسرچ اسکالر بہت اچھا اثر لے کر لوٹے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محترم ڈاکٹر اختر اورینوی کو صحت و تندرستی کی لمبی عمر عطا فرما دے۔ اور اسلام و ملت کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین۔

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

ڈاکٹر اختر اورینوی

میرا نظریۂ فن

میں سوچتا ہوں کہ جب میں نے شاعری اور افسانہ نگاری کی ابتدا کی تھی تو کیا اس وقت میرا کوئی نظریہ تھا۔ میرا حافظہ مجھے جواب دیتا ہے کہ کوئی نظریہ نہیں تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ شعر و ادب کی طرف جھکاؤ پیدا ہو۔ ریاضی میں نسبتاً کمزور تھا، مگر انگریزی اور اردو ادب سے بڑی رغبت تھی، جغرافیہ کی طرف بھی طبیعت بہت مائل رہی، نقشے اور رلیف نقشے بنایا کرتا تھا اور انعام حاصل کرتا تھا، بعد ازاں سائنس کا طالب علم بنا، اس دور میں بھی اردو ادب سے دلچسپی بڑھتی گئی، میڈیکل کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی ادبیات کی طرف دل کھنچتا تھا، دو سال کی صحرا نوردی میں ادب و شعر ہی کا سہارا ملا۔ جب انگریزی آنرس کلاس میں نام لکھا یا تو پھر ادب اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ میں سوچتا ہوں کیا اُن زمانوں میں میرا کوئی نظریۂ فن تھا، جی نہیں! کوئی نظریۂ فن نہیں تھا مطالعۂ ادب بھی میں نے میلانِ طبع کی وجہ سے کیا اور تخلیقِ ادب کا کام بھی شوق بے اختیار کے نتیجہ میں شروع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ۱۹۲۷ء سے چھوٹے چھوٹے ادب لطیف کے نمونے پیش کرنے شروع کر دیئے تھے، اور غزلیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ عنفوانِ شباب کا خاص تعلق ادب لطیف اور غزل سے ہے بھی، تخلیق سے ذوق و شوق کی تسکین ہوتی تھی، اور بس! ادب و نظریہ کے تصور سے بھی واقف نہ تھا۔ یہ کیفیت ۱۹۳۶ء تک رہی۔ اور اس لمبے عرصہ میں میں نے رومانی رنگ کی تخلیقات بھی کیں۔ حقیقت پسندانہ بھی اور مقصدی ادب بھی پیش کیا۔ لیکن یہ سب مشاہدہ اور وفورِ شوق کے نتیجہ میں تھا۔ میرا کوئی فلسفۂ شعر و شاعری یا نظریۂ ادب وجود میں نہیں آیا تھا۔ بعد میں جب اس مسئلہ کے متعلق سوچنا پڑا، تب بھی میں نے کٹر پن کے ساتھ کوئی نظریہ اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ اصل چیز تخلیقی قوت، مذاقِ سلیم، ذوق و شوق اور قدرتِ الہام ہے۔ سوچ بچار کر اس نکتہ کو بھی سمجھا ہے کہ فن کے اندر فکری پہلو کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ جذبہ و تخییل کی قدر و قیمت فکر سے بڑھ جاتی ہے۔ اور فکر و فلسفہ فن کو وزن اور وقار عطا کرتے ہیں۔ زندگی اور حقائق زندگی کے متعلق ہر شخص کا کچھ نہ کچھ نظریہ ہوتا ہے، ایک اندازِ نظر، ایک اسلوبِ فکر، ایک مخصوص ردِ عمل کا پایا جانا فطری بات ہے۔ آدمی ہمیشہ کائنات اور حیات کے بارے میں سوچتا ہی رہتا ہے۔ اس کے جذبات کا بھی ایک طور ہوتا ہے اور اس کے خیالات و افکار کا بھی۔ ہم ہمیشہ کسی نتیجہ تک پہنچنا چاہتے ہیں، معنی اور مقصد کی تلاش کرتے ہیں، منزل و آدرش کی طرف سفر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں انسانی سرشت میں پائی جاتی ہیں۔ ہم کائنات، فطرت اور معاشرہ کو اک نظام عطا کرنا چاہتے ہیں، ہم ابتری اور انتشار میں ترتیب و تنظیم کی تخلیق کرتے ہیں۔ کائنات اور حیات کے خالق نے ان کا کچھ مقصد رکھا ہو یا نہ رکھا ہو، وجود کے کوئی معنی ہوں یا نہ ہوں لیکن ہم ابن آدم بہر حال مقصد و معنی کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں۔ اور اگر ہم اپنے

چاروں طرف مقصد و معنی کہیں پاتے تو اُن کی تمنا کرتے ہیں۔ اور اُن کی تخلیق کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح کائنات و حیات میں نیرنگی دیکھتے ہیں انسانوں کے ردِ عمل میں نیرنگی و بوقلمونی ہے۔ فرد فرد کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ ہر فرد کی داخلی زندگی ایک عالمِ صغیر ہے اور اسی عالمِ صغیر میں، عالمِ کبیر، کائنات و فطرت کی مختصر توضیح اور تعبیریں ہوتی ہیں۔ فرد فرد کے ذہن و ذوق میں فرق ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کے نظریہ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا کوئی ذکی اور دانشمند فرد ان امور کے بارے میں زیادہ گہرے طور پر سوچتا ہے اور وہ معنی و مقصد کی تلاش میں دور تک جاتا ہے۔ ہمہ جہتی طور پر اپنی جستجو اور غور و فکر کو جاری رکھتا ہے اور وہ دوسروں کی نسبت زیادہ بالیدہ، واضح اور مربوط نظریۂ حیات و کائنات پیش کر دیتا ہے۔ بہت سارے لوگ اسی کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور ایک دبستانِ فکر پیدا ہو جاتا ہے فکر و نظر کے مطابق عقائد و اعمال پیدا ہوتے ہیں۔ فلسفے، مذاہب اور نظام ہائے معاشرہ وجود میں آتے ہیں، انقلابات برپا ہوتے ہیں، آویزشیں اور تصادم سے قیامتیں اُٹھتی ہیں لیکن اختلافات بہر حال قائم رہتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی طرح سوچے اور عمل کرے لیکن ساتھ ساتھ وہ دوسروں کے تحکم اور قدغن کو ناپسند بھی کرتا ہے۔ آپ کسی پہلوئے زندگی کے بارے میں سوچیں، آپ لوگوں کے مختلف ردِ عمل کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ فرق جابجا قدم بہ قدم ملتا ہے، چھوٹے چھوٹے فرقوں کا تذکرہ نہیں، نمایاں اختلافات بھی بہت ملتے ہیں۔ کوئی زندگی کو المناک سمجھتا ہے کوئی عبرتناک۔ لہذا کوئی قنوطی بن جاتا ہے کوئی رجائی۔ کوئی لذتیت کا قائل ہے کوئی روحانیت اور کلبیت کا، کہیں وحدانیت سب کچھ ہے، کہیں کثرت اور شرک کا دور دورہ ہے اور کہیں وحدت الوجود کے نغمے گائے جا رہے ہیں۔ کسی کے مزاج میں رومانیت پائی جاتی ہے اور وہ کائنات کو اسی نظریہ سے دیکھتا ہے۔ کسی کے اندر حقیقت پسندی اور توازن اور جزئیات پسندی ہے، کوئی کلاسکیت اور روایت پرستی کا قائل ہے۔ کوئی جدت، تازگی اور اختراع پر مرتا ہے، اس کے علاوہ کچھ قومی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ مقامی ماحول اور حالات ہوتے ہیں، تاریخی موڑ اور حوادث نمودار ہوتے ہیں اور یہ سب افراد و اقوام کی نظر، نظریہ، ردِ عمل، فلسفہ اور آدرش کو بدلتے رہتے ہیں اور جب مجموعی طور پر زندگی اور کائنات کے نظریئے بدلتے ہیں تو لازماً فنونِ لطیفہ اور ادبیات کے نظریئے بدلتے رہتے ہیں۔

آپ ادبیات کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ دیکھیں گے کہ فنی نظریئے صرف سماجی، سیاسی اور اقتصادی بنیادوں ہی پر نہیں بدلتے بلکہ وہ ذوقی اور ذہنی اسباب سے بھی بدلتے ہیں۔ مثلاً کسی ادب پر ایک دور آتا ہے کہ شعراء سادہ کاری اور فطرت نوازی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور دوسرے دور میں وہ پُر تکلف طرز و اسلوب اور پیچیدہ مضامین سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کبھی منظر نگاری ہوتی ہے اور انسان و فطرت کے تعلقات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی تمدنی زندگی کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں، جزئیات نگاری ہونے لگتی ہے، کبھی عالمِ النفس کی نازک لہروں، اُن کی پیچیدگیوں اور حیرت افزائیوں کے تجزیئے ہوتے ہیں۔ ادبیات کے ہزار پہلو ہیں۔ اور یہ فنکاروں کے ذوق و شوق، میلان، رجحان، نظر و نظریہ کے مطابق اُبھرتے اور پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں! یہ صحیح ہے کہ زندگی کے معروضی حالات، خارجی انقلابات ذہن و ذوق اور فکر و خیال کو بھی گہرے طور پر متاثر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ذہن و ذوق یا فکر و خیال انسان کی خارجی زندگی کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو ہم کہیں گے کہ غیر معمولی شعور اور جذبہ رکھنے والے افراد کے فکر و خیال اور ذوق و شوق میں وہ بجلیاں بھری ہوئی ہوتی ہیں کہ اس سے اجتماعی حشر سامانی ہوتی ہے اور نسلاً بعد نسلاً اس کے اثرات پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ انسانی زندگی میں خارجی حالات اور داخلی حالات مل کر ایک دائرہ متحرک بنا دیتے ہیں۔ اور ایک نصف دائرہ دوسرے نصف دائرے کو کھینچ کر متاثر کرتا رہتا ہے۔

مجھے ادب و نظریہ کے مسئلہ پر سوچنے کی طرف چند باتوں نے

مائل کیا۔ ایک دفعہ میں پٹنہ کالج کے پرنسپل آرمر سے ملنے گیا میں بی۔ اے
آنرس انگریزی کے ساتھ پاس کر چکا تھا اردو میں ایم۔ اے بھی کر چکا
تھا، یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے، ریسرچ اسکالرشپ کے لئے کوشاں تھا
میرے ہاتھ میں ایک روسی ناول کا ترجمہ تھا غالباً "لیزا" آرمر
صاحب نے پوچھا کون سی کتاب ہے میں نے بتایا، انھوں اپنی پنی
تیز آنکھوں سے مجھے بہ غور دیکھا اور پھر مسکرانے لگے۔ فرمایا۔ "زندگی
تو تلخ حقیقتوں سے بھری ہوئی ہے اور تم ادب میں بھی انہیں تلخیوں
سے ناتا جوڑے ہوئے ہو تمہیں اور کچھ پڑھنے اور دو گھڑی دل
بہلانے کو نہیں ملتا۔ عزیزم میں حقیقت پسندی سے اکتا چکا"
میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا لیکن بعد میں اس واقعہ نے مجھے
اور زیادہ حقیقت پسندی کی طرف مائل کر دیا شاید ہر ممنوع چیز
کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہی ہیں اور معلم کی تنبیہ اپنے اندر ایک
تاثر معکوس رکھتی ہے۔ انہیں دنوں ملک میں ترقی پسند تحریک
پھیل رہی تھی۔ پٹنہ میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں
آیا۔ یہاں ادیبوں کا ایک حلقہ تھا جو اس تحریک سے بہت دلچسپی
لے رہا تھا۔ کچھ لوگ باضابطہ ممبر تھے کچھ بے ضابطہ اور کچھ
ہم خیال تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے نقطۂ نظر اور ترقی پسندوں
کے نقطۂ نظر میں کچھ اقدار مشترک پاتے تھے اور ان کی حلقہ بندی
سے متاثر ہو کر ساتھ ساتھ تھے۔ میرے دوستوں میں علی اظہر، زبیر احمد
تمنائی، رضا نقوی، یحییٰ نقوی اور سہیل عظیم آبادی۔ مختلف رنگ اور
آہنگ کے ساتھ ترقی پسند کہلاتے تھے۔ کچھ کم عمر ابھرتے ہوئے ادیب
بھی اس حلقہ کی طرف کھنچ گئے تھے جیسے طفیل احمد خاں، منظفر، سید
اختر بیامی وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی اور نوجوان یا ترقی پسند تھے یا
کہلاتے تھے یا غلط طور پر سمجھے جاتے تھے۔ خود میں بھی پانچویں سواروں
میں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے باقاعدہ طور پر کبھی بھی انجمن ترقی پسند
مصنفین کی رکنیت اختیار نہیں کی۔ صوبہ سے باہر کی دنیا میں بھی
ترقی پسندی کا غلغلہ تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا طوطی بولتا
تھا۔ لاہور اور لکھنؤ کی انجمنیں اور بعد میں بمبئی دلی کی انجمنیں خوب

سرگرم تھیں۔ لکھنؤ سے نیا ادب نکل رہا تھا، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم
ترقی پسندی کا نظریہ پیش کر رہے تھے۔ ان دنوں علی سردار جعفری،
سبط حسن، مجاز اور حیات اللہ انصاری سب وہاں اکٹھا تھے۔
احمد علی بھی وہیں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ بعد میں احتشام حسین اور
آلِ احمد سرور بھی وہیں آ گئے لیکن اس وقت تک علی سردار جعفری
وہاں سے جا چکے تھے۔ اکثر نوجوان شاعر اور افسانہ نگار ترقی پسندانہ
رنگ اختیار کر رہے تھے۔ کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم، احسان دانش،
مجاز، علی سردار وغیرہ وغیرہ۔ ادبی فضا میں خود میرا میلان بھی
حقیقت پسندی، مقصدیت اور ایک وسیع البنیاد جمہوری اور
اخلاقی اشتراکیت کی طرف ہو گیا، لیکن میں ترقی پسندوں سے پورے
طور پر کبھی مطمئن نہ ہوا اور وہ بھی مجھ سے مطمئن نہ ہوئے۔ ایک عجیب
واقعہ ہوا۔ نیا ادب بمبئی چلا گیا، نیا ادب کے پچھلے کور کے آخری
صفحہ پر ترقی پسند فنکاروں کی اک فہرست نکلتی تھی اور شاید انکی
کتابوں کا اعلان نکلتا تھا۔ عنوان ہوتا "نئے ادب کے معمار" غالباً
۱۹۴۶ء میں میرا ایک افسانہ ادب لطیف لاہور میں چھپا "ابھی
مردے نہ کہو" اس میں میں نے ذہنی طور پر ظالمانہ تقسیم فلسطین کی
ذمہ داری روس اور امریکہ دونوں پر ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ
میں نے رانچی میں ترقی پسندوں کے بعض رویہ اور ان کی ادبی لغزشوں
کے متعلق اک تقریر کی تھی بس غضب ہو گیا۔ پہلے نیا ادب میں نئے ادب
کے معماروں کی فہرست میں میرا نام بھی ہوا کرتا تھا، مذکورہ واقعات
نے غالباً اشتمالی خیال کے ترقی پسندوں کو مجبور کیا کہ وہ مجھ پر ارتداد
اور کفر کا فتوے لگائیں اور برادری سے مجھے خارج کر دیں۔ بہرحال
اب نیا ادب کی فہرست میں میرا نام نہ تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات
سہیل عظیم آبادی کے ساتھ بھی ہوئی اور سعادت حسن منٹو نے تو
تماشہ کیا۔ انہوں نے بمبئی کے انتہا پسند ترقی پسندوں کے مرکز ادبیات
اور افسانہ نگاری سے متعلق ایماندارانہ باتیں کہدیں۔ منٹو کی کسی ادبی
محفل میں بڑی کامیاب تقریر ہوئی جس میں انہوں نے اپنے فن کے متعلق
خاص طور پر اور فنون کے متعلق عام طور پر بالغ نظرانہ باتیں کہیں اور

اُس کے بعد مخصوص انتہا پسندوں نے کڑی نظریں ڈالیں اور انہیں ترقی پسند
ماننے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسندی کو انتہا پسند ترقی پسندوں
نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں شاہد احمد دہلوی کی فرمائش پر میں نے ترقی پسندی
پر ایک مقالہ ساقی کے خاص نمبر کے لئے لکھا اور پھر ۱۹۴۱ء میں
ادب لطیف لاہور کے سالنامہ کے لئے ایک مقالہ بعنوان "اردو اور
ادبیات عالم میں ترقی پسندانہ رجحانات" لکھا، ان دونوں مقالوں میں
میں نے ترقی پسندی کی تعریف کی تھی اور اس کی کمزوریوں پر بھی نظر
ڈالی تھی، میں بہر حال اُن میں فنی حسن چاہتا ہوں، تجربہ خواہ کوئی ہو موضوع
اور نظریہ چاہے جو بھی ہو، فن کی داخلی اور خارجی خوبیاں جب تک
نہ ہوں، فن کی بلندیاں طے نہیں ہوتیں۔ محض حقیقت نگاری، مقصدیت
اور ترقی پسندی سے فنکاری نہیں ہوتی، فنکاری فنکاری سے ہوتی ہے
ہاں مقصد و منہاج فن کو مزید قوت عطا کرتے ہیں، میں اُن دنوں بھی
حقیقت پسندی کو سب کچھ نہیں سمجھتا تھا، میں نے ادب لطیف میں
ایک مقالہ لکھا تھا "حقیقت پسندی اور مثالیت" اس سے بھی
میرے خیال کی وضاحت ہوتی تھی، واقعیت اور مثالیت کے امتزاج
کامیاب سے ہی اعلیٰ ادب پیدا ہو سکتا ہے۔ آج میں اس خیال پر اور
زیادہ استحکام کے ساتھ قائم ہو گیا ہوں، عالم مثالی، خود عالم حقیقت
کی ایک بلند شاخ ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ حقیقتوں کے پردے
اٹھانے چاہئے آپ کو یہیں حقیقت میں عالم مثالی کی جلوہ گری کے
نظارے ملیں گے۔

نگار لکھنؤ نے نظیر نمبر شائع کیا۔ اس نمبر میں مجنوں گورکھپوری
احتشام حسین اور کئی اور ادبا کے مقالے نظیر کی شاعری اور زندگی پر تھے
خود نیاز صاحب نے بھی نظیر اکبر آبادی پر قیمتی مضمون لکھا تھا۔ ایک میرا مقالہ
بھی تھا، غالباً یہ نمبر بھی ۱۹۴۱ء میں نکلا تھا۔ اختر تلہری صاحب نے
بعد میں مجنوں اور احتشام پر اور اس خاکسار پر بھی سخت تنقید کی اور
ہمیں مارکسی بتایا معلوم نہیں اختر تلہری کو میرے مقالے میں مارکس کہاں پر سے
جھانکتا ہوا نظر آیا، تماشے کی بات تو یہ ہے کہ میری نا استواری یا عدم

کٹرپن کی وجہ سے انتہائی ترقی پسندوں نے مجھے رجعت پسند قرار دیا
اور مولانا تلہری صاحب نے مجھ پر کفر کا فتوے لگایا اور مارکسی
قرار دیا، اب آپ حضرات ہی فیصلہ کر لیں کہ میں مارکسی ہوں یا مسلم۔
لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ادب میں ایک مارکسی کی بھی جگہ ہے اور مسلم کی
بھی، زندگی بھی متقی کی بھی، ایک ہندو اور گبرو کی بھی ایک عیسائی اور
یہودی کی بھی اور ایک ایسے شخص کی بھی جو کچھ نہ ہو، آزاد خیال، خالص
نیچرل، میں سوچتا ہوں ممکن ہے کہ آدمی اس نتیجہ پر بھی پہنچ سکتا ہے کہ
زندگی اور ادب میں کسی نظریہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ایک نظریہ ہے
بشرطیکہ یہ پروردۂ فکر ہو، بوجھ بوجھ کر ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کائنات بے معنی
ہے یا کم از کم یہ کہ خالق کائنات یا نیچر کے اپنے معنی ہوں گے ہم اتنے
حقیر ہیں کہ اس عظیم و بسیط کائنات اور فطرت کے معنی سمجھ نہیں سکتے اور
از خود اس میں معنی پرو بھی نہیں سکتے۔ پھر ایک نظریہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگوں کو معنی و مقصد سمجھنے کی آزادی دیدی
جائے۔ اور ہم زندگی اور فن میں رواداری کو راہ دیں۔ اس کثرت معنی
سے لطف سخن بھی پیدا ہوتا ہے۔ تشریحات و تعبیرات کی کثرت اور نیرنگی
کیف و شعور حیات کو بڑھاتی ہے۔ ایک ہی کائنات ایک ہی فطرت اور
ایک ہی حیات کو اتنی تعداد سے ضرب دیدیتی ہے جتنے آزادانہ سوچنے
والے ذہن اور دماغ اور آزادانہ محسوس کرنے والے دل ہوتے ہیں۔
کثرت نظریہ سے ادب میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ
کامیاب فنکاروں کی انفرادیت اور جدت بھی ایک حد تک نظریہ کی
نیرنگی پر منحصر ہے۔ بلکہ کبھی کبھی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ایک ہی فنکار
کے مختلف تجربوں کی بدلتی ہوئی تعبیرات کی وجہ سے اس کے کلام میں تازگی
اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ نظریہ کی قطعیت اور انجماد، اکتاہٹ،
سپاٹ پن، زوال اور نقالی پیدا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے باوجود فی الحال میرا ایک نظریہ فن ہے
میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ فرضیئے نظریئے، فلسفے اور عقاید
تجربات و افکار گویا ذہن میں تدریجی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ وراثت،
ماحول، تعلیم اور تربیت کے اثرات اور تحریکوں، تبدیلیوں اور انقلابات

عالم کے نتائج، افراد اور جماعتوں کے نظریے اور عقاید کی نوعیت متعین کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، میرے خاندانی حالات، ماحول، تعلیم و تربیت، مطالعہ اور تجربات نے مجھے اک نظریہ فن دیا ہے، لیکن تخلیق کا عمل بڑا پیچیدہ ہوتا ہے اور انسانی ذہن و روح کے کوائف و احوال ہمیشہ نت نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں خصوصاً ایسے افراد کی جن کی شخصیت میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اور عموماً ہر فرد کی زندگی اور خیالات و افکار کا ایک درمیانی دھارا ہوتا ہے، لیکن درمیانی دھارے کے علاوہ اطراف و جوانب کے چھوٹے چھوٹے دھارے موجیں اور لہریں بھی ہوتی ہیں۔ آگے بڑھنے والے دھارے کے علاوہ "پس آیند" بھی ہوتا ہے۔ جہاں کبھی الٹی گنگا بہتی ہے۔ اور کبھی وہاں سکون اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ نیز شخصیت کی بالائی موجوں کے علاوہ اندرونی اور گہری موجیں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ اندرونی موجوں کا تماشہ وہی ہو جو بیرونی موجوں کا تماشہ ہے۔ انسانی زندگی اک دریائے تموج و تضاد، اک عالم تصادم و اتحاد، اک دنیائے سکون و حرکت، حقیقت و فوق الفطرت، واقعیت اور مثالیت ہے۔ نیرنگ وجود کو سمجھنا گویا ناممکن ہے۔ پھر بھی ہم کس حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے قلیل سرمایہ عقل و فہم کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

یہ فریب عقل ہماری زندگی کے تگ و تاز کا باعث ہے۔ بہر حال یہی قلیل پونجی ہمارے جذبات و ارادات کو بھی کچھ دیتی ہے اور انہیں حرکت میں لاتی ہے۔ میں نے بھی اپنی شخصیت اور اپنے خیالات و افکار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، عرفان وجود، عرفان کائنات اور عرفان خدا تو بہت بڑی چیزیں ہیں، اپنا آپ عرفان بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا مجھے عرفان ذات حاصل ہو چکا ہے یا اندر کی دنیا سے جواب آتا ہے ادھورے طور پر ہوا۔ میں آپکو بھی کسی نارسائی اور ناتمامی کے دھندلکے دکھاؤں گا۔

میرا خیال ہے کہ تخلیق فن بہت حد تک انفرادی اور ایک حد تک اجتماعی مسئلہ ہے، روح تخلیق کا مرکزی حصہ انفرادی ہے اس کے علاوہ فن کی ہر تخلیق اپنی انفرادیت علیحدہ رکھتی ہے، اُن کے درمیان مشابہتیں ہو سکتی ہیں، جیسے دو بھائیوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر ان کی ہستی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے، اسی طرح ایک ہی فنکار کی دو تخلیق بالکل ایک جیسی ہو نہیں۔ مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ، شکوہ اور ابلیس کی مجلس شوریٰ، ہیملٹ اور میکبتھ، میگھ دوت اور شکنتلا، اپنی اپنی انفرادیت کے حامل فنکار نامے ہیں۔ غرضیکہ اول تو فنکار کی انفرادیت مسلم ہے اور دوسرے یہ کہ فنی تخلیقات کی انفرادیت بھی واضح ہے۔ ایک دبستان ایک دور، ایک تحریک وعقیدہ سے وابستہ فنکاروں کی تخلیقات میں کئی جہتوں سے فرق پایا جاتا ہے، ہم فنکاروں اور ان کے کارناموں کو مشینی پیداوار کی طرح ہرگز نہ نہیں سمجھیں۔ وہ کسی ایک فرمے یا سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے، اسی طرح ان کی تخلیقات بھی ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی نہیں ہوتیں، فنکاروں کے دماغ کا سانچہ بھی ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ ہر چند کہ اس میں یکرنگی بھی پائی جاتی ہے اور کثرت میں وحدت۔

ان معروضات کی روشنی میں میں عرض کروں گا کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد میرا ایک نظریۂ فن بنا، لیکن اس نظریے کی ڈور ہر وقت میری گردن میں اُلجھی ہوئی نہیں رہی۔ میرے نظریے نے کسی ٹھپّہ یا مہر کی طرح مجھ پر اثر نہیں ڈالا اور جب کبھی میں نے یہ محسوس کیا کہ میری تخلیق میرے نظریے کی غلام ہوتی جا رہی ہے۔ تو میں نے اس سے چھٹکارا بھی حاصل کرنا چاہا، کبھی شعوری طور پر شاید کبھی لاشعوری طور پر، اس لاشعوری عمل سے اس وقت واقفیت ہوئی جب کوئی تخلیق عمل میں آ گئی اور کچھ دنوں کے بعد میں نے اس کا جائزہ لیا۔ میرے نظریۂ فن نے ایک کیمیاوی مادے کی طرح ذہن و دماغ میں کام کیا لیکن کبھی کبھی میرے نظریے نے بھونڈے طور پر کار فرمائی کی ہے۔ پھر میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ میرے نظریے فن کے رنگ، سائے، آہنگ اور لے بدلتی بھی رہی، جھٹکے کے ساتھ نہیں تھوڑی تھوڑی، کبھی لب و لہجہ میں تبدیلی ہوئی کبھی آہنگ، کبھی ترکیب و تعلقات میں کبھی انداز نظر کبھی بندش میں، کبھی اضافی، انفرادی کمی اور پختگی کے سبب۔ میرا نظریۂ فن کچھ اس طرح بنا کہ اس میں پھیلاؤ اور لچکداری ملتی ہے۔ یہ باتیں میں سمجھتا ہوں ممکن ہے

دوسرے لوگ اس طرح نہ سمجھیں۔

میرا نظریہ، یہ ہے کہ فن کی ساری قسمیں تجربات زندگی سے تمام مواد حاصل کرتی ہیں۔ اور ترتیب فن کی اندرونی شخصیت سے نئی ترتیب، تازگی، زندگی، روح، سوز و ساز، تعبیر و معنویت اخذ کرتی ہیں۔ اور پھر تشکیل کی منزل میں فنکار کی ہنرمندی سے ترتیب و تناسب، ربط و ہم آہنگی، تراش و خراش، وضع و قطع، اسلوب و ادا، تنظیم و تعمیر پاتی ہیں۔ غرض یہ کہ فن، فطرت اور معاشرہ۔

زندگی اور کائنات کی محض ترجمانی کا نام نہیں بلکہ اس کی تخلیق جدید کا نام ہے۔ میں خود اپنی تخلیقات میں کہاں تک اس تخلیق جدید میں کامیاب ہوا ہوں، مجھے صحیح طور پر اس کا اندازہ نہیں۔ یہ کام میرے ذہین یا ذوقی اور دوسرے فنکار ناقدین کا ہے۔ میں فن کی تخلیقی اور جمالیاتی اقدار کو فن کے لئے بنیادی طور پر ضروری سمجھتا ہوں، فن کی انفرادیت، اس کا صنفی فن، انہیں اقدار سے متعین ہوتا ہے، اسلئے فنکاری کو حسن کاری کہتے ہیں۔ لیکن میں ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ فن ارتقائی منزلوں سے گزرتا ہے۔ پہلے تصویری اور محاکاتی منزل آتی ہے، پھر جذبی اور تخیلی منزل، بعد ازاں فکری اور معنوی منزل نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو پچھلی منزلوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ یہ عجب ماجرا ہے ترقی یافتہ فنکاری، بیک وقت تصویری محاکاتی جذبی، تخیلی، فکری اور معنوی ہوتی ہے۔ اسی فکری اور معنوی منزل پر پہنچ کر ہمیں معاشرہ، فطرت کائنات، حقائق اور حق کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ نظریہ اور فکر کی منزل پر بھی ہمیں تخیلی، جذبی، محاکاتی اور تصویری انداز بیان کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ غرض یہ کہ فنکاری کی کچھ ثانوی قدریں بھی رونما ہوتی ہیں۔ اور بالیدہ فنکاری میں ہمیں ثانوی قدروں کی جھلکی ہوئی روشنی ملتی ہے، انہیں ثانوی قدروں میں نظریہ اور فلسفۂ حیات کا مقام ہے۔ ظاہر ہے کہ نظریئے مختلف ہوتے ہیں اور یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ نظریوں کا مقابلہ اور موازنہ کرتا ہے اور جو نظریہ اسے پسند آتا ہے اس کی جلوہ گری اگر فنی کارناموں میں دیکھتا ہے تو ان کارناموں کو زیادہ پسند کرنے لگتا ہے۔ جمالیاتی لذت اندوزی اور اثر پذیری میں بھی یہ ثانوی اسباب دخیل ہوتے ہیں۔ ہم اصولی طور پر جمالیاتی لذت اور فنی تاثیر کی بات بالکل علیحدہ رنگ میں کر سکتے ہیں لیکن عملی طور پر بالکل منزہ اور مصفّٰی جمالیاتی تاثیر کا وجود شاید ممکن نہیں حسن اک علیحدہ قدر ہے لیکن جب ہم کسی حسین عورت کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں تو اس تاثیر میں صرف حسن و جمال نہیں ہوتا کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ عملی طور پر اثر پذیری میں حسن کو جنس سے الگ کرنا بہت مشکل کام ہے اور شاید ناممکن، اسی طرح تخلیقات فن سے اثر پذیر ہوتے ہوئے ہم محض جمالیاتی اقدار کو ہی محسوس نہیں کرتے، بلکہ ثانوی نظریاتی اقدار سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں، نظیر اکبر آبادی کی نظم "جمنا میں تیراکی" ہمیں اس طرح متاثر نہیں کرتی جس طرح اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کرتی ہے۔ اسی طرح نظیر کی نظم بلدیو جی کا میلہ یا کرشن کنہیا، ہمارے قارئین کو اتنی گہرائی کے ساتھ متاثر نہیں کریں گی جتنی ہندو قارئین کو۔ تاج محل پر ایک نظم ہر شخص کے لئے ایک تاثیر نہیں رکھتی، بہرکیف تخلیقات فن کی اثر پذیری بنیادی جمالی اقدار کے ساتھ ساتھ ثانوی نظریاتی اقدار سے بھی وابستہ ہے جمالیاتی اعتبار سے اگر دو نظمیں یا دو ڈرامے ایک ہی پائے کے ہوں تو ہم اس تخلیق کو زیادہ پسند کریں گے جس میں ثانوی اقدار ہمارے معیار سے بہتر ہوں۔ یہ تشریح طلب مسئلہ ہے جس کی وضاحت کی گنجائش یہاں نہیں۔

صرف پسند و ناپسند کا سوال ہی نہیں، ثانوی اقدار میں موضوعات کی نوعیت اور وسعت بھی شامل ہیں۔ فنکار کو یہ حق ہے کہ وہ سماجی حقائق کی تصویر کشی کرے، اُن پر تنقید کرے، اور پھر اک بہتر سماجی دور کے خواب دیکھے۔ فنکار کے لئے ساری کائنات، ساری فطرت اور پورا معاشرہ سرمایۂ موضوعات فراہم کر سکتا ہے۔ اسے کہیں سے تحریک تخلیق حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی نظریہ وجہ افتخار بن سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس کی کامیابی جمالیاتی اقدار پر منحصر ہے لیکن اس کی وسعت و ہمہ گیری، وسعت و مشاہدہ، عمیق مطالعہ اور بصیرت حیات سے حاصل ہوتی ہے۔ فنکار کی ترقی پسندی یہی ہے کہ وہ کسی کام کا غلام نہ ہو، نہ جاگیرداروں کا، نہ سرمایہ داروں کا، نہ آمروں کا، نہ

استمالیوں کا، وہ ایماندارانہ زندگی، معاشرہ، فطرت اور کائنات کے متعلق اپنے ردعمل کو پیش کرے۔ اور اس پیش کش میں جمالیاتی اقدار کو اپنا رہبر بنائے۔ وہ تنقید و تعبیر حیات میں اپنے ایمان، اپنے اخلاص، اپنی جرأت، اور اپنی حسن کاری کی روشنی میں آگے بڑھے۔ وہ اپنے نصب العین کا پرورش اپنے نصب العین کے لہو سے کرے۔ وہ حقیقتوں کو بھی پیش کرے، خوابوں کو بھی، وہ ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لئے بھی کوشاں ہو، اس کی فنکارانہ روح عمرانیات میں بھی حسن کاری کرنا چاہتی ہے اور سیاسیات و اقتصادیات میں بھی اسلئے اگر وہ اصلاحی اور انقلابی پیام بھی دیتا ہے تو یہ اس کی جبلت ہے، اس کی سرشت ہے، اس کا فنکارانہ جذبہ ہے۔ بشرطیکہ وہ پیام رسانی کے وقت جمالیاتی طریقۂ کار سے انحراف نہ کرے، کیونکہ اک فنکار اس وقت تک فنکار ہے جب تک وہ فن کے جمالیاتی تقاضے پورا کرتا ہے۔

میں نے اپنی ادبی زندگی میں سب سے پہلے نیاز فتحپوری سے اثر لیا اور ساتھ ہی ساتھ یا اسکے کچھ بعد اقبال سے اثر پذیر ہونے لگا۔ نیاز اور اقبال کے دو متضاد نظریہ ہائے فن ہیں۔ آج میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کی تشکیل کا باعث ہیں۔ اردو ادب کی روایت میں ترقی پسندی بھی ملتی ہے اور عیش کوشی بھی۔ ان دونوں کا تصادم بھی ملتا ہے اور رجعت پسندی بھی۔ میرے گھر کی مذہبی فضا نے مجھے حالی، اقبال، شبلی اور شرر کا گرویدہ بنا دیا۔ لیکن میرے مزاج کی جذبات پروری اور رومانیت نے مجھے میر، غالب، نیاز فتحپوری، یلدرم اور اختر شیرانی کی طرف بھی مائل کیا۔ درمیانی دور میں، میں اشتراکیت سے بھی بہت متاثر ہوا ہوں، اسی بناء پر ترقی پسند مصنفین کی انجمن اور ترقی پسند تحریک سے گہرا اثر قبول کیا۔ اب غور کرتا ہوں تو میں کسی ایک میلان کا کبھی نہیں ہوا اور ایک دھارے میں کبھی نہیں بہا۔ کچھ دیر ہر رہرو کے ساتھ چلا اور بعد ازاں ٹھٹھک کر سوچنے لگا کہ صحت و سلامتی اور حسن و معنی کہیں اور بھی ہیں یا نہیں۔ اور اب میں بڑے مطمئن قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جنت فن کا نام ہے حسن کاری کا، گہرے مشاہدہ، ذکی احساس، مخلص جذبات، بلند تخئیل، انسانی محبت، اخوت عامہ، حرکت و عمل، مساوات و حریت، گداز و ہمدردی، قربانی، ایثار اور موجودہ دنیا سے بہتر دنیا کی تلاش کا۔ لیکن یہ تلاش حق بغیر رواداری اور مفاہمت کے ناممکن ہے۔ میرا عقیدہ لا اکراہ فی الدین بھی ہے اور لا اکراہ فی الفن بھی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی
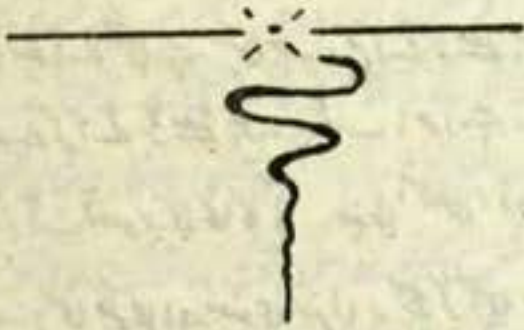
میں اور میرا فنِ افسانہ نگاری

بچپن میں کہانیاں سُننے کا بڑا شوق تھا، گھر کی بڑی بوڑھیوں کی خوشامدیں کیا کرتا اور خوب کہانیاں سنا کرتا تھا۔ دادی اماں مذہبی قصے سناتی تھیں اور دوسرے لوگ دنیا بھر کی حکایتیں اور داستانیں سناتے تھے۔ بیمار بہت پڑتا تھا اور کہانیوں سے میری بیماریاں بہلائی جاتی تھیں۔ مجھے میٹھی چیزوں اور کہانیوں کا بڑا شوق رہا ہے۔ آج بھی ناولوں اور افسانوں اور حلووں پر جان دیتا ہوں۔

چچا مرحوم گاؤں کے رئیس تھے۔ بنگلہ پر روزانہ نشست ہوتی تھی۔ سماور میں اعلیٰ درجہ کی چائے بنتی۔ جمنا پاری بھینسیں کئی تھیں، گاڑھے دودھ کی چائے حریرہ کا مزہ دے جاتی تھی۔ کیا کیا صحبتیں سجتی تھیں۔ ایک سے ایک خوش گفتار لوگ جمع ہوتے تھے۔ حماد میاں، سوہنا بابو، ظہور داد، معین بھوکھا، بابو گھوگھنو سنگھ، بنواری سنگھ اور بہت سے حاشیہ نشیں، ان محفلوں میں درس قرآن سے لیکر داستان امیر حمزہ تک بات پہونچتی۔ سوہن بھائی عبدالحلیم شرر کے رسیا تھے۔ شرر، سرشار اور راشد الخیری کے ناول پنچایتی طور پر پڑھے جاتے تھے۔ جب میرے چند چچازاد بھائی کالجوں میں پڑھنے لگے تو نیاز فتحپوری کے پرچے شروع ہوئے اور نگار کا انتظار واقعی معشوق جواں سال کی طرح کیا جانے لگا۔ میں نے ۱۹۲۶ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور طویل فرصت میں طلسم ہوشربا کی کئی جلدیں پڑھ ڈالیں۔ سائنس کالج میں داخل ہوا تو چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا [illegible] جاتا اور اپنے بنگلہ کی مجلسوں میں شیر و شکر ہو جاتا۔ بہت سے ادبی پرچے آنے لگے تھے، نگار کے علاوہ نیرنگ خیال، عالمگیر، ادبی دنیا، ہمایوں اور شاہکار۔ ان مجلسوں کی مستقل صدارت نیاز فتحپوری کو حاصل تھی، نگار، نگار کے مدیر، نگار کے لکھنے والے نگار بک ڈپو کی کتابیں وردِ زبان اور حرزِ جان رہتی تھیں۔ شہاب کی سرگذشت نگارستان اور گیتانجلی کی تلاوت ہوتی تھی۔ بنگلہ پر جمہوریت ادبی اور اشتراکیت ذہنی قائم تھی مگر بڑے ستھرے شریفانہ اور پُرامن انداز کی۔ نمازیں بھی باجماعت ہوتی تھیں، اور افسانہ خوانی بھی باجماعت، لیکن سنتیں اور نفلیں علاحدہ علاحدہ پڑھی جاتی تھیں۔

اسی فضا میں میری طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ سائنس کالج کی لیبورٹری میں تجربے بھی کئے جاتے رہے اور افسانہ نگاری اور غزل سرائی بھی شروع ہو گئی۔ چچی کی شفقت اور مشق سخن دونوں جاری رہے۔ میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں پہلا پہلا افسانہ لکھا جو کبھی شرمندہ اشاعت نہ ہوا۔ سُرخیٔ افسانہ تمنا تھی۔ بڑے چاؤ سے نیاز فتحپوری صاحب کی خدمت میں اپنے جگر گوشہ کو روانہ کیا ہفتہ کے اندر ہی نور چشمی سلمہٗ واپس بھیج دیئے گئے۔ نگار سے انکار وصال نہ ہو سکا۔ نیاز صاحب نے لکھا۔ افسانہ لکھنے کا اچھا میلان ہے۔ مشق جاری رکھئے۔ دل ڈوبا بھی مول اُبھرا بھی۔ لیکن میں نے

فیصلہ کرلیا کہ سائنس سے محبت پختہ کرلی جائے۔ برسوں افسانہ نہیں لکھا۔ میڈیکل کالج کے دور میں نظمیں تو لکھیں کہانی نہیں لکھی۔ ۱۹۳۰ء میں میڈیکل کالج چھوڑنا پڑا۔ میں بیمار تھا اور سون کے کنارے اردل میں حصول صحت کے لئے رہنے لگا۔ "پام دلا" کے رہنے والوں کو بھی ادبی پرچوں، افسانوں اور شعر و شاعری کا شوق تھا۔ میں دوبارہ ادب کی آغوش میں آگیا۔ ساحل سون کی فضا بھی افسانوی تھی۔ میں اپنی پہلی محبت کی طرف واپس لوٹ آیا۔ افسانہ نگاری اور شاعری باضابطہ شروع ہو گئی۔ اصغر مجیبی صاحب ایک ماہانہ رسالہ "بہارستان" ان دنوں پٹنہ سے نکال رہے تھے۔ میں نے بدگمانی اور درد پشیمانی دو افسانے اس رسالہ کے لئے لکھے۔ میرا تیسرا مطبوعہ افسانہ "نیا شوالہ" تھا جو نگار لکھنؤ میں چھپا اور میرے خواب حقیقت بن گئے۔ میری خوشی کو پر پرواز لگ گئے اور وہ پریوں کے دیس کے لالہ زاروں میں ناچنے لگی۔ میرے تینوں مذکورہ بالا افسانے رومانی دبستان کے افسانوں میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اُن دنوں میں کچھ اس طرح لکھا کرتا تھا ــــ

"کامنی بھی جبکی آنکھیں رات کو جاگ کر سحر بیدار ہو گئی،
تھکی ماندی میں اشنان کرنے آئی حسن مغموم کی
قیامت خیزیوں نے ندی کی موجوں میں بھی زندگی
پیدا کر دی اور لرزاں موجیں کامنی کے بلوریں جسم
سے ایک بار مس کر جانے کی آرزو لئے ہوئے بڑھیں
اور کامیاب ہوئیں اس لمس سے نازک نورانی لہریں
پیدا ہوئیں اور فضا میں ایک دلکش لطیف نغمہ
پھیل گیا۔" (نیا شوالہ ۔ کلیاں کانٹے)

یہ رومانی رنگ میری افسانہ نگاری کے بعد کے دوروں پر بھی جھلکا ہے مگر بس جھلک ہی۔

دو سال اردل اور اورین میں آرام کرنے کے بعد میں پھر یونیورسٹی کی دنیا میں آنکلا۔ فراڈ کا دور ختم ہو چکا تھا، میڈیکل کالج سے ناتا توڑا اور ادب و فن سے رشتہ جوڑا۔ انگریزی ادب کے مطالعہ نے مجھے مغربی افسانہ نگاروں سے ملایا۔ پہلے اسٹیونسن اور ڈگلینز نے متاثر کیا پھر ڈکنز، ہارڈی، ویلز، لارنس، ماڈم وغیرہ نے۔ فرانسیسی اور روسی افسانہ نگار بہت بھائے۔ ہر کے حسن داد نے اپنے اپنے انداز میں مجھے متاثر کیا۔ ان سب کا مجموعی اثر میرے ذہن و ذوق پر پڑتا رہا۔ اور اپنے اپنے وقت پر ابھرتا رہا۔

میں بیماری و صحت کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا ہوں۔ شفاخانوں، صحت گاہوں، غریب خانوں اور تعلیم گاہوں میں عمر کٹی۔ بیماریوں نے مجھے صحت کی بہ نسبت زیادہ پڑھنے کے موقعے دیئے۔ میں نے پریم چند، زولا، چیخوف، دوستوفسکی، ٹالسٹائی، ترگنیف، لارنس اور ماڈم کا مطالعہ بیشتر بستر علالت پر کیا ہے۔

پریم چند سے سیکھا ہے، نیاز پر ریجھا ہوں، چیخوف، ایفسکی اور ٹالسٹائی کے سامنے متحیر ہوا ہوں اور لارنس اور ماڈم کو بے حد پسند کیا ہے۔

میرے دوست زبیر احمد تمنائی اور علی اطہر نے مجھے ترقی پسند تحریک کی طرف مائل کیا۔ شرف عظیم آبادی ایک اور دوست تھے۔ وہ اس تحریک سے ہمیشہ بدظن رہے۔ وہ اور شستہ عظیم آبادی حقیقت پسندی کے گردباد سے انکا اجلا پن میلا ہوتا تھا۔ مجھے اس ادبی کشمکش سے بڑا فائدہ پہنچا۔ میں ترقی پسندی سے متاثر ضرور ہوا مگر اس تحریک پر ایمان کبھی نہیں لایا۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ سیکھتا اور سمجھتا رہا۔ میرے ۱۹۴۰ء میں شائع شدہ تنقیدی مقالے اس امر کے گواہ ہیں۔

میں نے اپنے ہمعصر اردو افسانہ نگاروں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے خصوصاً منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم اور بیدی سے۔ انھوں نے بھی میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اور ہمعصرانہ رقابت نہیں محبت کا ثبوت دیا ہے۔ ہم لوگ اب تک لکھے جاتے ہیں مگر وہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک کی دنیا اب کہاں رہی۔ اردو افسانہ نگاری کا دور زریں۔ محبت و اخوت کا عہد تابناک۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اردو افسانہ نگاری میں جمود کا قائل ہوں۔ ہم ہی سب کچھ نہیں ہمارے علاوہ بھی لکھنے والوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ اور ہمارے بعد المیہ اور طربیہ کہانیاں لکھی جائیں گی ابھی بھی بہت اچھی اچھی

کہانیاں لکھی جاتی ہیں مگر وہ تخلیق کی دس سالہ موج حیات کے سمندر میں بلند ابھری نقش کار ہوتی اور اس میں مل گئی۔ میرے افسانہ نگار رفقاء ادب بھی افسانے لکھ رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں لیکن اجتماعی موج کی کیفیت نہیں انفرادی لہر کی حالت ہے۔

میں نے آپ کو اپنی افسانہ نگاری کی کہانی سنائی ہے۔ کہانیاں ہمیشہ ادھوری رہتی ہیں۔ مختصر افسانوں میں تو ادھورے پن ہی کو فن بنا دیا جاتا ہے شاید ادب اور زندگی کا معجزہ یہی ہے کہ ذرہ کو آفتاب بنایا جائے اور لمحہ کو ابدیت میں بدل دیا جائے۔ ہمارے روایتی طرز کے خطوں میں لکھا جاتا ہے "تھوڑے لکھے کو بہت جانو" شاید یہی غرض میری بھی ہے۔ چلتے چلتے تخلیق اور نظریہ کی نسبت ضلا بھی سنا دوں تو اچھا ہے۔

ادب اور نظریہ کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور اسے ہماشما نے الجھا دیا ہے۔ ادبیات دل بہلا دے سے چلی، سچائی، سماجی، اصلاح، اخلاق سیاست، معاش اور مذہب کے راستوں اور منزلوں سے گزرتی ہوئی نفسیات اور جنسیت اور مادیت کے بادیوں میں جا پہنچی، ہم آپ سب ہمیشہ ایک سیدھ میں نہیں چلتے اور ایک سیدھ میں نہیں سوچتے پھر آدمی کے مزاج اور میلان کے دور ہوتے ہیں۔ میں بھی پیچ وخم سے گذرا ہوں اور میرا فن بھی۔ کبھی رومانیت کی نشاط افروزیوں نے مسرت بنایا اور کبھی حقیقت کے کھردرے پن نے متوجہ کیا۔ اور شعور بڑھا تو حقیقتوں کی تہوں کے اندر رومان نظر آیا۔ کبھی تصویر یمیات نے رجھایا، کبھی تعبیر زندگی نے کبھی تفسیر، کبھی تنقید اور کبھی تعدیر وجود نے۔ مجھے وقتاً فوقتاً مختلف نظریوں نے اپنی طرف کھینچا، میں بہتیروں سے متاثر ہوا ہوں لیکن کسی نظریہ کی غلامی اختیار نہیں کی۔ یہ تو ہوا ہے کہ بعض دوروں میں ایک نظریہ کی طرف زیادہ مائل رہا اور اس سے رسم و راہ بڑھ گئی۔ مگر میں نے ان تعلقات میں یہ پایا ہے کہ حسن اور یک جہتی نہیں ہوتا۔ فنکار کو حسن و صداقت کی ہر ادا سے فیضیاب ہونا چاہئیے۔ حقیقت آگاہی میں بھی نیرنگی ہوتی ہے اور جلوہ سامانی میں بھی بوقلمونی۔

فنکار کے پاس اگر ایک نظریہ ہو تو اچھا ہے، اس سے بڑا سہارا ملتا ہے، تحریک اور ارتقا کو مدد ملتی ہے۔ فن کی سمت اور رفتار متعین ہوتی ہے۔ اس میں اپج اور کاٹ پیدا ہوتی ہے۔ نیز حقیقتوں کی منقید تعبیر بھی آجاتی ہے۔ بلکہ کسی نظریہ کی تخصیص نہ کی جائے کٹرپن اور تعصب کو راہ نہ دی جائے تو سب کا بھلا ہوتا ہے۔ نظریہ کی حیثیت باطنی آنکھ کی ہے۔ نظر شعور بھی ہے اور شوق بھی یہ عقلیت بھی ہے اور محبت بھی زبردستی کی سوجھ بوجھ اور بالجبر محبت نام ہے اور محبت اور غلط بنیاد تعقل ہے۔

میں سمجھتا ہوں افسانہ نگار کو سب سے پہلے سب سے آخر میں افسانہ نگار ہونا چاہئیے۔ تخلیق کی درمیانی منزلوں میں چاہے وہ جس نظریہ سے سوز و ساز گرمی و گداز، شعور و سمت، عبرت و بصیرت، گہرائی اور صداقت، رفعت و پیغام حاصل کرے، افسانہ کو ٹھوس اور بامعنی بنانے کے لئے زندگی کا گہرا شعور ضروری ہے۔ ہمہ جہتی زندگی کا شعور پھر اس عظیم زندگی سے کچھ اپنا بنا لینے کی آرزومندی طبعی لازمی ہے۔ اور تکنیک اور ہنرمندی کی طرف خاصا توجہ کرنے سے اظہار و ابلاغ فن کی تکمیل حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ابتری اور نارسائی ہے۔ فن کی واقفیت اور بصیرت، زندگی کا وسیع، ہمہ جہتی، گہرا مطالعہ، مخصوص انداز نظر، نظریۂ حیات، دردمندی اور انسانیت دوستی، بے تعصبی اور وسیع النظری، ہنرمندی، مشق اور تکنیک پر قدرت کا افسانہ نگاری اور دوسری اصناف سخن پر کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ فنکار تجربے کرتا رہتا ہے۔ میں نے بھی موضوع اور ہیئت کی جہتوں میں تجربے کئے ہیں۔ رومانیت کے بعد میں واقعیت کی طرف آیا۔ ماحول اور حالات بھی فنکار کی سمتیں مقرر کرتے ہیں۔ میری علالت اور زندگی کی تخصیتوں نے مجھے رومان کی رنگین وادیوں سے کھردری اور تلخ حقیقتوں کی طرف لایا۔ حقیقت پسندی کا کچھ ایسا عالم تھا۔ "تبسم ایک دل دوز انوکھا تبسم، پژمردہ ملتجی، مایوس، مترجم" آج بھی میرے افق تصور میں اسی طرح پر کا سامان ہے جس طرح جیٹھ کی ایک گرم شام کو سرِ راہ ہوا تھا۔ وہ ایک مزدور تھا، عمر رسیدہ مزدور، اس کے خد و خال رسیدہ اعتبار سے بھی اس کی بہار صحت کا پتہ چلتا تھا، عضلات اگرچہ ڈھیلے تھے مگر اب بھی مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ مضبوط شانے جن پر گھٹوں کے نشانات تھے۔ استوار گردن جس پر ڈور کی طرح موٹی موٹی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ شکن آلود

پیشانی، بھدّی ہتھیلیاں اور تلوے گذشتہ سخت محنت و مشقت کا افسانہ دہرا رہے تھے۔ مگر اُس کے سراپا پر ایک غم انگیز اضمحلال طاری تھا۔ وہ ماضی کے آباد شہروں کے کھنڈر کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔" (کام ــــ منظر پس منظر)

میں نے حقیقت پسندی اور تخلیت کے ملاپ کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔ آرٹ بغیر تعبیر حقیقت کے محض رپورٹ ہے یا خبرنامہ۔

میں نفسیاتی حقیقت نگاری کی طرف بھی متوجہ رہا ہوں۔ یوں تو ابھی کردار نگاری بغیر نفسی ترجمانی کے ناممکن ہے۔ لیکن میں نے نفسی کیفیات کی تفصیل تشریح و تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس باب میں متاخرین ڈاکٹر عظیم الدین عظیم آبادی اور دوسری صف میں عسکری نے خاص طور پر گہرا کام کیا ہے۔ میں نے بوڑھی ماں، بے بسی، پس منظر، تاریک سائے وغیرہ افسانوں میں عالم نفس کے نہاں خانوں کی کھڑکیاں کھولی ہیں۔

"اتنی بڑی ہوگئی اور اوڑھنی گلے میں پیٹے پھرتی ہے، ادھر آ، ایسے یوں اوڑھتے ہیں۔ کمبخت اتنا بھی سلیقہ نہیں تجھے، ایسے تادیبی الفاظ جوشا کرہ نے آٹھ سال کی عمر میں سُنے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ اوڑھنے اوڑھنی میں مجھ پر نئی پابندیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں۔ حکم تو وہ بھول گئی لیکن حکم کی تلخی کا ایک مبہم احساس اس کے دل سے ہٹ نہ سکا۔ اس نے کئی بار کھڑکیاں تسنیں مگر وہ اوڑھنی کے اوجھاوے میں گرفتار ہونے کے لئے تیار نہ تھی ــــ (پس منظر ــــ منظر و پس منظر)

یہ سوچنا صحیح نہیں ہوگا کہ میری رومانیت کا دور ختم ہو گیا تب واقعیت کا دور آیا۔ یہ بھی ختم ہو گیا تو نفسی حقیقت پسندی کا عہد آیا اور بعد ازاں رمزیت و اشاریت کا عہد۔ افسانہ نگاری میں تدریجی ارتقا ہوا ہے مگر کوئی رنگ آہنگ، میلان یا مقصد معلوم نہیں ہوا۔ مثلاً کلیاں اور کانٹے، یہ دنیا، انارکلی اور بھول بھلیاں، کیچلیاں اور بالِ جبریل، سپنوں کے دیس میں، نقشِ قدم اور مجبّر میں بہت سی باتیں قدرِ مشترک کے طور پر ملیں گی۔ میں تاریخی سلسلے سے افسانوں کے نام لے رہا ہوں۔ اب تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میلانات کا امتزاج و ترکیب تاثیر افسانہ نگاری کے لئے بہت مفید ہے۔ رمزیت، اشاریت و معنویت کی آئینہ سامانی واضح طور پر میرے تین افسانوں میں ہوتی ہے۔ کیچلیاں اور بالِ جبریل، سپنوں کے دیس میں اور مجبّر۔

"نہ تھا کچھ تو خدا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادم ادم ادم ادم ہر طرف نور ہی نور تھا جب کہ اطراف نہ تھے اور آنکھیں کچھ نہ تھیں۔ میں اس وقت کی کہانی سُنا رہا ہوں جب ہوش گوش بھی نہ تھا، وہم و خیال بھی نہ تھے۔ راز و راز نہ تھا۔ وہ اپنے آپ پر آشکارا تھا۔ کوئی راز داری بھی نہ تھی۔ نہ صبح ازل میں کسی کو انکار کی جرأت ہوتی تھی۔ نہ روح، نہ مادہ، نہ فرشتے، نہ شیطان، اور میں بھی نہ تھا۔ نہ پانی نہ مٹی عناصر لامعلوم، مظاہر ناشہود۔ نہ سمت۔ نہ جہت۔ نہ رنگ نہ صورت، نہ لفظ نہ معنی۔ نہ تھا۔ مگر وہ تھا عدم کی رات میں سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار کا عالم تخلیق کا منتخب لا میں حسن کی جلوہ فشانی دیدنی تھی۔" (کیچلیاں بالِ جبریل) میں چاہتا ہوں آگے پاؤں راہِ عشق میں منزلِ طلب دور ہی ہوتی جاتی ہے۔ (شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

سیّد احتشام حسین

اختر اورینوی کا نظریۂ تنقید

اکثر ادیب اپنی شخصیت اور تصوّرات کے اظہار کے لئے اصناف ادب میں سے ایک یا دو صنفوں کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اُنہیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ بہت سے راستوں پر چلنا اور ہر ادبی صنف میں اپنے نقش بنانا قاری کے دل میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ لکھنے والا اپنی منزلِ مقصود سے ناواقف ہے اور مختلف راہوں میں بھٹک رہا ہے لیکن یہ بات ہر حال میں صحیح نہیں ہوتی۔ بعض ادیبوں کی قوتِ تخلیق اظہار کی مختلف راہوں سے ایک ہی منزل کی طرف جانا چاہتی ہے چنانچہ یہ بات مجھے پروفیسر اختر اورینوی کی ذات میں بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور افسانے بھی، شاعری بھی کی ہے اور ڈرامے بھی تخلیق کئے ہیں تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں اور تحقیق کی راہوں سے بھی گذرے ہیں، اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان سب میں انھوں نے اپنے گہرے نقش چھوڑے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے گا تو غالباً ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعلیٰ ترین مظہر اُن کے افسانے اور تنقیدی مضامین قرار پائیں گے۔ تحقیق ایک طرح سے تنقیدی شعور کے لئے معاون ثابت ہوگی اور شاعری افسانہ نویسی کی تخیلی فضا کو تقویت بخشے گی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اختر اورینوی کے ذہنی عمل میں تنقید اور افسانے کی شاہراہیں بھی متوازی چلنے کی بجائے ایک ہی مرکزِ خیال کی طرف جاتی ہوئی نظر آئیں گی جسے ہم حسن، خیر اور حقیقت کی جستجو کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ اس مختصر سے مقالہ میں اختر اورینوی کے تنقیدی تصورات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ بنیادی افکار کو سمجھنے کی کوشش بھی کی جائے گی جن سے اُن کے نظریاتِ فن کی تخلیق ہوئی ہے۔ انھوں نے مختلف مقامات پر اپنے تنقیدی اصول اور نظریوں کی وضاحت اس طرح کر دی ہے کہ اُن کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں پیدا ہوتی۔ انھوں نے تنقید کی طرف توجہ ۱۹۳۶ء کے بعد کی۔ اور چند سال کے ایک معمولی وقفہ کو چھوڑ کر جسے ذہنی تعمیر کا زمانہ کہا جا سکتا ہے اُن کے خیالات ہمیشہ بڑے واضح انداز میں ایک ہی سمت میں بہتے رہے ہیں۔ اپنے ایک مجموعۂ مضامین کے دیباچہ میں اختر اورینوی نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں "بنیادی اور مجموعی طور پر آج بھی میرے خیالات وہی ہیں۔ (غالباً ۱۹۶۲ء میں) جو اُن مقالوں کے لکھنے کے وقت تھے مگر خیالات کے بعض پہلو بدل گئے ہیں۔ میں ادب و شعر کی تخلیق میں سماجی میلانات اور ماحول کی معروضیت اور مزاج کی اہمیت کو آج بھی تسلیم کرتا ہوں لیکن اب میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس عمل میں انفرادی قوتِ تخلیق و تعمیر کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ اس پہلو پر تاکیدی نشان لگائے . . . . . ادب میں رفیع مقصد کا ہونا بہت ہی اہم بات ہے مگر اس کے اختراعی اور جمالیاتی مطالبوں کا پورا کرنا فنکار کا فرضِ اولین ہے۔" یہ بات اختر نے مختلف شکلوں میں بار بار دہرائی ہے اور بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ فنکار کے انفرادی میلانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انھوں نے متعدد مضامین اسی خیال کو واضح کرنے کیلئے لکھے ہیں۔

ادب میں تبدیلی اور تغیر فطری اور لازمی ہے اور تغیر زندگی کا ایک ناگزیر عمل ہے۔ ادب اپنی پیدائش اور کام کے لحاظ سے سماج، مذہب، سیاست ہر ایک سے اثر قبول کرتا ہے، شاعر اور ادیب اپنے ماحول کی زندہ عکاسی کرتا ہے اور بدلتے ہوئے ماحول کی ترجمانی سے کسی وقت غافل نہیں رہتا۔ ان خیالات کی موجودگی میں ادیب اور شاعر کے انفرادی میلانات کو اہمیت دینے سے وہ توازن پیدا ہوتا ہے جس کو پیشِ نظر رکھے بغیر شعر و ادب سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی عہدِ جدید کے ان تقاضوں کا شعور رکھتے ہیں جن میں نہ تو بھٹکی ہوئی انفرادیت ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کر سکتی ہے اور نہ کوئی ایسا سماجی نظام تسلط حاصل کرتا نظر آتا ہے جو فرد کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے؛ سائنس، عمرانیات، مذہب، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کی مختلف شاخوں کے وسیع مطالعہ نے ان کے سامنے زندگی کو ایک تجربۂ بے کنار کی شکل میں پیش کیا ہے جس میں یہ مختلف مظاہر الگ الگ بھی نظر آتے ہیں اور مل جل کر ایک ایسے نقش میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں جس کا حسن اپنی الگ کیفیت رکھتا ہے چنانچہ ان کے اکثر تنقیدی مضامین میں بھی تخلیقِ ادب کی اسی پیچیدگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان کا ایک بہت ہی اہم مضمون "ادب و فن کی بنیادی قدریں" (جو "قدر و نظر" میں شامل ہے) اس نقطۂ نظر کی بہت واضح ترجمانی کرتا ہے۔ اس مضمون کو ان کے نظریۂ فن کا ایک ادبی منشور کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں نہ صرف علمی حیثیت سے مختلف فنونِ لطیفہ کی باطنی ساخت اور بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے بلکہ اظہارِ خیال نے عقیدہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جگہ جگہ پر ایک ایسے خطیبانہ جوش کی جھلک ملتی ہے جو اپنے نقطۂ نظر پر یقین اور اعتماد کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔

اختر کے مختلف وقتوں میں لکھے ہوئے مضامین کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے مزاج کی لطافت اور ذہن کی قوتِ تخلیق حقائق کا احساس کرنے کے بعد ایک عالمِ مثال کی جستجو میں نکل کھڑی ہوتی ہے جہاں وہ ادیب اور شاعر سے حسن کے بکھرے ہوئے جلووں کو ایسے منظم انداز میں پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں جو حسن کو بقائے دوام عطا کرے۔ اختر کے خیال میں ذوقِ حسن عطیۂ فطرت ہے اور اگرچہ حسنِ مطلق تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی لیکن اس کا ذوقِ جمال اسے حسن کے گیت گانے کے لئے مجبور کرتا ہے اور اظہار کے جو دوسرے ذرائع اس کے پاس ہیں ان سے کام لے کر وہ جلوۂ حقیقت کو جسمِ مجاز عطا کرتا ہے۔ یہاں جس مثال پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اختر کے بنیادی افکار کا جزو ہے۔ بہت سے مغربی علماء کی طرح وہ بھی مذہب اور آرٹ کو ایک ہی سرچشمۂ فیض سے متعلق سمجھتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی اور حقیقی تعلق وجدان سے ہے اور دونوں کا سرچشمۂ فیض جمالیاتی تجربے ہیں۔ آرٹ میں ہیئت کا وہی مقام ہے جو مذہب میں شریعت کی جگہ۔ اور اول الذکر میں فنی تجربہ کی وہی کیفیت ہے جو ثانی الذکر میں طریقت یا باطنی تجربہ کی۔ لطیف و حسین باطنی تجربے آرٹ اور مذہب کی روح ہیں ..... اسی منزل سے صوفی، نور و سرور حاصل کرتا ہے اور صناع میتھو آرنلڈ کے اسکالر جپسی کی طرح اسی شرارۂ سماوی سے سوز و نغمہ پاتا ہے۔ حسن ہی مذہب اور آرٹ کی بنیادی قدر ہے اور اسی سے خوبی اور محبت کا وجود ظاہر ہوتا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ فن کے اعلیٰ تجربے ایک طرح کے روحانی تجربوں سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن شاید ہر شخص اس بات کو تسلیم نہ کرے کہ مذہب کی باطنیت فن کی باطنیت سے وہی مماثلت رکھتی ہے جس کی طرف اس عبارت سے ذہن منتقل ہوتا ہے۔ غالباً اختر کا یہ مقصد بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جہاں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ "خود مذہب فنونِ لطیفہ میں لطیف ترین فن ہے"۔ وہیں وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ آرٹ کی ایک بنیادی قدر عشق بھی ہے جو حسن کاری کا محرک بنتا ہے۔ اسی لئے اس کے دائرہ میں جہاں مسجدِ قرطبہ اور گوتم بدھ کے مجسمے آتے ہیں وہیں اسٹالن گراڈ کی جنگ کی داستان، شاہنامہ، خمریاتِ خیام اور عریانیاتِ امرء القیس بھی۔

اختر اورینوی نے اپنے چند مضامین میں اپنے نظریۂ تنقید کو بڑی گہری اور فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جو شخص ان کے اس قبیل کے مضامین کا مطالعہ کرے گا اسے بالکل شبہ نہیں

باقی رہ سکتا کہ وہ تنقید کو محض ایک ذوقی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ مضامین ہیں تبلیغ اور قدریں، ادب اور نفسیات، تخلیق و تنقید، ادب و فن کی بنیادی قدریں، فن اور ماحول، ادب میں روایات اور تبدیلیاں اور ترقی پسند ادب، ان میں سے ہر مضمون ان بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ادب کا مطالعہ کرنے والے کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کہیں کہیں اپنے خیالات جذباتی انداز میں ظاہر کئے ہیں لیکن اُن کے پیچھے گہری علمی بصیرت اور زبردست مطالعہ سے پیدا ہونے والا شعور ہے کیونکہ جب وہ تنقید نگار کی ذمہ داریوں کی گفتگو کرتے ہیں تو اس توازن کو برقرار رکھتے ہیں جس میں ادب اور ادیب سے ہمدردی کے باوجود صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کو فرض شناسی سے غفلت قرار دیا جائے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "نقاد کا فرض ہے کہ وہ کاذبوں کے کذب سے ادب کو آگاہ کرتا رہے۔ ادبی گمراہیوں، خطاکاروں، خطاکوشوں اور باغیوں پر نگاہ رکھنا بھی اس کا کام ہے۔ ۔۔۔۔۔۔ غیر جانبداری بھی ایک اہم اصول تنقید ہے اور یہ بھی وسعت تخیل اور [illegible] ہمدردیوں سے حاصل ہوتی ہے۔"

اختر ادب میں نصب العین کے بھی قائل ہیں اور یہ نصب العین اُن کے نقطۂ نظر سے اخلاقی اجتماعی کی روح کا پیش کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ادب کو تبلیغ کا آلۂ کار بنانے کے مخالف ہیں حالانکہ اگر ادب تبلیغی مقصد کو اجزائے حسن و لطافت کے ساتھ شیر و شکر کرکے پیش کرے تو وہ اُسے جمالیاتی اصولوں کے منافی نہیں سمجھتے چنانچہ ایک جگہ وہ ادب پر امریکی اثرات اور روسی اثرات دونوں کو اس لئے انتہاپسندی سے تعبیر کرتے ہیں کہ دونوں کے پیچھے سیاسی پروپیگنڈے کی مشین حرکت کر رہی ہے۔ لیکن اگر کوئی ادیب کسی مخلصانہ تحریک کی بناء پر کسی ایسے موضوع کو بھی فن پارے کی شکل میں ڈھالتا ہے جو بظاہر تبلیغی یا سیاسی نظر آتا ہے تو وہ خلوص اور حسن کاری کی بناء پر اسے ادبیات کے دائرہ میں شامل کر لیتے ہیں۔ اپنے کئی مضامین میں انھوں نے جبلت جمال کو فن کی بنیادی قدر قرار دیا ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ یہی قدر فن کے اندر حسن اور اثر پیدا کرتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

"مخلصانہ تحریک و القا کا مصدر پوری کائنات ہو سکتی ہے اُس کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے، پھول یا تارے، کوٹھے کی کامنی یا زلف شبگوں، سبزہ زار یا ریورڈوم، مسجد قرطبہ یا کوریا، بھوک یا جزیرہ بالی کا رقص، بنگال کا قحط یا صبح بنارس، شرط یہ ہے کہ اُن کا جذباتی، تخیلی، جمالی، صناعانہ، موزوں مترنم، حسین اظہار فن پارے میں ہو" حقیقت یہ ہے کہ اختر نے اپنے تمام نظریاتی مضامین میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ادب میں حسن اور صداقت دونوں کا موجود ہونا لازمی ہے ادیب اور شاعر کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے سچے تجربات کو حسین انداز میں پیش کرے۔

تنقید جدید کا یہ ایک بہت ہی اُلجھا ہوا مسئلہ ہے کہ موضوع اور اظہار کو کس طرح خالص ادبی اور جمالیاتی قدروں کے ذریعہ سے پرکھا جائے، کیونکہ خود زبان اور اسلوب خیال کے تابع ہو جاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ موضوع کی عظمت اور حسن ہی سے زبان کے تخلیقی استعمال کے لئے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اختر نے اس نکتہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور مختلف شکلوں میں اظہار کی پیچیدگیوں اور اسالیب کی رنگا رنگی کو صناعت اور حسن کاری کا جزو قرار دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی کا ذہن وجود انسانی کو ایک اخلاقی نظام کے تابع لانا چاہتا ہے اور اُن کا دل جمال پرستی کو فن کا بنیادی وصف قرار دینے پر مُصر ہے۔ اس کشمکش سے اکثر فنکاروں کو سابقہ پڑتا ہے اور اسی کی توجیہہ اور تاویل سے وہ ایک ایسا نظریۂ فن ترتیب دے لیتے ہیں جس میں دونوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے۔ یہ کچھ ویسی ہی بات ہے جیسے قلب تو مومن ہو اور دماغ کافری پر آمادہ ہو۔ تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ اس کشمکش کے بغیر فن وجود میں بھی نہیں آ سکتا۔ کبھی دل جیت جاتا ہے اور کبھی دماغ لیکن جہاں کہیں یہ دونوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں وہاں اعلیٰ ترین فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ اختر اپنے نظریۂ تنقید اور نظریۂ فن میں اسی نصب العین کی جستجو کرتے ہیں۔

اُوپر کی سطروں میں اختر اورینوی کے نظریۂ فن کا ایک مجمل خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ایک تنقید نگار کی حیثیت سے

اُن کی کامیابی کا راز اس بات میں بھی پوشیدہ ہے کہ وہ ان نظریات کو نہ صرف اپنے افسانوی اور شعری کارناموں میں پیش کرتے ہیں بلکہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی فنکاری کا جائزہ لیتے ہوئے بھی انہیں سے کام لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا خوبصورت مظہر اُن کا آخری مجموعۂ مضامین معراج و منہاج ہے۔ اُس میں اختر اورینوی نے جن شعراء کا جائزہ لیا ہے اُن میں سے ہر ایک کے اندر انھوں نے حسن و اخلاق کی اُنھیں قدروں کو ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے جن سے اُن کے نظریۂ فن کے تانے بانے تیار ہوئے ہیں۔ خاص طور پر شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی اور انداز نظر، جمیل مظہری کی غزل نگاری، پرویز شاہدی کی فنکاری، اور اجتبیٰ رضوی کی شاعری، اُن کی عملی تنقید کے دلکش اور اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے تنقیدی انداز نظر کی جلوہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ شاعر کی اس انفرادیت کا سراغ لگائیں جو اپنے ذاتی جمالیاتی تجربوں کو اپنے فنی ڈھانچوں میں ڈھالتی ہے جو تاثیر سے لبریز ہیں۔ یہ تاثیر خود اختر کی تحریروں میں موجود ہے کیونکہ ان کا ذہن تخلیقی ہے اور وہ محسوس کرکے لکھتے ہیں۔ گو اُن کے چند مضامین ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں لیکن مجموعی طور سے اُن کا انداز بیان دلکش، اُن کے تجزیے عالمانہ اور اُن کے اصول ادبی ہیں۔ تنقید جدید نے اپنے سر یہ ذمہ داری لے رکھی ہے کہ وہ ذوق اور شعور کا تجزیہ ہی نہ کرے بلکہ ادبی ذوق کی تربیت میں بھی مدد دے، اختر اورینوی کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے والا اسے محسوس کرے گا کہ وہ اس ذمہ داری سے باخبر ہیں اور پڑھنے والے میں صحیح اور صحت مند ذوق تجسس پیدا کرتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اُن کے نظریات تنقید محض ادبی مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اُس کے سوتے اُن کے تصورِ حیات سے مل جاتے ہیں جو کائنات کو حسین اور متوازن دیکھنے کا متمنی ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

اخترؔ اورینوی کا ادبی مقام

ڈاکٹر اخترؔ اورینوی میرے کرمفرماؤں میں سے ہیں ان سے میرا تعارف غالباً ۱۹۵۲ء میں ہوا تھا، لیکن اس سے پہلے سے میں انھیں ایک ادیب کی حیثیت سے جانتا تھا، اس وقت ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ تو نہیں تھی، تاہم ان کے مضامین اور ان کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا مصنف بہت ہی اچھی ادبی صلاحیتوں کا حامل ہے

اس کے بعد مجھے پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا، پروفیسر حسن عسکری میرے ساتھ تھے اور انھوں نے ہی میری رہبری چھجو باغ میں، ڈاکٹر اخترؔ کے گھر تک کی، پروفیسر عسکری اور میں، لکھنؤ سے اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے بعد پٹنہ گئے تھے، جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ فارسی، ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میرے پٹنہ کے سفر کا مقصد جناب عماد تمنائی صاحب کے مملوکہ ایک قدیم مخطوطے "صراط مستقیم" کو دیکھنا تھا۔ اس مخطوطے کا تذکرہ میں نے پروفیسر حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخ اردو" میں پڑھا تھا۔ اسے دیکھنے کی مجھے خواہش تھی، اور اس سلسلے میں میں نے اخترؔ صاحب سے مراسلت کی تھی۔

صبح اسٹیشن سے ہم سیدھے، اخترؔ صاحب کے مکان پر پہنچے، تو میں نے دیکھا کہ ایک متعارف "کمسن ادیب" سے میں متعارف ہو رہا ہوں، اخترؔ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی عمر کو چھپا کر دکھاتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت کی نفاست سے ان کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم پہلی ہی ملاقات میں مجھے احساس ہوا کہ

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی!

اور اب چند ہی سال کے اندر میرے قیافے کی تعبیر مل گئی۔ ڈاکٹر اخترؔ اورینوی نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اردو کی صفِ اول کے لکھنے والوں میں جگہ پیدا کر لی ہے۔ تنقید اور تخلیق دونوں میں ان کا پایہ بلند ہے، "بہار میں اردو زبان اور ادب کا ارتقا" ان کا اہم کارنامہ ہے بہار کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ہم کو معلومات تھیں، لیکن چیدہ اور غیر مربوط۔ اس کتاب کے ذریعہ پہلی دفعہ ہم بہار میں اردو زبان اور ادب کے ارتقا کی مربوط اور تعمیری تفصیل سے واقف ہو سکے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں پٹنہ میں تھا، اخترؔ صاحب سے ان کی اگلی ادبی تجویز کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ ان کا خیال بہار کے اردو ناول نگاروں کے بارے میں تحقیق کرنے کا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان کی مستعدی، تلاش اور جستجو کی صلاحیتوں کے مدنظر بہار کے سارے ادب کا جائزہ شاید زیادہ موزوں ہو گا۔ یہ بنیادی کام انجام پائے تو بعد کے لکھنے والے الگ الگ شعبوں پر زیادہ شرح و بسط سے کام کر سکیں گے۔

بہر حال آغاز کسی طرح ہوا ہو لیکن ایک ضروری اور اہم کام کی تکمیل ہو گئی، اب ہمارے ادیب، مختلف شعبوں، جیسے زبان، شاعری افسانہ نگاری، ناول صحافت پر الگ الگ کام انجام دے سکتے ہیں۔

اس کتاب اور غالباً ان کی تصنیف "نئی تحقیق"[1] میں پیش کردہ بعض بعض نظریے میرے لئے خاص طور پر جاذب نظر رہے۔ ڈاکٹر اخترؔ نے لکھا ہے کہ ریختہ کی نشو و نما کسی مخصوص مقام کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ مختلف صوبوں میں، جہاں جہاں فارسی بولنے والے بڑی تعداد میں گئے ریختہ کا ہیولیٰ تیار ہوا۔

[1] "غالباً تنقید جدید" مراد ہے "نئی تحقیق" کے عنوان سے اخترؔ صاحب کی کوئی تصنیف نہیں (ادارہ)

نئے خیال ہمیشہ ساری تفصیلات کے ساتھ ذہن میں نہیں آتے بلکہ اجمالی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس اجمال کو بعد کے لکھنے والے تفصیل کی صورت عطا کرتے ہیں۔ تمیز کے پالی کے بارے میں اجمالی اشارہ کے ساتھ یہی ہوا۔ لسانی مسائل میں شواہد اور استدلال کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، یہ لسانی مسئلہ بھی ہمارے لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے علما کے لئے تحقیق اور تلاش کا باب بن سکتا ہے۔

نئی تحقیق " میں ڈاکٹر اختر کے بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں۔ جن میں پہلی دفعہ، اردو میں دراوڑ زبانوں کی زیریں تہ (SUB STRATUM) کی طرف اشارے ملتے ہیں، انگریزی میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔

یہ موضوعات تنقید کے مقابلے میں شاید زیادہ خشک ہیں، لیکن ان سے زبان کے بنیادی مسائل پر روشنی پڑتی ہے اس لئے ان کی چھان بین میں جو وقت اور توانائی صرف جاسکے، وہ ضائع نہیں جائے گی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی اچھے افسانہ نگار بھی ہیں، اور تنقید میں تو انہوں نے ایک مقام حاصل کر لیا ہے یہ ان کے ایسے کارنامے ہیں جن کی بدولت وہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ابھی علم و ادب کے وسیع میدان ان کی صلاحیتوں کے سامنے ہیں۔

بقیہ:- حسرت تعمیر ایک مطالعہ

ہم سے ہر صاحب نظر، صاحب فکر و فن، صاحب حل و عقد کے دلوں میں یہ لگن پیدا کرتی ہیں کہ ہم خواہ کسی سیاسی نظریئے، کسی مذہب و ملت کسی رنگ و [illegible] کے کیوں نہ ہوں۔ ہمارا بنیادی مقصد خدمت خلق ہے ہو سکتا ہے۔ کہ ہماری آرزوئیں ہماری زندگی میں پوری نہ ہوں۔ ہماری آرزوئیں ناکام رہ جائیں۔ ہمیں منظری کی طرح اسپتال میں ادھورے کام چھوڑ کر دم توڑ دینا پڑے لیکن ہمارے عزم کو دم نہیں توڑنا چاہیے

حسرت تعمیر میں ناول نگار کے یہ نظریئے روز روشن ہیں۔ ہم جب اس ناول کو پڑھ کر اس کے کیفیات پر غور کرتے ہیں۔ تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور یہ ناول نگار کی بڑی کامیابی ہے اس نے ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے۔ لیکن اس کی دنیا کی زندگی پیچ بن کر ہمارے سامنے نہیں آتی ہے۔ مولانا حالی نے مجالس النسا میں لکھا ہے کہ علم بادشاہ ہے اور ہنر اس کا وزیر ہے۔ جیسے بادشاہ بغیر وزیر کے نکما ہوتا ہے اسی طرح علم بغیر ہنر کے دنیا میں کچھ کام نہیں آتا۔ اس ناول میں علم اور ہنر یعنی تجربہ اور بصیرت دونوں کی حسین آمیزش نے مل کر "حسرت تعمیر" کا روپ دھارا ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

اُردو تنقید میں اعتدال و توازن کی ایک مثال

اُردو میں تنقید کا وجود اصلی ہو یا فرضی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بعض تاریخی و سماجی اسباب کی بنا پر اعصاب زدگی اور ایک سُرا پن ہمارے ادبی و تنقیدی مزاج کا خاصّہ رہا ہے۔ مدرسانہ اور مکتبی قسم کی بے ضرر تصنیفات و تالیفات کو اگر ہم دائرۂ تنقید سے خارج بھی کر دیں تو بھی ہماری جدید تنقید اپنی تمام تر افادیت کے باوجود بُت پرستی و بُت شکنی، مجادلہ و مناظرہ، مدح سرائی و ہجو نگاری، تبلیغ و اشتہار، وعظ و تلقین، تہدید و تنبیہ اور سنسنی خیزی و دہشت انگیزی کے حصاروں سے کم ہی باہر نکل پاتی ہے۔ اختر اورینوی دورِ حاضر کے اُن معدودے چند نقادوں میں ہیں جنھوں نے ان تمام تاثرات و تعصّبات سے بلند ہو کر اپنے ادبی مزاج کی تربیت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی تحریریں اعتدال و توازن کی ایک خوشگوار مثال پیش کرتی ہیں۔ وہ نہ روایت زدہ ہیں اور نہ روایت سے رو گرداں۔ انھوں نے قدیم اور جدید کا مطالعہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور مشرق و مغرب کے علمی اور ادبی سرمائے سے صالح طور پر استفادہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے تنقیدی مضامین خواہ وہ اصول و نظریات سے متعلق ہوں یا اشخاص و افراد کے تجزیہ و محاکمے سے تعلق رکھتے ہوں بالعموم اِس افراط و تفریط سے محفوظ ہیں جس سے ہمارے اکابرینِ تنقید کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔ اختر اورینوی کا جو تنقیدی کام ہمارے سامنے ہے۔ اُن میں مطالعۂ اقبال اور مطالعۂ نظیر کے علاوہ کہ وہ مستقل تصانیف ہیں اُن کے تنقیدی مجموعے کسوٹی، تنقید جدید، قدر و نظر اور مزاج و منہاج اُردو زبان کے سرمایۂ تنقید میں دیرپا حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ اُن نقادوں میں نہیں ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ادبی حلقوں میں فتنہ و فساد اور بحث و تمحیص کے دروازے کھول کر گرمیٔ بازار کا سامان فراہم کیا ہو یا بعض رجحانات و تحریکات کی پشت پناہی کے لئے نزاعی یا دفاعی مضامین لکھ کر سرخروئی حاصل کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی گروہوں میں کم سے کم زیرِ بحث رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسی سبب سے اُردو تنقید کا جائزہ لینے والوں کے ذہن سے کبھی اُن کا نام اکثر و بیشتر اُتر گیا ہے۔ "غزل کی گردن بے تکلف مار دینی چاہیے"۔ یا "اُردو شاعری میں کیا ہے محض چند جھلیاں اور چند پُرزے" قسم کے بیانات کو اہم تنقیدی فیصلے سمجھ کر اس کی موافقت و مخالفت میں ہم اپنی قوت اتنی صرف کر دیتے ہیں کہ ہمیں یہ فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہم لوگوں کی قدر کرنا سیکھیں جنھوں نے اُردو زبان کے قدیم و جدید اسالیب و رجحانات کے بارے میں معقول اور مناسب رائیں دی ہیں اور جن کی روشنی میں ہم ادب کا ایک جامع اور متوازن تصوّر قائم کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے اُوپر کے چند فقروں سے یہ گمان ہو کہ میں نے یہ خصوصیات فرض کر لی ہیں اور میں کسی خوش فہمی یا خوش عقیدگی کی

بنا پر انہیں اختر اورینوی سے منسوب کردہ اصول وسمائے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض عناصر کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے جنھیں پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔

اختر اورینوی بھی ہمارے اُن ادیبوں میں ہیں جنھوں نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اس وقت روایت اور جدیدیت، افادیت اور جمالیت، مارکس اور فرائڈ، غزل اور نظم قسم کی بحثیں چل رہی تھیں۔ رجعت پسندی و ترقی پسندی مشرقی زندگی اور مغربی زندگی کے خطابات تقسیم کئے جا رہے تھے۔ اُن کے ہمنام اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" نئی ادبی تحریکات کی بنیاد بن چکا تھا اور اُس کے اثر سے ہمارے یہاں ایک طرف روایت پرستی پر اصرار بڑھ رہا تھا تو دوسری طرف ماضی کے ادب کو جاگیردارانہ عہد کی زوال پذیر قدروں کا نمائندہ سمجھ کر اس سے بغاوت کی جا رہی تھی۔ ایک طرف ہیئت پرستی دوسری طرف مواد پرستی اس زمانے میں اختر اورینوی نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ آج بھی قابل غور ہیں۔

"روایات اگر ادب کا مکمل ڈھیر نہیں تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ضرور ہیں۔ آئندہ ہونے والی ترقیاں اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں۔ ہر ادب چند خصوصیات ورثہ میں حاصل کرتا ہے۔ یہ روایتی خصوصیات ایک فضا پیدا کر دیتی ہیں اور مستقبل میں نقش ہونے والی تصویریں اس فضا سے ایک خاص دشت رکھتی ہیں۔ ماضی کے خطوط و دوائر مستقبل کے رنگ و روغن سے کم اہم نہیں۔"

"ادبی تبدیلیاں ضروری، لازمی، فائدہ رساں اور فطری ہیں۔ چونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا جب کبھی آثار حیات میں تبدیلی ہوگی ادب اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ اگر ادب سے تبدیلیوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو وہ آثار قدیمہ میں شامل کئے جانے کے قابل ہو جائے اور اس کے اوراق کتب خانوں کے بجائے عجائب خانوں کی زینت بنیں۔ تبدیلیاں ادب میں لچک پیدا کرتی ہیں۔ لچک زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جمود حیات کے منافی ہے۔"

"بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی نظریئے کی پیروی کے جنون میں مبتلا ہو کر ہمارے سرمایۂ ادب کے کسی حصے کو رائیگاں کر دینا چاہتے ہیں مثلاً وہ خالصے جو عربی اور فارسی الفاظ کو ہندوستانی زبان سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو غزل گوئی کے خلاف علم جہاد بلند کئے ہوئے ہیں یا وہ گروہ جو فارسی عربی اور عبرانی تلمیحات یا ایرانی تشبیہات و استعارات سے متنفر ہے۔ وہ لوگ بھی حدود جدید اندیش ہیں جو فصاحت کے جنون میں مبتلا ہو کر سیلے ہندی شبدوں کو ادب کے سرمایئے سے نوچ کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔"

"تلمیحات و قصص کے متعلق عرض ہے کہ جس طرح ہماری زبان عربی، ایرانی و عبرانی سرمائے سے فیضیاب ہے بالکل اسی طرح انگریزی ادب یونانی و رومی ضمیمات و اساطیر سے بھرا پڑا ہے۔"

"ایک گروہ ادبا روایت کی پونجی لٹانے پر تلا ہوا ہے کہ اب اس گروہ کی نئے جو تبدیلیوں کی نئی لعنت میں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ یہ لوگ اسلاف کی ہڈیوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ نئے خیالات، نئے رجحانات، نئے اسالیب اور نئی طرزوں کو بغاوت و طغیان کا نام دیتے ہیں۔ یہ لوگ اُردو ادب کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ زمانہ خود انھیں فنا کر کے رکھ دے گا۔"

(ادب میں روایات اور تبدیلیاں)

اب اسی زمانے کا ایک اور مضمون دیکھیے ''وہ جو ترقی پسند ادب'' پر ہے۔

''زمانے کے ردوبدل نے زندگی کے پرانے معیاروں پر نظر ثانی کی ضرورت ناقابل انکار طور پر ثابت کر دی ہے۔ رواں دواں زندگی ہمیشہ نئے مسئلے پیدا کرتی ہے اور پھر ان مسائل کا حل سوچتی اور انھیں بروئے کار لاتی ہے۔ حیات کے خصائص میں تسلسل بھی پایا جاتا ہے اور انقلاب بھی زندگی اپنی بنیادی خصوصیات پر قائم رہتے ہوئے بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ حرکت و ترقی زندگی کا بہت بڑا مظاہرہ ہے۔ ادب مظاہر زندگی میں سے ایک مظہر ہے۔ ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ زندگی کے بطن سے جنم لیتا ہے اور اسی کی آغوش میں پروان چڑھتا ہے۔ لہٰذا ادب کا زندگی اور مظاہر زندگی سے متاثر ہونا ضروری ہے۔''

''مگر ادب کے نصب العین رکھنے کے یہ معنی نہیں کہ ادب اور پروپگنڈہ ایک ہی چیز ہے۔ ادب ایک کامیاب پروپگنڈہ ہو سکتا ہے مگر ہر پروپگنڈہ ادب نہیں ہوتا۔ خالص پروپگنڈہ ادب نہیں ہوتا۔ خالص پروپگنڈے میں وہ حسن کاری نہیں ہوتی جو ادب میں پائی جاتی ہے۔ سخن ہائے گفتنی جب جمالیات سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو مقصدی ادب پیدا ہوتا ہے۔ ادب ایک صناعت ہے۔ لہٰذا یہ جمالیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ لطافت اور حسن کاری ادب کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔ محض بے جان سی چیز ہوتی ہے۔''

''ترقی پسند ادیبوں کے لئے فن اور ترکیب فن سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قدیم ادب العالیہ کے بہترین نمونے اور شہکار ہمارے لئے رہبری کا کام کر سکتے ہیں۔ گذشتہ تہذیبوں کی ساری اچھائیاں ترقی پسند ادب کے لئے بہت بھی قیمتی ورثہ ہیں۔''

''ترقی پسند ادیب کے لئے ایک اور مسئلہ نہایت ہی نازک ہے۔ پیام اور نصب العین کو اشتہاری یا تبلیغی طور پر نہیں پیش کرنا چاہئے۔ زندگی کی رواں دواں اور محسوس حقیقتوں کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔ اشتہاری ادب پیدا کرنا آسان ہے مگر ادب کو اس طرح برتنا کہ اس کے ذریعہ زندگی کا جسمانی اور روحانی اکسرے ہو جائے اور پھر بھی دل کی دھڑکن، خیالات کی پرواز اور اعضا کی حرکت قائم رہے بڑی کٹھن بات ہے۔''

''ترقی پسندی کو اتنا ہی وسیع ہونا چاہئے جتنی حیات حاضرہ وسیع ہے۔ ترقی پسندی کا تقاضا صرف یہ نہیں کہ وہ بھوک، افلاس اور جنسی کمزوریوں کو پیش کر دے بلکہ انسان کے سارے جذبات اور لامحدود تخیلات کو موجودہ پینٹنگ میں پیش کرنا بھی حقیقت نگاری ہے۔''

''ہمارے ادبا تجربات کو زندگی کا قالب نہیں بخش پاتے۔ اُن کے تجربے ننگے اور بے جان ہوتے ہیں۔ صرف نعرۂ انقلاب یا جلوس کی صداؤں کو ادب نہیں کہتے۔ واقعات کا سرسری بیان، اخبار کی رپٹ تو ہو سکتا ہے مگر یہ ادب کہلانے کا مستحق نہیں۔''

''ہر عبوری دور کی ابتدا میں ادب عالیہ سے زیادہ اشتہاری ادب پیدا ہوتا ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ خود مسائل حیات و مسائل ادب سے واقفیت حاصل کرے اور اپنی رہنمائی کے ذریعہ اصلاح ادب اور اصلاح زندگی میں حصہ لے۔ نئے پیدا ہونے والے رجحانات کی تنقید و تہذیب، اُن کی کاٹ چھانٹ اور اُن کی تنظیم باقی رہنے والی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ حیات اور ادب کے رجحانات کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑنا مزاج اور تباہی پیدا کرتا ہے۔ ہنگامی مزاج کی نہیں نئے راج کی ضرورت ہے۔''

ان طویل طویل اقتباسات کے لئے کسی معذرت کی ضرورت اسلئے نہیں کہ ان خیالات سے ہماری تنقید کا ایک قابلِ ذکر پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس نوع کا نقطۂ نظر پیش کرنے والوں کو ہم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان کے خیالات نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوتے۔ اور اسکے برعکس ان تنقیدوں کو فروغ ہوا جن کے لکھنے والوں نے ترقی پسند ادب کے نام پر لکھی ہوئی ہر تحریر کو ادب سمجھا اور انہیں دستاویز سمجھ کر پڑھا۔ ان کی بنیاد پر ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کو اہمیت دی گئی۔ ادب کے جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے اور ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت محض ان کے مواد کو پیش نظر رکھنے کا نتیجہ جس شکل میں رونما ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

اس موضوع کے تمام نظریاتی اور اصولی مضامین میں اختر اورینوی کے یہاں یہی سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ انھوں نے فن کے رموز و اسرار کا کلی طور پر مطالعہ کیا ہے اور اس کے ہر پہلو پر ان کی رائیں بہت سنجی تلی ہیں۔ "فن اور ماحول" "افسانہ فنی نقطۂ نظر سے" "افسانے میں عقدہ" "افسانے میں حقیقت طرازی و مثال نگاری" "ڈراما فنی نقطۂ نظر سے" "ادب اور نفسیات" "تخلیق و تنقید" "ادب اور فن کی بنیادی قدریں" "جبلتیں اور قدریں" یہ وہ مضامین ہیں جو اردو کی اصولی اور نظریاتی تنقید میں آج بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ان مضامین کا محرک کوئی فوری جذبہ یا مقصد نہیں بلکہ ان میں وہ تصورات پیش کئے گئے ہیں جو ادب کے گہرے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی اپیل صحافتی نوعیت کی نہیں ہے اور نہ ان میں کوئی تہلکہ برپا کرنے والے خیالات ہیں لیکن ادب کا کوئی طالب علم جب بھی ادب کے بارے میں کوئی معقول اور سنجیدہ نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہے گا تو اس کو ان مضامین سے بہت مدد ملے گی۔

اختر اورینوی ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے انگریزی یا اردو ادب کے چند نمونے سامنے رکھ کر ہی اپنی تنقید کی عمارت کھڑی کی ہو۔ انھوں نے سائنس و فلسفہ، تاریخ و عمرانیات، سیاست و مذہب اور دیگر متعلقہ علوم پر بھی دسترس حاصل کی ہے اسلئے انکی تنقیدوں میں وزن اور وقار ہے اور ان کے یہاں وہ حکیمانہ بصیرت ملتی ہے جو تنقید کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ان کی تنقیدیں تاثراتی انشائیے، یا عدالتی فیصلے نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں وہ تنظیم ملتی ہے جو سائنٹفک تنقید کی خصوصیت ہے۔ ان کا مضمون "جبلتیں اور قدریں" اس اعتبار سے اردو تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس میں انھوں نے تمام علوم سے استفادہ کرکے بہت مدلل طور پر مارکس اور فرائڈ کے پیروؤں کے انتہا پسندانہ نظریۂ ادب اور نظریۂ جمال کی تردید کی ہے۔ اور ادب کی بنیادی قدروں کے بارے میں ایک خیال انگیز نظریہ پیش کیا ہے۔

اصولی اور نظریاتی مضامین کے علاوہ اختر اورینوی کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ان کی عملی تنقید سے کیا جا سکتا ہے۔ عملی تنقید کے لئے صرف کتابی مطالعہ اور معلوماتی علم ہی کافی نہیں بلکہ ادب کے رچے ہوئے ذوق، سوجھ بوجھ، ادبی قدروں سے گہرے لگاؤ، تخلیقی عناصر کی پہچان اور بے لاگ خارجیت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس کے بغیر عملی تنقید یا تو مدح سرائی کا نمونہ ہوتی ہے یا ہجو تضحیک کا پیرایہ۔ ہمارے نقاد عموماً ان اشخاص پر مضامین لکھتے ہیں جن کی تعریف کرنی مقصود ہوتی ہے یا ان پر قلم اٹھاتے ہیں جن کی شہرت خاک میں ملانی ہوتی ہے۔ اختر اورینوی نے جن ادیبوں یا شاعروں پر قلم اٹھایا ہے ان کے کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی خوبیوں کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے اور ان کی خامیوں کی بے لاگ نشان دہی کی ہے۔ نظیر اکبرآبادی، راسخ، شاد عظیم آبادی، غالب، درد، داغ، حسرت، اقبال، اور نذیر احمد پر ان کے مضامین پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے فن کا محاکمہ کس دیدہ وری سے کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ قابل توجہ وہ مضامین ہیں جو انھوں نے اپنے ہم عصروں پر لکھے ہیں۔ ہم عصروں پر ہمارے سکہ بند نقاد یا تو مستقل مضمون نہیں لکھتے اور اگر لکھتے ہیں تو مروت اور مصلحت انکی تنقیدی رایوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اختر اورینوی نے جوش (ایک صناع کی حیثیت سے) فیض احمد فیض کی شاعری اور اس کی فضا، جمیل مظہری کی غزل گوئی، پرویز شاہدی کی فنکاری اور اجتبیٰ رضوی کی شاعری پر جو مضامین لکھے ہیں وہ ان کی تنقیدی دیانت داری،

فنکارانہ آگہی اور متوازن طرزِ فکر کا بیّن ثبوت ہیں۔

جوشؔ کی بعض نظموں پر تجزیہ و تنقید کا عمل کرتے ہوئے انہوں نے نظم نگاری کا یہ اصول پیش کیا ہے :-

"نظم ایک مکمل تعمیری اکائی ہوتی ہے۔ نظم کی مکمل اور متعین عضویاتی تنظیم کے لئے یہ لازمی ہے کہ ساخت میں کہیں جھول نہ ہو، کہیں رخنہ نہ ہو، بے جا اضافہ و تکرار بھی عیب ہے اور نامناسب کمی، اختصار اور تشنگی میں نظم کی تکمیل کے لئے اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا، درمیانی منزل اور انتہا ہوتی ہے۔ ان حصوں میں کڑی تنظیم پائی جاتی ہے۔ ایک کامیاب نظم کی فنکارانہ تکمیل اس کے مجموعی تاثر پر منحصر ہے۔ کسی ایک جزو کا حسین اور ترشا ہوا ہونا کافی نہیں بلکہ مختلف اجزا کے نظم کا مجموعی حسن ضروری ہے۔"

اب جوشؔ کے سلسلے میں ان کی بعض تنقیدی رائیں دیکھئے :-

"جوشؔ کے فن میں نری نقاشی نہیں بلکہ مصوری ہے یعنی وہ الفاظ کے رنگ و نور سے تصویریں بناتے ہیں اور حقیقتوں کی تخلیقی تعمیر بھی کرتے ہیں مگر جوشؔ کی اوسط درجہ کی بڑی نظم میں بھی تنظیم کا عیب عموماً پایا جاتا ہے۔ وہ زورِ تخلیق میں مربوط اور بے جھول تعمیرِ نظم نہیں کر سکتے اور یہ عیب دن بہ دن زیادہ ہوتا گیا ہے جوشؔ کی چھوٹی نظمیں عموماً سجی اور مکمل طور پر تراشیدہ ہوتی ہیں۔"

جوشؔ کی نظم "انسان کا ترانہ" کا تنقیدی تجزیہ دیکھئے :-

"میرے خیال میں یہ سارا کلام منظوم صرف ایک شعر کی شرح ہے اور بس ؎

مری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
شجر کانپتا ہے حجر کانپتا ہے

اسی مطلع کو اور چودہ اشعار کے ذریعہ پہلو بدل بدل کر پیش کیا گیا ہے۔ نظم کی ہیئت غزل کی ہے۔ شاعر مقطع میں بھی وہی بات کہتا ہے جو مطلع اور دوسرے اشعار میں کی گئی۔

عام طور پر غزل میں ہر شعر ایک منفرد تجزیہ پیش کرتا ہے یا سارے اشعار تنوع کے باوجود ایک جذبہ و کیف میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ غزل کی تیسری قسم ہے جو نظم نما ہے مگر نظم نہیں اور ابتری خیال کی جگہ تکرار خیال کا عیب لئے ہوئے ہے۔ صرف تشبیہیں اور استعارے بدلتے جاتے ہیں۔ خیال میں کوئی ارتقا یا تنوع نہیں پایا جاتا۔ اس نام نہاد نظم کا میکانکی ارتقا محض قافیوں کے سہارے قائم ہے۔"

جوشؔ کی نظموں کے بارے میں مجموعی طور پر جو رائے قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے :-

"جوشؔ کے ہر مجموعے میں ایسی نام نہاد نظمیں کثرت سے مل جاتی ہیں جو تکرارِ خیال کی وجہ سے غیر متحرک اور نامکمل ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کی قماش غزلوں جیسی ہے۔ جوشؔ غزل نگاروں کے متعلق کہتے ہیں ؎

اُن کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ
قافیے کے ہاتھ میں رہتی ہو جن لوگوں کی باگ

خود جوشؔ کی باگ بھی قافیے کے ہاتھوں میں رہتی ہے مثلاً ان کا ترانہ، نظام نو، ہم لوگ، مشاہدات، داغِ جگر، سمجھتا ہوں، بوم بہار، آج کی رات، شام کا رومان، تیرے لئے، کب آئے گا، ابدی شعلۂ خرابات، جہاں میں تھا وغیرہ وغیرہ۔

جوشؔ کی موسیقی کا آہنگ تیز اور کو بجا رہتا ہے۔ وہ نرم تجربوں کو متناسب اور نرم آہنگ میں پیش نہیں کر سکتے۔ ان میں صوتی گداز کی کمی ہے۔"

جوشؔ کی مشہور نظم "کسان" کا فنی جائزہ لیتے ہوئے

لکھتے ہیں:۔

"استعاروں کے سیل رنگ و بو میں کسان گم ہو جاتا ہے۔
یہ اشعار نہ صرف یہ کہ واقعیت کی تصویر کشی سے قاصر
رہتے ہیں بلکہ کثرت تکرار سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے
ہر شعر اپنی جگہ پر خوبصورت اور پُر تاثیر ہے مگر کُل کے
حُسن میں اضافہ کرنے کے بجائے تکرار بے جا سے بدصوتی
پیدا کرتا ہے جیسے کوئی تاج محل کے میناروں یا گنبدوں
میں اضافہ پر اضافہ کرتا جائے۔"

فیض احمد فیض جن کی شاعری پر تحسینی و تفریقی مضامین بھی خاصی تعداد
میں لکھے گئے ہیں اور تخریبی و تنقیصی بھی لیکن ان پر متوازن تنقید کم دیکھنے میں
آتی ہے۔ لوگ یا تو ان کی شہرت سے مرعوب ہیں یا برافروختہ۔ اختر اورینوی
نے فیض پر جو مضمون لکھا ہے وہ نہ صرف اُن کے بہترین تنقیدی مضامین میں سے
ہے بلکہ فیض پر لکھی گئی تمام تنقیدوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس
مضمون میں فیض کے محاسن اور معائب دونوں کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔
ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"رچے ہوئے احساسات، گہرے مگر متوازن جذبات،
رنگین و شاداب تخیل سے مل کر فیض کی نظموں میں دیرپا
تاثر پیدا کرتے ہیں۔ فیض کی نظموں کا ادب اور قماش
مرکب و پیچیدہ اور بالیدہ نہیں ہوتا مگر اس فنکار
کے سادہ فاریوں اور نقشوں میں نفاست و لطافت
پائی جاتی ہے۔ ان کی گرہ بہت سبک اور گھٹیلی ہوتی ہے۔
لیکن فیض میں فکر اور بھرم کی کمی ہے۔ اس کے تخیل میں
اڑان بھی نہیں۔ اس کی اکثر و بیشتر نظموں کی سطح عنفوان
شباب کے محسوسات سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے شاعرانہ
تجربے ہموار تھا اور بالیدگی سے ہمیشہ منہ موڑے رہتے ہیں۔"

عام طور پر لوگوں نے "دست صبا" والے فیض کو "نقش فریادی"
والے فیض کے مقابلے میں ترقی یافتہ بتایا ہے لیکن اختر اورینوی نے
اس دور کو فیض کے شاعرانہ انحطاط سے تعبیر کیا ہے۔[۵۱]

"فیض کی شاعری کا دوسرا دور اس کی ترقی پسندی کے
باوجود ترقی یافتہ نہیں۔ اگر فکر میں تھوڑی سی تبدیلی
ہوئی ہے اور جذبے کا رُخ اور محل بدل گیا ہے تو اس سے
شعریت اور صناعی کو کچھ نقصان ہی پہنچا ہے فائدہ نہیں۔"
"دست صبا" کی جن نظموں تو نقش فریادی سے ہی کی گئی ہیں
بقیہ نظموں میں بھی ہمیں ترقی فن کی کوئی منزل نہیں ملتی۔"

پرویز شاہدی پر مضمون لکھتے ہوئے بطور تمہید یہ بات کہی ہے:۔

"پرویز میرے ہم عصر ہیں، بہاری ہیں، عظیم آبادی ہیں،
میرے دوست ہیں۔ اشتمالی ہیں اور میں ابھی تک اپنے
آپ کو مذہبی کہتا ہوں۔ آہنی دیواریں میرے راستے میں
حائل ہیں۔ اُن کو توڑ کر مجھے پرویز کی شخصیت اور اس
کے فن تک پہنچنا ہے۔"

اوپر کی سطروں میں جو نکتہ پیش کیا گیا ہے وہ بہت سے نقادوں
کے لئے قابل غور ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اختر اورینوی نے
اپنے مضمون میں اُن شخصی تعلقات و تعصبات سے اوپر اُٹھنے کی کوشش
کی ہے۔ پرویز شاہدی کی قابل قدر نظموں کو سراہا ہے اور ان کی خوبیوں کا تجزیہ
کیا ہے لیکن ایک نظم پر یہ بے لاگ رائے سنئے:۔

"ہر کلام منظوم شعر نہیں ہوتا۔ خطابت اور صحافت کو شاعری
نہیں کہتے۔ اس پوری نظم کو پڑھ کر یہ اثر ہوتا ہے کہ عنفوان
شباب میں داخل ہوئے ایک نوجوان کو غصہ آ گیا ہے
اور وہ غصہ بھی سلیقے سے نہیں کر پایا ہے۔ اس نظم سے
کمزور ذہانت اور معمولی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ کسی اخبار کا کالم نویس ایک مراسلہ
سپرد قلم کر رہا ہے جس میں کہیں کہیں ادبیت کی جھلک
بھی ملتی ہے اور جو اتفاق سے منظوم بھی ہو گیا ہو۔"

نظم "بنت ہمالہ" کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس نظم میں بعض بند بہت خوبصورت ہیں۔ فنکار نے
لفظوں سے مصوری کی ہے۔ پیکر تراشی کی ہے۔ موسیقی

---

[۵۱] ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون "انحطاط کی مثال فیض" اختر اورینوی کے مذکورہ مضمون کے برسوں بعد شائع ہوا۔

کی ہیرمیں ہیں اور ترکیب و استعارہ سے نئی تعبیریں
تخلیق کی ہیں۔ اسلوب ادا میں ندرت ہے۔ اس نظم
میں بڑے امکانات تھے لیکن شاعری کو آنی جانی تاثرات
نے بہکا دیا۔ شاعری لمحے کو ابدیت میں تبدیل کرتی ہے۔
لیکن نظم میں ابدیت کو لمحہ بنا دیا گیا ہے۔"

نظم "قید خانہ" کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"نہایت ایمائی عنوان ہے۔ نظم کی کلّی تاثیر، شعریت
اور قوت و ندرت کا اظہار قابل تحسین ہے۔ اگر اس
نظم کے بندوں میں غزل کی ہیئت استعمال نہ کی جاتی
تو بہتر تھا۔ فارم نے مزاج نظم کو بھی متنفر لذت بنا دیا
ہے۔ تکرار خیال بہت کھلتی ہے۔"

آگے چل کر ایک عمومی بات کہی ہے:۔

"کاش اردو نظم کو کوئی غزل کی زیادتیوں سے نجات
دلا دیتا۔ نظم کے فارم میں تکرار خیال اور لفظوں کا بھرتہ
بہت بُرا لگتا ہے۔ نظم کی کاریگری گھٹی ہوئی تراشیدہ
اور مربوط ہوتی ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے نظم کے فارم
کو غزل کی بدولت دیدی اور ایک بڑے شاعر کی بُری
مثال سے بہتوں کو ٹھوکر لگی۔"

جمیلؔ مظہری اور اجتبٰی رضوی پر بھی اختر اورینوی نے اسی
طور پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ جہاں انکی شاعری کے محاسن اُجاگر کئے ہیں۔
وہاں اُنکی کوتاہیوں اور نارسائیوں پر بھی کھُل کر لکھا ہے۔ اس طرح کے
تنقیدی مضامین نہ صرف یہ کہ زیر بحث شاعر کے تنقید ہو سکتے ہیں بلکہ اس
سے دوسرے شعرا اور ادبا کے عام طالب علم بصیرت حاصل کر سکتے ہیں

عملی نقد کی جو مثالیں اُوپر دی گئی ہیں اُن سے یہ خیال دل میں پیدا
ہو سکتا ہے کہ اختر اورینوی بھی شاید اسی طرح غزل اور غزلیت کے
مخالف ہیں جس طرح پروفیسر کلیم الدین احمد۔ اولاً تو اس خیال کی تردید
اُن کے ان مضامین سے ہو سکتی ہے جو انھوں نے غزل گو شعراء پر لکھے
ہیں۔ مثلاً غالبؔ، شادؔ عظیم آبادی، داغؔ اور حسرتؔ وغیرہ پر لیکن غزل
کے متعلق اُن کے نقطۂ نظر کا اندازہ اُن کے مضمون "فن غزل" سے کیا
جا سکتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ غزل میں مہذب و متمدن
شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ غزل میں اگر عضویاتی تنظیم نہیں
ہوتی تو اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اشعارِ فرد کی
بکجا پیشکش قطعی طور پر غیر فنکارانہ ہے۔ اشعار مفرد
میں بھی حُسن کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ وہ گاہے گاہے
اچھی نظموں پر بھی بھاری ہوتے ہیں۔ منظم حُسن کاری
میں ایک خاص قسم کی لذت بخشی ملتی ہے لیکن حُسن کی
انفرادی اداؤں میں بھی سامان لذت و نشاط ہے۔
ان لذتوں کو بُرے معنی میں نیم وحشت یابی نہیں کہہ
سکتے۔ کیا وہ ہر میلان فطرت، ہر جبلت، ہر خصوصیت
جو دورِ وحشت یا عہد نیم وحشت میں پائی جاتی تھی۔
بُری ہے؟ کیا متمدن دور کی ساری خصوصیات پسندیدہ
و محمود ہیں؟ تفصیلی بحث سے قطع نظر سادگی و معصومیت
ہی کو لیجئے، بے ریا محبت، اخلاص و وفا کی استواری
کو ہی دیکھئے۔ یہ صفات اس سماج میں زیادہ تابناک
طور پر پائی جاتی تھیں۔ جسے نیم وحشی کہا جاتا ہے اس کے
برخلاف تصنع، دکھاوا، خود غرضی، دو دل کی پریت
متمدن دور کی وبائیں ہیں اور ان کا سایہ ادب پر بھی
پڑ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے سماج کے نیم وحشی دور
کے بہت سے عناصر آج کی مہذب دنیا کے لئے بیتابانہ
طور پر ضروری ہیں۔ اگر غزل کے فن میں ایسے ہی نیم وحشی
عناصر ہیں تو وہ اس قابل ہیں کہ انہیں توازن حیات و
توازن فن برقرار رکھنے کے لئے قائم رکھا جائے۔"

اختر اورینوی کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے
یہاں اصناف و اسالیب کے سلسلے میں کسی قسم کی تنگ نظری یا تعصب
نہیں تھا۔ وہ غزل سے بھی لطف اندوز ہونا جانتے ہیں۔ نظم کی قدر و قیمت

بھی پہچانتے ہیں اور ہیئت کے تجربوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہر صنف کے مخصوص تقاضوں اور مطالبوں کو سمجھتے ہیں اور اُن کی روشنی میں فن پارے کا جائزہ لیتے ہیں۔ انھوں نے مثنویوں اور مرثیوں پر بھی لکھا ہے اور وہاں بھی ان اصناف کی روح کو فراموش نہیں کیا ہے۔ یہ ان کی سلامت طبع اور خوش ذوقی کی دلیل ہے۔

اختر اورینوی کی تنقیدی کاوشوں کے سلسلے میں ہم نے بعض دوسرے امور سے قطع نظر کرکے محض ان کی اس خصوصیت پر زور دیا ہے جو انھیں اُردو کے عام نقادوں میں ممتاز کرتی ہے یعنی اعتدال و توازن۔ یہ اعتدال و متوازن صرف اُن کے نقطۂ نظر یا ان کی رایوں اور محاکموں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اُن کا اسلوب نگارش بھی اسکی مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک اُردو میں تنقید کا کوئی معین اور معیاری اسلوب نہیں بن سکا ہے۔ ہمارے یہاں ایک طرف ایسی تنقیدیں لکھی جاتی ہیں جن میں شاعرانہ نثر اور انشائے لطیف کی زبان ہوتی ہے تو دوسری طرف بعض نقادوں کا خشک، سپاٹ اور بے رس طرز تحریر ہے جو سائنس اور ریاضیات کے لئے تو ممکن ہے کہ موزوں ہو لیکن ایک ایسی صنف کے لئے نہیں جو بہر حال ادب کی ایک صنف ہے۔ اختر اورینوی کی تنقیدوں میں ادبی نثر ملتی ہے لیکن یہ نثر واضح، شفاف شگفتہ اور باوقار ہوتی ہے۔ ان کے مضامین بے کیفی اور اکتاہٹ نہیں پیدا کرتے۔ وہ نہ زیادہ طوالت سے کام لیتے ہیں اور نہ حد سے زیادہ سرسری بیانات اور رایوں کا اظہار کرکے گزر جاتے ہیں۔ وہ حسب ضرورت تاریخی و سماجی ماحول کا بھی حوالہ دیتے ہیں لیکن جا و بیجا تاریخ کا موختہ نہیں پڑھتے۔ انہوں نے نفسیات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن نفسیات کو انہوں نے اپنی تنقیدوں کی بنیاد نہیں بنایا۔ انہوں نے جس مصنف یا ادیب پر قلم اٹھایا ہے اس کا کلی مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے بارے میں جو بات بھی کہی ہے اس کے لئے دلیل اور ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ فن پارے کا تجزیہ پہلے کرتے ہیں اس پر محاکمہ بعد میں کرتے ہیں اس لئے پڑھنے والا عام طور پر ان کے خیالات سے پورے طور پر متفق نہ ہوتے ہوئے بھی بدمزہ یا بدحظ نہیں ہوتا۔
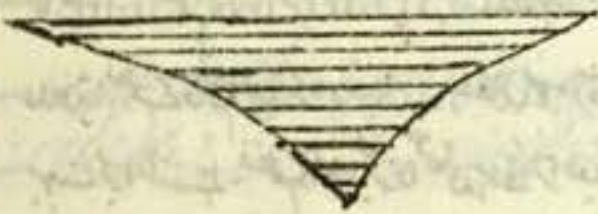
عبدالمغنی

اختر اورینوی کی افسانہ نگاری

جس وقت اختر اورینوی نے افسانہ نگاری شروع کی پریم چند زندہ تھے اور اُن کے پیروؤں کی ایک پوری نسل بروئے کار آ چکی تھی، سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس وغیرہ ابھر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری کا جمالستان اور سجاد حیدر یلدرم کا خیالستان بھی سج چکے تھے۔ مجنوں گورکھپوری کا بیابان بھی سامنے آ چکا تھا۔ حجاب امتیاز علی کا کوہ قاف نمودار ہو رہا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے ابھی لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر اختر اورینوی کے لکھنا شروع کرنے کے دو تین ہی برسوں بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور چند سال اور بعد عصمت چغتائی بھی میدان میں آ گئے۔ اسی عہد میں احمد ندیم قاسمی بھی لکھنے لگے۔ اس طرح اورینوی اردو افسانہ نگاری کی دوسری نسل کی پہلی صف میں وجود پذیر ہوئے۔

یہ وہ دور تھا جب اُردو ادب میں مختصر افسانہ نگاری کی بنیاد پڑ چکی تھی، مگر در و دیوار اور بام و سقف کا صرف ڈھانچہ تیار ہوا تھا۔ اور کاریگری کے لیے چابک دست معماروں کی ضرورت تھی۔ پریم چند نے بنا مضبوط ڈال دی تھی، مگر وہ خود اور اُن کے قبیلے کے لوگ مزید تعمیر کے گُر سے واقف نہ تھے۔ پریم چند اسکول کی حد تک اُردو افسانہ ابھی بالکل ابتدائی، سادہ و معصوم شکل میں تھا۔ اس کی ہیئت اور مواد کسی میں بلوغت کی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ بیشتر افسانے دیہاتی قصے، قصبے کی کہانیاں، رجاتی داستانیں، کاشتکاروں، دہ جاگیرداروں کی دنیا کے، زن، زمین اور زر کے سادہ ترین تانے بانے سے بنے ہوئے فسانے اور اس پُرسکون قماش کو برہم کرنے والے اُن حملوں کے کچھ چھینٹے، جو سیاست و صنعت کی ابھرتی ہوئی نئی دنیا کے دائرے سے دور افتادہ اشرافیت کی ٹوٹتی ہوئی اور فانی دنیا پر ہو رہے تھے، ان کچے جھٹکوں میں ناگہانی حملوں سے پیدا ہونے والی تشویش اور تجسس کا اظہار بھی نیند سے اٹھ کر چونکے ہوئے مبہم احساسات، ان جانے جذبات — یہ تھی کل کائنات اُردو افسانے کی، پریم چند کے دائرہ میں۔

بات یہ ہے کہ جدید نظم اور جدید تنقید کی طرح مختصر افسانہ بھی فنی اعتبار سے مغرب کی دین ہے۔ اُردو ادب میں یہ صنف براہِ راست انگریزی ادبیات کے زیرِ اثر پروان چڑھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پریم چند اور اُن کے اکثر پیرو کسی نہ کسی طرح انگریزی افسانہ کی بو پا گئے تھے۔ لیکن فنی رسوخ کے لیے ظاہر ہے کہ محض بو پا جانا کافی نہیں۔ اس کے لیے راست مطالعہ اور باضابطہ ریاضت شرط ہے۔ اس شرط کی تکمیل اُردو افسانہ نگاروں کی پہلی نسل سے ممکن نہیں تھی۔ ان میں اکثر تو انگریزی یا کسی دوسرے مغربی ادب سے واقف ہی نہ تھے۔ اور جو کچھ واقف تھے وہ یا تو ضروری عناصر کو جذب نہیں کر سکے یا کسی وجہ سے انہوں نے ان عناصر کو اختیار نہیں کیا۔ اس پہلی نسل کی نارسائی میں پریم چند اسکول۔۔ تنہا نہیں۔ اس میں نیاز کی جمالیت اور یلدرم کی تخئیل بھی شامل ہیں، دونوں ہی اپنے اپنے رومان میں اس درجہ سرشار تھے کہ باہر کی حقیقت کی طرف رُخ ہی نہیں کر سکے۔ مجنوں کچھ تو دیر سے

مل رہے اور کچھ عبوری بن گئے۔

فن ہی سے ملتا جلتا حال نسلِ اول کی فکر کا بھی ہے۔ اس میں ایک طرف پریم چند کی انتہائی سادگی ہے تو دوسری جانب نیاز کی انتہائی رنگینی پیچیدگی، شعور اور خلوص دونوں جگہ مفقود ہیں۔ پریم چند اور ان کے رفیقوں کے یہاں ہندوستان کی مٹی کی بو باس ضرور ہے لیکن پختہ و بالیدہ فن محض کچی مٹی سے نہیں ابھرتا، خوبصورت، سبک اور سجل برتنوں کو ڈھالنے کے لئے اس مٹی کو گوندھ کر چاک پر گھمانا اور پھر آوے میں پکانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ لطافت و نفاست میں اضافے کے لئے مٹی کی شکل بدل کر اس کو چینی کا رنگ بھی دینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف نیاز (و یلدرم) اس دھرتی پر قدم ہی نہیں رکھتے یہاں تک کہ اپنے زمانہ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ نیاز تو قدیم مصری و یونانی وغیرہ اساطیر کے اتنے دلدادہ ہیں کہ ان کے کردار اور وہ خود الف لیلہ یا طلسم ہوشربا سے نمودار ہوتے نظر آتے ہیں۔ یلدرم ترکی وغیرہ پر ایسے فریفتہ ہیں کہ ان کی معدودے چند طبع زاد کہانیاں بھی دوسرے ادیبوں کا ترجمہ یا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دونوں بزرگ، قدیم داستان گویوں کی طرح مثالیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ نسلِ اولین کا یہ فکری نقص اس لحاظ سے تو فطری ہے کہ ابھی یہ لوگ سوچ بچار کی ابتدا ہی کر رہے تھے۔ مگر یہ امر حیران کن ہے کہ اردو ادب کی دوسری صنفوں میں علم و فکر کا نہایت بالغ سرمایہ جمع ہو چکا تھا اور بڑے بڑے مفکرین پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے افسانہ نگار عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی دنیاؤں میں سانس لے رہے تھے یعنی لکھنؤ رجب علی بیگ اور میر امّن کا پروردگار جاگ رہا تھا اور سنسار سو رہا تھا۔

یہ تھی وہ بھولی بھالی خواب ناک فضا جس میں اختر اورینوی نے اپنے ہم عصروں کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اس فضا کا اثر توارث اور ماحول کے نتیجے میں، موضوع یا اسلوب کی حیثیت سے اردو افسانہ نگاروں کی دوسری نسل کی کم از کم ابتدائی کاوشوں پر طاری رہا۔ ویسے اسی نسل میں حجاب امتیاز علی اپنی فنی انفرادیت کے باوصف ایک گزرتے ہوئے دور کے احساسات کو پیش کر رہی تھیں۔ کہنا چاہیے کہ انھوں نے ایک نیا طلسم ہوشربا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے سوہنی مہیوال اور پھر کرشن چندر کے کشمیری لیلیٰ مجنوں، اپنے رنگین ماضی کی صدائے بازگشت تھے۔ یہ ساری باتیں فطری تھیں۔ اس لئے کہ اردو افسانے کی ایک روایت بن چکی تھی اور آئندہ ارتقا اسی کے تسلسل میں ہونا تھا۔

بہرحال، دوسری نسل میں مثالیت اور رومانیت کا میلان بہت جلد ختم ہو گیا۔ تاریخی حالات، ادبی رو اور ذاتی تجربات سبھی عوامل رجحان کی تبدیلی میں معاون ہوئے۔ سب سے پہلے تو جدید علوم و فنون کی اشاعت نے حساس طبیعتوں میں نئی نئی ہمتیں پیدا کیں، ذہنوں پر عجائبِ عالم کے دروازے کھلے، نفس و آفاق کی بے شمار باریکیاں مشاہدے و تجربے میں آئیں۔ پھر سیاسی حوادث کے طوفانوں نے زندگی کی موجوں میں اضطراب پیدا کر دیا اور تلاطم کے ساتھ ساتھ کتنے ہی گرداب ابھرے۔ اقتصادی احوال بھی دگرگوں ہو گئے۔ زراعت سے صنعت اور دستکاری سے آلات سازی کی طرف رجحان ہو گیا، دیہاتوں کی جگہ شہروں نے لی۔ تمدن کے یہ انقلابات تہذیب پر بھی اثر انداز ہوئے، نئی نئی قدریں بروئے کار آ گئیں، دلچسپیاں اور ہمدردیاں بھی بدلنے لگیں۔ چنانچہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں اور ادب کی دوسری صنفوں کی طرح افسانے میں بھی اجتماعیات و عمرانیات کا عمل دخل کافی بڑھ گیا، کرداروں اور کوائف کا مطالعہ معاشیات، نفسیات اور جنسیات کی روشنی میں ہونے لگا۔

حالات کی پیچیدگی یہاں تک بڑھی کہ انسان کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے گئے۔ علوم و فنون کی طرح افسانوں میں بھی انسانی شخصیت کے خاص خاص پہلوؤں کی تخصیص ہونے لگی۔ منٹو نے جنسیات میں اختصاص حاصل کیا، ممتاز مفتی کو نفسیات میں امتیاز ملا، عصمت چغتائی گھر کی بھیدی قرار دی گئیں، راجندر سنگھ بیدی روزمرہ کی خانگی زندگی کے علمبردار ہوئے، احمد ندیم قاسمی نے فطرت کی دل آویزیوں اور عشق کی معصومیوں کو موضوع بنایا، کرشن چندر نے سیاسی و معاشی استحصال کی پردہ دری کا بیڑا اٹھایا۔ اختر اورینوی نے اس تخصیص سے بغاوت کی، انہوں نے وقت کی رفتار اور موضوع کی مناسبت سے حسن کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش

کی، زندگی کے ہر جلوۂ گوناگوں کو آئینہ بند کرنا چاہا۔ حیات کو ہر سطح پر اور ہر زاویئے سے دیکھا اور دکھایا: جنس، نفس، گھر، خاندان، نفرت، عشق، سیاست اور معیشت — فرد اور سماج کے یہ سارے گوشے اختر اورینوی کے اکثر افسانوں میں الگ الگ اور بعض افسانوں میں یکجا بھی مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ اختر اورینوی نے ایک تازہ اور انوکھا گناہ تفلسف کا بھی کیا ہے۔ انھوں نے بہتیرے افسانوں میں جزوی طور پر اور بعض افسانوں میں کلّی طور پر انسان کی ابتدا و انتہا اور کائنات کے خیر و شر کی مابعد الطبیعی بحثیں بھی چھیڑ دی ہیں۔ چنانچہ فلسفے کے ساتھ ذہنیات و اخلاقیات کے شجر ممنوعہ سے بھی انہوں نے بعض نوچ کھائے ہیں۔ ممکن ہے اس جسارت نے زاہدانہ ان کی یا اردو افسانے کی عقل میں زبردست اضافہ ہو گیا ہو مگر اس کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا ہے کہ بعض فرشتے انہیں افسانہ نگاری کے فردوس بریں کے باہر حنیف، بیرون در بنانے پر مائل نظر آتے ہیں۔ بہرحال اختر اورینوی کی انفرادیت تنوع اور فور میں ہے۔ ویسے اگر تقسیم کاری کے مروج اصول کو راہ دی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اورینوی کا امتیاز روحانی تفکر ہے، مگر اس صورت میں بھی اورینوی کے افسانوں کا کوئی خاص موضوع مقرر نہیں ہوتا۔ یوں کہئے کہ ان کے فن کی رو کسی ایک سانچے میں بند نہیں ہو پاتی۔ ایسا اس لئے ہے کہ اورینوی کو ماجرا سے بجائے خود دلچسپی کم ہوتی ہے، ان کی دلچسپی کا مرکز تو وہ احساس یا فکر ہوتا ہے جو ہر افسانے کے نقطۂ عروج پر نمودار ہوتا ہے۔ دراصل اورینوی ایک واضح انداز نظر کے مالک ہیں، اور ان کا یہ انداز نظر زندگی کے ہر رُخ اور جلوے میں ایک مخصوص ارتعاش کا سراغ لگا لیتا ہے۔ یہ ارتعاش فی الواقع چند بنیادی انسانی قدروں کا ہوتا ہے۔ اس ارتعاش کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ فن کار کے پاس کہنے کی کچھ سنجیدہ اونچی اور گہری باتیں ہیں جنھیں اس نے قصے میں گھول دیا ہے، یا یہی باتیں پھیل کر افسانہ ہو گئی ہیں اور اگر انہیں سمیٹا جائے تو وہ چند مجرد اصولوں میں مرتکز ہو جائیں۔

———×———

اب تک اختر اورینوی کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخی ترتیب یوں ہے:-

۱۔ منظر و پس منظر (۲) کلیاں اور کانٹے (۳) انارکلی اور بھول بھلیاں (۴) سمنٹ اور ڈائنامیٹ (۵) کیچلیاں اور بال جبریل۔ چھٹا مجموعہ سپنوں کے دیس میں اشاعت کے لئے مرتب ہو چکا ہے۔ اگر ہم افسانہ نگار کے ذہنی ارتقا کی تاریخ مجموعوں کی روشنی میں پیش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ منظر و پس منظر اور کلیاں اور کانٹے ابتدائی دور کی یادگار ہیں جب کہ فن کار کا شعور اپنے ماحول کی چار دیواری میں محدود تھا، اس کے انداز میں ابھی اتنی بالیدگی نہیں آئی تھی کہ وقت کے میلانات سے بلند ہو کر اپنی صنف کو کوئی نئی جہت دے سکے۔ چنانچہ ان دونوں مجموعوں میں سماج اور فرد کے معاشی، نفسیاتی مطالعے کے وہ سارے پہلو موجود ہیں جو معاصر افسانہ نگاروں کے طرۂ امتیاز تھے۔ یہاں زندگی کی اقتصادی کشمکش اور فرد کے ساتھ نفسیاتی ہمدردیوں کے سارے عنوان پائے جاتے ہیں۔ بہرحال ان حدود کے اندر مشاہدے کی باریکی، تصور کی لطافت، بیان کی تصویریت — داستان سرائی کے تینوں عناصر کافی حد تک موجود ہیں۔ اس دور کے افسانوں میں سب سے نمایاں وصف ماجرا کی فنکارانہ ترتیب ہے۔ افسانوں کی ہیئت ایسی سڈول ہے جیسے گڑھا ہوا زیور، پلاٹ کی تراش اور تعمیر نوک پلک سے درست، بالکل سجل، واقعات کا ارتقا بالکل مربوط اور منضبط، یہاں تک کہ کلاسکی وحدتوں کی پوری رعایت۔ کلاسکی معیار سے افسانہ نگاری کا سب سے اہم فنی مرحلہ نقطۂ عروج کی تعمیر کو سمجھا جاتا ہے۔ مذکورہ مجموعوں کے بیشتر افسانے اس معیار پر حیرت انگیز حد تک پورے اترتے ہیں۔ ان افسانوں میں عروج کی تعمیر اتنی مرتب و منظم ہے کہ جیسے کسی نے ایک قالب میں مواد ڈال کر کوئی مشین ڈھال لی ہو، کہیں سے کوئی گوشہ نکلا ہوا یا کھردرا نہیں، تمام گوشے ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ جیسے کسی موزوں قامت کے اعضا کا تناسب، پھر ہر ہر جز باہم مل کر ایک معین سمت میں آگے بڑھتا ہوا، یہاں تک کہ عروج ایک مینار یا گنبد کی چوٹی کے مانند ابھر آئے۔

پہلے مجموعے "منظر و پس منظر" کے انیس افسانوں میں کم از کم گیارہ ایسے ہیں جن پر بے اختیار نگاہ ٹک جاتی ہے ۔۔۔ "ڈابچیٹ"، "آخری اگنی"، "پاگل"، "جینے کا سہارا"، "تسکین حسرت"، "دو مائیں"، "جونیئر"، "بیل گاڑی"، "جیتے نوابم کا فقیر"، "مریض"، "پس منظر"۔ دوسرے مجموعے "کلیاں اور کانٹے" کے گیارہ افسانوں میں کچھ کے نقوش حافظے پر مرتسم ہو جاتے ہیں:۔۔۔ "شادی کے تحفے"، "زود پشیمانی"، "شکر دادا"، "کیٹے والا"، "بہت بے آبرو ہو کر"، "کلیاں اور کانٹے"۔ ان افسانوں میں اپنے گرد و پیش کے ساتھ انسان کے دل و دماغ کی بھی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہاں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، اور ہر سرگذشت بیک وقت حکایت ہستی بھی ہے اور تجربہ ذاتی بھی، فن کار نے اپنے آس پاس سانس لیتی ہوئی زندگی کے ہنگاموں کو غور سے دیکھا ہے، پھر اس مشاہدۂ الم سے دل میں پیدا ہونے والی دھڑکنوں کو غور سے سنا ہے، اور اس آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کا گہرا تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد اس تجزیہ کی پیش کش کے لیے سوچ کے نتیجے کی ایک شکل نکالی ہے، اور اس شکل کا پورا تانا بانا کھڑا کیا ہے، یہاں تک کہ ہمارے سامنے خوش وضع کہانیوں کی ایک فوج آراستہ ہو گئی ہے۔

ان کہانیوں میں بڑا تنوّع اور وفور ہے۔ "ماسینٹ سے کوٹنے والا"، "پاگل" سے "شکر دادا" اور "دو مائیں" سے "کلیاں اور کانٹے" تک انسانیت کے درد و داغ اور جستجو و آرزو کی رنگ برنگ کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ سیدھے سادے زمانے کے آئے دن ہوتے رہنے والے واقعات بھی ہیں، اور بعض غیر معمولی قسم کے خاص الخاص وقوعے بھی، پھر ان سارے واقعات کے پیچھے دبے ہوئے واردات اور ابھرے ہوئے خیالات بھی، اور ان واردات و خیالات میں تصورات و تجربات کا میل تال بھی، سب سے بڑھ کر افسانہ نگار کا اپنے کردار کے ساتھ خصوصی رویہ ہے۔ خالق کو اپنی مخلوقات کے سرد و گرم سے محض دلچسپی نہیں، بلکہ ان کی محرومیوں کے ساتھ ایسی ہمدردی اور شادکامیوں میں ایسی شرکت ہے گویا الم اور نشاط کی یہ ساری کیفیتیں خود خالق پر گذر رہی ہوں، بیگانگت کے اس مقام کو بجائے شناسائیت کے [illegible]

تعبیر کرنا بہتر ہوگا۔ لیکن اتنی قربت کے باوجود یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ صانع اور مصنوع کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ گیا اور معاملہ من تو شدم تو من شدی کا ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ جذب کامل کا یہ حادثہ اگر واقعی رونما ہو جاتا تو پھر افسانہ تو وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

فن کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم وضع ہیئت میں [illegible] وضعیت کارفرما ہو، اور اس طرح افسانہ نگار اور اس کے تخلیق کردہ کرداروں میں کچھ ذہنی فاصلہ لامحالہ پیدا ہو جاتا ہے، اس فاصلے کی بدولت ہی افسانہ نگار مختلف اور کبھی متضاد کرداروں کے ساتھ رشتۂ الفت قائم کر لیتا ہے۔ اس طرح اس معاملہ حلول اور نفوذ کا ہو جاتا ہے یعنی فن کار کی اپنے نمونوں کے ساتھ ایسی گہری موانست جو صرف دو رازدار دوستوں کے درمیان ہوا کرتی ہے، اور یہ رازداری محض تبادلۂ اطلاعات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ بیچ میں ایک چھٹی حس بھی ہے جس کے ذریعہ واردات صرف معلوم نہیں، محسوس بھی ہوتی ہیں۔ یہی چھٹی حس اورینوی کے پاس وافر مقدار میں ہے، اسی کے ذریعہ وہ مختلف شخصیتوں کے دل و دماغ میں گھس جاتے ہیں، یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے لئے انکی دھڑکنوں کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں اور ایسی حالت میں ان شخصیتوں کو نقش بند کر لیتے ہیں چنانچہ قاری جب ان نقش بندوں کے احوال پڑھتا ہے تو اس پر بھی تقریباً اسی قسم کے کوائف گزر جاتے ہیں جیسے خود فنکار پر دوران مطالعہ گزر چکے ہوتے ہیں۔ ہیئت کے سرد خانے کی یخ بستگیوں کے باوجود تخلیقات میں اتنی حرارت اور زندہ دلی غیر معمولی تصور اور نہایت تیکھے نقوش کے استعمال سے ہی پیدا ہو سکتی ہے، اور اورینوی تصور اور نقوش دونوں کے عظیم سرمایہ دار ہیں۔

افسانے کی تنگ تکنیک میں گھرے ہونے کے باوجود زیر نظر مجموعوں کے افسانوں میں ٹھوس زندگی کے احساس کی یہ فراوانی یقینی نئے پر فکر و فن کی آئندہ رفعتوں کا بیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ آئندہ رفعتوں سے قطع نظر، اپنی اس ابتدائی شکل میں بھی اورینوی کی افسانہ نگاری اردو ادب میں ایک مقام کی مستحق ہے، بالخصوص جب اس کو اپنے دور کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ اورینوی نے اپنے فن

کی ابتدا ان افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہو کر کی جو اس زمانہ میں ترقی پسند کہے جاتے تھے، اگرچہ ترقی پسند تحریک کے ہر میٹنگ اور ہنگامے میں غالباً ان کی کوئی تخلیق شامل نہیں۔ بہرحال اس دور کے لکھنے والوں میں (منٹو اور عصمت کے علاوہ) کرشن چندر اور بیدی سب سے نمایاں ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ تصور میں اورینوی کرشن چندر سے زیادہ قریب ہیں، مگر (زیرِ نظر مجموعوں میں) تکنیک کے اعتبار سے وہ بیدی سے مماثل ہیں۔ بیدی کے ابتدائی دور کے افسانوں میں جو تراش خراش اور چستی ہے جو اورینوی کے ابتدائی افسانوں میں پائی جاتی ہے، تھوڑا سا فرق عروج کی تعمیر میں پایا جاتا ہے۔ اورینوی کا عروج تیز رفتار ارتقائے اجزا پر ایک جھٹکے کے ساتھ بریک ہونے لگتا ہے، بلکہ گاڑی کو رفتہ رفتہ فطری رفتار سے، نہایت سکون کے ساتھ قاری کے اندازے کے مطابق منزل پر لے آتا ہے۔ بیدی بھی اگرچہ عروج میں ڈرامائی کے قائل نہیں، مگر ان کے یہاں ارتقا یہ اتنی ترشیدہ ہموار نہیں۔ ایک ہی قسم کے عمل میں یہ درجوں کا فرق ہے۔ شاید اسی کی وجہ پلاٹ کی اٹھان میں بھی چند درجوں کا فرق رہا ہے۔ بیدی کے پلاٹ میں کچھ الجھاؤ ہوتے ہیں۔ جب کہ اورینوی کا پلاٹ ناک کی طرح سیدھا ہے۔ تاہم اسی لیے اورینوی کا عروج جتنا نوکیلا ہے بیدی یا کسی دوسرے افسانہ نگار کا نہیں۔

اختر اورینوی کی فنی تربیت کا یہ دور ان کے تیسرے مجموعے "انارکلی اور بھول بھلیاں" تک جاری رہتا ہے۔ عنوان کے افسانے کے علاوہ مجموعے کے دوسرے نمایاں افسانوں 'بیداری'، 'تم ہوئے، ہم ہوئے'، 'تاریک سائے'، 'گوانڈی' اور خاص طور سے 'آئینہ' سب میں جنس و نفس کی گہرائیوں کی وہی پیمائش ملتی ہے جو پہلے اور دوسرے مجموعے میں پائی جاتی ہے۔ اب تک اورینوی کا تخیل ترقی پسندی کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلا ہے، وہی زور، وہی زمین، وہی زبان اور وہی جگہ سے اندھیرے … ہے کہ … 'آئینہ' … عصمت چغتائی کے محبوب موضوع 'زنانہ ہوس' کو بھی مجسم کر دیا اسی طرح جس طرح … کرشن چندر کے … انسانیت … ہو اور

کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ 'بیداری' اور 'تاریک سائے' دونوں پر منٹو کا عکس ہے۔ 'گوانڈی' اور خاص طور سے 'ممتاز مفتی کو رستہ دکھاتا ہے۔

اس طرح اورینوی اپنے ہم عصروں کے ہم مذاقی کی حد تک قدم بہ قدم ہیں، بلکہ کہنا چاہیے 'ہم زلف' ہیں: ہم ہوئے، تم ہوئے، میر ہوئے، سب اسی زلف کے اسیر ہوئے۔

لیکن اس ترقی پسندانہ بے خودی میں ایک ہوشیاری بھی اورینوی کے ہاں پائی جاتی ہے۔ یعنی موضوعات کی یکسانی کے باوجود ان کی پیشکش کا انداز بالعموم اپنے ہم عصروں سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ جنس، نفس اور شکم، تینوں معاملوں میں وہ اپنے جذبات کی تہذیب دوسروں سے کہیں زیادہ کر لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان نظریاتی معاملات میں بھی ان کا اندازِ نظر زیادہ تر فلسفیانہ یا شاعرانہ ہوتا ہے۔ وہ نہ خود درد بن پاتے ہیں نہ مریض اور نہ عاشق، بلکہ ہر حال میں ایک خاموش ناظر یا مفکر ہی رہتے ہیں۔ نتیجۃً ان کہانیوں میں الجھنوں، توڑ پھوڑ اور ہیجان کا سراغ نہیں ملتا، صرف ابنِ آدم اور بنتِ حوا کی ہزاروں خواہشوں اور ناآسودگیوں کی لکیریں مل جاتی ہیں۔ معلوم نہیں اورینوی قصداً ذہنی عیاشیوں سے دامن بچاتے ہیں، یا ان کی طبیعت ہی ادھر نہیں آتی۔ شاید ان لذتوں سے ان کی تنزیہہ کی وجہ وہ جان کا سوچ ہو جو ان کے ذہن پر ہر وقت مسلط رہتی ہے اور کبھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتی کہ کھل کھیلیں۔

یہ سوچ اگرچہ ابھی تک واضح اور منظم شکل میں نمودار نہیں ہوئی ہے، مگر 'گوانڈی' اور خاص طور سے 'آئینہ' میں مبہم انداز میں ضرور دکھائی ہے، اور اس کا معنی … بعد کے بیشتر افسانوں میں ابھرا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 'انارکلی اور بھول بھلیاں' اورینوی کی افسانہ نگاری کے عبوری دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ پچھلے موضوعات ہنوز پیچھے جا رہے ہیں، مگر اندازِ نظر اور پیشکش میں فرق ابھر رہا ہے۔ اب افسانہ نگار کے ذہن میں زیادہ وسعت اور شعور میں زیادہ گہرائی پیدا ہو رہی ہے، جسے زندگی کے بلند تر حقائق اور انسانیت کی عمیق تر قدروں کا مبہم سا احساس ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تکنیک کا وہ سانچہ

اب پگھلنے لگا ہے جو بنی با افتادہ واقعات کی ترکیب کرنے کا فی تھا۔
ہیئت میں اب وہ تراشیدگی اور چستی نہیں جو منظر و پس منظر، اور
کلیاں اور کانٹے، تک قائم تھی۔ اب فنکار کے تجربات زیادہ وسیع، پیچیدہ
اور بالیدہ ہونے لگے ہیں، اب اس کی روح کا فنی ارادہ سیلی رنگا حدود میں
بند ہونے والا نہیں، اس کی جدتیں اپنے بھرپور اظہار کے لئے اب اچھے
سانچوں کی طالب ہیں سے کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے
کہہ سکتے ہیں کہ اورینوی کی فنی تربیت کا دور اب ختم ہو رہا ہے، انہیں
اُردو افسانہ نگاری میں جو کارنامہ انجام دینا ہے اور اس کے صلے میں
جو حق حاصل کرنا ہے، اس کے لئے قدرتِ فن کی جو شرطِ اولین تھی
وہ اب پوری ہو رہی ہے۔ پہلے دو مجموعوں میں اورینوی نے افسانے کی ہیئت
پر قدرت حاصل کی اور تیسرے مجموعے میں انہوں نے اپنی فکر کی ندرت
کے پیشِ نظر اپنے فن کی انفرادیت کے لئے تجربے شروع کر دیئے، بلکہ
تجربوں کی کامیابی کی راہ پر لگ گئے۔

---x---

اختر اورینوی کا چوتھا مجموعہ 'سیمنٹ اور ڈائنامائٹ' ہے،
اس کے آٹھ افسانوں میں ذیل کے چھ کو ہم چن سکتے ہیں: سیمنٹ
بنیاد، سنٹ، گھر کو دیوی، ہر اب بھی کبھی بن، مات ابطر، داستانِ منتشر
پانچویں مجموعے 'کیچلیاں اور بال جبریل' کے دس افسانوں میں عنوان
کی کہانی کے علاوہ یہ کہانیاں نمایاں ہیں: سیکھ، جمہور، دکتا ہرٹ،
گرجا کے سائے میں، جنت سے دور، نہیں مرد سے نہ کہو، کل، آج، کل
دانِ محل، ایک معمولی سی لڑکی۔ زیرِ طباعت چھٹے مجموعے کے افسانوں
میں 'سپنوں کے دیس میں'، اور 'داشتہ گرہ'، قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تینوں
مجموعے مجموعی حیثیت سے بھی اور اپنے بعض منفرد افسانوں کی بدولت
بھی اورینوی کی افسانہ نگاری کے عروج و کمال کا واضح نقش پیش
کرتے ہیں۔ اب اورینوی کو زندگی کی داستان سرائی کے لئے کسی
بندھے ٹکے سانچے کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ اُن کے تجربات
متنوع اور بصیرت اتنی گہری ہو چکی ہے کہ وہ افسانہ کہیں سے شروع
اور کہیں ختم کر دے سکتے ہیں ـــ

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

انہیں اپنے تخیل کی رنگینی، فکر کی لطافت اور اسلوب کی جاذبیت
پر پورا بھروسہ ہے۔ ان کی نگاہ اتنی باریک اور تصور اتنا گداز
آفریں ہو چکا ہے کہ دقیق فلسفیانہ، یہاں تک کہ ابعد الطبیعی، آدرش بھی جن
اور تکمیل کر کے ایک طلسم ہوشربا تخلیق کر سکتے ہیں۔
یہ آخری تین مجموعے قبل کے تین مجموعوں سے اس معنے میں ممتاز
نہیں ہیں کہ ان میں اورینوی پہلا انگ لگا کر یک بیک دھرتی سے
آکاش پر چلے گئے ہیں۔ ایسی بات بھی نہیں ہے کہ موضوعات یک قلم
بدل گئے ہیں اور بالکل انوکھے واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے، یا
اندازِ نظر یکسر مختلف ہو گیا ہے، یا اسلوب میں کوئی نمایاں تغیر آگیا
ہے، اور نہ یہ بات ہے کہ اب اورینوی افسانے کی تکنیک سے بالکل
بے پروا ہو گئے ہیں۔ اورینوی کے طویل دورِ افسانہ نگاری (جو قریباً
ربع صدی پر محیط ہے) کے مذکورہ تین مرحلے اُن کی فکری ذہنی بینش
رفتار میں کسی انقلاب کی نشاندہی نہیں کرتے، یہاں صرف ارتقاء
مسلسل کا ہے۔ مثال کے طور پر 'منظر و پس منظر' کا رنگینی ... ہے،
جنس کے شعور نے سپنوں کے دیس میں، قامت انتہا ... کا ہے۔ اس
طرح اعداد و شمار کی اگر جانچ کی جائے تو دریافت ہو گا کہ اورینوی
نے اپنے ہر دوسرے مجموعے میں پہلے مجموعے کے ایک سے زیادہ موضوعات
کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن یہ واقعہ جمود اور تکرار پر دلالت نہیں کرتا۔
یہ بھی ایک ارتقا ہے، جس کی نوعیت یہ ہے کہ فنکار حیاتِ زندگی کے
تسلسل کا راز داں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں ایک ہی قسم کے واقعات
مختلف اوقات میں پہلو بدل بدل کر مختلف شکلوں میں سامنے آتے
رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احوال و ظروف کے اعتبار سے مسائل کی ہیئتیں
متغیر ہوا کرتی ہیں، مگر ان مسائل کی تہہ میں بڑی بنیادی قدریں اپنی جگہ
استوار رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ کا موضوع لے لیجئے۔ اورینوی
نے زندگی کے اس اہم مسئلے پر اپنی افسانہ نگاری کے ہر دور میں مختلف
زاویوں سے روشنی ڈالی ہے، گو مرکزی نقطہ ایک ہی رہا ...

کار ہا ہے۔ کلیاں اور کانٹے میں' پناہ گزیں' انار کلی اور بھول بھلیاں میں آئینہ' سمینٹ اور اُسنا مایٹ میں' گھر کو واپسی' کیچلیاں اور بال جبریل' انہیں مرد سے نہ کہو' اور سپنوں کے دیس میں' حدیں' نقش دوم' اور پیلی پینڈ — ایک ہی حقیقت کے متفرق جلووں کو پیش کرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ دوسرے فنکاروں کی طرح افسانہ نگار بھی' اگر وہ حقیقت پسند ہے' گرد وپیش سانس لیتی ہوئی حیات کے ابھرتے اور مٹتے ہوئے نقوش کی اپنے انداز نظر کے مطابق ترجمانی کرتا رہتا ہے' اور یہ نقوش بنیادی طور پر یکساں ہونے کے باوجود ہمیشہ روپ بدلتے رہتے ہیں' پھر زندگی کی حقیقتیں اپنی ظاہری سادگی کے باوجود بڑی پیچیدہ اور پُراسرار ہیں' یہ کبھی ایک دفعہ پوری گرفت میں نہیں آتیں کوئی ایک لمحہ' وہ کتنا ہی طویل ہو' اُن حقیقتوں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کافی نہیں' ایک نارمل آدمی کے سامنے ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو مختلف وقتوں میں آتے ہیں لہٰذا بجز جو زندہ ہیں اور متحرک فنکار ہیں ان کی تلاش حقیقت کبھی ختم نہیں ہوتی' ان کا سینہ بجائے جستجو وآرزو کی نا آسودگیوں سے گرم جوش رہتا ہے وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں چوکنا رہتے ہیں' آخری سانس تک اُن کی آنکھوں میں دم رہتا ہے اور وہ گلزار ہست و بود کو بار بار دیکھتے رہتے ہیں۔ کب کوئی نیا شگوفہ کھل جائے اور ان کی نگاہیں لذت دید سے محروم ہو جائیں۔ اس کے علاوہ فنکار کا طبعی عدم اطمینان بھی ہے' ایک صاحب ذوق اور باشعور فنکار کو حقیقت کے کسی جلوے کی صورت گری کے بعد شاید ہی تکمیل وتشفی کا احساس ہوتا ہو' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی جلوے کی ایک تصویر ختم نہیں ہوتی کہ دوسری کی تمنا پیدا ہو گئی' حقیقت کے پیچیدہ تنوع اور فنکار کی جستجوئے پیہم سے جو صورت حال بروئے کار آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر بدلتے ہوئے حالات میں جب کبھی کوئی موقع سامنے آجاتا ہے تو فنکار چوکتا نہیں اور موضوع کے نئے پہلو کو فوراً اپنے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ تازگی ان فنکاروں میں پائی جاتی ہے جن کی شخصیت اپنے ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔ اختر اورینوی ایسے ہی ایک فنکار ہیں۔

اس صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حقیقت پسند فنکار سب سے پہلے اپنے زمانے اور ماحول کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس پڑی ہوئی چیزوں کو اٹھاتا ہے اور انہیں ایک قالب میں ڈھال کر فن بنا دیتا ہے۔ اس کا پہلا اور براہ راست واسطہ اپنے زمان و مکان کے اُن ہی عناصر سے ہوتا ہے جو بظاہر نہایت معمولی اور محدود معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فنکار بھی جن کا مقصود مثالی اور تخیلی ہوتا ہے اپنے افکار وخیالات کی تجسیم کے لئے روزمرہ کے حقایق و واقعات کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ ورنہ اُن کا فکر فن نہیں بن پائیگا فکر کتنا ہی لطیف ہو' اپنے فنی انعکاس کے لئے اس کو اس کثافت کا سہارا لینا ہی پڑے گا جو دنیوی زندگی کا رونق ہے۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ اپنے زمانے کے جنسی نفسیاتی اور اقتصادی مسائل کے ساتھ انہوں نے پورا انصاف کیا ہے جو نیر وکیل سے کٹے والا تک شاید کوئی سماجی ناپ ہو جو اُن سے چھوٹ گیا ہو۔ اسی طرح 'بے بس' یہ دنیا' بہتے آنسو ہوکر' نگاہیں' تاریک سائے' اور 'نشا' جنسی الجھنوں کے متنوع تیوروں کو پیش کرتے ہیں' کواڑ کی اوٹ سے' ایک معمولی سی لڑکی' بوڑھی ماما' کیکھ جھوڑ' شکوردادا' جینے کا سہارا' انسانی نفسیات کی نت نئی گرہوں کو کھولتے ہیں۔

لہٰذا جہاں تک موضوعات اور اجتماعی دلچسپیوں اور ہم دردیوں کا تعلق ہے' اختر اورینوی کا طریق پہلے مجموعے منظر پس منظر سے آخری مجموعے' سپنوں کے دیس میں (زیر طبع) تک یکساں ہے' جس طرح نوجوانی میں فرد اور سماج کے پیش پا افتادہ مسئلوں کو داستان بنایا تھا' اسی طرح کہولت میں بھی عام حقایق کے ساتھ اُن کا تجسس جوں کا توں قائم ہے' وہ اب بھی اٹھتی اور مچلتی ہوئی جوانیوں کے رومانوں اور جنگ کی دردناکیوں کی کہانیاں بڑی لہک سے سناتے ہیں۔ وہ ابھی تک ایک افسانہ نگار کی طرح معصوم' چوکنا اور چونچال ہیں۔ اُن کی انشا ایک زندہ دل کا اشاریہ ہے — لیکن طبیعت کی

اس تازگی کے باوصف ذہن کی بڑھتی ہوئی سنجیدگی افسانوں کے تاثر سے صاف نمایاں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نظر تو وہی ہے مگر انداز بدل گیا ہے، اگرچہ بدلنے کا عام مفہوم یہاں پر مشکل لاگو ہوگا، اسلئے کہ اُوپندرناتھ کا یہ اندازِ نظر شروع ہی سے اُن کے فن کو ایک خاص رُخ پر بڑھاتا رہا ہے۔ یہ رُخ کینچلیاں اور بالِ جبریل' اور سپنوں کے دیس میں' میں آکر بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ افسانہ نگار جس چوٹی تک پہنچنے کے لیے متنوع نشیب و فراز کی پیمائش کر رہا تھا وہ اُن عظیم افسانوں میں سَر ہوجاتی ہے۔ قبل اور بعد کے جتنے افسانے ہیں وہ اس چوٹی کی راہ میں چڑھاؤ اور اُتار کے پڑاؤ ہیں۔ حکایت ہستی کی جتنی تعبیریں اُوپندرناتھ پیش کی ہیں وہ سب اُن ہی دو داستانوں کی پکار یا بازگشت ہیں۔ یہ افسانے حکایتوں کی حکایت پیش کرتے ہیں ان میں انسان کی دنیوی زندگی کے تمام درو داغ اور جستجو و آرزو کو نچوڑ دیا گیا ہے۔ تخلیق سے ارتقا تک کے سارے مرحلوں کو ان میں نقش بند کردیا گیا ہے، یہاں تک کہ زوال اور فنا تک کی پیش قیاسی کردی گئی ہے، بلکہ حیاتِ نو کا اشارہ بھی دیدیا گیا ہے۔

"میں اپنے خوابوں کا نفسی تجزیہ و تحلیل کرنے لگا۔ کیا یہ دجال اور آزاد پر مستقیوس، یہ اژدھے، سانپ اور آتشیں بچھو خود میرے نفس سے نہیں نکلے؟ کیا ارتقا صرف کینچلیاں بدلنے کا نام ہے؟ اور میں سانپ کا سانپ ہی رہا؟ کیا یہ بچھو ابھی میرے اندر ہے؟ کیا میں نے اپنی روح کے ایک گوشے کو شیطان کے تصرف سے بچا لیا ہے؟ کیا مجھے جبریل کے پر پرواز بھی عطا ہونگے یا میں اس غم میں خودکشی کرلوں گا؟ اگر مجھے جوہر روح نہ ملا تو میں مادہ کی جوہر شکنی کرکے خدا کی کائنات کو فنا کردونگا اور خود بھی فنا ہوجاؤں گا ؎

"زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟"

(خاتمہ کینچلیاں اور بالِ جبریل)

سپنوں کے دیس میں یاجوج و ماجوج موجیں مارنے لگے کوہ قاف کے دیوزادوں نے آکاش اور پرتھوی پر قبضہ کرلیا۔ سندباد جہازی کے سفر الف لیلوی دنیا سے باہر نکل آئے۔ دجل و فریب کا عفریت اپنی مٹھیوں میں دو رخ و جنت لئے دنیا کو ناپنے نکلا۔ اُس نے ذرّے کو آفتاب ساماں بنادیا۔ اہرمن کو مادہ پر قدرت حاصل ہوئی اور دجال نے خدائی کا دعویٰ کردیا۔ مگر جوہر مادہ تک رسائی مادہ کی شکست بھی تھی۔ مادہ انادی نہیں، ازلی و ابدی نہیں، اصل توانائی ماورائے مادہ ہے اور خود اہرمن کے ہاتھوں مادہ اور مادیت کے لات و منات ٹوٹ گئے۔ عفریت نے طلسمی گولے لیکر ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کردیا۔ عالم نو نوراِ فشاں بھی تھا اور پوسترِ با بھی۔ بڑی کشمکش پیدا ہوئی۔ سخت تصادم رونما ہوا۔ بھیانک دھماکے ہوئے۔ کائنات لرزہ براندام ہوگئی خواب کے پتلے فنا ہوگئے۔ سپنوں کا سنسار تحلیل ہونے لگا۔ شاید بند دادر برہما کی کہانی ختم ہورہی تھی۔ یہ عظیم دماغ کا ایک لمحہ تھا یا ابدیت کی ایک کڑی؟ کون جانے؟ عظیم دماغ خلفشارِ عالم سے بیدار ہورہا تھا۔ برہما کی نیند دھماکوں سے اُچٹ گئی تھی۔ سپنوں کا سنسار چھایا! خواب کی دنیا پایا ۔۔۔ کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا؟ کیا برہما پھر اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا؟"

(سپنوں کے دیس میں، خاتمہ)

یہ دونوں افسانے، میرے مطالعہ کی حد تک اُردو ہی میں نہیں پوری دنیائے ادب میں فقید المثال ہیں۔ افسانہ نگاری کی دنیا میں کسی ادیب نے اب تک یہ جرأت اور اس سے زیادہ صلاحیت بہم نہیں پہنچائی تھی کہ تخلیق و تقدیر کے پیچیدہ و سربستہ اسرار کو اس فلسفیانہ تحقیق کے ساتھ افشا کرنے کی کوشش کرے۔ فکر و فن دونوں اعتبار سے ان افسانوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں آج تک کی معلوم تاریخ انسانی کے

تمام حقائق کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ ارتقائے آدم کے ہزار جہت مرحلوں کو ایک نظامِ فکر کے تحت مربوط کر دیا گیا ہے، جسم و روح کے تمام انقلابات کو مرتب کر دیا گیا ہے، فلسفہ، مذہب، شاعری، سائنس، نفسیات، ناول، اقتصادیات — زندگی کی تمام تعبیروں اور ذہنِ انسان کی تمام رودوں کو منضبط کر لیا گیا ہے، پھر علوم و فنون پر مبنی افکار کو محض بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان افکار کو فنی نقوش کی صورت بھی دی گئی ہے، علوم و فنون کے بے شمار استعارے اور تلمیحیں اس طرح عبارت میں چست کر دی گئی ہیں کہ عام زبان کا حصہ معلوم ہوتی ہیں، یعنی صرف افسانے کی ہیئت ہی میں نہیں بلکہ اسلوب میں بھی علوم و فنون کو علامات کی حد تک جذب کر لیا گیا ہے — ادبی اعتبار سے مذکورہ افسانوں کا سب سے بڑا کمال یہی ہے۔

لیکن خالص فکری اعتبار سے افکار کا اس حد تک گداز کچھ الجھنوں کا باعث بھی ہو جاتا ہے۔ اورینوی نے افسانے کی تکنیک کو افکار کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لئے دونوں افسانوں میں خواب کا جو کھیل استعمال کیا ہے (کیچلیاں اور بالِ جبریل میں، خود آدم خواب دیکھتا ہے اور اپنی جسمانی و روحانی معراج (یا شاید زوال) کے تمام مراحل طے کرتا ہے، اور 'سپنوں کے دیس میں' میں خالقِ آدم خواب دیکھتا ہے اور تخلیقِ کائنات و حیات کے تمام نشیب و فراز سے گزرتا ہے) اس طرح پردۂ سیمیں جیسی ایک خوابناک فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں رنگ برنگ مناظر اُبھرتے ہیں اور متنوع کردار اپنے اپنے حصے کی نقلیں کرتے ہیں، اور ایک دلچسپ تماشے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، ایک ڈرامائی ماحول بن جاتا ہے اور آخر تک تجسس سا قائم رہتا ہے، اس انداز سے دقیق افکار کے ہجوم میں بھی فن سالم رہ جاتا ہے، مگر فکر اگر سلیم رہ بھی باقی ہو تو اس کی رفتار مستقیم تو یقیناً نہیں رہ پاتی۔ اس لئے کہ خواب کتنا ہی معنی خیز ہو، بیداری کے اسا حقیقت افروز نہیں ہو سکتا، خواب خواہ آدمی کا ہو یا خدا کا، عالمِ واقعہ کی ٹھوس زندگی کی پوری تو گرفت سے قاصر ہے۔ خواب سے کچھ اس قسم کا فریبِ آرزو پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ زبان زدِ عام مصرعوں سے ٹپکتا ہے:—

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

شاید یہی خواب کا اثر ہے کہ زبردست ذہنی کاوش اور فکری قوت کے باوجود دونوں افسانوں کا انجام قنوطیت پر ہوتا ہے: 'میں آدمی جوہر شکنی کر کے خدا کی کائنات کو فنا کر دوں گا اور خود بھی فنا ہو جاؤں گا' (بالِ جبریل اور کیچلیاں) 'سپنوں کا سنسار چھلاوا! خواب کی دنیا مایا!!' (سپنوں کے دیس میں) اگرچہ اختتامیوں کے ساتھ ذیل کے فقرے اور جملے بھی لگے ہوئے ہیں: 'اگر مجھے جوہر رد نہ ملا تو . . .' (بالِ جبریل اور کیچلیاں) 'کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا؟ کیا برہما پھر اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا؟' (سپنوں کے دیس میں) اس سے قطع نظر کہ 'اگر' کا شرطیہ بجائے خود اندیشہ و خوف پر مبنی ہے، 'عظیم دماغ' کا ابتک خستہ رہنا اور دنیا کو نقشِ مایا کی چھایا دیتے رہنا (عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے) پھر جاگ کر بھی دوسرے سپنے میں چلا جاتا — یہ ساری باتیں عالمِ انسانیت کو امید کا کوئی پیغام نہیں دیتیں، بلکہ قصے کے درمیان خدا کے آخری پیغام اور آتشیں شریعت کے طلوع و فروغ کی جو بشارت و بصیرت دی گئی تھی وہ بھی خاتمے کے بعد مجموعی تاثر کے نتیجے میں زائل ہو جاتی ہے۔

بہر حال ان افسانوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان کو پڑھ کر سرگذشتِ آدم کی ایک رنگین تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ انسان کے نفسی آفاق کی تہذیبوں اور گروہوں کا شعور حاصل ہوتا ہے، ابنِ آدم زمین پر جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس کا علم ہوتا ہے، آدمی کے حوصلوں اور شکستوں کی بصیرت ملتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئی دنیا میں انسانیت کے مستقبل کے متعلق نہایت سنجیدہ فکر لاحق ہو جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جس دھرتی پر جن فضاؤں اور جن سمندروں میں آدمی اپنی حکومت کا تختہ رواں لئے جا رہا ہے وہ محفوظ نہیں، اور یہ کہ جس راہ پر ہمارا سفر جاری ہے وہ منزل کی طرف لے جانے والی نہیں ہے، ہم نے ازل اور ابد کے بیچ میں اپنا رُخ غلط سمت میں موڑ لیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ ہمیں اس زبان کا [illegible] اس حد تک نہیں [illegible] اس طرح اورینوی کا [illegible]

عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ جدید انسان کے سامنے اس کی انسانیت کے متعلق ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے، اس کے ذہن، فریب خوردہ ذہن کو جھنجھوڑ دیا ہے کہ وہ جس بات کو عروجِ آدمِ خاکی سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت زوالِ آدمِ خاکی ہے۔ چنانچہ نمایاں فن کے دایرے میں اختر اورینوی پوری طرح کامیاب ہیں، اس لیے کہ بالعموم فن کا کام اسی طرح زندگی اور اس کے مظاہر کے متعلق سوال مبصرانہ اور کارآفریں سوال اٹھانا ہے، تاکہ انسان کی روح کسی لمحے تعمیرِ حیات کے منصبی وظیفے سے غافل نہ ہو۔ اس کے علاوہ خالص فلسفیانہ سطح پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِن افسانوں نے معمولی آدمی کی حدودِ عقل میں رہتے ہوئے صرف اس کیفیت کی آئینہ سامانی کی ہے:

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

افسانہ نگار نے جہاں سے جہاں تک حکایتِ ہستی سُنی ہے بلا کم و کاست بیان کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے اشارہ و استعارہ ہے، جس میں کاوشِ فکر کے نتیجہ خیز ہونے کا کوئی تیقن نہیں۔

کچلیاں اور بالِ جبریل، اور بسنتوں کے دیس میں، اختر اورینوی کے فن کے بہترین نمایندے ہیں۔ ان دونوں سے اورینوی کی افسانہ نگاری کا قد اور قدر دونوں متعین ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ افسانے کسی اچانک عمل کی پیداوار نہیں۔ ان کے پیچھے ایک وسیع و عریض فن کا پورا ارتقا ہے۔ یہ افسانے اورینوی کی افسانہ نگاری کے پورے کردار کے کاشفے ہیں، اور یہ کردار اردو افسانہ نگاری کی روایت میں ایک منفرد و متعدد ایک انوکھا تجربہ پیش کرتا ہے۔

فنی اعتبار سے ادب کی چند ہیئتیں، کچھ نظم اور کچھ نثر میں، مقرر کر دی گئی ہیں، جنھیں اصطلاح میں اصناف کہا جاتا ہے۔ یہ صنفیں کلاسکی نقطۂ نظر سے نہ صرف اپنی علاحدہ شکلیں رکھتی ہیں، بلکہ ان کے مزاج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، ہر ایک کا رنگ اور آہنگ جدا جدا ہے۔ مثلاً ڈراما ادب کی دوسری صنفوں سے الگ اپنی ایک مخصوص فضا رکھتا ہے: کشمکش، کشیدگی، رفعتِ تخیل، عمقِ نگاہ، شوکتِ اسلوب، بالخصوص ڈرامے کی المیہ قسم میں، ڈرامے کے وہ عناصر ہیں جو اسے اوروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اسی طرح رزمیہ کے اندر ایک خاص انداز کا کر و فر، بردار، پھیل اور ہیجان پایا جاتا ہے، اس کا طرز ڈرامے سے بھی زیادہ تند اور رنگین ہوتا ہے، اور تخیل میں ڈرامے سے بھی زیادہ بلندی ہوتی ہے، یہاں جذبات کی تہیں بھی غیر معمولی ہوتی ہیں۔ افسانہ نگاری بھی ایک ممتاز صنفِ ادب ہے، اس میں اشخاص کے معمولی، روزمرّہ کے سماجی تعلقات، واقعات اور اِن تعلقات، و واقعات کے پس منظر میں افراد کے عمل اور ردِ عمل اور اس عمل و ردِ عمل سے ابھرنے والی سوچ کا بیان ہوتا ہے، اس کا اپنا ایک سیدھا سادا، نرم و سبک اسلوب بھی سمجھا جاتا ہے۔

اختر اورینوی کی افسانہ نگاری بحیثیت مجموعی اس فنی روایت کے سامنے ایک مسئلہ بن کر آئی ہے۔ اورینوی کے منفرد اور نمائندہ افسانے اس کلاسکی چوکھٹے میں مشکل سمائیں گے جس کا نقشہ اوپر پیش کیا گیا۔ بحیثیت فنکار اورینوی کا تجربہ اور تخیل دونوں افسانہ نگاری سے زیادہ ایک قدر اپنے اندر رکھتے ہیں، ان کا مطالعہ، تفکر اور جذبات بھی افسانے کے کلاسکی تصور کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ وہ طبعاً ایک شاعر، تربیتاً ایک عالم اور عادتاً ایک فلسفی ہیں، اس کے علاوہ اپنے فکر و جذبے سے مجبور ہو کر وہ مجاہد بھی بننا چاہتے ہیں اور کچھ اس کی کوشش بھی کرتے ہیں، کم از کم خیالات کی حد تک، وہ برابر میدانِ عمل کے اردگرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اِن سب خصوصیتوں نے مل کر اختر اورینوی کو یونانی المیہ کی ایک شخصیت بنا دیا ہے، وہ راست کارزارِ حیات میں علم و عمل دونوں کی داد دینا چاہتے ہیں۔ نتیجتاً ان کا ذہن زندگی اور اس کے ساتھ ادب کو الگ الگ سربند خانوں میں تقسیم کرنے پر آمادہ نہیں، وہ اپنے تسکین بخش اظہار کے لیے پوری کائنات کی وسعت مانگتا ہے، اس کے تصور میں زندگی کا ہر جلوہ شعر، فلسفہ، ڈراما، رزمیہ، فسانہ وغیرہ کی متنوع اداؤں کو لیے آتا ہے۔ ایسا ذہن جب اپنے وفورِ سرجوشی کو کسی ایک ہیئت میں بند کرنا چاہتا ہے تو لامحالہ بعض دوسری ہیئتوں کے احساسات بھی اس میں در آتے ہیں۔

چنانچہ اُورینوی کے نمایاں افسانوں میں ٹھیٹ ڈراما، رزمیہ شعر اور فلسفہ کے تیور اور لہجے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اُورینوی کا ایک افسانہ پڑھ کر ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی کہانی سُن لی ہے اور خوش وقت ہوگئے ہیں، بلکہ پڑھنے کے دوران ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ محض قصہ نہیں، اس کے اندر بہت سے تقاضے پنہاں ہیں۔ اس میں ایسا ولولہ اور درد ہے، ایک ندا ہے، ایک نغمہ ہے۔

"... ہر طرف زندگی متحرک و جولاں تھی۔ پتے پتے بوٹے بوٹے میں پرندوں کے نغمے اور اُن کی پروازیں تھیں، بہار کی لہریں اپنے کو نکھارا کر رہی تھیں۔ مظاہر قدرت کی حیات افزا دنیا، پرنور، گرم، رنگین، بہار جوشاں تھی، ہر سو اشجار کی ولولہ انگیز نمو و نمائش سے نیلے آسمان میں نئے نئے بیتی قماش بن رہے تھے، ان کو نیلوں پر کرنیں ناچ ناچ کر انہیں بھی رقصاں اور برق تاب کر رہی تھیں۔ درختوں کی چوٹیوں پر سبز شعلے سے لپکنے لگے تھے۔ ہر طرف رنگین چراغاں ہو رہا تھا، غیر مرئی چشمۂ حیات کی محسوس و مرئی زرنگار شکلیں، یہ گدرائی اور فانی ہونے کے باوجود اپنی سرجوشی میں ابدی اور ازلی تھیں۔ دکھ، درد اور موت سے ارفع یہ سربلند و ارجمند ہو کر ہر دوسری شے کے خلاف دعوائے مقابلہ و محاربہ کر رہی تھیں..." (ڈائنامائٹ)

"... ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا، یہ کرہ، سارے سامانِ حیات کو لیکر میرے سامنے گولی کی طرح سَن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلا، تاریک و سرد خلا میں معلق، ڈوب جانے کیلئے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھونڈنے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بنا ہوا تھا، طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آشیانہ اور مسکراہٹوں کے بندھن سے بندھا تھا۔ اور اب ایک نئی آندھی آشیانہ حیات کو نوچ نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ میں نے کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سُلا دیا تھا، کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا۔ اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہار تازہ کا پیغام لا رہی تھی، مستقبل پھر فریب تمنا دے رہا تھا۔ اور یکایک موت کے ترکش کا ایک تیر اُڑا، پھر وہی خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے حس سکوت!" (کلیاں اور کانٹے)

"... اس عورت کے حسن و التفات کے تصور سے اس کے شہوانی جذبات دب دبایا کرتے تھے۔ ایک بہشت متمرد سامنے آجاتی تھی اور سانپ رینگتا ہوا کہیں تاریک غار میں جا چھپا تھا!" (راج محل میں)

"... فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور پھر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، ارفع اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و افزوں نظر ہونے کے تصور سے روح بسی جاتی ہے۔ دنیا کا فانی ہونا ہی ہی کشش کا باعث ہے۔" (کلیاں اور کانٹے)

"... اور یقینی طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ ... انسان عورت ہی کی مدد اور محبت سے چند قطروں کو ناپیدا کنار سمندر بنا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔" (کلیاں اور کانٹے)

افسانہ نگاری میں احساس و ادراک کی یہ تہیں اور اسلوب کے یہ پیچ و خم اُورینوی کے فن اور اس پر تنقید دونوں کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ اورینوی کے

افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ احساس ہوا ہے جیسے میں کوئی المیہ یا رزمیہ پڑھ رہا ہوں، اُن کے تخیّل کی باریکی اور اسلوب کی رنگینی مجھے باربار افسانے کی سطح سے اوپر اٹھا دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تخیّل اور اسلوب کا آخر افسانہ نگاری میں کیا مقام متعیّن ہوتا ہے؟

سب سے پہلی بات تو مجھے یہی کہنی ہے کہ کوئی بھی جینیس اپنے فن کی ٹکسالی ہیئت کے رسوم میں جکڑ کر نہیں رہتا۔ اس کی انفرادیت لامحالہ روایت کے سانچوں کو کچھ پھیلا دیتی ہے۔ ہر تازہ قطرہ جو سمندر میں گرتا ہے، فنا ہوتے ہوتے بھی سمندر کے دایرے، سطح اور روانی میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔ کسی عمل سے اگر اتنی جدّت بروئے کار نہ آسکے تو سمجھنا چاہیے کہ اس عمل میں کوئی امتیازی بات نہیں۔ دوسری بات یہ کہ حدود کی حد تک تو ہر ہیئتِ فن کا دایرہ معیّن ہے اور اس میں کوئی تبدیلی معقول نہیں، مگر دایرے کی حد میں ایجاد و اختراع کی پوری گنجائش ہے، ورنہ ندرت، تازگی اور ارتقا کی حرکتوں سے محروم ہو کر ہیئت فن جامد ہو جائیگی اور اس کے آیندہ امکانات ختم ہو جائیں گے۔ تیسری بات یہ کہ اسلوب کی قماش موضوع کے اعتبار سے مرتب ہوتی ہے، جیسا نالہ ہو گا نَے سے آواز ویسی ہی نکلے گی۔ فکر و فن کا ارتباط اب ادب کا ایک مسلّم اصول ہے۔ علم تحریر کا وصف محض فصاحت نہیں، اس سے زیادہ بلاغت ہے۔ ادبیت صرف قواعد کی چیز نہیں، اس کا اصلی جوہر نقوش ہیں۔

اختر اورینوی اردو افسانہ نگاری میں ایک جینیس ہیں، اور جینیس اور منفرد۔ یہ ممکن نہیں تھا، نہ موزوں تھا کہ وہ افسانہ نگاری کے عام گھریلو پن اور نرمی کی حدود میں سکڑ کر رہ جائیں۔ ابتدا میں دو تین مجموعوں تک بالعموم وہ ٹکسال کی کھینچی ہوئی لکیروں کے اپنے آپ کو سمیٹے رہے۔

چنانچہ اس دور کا تقریباً ہر افسانہ ہیئت کے اوزاروں سے تراشا ہوا اور ہر پہلو سے مکمل ہے، اسی مناسبت سے معمول کے واقعات و احساسات بھی قصے پر طاری ہیں۔ لیکن جب اورینوی کا فن اپنی پوری بہار پر آتا ہے اور غنچہ کھل کر گلِ تر بن جاتا ہے تو عیاں ہوتا ہے کہ رنگ و بو کی ایک بالکل نئی اور انوکھی قماش ابھری ہے۔ اورینوی آخر تک رہتے افسانہ نگاری میں، پورے داستان گو اور اجزا ساز، مگر وہ ساتھ ہی نہایت ممتاز طور پر "اورینوی" ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری کی قماش توڑی نہیں ہے، صرف اس میں چند ابعاد کا اضافہ کیا ہے۔ بالطّول افسانہ نگار حضرات "حکایتِ ہستی" کا آغاز جنّت میں رینگ جانے والے سانپ اور پھر ہابیل و قابیل کی کشمکش سے کرتے ہیں۔ اور ختم اس لمحہ و کیفیت پر کر دیتے ہیں جس سے وہ اپنے وجود دوچار ہیں، حالانکہ انسان کی خودی کا حال یہ ہے کہ: ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے : نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے اپنے وجود کی حکایت درمیان سے سنی ہے، ہمیں نہ ابتدا یاد ہے، نہ انتہا معلوم، لیکن انسانی و الٰہی علوم نے ہمیں ازل کی بھی خبر دیدی ہے اور ابد کا بھی نقشہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا اب ہماری داستان مکمل طور پر اسی وقت بیان کی جا سکتی ہے جب افسانہ خواں ہماری تخلیق اور عاقبت دونوں کا شعور رکھتا ہو۔ اردو افسانہ نگاری میں اختر اورینوی کا امتیاز سرگذشتِ آدم کی یہی مکمل قصہ خوانی ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ فرد کی شخصیت اور سماج کی ہیئت کا کوئی پہلو مطالعے میں نظر انداز نہ ہو جائے، اُن کے سامنے زندگی کا ہر واقعہ اور انسانیت کا سانحہ اپنی پوری شکل میں آتا ہے۔ وہ حیات کے کسی ایک رُخ کا بھی مطالعہ کرتے ہیں تو اس پر ہر جہت سے روشنی ڈال کر اُس کی اصلیت کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، اک جلوہ گہِ دانہ بھی اُن کے سامنے ایک جہانِ معانی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ صرف چند منٹ میں وہ پورے عرصۂ وجود کو طے کر لیتے ہیں، قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھ لینے کا یہی وہ ملکہ ہے جو متعدد مراحل سے گزرتا ہوا "کچلیاں اور بال جبریل"، "اور سپنوں کے دیس میں" میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔

بہر حال، بحیثیت افسانہ نگار اورینوی واقعات و حالات سے زیادہ اہمیت اشخاص و کردار کو دیتے ہیں۔ وہ بالعموم اپنے مطالعے کیلئے کسی اشرف المخلوقات کو چن لیتے ہیں، اس کے بعد جب موقع اس کے گرد ایک ماحول کھڑا کر کے، اس کے کوائف اور امکانات کا جائزہ لیتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اس اندازِ کار کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو وہی المیہ اور رزمیہ کی رفعت و شوکت جس کا اظہار شخصیتوں ہی کے

پیچ وخم میں ممکن ہے، دوسرے غالباً کارگاہِ حیات میں کامیابی وناکامی کے لئے انفرادی ذمہ داری کا دینی احساس؛ کوئی بارِ کشِ حیات دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، ہر نفس کو اپنے کئے کا اچھا اور بُرا پھل ملتا ہے؛ جو ذرہ بھی نیکی کرے گا اس کو پائے گا، جو ایک ذرہ بھی بدی کرے گا اس کو پالے گا۔ اُورینوی کے شعور میں نیک و بد اور انفرادی عمل کے نتیجے میں جزا و سزا کا تصور پوری طرح جاگزیں ہے۔ اپنی شوخ گفتاری اور بعض اوقات فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود اُورینوی اپنے خدا اور اُس کے نظامِ کائنات سے شدید ذہنی وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ وابستگی فنِ افسانہ نگاری میں کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ہر کردار اپنے حالات میں مبتلا رہنے کے باوجود اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں کی داد دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ کہانی کے خاتمے پر اس کے مقدر کا اندازہ اس کے ذاتی عزائم یا کارگذاریوں سے ہی ہوتا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

گچھیاں اور بالِ جبریل کا ہیرو 'دلّی' میں، ہے اور 'سپنوں کے دیس میں' کا ہیرو بچوں میں ہے؛ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر کا 'میں' انسان ہے اور ثانی الذکر کا 'میں' برہما ہے۔ گرچہ برہما اپنے اعمال کے لئے کسی کو جواب دہ نہیں جب کہ انسان ہے، برہما کا اپنا کوئی حشر اور آخرت نہیں، جب کہ انسان کا ہے ــــ بہر حال، یہ بنیادی نقطہ انسان اور برہما دونوں میں مشترک ہے کہ وہ اپنی اپنی مستقل ذات و صفات اور شخصیت و کردار رکھتے ہیں، اور یہ کہ دونوں اپنے اپنے عمل میں لگے ہوئے ہیں، اس عمل کی سطح دونوں کے درمیان خواہ کتنی ہی مختلف ہو، مگر ہر ایک عمل کے پیچھے اپنے اپنے اثرات ہیں؛ اب خدا تو اثرات کا حساب لے گا اور آدم کو حساب دینا ہوگا؛ چنانچہ احتساب کی یہ گراں باری ہر ہر فرد کی زندگی کو نہایت گراں مایہ بنا دیتی ہے؛ ہر آدم اپنا ایک عالم ہے، دنیا ایک نظامِ شمسی ہے اس کے اپنے سیار و ثابت اور مہر و اختر ہیں، اپنی فضا اور سرحدیں ہیں۔ اُورینوی آدمی کے اِس مقام سے باخبر ہیں 'مانیٹ'، 'کوٹھے والا'، 'سکھ چین'، 'شکور دادا'، 'بوڑھی ماں'، 'پاگل'، 'خونیں'، 'مریض'، 'سینے ٹوٹم کا فقیر'، 'ایک معمولی سی لڑکی'، 'پناہ گزیں' ــــ یہ تو چند عنوان ہیں خاص کرداروں ہی کے؛ اِن کے علاوہ بہت سی سرخیاں ہیں حضرتِ دل کے افسانے کی: 'ممتا'، 'کوا'، 'کی اوٹ سے'، 'آئینہ'، 'بہت جلا بود ہوگی'، 'پندرہ منٹ'، 'راج محل میں'، 'جینے کا سہارا'، 'تسکینِ حسرت' ــ یہ سب منفرد کرداروں کے آئینے ہیں۔

اختر اُورینوی کے ہم عصروں میں قدرِ اوّل کے تین دیدا ور ہیں: کرشن چندر، منٹو، بیدی، چند مستثنیات کو چھوڑ کر منٹو سے اُورینوی کی کوئی مماثلت نہیں، نہ فن میں نہ فکر میں؛ دونوں قطبین پر واقع ہیں۔ بیدی سے خالص فنی سطح پر دورِ اوّل کے اُورینوی کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ دونوں اپنی ہیئت کی تراش خراش، چینی کے برتن کی طرح آئینوں بلکہ زیادہ موزوں لفظوں میں، بلور سازی کرتے ہیں۔ لیکن یہ مشابہت تکنیک سے آگے نہیں بڑھتی۔ اُورینوی اور بیدی کے موضوع و ماحول میں نمایاں فرق ہے، اس سے بھی زیادہ فاصلہ دونوں کے احساسات میں ہے، دونوں ذہن یکسر مختلف ہیں، بیدی گھریلو، اور بالعموم پنجاب کے گھریلو معاملات کے بھیدی ہیں، وہ اِس حلقۂ زندگی کے ماہر ہیں، اور اِس مہارت میں قانع ہیں، چنانچہ اپنے خالص الخاص معاشرتی دائرے سے قدم باہر نہیں نکالتے، وہ اپنے مضبوط قلعے میں محفوظ و مامون رہنا پسند کرتے ہیں، بیرونی میدان کے طوفانوں کی زد پر آنا گوارا نہیں کرتے۔ یہ ایک لحاظ سے بیدی کی بڑی خوبی ہے اور دوسرے لحاظ سے یہی خامی ہے بیدی کا فن بہت بالیدہ ہے، مگر فکر نہایت محدود ہے، تجربہ قلیل، مطالعہ مختصر اور نگاہ پست ہے۔

اپنی صدی کے ہم عصروں میں اختر اُورینوی کا پورا تقابل صرف کرشن چندر سے ممکن ہے۔ دونوں کے تجربات وسیع اور متنوع ہیں؛ دونوں تفکر کے عادی ہیں، دونوں کے طرز میں شعریت پائی جاتی ہے۔ اور دونوں ورائے افسانہ چیزے دگر کے طالب ہیں۔ یہ تو اتفاق کے نقطے ہوئے۔ مگر اختلاف کے نقطے بھی کم نہیں۔ کرشن چندر کپڑے اتار کر زندگی کی نہروں میں غوطے لگا چکے ہیں، جب کہ اُورینوی نے سمندر کی گہرائیوں کو آبدوز میں بیٹھ کر ناپا ہے۔ کرشن چندر تمام تفکر کے باوصف فلسفے یا مذہب کی بلندیوں تک پرواز نہیں کر پاتے، اور اُورینوی کا تفکر کسی نظریے

(باقی صفحہ ۳۳۳ پر)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

اختر اورینوی کی مقالہ نگاری

تنقید کی روایت بہت قدیم ہے جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے وہ لاشعوری طور پر چیزوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہا ہے، اشیاء سے بیم و رجا کا احساس اس کو محبت اور نفرت کی طرف متوجہ کرتا رہا، ہر ملک، قوم اور زبان میں اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کے ساتھ فنِ تنقید کو فروغ حاصل ہوتا رہا وہ لوگ جو کوئی نقطۂ نظر نہیں رکھتے لیکن زندگی اور ادب کے اتار چڑھاؤ سے غافل نہیں رہ سکے یہاں بھی انکی عکاسی نظر آتی ہے

اردو ادب میں تنقید کی روایت ایک منظم اور مربوط صورت میں سرسید تحریک کے زیر اثر نمودار ہوئی۔ مغربی طرزِ فکر نئے خیالات اور نئی ضروریات کے باعث ادب کو نئے موضوعات فراہم ہوئے اور نئے اسالیب کو برتنے کا موقع ملا، سرسید خود بھی کوئی بڑے نقاد نہ تھے مگر انہوں نے جو اثر اپنے بعد آنے والوں پر ڈالا اس نے تنقید کے لئے نئے راستے کھول دئیے اپنے گرد و پیش ایک ایسا حلقہ قائم کر لیا جس نے تنقید کے ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی، وہ لوگ جو سرسید کی تحریک سے بالواسطہ تعلق نہیں رکھتے تھے ان کے یہاں بھی یہ اثر لاشعوری طور پر موجود ہے اسی عہد کی تین ممتاز شخصیتیں ہمارے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ یعنی حالی، شبلی اور آزاد۔ یہ تینوں مختلف دبستان ادب کی نمائندگی کرتے ہیں، اور آج تک تنقید کا جو رجحان ملتا ہے، وہ دراصل انہی روایات کا تسلسل ہے جو حالی اور شبلی سے شروع ہوتی ہیں، آج کے بدلے ہوئے حالات اور نئے تقاضوں کے باعث تنقید کی صورت بدل گئی ہے، مگر اپنے اسلاف کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہے۔

دورِ جدید کے ممتاز نقادوں میں اختر اورینوی کا نام بھی قابل ذکر ہے جن کو قدرت نے رچا ہوا مذاق، سلجھا ہوا دماغ اور سنجیدہ اسلوب تحریر عطا کیا ہے۔ ان کے متعدد تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو کر ملک میں مقبول ہو چکے ہیں، مقالات مذکورہ کو پڑھ کر ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اختر کا مطالعہ وسیع اور طرزِ استدلال موثر ہے سب سے پہلی بات جو ایک پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جدید ادب کے مداح ہوتے ہوئے بھی کلاسیکل ادب سے بیزار نہیں ہیں ہمارے ادیبوں میں بدقسمتی سے ایک گروہ ایسا ہے جو قدیم شعر و ادب سے یا تو بیگانہ ہے یا عصبیت کی بنا پر اس کے محاسن سے آنکھیں بند کرنا پسند کرتا ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جو قدیم تخیل اور اسالیب میں کسی قسم کے تغیر و تصرف کا روادار نہیں ان کے برخلاف اختر صاحب نے بڑی معتدل راہ اختیار کی ہے اور توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا یوں تو ادب کی ہر صنف میں توازن کی ضرورت ہوتی ہے مگر تنقید میں توازن کی اہمیت کچھ زیادہ ہو جاتی ہے اگر تنقید میں توازن نہ ہو تو اس میں کھوکھلا پن پیدا ہو جائے گا یا انتقاد افراط و تفریط کا شکار ہو جائے گا، نقاد کے یہاں عدم توازن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کسی عصبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اختر صاحب کے یہاں جہاں توازن ہے وہاں گہرائی، بے باکی اور خلوص بھی ہے، ادب اور زندگی کے ساتھ ان کا طرزِ عمل مخلصانہ اور ہمدردانہ ہے اور یہی ایک بڑے نقاد کی پہچان ہے وہ جہاں ایک طرف جوش اور فیض کی شاعری کے قدرداں ہیں، وہاں دوسری طرف درد، راسخ داغ اور حسرت کے کمالات کے معترف ہیں۔

تھوڑا عرصہ ہوا جب ہمارے ملک میں غزل کے خلاف ایک ایسا طوفان اٹھا تھا، خیال تھا وہ اپنے ساتھ غزل اور غزل کی تمام روایات کو بہالے جائے گا مگر اس کو غزل کا ذاتی توازن کہئے یا سخت جانی کہ اب مخالف کیمپ

میں بھی اکثر اصحاب غزل کی اہمیت کا اعتراف کرنے لگے ہیں، اختر صاحب کا بیان اس سلسلہ میں سننے کے لائق ہے۔

"اردو غزل کی تہذیبی اہمیت اس تاریخی حقیقت سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری کی نشاۃ الثانیہ میں بھی صنف غزل کی ایک نمایاں اور تاباں جگہ ہے ...... اردو غزل کے نئے نمونوں اور تازہ ترین رجحانات میں ایسی فنی علامتیں ہیں، جو حالی کے نظریۂ فن کے خلاف ہیں، حسرت، یاس، یگانہ، فانی، اصغر، جگر، فراق وغیرہ جدید ہوتے ہوئے بھی اردو غزل کی قدیم روایات سے گہرے طور پر متاثر ہیں ...... میں جدید اردو غزل کی ثقافتی اہمیت کو دیکھتا ہوں اور غزل نگاری کے احیا اس حقیقت و حسن کی روشنی پاتا ہوں جو ایسی غزلوں میں کافی جاندار ہے وہ اپنی تہذیبی بنیادوں پر قائم رہ کر نئی فضاؤں کی طرف بڑھتی ہیں ان کے اندر گہری تاثیر ہے نئے امکانات کے دعوے ہیں اور نئے میلانات ہیں۔" (تنقید جدید)

ان کی رائیوں میں عموماً اعتدال ہے اور افراط و تفریط سے پرہیز اور یہ ان کے افکار کے متوازن ہونے کا ثمرہ ہے اگرچہ رائیوں کے اس جم غفیر میں ہر لائے سے فرداً فرداً اتفاق کرنا ممکن نہیں، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

"غالب کی شخصیت میں بلند ہی اس کے مزاج میں وقار وضعداری اور غیرت تھی، یہ اور بات ہے کہ زمانے سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی عزت مجروح ہوتی گئی مگر اس شدت سے طبیعت کی تلخی بڑھتی گئی۔" (قدر و نظر)

ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ گردش روزگار کے اثر سے غالب کے مزاج میں تلخی آگئی تھی درست نہیں، اس کے برخلاف جہاں تک غالب کے کلام نظم و نثر کا تعلق ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور نیرنگی دہر کو "تماشا" سمجھتے رہے، یہ درست ہے کہ ان پر مصائب گذرے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بشری حد تک ان سے اثر پذیر بھی ہوئے، مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک متوازن ذہن رکھتے تھے جو موجوں کے تلاطم کو "فزع" اور سمندر کے ٹھہراؤ کو اصل سمجھتے تھے

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تخلیقات (شاعری اور خطوط) پر تلخی کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے وہ حوادث عالم پر روتے بسورتے نہیں بلکہ مسکراتے اور قہقہے لگاتے گزر جاتے ہیں، اصغر نے فرمایا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہی حال غالب کا ہے۔ علیٰ ہذا اختر صاحب کی اس رائے سے بھی اتفاق کرنا مشکل ہے۔

"داغ کی شاعری میں نیز دبستان لکھنؤ کے اکثر شعرا کے یہاں رسمیت اور خارجیت کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔"

"داغ کی شاعری میں واقعیت اور رسمیت کا امتزاج بے جوڑ آمیزہ ہے۔" (قدر و نظر)

اس کے برخلاف ہمارا خیال ہے کہ داغ کی شاعری اور جو کچھ ہو مگر رسمیت اور خارجیت سے بڑی حد تک پاک ہے اگر رسمیت سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے شعر کے قدیم سانچے اختیار کئے ہیں اور خارجیت کا یہ مقصد ہو کہ ان کا محبوب ایک خیالی پیکر نہیں بلکہ گوشت پوست کا ایک انسان ہے تو ہمیں اعتراض نہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ داغ کی شاعری (امیر کے برخلاف) سراسر قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید کی مصداق ہے۔ بہر حال ان جزوی امور سے اختر صاحب کی معتدل مزاجی پر حرف نہیں آتا، انھوں نے متعدد شعرا کے کلام پر بحث کی ہے اور ان کے محاسن گنائے ہیں۔ مثلاً درد، غالب، داغ، اقبال، عظیم، حسرت، جوش، فیض اور اس سلسلے میں بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔

ایک اچھے شعر کے لئے وہ کن چیزوں کو ضروری سمجھتے ہیں، اس سلسلے پر ان کی رائیں لائق توجہ ہیں مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ اچھے شعر کے لئے شعریت شرط ہے اگر خالص فلسفہ نظم کر دیا گیا ہو مگر اس میں شعریت نہیں ہے تو وہ ہماری بحث سے خارج ہے، دونوں میں بنیادی فرق ہے۔

۲۔ شعر دل سے اپیل کرتا ہے دماغ سے نہیں برخلاف فلسفہ کے، شعر ایمان چاہتا ہے استدلال نہیں

۳- شعر کو زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔
۴- شاعر خارجی تحریکات سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر پہلے ان کو اپنے دل کی واردات کا جزو بنا لیتا ہے، پھر ان کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے بلکہ وہ تجربہ خود ڈھل جاتا ہے۔
۵- شاعر انسان ہونے کی بنا پر خلافت الٰہیہ کا وارث اور اسرار حیات کا رازداں بلکہ ترجمان ہے، اس سے بھی زیادہ وہ امکانات حیات کا خازن و امین ہے اسلئے اس کا درجہ بہت بلند ہے۔
۶- یہ وصف اس میں احساس خودی یعنی اپنے انا کی بے پناہ صلاحیتوں کا ادراک بھی پیدا کرتا ہے، یہیں سے عمل کا جذبہ اور کثرت میں وحدت کا مشاہدہ کرنے کی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

اختر صاحب کو لسانیات پر کافی عبور ہے انھوں نے اپنے متعدد مقالات میں ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کا ذکر کیا۔ خصوصاً اردو کی ابتدا و ارتقا پر بحث کی ہے۔ اردو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"........ باہر سے مسلمانوں کی آمد کے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں ملک میں آئیں، رفتہ رفتہ ان کا میل جول دیش کی بھاشاؤں سے ہوا اور دھیرے دھیرے دونوں جماعتوں کی بولیوں کا جوڑ مل گیا، نئے پیوند سے نیا پیڑ اگا اور دیکھتے دیکھتے یہ پیڑ عظیم الشان ہرا بھرا درخت بن گیا، اور اردو زبان پیدا ہوگئی، اور پالی کی طرح ہندوستان گیر ہو کر آفاق گیر ہو گئی"
دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں۔

"اردو زبان بھاشا اور فارسی، عربی کے میل سے بنی ہے۔ ریختہ اردو پر ارتقا کے کئی دور گزرے ہیں، میں ان ادوار کا مختصراً جائزہ لینا چاہتا ہوں، میں نے اپنے کئی مقالوں میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ میں ریختہ کی صرف ایک شکل تسلیم نہیں کرتا، بلکہ میرا نظریہ یہ ہے کہ جتنی بھاشائیں تھیں اتنی ہی ریختائیں بنیں، اس مختلف ریختاؤں کے عہد کو میں اردوئے قدیم کا عہد کہتا ہوں،

..پھر اردوئے وسطیٰ کا عہد آتا ہے اور ایک بڑے لسانی دور کی تکمیل پر معیاری اردو کا عہد رونما ہوتا ہے۔ اگر پورے پاک و ہند برصغیر کو زیر نظر رکھا جائے تو ہم آج بھی ان تینوں لسانی لہروں کے اثرات دیکھ سکتے ہیں........"

غالباً وہ وقت دور نہیں کہ اس برصغیر کی عام اور ادبی زبان ہندوستانی کھڑی بولی ہوگی، پاکستان میں ہندوستانی کھڑی بولی کا اردو فارم زیادہ مروج ہوگا اور بھارت میں اس کا ہندی فارم تاریخ کی اس لسانی لہر کو تنگ نظر صوبہ پرستوں کی کوششیں بھی نہیں روک سکیں گی۔ ہاں رسم الخط کے مسئلے کو مستقبل طے کرے گا۔[1]

اختر صاحب کا خاص موضوع بہار کی ادبی خدمات ہے اور اس پر وہ ایک مستقل کتاب مرتب کر رہے تھے۔ ان کے مطبوعہ مجموعوں میں بھی بہار کے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی تفصیل آتی ہے، بہار میں اردو مثنوی نگاری، بہار میں مرثیہ نگاری، بہار میں ناول نگاری وغیرہ وغیرہ بزم راسخ، عظیم، عبدالرزاق بیدل، شمس منیری پر مقالات ہمارے بیان کے شاہد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا سے آج تک حضرات بہار اردو شعر و ادب کی برابر خدمت کرتے رہے ہیں اور اس لحاظ سے دہلی اور یوپی کے بعد بہار کی خدمات کافی وقیع ہیں اگرچہ اس امر کا افسوس ہے کہ زمانۂ حال کی تعصب آمیز سیاست نے ان خصوصیات کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، غرض ان مساعی کا محرک کوئی صوبائی جذبہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کو منظر عام پر لانا ہے جس کو ہمارے اہل قلم اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اختر صاحب بہار میں مثنوی نگاری کے تحت لکھتے ہیں۔[2]

"مسلم صوفی درویش سارے ہندوستان میں پھیل گئے تھے وہ پرخطر اور دشوار گذار راستوں، سر بفلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو طے کر کے ایسے مقامات میں پہونچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمانوں کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ یہ بلند مقام درویش مسلمان فاتحین کے لشکروں کے پیچھے پیچھے نہیں چلتے تھے بلکہ وہ نہایت محبت و دردمندی کے جذبات سے سرشار ہو کر ہندوستانی دلوں میں گھر بنانے، اور ان کے پریم کو کھینچنے ان سیاسی یا قومی لشکروں سے مستغنی ہو کر آگے آگے چلتے تھے۔"

---

۱ - قدر و نظر — ۲ اختر صاحب کی کتاب بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا عرصہ قبل شائع ہو چکی۔ (ادارہ)

آگے چل کر رقم طراز ہیں۔

"زمین بہار نے ان صوفی درویشوں کو سرورِ اول ہی سے ہی اپنی طرف کھینچا۔ حضرت تاج فقیہہ یروشلم سے ۵۷۶ھ میں منیر شریف ضلع پٹنہ تشریف لائے۔ منیر کی تاج شاہی" مٹھائی آپ ہی کے عہدِ شیریں کی یادگار آج تک دل پسند خاص و عوام ہے، آپ کے فرزند اسرائیل عبد العزیز اور اسمٰعیل پھلے پھولے ہوئے، جناب اسرائیل حضرت مخدوم یحییٰ منیری کے والد ماجد تھے، حضرت پیر شہاب الدین جگجوت (موضع جیٹھلی، ضلع پٹنہ) کی ایک لڑکی کی شادی آپ سے ہوئی، اس مجمع البحرین سے وہ گراں قدر موتی پیدا ہوا جو عالمِ روحانیت میں آفتاب وار چمکا یعنی حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری مخدوم بہار۔"

ان طویل اقتباسات سے ہمیں دکھانا یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو لیتے ہیں اس کے ساتھ پورا انصاف کرتے اور اس کے مالہٗ اور ما علیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اختر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اردو کے سرمایہ کے علاوہ بھاشا اور انگریزی ادب پر بھی ان کی معلومات وسیع ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی فنِ تنقید کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے ظاہر ہے کہ انگریزی زبان و ادب نہایت ترقی یافتہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں تنقید کا سرمایہ وافر ہے اختر صاحب نے اس سے پورے طور پر استفادہ کیا ہے یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ اس خصوص میں انھوں نے متوازن نکتۂ نظر سے کام کیا ہے۔ "ابن الوقت پر ایک تبصرہ" "افسانہ فنی نکتۂ نظر سے" "نیاز افسانہ نویس کی حیثیت سے" "افسانہ میں حقیقت طرازی اور تمثال نگاری" "ڈراما فنی نقطۂ نظر سے" سب خاصے کی چیزیں ہیں، جن میں اکثر معتدل فیصلے اور مفید معلومات بکھری ہوئی ہیں۔

اوپر کے بیانات اور اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اختر صاحب کی ہمالیے ادبی سرمائے پر کافی نظر ہے اور صرف نظری تنقید (THEORITICAL CRITICISM) نہیں بلکہ عملی تنقید (APP-LIED CRITICISM) کے بھی ماہر ہیں اسی کے ساتھ یہ امر واقعہ ہے کہ انھوں نے فنی مباحث کے الجھے ہوئے اور خشک موضوعات

کو بھی واضح اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، اختر صاحب نے شعر و ادب کا نفسیاتی اور فنی تجزیہ اکثر کامیابی سے کیا ہے اور ان کا اندازِ بیان نہایت رنگین، دلکش اور شعریت سے بھرپور ہے اور اسی کے ساتھ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں اس کو کمال وضاحت اور صفائی سے کہہ دیتے ہیں۔

بقیہ:۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری

یا فلسفے سے وابستہ ہے۔ شاید اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ کرشن چندر معاشیات، نفسیات اور جنس ہو تو سیاسیات سے زیادہ گہرائی میں جانے کی اہلیت نہیں رکھتے، انہیں سماجی زندگی کے صرف مسئلوں کا شعور حاصل ہے ـــــ برخلاف اس کے، اورینوی مابعد الطبیعات عمرانیات و سائنس، اخلاقیات اور الٰہیات تک کو کھنگالے ہوئے ہیں، انہیں انسانیت کی بنیادی قدروں کا عرفان بھی حاصل ہے۔ کرشن چندر کے داستِ مشاہدات گرچہ اورینوی سے زیادہ ہیں مگر ان کے علمی مطالعات اورینوی سے بہت کم ہیں، لہٰذا کرشن چندر کو حیات [illegible] کے ایک منظم کل ہونے کا وہ شعور میسر نہیں جو اورینوی کو حاصل ہے۔ اورینوی زندگی کے کائناتی نظام سے، کرشن چندر کے مقابلے میں، زیادہ واقف ہیں۔

کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو افسانہ نگاری کی صفِ اول کے عناصر اربعہ کی ترتیب یوں ہونی چاہئے: کرشن چندر، منٹو، اورینوی، بیدی۔

پروفیسر شاہ مقبول احمد

اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے بعض پہلو

باوجودیکہ زندگی کی اس وادیٔ حزن و یاس میں ابھی قدم نہیں رکھا ہے جہاں سے ـــــ دریغا کہ عہد جوانی گذشت ـــــ جیسی حسرت خیز صدائیں بلند ہوں تاہم عمر کی اب وہ منزل ضرور آگئی ہے جہاں ماضی کا دھندلکا موجودہ زندگی کا پس منظر یاد دلاتا ہے کہ میں ۱۹۳۰ء کا جوان ہوں۔ ریاست بہار کے ادباء و شعراء کی وہ نسل جس نے اس دور میں ہوش سنبھالا تھا باعتبار شعر و ادب اس کی روایات و نفسیات کی تشکیل میں جو عناصر محرکات اس وقت برسر کار تھے اب مفقود ہیں۔ حالانکہ شاہ غلام نقشبند سجاد[۱] اور شاہ آیت اللہ جوہری[۲] جیسے قدمائے ادب نے بارھویں صدی ہجری ہی میں بہار میں اردو شعر و ادب کی بنیاد ڈالی تھی اور جس کا سررشتہ تسلسل کے ساتھ دور حاضرہ سے بندھا ہوا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس دور (۱۹۳۰ء) میں نشر و اشاعت کے فقدان کے باعث دنیائے اردو میں خطۂ بہار ایک گوشۂ گمنام ہی تھا۔ نتیجہ کے طور پر اس عہد میں کم مائیگی، بے بضاعتی اور کمتری کے احساسات اہل بہار میں عام تھے۔ ریاست بہار کی اس افسردہ حال ادبی حیثیت نے اس دور کے نوجوانان ادب کو جھنجھوڑ کے اٹھایا اور آمادہ حرکت و عمل کیا۔ خدمت ادب کی طرف عام توجہ ہوئی۔ مشہور ماہنامہ "ندیم گیا" کا اجرا ہوا۔ رسائل "تسنیم گیا"، "موج نسیم پٹنہ"، "شمیم پٹنہ"، "گنجینہ پٹنہ"، "فطرت راجگیر"، "تہذیب پٹنہ" کے ساتھ "معیار پٹنہ" اور اس کے بعد "معاصر پٹنہ" جیسے موقر و ممتاز جرائد[۳] وجود میں آگئے۔

متذکرہ رسائل کے صفحات میں ادبیات بہار کی تحقیق نے اتنا اہم مقام حاصل کر لیا کہ رسالہ "معاصر پٹنہ" میں "دکنیات" کی طرح "بہاریات" کی اصطلاح بھی اپنے جائز حق سے سرفراز ہوئی۔ قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، سید حسن عسکری، عزیز الدین راز بلخی، فصیح الدین بلخی، رخشاں ابدالی، عبدالمالک آروی، سید وصی احمد بلگرامی، نجیب اشرف ندوی، شاہ طٰہٰ اشرف پھلواروی، اختر اورینوی، سید حسن، حکیم شاہ محمد شعیب، محفوظ الحق، انجم مانپوری، محتاب الدین آرزو، اور معین الدین دردائی جیسے ذی استعداد اور واجب التعظیم ارباب قلم[۴] کی کوششوں کے باعث بہار کے گذشتہ سو برس کے تقریباً تمام ادبی کارنامے یکے بعد دیگرے پچھلے تیس سال میں منظر عام پر آگئے۔

راقم السطور باوجودیکہ تلخ زبان ہے مگر اسی عہد سعید کا حدی خواں ہے۔ چنانچہ سرزمین بہار کی ان حوصلہ افزا ادبی سرگرمیوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں علم و ادب کی اس بزم مقدس

۱؎ ۱۱۱۶ھ تا ۱۱۷۳ھ ۲؎ ۱۱۲۶ھ تا ۱۲۰۱ھ ۳؎ رسائل "صنم پٹنہ"، "صبح نو پٹنہ"، "مسعود پٹنہ" اور "اشارہ پٹنہ" سے بہار میں اردو صحافت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ۴؎ ان اصحاب قلم میں مزید ناموں کے اضافہ کی گنجائش ہے۔ ش۔م۔ا

میں شرف باریابی حاصل کر دں۔ اسی کا تقاضا تھا کہ ۱۹۵۳ء
کی تعطیلات گرما میں وارد عظیم آباد ہوا۔ میرے میزبان
عزیزِ گرامی پروفیسر سید حسن صاحب تھے۔ موصوف کی
معیت میں فرداً فرداً شہر عظیم آباد کے مشاہیر ادب کی
خدمت میں حاضری اور نیاز کا موقع ملا۔

خیال آتا ہے کہ اس یادگار شام کی تاریکی گہری ہو چلی
تھی۔ لان کے گرد برقی قمقمے روشن تھے۔ ساحلِ گنگا کی ہوائیں
نغمہ ریز تھیں۔ فضا ہر سو وسیع و کشادہ تھی۔ کارکنان قضا
و قدر نے حالات کو بہ ہمہ وجوہ سازگار و خوشگوار بنا دیا
تھا۔ ایسی شبھ گھڑی میں اختر صاحب اپنے چمن بداماں گوشۂ
امن و عافیت میں موجود تھے۔ اور فطرت کے کھلونوں یعنی
چھوٹے چھوٹے بھولے بھولے بچوں میں محو تھے۔ دیکھا کہ موصوف
کی توجہ نقطۂ عروج پر ہے اور شیفتگی شفقتِ پدری کی سرحدیں توڑ کے مہر مادری
کی حدود میں داخل ہوا چاہتی ہے۔ ایسی ہی ساعت نیک میں میں اور
پروفیسر سید حسن صاحب اچانک طور پر جا موجود ہوئے۔ آتش
مرحوم کی "شرط سفر" مجھ بے سر و ساماں کی زادِ راہ تو نہ تھی مگر سید حسن
صاحب کی پرخلوص شخصیت نے اختر صاحب کو میرے حق میں "مسافر
نواز" بنا ہی دیا۔ ہم لوگ باہم متعارف ہوئے۔ گفتگو ہوئی۔ اور
موضوعات اس نوع کے بھی زیر بحث آئے جن سے مجھ جیسا حسن و عاشقی
سے کورا سادہ و بے رنگ مرد مسلمان بھی دل پر یہ نقش لے کر اٹھا کہ
اختر فطرت کے کھلونوں کے ساتھ عطیات الٰہی یعنی صنف لطیف
کے باب میں بھی ایک مانوس و آشنا اور اس سے زیادہ ممنون و
مشکور قسم کے جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ طویل القامت
قوی الجثہ اور جاذب و موثر خد و خال کے اندر وہ اختر بھی نظر آئے
جن کو ایک ظالم اور مہلک مرض کے شاید کرم و عطا نے حسن بیمار
کی طرح پرکشش بنا دیا تھا۔ گفتگو کے وقت لہجہ میں نرمی و شیرینی اور
توازن و تناسب اسی اعتدال و احتیاط کا شاید نتیجہ تھا جو ان
سوگوار حالات میں تقاضائے نفسیات ہو جاتے ہیں۔

"تقریب ملاقات" کے لئے غالب کو "معموری" کے رنگ و روغن
نے ممنون کیا تھا۔ میری بے ہنری کا بھلا ہو کہ اختر سے تعارف کے لئے
تمہید کی ان بے کیف و بے رنگ سطور کا میں سپاس گزار ہوں۔
آپ گرانبار ہوئے ہوں مگر مجھے اس مختصر سی صحبت کی تفصیلات
میں اختر کی خصوصیات فن کے بعض واضح اور غیر مبہم علامات و نشانات
مل گئے جن پر ان کی صناعی اور فن کاری کی بنیاد قائم ہے۔

کسی ادیب و شاعر کی مخلوقات فکر کے بے کم و کاست
جائزہ کے لئے اگر ان حالات و کوائف اور عوامل و محرکات سے
آگاہی ضروری ہے جن کا آفریدہ و پروردہ ایک ادیب و شاعر
ہوتا ہے تو میں الفاظ مختصر یہ کہوں گا کہ اختر کی دنیائے فکر اور ان کی
شخصیت اس سماج کی دین ہے جس کی تعمیل و تشکیل میں زرعی نظام
معیشت، روایات سیادت و شرافت، دیہات کا نیم قصباتی و
نیم شہری تمدن، قدیم معیار تہذیب و شائستگی درجۂ اساس
رکھتے ہیں۔ مذکورہ معاشرہ کے عام عناصر کے علاوہ انفرادی طور
پر ادبیات مشرق و مغرب، علوم سائنسی، ادب جدید کے ترقی
پسند رجحانات و نظریات نے بھی اختر کے ذہن و افکار کی ساخت
و پرداخت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اختر کے فن کا جائزہ لینے سے پہلے اردو ادب کی ان افسوسناک
روایات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے جنہوں نے اردو ادب کو
کافی متاثر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تازہ ولایت فارسی کے ارباب
کمال نے اپنے افکار تازہ و خیالات نو سے اردو ادب کو سرمایہ دار
بنایا تھا مگر ان کے اثر سے بعض ایسی گمراہ کن و مضرت رساں رسوم
و قیود بھی رائج ہو گئی تھیں جن سے اردو ادب کا دامن داغدار بھی ہو گیا
تھا۔ شیراز و اصفہان کا رنگ اور "اہل زبان" کی تقلید کی لے اتنی
بڑھ گئی تھی کہ اس کے اثر سے ہمارے قدمائے ادب کی قوت
مشاہدہ اور صلاحیت اختراع و تخلیق گویا پامال ہو کے رہ گئی تھی۔
نقل مطابق اصل کی مریضانہ حس نے ادبا کو خاص اپنے گرد و پیش،
ماحول و فضا سے اس درجہ بیگانہ اور ناآشنا بنا دیا تھا کہ ان کا

پیش کردہ ادب اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی کے نشیب و فراز اور شام و سحر کی عکاسی تو کیا کرتا زبان و بیان تک میں مقامی اثرات و خصوصیات اس کے حق میں عیب و سقم کا درجہ پا گئے تھے۔ دلّی اور لکھنؤ کے سامنے ایران و توران تھے اور بہار و دکن اپنے ماحول سے مُنہ پھیر کر دلّی اور لکھنؤ کو اپنا کعبۂ مقصود بنائے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ نقالی ہو سکی۔ اور نہ مطالعہ ماحول ہو سکا اور اس کے برعکس وہ تخلیق معیاری قرار پا گئی جہاں مقامی ماحول کا گذر نہ ہوا اور جس میں مقامی ذخیرۂ لغات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا ہو۔ نتیجہ کے طور پر ہمارا معتد بہ حصۂ ادب موج تخییل کی بے جان پیداوار ہو کر رہ گیا۔

اردو ادب میں یہ روایات تقریباً ۱۹۳۰ء تک رائج تھیں ایسی تخلیقات جو اس ڈگر سے قدرے علٰحدہ تھیں وہ ٹکسالی اور معیاری تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ اپنے دیگر معاصرین کی طرح اختر اورینوی کا ادبی ورثہ خیالات کا کم و بیش یہی سرمایہ تھا۔ چنانچہ ان کے بعض افسانے اسی لے میں معرض تحریر میں آ گئے رہیں جن میں زورِ انشا ٹکسال سے داد طلب ہے اور جہاں فضا تخیلی اور مقامی ماحول سے غیر متاثر اور بیگانہ ہے۔ مطالعہ و مشاہدہ ساکت مُنہ تکتے ہیں اور حُسن بیان و زورِ کلام اپنا جادو جگا رہے ہیں۔ ان سب سے الگ دوسری جانب قاری اپنے کو طلسم زار کے دشت ہویدا میں کھڑا پاتا ہے۔

ادب جدید کے معماروں کا خدا بھلا کرے جنہوں نے ہمارے ادبا کو اس طلسم سے آزاد کیا۔ مقامی ماحول اور اس کے مبنی بر صداقت عکاسی کے لئے مقامی ذخیرۂ لغات و محاورات کو اولین درجہ بخش تخیل و تصور پر مشاہدہ و مطالعہ کی فضیلت و فوقیت کا اعلان کیا، باوجودیکہ جذبات و احساسات آفاقی و عالمگیر تھے مگر ان کے اظہار کے لئے ادیب کے گرد پھیلی ہوئی کائنات اور بکھرے ہوئے اجزائے حیات اور ان میں سانس لینے والے افراد و اشخاص کی روداد کو ہی صحیح اور موثر ذریعہ قرار دیا۔ دراصل ایک گروہ ادبا کی اسی راستی اور سلامت روی نے اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کو ایک تازہ اور نیا زندہ و پائندہ رخ عطا کیا۔ جس نے ان کے پیش کردہ افسانوں کے ایک بڑے حصہ کو کارگاہ ادب میں نقش باقی بنا دیا۔ اب ان کے قلم کی گردش سے حیات کے ایسے مرقعے سامنے آ گئے جن میں ان کے قاری نے اپنے سامنے بکھری ہوئی زندگی کے نقوش و نشانات دیکھے۔ حیات و کائنات کی مبنی بر صداقت عکاسی کی وجہ سے ان کے افسانوں کا ایک خاص قابل لحاظ حصہ ہے جس کو اسی طرح "روح بہار" کہا جا سکتا ہے جس طرح شرت چندر چٹرجی کے افسانوی ادب کو "بنگال کی روح" کے نام سے بنگال کے نامور نقاد یاد کرتے ہیں۔ اختر اورینوی کے افسانوی کا ادب سے اہل بہار اور اہالیان اردو کی عقیدت و محبت کا راز اسی جانے پہچانے دیکھے بھالے ماحول میں ہے جو ہماری سماج کے ارکان و اجزا ہیں اور جن کی تصویر کشی اختر نے کمال صداقت فن اور خلوص عمل سے کی ہے۔ جس زرعی معیشت، قصباتی نظام شرافت و سیادت کے وہ ساختہ و پرداختہ تھے۔ وہی ماحول شعوری انداز میں فسانۂ اختر میں جاری و ساری ہے۔ "ماما دھیا" "شکور دادا" اور "شمشیر دا" "تاجو" جیسے بیسوں کردار ہیں جن سے ہم مانوس و متعارف ہیں۔ کوچہ و بازار خانقاہ و مدرسہ، عرس و قوالی، بیٹے بیٹیاں، ماما بیگم، نوکر آقا، وکیل مختار، گواہ و محرر، مولوی مُلّا، پیر و مرید، حکیم ڈاکٹر، بیمار و تندرست، معلم و متعلم، بچے بوڑھے، عورت مرد، کھیت کھلیان، ہل بیل، براہل گماشتہ، حسن و عشق، تہنیت و تعزیت، دوا و دعا، جیسے متنوع و مختلف عناصر کی رنگا رنگی نے فسانۂ اختر کو ایک ایسا مرقعہ بنا دیا ہے جس میں ہماری سماج کی جیتی جاگتی تصویریں ہر سو نظر آتی ہیں۔ مقامی ماحول کی عکاسی میں اختر اورینوی مولوی حسن علی[5] جیسے صاحب فن کے ہم عناں معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری معاشرہ کی افسانوں میں نہایت سلیقہ

---

[5] مولوی حسن علی مصنف ناول "نقش طاؤس" "نجاد و سنبل" "صورت الخیال" اور "شمسا و سوسن"۔ موصوف کے حالات و سوانح اور فکر و فن کے متعلق پروفیسر سید حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کے کئی گرانقدر مقالات اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مصنف مذکور اپنے دور میں منفرد صاحب فن تھے۔ ش۔م۔ا

کے ساتھ سہانے اور رچے ہوئے انداز میں اختر نے سمو دیا ہے اور اس نادر سرمایہ کے ذریعہ اردو ادب کے تمول میں بیش بہا اور لازوال اضافہ ہوا ہے۔

اختر کے ہمدردانہ مطالعہ کے دائرہ میں کوئی خاص گروہ شرفا و امرا یا کوئی مخصوص طبقہ ادنیٰ و اوسط نہیں ہے۔ وہ کسی خاص طبقہ کے مسائل و موضوعات کے علمبردار نہیں۔ ان کی ہمدردیاں عام ہیں۔ ایک خاص نظریہ کے ماتحت غربا اور تنگ حالوں سے محبت یا امرا و رؤسا سے نفرت و عداوت جیسا رویہ اختر کے یہاں بالعموم دکھائی نہیں دیتا۔ اختر کے سامنے ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا رذیل، نیک ہو یا بد، رند قدح نوش ہو یا عابد شب زندہ دار، ان الگ الگ خصوصیات کی وجہ سے ان کی اپنی اپنی انفرادیت ہے اور انسان کی یہی چیز ان کے نزدیک دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ بخشش و عطا، رحم و کرم کے مناظر کم ہیں اور ان ہی کے بالمقابل لوٹ کھسوٹ، جبر و استحصال اور مکر و ریا کے مناظر عام ہیں۔ اس سے تنگ آکے اختر کا فن ایک ایسے سماج اور معاشرہ کی تخلیق کے لئے عموماً واضح اور مثبت طور پر کوشاں نظر نہیں آتا جہاں سماجی انصاف و مساوات کا دور دورہ ہو۔ لیکن با ایں ہمہ اختر کی نگاہیں ان سارے کرب انگیز مناظر کو روشناسانہ طور پر دیکھتی ہیں اور ان کا قلم ان کو اپنی صناعی کی بدولت لفظ و معنی کا آب و رنگ دے کر اس طرح ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ واضح اور براہ راست اشارات و توضیحات سے اجتناب کے باوصف ایک ایسا تاثر یا شعور ضرور پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ سماج قاری کے احاطۂ تنقید میں آجاتا ہے جس کی ناانصافیوں نے ایک اچھی خاصی عورت کو "ماوبیا" بنادیا اور جس کی بے مہریوں کی بدولت بظاہر ایک بھلے مانس مرد معقول کو "شکور دادا" بننا پڑا۔ کتنے ہی کرداروں کی روداد حیات اس طرح احاطۂ بیان میں آگئی ہے، جن کو پڑھ کر قاری ہنستے ہنستے رو دیتا ہے۔

پچاس سالہ "شکور دادا" جس کے آغاز شباب کی رومان انگیز داستان مثنوی زہر عشق سے آنکھیں ملاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ عمر کی پچاسویں منزل تک پہنچتے پہنچتے مرتے جیتے اجڑتے بستے کے ان تمام حادثات و سانحات کا معمولات زندگی کے عین مطابق شکار ہو چکتا ہے جو اولاد آدم کا مقسوم ہے۔ پھر بھی ذوق تعمیر حیات کے ہاتھوں آرزوؤں کے پیہم فریب کھاتا ہے اور بالآخر اپنی زندگی کی آخری شام کو حسرتوں اور ناکامیوں کی آغوش لحد میں سلا دیتا ہے۔ بظاہر اس کا وجود اس تماشا گاہ ہستی میں تنہا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظام معاشرہ پر اختر کے طنز خفی نے بتایا ہے کہ شکور دادا کی قبر اکیلی نہیں بلکہ اس صحرائے بے آب و گیاہ میں حسرتوں کے مزار ہی مزار ہیں۔ اور شکور جیسے ناکام و نامراد تشنہ و ناآسودہ کردار کی تخلیق کے لئے اختر کی فنکاری اور صناعی سے زیادہ خود سماج ذمہ دار ہے۔ شکور دادا کا نفسیاتی تجزیہ اور پورے واقعات کی تفصیلات و جزئیات میں ماحول کی بھرپور عکاسی اسی تکمیل اور خوبی سے ہوئی ہے کہ ایک بہاری گاؤں اپنے تمام اچھے اور برے متعلقات و مناظر کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے اور معاشرے کے تمام خد و خال اس کے سامنے روشن اور واضح ہو جاتے ہیں۔ ناول "کاروان" کے ابواب یا اختر کے افسانوں کے مطالعے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس معاشرے کی کوکھ نے اختر جیسے فن کار کو جنم دیا تھا اور جس کی کھلی اور تازہ ہوا نے اس کے فن کو بالیدہ و توانا کیا تھا اسی سماج کی بکھری ہوئی اچھی یا بری حقیقتوں کو اختر نے افسانوں کا روپ دے دیا ہے۔ اور اس طرح بالفاظ دیگر اپنے ماحول و معاشرہ سے جو کچھ لا تھا اسی کو اختر نے اپنے فن کے ذریعہ خوبصورت اور نادر تحائف کی شکل میں شکریہ کے ساتھ واپس کیا ہے اور جو ہم سب کے لئے افتخار کا باعث ہے۔

———— ⁘ ————

ڈاکٹر محمد عقیل

اختر اورینوی — ایک افسانہ نگار

اُردو کے افسانہ نگاروں میں اختر اورینوی ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔ جب اُردو کی افسانوی دنیا میں پریم چند کے ساتھ ایک گہری اور زندگی میں تیر جانے والی نظر پیدا ہوئی تو قصوں نے شہر کے ساتھ دیہاتوں کے بھی چکر لگائے ۔۔ دیہات جو ہندوستانی زندگی کا صحیح اور بڑا نمونہ تھے اور جو ابھی اچھی اور خراب زندگی کے ساتھ کشمکش کے منتظر تھے، رفتہ رفتہ منظرِ عام پر اُن کی زندگی آنے لگی۔۔ اختر اورینوی بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے بہار کے دیہات کی زندگی سے اپنے افسانوں کی ابتدا کی اور رفتہ رفتہ ایک باشعور اور بالغ النظر فنکار کی طرح ہندوستان کی پوری زندگی پر چھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے افسانوں کے مختلف رُخ پیدا ہوئے۔ ایک طرف بہار کی مخصوص فضا اور حالات میں رہنے والے کسانوں کے مصائب "خشک سالی" "لگان" "بھوک" "افلاس اور اسی بھوک اور افلاس میں تھوڑی سی رنگینی شامل کر کے اس اجاڑ اور بے سبب زندگی کی ناؤ کھینے کے واقعات ہیں" تو دوسری طرف شہر میں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جہاں زندگی مختلف طبقات میں بٹی ہوئی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی ہے۔ وکیل کی بے روزگاری کی شکل میں، "نا گیسلٹ کو کام نہ ملنے پر اس کے بھوکوں مرنے کی صورت میں" "سکھ سدھ" کے لباس میں اور ایک بیمار مُعلّم کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر چند روپیوں کے عوض درسی کتابیں لکھا کر ہزاروں کا نفع کمانے والے سیٹھوں کے ہونے میں۔

اختر صاحب نے جب اپنے افسانوں کی ابتدا کی، اس وقت ہندوستان کے ادیبوں کو ایک نئی ادبی تحریک سے روشنی ملنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ تھی ترقی پسند تحریک جس میں اردو والے زیادہ پیش پیش تھے اور اردو کے افسانہ نگار سب سے آگے۔ سیاست کے میدان میں جنگ آزادی لڑنے والی کانگریس اپنی صوبائی حکومت بنا چکی تھی اور ۱۹۳۶ء میں اس حکومت کا ایک تجربہ بھی کیا جا چکا تھا۔ یہ بھی ہوا کہ کسان جو کانگریس کی فوج تھے، اپنے خوابوں کی صحیح تعبیر نہ پا کر جن کا کانگریس نے وعدہ کیا تھا یعنی زمین کی ملکیت کا حصول، کانگریس سے بددل ہو چکے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ اسی وزارت کے زمانے میں مزدوروں پر گولیاں بھی چل چکی تھیں لیکن ادب کی دنیا میں اور خاص طور پر اردو ادب کی دنیا میں انقلاب لانے والی جماعت کانگریس ہی سمجھی جاتی رہی اور ادبی تخلیقات اسی سیاسی پس منظر میں پیش ہوتی رہیں۔ دراصل یہ بورژوا انقلاب کا مبہم تصور تھا جسے رومانی تصور زیادہ سمجھنا چاہیے۔ جہاں سماج کے پرانے قوانین کو توڑ ڈالنے پر انسان اور محبت کو آزاد کرا لینے، بدیسی حکومت سے آزادی حاصل کر لینے وغیرہ کا غیر منظم اور گنگناتا سا تصور تھا۔ محبت پر پابندیاں اور قید بیں ادیبوں کو اس دور میں سب سے زیادہ کھلتی نظر آتی ہیں اور یہ رجحان افسانوں میں نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔ قدروں کے تضاد کا اظہار۔ عاشق اور انسان دونوں محبوس ہیں (حسن اور حیوان — کرشن چندر) فطرت اور زندگی پر اجارہ داریاں ہیں، انسانیت ایک

انتہاہ گہرائی میں دھنستی ہی جا رہی ہے اسے کسی طرح چھٹکارا دلانا چاہتے اور جب جنگ شروع ہوئی تو یہ سارے رومانی تار و پود تقریباً بکھر جاتے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار جنسیات اور لاشعور کے اندھیرے میں بھٹکنے لگتے ہیں۔ حسن عسکری کے 'جیل' اور 'دو دلی' کی طرح عصمت کے 'لحاف' اور 'ڈیفنس'، منٹو کے 'دھواں' اور 'پھاہا' کی شکل میں اور سنت سنگھ سیکھوں کے "اگر میں لڑکا ہوتی" کی صورت میں۔ اسی ماحول میں اختر اورینوی اپنے مجموعے 'منظر اور پس منظر' کو لے کر ابھرتے ہیں۔

اختر اورینوی کے افسانوں کا دائرہ نچلے اور متوسط طبقے تک محدود رہتا ہے۔ انھیں طبقوں کی زندگیوں کا مطالعہ، اس کی مختلف کیف سامانیاں اور شکلیں ان کے افسانوں کے رگ و ریشے میں 'منظر و پس منظر' کے تقریباً تمام افسانے ایسی ہی زندگی پیش کرتے ہیں۔ 'سمنٹ اور ڈائنامائٹ'، 'اور کیچلیاں اور بال جبریل' بھی[عہ] ایسے ہی لوگوں کی داستان حیات ہیں جہاں افراد کی زندگیاں سماج اور زمانے کی چکی میں پس رہی ہیں، چھٹکارا پانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہیں یا تھک ہار کر زندگی کے اس تیز بہتے ہوئے دھارے سے الگ ہو کر ختم ہوتی جاتی ہیں۔ بوڑھی دھنیا ماں کی طرح، کام کے مفلوک الحال مزدور کی طرح جو گو کہ کسی انقلابی نظریہ حیات سے آشنا نہیں مگر ایک خاموش طبقاتی جنگ لڑ رہا ہے۔ بے بس کے رحمو کی طرح جو زندگی بھر اپنا گھر آباد کرنے کی جد و جہد میں مشغول رہتا ہے۔ لیکن اسے کامیابی نہیں حاصل ہوتی۔ ظاہری شادی لیکن حقیقت میں خانہ بربادی، رحمو اور اس کی بیوی کا انجام ہے۔ برمنس گوپ ہے جس کا بچہ قحط کے دوران میں اپنی ہی گائے کا دودھ نہیں پاتا کیونکہ عین اسی وقت جبکہ وہ بھوک سے بلبلا رہا ہے۔ زمیندار صاحب کی ضرورت اس کے منہ سے دودھ چھین لے جاتی ہے۔ اسی طرح کے بہت سارے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کو اختر صاحب نے تجزیاتی اور تجرباتی طور پر اپنایا ہے جو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ فنکار ان زندگیوں میں خود سرایت نہ کر جائے۔ اور اس کے دل و دماغ میں انسانی ہمدردی کا وہ سرچشمہ نہ پھوٹ رہا ہو جو شاعرانہ طور پر رسمی ہمدردیوں کا اظہار نہ کرتا ہو بلکہ ان مصائب پر کوہ گراں سے چھٹکارا دلانے کیلئے کسی راستے کی تلاش میں ہو۔ اختر صاحب کے افسانوں میں انسانی ہمدردی بہت نمایاں ہے اور یہ ہمدردی عام انسانی برادری کیلئے ہے تاہم اس میں کسی منظم طبقاتی جنگ لڑ کر ان مصائب کو دور کرنے کا رخ نہیں ملتا۔ لیکن ایک مبہم کی صورت ضرور نظر آتی ہے جو بعد کے افسانوں میں تیز تر ہو گئی ہے۔ اور جہاں افسانہ نگار اسے شعوری طور پر ناگزیر سمجھنے لگتا ہے یا کم از کم ان عوامل کو پہچان کر ڈھونڈھ نکالتا ہے جو طبقات کی بلندی اور پستی کی جنگ آہستہ آہستہ لڑتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ آگہی بہت آہستہ رو ہے۔

اختر اورینوی کے افسانوں میں شعور اور آگہی کی لہریں بہت آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ یوں بھی ان کے افسانوں کی فضا، حالات اور واقعات تیزی سے اپنے ساتھ نہیں چلتی بلکہ بہت خاموشی اور پر سکون انداز میں واقعات اپنائے جاتے ہیں لیکن تفصیلات اور واقعات کی کروٹوں کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور ذہنی گتھاؤ کے قدم بہت محتاط۔ اور جہاں وہ اپنے افسانوں میں شعور کی رو جیسی ٹکنیک استعمال کرتے ہیں وہاں یہ وضاحت بہت صاف رہتی ہے کوئی الجھن، یا تو مرور ایسے نہیں ہوتے جو نتیجے پر پہنچنے میں رکاوٹ پیدا کریں یہ آہستہ روی واقعات کم لیتی ہے کیونکہ متعدد واقعات ایک ساتھ لے کر افسانے کی دوڑ کو ایسا الجھا دینا کہ مقصد فوت ہو جائے یا قصہ اپنے اصلی راستے سے ہٹ جائے یہ اختر صاحب کا طریقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے افسانوں میں تجربے بھی بہت کم کئے ہیں اور موضوعات بھی وہی اپنائے جن کا انھیں تجربہ تھا اور جو ان کے بس میں تھے۔ جس کی وجہ سے ایک کمی تو یقیناً رہ گئی کہ افسانے ایک محدود رقبہ سے باہر نہیں نکلے۔[عہ] ایک سیدھا سادا ڈھرا ہے جس پر مصنف اپنی خاص صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے استادانہ ڈھنگ سے گامزن رہتا ہے۔ جہاں قصوں کی دل نشینی ہے، واقعات کی چھٹکن اور قصہ گو کے پر اثر انداز تیکھے وار پڑھنے والوں کو کرداروں کی مظلومیت سے وابستہ کرتے جاتے ہیں۔ یہ انداز اپنایا ہے۔ 'بیل گاڑی'، 'دو ماں'، اور ایسے ہی افسانے پریم چند

عہ 'سمنٹ اور ڈائنامائٹ'، 'اور کیچلیاں اور بال جبریل' گو 'دنیا منظر و پس منظر' اور 'کلیاں اور کانٹے' نیز 'دنیا ہے' اور 'جھل جھلیاں' سے مختلف و متاثر اور زیادہ بالیدہ و باشعور ہے۔ ادارہ

عہ 'سمنٹ اور ڈائنامائٹ'، 'اور کیچلیاں' اور 'بال جبریل' نیز سینٹ کے ولیس میں (جن کے افسانے تو مطبوعہ ہیں مگر مجموعہ زیر اشاعت ہے) داستان کی تصدیق نہیں کرتے۔ ادارہ

کے قریب پہنچتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں بہار کی فضا، بہار کے دیہات اور بہار کے مسئلے بولتے نظر آتے ہیں۔

افسانہ نگار کی ذمہ داری یہیں نہیں ختم ہوتی کہ وہ حالات کی تصویر کھینچ دے اور واقعات کی ایک فہرست مرتب کر کے قاری کے سامنے پیش کر دے۔ اور نہ یہی اس کا کام ہوتا ہے کہ صرف محسوسات اور تاثرات کے دریا بہا کر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائے بلکہ اس کا کام بہت مشکل کام ہے۔ اسے یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ چھان پھٹک کر وہ باتیں بھی ڈھونڈھنی پڑتی ہیں جن کے تحت افراد خاص وقت اور ماحول میں خاص صورتیں اختیار کرتے یا کر سکتے ہیں۔ حالات اور واقعات کی مصوری، اگر اس میں افسانہ نگار نے روح اور زندگی کی ان اندرونی ہتوں کو اسیر نہیں کیا جو صحیح معنوں میں بنی نوع انسان کی تعمیر کرتی ہیں تو ایسی ظاہری تصویریں ادب کی دنیا میں حقیقی طور پر کارآمد نہیں ہو سکتیں اور یہ کام ایسا انسان کبھی انجام نہیں دے سکتا جو شعورِ انسانی کی میکانکیت سے واقف نہ ہو اس کی تہہ در تہہ بناوٹ، ماحول، سماج اور ایک خاص وقت، اور موقع پر خاص خاص طریقوں پر اثر لینے اور اپنے کو ظاہر کرنے کی صلاحیتوں سے آگاہ نہ ہو۔ ایک اچھے ادیب کے لئے ان سارے رموز کی واقفیت اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کہ زندگی کے لئے ہوا، پانی اور خود اس کی سانس لینے کی صلاحیت اور اسی صورت میں آسے ادیبوں کا وہ سیال ہاتھ آسکتا ہے جسے بقول گورکی قدیم دور سے ان لوگوں نے انسانی روح کو اسیر کرنے کے لئے پھینک رکھا ہے۔ اختر صاحب انسانی زندگی کے ان پیچیدہ راستوں سے واقف ہیں اور

"تاجو کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ آخر اس کے تن بدن میں ایک زلزلہ سا کیوں آگیا تھا۔ اچانک، انجان طور پر۔ دھرتی اور عورت!... تاجو کے اندر عورت چلا رہی تھی۔"

"خدا کا قانون تو سمجھ میں آئے مگر انسانوں کا نظام تو سمجھ میں آتا ہے، ایک بھیمانہ مقابلہ . . . . . اگر کوئی کمزور ہو جائے تو پھر ساری دنیا اسے پیستی ہوئی، روندتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔"

"گاؤں میں سوائے مہاجن اور شیطان کے اور کوئی خوش نہ تھا"

"دولت رام سوچ رہا تھا۔ شام کی پارٹی۔ صاحب کی تعریفیں۔ ریڈ روں کی منظوری۔ پندرہ ہزار روپئے۔ سماج میں ناک اونچی، شہرت اور رات کے بھوجن میں حلوہ۔ تربینی بابو کے دماغ میں بھی خیالات منڈلا رہے تھے۔ مکمل آرام۔ محنت، قرض۔ بچوں کی ادائیگی۔ کیلشیم۔ وٹامن۔ بیوی کی پھٹی ساری۔ پچاس روپئے۔ پورسی۔ ریڈریں۔ اندھیر نگری!"

یہ سارے خیالات انسان کے اندرونی تضاد اور مختلف روؤں یا جدلیاتی طریقِ کار کو سمجھے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ یہ ضرور ہے کہ جس گہرائی سے ادیب ان میں اترے گا اسی حد تک اس کا فن بالیدہ ہوگا۔ اس کا تجربہ نکھار ہوگا اور وہ متحرک حقیقتوں سے قریب ہوتا جائے گا۔ لیکن اگر وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گیا، یا اس نے رومان کی طرف حقیقت سے زیادہ توجہ کی تو جذباتی اور رومانی لہریں اسے حقیقت کا پردہ پوش بھی بنا سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اختر صاحب اس سلسلے کی ساری کمیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اس کی اہمیت کے بھی معترف ہیں لیکن ان میں بہت زیادہ گہرائیوں تک نہیں اتر پاتے۔ ان کی بنی ہوئی زندگیاں کبھی کبھی اپنے لئے حد محدود دائرہ سا ڈھونڈ کر ان سانچوں میں گھومنے لگتی ہیں اور وقت کا محور ٹھہر سا جاتا ہے۔ رحمو، تاجو خیر اور آخری، کنی کی طرح بھولے اور راجہ کی طرح جو ایسے سپاہی ہیں جو محض لڑائی میں مارے جانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جن کے ہاتھ اسلحوں سے خالی ہیں۔ یہی حال رومانی لہروں کا ہے جسے وہ فن کو سنوارنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو افسانوں میں حسن پیدا کرتی ہیں لیکن جب اس محلول کے وزن میں تناسب قائم نہیں رہتا تو افسانے محض ہو کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کی نامیاتی قوتوں کا ساتھ دینے کے باوجود ان میں فن اور فکر دونوں کا گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ جب فکر پیدا کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو لمبی چوڑی فلسفیانہ تقریریں آتی ہیں اور ان کی خشکی میں افسانے کے فن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی گہری باتیں کیوں نہ ہوں۔

"میں نے کیٹکا (KATFKA) کا جسم بالکل سے ایک تغیرِ عظیم کا مشاہدہ کیا۔ مادیت پرست، ظاہر بیں، صلح پسند دنیا کی بے دردیوں کو دیکھا۔ میں نے رومی اور سعدی کی آنکھوں سے بھی یہی کچھ دیکھا تھا۔ میری

انسانیت کے ایک اجزو نے دوسرے جزو کو نہ پہچانا۔ دوسرے جزو میں انسانیت تھی ہی نہیں، شیطنیت تھی۔۔۔۔۔ یوں کہ میری روح کا ایک جزو چنگادڑ بن جاتا ہے اور دوسرا جبریل"

"اب فیض، سر زیر بار منت دربان کئے ہوئے کھڑا تھا۔ جیسے بھرے بازار میں کسی نوجوان لڑکی کو کھڑا کر دیا گیا ہو۔ کئی کلاس ختم ہو چکے تھے اور اب آخری کلاس کی گھنٹی بجنے والی تھی۔ کمروں میں لڑکیاں، گلیاروں میں لڑکیاں، دالانوں میں لڑکیاں، دہلیزوں میں لڑکیاں، سیڑھیوں پر لڑکیاں، برساتی میں لڑکیاں، صحن میں لڑکیاں غرض میں جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔ فیض کے دماغ میں تتلیاں سی اڑنے لگیں۔ کوئی شئے واضح نہ تھی۔ ہر سو نیرنگ نظر، سیلاب کیف، محشر آواز، طوفانِ نکہت اور امواجِ خرام کے نقشے بنتے اور بکھرتے"

یہ نثر میں شاعری، یہ عبارت آرائی، چاہے ادب لطیف کا اثر ہو یا شعری ماحول کا لیکن یہ حقیقت نگاری اور واقعات کے پیچ و خم کو نہس نہس کر ڈالتی ہے جن میں نہ سمنٹ کی محبت اور نفرت کے دائرے ہیں نہ انسانیت کی صلح و آشتی سے اُبھاری ہوئی دلبستگی کے جلوے۔

اختر صاحب کے افسانوں میں جزئیات اور تفصیلیں بڑی باقاعدگی اور اچھی طرح بنی ہوئی ملتی ہیں جو کبھی کبھی کرشن چندر اور بیدی کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ تفصیلیں کرداروں کی فکروں، اُن کے حرکت و سکون میں، واقعات کے پیچ و خم میں، تقریباً سبھی جگہ ہوتی ہیں۔ دراصل یہ فنکار کی قوت مشاہدہ کا بھی اظہار ہیں اور زیادہ تر اس بات کا کہ اس نے ان تفصیلوں کے ساتھ اپنے جذبات اور خیالات کو کس طرح وابستہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ انھیں کرید اجائے تو لکھنے والے کی نفسیات کی تہیں بھی اس کے اندر جھلکتی ہوئی نظر آئیں گی اور اگر اس نے ان تفصیلات میں عمومیت پیدا کی ہے، زندگی کی حرکی اور تعمیری قدروں کے ساتھ اس کی وابستگی ہے تو اس تفصیل نگاری میں تعمیمی جزو شامل ہو کر ادب کو ایک شعوری عمل بنانے گا ورنہ یہی تفصیلات پورنو چیتر ناک کی طرح مٹتی ہوئی قدروں سے جذباتی وابستگی پیدا کر کے بڑھتے ہوئے ترقی پسند سماج کو اس ویران اور غیر آباد مرکان میں لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جہاں ڈاکٹر زندگی ہے اور راتوں کو بھونکنے والے بھیڑیئے اور چند متحرک سائے۔ زندگی سنسان، اُجاڑ اور بھیانک مکانات بوسیدہ، بے رونق اور بھوتوں کا مسکن۔ یا پھر تفصیلات محض اخباری رپورٹ بن کر رہ جاتی ہیں جن میں نہ فکر کی قوت ہے اور نہ سماجی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کی آگہی۔ منظر و پس منظر، کے افسانوں میں اختر صاحب نے ایک تعمیمی تفصیل نگاری سے کام لیا ہے۔ اُنکی یہ کوشش صرف ظاہری خد و خال تک نہیں رہ جاتی اور نہ واقعات کا ایسا گورکھ دھندا تیار کرتی ہے جو نتیجے میں پلٹ کر حقیقت کو روپوش کر دیں۔ بلکہ وہ کرداروں کے دلوں اور ماحول کے رگ و ریشے میں اتر جاتے ہیں اور وہاں سے حقیقت کے ایسے جوہر نکال لاتے ہیں جو بنیادی تضاد سے وجود میں آتے ہیں، ظاہری خد و خال کے طول و عرض کی پیمائش سے نہیں۔ سماجی ترقی اور تنزل کا رُخ پہچاننے والوں کو ملتے ہیں ہر کس و ناکس کو نہیں۔ سائنٹفک اور سماجی حقائق کے اقرار سے حاصل ہوتے ہیں تصوریت اور تقدیر پرستی کی ترغیب سے نہیں۔

"موتیا دیر تک بیٹھا ہوا یونہی چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر انگڑائی لے کر اُٹھا۔ اس نے انگڑائی میں مبالغہ سے کام لیا جیسے وہ کسی خواہش کو دبا رہا ہو۔ آدھے ارادے کے ساتھ وہ بازار کی طرف چل نکلا۔ سڑک کے کنارے پرانے تاڑی خانہ کو للچائی بھری نظروں سے دیکھا کئی مزدور اور ایک دو گاڑی بان دونے پر دونا چڑھا کر بھاگن کا توس بیری کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ اس نے ضبط سے کام لیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔۔۔۔ پھر بازار میں وہ یونہی گھومتا رہا۔ مگر اس کے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش تھی کہ وہ سب کچھ خرید لے۔ کپڑے، مٹھائیاں، چوڑیاں، ترکاریاں، سرمیں دینے کا تیل، کنگھی، سیندور اور تاروں کی طرح چمکتی ہوئی ننھی ننھی ٹکلیاں ۔۔ اِن سب سے بیچ کر رادھا کیسی سندر لگے گی"

"گلیوں میں کوڑے کرکٹ کے تاریخی اہمیت رکھنے والے چھوٹے بڑے ڈھیر، رکی ہوئی نالیوں کی اُمڈتی ہوئی کیچڑ، متبذل دروازوں پر ٹاٹ کے میلے چیکٹ پردے۔ گندے بچے۔۔۔ آوارہ حال

بکریاں، ان کی بکھری ہوئی مینگنیاں ۔۔۔۔۔ دریدہ دہنا اور بدزبان عورتوں
کی ٹولیاں، ان کا جوتیوں دیکھنا، یہ سب آپس میں گڈمڈ ہو کر دلوں اور
دماغوں کو روندھانے والے بدوضع وقماش بنائے ہیں۔ روح پر ایسا اثر
پڑتا تھا جیسے جیتی جاگتی موت کے لئے" ان تفصیلات میں ان انسان نما
جانوروں کی تصویریں ہیں جو ایک غیر متناسب سماجی اور طبقاتی تقسیم کا
شکار ہیں اور جو اب اس احساس کو بھی تقریباً کھو چکے ہیں کہ وہ انسان
ہیں۔ لیکن جب اختر صاحب ان راستوں کو چھوڑ کر دوسری سمتوں کی
طرف چلتے ہیں تو کچلیاں اور بال جبریل جیسی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔
جہاں نہ تو انسانی تجربوں کی مادی اور عملی جھنڈگی ملتی ہے اور نہ اس
حقیقت نگاری کا پتہ چلتا ہے جو عمل اور مادہ کی کارفرمائیوں سے وجود
میں آتی ہے بلکہ تصوریت اور تقدیر پرستی کے راستوں سے آڈن اور ٹی ایس
ایلیٹ کی طرح عقائد کی سلسلہ جنبانی کا احساس ہوتا ہے کم از کم مجھے
ایسا ہی معلوم ہوتا ہے عـــہ

افسانہ نگار کو افسانہ لکھتے وقت اس ذمہ داری سے باخبر رہنا چاہئے
کہ وہ لوگوں کے لئے صرف تفریحی سامان نہیں فراہم کر رہا۔ بلکہ ادب کی تخلیق
بھی کر رہا ہے اور اسی تخلیق کے ساتھ وہ ایک تاریخ بھی مرتب کرتا جاتا ہے
معاشی اور سماجی تاریخ۔ کیونکہ ادب کسی مخصوص دور کے لوگوں کی ذہنی،
جذباتی، معاشی زندگی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وہ خارجی حقائق اور
داخلی رویے بھی پیش کرتا جاتا ہے جنکی پرچھائیاں اس سماج پر پڑ رہی ہیں
جس میں ادیب زندہ ہے۔ داخلی رویے جو انسانوں میں کشمکش اور پیچیدگی
پیدا کرتی رہتی ہیں اور تاریخ، سچ پوچھئے تو اس کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔
مارکس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یونان کے کلاسکی ادب کا مطالعہ ہر سال
کرتا تھا حالانکہ اسے وہ "انسانیت کے زمانۂ طفلی کے حافظے کے نام سے یاد
کرتا تھا" لیکن یہ مطالعہ اس لئے ہوتا تھا کہ ان میں اس دور کے مخصوص
سماجی حالات، ترقیاں اور کشمکشوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ تاریخ کو صرف
بادشاہوں کی لڑائیوں تک محدود رکھنے والے بھی اگر غور سے تاریخ کا
مطالعہ کریں تو ان کا بھی ایک مخصوص نقطۂ نظر کا اختلاف ہی ملک گیری
کی جدوجہد کا محرک ہوتا ہے۔ نئے پرانے سماج کی لڑائی، نقاط نظر کا اختلاف
حکومتوں کی حکمت عملی پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور انکا یہ اختلاف و
اتفاق کرکے ادب اور تاریخ دونوں کی تشکیل ہوتی رہی ہے، شہنشاہیت
کی ترجمانی کرنا بھی تاریخ بناتا ہے۔ عام انسانوں سے ہمدردیاں وابستہ کرنا اور
مظلوموں کا ساتھ دینا، اس دور کے ظالم اور مظلوم دونوں کے سماجی رشتوں
کی وضاحت کرکے معاشی بدنظمی کے راستوں سے تاریخ کے اوراق تک پہنچانا بھی
بھی تاریخ کی تکمیل ہے اور جذباتی ہیجان، گھٹن، جنسی بے راہ روی میں دلچسپی
لے کر ایک مخصوص دور کے مذاق اور MRBIDITY میں گم ہو کر لذت پرست
نکلنا بھی تاریخ کے اتار چڑھاؤ کو واضح کرتا ہے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس
طرح صرف سماجی تاریخ ہی ترتیب پاتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ادب
اور سیاست بھی کے رشتے ہاتھ آجاتے ہیں۔ اختر اورینوی کے افسانوں کو
پڑھ کر بہار کے دیہات، انسانوں کی مظلومیت، ان کی خود غرضیاں، آپس کا
انحطاط سب تو بے نقاب ہوتا ہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دور اور
تاریخ کی اس رفتار کا بھی واضح رخ سامنے آتا ہے جہاں زندگی، سسکتی،
آنسو بہاتی، اپنی تمناؤں کے ساتھ بیل گاڑی کے موتیا اور اسکے خریدے
ہوئے سیندور، بندی اور بچے کی جلیبیوں میں حل ہو کر مٹی میں ملتی دکھائی
پڑتی ہے۔ بیکسوں کی ناشنوائی، زبردست کی زبردستیاں، حکومت کی
سماجی بے تعلقی اور حالات سے بیگانگی کا پردہ فاش کرتی ہے اور ادیب
کے اس رجحان کی بھی وضاحت کرتی ہے جہاں وہ ایسے نظام سے متنفر ہے
اور ایک نئی ترقی یافتہ حکومت چاہتا ہے اور اس ادیب کے ساتھ وہ
تمام انسان ہوتے ہیں جو ادب کو ذریعہ اظہار نہیں بنا سکتے لیکن جو ایسی
تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔ کرشن چندر اور عصمت کے یہاں یہ رجحان انقلابی
زور شور کے ساتھ ملتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور بیدی خواہشوں کو
جذبات کی آنچ میں پگھلا کر دھیرے دھیرے دماغ پر چھا جانے والی کیفیات
کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اختر صاحب اس میدان میں تیز رو نہیں اور
نہ وہ انقلابی راستوں سے یہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان میں انسانی
ہمدردی کا جذبہ محسوسات کے راستوں سے داخل ہوتا ہے وہ سماج
پر تنقید کرتے ہیں، غلط صحیح راستوں سے عوام کو باخبر کرتے ہیں لیکن شاید

عـــہ جنم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا ادارہ

کسی نئے نظام کی تشکیل میں اِن حالات کی تبدیلی کا حل نہیں تلاش کرنا چاہئے اور انہیں محسوسات کے راستوں سے تاریخ کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں ایک ہی ماں باپ کی اولاد کامیشر اور پرمیشر میں ایک انسانی اخوت اور ہمدردی کے ناتے اپنے ہم قوموں کی حفاظت کے لئے رات رات بھر پہرہ دیتا رہتا ہے اور اس کا خیال نہیں کرتا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان لیکن دوسرا ماضی کی تاریخ میں گم ہے جن سنگھ کے ساتھ شامل ہو کر ماضی کو واپس لانے کی کوشش کرتا ہے یہ نہیں سمجھتا کہ ماضی کبھی واپس نہیں آیا کرتا اور اگر وقتی طور پر واپس آ بھی گیا تو اُسے قیام ممکن نہیں۔ لیکن اس ہیرا پھیری میں کُشت و خون سے ایک بحرانی دور کی تاریخ ضرور مرتب ہوتی جاتی ہے۔ اختر صاحب کے افسانوں میں بہار اور نواکھالی کے قتلِ عام سب تاریخ کے اجزا ہیں اور تاریخ والے مانیں یا نہ مانیں لیکن آج تاریخ شاہد فتوحات سے الگ ہو کر کلچر، ثقافت اور ذہنی انتشار یا تعمیر کے انکشاف میں سما گئی ہے۔ آرٹ اور ادب انسانوں کی سماجی اور حرکی تاریخ مرتب کر کے آنے والی نسلوں کو زیادہ روشنی دکھا سکتے ہیں۔ واقعات اور حکمتِ عملی (STRATEGY) کی غلطیوں اور نا فہمیوں کے ساتھ غلط جذباتی رویئے بھی یہ بتاتی رہیں گی کہ کہاں اِنسانوں نے غلطیاں کی ہیں۔ اور کہاں انہوں نے صلح و آشتی سے محبت کا دامن تھام کر اِنسانیت کی تعمیر کی ہے اور کب اپنی منافرت سے قوموں کے پرخچے اُڑا دیئے ہیں۔

"آج سخت حملہ ہونے والا ہے ماں میں کہتا ہوں کامیشر مطلب کے ہاں کیوں رات کو پہرہ دیتا ہے آج شام ہی سے اُسے گھر بلا لو،" پرمیشر نے دیوان گھرانے کی مسماۃ سے کہا۔

"کیوں بلا لوں اُسے؟ پرمیشر بیٹا! تم بُرے لوگوں کی صحبت چھوڑ دو۔ میں کہتی ہوں تم بھی کامیشر کے ساتھ اپنے بھائیوں کی حفاظت کرو۔" (کل اور آج)

ماں کی اس آواز میں ہندوستان کی سرزمین بول رہی ہے جہاں ہندو مسلمان مختلف المذہب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے تھے اور جہاں اب بھی بہت سارے انسان ایسا سمجھتے ہیں اور پرمیشر کا "بس بس! بھائی" کہہ کر ان جذبات کا مذاق اڑانا ایک بھٹکی ہوئی اُمنگ ہے جو بہیمیت کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ

"اور انقلاب کی نہریں گہری ہوتی چلی گئیں۔ ۔ ۔ ۔ من پاٹن ہوا اور دیش بانٹن۔ جمہور کہتا ہے من پاٹن صاحب آئے اور ملک بانٹ کر چلے گئے۔ قصبہ سونا ہو گیا۔ کئی خاندان دور دیش چلے گئے۔ گلفشاں سے نزدیک کی حویلی ویران ہو گئی" (سکھ جھجود)

جیسے جیسے ہندوستان کی تاریخ کے ایسے ورق ہیں جو شاید کبھی بھلائے نہ جا سکیں گے۔

اختر اورینوی اپنے افسانوں کو ابلاغ سے بچانے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ ادب کا تصور بغیر ابلاغ اور مقصدیت کے بے معنی ہے لیکن اُن کا ابلاغ محتاجی نہیں۔ اُن کی تبلیغ محسوسات اور ادبی حسن کے راستوں سے ہوتی ہوئی سماجی مسائل کو اپناتی رہی ہے جس کی وجہ سے اُن کے افسانوں میں ہمیشہ قائم رہنے والا حظ شامل ہوتا گیا ہے یا کم از کم بہت دنوں تک خیالات اور محسوسات میں یہ متحرک رہے گا۔ ان میں وقتی جوش اور جھنجھلاہٹ نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے جذبات اور خیالات کو حرکت میں لاکر ایک دیرپا عمل کی پیروی کے لئے انہیں تیار کرتے ہیں۔ نفسیات اور احساسات کا جواب صلاحیتوں کو چھوتے ہیں اور ہمیں حالات کے ساتھ خود کو بدلنے اور مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور چونکہ اُن خیالات اور واقعات کا سر رشتہ عوامی زندگی سے ہاتھ آیا ہے اسلئے ایسا ادب اپنا تاثر شاید کبھی نہ کھوئے گا۔ مکان کی تلاش، ممتا، آپ؟، جوئیں، نابیٹا، کل، آج، کل، دو مائیں اور بیل گاڑی جیسے افسانے کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ یہ تمام افسانے اور اُن کے پیچھے کردار، ان کی تقدیر نہیں بنتے بلکہ سماجی اور معاشی ارتقا کی تاریخ میں طبقاتی جنگ لڑنے والوں کی حیثیت متعین کرتے ہیں، گو اُن میں الٰہیات، سیاست اور فلسفہ کی حقیقتوں کی لہریں بھی شامل ہیں ایسا ہے؟ (کاش اس افسانے کا کوئی اور نام رکھا گیا ہوتا) کا منجلا "یکہ بان" "ہوتا ٹر بھیٹ، موٹر بھیٹ"۔ یکہ سوچتا۔ موٹر پر کھاؤ دھکا ہے کہ اس معاشی، سائنسی اور اقتصادی مقابلہ COMPETITION کے قلیلے سے نادانستہ طور پر دوچار ہوتا ہے جس نے موٹر کو میکانکی طریقوں میں لاکر یکہ پر اس کی برتری کو مسلم کر دیا ہے اور حصولِ معاش کے لئے ایک بہتر اور

تیز رفتار آلہ "کار بنا دیا ہے۔ جس سے لیسپا ہو کر یکّہ والا ایک طرف تو معاشی دور میں پیچھے رہ جاتا ہے اور دوسری طرف منقسم اور تقدیر کے راستوں سے ہوتا ہوا انسانیت کی طرف بھی جا سکتا ہے اور خود فکر کی اس وادی میں بھی بھٹک سکتا ہے جہاں سرمایہ دار طبقے کے اس پُر فریب تصوّر اور تخیّل کو مدد مل سکتی ہے کہ ان کا طریقہ کار اور پیداواری طریقے مکمل ہیں اور اونچ نیچ کی تفریق یقینی ہے جس سے موٹر کا مالک یکّہ والے سے بہتر رہے گا۔ اور اسی طرح یہ نہ بدلنے والے حقائق رہیں جو دوز بروز اُسے پستی کی طرف گراتے جائیں گے۔ لیکن یکّہ بان اپنی کم تری کو اپنی تقدیر اور مقسوم نہیں مانتا۔ یہی افسانہ نگار کی رجائیت اور اس کے نقطہ نظر کی وضاحت ہے جب موٹر والا دیہات لے کر چلتی ہے تو یکّہ والا جھنجھلا کر اپنی روزی چھیننے والے کا پیچھا بھی کرتا ہے مگر جاندار اور مشین کا مقابلہ کب تک۔ آخر ہار کر پیچھے رہ جاتا ہے اور آخر میں حتا یکّہ بان کا سوال اُپ ہے۔ اس کی ہزیمت نہیں بلکہ ایک میدان کی تلاش کا سوالیہ نشان ہے جو اس میں رجائیت، قوتِ عمل اور حالات کے ساتھ خود کو بدلنے کی ترغیب، شامل ہے اور ایک نئی طبقاتی جنگ کا اعلان بھی۔ کاش اختر صاحب زندگی کے ایسے مسائل کی طرف اور زیادہ توجہ دیتے[عہ] ان سے یہ شکایت ضرور کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اس بھری دنیا میں بہت کم مسئلوں کو آزمایا۔ آج کی دنیا ایسی دنیا نہیں کہ تھوڑی سی رسم اور چھوٹے پیمانے پر اکتفا کر کے راز گنجینہ معنیا سمجھایا جا سکے۔ آج ارضی مسائل، صد رکینیڈی اور گاندھی جی جیسے قاتلوں کی ذہنیت (اپنا وسیع معنوں میں) اور کلا سکو، شعلہ دو، رور کیلا اور بھلائی کی فیکٹریوں سے لیکر زمین پیداوار، مکانوں کے مسئلے، فرقہ وارانہ فساد، ہر قسم کے استحصال اور معاشی مسائل سے ہوتے ہوئے چاند تک جا پہنچے ہیں اور ان مسائل کے سامنے ادب صرف رومان جمالیات اور جنس تک کیسے محدود رہے گا[عہ]

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں ان لوگوں کو بھلا ادب کی ایسی کوششوں کا سرپرست ہیں یا اس سے صرف ایسی ہی چیزوں کو پیش کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔ نہ یہ اگر گمراہ سمجھتا ہوں بلکہ اپنے ساتھ پورے معاشرے کو بھٹکا دینے والا اُسے

کھلونوں میں بہلانے والا اور انسانی ارتقاء کا منکر اور تکذیب کرنے والا بھی سمجھتا ہوں۔

اب جنس اور رومان کا تذکرہ چھڑ گیا ہے تو اختر اورینوی کے افسانوں کے اس رُخ پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ اُن کے یہاں اس مسئلے سے بھی متعلق بحث طلب افسانے ہیں۔

جنسیت نگاری افسانوں اور قصوں کا ایک اہم موضوع رہی ہے کیونکہ جنس سے انسانوں کی بنیادی دلچسپیاں وابستہ رہتی ہیں۔ اردو کیا دنیا کے تقریباً تمام قصوں اور کہانیوں میں جنسیت نگاری کی روایت اچھی خاصی رہی ہے اور ان تذکروں کو مناسب اور نامناسب بھی طریقوں سے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ایسے طریقے جن میں لذتیت، اپنی حدوں سے گذر کر انسانوں کو غلط طریق کار پر اکساتی ہے اور جو جنس کی بے راہ روی کے راستے دکھاتی ہے جن میں گرفتار ہو کر انسانی ذہن اس سماجی شعور سے ہٹ جاتا ہے جو اسے آزادی، غلامی اور سیاسی و سماجی الٹ پھیر کی آگہی دیتا ہے جو زندگی کے صحیح اور غلط محرکات کے فرق کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔ اختر صاحب نے کبھی ایسی بے راہ روی کے راستوں میں اپنے افسانوں کو لے جانا نہیں چاہا۔ وہ کبھی فرائیڈ کے گورکھ دھندوں میں نہیں پھنستے۔ ان کے یہاں جنس کے تذکرے عشق، رومان اور نفسیات کے پیچیدہ مگر صحیح راستوں سے گذرتے ہیں۔ سمنٹ کی راشدہ اور ہاشم کی طرح، بندرہ منٹ کے قفس کی طرح' "دُنا ناٹ" کا میاں بیوی کی صورت میں جو دبی ہوئی جنسی خواہشات میں خوطے نہیں لگاتے اور نہ عشق و محبت کے MORBID اور مجرو راستے اختیار کرتے ہیں بلکہ زندگی کے ابھی نا پید اکنار سمندر کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر کے ایک وسیع فضا میں تیرتے ابھرتے ہیں۔

"آدھی بات یہ کہ میاں بیوی لڑتے رہتے تھے۔ مہینہ ختم ہو رہا تھا اور گھر میں پیسوں کی سخت قلت تھی۔ ہر مہینہ کچھ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ جیسے جیسے تاریخیں بڑھتی جاتی تھیں اس کی بیوی کی چڑچڑاہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی اور مہینہ ختم ہوتے ہوتے تو میاں بیوی میں باقاعدہ لڑائی شروع ہو جاتی۔" (دُنا ناٹ)

پھر محبت عود کر آتی ہے۔ وہ رشتے سر اٹھاتے ہیں جنھوں نے تخلیق آدم کے لئے اپنے جال مرد اور عورت پر ڈال رکھے ہیں لیکن زندگی کی چکی رہتی بار بار

عـہ اختر صاحب عرف رومان، جمالیات اور جنس ہی نہیں بلکہ زرا زمیں اور معاشیات و جدلیات کی تنگنائیوں سے بھی بلند ہیں۔ ۱۷|۱

عـہ اختر صاحب زندگی کے زیادہ گہرے اور حقیقی مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ انسانیت کو طبقوں میں بٹا ہوا نہیں بلکہ ایک متحدہ کنبہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ارتقا کی شرط تضاد اور ٹکراؤ نہیں بلکہ توافق اور ملاپ ہے ۱۷|۱۲

نتیجوں کی طرف کھینچے لے جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسی طرح ڈوبتے ابھرتے زندگی گذرتی جاتی ہے۔ اختر صاحب بڑی ہوشیاری سے اس ترش و شیریں داستان سے متھ کر اس زہر کو نکال لیتے ہیں جس نے انسانوں کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔

"جس نظام دہر نے اُسکی بیوی سے پھول اور بچے چھینے تھے اس کے خلاف اس کا غضب بھڑک اُٹھا۔ اسکے دماغ میں ڈائنامائٹ پھٹ رہا تھا جو فائلوں سے انباروں اور سارے دفتر کو ریزہ ریزہ کرکے خاک بنانے پر تیار تھا۔" (ڈائنامائٹ)

"زیتون اور معاّلو سے وہ چھیڑ چھیڑ کر "بڑی بڑی باتیں" پوچھتی۔ گاؤں اور گلیوں میں چلتے پھرتے مردوں کو جھانکتی۔ عورتوں کی ٹولیوں میں بیٹھ کر بھکڑ دیکھتی۔ گالیوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پیتی مگر اس کی تشنگی دور نہ ہو پاتی۔" (ممتا)

یہ حالت اور نفسیات اس عورت کی ہے جو کمسنی میں بیوہ ہو جاتی ہے اور جس کے یہاں جوانی اور جنسی خواہشیں یہ صورتیں اختیار کرتی ہیں یہاں تک کہ اسے ایک منشی جی سے دلچسپی ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک معصوم انسان تولد ہوتا ہے لیکن دنیا اپنے دستور کے مطابق اس معصوم کو گناہوں کی پوٹلی سمجھتی ہے اور جب قصہ کے اختتام پر ناجو اپنے پہلے شوہر کی لڑکی کو کوٹ ایک شلوار اور ماسٹر کی بلاؤز چھپٹ کر اپنے نوزائیدہ بچے کو سردی سے بچانے کے لئے پہن لیتی ہے جو اس کا منشی جی کی نئی بیوی نے دی تھی تو اختر صاحب کا شعور نمایاں ہو جاتا ہے جو پورے افسانے میں دبے پاؤں اس کا نفسیاتی اُتار چڑھاؤ کے ساتھ جنس کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ساتھ چلتا رہا تھا۔ اور پڑھنے والوں کا ذہن، نظام کی اس سماجی اونچ نیچ کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے جہاں استحصال ہے سماجی بھی اور جنسی بھی، نفسیاتی اور معاشی مجبوریوں کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ اخلاق کی کم مائیگی ہے، ناجو کا افلاس، منشی جی کی بے وفائی کو پسِ پشت ڈال کر اسکی بے وفا کے عطیہ سے اپنی فوری ضرورت پوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اس کا بھی احساس نہیں رہ جاتا کہ کوٹ جس سے وہ کپڑا چھپٹ کر پہن رہی ہے وہ بھی اسی کی جوان لڑکی کا ہے جو کڑکڑاتے جاڑے میں سردی سے اکڑ رہی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام تک پہنچتی ہے جس کی بنیادیں ابھی بھی کھوکھلی پر قائم ہیں اور جہاں رحم و انسانی ہمدردی کے جذبہ کو کوئی جگہ نہیں ملتی۔

اختر اورینوی کے ایسے تمام افسانوں میں زندگی کا الٹ پھیر جنسی دباؤ پر چھا جاتا ہے اور اُن کی بصیرت سماجی زندگی کی اس غلط تقسیم کو درنج کر دیتی ہے جو انسانوں کو اقتصادی طبقوں میں بانٹتی ہے۔

آخر میں اب اختر اورینوی کی زبان کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے افسانوں میں بڑی موثر اور جذباتی زبان استعمال کی ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ الفاظ اور جملوں کے ذریعہ پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر جائیں اور اُن کیفیتوں کا جلوہ اپنے قارئین کو بھی دکھا سکیں جو انھوں نے دیکھے اور محسوس کئے ہیں۔ اور جب انھیں اپنے جملوں سے تسکین نہیں ہوتی تو برمحل حافظ اور غالب کے اشعار سے یا اُن اشعار کی ترکیبوں میں استعمال کرکے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات جملوں اور محاوروں کی ناہمواری قاری پر بڑا ناگوار اثر چھوڑتی ہے۔ بہت سے الفاظ ان کی تذکیر و تانیث، ان کا محلِ استعمال، کچھ محاورے اور ترکیبیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جن سے اُردو کے اہلِ زبان ناآشنا ہیں۔ اس میں کچھ تو مقامی اثرات کام کر رہے ہیں اور کچھ کے لئے محض قابل سمجھا جا سکتا ہے۔ اختر صاحب صرف افسانہ نگار ہی نہیں وہ ایک تنقید نگار اور علم اللسان کے ماہر بھی ہیں اسی لئے یہ کہنے کی ہمت ہوتی ہے کہ "مگر اس نے اپنی جوان بیوی کے لئے کبھی کوئی سوغات نہیں لایا" (منظر و پس منظر ص ۱۰۰) "انگریزوں نے خود انقلاب لایا" (کیچلیاں اور بالِ جبریل ص ۱۰۳) "ایک لانبی عورت نے ہاتھ میں سیندور لایا" (منظر و پس منظر ص ۱۲۰) "اس کی بیوی کی چال چلن خراب ہو سکتی ہے" "اونچے جہری کا عجیب القطع پاجامہ" (منظر و پس منظر ص ۷۳) "لیکن شاہد جب بی۔ اے کی امتحان کے بعد آیا" (سمنٹ اور ڈائنامائٹ ص ۱۳۶) "ایام طالب علمی ہی سے ہمیں اُن سے نیاز حاصل تھی" (سمنٹ اور ڈائنامائٹ ص ۱۳۴) وہ ہماری سماج

کی طرح ماندھی تھی۔ (رستا روپ، منظر ص۴۳) تو بیدو یا گیا، اسکی
تعویذ کچھ اور ابھر آتی (اردو کی مروجہ اور معیاری قواعد سے
ہم آہنگ نہیں ہو پاتے اور اس طرح 'سلائی پرائی' بجائے
'سینا پرونا'، 'گنی بوٹی' یا 'ستوریا' بجائے 'گنی بوٹی بیٹا تھوریا'
'کیونکر نا یا' کا لفظ مقدار کے لئے نہیں، اس استعمال میں ہمارے ہاں
کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ 'پاستانے' بجائے 'پامنتی' 'آ سکت'
بجائے 'آلس' یا 'آلست'، 'لوڑھا'، بجائے 'بٹّہ' (سل کا)
'گاڑی گھٹنا'، بجائے 'گاڑی چھوٹنا یا گاڑی چلنا' 'مان جائے'
بجائے 'مان جائے' جیسے بھی محل نظر ہیں عہ۔ زبان کے دائرے
کو تنگ کرنا، اس کا گلا گھونٹنا ہے۔ اس سے میں واقف ہوں
لیکن آپ نے کہاں جانا ہے' جیسی وسیع الفعلی بھی زبان کے
ارتقا اور وسعت پر دلالت نہیں کرتی۔ معیار کے دائرے بھی
پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں اور رہیں گے لیکن بہر حال معیار
کے قیام اور امن کی اہمیت سے انکار کبھی نہ کیا جا سکے گا۔

عہ حوالے کی کتابوں میں کہیں ایک کتابت کی غلطیاں ہیں (جیسے داستان کی جگہ)
اور بعض جگہ بے محل طلب ہیں (جیسے سماج کی جگہ)۔ ادارہ

ان حروف گیر بولنے سے قطع نظر اختر اورینوی کی زبان
میں (خاص طور پر جو زبان افسانوں میں استعمال کی گئی ہے)
ایک دلچسپ اضطرابی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان کے الفاظ کی
آوازوں میں ایک حس ہے جس سے انسان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا
ہے اور زمانے اور سماج کی ناآسودگی کے گھٹتے ہوئے بادلوں اور حادثوں کی فضا پر
چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ گو افسانے واقعات کی کڑیاں بہت
آہستہ روی سے کھولتے ہیں مگر ان کا مطمح نظر تغیر اور تبدیلی کے لئے ہوتا ہے۔
انسانوں کی جماعت کے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی ہے اسی کا [illegible] کا
حامل ہے۔ اس اضطراب میں ایک نئے راستے کی تلاش کی گردکاوش
اور سماج کی منافقت پالیسی اور سماج کے اتحاد سے ساگر سے امید کے
ساحل پر پہنچنے کی چند بشارت پوشیدہ ہے۔ ان کے افسانوں
کی زبان میں یہی اضطرابی روح ہر جگہ دوڑتی نظر آئے گی جو
حرکت اور عمل پر ان کے عقیدے کو اور مستحکم کرتی جاتی ہے۔

عہ ان مثالوں میں اختر صاحب کے پیش نظر بہاری محاورہ رہا ہے۔ اسلئے
کہ کھڑی بولی اور بہار کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں کرتی یا لکھنؤ یا دہلی معیار
فصاحت ہو۔ پھر کرداروں کی زبان میں مقامی رنگ پیدا کرنا بھی
افسانہ نگار کے فن کا ایک حصہ ہے ۔ ادارہ

بہزاد فاطمی

اختر اورینوی کی شاعری

(تعارف اور تبصرہ)

بیسویں صدی کے اوائل میں ریاست بہار کے مشرقی افق سے ایک ایسا ستارہ طلوع ہوا جس نے اپنی تابانی سے نہ صرف اپنے قصبہ کو جگمگایا بلکہ اس صوبے کی عظمت کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ اس اختر تابندہ نے جسے اختر اورینوی کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ اپنے وطن (اورین) کو بہار کے ادبی جغرافیا میں ایک ممتاز جگہ عطا کردی۔ اردو زبان و ادب کا مورخ اس سرزمین کو نظر انداز نہیں کر سکتا جسے اختر کی جنم بھومی کا شرف حاصل ہے۔ اور جو اس کے نام کا جزو لاینفک بن کر شہرت دوام کی مستحق بن گئی۔ چوتھائی صدی میں سے بھی کچھ زیادہ عرصہ گزرا میں پٹنہ کالج کا متعلم تھا۔ اس وقت اساتذہ میں الحاج پروفیسر عبدالمنان بیدل اور (الحاج) پروفیسر حافظ شمس الدین احمد کی ہستیاں نہایت ہی اہم اور مقبول تھیں۔ بیدل کی زندہ دلی اور شمس کی سنجیدہ متانت اس محفل ادب میں گنگا جمنی رنگ بکھیرتی رہی۔ بعد میں اختر کی شمولیت سے اس گنگا جمنی محفل میں کہکشاں سی سج گئی۔ اس دانش کدے کی ادبی فضا کا اثر سمجھئے یا ان اصحاب ثلاثہ کا سلیقۂ انجمن آرائی کہ اس بزم کہکشاں کے ستارے آج صوبے کے ہر ادبی گوشے میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ بیدل اور شمس تو اپنا کام پورا کرکے سبکدوش ہو گئے۔ اختر آج بھی اسی مسند کی زینت اور طلبہ کے محبوب استاذ ہیں۔ ان کی تقریروں کا جادو آج بھی ذہنوں کو بالیدگی بخشتا اور نوجوان دماغوں میں توانا ادب کی تخم ریزی کرتا ہے۔

اختر اورینوی شخصیت کے اعتبار سے نکلتے بلند قامت، وجیہ اور جامہ زیب انسان ہیں۔ جن کی گداز آنکھیں "شکست رنگ رخ" کی مظہر نظر آتی ہیں۔ طبیعت کے لحاظ سے باغ و بہار آدمی اور بڑے مخلص دوست ہیں۔ مزاجاً شگفتہ ہیں جن کی خوش گفتاری موقعہ اور محل کے اعتبار سے لطیف طنز و مزاح کا ہلکا سرور بخشتی ہے۔ کبھی کبھی یہ سرور آفریں حالات کی بنیاد پر صہبائے تند کی تلخیوں میں بھی بدل جاتا ہے۔ یہ تلخیاں ناگوار سہی، دیرپا نہیں ہوتیں۔ احساسات کی چبھن سے پیدا ہونے والا یہ عارضی تغیر ایک فطری عمل ہے۔ ذہنی طور پر ایک خوش فکر مفکر اور محقق کی حیثیت سے ایک کامیاب پروفیسر۔ یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے کر محقق ہونے کی سند بھی دے دی۔ لیکن اس اعزاز سے بہت پہلے ہی ان کی رنگا رنگ شخصیت اپنا ایک مخصوص اور قابل رشک مقام بنا چکی تھی۔ ایک کامیاب پروفیسر ادیب اگر ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ادیب بھی ہو۔

اختر اورینوی ایک بہ دلیسر بھی ہیں اور ایک بلند پایہ ادیب بھی، با شعور فن کار اور ایک چابک دست ادیب گر بھی۔ ان تمام اوصاف کے حسن کارانہ امتزاج نے اردو ادب کو کیا دیا؟ اس کا جواب آئندہ سطریں دیں گی۔

فنی تنقید پر جس کی نظر ہے وہ اختر اورینوی کو ایک باشعور اور سلجھا ہوا نقاد سمجھتا ہے جنہوں نے ان کے افسانے پڑھے ہیں وہ انہیں درجۂ اول کے افسانہ نویسوں میں شمار کرتا ہے جس کی رسائی ان کے ڈراموں تک ہے۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اختر نے اس فن میں بھی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ جس نے ان کی تقریر سنی ہے وہ ان کی سحر بیانی کا قائل ہے۔ جو صرف انشا کی لطافتوں کا دلدادہ ہے وہ انہیں ایک کامیاب انشا پرداز مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور شعری ادب کا شیدا انہیں ایسا شاعر سمجھتا ہے جو فطرۃً رومان پرست ہے اور بہ حیثیت فن کار زندگی اور حرکت پیدا کرنے والے ادب کا خالق۔ علمی کارناموں کی اس جاذب نظر فہرست میں میں نے شاعری کا ذکر بالقصد آخر میں کیا ہے۔ اس لئے کہ اختر اورینوی کی شاعری اس توجہ سے اب تک محروم ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ اور آج میرا موضوع سخن بھی یہی ہے۔

محترم بجا ہیں نے اپنے ایک مضمون "عصر حاضر میں بہار کے شعرا" (مطبوعہ ندیم بہار نمبر) میں اختر اورینوی کی شاعری کے متعلق مجموعی طور پر کچھ اشارے کئے تھے۔ آج ذرا تفصیل کی جرأت کر رہا ہوں۔

سون کی وادی میں رقصاں لہریں غزالوں کا ہجوم

یہ ابتدائی نظم اختر کے اصلی رنگ طبیعت کی غماز ہے۔ اپنے احساس بکھران کو الفاظ کے پیکر میں والہانہ اور فنکارانہ انداز سے اس طرح ڈھال دینا کہ اس کی لذت دوسروں کیلئے بھی عام ہو جائے۔ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ "غزالوں کے ہجوم" میں "بجھتے ہوئے ستاروں" کا "خندۂ بے باک" اور "آنچلوں کی لہریں" "لالہ زاروں کا ہجوم" شاعر کی اپنی دنیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دوسروں کیلئے بھی "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" نہیں؟ "دریائے سون" میں شاعر کا احساس جمال منظر نگاری کی قدرت کے دلکش پیرائے میں نظر آتا ہے ؎

مرمرِ سیال ہے تو سون یا سیم رواں

نور کی پریاں فضاؤں میں تری ہیں پُر فشاں
تیرے دامن میں ہیں کتنے جلوۂ دلستاں
سرسبز تو ہے تو رود بار تیز رو
تو سراپا حسن ہے آماجگاہِ نور و ضو

لیکن اس کی نگاہیں مرمرِ سیال ہی پر جم کر نہیں رہ جاتیں اس "آماجگاہ نور و ضو" کے آئینہ میں ایک دوسری تصویر بھی نظر آتی ہے۔ اس "فروغ نور دیدہ" اور "مست رو ساقیِ خمستان بہار" کی پیہم روانی سے خرام زندگی کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اگر یہ ایک جانب اپنی گرمی عمل سے سبق آموز ہے تو دوسری جانب ہماری عظمت رفتہ کا افسانہ خواں بھی۔ منظر جمال سے یہ گریز دعوت فکر ہی نہیں ایک تصویر ہے رواں دواں جو بھی تیز روی کی تلقین ہی اور آگے بڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔ سون کی دلکش وادی شاعر کا محبوب موضوع سخن ہے۔ اس گلفام وادی کے ذرے ذرے میں جلوۂ جمال نظر آتا ہے۔ اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جب اس کا حساس دل پکار اٹھتا ہے ؎

دل کی تاریک خموشی ابدی لذت کا سوز
مرگ ہے حشر محبت کا ہے پیماں دلدوز
کالعدم عشرت فردا ہے پا بستی اور حبل
دامن گرد کو پکڑے ہوئے کیوں ہے بیکل!

احساسات کا یہ متضاد اتار چڑھاؤ حقیقت اور تخیل کے اعتبار سے عین فطری ہے۔ اسے اس وادی سے بے پناہ محبت ہے۔ بے پناہ محبت۔ یہی محبت جب اپنی ارتقا کی منزل طے کر لیتی ہے تو اپنے دامن میں سارے ملک کو سمیٹ لیتی ہے۔ جب وقت پڑتا ہے تو یہی جذبہ انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ابل پڑتا ہے ؎

جلوۂ صد رنگ کی تیرے تمدن میں بہار
آبرو گنگ و جمن کی بن گئے ہیں آبشار
ہے فضائے ہند پر پہلو سے رحمت در کنار
جس کی جلوہ گاہ میں تسکین قلب بیقرار
سرنگوں کیا تیری عظمت کے لئے دیوانہ وار
اے وطن! اے میرے وطن! پیارے وطن ہندوستان

جمالیات کا دلدادہ شاعر اپنے وطن کی آبرو بچانے کیلئے "مل من مبارز" کا نعرۂ جہاد بھی بلند کرنے کی اہلیت رکھتا ہے ؎

چشم دشمن اس طرف اٹھی ہے پھوڑ دی جائے گی
چال بازوں کی کلائی بھی مروڑ دی جائے گی
ظلم کی دیوار ہر جانب سے توڑ دی جائے گی
بے خطا کی قوم قوت سے جھنجھوڑ دی جائے گی
موج مغرور ستم ہمت سے موڑ دی جائے گی
اے وطن! اے میرے وطن! پیارے وطن ہندوستان

اختر کا ذوق جمالیات محض منتخب موضوعات ہی تک محدود نہیں ان کی کائنات وسیع ہے۔ ان کا جذبۂ تجسس کچھ اور گوشے بھی ڈھونڈ لیتا ہے جن کی آغوش میں تسکین نظر کا کافی سامان ہو۔ لیکن ان گوشوں تک پہونچ جانے کے بعد یہ داستان جمال اپنا رخ بدل دیتی ہے۔ انداز نظر بدل جاتا ہے۔ راہ بدل جاتی ہے۔ منزل بدل جاتی ہے۔ مرکز ہی خیال بھی بدل جاتا ہے۔ یہی زندہ اور توانا ادب کی پہچان ہے جو جدید ذہن و فکر کو بالیدگی بخشتا ہے۔ دعوت فکر و عمل دیتا ہے ؎

زلف کی لٹ رخ پہ لہرائی ہوئی عشرت نشاں
روح کی تسکین جیسے پرچم امن و اماں
گنگناتی چوڑیاں کھنکیں دست نازک کی رہیں
رقص کے دستے جو گاتی ہوئی سنگر مشین
کھیلتی تھی پھول سے لب پہ کبھی موج سرور
ناچتا تھا نگاہ انگڑائی میں شیریں سا غرور

لیکن اس انبساط آگیں اور ترنم ریز وادی تک پہونچنے کے بعد توسن فکر قصیدے کی گریز کی طرح باگ موڑتا ہے ؎

آہ یہ دنیا یہ کشت و خون کے میدان فساد
حیف یہ تہذیب حاضر کا نظام بد نہاد
الاماں سرمایہ داری کی نگاہ زہر ناک
کر رہی ہے مشرق و مغرب میں انساں کو ہلاک
مفلسی کے جور سے پیسوں میں بکتی ہے حیات
جنگ کے مقتل میں ملتی ہے اسے غم سے نجات
الحذر سرمایہ کے قبضہ میں آئے جب مشین
چیخ اٹھتی ہیں فضائیں خون روتی ہے زمیں

ظاہر ہے کہ اختر نے کوئی انوکھی اور چونکا دینے والی بات نہیں کہی ہے۔ رتنی آہن اور دست تخت کشی کے مناسب سے ہزاروں باتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اور بنائی بھی گئی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ بات کرنے کا سلیقہ کیسا ہے۔ تہذیب حاضر کے نظام بد نہاد اور سرمایہ داری کی نگاہ زہر ناک کو "آتشی سیال" ہی کہہ کر زبان شعر میں کوسنا منظوم نعرہ بازی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کا ردعمل تخریبی ہے تعمیری نہیں۔ اختر کے لب و لہجے میں وقار ہے، تمکنت ہے، تعمیری جذبہ ہے خلوص ہے، ہمدردی ہے۔ یہی انداز فکر ایک کامیاب نظم کو افادیت کے دوش بدوش کر دیتا ہے۔ شاعر محض کھوکھلی نعرہ بازی سے کام نہیں لیتا۔ اس کا مفکر دماغ اس گتھی کا حل ڈھونڈ نکالتا ہے ؎

ہے مگر لوہے کی فطرت میں بھی انداز جمیل
برق کی سوزش محبت سے ہو گلزار خلیل

اس کے بعد اس کا یہ اعتراف بڑے پتے کی بات کہہ دیتا ہے ؎

جانتا تھا میں کہ لوہے سے برس سکتے ہیں پھول
آج میں نے اس حقیقت کو کیا دل سے قبول

نظم "جشن جمہوریہ" اپنی ضخامت کے ساتھ ساتھ شاعر کے مخصوص رنگ کی ترجمانی کرتی ہے ؎

یہ رقصِ سرِ نغمہ یہ بجتے ہوئے گھنگرو
یہ وادیٔ پنجاب کا چھلکا ہوا آہو
یہ بولتا گاتا ہوا اشکال کا جادو
دوشیزہ دوشیزوں کی چلتی ہوئی خوشبو
جھاڑی کے گلستاں میں یہ اڑتے ہوئے جگنو
سلجھے ہوئے گیسو! ملبوس کی خوشبو!

تو ہی یہ جیتی جاگتی دل کش منظر اور رُومانی ماحول کی اس فرح ناک اور نرم خنکی میں وہ چند گھٹے ہوئے احساسات کے نشتر کی چبھن بھی محسوس کرتا ہے۔ اس خلش کو نہایت بے باک مگر باوقار لہجے میں بیان کرتا ہے ؎

اس دل کو کروں کیا کہ یہ بجھتا ہے سرِ شام
ہنگامۂ رنگیں میں نہیں گوشۂ آرام
بیگانۂ منظر ہی یہ بے صبریٔ ایام
پھولوں کی کرن میں ہے عیاں ناوکِ آلام
ہے خندۂ محبوب میں بھی نشترِ انجام
یہ دردِ تہِ جام! یہ دردِ تہِ جام!

پھر بھی وہ نشترِ انجام کی خلش ہی پر بات کو ختم نہیں کرتا۔ دردِ تہِ جام کی مجبوری کیفیت سے نہیں اکتاتا۔ اس کا اندازِ فکر متحرک ہے۔ اس شعر زدہ گزرے عکس میں ایک دوسرا ہی نقشہ نظر آتا ہے جو بہاروں کی طرح شاداب اور فرح ناک ہے ؎

تاریکی و انوار میں بھولی نہیں تعمیر
انساں ابھی آلام و مصائب کا ہے نخچیر!
تدبیرِ خود آرا سے پلٹ دوں گا میں تقدیر
اشکِ مرے خوابِ محبت کی یہ تعبیر
پھیلے گی مگر تازہ بہاروں کی بھی تنویر
ہرگز! نہ ہو دل گیر! ہرگز نہ ہو دل گیر
ہرگز نہ ہو دل گیر! ہرگز نہ ہو دل گیر!
وہ دیکھو افق پر ترے ارماں کی ہے تصویر

ایک ہوشیار فن کار تاثر کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کے لیے تکنیک کا بھی سہارا لیتا ہے۔ آخری بند کی تکنیک میں ایک ہم آہنگ تبدیلی کرکے اختر نے ایک طرف تو اپنے یقینِ محکم کی مہر ثبت کردی دوسری جانب اس کو تاثر سے بھرپور کردیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ جمالیات کا پرستار شاعر "جنت" سے انکار کی جرأت کیسے کرسکتا ہے۔ اس کا سبب خود اختر کی پرلطف زبان سے سنیے ؎

قصر ایواں ہیں مگر خانۂ برباد کہاں
مطمئن قلب سہی پر دلِ ناشاد کہاں
دودھ کی نہر تو ہے کاوشِ فرہاد کہاں
گلشنِ خلد میں بجلی کہاں صیاد کہاں

جامِ نوشیں تو ہیں جنت میں مگر نیش نہیں
مہرباں حور تو ہیں حسنِ ستم کیش نہیں

ایک بے کیف تسلسل مجھے مطلوب نہیں
مجھ کو بے خار گلستاں بھی مرغوب نہیں
عشرتِ عزم شکن شوق کو محبوب نہیں
عیش کوشی دلِ مجذوب کا اسلوب نہیں

دائمی موت دے یا قسمتِ سیمابی دے
دلِ مضطر کو مرے دردِ بے تابی دے

ممکن ہے "دے" کی "دے" کا ایک جگہ نہیں دو دو جگہ دب کر نظم ہونا عروض کے طالب العلموں کو الجھن میں ڈال دے۔ اس کا معقول جواب یہی ہوگا کہ شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد۔ دیکھنا یہ ہے کہ قصرِ ایوان اور خانۂ برباد۔ قلبِ مطمئن اور دلِ ناشاد۔ دودھ کی نہر اور کاوشِ فرہاد۔ جامِ نوشیں اور نیش۔ حورِ مہرباں اور ستم کیشی کے امتزاج نے جو لذت پیدا کردی ہے وہ بے اندازہ ہے یا نہیں! اسے بھی جانے دیجئے۔ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟ کس طرح کہتا ہے؟ اس کا نظریۂ حیات کیا ہے؟ کہنا کیا چاہتا ہے

اور کس طرح کہتا ہے۔ اس کا احاطہ تو مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ منظریہ حیات کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ہم اس نظم کے الفاظ پر غور کرتے ہیں صرف عیش کوشی شاعر کا اسلوب نہیں۔ جام نوشی کا وہ طلب گار نہیں حور کی مہربانی کا متمنی نہیں۔ قلب مطمئن کی حاجت نہیں۔ بے کیف تسلسل کا خریدار نہیں۔ اسے تو طلاطم چاہیے۔ کاہش زیاد چاہیے۔ نیش کی خلش چاہیے۔ دل ناشاد کی کسک چاہیے اور حسن ستم کیش کی ستم رانی چاہیے۔ وہ خطروں میں پڑنے کا عادی ہے۔ اور جہد مسلسل کا مدعی۔ ان باتوں کی جنت میں کہاں گنجائش۔ کیونکہ ؎

تیری جنت میں تو جو چاہیے ہو جاتا ہے
قلب مضطر کو قرینہ یہ نہیں بھاتا ہے

بڑے لطف کی بات تو یہ ہے کہ شاعر قصر فردوس کے مادی تعیش اور نوازش بے پایاں سے انکار بھی نہیں کرتا لیکن اس کی خوددار اور بے لوث محبت کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ؎

حرمت عشق کو اب کبھی سبک نام نہ کر
سرفروشانِ محبت کو تو بدنام نہ کر
چشم بے دید کے مارے کو عطا جام نہ کر
دے کے فردوس مرے شوق کو ناکام نہ کر
حور و رضواں سے نہیں ہونے کی تسکین مری
بندہ پرور! بھری محفل میں یہ توہین مری

اختر کے سحر کار قلم نے خارجی مصوری کے بھی نمونے پیش کئے ہیں ؎

وہ کاکل پر پیچ کے بل کھول رہی تھی
یا آلۂ تسخیر کو وہ تول رہی تھی
محبوب اداؤں کے گہر رول رہی تھی
وہ زلف رسا تا بہ قدم آئی ہوئی تھی
بکھری ہوئی مچلی ہوئی لہرائی ہوئی سی
بدمست جوانی پہ گھٹا چھائی ہوئی تھی

وہ فتنۂ گیسو کو تھی ہاتھوں سے سنبھالے
لیکن وہ مچل جاتے تھے سو ناز کے پالے
پہرے پہ جوانی کے خزانے کے تھے کالے
تھا جسم فسوں ساز میں پھیلا ہوا کاجل
شانے پہ وہ ڈھلکا ہوا سرکا ہوا آنچل
جھکتی ہوئی گردن کا دمکتا ہوا صندل

ماتھے پہ تھا ٹوٹا ہوا اک تار سا ٹیکا
کملایا ہوا چہرہ پہ تھا صبح کا تارا
نکھرے ہوئے چہرے پہ مچلتا ہوا غمزا
ابروئے خمیدہ میں پلا فتنۂ دوراں
غنچے سے حسیں کان میں آویزہ لرزاں
سر تا بہ قدم لوٹتی تھی وہ گلستاں
وہ نیم نگاہی سے مجھے لوٹ رہی تھی
پیراہنِ نایاب سے یہ پھوٹ رہی تھی
اور نبض زمانے کی ادھر چھوٹ رہی تھی

——— (جلوۂ گریزاں)

رخ صندلی پہ بہار بہشتی جبیں حسیں پہ کلی سی وہ ابھری
عجب دلفریبی
کنول نین بیاکل نشیلی کبھی تو ہٹیلی کبھی ہے لجیلی
غضب کی رسیلی
گھنیرے ہیں گیسو کہ راز بہاریں کہ وسطِ بہاراں کا خواب خماریں
جمال نگاریں
وہ گردن پلٹ کر خمیدہ نگاہی تمنا کو جھٹک خرد کی تباہی
گئی بے گناہی
(تماشا)

ان اقتباسات پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہر صاحب

ذوق ان تصویروں سے یکساں طور پر لطف اندوز ہو سکتا ہے ؎

قلم کی آڑی ترچھی لکیروں سے نقش کھینچ دینا آسان ہے۔ عبارت سے ایک اچھی تصویر بھی بن سکتی ہے۔ رنگوں کے تناسب اور ان کی حسین آمیزش سے کسی داخلی کیفیت کا اظہار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کو نطق خاموش عطا کرنا ایک دشوار ترین امر ہے۔ یہ کام ایک باشعور اور باکمال مصور کا ہے۔ بجنسہ یہی حال شاعری کا ہے۔ شاعر اپنے لطیف احساسات الفاظ کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ مجرد تنہا ان داخلی احساسات کو اپنے تاثرات کے ساتھ پیش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے وہ ان سب تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا لیتا ہے مگر ان تشبیہوں اور استعاروں سے خاطر خواہ کام لینا فنی مہارت اور زبان پر قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔ شاد کے موئے قلم سے کھینچا ہوا ایک داخلی کیفیت کا دل آویز مرقع پیش نظر کیجئے۔

خیال وصل کو اب آرزو جھولے جھلاتی ہے
قریب آنا دل مایوس کے اور دور ہو جانا

اور اب اختر کی بنائی ہوئی یہ تصویر بھی دیکھئے ؎

موج نازک سے عبائے شوخ کی مستانہ وار
مخملیں سبزے پہ جیسے برگ گل کی ہو پھوار
جس طرح پانی کی چادر پر نشیلی رات کو
بارش شبنم بنائے ریشمیں شکنوں کا ہار
جیسے بیمار محبت کی تھکی پلکیں جھپکیں!
دھیرے دھیرے دل پہ چھایا جائے نغمے کا خمار

یہاں پر مجھے موازنہ کرکے حماقت کا ثبوت دینا نہیں۔ بلکہ دکھانا یہ چاہتا ہوں کہ معمولی سی معمولی کیفیت کا بھی اثر سامع کے ذہن پر بجنسہ مرتسم کرنے کے لئے شاعر کو کن دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ ان منزلوں سے گزر گیا تو یہ شاعری نہیں معجزہ ہے۔

میں اختر اورینوی کی ابتدائی زندگی اور نجی حالات سے واقف نہیں۔ اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ شاعر کا کلام ہی وہ آئینہ ہے جس میں اس کی زندگی کے اہم پہلو جھلک جاتے ہیں۔ ان کی بعض نظموں کے مطالعے سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذہنی تربیت میں مذہب کا بھی ایک نمایاں حصہ رہا ہے۔ اور وہ اس تربیتی ورثے کو نہایت ہی افتخار کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ اپنی ایک نظم "ایک مجاہد فلسطین کے افکار" میں کہتے ہیں ؎

اے فلسطین! جوش ایماں اب بھی ناداروں میں ہے
اب بھی جرأت کی چمک مسلم کی تلواروں میں ہے
اک گراں مایہ امانت ہے شہیدوں کا لہو
جان دے کر بھی بچاؤں گا میں تیری آبرو
تیری خاک پاک سے وابستہ ہے الفت مری
بک نہیں سکتی کسی قیمت پہ بھی عزت مری
سر تو سکتا ہے مسلماں پر یہ مر سکتا نہیں
لشکر باطل کے ہنگاموں سے ڈر سکتا نہیں
روح پرور اہل ایماں کے لئے تکبیر ہے
مرد مومن کا ارادہ خالق تقدیر ہے

اگرچہ اس نظم کا تعلق ایک خاص موضوع اور ایک خاص ہنگامی صورت حال سے ہے۔ اس کا لب و لہجہ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں اور لذت خواب سحر کی آغوش سے نکال کر اپنے وجود اور عالمیت کیلئے زندگی کی رزم گاہ میں بے خطر کود پڑنے کی دعوت دیتا ہے۔

عظمت فاروق سے لرزاں تھا قیصر کا غرور
کھا گئی عصر کہن کو میری تیغ ناصبور
تیغ سیف اللہ تھی یا برق ایماں کی چمک
آتش سینا تھی یا مومن کی غیرت کی جھلک
بو عبیدہ صاحب تدبیر و عزم و حُبّ دیں
جس کی ہر ہر بات تھی ایثار و جذبات آفریں
نخوت اعدا کا قاطع اہل ایماں کا جلال

دشمنوں کے دل میں اس وقت یاس تھا یا ملال
مسلمانوں کی سطوت پارینہ اور اس کی بنیاد رکھنے والوں کا ذکر
یہاں پر کتنا برمحل ہے۔ یہ پرجوش نظم اس دعا پر ختم ہوتی ہے۔ جو
یقیناً آمین کی مستحق ہے ؎

پھر نمایاں دل میں جوشِ حیدرِ کرارؓ ہو
عزم ہو فاروقؓ سا صدیقؓ سا ایثار ہو

ایک دوسری نظم "نوید تجلی" کے پیش منظر کی بیت ہے ؎

یہ آدم خاک کا پتلا تھا اس کی تابانی
زمیں تا آسماں پھیلا ہے اس کا نورِ پیشانی

اس کے بعد کہتے ہیں ؎

خوشا طالع! محمدؐ میں یہی نورِ مبیں چمکا
کہ معراجِ تجلی میں یہی سوزِ یقیں چمکا
یہ دورِ صد ہزار انجم یہی ہو کر نگیں چمکا
بہ اوجِ آخریں پر عرش کے بالکل قریں چمکا
زمیں کے آسماں بننے کی تدبیریں نکل آئیں
چھپی تھیں سات پردوں میں جو تقدیریں نکل آئیں

اس منظر میں شاعر نے ذرا قصیدے کا لب و لہجہ اختیار کرتا ہے
موضوع کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس قصیدہ نما نظم کا گریز اس
نعت سے شروع ہوا ہے جس کی بیت کا یہ دوسرا مصرع ہے ؎

محل خانوں میں اب ایسے بھی سامانِ ماتم ہے

محل خانوں میں سامانِ ماتم تو ہے لیکن خود شاعر کی کیا کیفیت ہے

غمِ عالم کی خبروں سے دلِ شاعر دھڑکتا ہے
لرزتا جسم ہے جان جب جنگ کا شعلہ بھڑکتا ہے
کچلنے کو بنی آدم کے جب لوہا کھڑکتا ہے
تباہی ناچتی ہے ہر طرف دانش پھڑکتا ہے
یہ جنگِ زرگری ان کی وہ جنگِ سرد جاری تھی
کہیں ہے ساحری ان کی کہیں فتنہ گری ان کی

لیکن اس پر بھی امید کی تابناک کرنیں ضو فگن ہیں ؎

مگر ہیں روحِ انساں میں نئی کرنیں ضیا افگن
اندھیرے کے پجاری بھی کریں گے شمعِ نو روشن
منور کر کے میت خود سجائے گی نئے گلشن
حیاتِ نو اگائے گی نئی تہذیب کے خرمن

ظاہر بیں نظریں یقیناً "لو بھڑک اٹھے" "لاشہ پھڑک اٹھے" اور
"خرمن اگلنے" پر بھڑک اٹھیں گی مگر لیکن نفسِ مضمون پر نظر رکھنے
والے ان لفظوں کی پروا نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں
بھی موقع آیا ہے اختر نے ہمیں امید کی کرنیں دکھائی ہیں۔ وہ
تاریکی سے بیزار ہیں۔ یاس اور احساسِ ناکامی کو ذہنی اضمحلال
سمجھتے ہیں۔ ان کا مفکر دماغ رجائی اور تعمیری ادب پیش کرتا
ہے۔ انھوں نے آندھی کی رو میں جلتے ہوئے چراغ کو دیکھا ہے۔
اس سے انھیں ہمدردی ہے۔ وہ اس کی صرف ثنا خوانی ہی نہیں
کرتے بلکہ اس کے عزم و استقلال کی پائندگی پر یقین کامل رکھتے
ہیں۔ انھیں پورا بھروسہ ہے کہ یہ طوفانی لہر جلد ہی گزر جانے والی
ہے۔ یہی یقین محکم ہمیں ایک نئے اور بالیدہ نظام کا مژدہ سناتا ہے

اختر کی شاعری دل کی بھی ہے اور دماغ کی بھی۔ ان کی نظموں
کے خرمن میں حسنِ ستم پیشہ کی بجلیاں ہیں۔ اور عشقِ وارفتہ
مزاج کی والہانہ شیفتگی بھی۔ جنوں کی جاں گدازی بھی ہے اور خرد
کی بخیہ گری بھی۔ حدیثِ یزداں بھی ہے۔ اور افسانۂ اہرمن بھی۔
ہے انگبیں کی لاگ بھی ہے اور طاعت کا سرور بھی۔ نمازِ عشق
بھی ہے۔ اور نمازِ حسن بھی۔ مناظرِ فطرت کی مصوری بھی ہے
اور داخلی جذبات کی عکاسی بھی۔ عظمتِ انسان کی قصیدہ گوئی
بھی ہے اور اس کی پستی پر نوحہ گری بھی۔ مذہب کا جوش و مستی
بھی ہے۔ اور حبِ وطن کا بیدار شعور بھی۔ ماضی کی روایات
سے وابستگی بھی ہے اور نظامِ نو کا سنہرا خواب بھی۔ غرض یہ کہ وہ

سب کچھ ہو جو زندہ اور پائندہ ادب کی جان ہے۔ اختر کے کلام میں ایک اور بات ہے جسے میں نے محسوس کیا ہے۔ وہ یہ کہ ان کا مفکر دماغ تشکیک کی بھول بھلیوں میں پڑ کر سامع کو ذہنی قلابازیوں میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا بلکہ جو کچھ وہ سوچتا ہے ایک قول فیصل کی طرح پیش کر دیتا ہے۔ بحث طویل ہو جائے گی جس کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ اور نہ میں طول کلامی کا الزام اپنے سر لینا چاہتا۔ اس بحث کو کسی آئندہ فرصت کیلئے اٹھا رکھتا ہوں۔

شعری ادب کی زبان کے متعلق مشرق اور مغرب دونوں جگہ نظریوں کا اختلاف رہا ہے۔ اختر کا نظریہ کیا رہا ہے وہ اس اقتباس سے بخوبی ظاہر ہوگا ؎

وہ زبان میٹھی کہ مصری کی ڈلی ہو پیارے
صاف جو جیسے دھوپ میں ڈھلی ہو پیارے
نرم و درخشاں ہو رواں جمنا جلی ہو پیارے
تازہ و پاک ہو گنگا کی دھلی ہو پیارے

اپنے گلشن کی فضاؤں میں پلی ہو پیارے
پھول چمپا کا ہو جوہی کی کلی ہو پیارے
موہنی میٹھی سجل اچھی بھلی ہو پیارے
ایسی پیاری ہو کہ پیارے کی گلی ہو پیارے

لیکن ان کی منزل یہیں پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کی نظر فن پر بھی ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کا نظریہ شاد کے اس نظریہ سے مختلف نہیں ؎

شستگی زبان، صحبت دل میں بھرے ہیں خار و خس
چھوڑا کبھی بیرونِ در فکر درونِ خانہ کم
یہی فکر درونِ خانہ اختر کی بھی تدبیر منزل ہے ؎
ہے زباں راستہ منزل ہے کہاں سوچ پیارے

فن جو بے سوز تو پھر وہم و گماں ہے پیارے
لطف انداز ہے بس طرزِ بیاں ہو پیارے
دل میں جب آگ ہو فن تو دھواں ہو پیارے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اختر کی بیشتر نظمیں ان نظریوں کی تائید کرتی ہیں۔

نظم کے علاوہ اختر نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد نظموں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ اس ضمن میں کچھ متفرق اشعار پیش کر کے اس مقالے کو ختم کرتا ہوں ؎

محبت آرزو ہے جستجو ہے سوز آتش ہے
ثمر دے جستجو ہے سوز آتش
کسے خبر کہ خموشی میں پیچ و تاب بھی ہے
مری نظر کو تری چشم شوق سی ملتا
مگر ہوش ربا گزری ہے
زندگی حسن کے جلووں سے تو محروم نہیں

نہ مزاجِ شکوہ کبھی بہ سکیں نگاہیں
کہ الجھ کے رہ گئی ہیں تری زلف خم بخم میں

دل ستارا تھا بجھ گیا آخر
مدفن آرزو ہے سینہ راز

گھنیری زلفوں کے پیچ و خم سے بھٹک کے نکلا نہیں زمانہ
مگر ہے صحرائے آرزو میں تمہاری نظروں کا تازیانہ

اب ستم میں فسردگی سی ہے
کیا تعلق میں کچھ کمی سی ہے

زندگی ایک لفظ بے معنی
آرزو میں ہی زندگی سی ہے

ڈاکٹر سید احمد حسن

اختر کی شاعری

اختر صاحب سے اردو دنیا ان کی تنقیدوں، افسانوں، تقریظوں مقدموں، ناولوں اور ڈراموں کے توسط سے متعارف رہی ہے۔ ادب کی ان ساری شاخوں سے متعلق ان کا شعور پھیلتا اور گہرا ہوتا گیا ہے علمی دلچسپیاں ادب و زندگی کے نئے نئے تعلقات دریافت کرتی رہی ہیں اور اردو کی دنیا گوناگوں طور پر مستفید ہوتی رہی ہے۔ اس ہمہ درخشش لوح و قلم کے سلسلے میں ان کی شاعری کے متعلق واقف کاروں کا حلقہ نسبتاً محدود ہے۔ ان کی عمر دقیقہ کا بیشتر حصہ نثری تخلیقوں کیلئے صرف ہوتا رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ شاعری کے مستحکم اور تناور درخت کی بہ نسبت نثر کی ان شاخوں کا حق زیادہ تھا جن کی پھوٹتی ہوئی کونپلوں کو اپنی نشو و نما کیلئے نئے ذہنوں کا ممنون توجہ ہونا تھا۔ پھر بھی ان کی شاعرانہ تخلیق کی جو مثالیں کبھی سامنے آئی ہیں وہ بنیادی طور پر اسی فکر و فن کا شعری عکس ہیں۔ جس نے نثر کی مختلف شاخوں کی آبیاری کی ہے۔ ان کی تخلیقوں کا پس منظر نہ تو مبلغانہ ہے اور نہ انتہا پسندانہ، نہ تو فنی میکانیت کا غلو ہے۔ اور نہ خواب و خیال کی مدہوشی کر دینے والی رومانیت۔ یہاں ہمیں وہ ذہن ملتا ہے جو گرد و پیش کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے مختلف تار و پود کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان میں سے مناسب اجزا کا انتخاب کرتا ہے۔ اور انہی کی ترکیب سے اپنے تصور کی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ جس کی فضائیں اسی آب رنگ سے متاثر رہتی ہیں۔ جس کی انفرادیت میں عام انسانی احساسات کا زیر و بم ہوتا ہے۔ یہاں نہ فرار و گریز ہے۔ نہ سپردگی و بے بسی، نہ اخلاق کی بے ذوق تبلیغ ہے۔ اور نہ محض نفسیاتی الجھنوں کی تسکین۔ اختر صاحب کی دنیائے شاعری کے کردار انسان ہیں جن کی تخلیق احساسات کی متضاد لہروں سے ہونے کے باوجود ایک ایسے حسین امتزاج پر قائم ہے جس سے جینے کی آرزو ابھرتی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل نے ہندوستان میں فکر و خیال کے بہت سے دھندلے گوشے اجاگر کر دیئے۔ شعر و ادب کی دنیا میں بھی نئے نئے مسئلے پیدا ہو گئے جن میں فکر اور فن کے آہنگ کا مسئلہ خصوصیت کے ساتھ اہم تھا۔ روایتی تصورات نے فنی التزامات کو بنیادی اہمیت دے رکھی تھی۔ غزل کی روایت فکر و خیال کا متعین محور بن چکی تھی۔ اسی کو بڑی حد تک تہذیبی محوری حیثیت حاصل تھی۔ لیکن غزل کے فکری اور جذباتی تار و پود میں اب وہ تازگی نہیں تھی۔ اسے نئے رنگ و بو کی ضرورت تھی۔ ایسی حالت میں شعراء کیلئے فنی تربیت ہی اگر جان شاعری ہی بن کر رہ گئی تو تعجب نہیں۔ دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو نئے فکر و احساس کو سمونے کیلئے فنی پابندیوں کو نظر انداز کر دینے

کا حامی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ فن کی دار و گیر میں فکر و خیال کا گھٹ کر
رہ جانا تخلیق کے حق میں کوئی نیک فال نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی
بھی نہیں کہ فنی پابندیوں سے اس حد تک بے پروائی برتی جائے
کہ شعریت اور بازاریت کی حدیں مٹ جائیں۔ اردو شاعری میں افراط
و تفریط کی یہ دونوں مثالیں موجود ہیں۔ سنجیدہ طبقہ ان مخالف
سمتوں میں خوشگوار سنگم کا حامی تھا جس نے نہ تو فکر و خیال ہی کا
گلا گھونٹ دینے کی اجازت دی۔ اور نہ آزاد روی کو فنی ضبط و
تربیت کے فقدان سے بے راہ ہونے دینا پسند کیا۔ نئے نئے خیالات
اور گوناگوں اسالیب کو شعر و ادب میں سمونے کیلئے فنی تجربات میں
لچک ضروری تھی۔ ساتھ ہی ساتھ فنی تجربات کی تنظیم اور نکھار بھی فکر
و خیال کی تہذیب و ارتقاء کیلئے لازمی تھی۔ اختر صاحب کا تعلق
اسی مکتب فکر سے ہے۔ وہ نہ تو نئے اسالیب اور فکر و خیال سے
گریز کرتے ہیں اور نہ فنی رچاؤ سے بے پرواہ رہتے ہیں۔ ان کی داخلیت
نہ تو ماحول سے بے نیاز رہتی ہے۔ اور نہ ماحول کا احساس داخلیت
سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اختر صاحب زمانے کے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن
مشعل راہ خود ان کی اپنی ہی انفرادیت ہوتی ہے۔

حسن کی تخلیق کا مسئلہ فنون لطیفہ میں ہمیشہ بنیادی مسئلہ رہا ہے
فارسی اور اردو کے صوفیانہ مکاتب نے حسن کے تصور میں اتنی لطافت
اور ماورائیت شریک کر دی جس کا انسانی مدرکات کے دائرے میں سمٹ
جانا ہی محال ہو گیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ عشق ہی کے کوائف نے غیر معمولی
اہمیت حاصل کر لی۔ یہ خود حسن کا بدل ہو گیا۔ اور خود ہی حسن بن گیا۔
حسن کی انتہا تک انسان کی رسائی ہو نہ ہو عشق کی کیفیتوں تک اس کی
رسائی ضرور ہے۔ اس لئے حسن کے اس عشقی مقابل نے انسانی شخصیت
کو اہم بنا دیا۔ انسان کے احساسات کا عشق کے ساتھ ذاتی اور براہ
راست تعلق ہے۔ وہ اس کی کسک کو محسوس کرتا ہے۔ بے کلی
اس پر گذرتی ہے تمناؤں کی ٹیس اسے سہنی پڑتی ہے۔ اس لئے انسانی
نظم عشق کے کیف سے سرشار ہو کر رہ گیا۔

انسان کی شخصیت کی یہ ہمہ گیری حسن کی ماورائیت تک اس کی نارسائی
کا خوشگوار انجام تھا۔ لیکن جہاں حسن تک انسانی دسترس تھی اور اس
انگلیاں گوشۂ نقاب اٹھا سکتی تھیں۔ وہاں حالات کی شکل اور
تھی۔ باتیں زرد گیسو سے گذر کر بوس و کنار تک پہنچیں۔ اور
لذتیت کی بارگاہ میں ایک عریاں جسم ترغیب نفس پر مائل ہو گیا۔
شاعری رنگینی جنسی میں الجھ کر رہ گئی۔ لیکن یہی عریاں حسن جو
گوشت اور پوست کے رنگ و بو سے بہار زندگی بن گیا تھا۔ جب شاعر
کے احساسات میں ضم ہو کر گھل گیا۔ اور اس کی آرزو نفسی کیفیت بن
کر شاعر کا میلان طبع بن گئی تو وہ نظم پیدا ہوا۔ جو خالصتاً انسانی
تھا۔ یہاں نہ قدسی الوہیت تھی اور نہ جنسی ارضیت۔ اختر صاحب
کی شاعری میں اسی انسان کی تمنائیں مچلتی ہیں۔ انھوں نے وہ محبت
کی ہے جو حواس سے ابھر کر ذہن و وجدان کی دنیا پر چھا جاتی ہے۔ یہ
محبت ہر شے کو لائق پرستش تو نہیں سمجھتی لیکن ہر شے کے ساتھ اعتنائی
ہم آہنگی ضرور پیدا کر لیتی ہے۔ انفس و آفاق ایک مرکز پر سمٹ آئیں
نہ ہمہ ایک رشتے میں منسلک ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان میں ربط و
تعلق کے مدارج کا لحاظ ہوتا ہے۔ اس ساز کی طرح جس کا ہر تار
نغمے سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود اپنا صوتی زیر و بم ایک دوسرے
سے علیحدہ رکھتا ہے۔ یہ محبت ذہن و وجدان کی وہ مستقل ہوتی کیفیت
ہوتی ہے جس کی تیز لہریں محبت کرنے والے کی شخصیت کو بہا نہیں
لے جاتیں۔ بلکہ محبت یا شیفتگی ہیں محبوب اشیا کی کردار سے بھی
بھی باخبر رہتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر اختر صاحب کی شخصیں نرم ہو جاتیاں
ہوتی ہیں۔ یہ خود بے قابو ہو جانے کی بجائے واقعات و حالات پر
قابو رکھتی ہیں۔ اس میں آنے والے دنوں کی پیش بینی پائی جاتی
ہے۔ اور اصلاح کا وہ ہمدردانہ جذبہ بھی پایا جاتا ہے جس کی
نوعیت اذیت ناک ہونے سے زیادہ فنکارانہ ہوتی ہے۔ اختر صاحب کا تصور
حسن و عشق محدود نہیں ہو پاتا ہے۔ الوہی نہیں ارضی ہے، جنسی
نہیں وجدانی، عقیدت مندانہ نہیں رفیقانہ ہے۔ یہ ذہن کی فرحت

نہیں دل کی ٹیس ہے۔

اختر صاحب کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انھیں کس دبستان شاعری کا پیرو قرار دیا جائے؟ میر و مومن کے؟ غالب و اقبال کے؟ مجاز و فیض کے؟[عے] یا ان بہت سے گزرتے ہوئے سایوں میں سے کسی ایک کا جو چند لمحات کیلئے وقت کی توجہ اپنی جانب موڑ کر پھر دھندلکے میں غائب ہو جاتے ہیں؟ اشعار کے رو، دلبست، افکار کے تیور اور تکنیک کے مزاج کا تجزیہ کیا جائے تو اختر صاحب کی نظموں اور غزلوں میں مختلف دبستانوں اور مشاہیر کے اثرات ملیں گے۔ جابجا ایسی چنگاریاں دبی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جن کے شعلے کہیں اور نظر آئیں گے۔ لیکن ان سارے اثرات کا امتزاج اختر صاحب کی افتاد طبع میں کچھ اس طرح حل ہو گیا ہے کہ انھیں نہ تو کسی مخصوص دبستان کا پیرو قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ مشاہیر میں سے کسی کا تتبع بردار۔ انھوں نے ہر شاخ سے خوشہ چینی کی ہے۔ لیکن کسی شاخ کو شاخ نشیمن نہیں بنایا۔

اختر صاحب حسن و عشق کے شاعر نہیں۔ اور نہ ان کی شاعری معاش و معیشت کی شاعری ہے۔ وہ حقیقت کی بنیادوں پر دعا کی خواب آگیں دنیا تعمیر کرتے ہیں۔ اور تصورات و معانی پر حقیقی دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مشرقی اقدار کا احترام کرتے ہوئے بھی نئے تکنیکی تجربات سے گریز یا نفرت نہیں کرتے۔ اختر صاحب کی اعتدال پسندی شاعری میں بھی متوازن عوامل کی ضامن بن جاتی ہے۔ ایک سنبھلی ہوئی ہموار کیفیت ہے جو فکر، جذبہ یا ہیئت کسی اعتبار سے بے راہ رو نہیں ہونے پاتی۔

شعر و ادب کے بہت سے توجہ طلب مسائل کی طرح کردار، نقطہ نظر اور فن کی وحدت ثلاثہ کا مسئلہ بھی تشنۂ توجہ ہے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ قول بہت دور رس ہے کہ کوئی نامعقول انسان معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ رشید صاحب نے کردار اور فن کی ناگزیر وحدت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فن اس وقت تک ایک نقش باطل ہے جب تک کہ اس میں کردار کا خلوص و صداقت شریک نہ ہو۔ فن کردار سے ابھرتا ہے۔ سطحی تاثرات کے زیر اثر بھی ایک شاعر اپنی تخلیقات کو الفاظ اور آہنگ کی رونق دے سکتا ہے۔ شاعری عروضی مشق کے سہارے بھی کی جاتی ہے۔ اور سیاسی و سماجی مصلحتوں کی بنیادوں پر بھی کی جاتی ہے۔ ایسی تخلیقات فنکار کے خلوص احساس نہیں بلکہ خود فریبی کا انجام ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی تھوڑی دیر کیلئے احساسی خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ شعر شاعر کے تاثرات کا مرئی نقش ہوتا ہے یہ تاثرات عارضی اور سطحی بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ شاعر کے کردار کا مرکز و محور بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات کی مثال صبح کاذب کی ہے جس کی سطح روشن اور ضمیر تاریک ہوتا ہے۔ ایسے فنکار فنی آئیڈیل کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ اور فن اور شخصیت میں وہ وحدت ہوتی ہے جس سے فن معتبر اور انسانیت نواز بن جاتا ہے۔ رشید صاحب نے "معقول شاعر" کی شرط لگا کر اپنے قول کو وہ تحفظ دیا جس کے بغیر اس کا اطلاق غیر صحت مند نتائج پر بھی ہو سکتا تھا۔ اختر صاحب کی شاعری اور ان کی شخصیت دونوں ایک دوسرے کی ترجمان ہیں۔ فلاحی مملکت، صحت مند سماج اور ایسی دنیا کی تعمیر جس میں خلق، مروت، انسانیت اور محبت کی قدریں ہوں کس فنکار کی تمنا نہیں ہوتی؟ لیکن یہ تمنا اس وقت تک خلوص یا صداقت پر مبنی نہیں جب تک کہ فنکار کا آئیڈیل اس کی تخلیق اور اس کے کردار میں وحدت نہ ہو۔ اختر صاحب کا شاعر آئیڈیل ایک بہتر دنیا میں ایک بہتر انسان کی تخلیق ہے۔ ان کے آئیڈیل اور کردار میں وہ وحدت ہے جس سے فن ایک قدر بن جاتا ہے۔ یہاں محبت ہے لیکن محبت کہیں مریضانہ نہیں بنتی۔ غم ہے لیکن اس کا انجام سلبی یا منفی نہیں ہوتا۔ مسرتیں ہیں۔ لیکن سرخوشی کے تقاضے کہیں اخلاقی قدروں کو پامال نہیں کرتے۔ یہ حسن اعتدال اختر صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

"انجمن آرزو" میں اختر صاحب کا ہر دور کا کلام ہے جو مجھے

عے۔ اختر صاحب مجاز و فیض کے بعد نہیں بلکہ ان کے پہلے ہی ابھرے ہیں (ادارہ)

تیس برس کی شاعرانہ تخلیقات پر مشتمل ہو۔ یہ ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ نظموں کی تقسیم فکری نوعیت کے اعتبار سے چار عنوانات کے ماتحت کی گئی ہے ــــ "گلشن و وادی ایمن"۔ اس عنوان کے ماتحت ایسے موضوعات پر نظمیں اور غزلیں ہیں جن سے اختر صاحب کا عقیدتمندانہ تعلق ہے ــــ "سوز و ساز" کے ماتحت نظموں میں ان تمناؤں اور آرزوؤں کی ... ہے۔ جو شاعر کے دل میں دائمی غم بن کر رہتی ہے "درد نغمہ" کے ذیل میں شاعر نے اپنے متفرق ذاتی تاثرات پیش کئے ہیں اور "صہبائے بادہ" میں ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ غزلیں "صنم و حرم" کے عنوان کے ماتحت پیش کی گئی ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں کی تقسیم ابتدائی دور، عبوری دور اور شعوری دور کے اعتبار سے کی جا سکتی ہے۔ اوائل کی نظموں اور غزلوں میں تازگی ہے جوش ہے اور زود حسی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جوش سنجیدگی سے تازگی بالغ نظری سے اور زود حسی غور و فکر سے بدلتی جاتی ہے۔ عبوری دور کی نظموں اور غزلوں میں غم محبوب، غم کائنات میں مدغم ہو جاتا ہے شعوری دور میں سلسلہ یہی قائم رہتا ہے۔ لیکن خود اعتمادی گہری ہوتی جاتی ہے۔ ان ساری منزلوں سے گزرتا ہوا ارتقائی سلسلہ اپنی فکر و نظر کے اعتبار سے اسی کائنات سے وابستہ رہتا ہے۔ اس دوران میں شاعر کو جذباتی کشاکش سے بھی گذرنا پڑا ہے ــــ لیکن نفسیاتی الجھنوں کے آثار نہ ابتدائی دور کی تخلیقات میں ملتے ہیں اور نہ بعد کی تخلیقات میں۔ شعوری دور جسے سرسری طور پر آزادی ہند کے بعد کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نئے نئے تقاضے لئے ابھرتا ہے۔ فن کاروں نے آزادی ہند کا خوش آئند خواب دیکھا تھا۔ لیکن اس کی تعبیر میں ان کی امیدوں کی پاکیزگی اور حوصلوں کی بلندی سے بہت پست نکلیں۔ ایک مدت کی پالی ہوئی آرزوؤں کا اس طرح پامال ہو جانا غم آرزو کو غم روزگار کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے حزن و ملال شاعر کے نقطۂ نظر میں گھل مل جاتا ہے۔ ؎

پکارا تازہ بہاروں کی مستیوں نے اسے
دل حزیں مگر اب تک جواب دے نہ سکا (نغمۂ ثانی)

یہی ہے روز مسرت، یہی ہے شام نشاط
بجھی بجھی ہوئی کرنیں، اڑا اڑا ہوا رنگ ــــ (عید آزادی)

اس دل کو کیا کروں کہ یہ بجھتا ہے سرِ شام
شبگیر رنگیں میں نہیں گوشۂ آرام
بیگانہ نگاہی پہ ہے بے مہری ایام
خوں دل کی کرن میں ہے عیاں ناوک آلام
ہے خندۂ مجبور میں بھی نشتر انجام
یہ گرد تہ جام، یہ درد تہ جام (جشن جمہوریہ)

لیکن آزادی ہند کے متعلق خوش آئند خوابوں کا شرمندۂ تعبیر نہ ہونا وطن کیلئے شاعر کے دل میں سرد مہری نہیں پیدا کر دیتا۔

مجھے عزیز ہے اپنے چمن کی بجلی بھی
ستم یہ ہے کہ ہوئے پھول میرے دل تنگ
نفس نفس میں مرے رچ گئی ہے تو کہ وطن
ہے دل کے ساز میں بھی مضطرب ترے گنگ
بہار ہو کہ خزاں زندگی ہے عزم نمو
اٹھو! فضائے چمن کو بنائیں ہم آہنگ (عید آزادی)

جمہوریہ ہند میں گوا کی شمولیت کا ترانہ شاعر نے بڑے ایمائی انداز سے چھیڑا ہے۔ اس نظم کی تمثیلی نوعیت نے قومیت ہند کے لئے شاعری کا ایک پیش کش کو بدیعی بنا دیا ہے۔ یہاں نظم کی تکنیک کوئی خارجی چیز نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ نفس نظم بن کر رچ گئی ہے

مری وادی سے کرنوں نے لپٹ کے ہاں برسائے
سمندر کا جگر لرزا، جزیرے کانپے گھبرائے
سیاہی داغ دھبے مٹ گئے ساحل پہ ضو جھلکی
اجالا تان سے رقصاں ہے تقدیر وطن جھلکی
جھنڈا گرا!
جھکتا ہے حسین سدرچ!

ذرا دیکھو فضا کی دلبری!

زمیں سے آسماں تک ایک سیلِ نور جاری ہے
چمکتی ناچتی کرنوں پہ وجد و حال طاری ہے (گوا)

"روحِ صحرا" سے خطاب کرکے شاعر شہری تہذیب و تمدن کا شکوہ سنج ہے۔ شاعر اس عصرِ حاضر کی فریب کار تہذیب سے بیزار ہے اور روحِ صحرا سے کسی "مردِ جلیل" کی آرزو کرتا ہے۔ صحرائی فضا کی فطرت نوازی اور صحرائی تہذیب کی بے ریائی میں وہ جلال و جمال ہوتا ہے جس کے ادراک سے شاعرانہ حس کی تہیں کھل جاتی ہیں۔ اور محسوسات کی نئی سطحیں سامنے آ جاتی ہیں۔ دشتِ صحرا کی کشش ہماری شاعرانہ روایات کا ایک نمایاں رخ ہے۔ غزل کا ہر شاعر اس سے اچھی طرح مانوس ہے۔ اقبال نے صحرائی جلال و جمال کے بہت سے اچھوتے پہلو پیش کیے ہیں۔ اور اس کی بے ریا تہذیب کو ایک قدرِ حیات مانا ہے ؎

بادِ صحراست کہ با فطرتِ ما در سازد
از نفسہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم (اقبال)

اختر صاحب روحِ صحرا سے کسی "مردِ جلیل" کی آرزو کرتے ہیں اور شہری تہذیب سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ؎

شرحِ الفت ہے وہاں آوارگیِ چشم و گوش
عشق کی سرشاریاں مستِ کنی [?] بادہ فروش
زشت روئی پردۂ گلگونہ میں جلوہ فروش
محفلوں میں حسن کی معصومیت عصیاں بدوش
ہر طرف مکر و دغا، ظلم و ریا، فسق و فجور
کذب و حیلہ، مردم آزاری، حسد، کینہ، غرور
چشمہ چشمہ، ندی ندی، ایک شریانِ گناہ
چپہ چپہ کوہ و وادی کا نجاست سے سیاہ
ہو گئی ہے کیا تو اب اے مادرِ صحرا عقیم؟
کیا رہے گی اہلِ ایماں کی یونہی حالت سقیم؟

بطن سے تیرے ہو پیدا پھر کوئی مردِ جلیل
توڑ دے اٹھ کے بتِ تہذیب کو مثلِ خلیل (روحِ صحرا سے)

اختر صاحب کی نظموں اور غزلوں میں جا بجا مقامی رنگ کی رچی ہوئی دل آویزیاں بھی ملتی ہیں۔ ہندی طرزِ محاکات، ہندی [illegible]، ہندی پنگل اور ہندی الفاظ اور ترکیبوں کے آہنگ سے منظر اور پس منظر کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی نظموں میں کوئل خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ نظم پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کوئل سراپا فطرتِ کائنات کی درد بھری پکار ہے۔ اسے ہماری دنیا ایک غم کی بستی نظر آتی ہے۔ جہاں ظلم، ناانصافی، مکر اور فریب کا راج ہے اس حالت کو دیکھ کر فطرتِ کائنات کراہتی ہے۔ اسی کراہ کو کوئی "کوک" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کوئل کی کوک شے نہیں، ایک کراہ ہے۔ ہندوستانی گیتوں میں کوئل کی علاماتی اہمیت مسلم ہے۔ بہار کی یہ پیامبر بھولی بسری تمناؤں کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ دلوں میں دردِ عشق کے داغ جل اٹھتے ہیں۔ یہ وہ گیت ہے جو اپنی آواز کے تیر دل سے رگ رگ میں محبت کا امرت پیوست کر دیتا ہے۔ شاعر خود اپنے دل کی کراہ کو کوئل کی کراہ سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اس نظم کی فضا خالصتاً ہندوستانی ہے ؎

امر جیوتی کوک ہے تیری امرت کی ہے دھار
وہ دو بول سے تیرے گونجے بستی اور کہسار
سب میں ایسا جذبہ جوشے جاگ اٹھے سنسار
آشا کو بل ہوتا دے دے ناؤ ہے مجدھار
ٹوٹا ہے پتوار، کوک، کوک اے کوئل کوک!
(کوئل)

اختر صاحب کی نظموں اور غزلوں میں جا بجا اچھوتے سائے [?] بھی ملتے ہیں۔ ماضی کے ساتھ جذباتی تعلق نئی بات نہیں۔ اختر صاحب اپنی نظم "ماضی سے" میں ماضی کی قدر و قیمت کے احساس کا ایک نیا پہلو پیش کرتے ہیں۔ ماضی خوشگوار لمحات کا شاداب

سرمایہ پیکر شاعر کے پاس اس وقت آتا ہے جب وہ ہجوم یاس میں گھرا ہوا ہے
بچپن کی یاد، ماں باپ اور عزیز و اقارب کی یاد، اسکول اور کالج کی یاد،
جوانی کی مسرتوں کی یاد، ماضی آتا ہے اور یہ ساری طرب فزا یادیں بکھر
آتا ہے۔ شاعر کا مذاقِ حسن نوازی اس اندیشے سے لرز اٹھتا ہے کہ ناز و
وفا کا یہ حسین پیکر ہجوم یاس سے متاثر نہ ہو جائے۔ حال ہی طرح کہیں ماضی
بھی غمناک نہ ہو جائے۔ اس لئے اس سے چلے جانے کی آرزو کرتا ہے ــ
عموماً ہوتا یہ ہے کہ حال کی بے بسی اور بے چارگی میں ماضی کی کامرانیوں کی
یاد تسلی دیتی ہے۔ بعض حالتوں میں انسان جینے کیلئے اسی کا سہارا لیتا
ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماضی کی یاد دکھ سے حال کچھ اور ناقابل
برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ احساس عموماً نہیں ہوتا کہ ماضی کا حسین
پیکر غم واندوہ کے ہجوم میں کہیں سوگوار نہ ہو جائے ــ

روشنی تیری نہ کر لے رات کی ناگن شکار
ڈس رہی ہے تیرے نغموں کو ہوائے زہر بار
ابر بن ہو کر رواں تو جا مری حسرت کے ساتھ
خواب کے رنگیں جزیرے میں مری چاہت کے ساتھ
بارشوں کے شور میں چیخوں کو لرزاں کر چکا
دل کے شعلے ہر تنک سینے میں پہنچا کر چکا
جا مرا تاریکیوں میں دل دھڑکنا چھوڑ دے!
جا مرا تنہائیوں میں دم نکلنا چھوڑ دے!
آہ تو آئی تھی کیوں؟ پیاری حسینا اس سمے؟ (ماضی سے)

"ماں" اپنے پاکیزہ خلوص و عقیدت کے اعتبار سے "سرخیٔ افسانۂ دل"
"مجبور امنگوں کی برہمی کے اعتبار سے "انسان" اپنے رجائی یقین
کے اعتبار سے اچھی نظمیں ہیں۔ "مجاہد" ایک ولولہ خیز نظم ہے جس میں
ارکان اور الفاظ کے آہنگ سے جوش و شدت پیدا کی گئی ہے۔

"ڈھونڈتا ہوں خون کی امواج میں آب حیات
ہے بقا کی آرزو، اور یہ جہانِ بے ثبات
جستجو یکتائی کی، اور یہ کثرت ہائے دمنات

حسرت مہر درخشاں اور یہ تاریک رات
سادگی میری تمنا کی رہین دید ہے
مجھکو نیرنگ حوادث میں تلاش عید ہے (مجاہد)"

پہلے دور کی نظموں میں "جنت سے انکار" اپنی ندرت فکر کے اعتبار
سے قابل ذکر ہے۔ صوفیہ جنت کو منزل نہیں قطع منزل سمجھتے ہیں۔
ان کے یہاں زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ اور زندگی کا مقصد اقدار
الہیہ کا عرفان ہے۔ اسی لئے صوفیہ جنت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اختر صاحب
نے بھی جنت سے انکار کیا ہے۔ لیکن یہاں مسلک تصوف کا ادعا نہیں
بلکہ فلسفۂ زندگی کا اظہار ہے۔ یہ نظم برجستگی بے باکی اور اعتماد و یقین
کا ایک خوبصورت مرقع ہے ــ

حرمت عشق کو ایسا بھی سبک نام نہ کر
سرفروشان محبت کو تو بدنام نہ کر
چشم بے رنگ کے مارے کو عطا جام نہ کر
دے کے فردوس مرے شوق کو ناکام نہ کر
حور و رضوان سے ممکن ہو نہ تسکین مری
خندۂ برق بھی محفل میں یہ آئین مری

آخری بند ہے۔

شعر سادہ کے مزے اہل جناں کیا جانیں؟
کیف بے تابیٔ دل سوختہ جاں کیا جانیں؟
خوگر موسم گل لطف خزاں کیا جانیں؟
لذت نالہ و فریاد و فغاں کیا جانیں؟
قدسیوں کو ہی مبارک رہے جنت تیری
مجھکو تو چاہئے اے جان محبت تیری
(جنت سے انکار)

اختر صاحب کی منظری نظمیں ان کے مشاہدات، لطیف احساسات
اور برمحل تشبیہات و استعارات سے لفظ و بیان سے زیادہ چشم و
گوش کی چیزیں بن جاتی ہیں۔ شام کی رنگینیوں میں "دریا کے سون"

کی نرم خرامی کا منظر پیش کر رہے ہیں ؎

ساغرِ تابندہ کا جب لبریز ہو جاتا ہے جام
زلفِ مشکیں کھول کر آتی ہے جب لیلائے شام
خامشی جب دل کے ہنگاموں کو کر لیتی ہے رام
جھانکتا ہے دامنِ مشرق سے جب ماہِ تمام
سون کے رنگیں کناروں پر وہ جلوہ باریاں
یاسمیں کرنوں کا رقص اور موج کی تابانیاں
("دریائے سون")

اسی دریائے سون کے رنگین کناروں کا منظر "ابدی رات" میں پیش کرتے ہیں ؎

نقرئی جام ہے بیتاب تو ہے چھپا زر فام
پھول کا نشہ ہے لغزیدہ گلستاں میں تمام
حباب بنتے ہوئے سائے ہیں کہ موجِ خمار
فرشِ گلشن پہ ہے کتری ہوئی چاندی کی بہار
("ابدی رات")

اسی سون کی وادی کا منظر پھر بھی "ارمغانِ شباب" میں ملتا ہے۔

ساریوں کے رنگ ہیں یا لالہ زاروں کا ہجوم
آنچلوں کی لہر ہے یا آبشاروں کا ہجوم
خندۂ بیباک ہیں لرزاں ہیں فواروں کے گیت
قہقہوں کے راگ یا بجتے ستاروں کا ہجوم
قاتلِ جاں، عشرتِ دل نو نگاروں کا ہجوم
برقِ خرمن سوز کا، یا نوبہاروں کا ہجوم
دل، منظر، حسرت، تخیل، شوق، جذبہ، آرزو
اک مری جان اور اتنے بے قراروں کا ہجوم
(ارمغانِ شباب)

جامِ مہر کا لبریز ہونا، لیلائے شام کا زلفِ مشکیں کھولنا، ماہ تمام کا دامنِ مشرق سے جھانکنا، یاسمیں کرنوں کا رقص کرنا، موجوں کا بیتاب ہونا، نشہ کا لغزیدہ ہونا، حباب بنتے ہوئے سائے اور موج خمار سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاندنی کو تشبیہ دینا، کتری ہوئی چاندی سے حنائی شعاعوں کو، لالہ زار سے ساریوں کے رنگ کو، آبشار سے آنچلوں کی لہروں کو، فواروں کے گیت سے خندۂ بیباک کو، بجتے ہوئے ستاروں سے قہقہوں کو اور ان میں سے ہر چیز کو جو فطری طور پر بے قرار اور سیماب صفت ہوتی ہے۔ برقِ خرمن یا نوبہاروں کے ہجوم سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ "اک مری جان اور اتنے بے قراروں کا ہجوم" منظر کی ایک زندہ اور احساس خیز تصویر پیش کر دیتا ہے۔ ان حسین تشبیہوں سے تخیل میں ایک ایسا منظر کھنچ جاتا ہے جیسے فطرت کے دامن پر فنکار کی گلکاریوں نے بنایا ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے "خلش" بخش صاحب کے تجربوں کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ محرومی و مایوسی کا شاعرانہ احساس زندگی کو گھٹن نہیں بننے دیتا، سوگواری بھی دلکشی ہو جاتی ہے۔ محروم رہ کر بھی انسان جینے سے بیزار نہیں ہوتا، خود اپنی آرزوؤں کی خاموش پکار صدائے بازگشت بن کر احساس کے تاروں کو چھیڑتی رہتی ہے اور احساسات کا زیر و بم سنائی دیتا ہے۔

ناز فرما لبِ گلرنگ میں صہبائے حیات
زہر ہے آج اسی بادۂ نوشیں کا خیال
داغِ سوزاں ہے مرے دل میں یہ حسرت کا چراغ
ہر نفس تارِ رگِ جاں پہ مثالِ شمشیر
خواب اور اس کی بھیانک تعبیر!
اب تو محرومیٔ پیہم کی خزاں آئی ہے
دل کی دنیا میں عجب یاس کی رت چھائی ہے
کب کی دم توڑ چکی میری تمنائے بہار
پھر کہاں سے یہ چلی آتی ہے، دیکھیں یہ پکار؟
پھر دھڑک اٹھتی ہے جاں جیسے ہو زخمی مضراب
سن کے موجوں کی صدا دور سے یکدم بے تاب

راکھ کا ڈھیر بنا جاتا ہے سیماب تپاں
یاد ہے اس لب گلرنگ کی شعلے کی کماں
تا کہ حیرت کی صورت ہیں ترے حرف وفا
آہ وہ عہد وفا ـــــ درد نہاں "زخلش"

اختر صاحب کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ تکلف اور برجستہ تشبیہ کیلئے ایسی اشیاء کا انتخاب کرتے ہیں۔ جن میں مناسبت کی فطری استعداد پائی جاتی ہے۔ اور اس طرح کسی منظر یا واقعہ کے ساتھ ایسی اشیاء کے روابط ایک طرف تو اس کی فطری صداقت قائم رکھتے ہیں اور دوسری طرف اسے مجسم رومان بنا دیتے ہیں۔ ایک ایسا خواب جسے ہم بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ایسی حقیقت جسے ہم بھی چھو سکتے ہیں۔ وہ تخیل کا کیف ہونے کی بجائے ایک بدیہی چیز بن جاتی ہے۔ "محبت" میں راز محبت کو نہاں خانۂ دل میں چھپا رکھنے کی تلقین کرتے ہیں ؎

آرزو سینے میں ہو صورت درنایاب
سنگ کے بطن میں خوابیدہ ہو جیسے سیماب
جس طرح نغمۂ بلبل ہو کہیں تاروں میں
جس طرح چشمے ابلتے ہیں بیاباںوں میں
جیسے کہساروں میں خاموش ہو سرو غمگین
جیسے تنہائیوں میں عطر فشاں نافۂ چین
جیسے ویرانیٔ صحرا میں نور مہتاب
جیسے وادی کی خموشی میں ندی چھیڑے رباب
جیسے جنگل میں مہوں چہ دلے کہیں نغمہ سرا
جیسے سنسان چراگاہوں میں گھنٹی کی صدا
جیسے مندر میں ہو دوشیزہ پجارن کا چراغ
حور کے ہاتھ میں یا بادۂ کوثر کا ایاغ
بربط روح کی مضطرب ہے دل، تار ہے عشق
خالق حسن کا اک پرتو انوار ہے عشق
"محبت"

ابتدائی دور کی نظموں اور غزلوں میں لفظی چمک دمک، فوری محسوسات کی شدت اور سیمابی طبیعت کے تقاضے اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں غم کسی فوری محرک کا رد عمل ہوتا ہے۔ اور مسرت احساسی ہیجانات کا انجام ہوتی ہے۔ محبوب کا تصور محدود ہوتا ہے۔ اور اس کی اساس حسی تقاضے ہوتے ہیں۔ محبت فطری مطالبہ ہوتی ہے۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ شاعر کے نقطۂ نظر میں وسعت اور گہرائی آتی جاتی ہے۔ محبت شاعر اور کائنات کی بے شمار اشیاء کے مابین وحدانی رشتہ بنتی جاتی ہے۔ پہلے کائنات محبوب کا پس منظر تھی، اب محبوب کائنات کا پس منظر ہے۔ اور محبت آفاقی غم بنتی جاتی ہے۔

وصل سے بھی ترے تسکین نہیں ہوتی ہے۔
ترے ہوتے ہوئے آنکھیں ہیں برستا بادل
اے مرے دل ترا انجام محبت کیا ہے؟
جلوۂ لالہ و گل یا کہ سلگتا جنگل؟ "ایک تصور"

"مدفن آرزو" میں اسی احساس کی گونج ہے۔ "اعتاب" اور "تر دید منظر" احساسات کی وسعت و عمق کے اعتبار سے اسی آفاقیت کی ترجمان ہیں۔ یہ نظمیں اختصار، سادگی، فطری جذبہ اور خود اعتمادی کی اچھی مثالیں ہیں۔

غزل کی روایت صدیوں کی تہذیبی روایت ہے۔ اور حیات و کائنات کے متعلق مخصوص تصورات پر قائم رہی ہے۔ اپنی تہذیبی روایات کی مثبت اور منفی ہر دو سطح کے بے شمار تاروں سے غزل کی قبا تیار ہوتی ہے۔ اصناف سخن اور بھی رہے لیکن جو قبول عام غزل کو حاصل ہوا وہ کسی اور صنف کو حاصل نہیں ہو سکا۔ یہی اس کی کامیاب تہذیبی عکاسی کا راز ہے۔ ہماری مشرقی افتاد طبع کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئی ہے کہ ادب میں اسی کو ہم اپنا تہذیبی ورثہ قرار دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں حیات و کائنات کے متعلق بین الاقوامی ربط و تعلق کے اثر سے ہماری نظریں بدل رہی ہیں۔ اس کا اثر ہماری فکری مبادیات پر بھی پڑ رہا ہے اور ہماری تہذیب بھی رفتہ رفتہ متاثر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اثرات ہماری

تہذیبی روایات کیلئے کس حد تک بنیاد یا صحت مند ہیں، اور ان عوامل
و محرکات کے کون سے اجزا قابلِ قبول اور کون سے قابلِ رد ہیں۔ ایک
علیحدہ مسئلہ ہے۔ جس پر یہاں بحث کا موقع نہیں۔ یہ البتہ طے ہے کہ غزل
سے ہمارے مطالبات بدلتے جا رہے ہیں۔ فکری ہیجان اقسام لا رہے ہیں۔
شاعرانہ علامات بدلی جا رہی ہیں۔ رمزی و ایمائی اشارات بدل رہے
ہیں۔ غزل کی روایات کس حد تک ان تبدیلیوں کی تاب لا سکے گی۔ اس کا
فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔ بہرحال غزل کی ہیئت اور داخلیت میں
جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں۔ وہ ابھی سیالی حالت میں ہیں۔ وقت کی
نبض کی دھڑکن نہ مسلسل ہے نہ ہموار اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نئی
تبدیلیوں کو ہماری تہذیبی مبادیات کا حصہ بننے میں کتنی مدت صرف ہو گی
اور انجام کار اس کی کیا شکل ہو گی۔ جمہوری تقاضے، صنعتی سرگرمیاں
مادی قوتیں، حسی دلچسپیاں ـــــ یہ سارے عناصر ہمارے تہذیبی
ڈھانچے بنا رہے ہیں۔ ایسے میں نظم کا فروغ ایک قدرتی امر ہے۔ یہاں
ہر نئے تجربے کی گنجائش ہے۔ نظم کے باب میں کسی روایت کا فقدان نئے
تجربات کیلئے سازگار ہے۔ لیکن اردو میں نظم ابھی طفل نا آزمودہ کار ہے
اپنے لئے کشش ضرور رکھتی ہے لیکن معتبر نہیں ہے۔ اس میں کسی حد تک
اگر اعتبار ہو سکتا ہے تو غزل ہی کے آہنگ سے ہو سکتا ہے۔ اردو
میں جتنے اچھے نظم نگار شعراء ہیں ان کی تخلیقات کا اگر تجزیہ کیا جائے
تو انہی کے نام سرِ فہرست آئیں گے۔ جنہوں نے غزل کے سنگیت پر نظم کا
ساز چھیڑا ہے۔ اقبال، جوش، حفیظ، فیض اور بہت سے دوسرے
قابلِ ذکر شعراء نے ہمارے تہذیبی مزاج کا راز سمجھا ہے۔ اور آہنگ و
علامات کے اعتبار سے غزل کے دامن سے وابستگی قائم رکھی ہے۔
اختر صاحب کی نظموں کے رگ و ریشے میں بھی غزل کے تہذیبی ورثہ کا
اثر نمایاں ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بے موقع نہ ہو گا کہ غزل میں
تسلسل کا انحصار عشق کے مدارج پر ہے۔ خانماں بربادی، دشت
نوردی، جنون و وحشت، ستم نوازی، وغیرہ عشق کے اس عروج کی
طرف اشارہ کرتی ہیں جہاں پہنچ کر طبعی اور جسمانی تقاضے ہیچ ہو جاتے
ہیں۔ منطقی تسلسل، فلسفیانہ طرز استدلال اور عوامی معیار فکر
قابلِ لحاظ نہیں رہ جاتے۔ احساس کی سطح بدل چکی ہوتی ہے۔

"ہر لحظہ و ہر ساعت دنیائے دگر دارد"

ایسی حالت میں تخیلی تسلسل تناقض بالذات کے مترادف ہو گا جب
ایک شاعر عشق کی اس عروجی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ تو فطری
مناسبت قائم رکھنے کیلئے غزل کی داخلیت کو منطقی پابندیوں سے آزاد
کر دیتا ہے۔ محض لَے کا آہنگ قائم رکھنے کیلئے وزن اور ردیف
و قافیہ کا ربط و تعلق برقرار رکھتا ہے۔ غزل کا آہنگ بھی مخصوص تہذیبی
روایات کا ورثہ ہے۔ لیکن جب وہ عشق و محبت کی عام نفسی کیفیتوں
کو پیش کرتا ہے جب انسان کی طبعی نشو و نما اس سے محبت کا فطری
مطالبہ کرتی ہے تو اسکے احساسات میں تسلسل اور منطقی ربط ہوتا ہے
ایک مخصوص دور میں وہ ایک مخصوص کیفیت سے گذرتا ہے۔ اس لئے
ہر دور کی کیفیت اپنا اپنا تسلسل رکھتی ہے۔ ان حالتوں کے شاعرانہ
اظہار میں تسلسل لازمی اور فطری ہو گا۔ یہ محبت کی عام سطح ہوتی ہے
اور اس کے مطالبے بھی طبعی ہوتے ہیں۔ ان طبعی مطالبات میں تہذیب
کی سطحیں البتہ بدلتی جاتی ہیں۔ ابتذال اور عریانی محبت کے وحشی
تقاضے ہیں۔ حجاب اور پردگی محبت کے وجدانی تقاضے ہیں۔ اختر
صاحب کی غزلیں عموماً مسلسل اور مربوط ہوتی ہیں۔ ہر غزل سے
ایک مخصوص جذباتی کیفیت اور حالت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تک
کہ اکثر غزلیں عنوان کے ماتحت ہیں۔ مثلاً "الفراق"، "بادیا فنت"
"دیار محبوب سے آتے ہوئے" وغیرہ۔

اختر صاحب کی شاعری میں حسن کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے۔
وہی حسن کل ہے۔ اور وہی خالق حسن ہے۔ کائنات میں ہر طرف اسکے
جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن انفس و آفاق میں حسن کے جلوے ساکت
و غیر شخصی عکس ذات نہیں۔ بلکہ حسن کے یہ جلوے حسن کی نمود گوناگوں
اور بوقلموں عنوانوں سے ہو رہی ہے۔ یہ اپنی انفرادیت کے حامل ہیں
ان کی ادائیں اپنی ہیں۔ ان کے جلوؤں کے اظہار کے سلیقے اپنے ہیں۔ ہر

شے یعنی انفرادیت کے اعتبار سے اس دولت حسن کا اظہار کر رہی ہو
یہاں حسن خود اپنی غایت ہے۔ اختر صاحب کا تصور حسن
افلاطونی نہیں۔ افراد و اشیاء کا حسن حسنِ کامل تک پہنچنے میں
احساس کی رہنمائی تو کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اس کی غایت اولیٰ نہیں۔
یہاں ہر فرد کا حسن خودی اور خود شعوری کے جذبۂ اظہار سے خود
اپنے وجود کا اعتراف چاہتا ہے۔ ہر ایک کی کشش خود اسی کی اپنی ہے جو
اسی کی انفرادیت کو مستحکم کرتی جاتی ہے۔ اردو شاعری میں حسن کی اس
مربوط انفرادیت کا عرفان ابھی عام نہیں جو ایک طرف تو اپنے خالق سے
وابستہ ہو اور دوسری طرف خود اپنے وجود کا اثبات و اعتراف چاہتی
ہو۔ اختر صاحب حسن کی اسی انفرادیت کے دلدادہ ہیں۔ وہ حسن
کی تموجی کیفیت کے محرم راز ہیں جس میں لرزش ہو، روانی ہو، دھڑکن
ہو، حرکت ہو، تڑپ ہو، بیتابی ہو۔ وہ حیات کے پرستار ہیں اور حسن
میں زندگی کا جوہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جامد حسن ان کیلئے لائق
احترام نہیں ؎

یہ بگولے اٹھ رہے ہیں کہ سلگ گیا ہے صحرا
کسی شعلہ رو نے الٹی ہے نقاب رخ حرم میں

ان پردہ داریوں پہ تری دعوت نظر
چھپنا بھی جستجو کا تقاضا لئے ہوئے

یہ تابناک تارے یہ رخشندہ مہر و ماہ
تیری نقاب حسن کا گوشہ لئے ہوئے

حسن کی تموجی کیفیت میں زندگی کا مظاہرہ اختر صاحب کے
مطالعۂ حسن کا ایک دلکش رخ ہے ؎

کھلکھلاتے ہوئے لب رنگیں — آرزو ہی میں زندگی سی ہے
زندگی ایک لفظ بے معنی — آرزو ہی میں زندگی سی ہے
بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہوا دل کو — نبض ہستی رکی رکی سی ہے

ان کے کومل بدن کی لرزش سے کیا سراپا میں نغمگی سی ہے
حسن و عشق کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ بیتابی و بے قراری دونوں میں ہے
جس طرح حسن حرکت اور تموج کے بغیر حسن نہیں اسی طرح زندگی آرزو
کے مدوجزر کے بغیر زندگی نہیں۔ عشق زندگی کا جوہر ہے۔ لیکن اس
جوہر کا مصرف یہ نہیں کہ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے" بلکہ وفائیت
ہے جو حسن کی طرح اپنا بھی اثبات و اعتراف چاہتی ہے۔ اختر صاحب
عشق کے سوز و ساز ہی کو قدر حیات سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر شناسی انہیں
خبث سے بھی انکار پر مائل کر دیتی ہے۔ خودی و انفرادیت پر یہاں بھی
اصرار ہے ؎

ستم تیرا کرم سے زیادہ مرغوب
طبیعت عشق کی درد آشنا ہے

اے حسن گر نیاز جبیں تو ہی نہیں ملتا ہے
میں توڑ کے رکھ دوں گا کعبہ ہو کہ بت خانہ

چاہوں تو تصور میں اک طور بنا ڈالوں
اتنا بھی نہ نادان ہو اے جلوۂ جانانہ

فضا منجمد ہے زمانہ ہے ساکن
جنون تمنا کو بیدار کر دے

تری نگاہ سے دل کو سکوں ملے تو مگر
مزاج خاک میں شعلے کا التہاب بھی ہے

تری نظر سے زمانے کے تار سلجھے ہیں
مرے نصیب! زمانے کو انقلاب بھی ہے

بعض غزلوں میں الفاظ، جذبات اور تکنیک کے حسن امتزاج سے

ایسا مکمل آہنگ پیدا ہو گیا ہے کہ ان سے گزرتے ہوئے قاری خواب آگیں کیفیت محسوس کرتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل غزل میں وزن کی ہلکی پھلکی روانی، ردیف میں "گذری ہے" کی تکرار، قافیے میں حرفِ آخر "ا" کی نرم صوتیت سے پوری غزل میں ساحرانہ نغمگی سی پیدا ہو جاتی ہے ؎

تجھکو معلوم ہے دل پر مرے کیا گذری ہے
وادیٔ غم سے دعا آبلہ پا گذری ہے
تیرے کاکل کی مہکتی ہوئی یادوں کی قسم
آہ نکلی ہے ترے بن جو صبا گذری ہے
سایۂ ابر میں شادابیٔ قامت اللہ!
موجِ دریا ترے قدموں پہ فدا گذری ہے
ٹہنیوں نے ترے شانوں کی بلائیں لی ہیں
سبزہ و گل سے تری زلف رسا گذری ہے
سیرِ کہسار کی وہ خواب سی سرشار فضا
وجہِ بیدار سے نغمے کی صدا گذری ہے
تیرے جھکتے ہوئے تیور پہ نچھاور شال
تیرے کھوئے ہوئے عالم سے دعا گذری ہے
کون اختر کو سمجھا دیگا تسلی ہمدم
زندگی اس کی خود اپنے سے خفا گذری ہے

اختر صاحب کی شاعری میں نظم اور غزل کی داخلی نوعیت کا فرق بہت نمایاں ہے۔ جو خصوصیت نظم سے غزل کو علیحدہ کر دیتی ہے وہ اس کا جامِ جہاں نما ہونا ہے۔ جن جذبات و کیفیات کو نظم پھیلا کر بھی پیش کرنے سے معذور رہ جاتی ہے۔ انہیں غزل محض اشاروں اور استعاروں میں بیان کر دیتی ہے۔ کیفیت اور رچاؤ کیلئے نظم غزل ہی سے اس کی تکنیک مستعار لیتی ہے۔ ورنہ الفاظ کے شور اور ہنگاموں میں سطحی ذہنی وحدت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اختر صاحب اس راز سے باخبر ہیں۔ اس لئے ان کی غزل کے اشعار اپنی کیفی وحدت کے اعتبار سے نظم سے مختلف ہو جاتے ہیں ؎

موج ادھر بھی سی جو لہرائی ہے لگ گیا کوئی کنارہ شاید
اوس چمکی ہے کسی کونپل پہ جھلملاتا ہے ستارہ شاید

بھلا کیوں ہو تجھے میری ضرورت کہ تو سارے زمانے کا خدا ہے

اک دوسرے آدم کی تخلیق ہو بسم اللہ آنسو سے مرے گوندھو خاکستر بیجا

وہ بھی کیسے کبھی یاد الفت کی لاش ہر دم بھی ڈھوئی جاتی ہے

میں خار و خس کو دعائیں دوں یا میں برقِ جولاں پہ جاؤں صدقے
اندھیرے گھر کی جو جلی قسمت تو تنکا تنکا چراغِ خانہ

چاند تاروں میں کبھی پکار آیا کون جانے کہاں ہے وہ طناز

اختر صاحب شاعرانہ ادعا کے بعض پہلو چونکا دینے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں معصیت کا تصور ایک قدرِ حیات کے طور پر ابھرتا ہے۔ یوں اردو شاعری کیلئے یہ عنوانِ فکر و احساس اچھوتا نہیں۔ شافعِ محشر، اور داورِ محشر کے ادعائے کریمانہ کی محرک انسان کی معصیت ہی ہو گی۔ اس نسبت سے شعراء نے معصیت کے تصور میں بڑی لطافت اور کشش سمو دی ہے۔ انسان کیلئے ارتکاب معاصی سے دامن بچانا کبھی کفرانِ نعمت اور قدر ناشناسی ہے۔ مخلوق خالق کی بخششوں کا حق ادا نہیں کر سکتا اور نہ تقاضائے محبت کا جواب دے سکتا ہے۔ یہ احساس معذوری جو اس کی سرشت میں سمویا ہوا ہے۔ عصیاں کی خلش بنکر چھپتا رہتا ہے۔ اور اسی نسبت سے خدا کی صفت غفاری ایک ادائے محبوبی و بندہ نوازی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اختر صاحب کی شاعری میں گناہ

(باقی ص ۳۸[illegible] پر)

ڈاکٹر سید محمد حسنین

اختر اورینوی کے مقالوں کی فنّی خصوصیات

ہماری زبان کے نثری حصے میں جس صنفِ ادب کو سب سے
زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ افسانہ کے بعد مقالہ
ہے، اگر ہم پچھلے تقریباً ڈیڑھ پونے دو سو سال کی ادبی کائنات پر نگاہ
ڈالیں تو ہمیں اپنی ادبی بے بضاعتی شدید طور پر محسوس ہوگی۔ ہمیں
پھر اندازہ ہوگا کہ ان دنوں ہمارا ادب کیا تھا اور ادبی نگارشات
کتنی نیم وحشی حالات سے گذر رہی تھیں[1] —— یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا
کہ ہمارا ادبی سرمایہ اولاً نظم، داستان، اور مضمون جیسی بے وضع
اور بے ضابطہ نگارشات پر مشتمل تھا۔ لطیف و نازک کوائف نفسی
کا شعری طریقہ اظہار نظم تھی۔ قصص و حکایات یا نیم مذہبی اخلاقی
کہانیوں کی نثری قلم بندی کی دل کش صورت داستان تھی۔ ہر نوع
کے اہم وغیر اہم سنجیدہ امور کے اظہار کا سہل اسلوب مضمون تھا۔
نوعیتی لحاظ سے یہی تین شعری و نثری قسمیں ہماری زبان کا مایۂ ادب
تھیں۔ تنقید و تحقیق کی بات تو بہت دور کی بات ہے، ہمارا "افسانہ"
کہانی (FICTION) کی مخصوص صنفی حدود سے بھی ناآشنا تھا
اور مضمون کی خاص خاص شکلوں کی شناخت اس سے ممکن نہ تھی، اردو
لسانی طور پر ارتقاء کے ابتدائی منازل طے کر چکی تھی پر اس کا ادب
تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے قطعاً غیر ناہموار اور غیر محکم تھا ——
زبان شعری اظہارِ خیال کا بار اٹھا سکتی تھی، مگر نثری ابلاغ کے لئے
یہ مضبوط نہ تھی دراصل یہ وہ عہد تھا جب ہم تحریروں کی صنفی شناخت
و تشکیل سے بے خبر تھے اور صحیح معنی میں، تحریروں کی ادبی و غیر ادبی
شناخت کا فنی شعور نہ رکھتے تھے۔ —— مغرب کی "نئی لالٹینوں" سے
ہمارے دماغ میں نئے علوم کی روشنی پہنچی اور پیروی مغرب، سے ہم نے
فنکاری کے گُر جانے۔

تو اردو میں کچھ صنف سب سے زیادہ مقبول عام ہے، وہ
نثری ادب میں افسانہ کے بعد مقالہ ہے —— زندگی میں باتوں کی کثرت
ہے یہاں علوم اور سائنس کے پیدا کردہ افکار و عقائد اور نظریات
و تصورات کا ایک بھاری میلہ لگا ہے یہ میلہ بڑھتا ہی جاتا ہے اور لیل و
نہار کی گردش کے ساتھ ہر لحظہ یہ پھیلتا ہی جاتا ہے —— انسان، ہر ذی شعور
انسان، کو ایک میلے میں گھومنا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ ہر سمت اس
کے قدم اٹھتے رہتے ہیں اہم و غیر اہم مفید و غیر مفید اور عجیب و غریب
بھانت، بھانت، چھوٹی، بڑی باتوں کے انبار سے اس کی متجسس نگاہیں
ٹکراتی پھرتی ہیں، لیکن نگاہوں کی یہ آوارہ گردی مفید نہیں، نگاہوں
کو ٹھہراؤ اور دماغ کو سکون کی حاجت ہے۔ پر وقت کم ہے زندگی بھی
مختصر اور بیچارے[2] فہم و فراست بھی محدود! انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ
اتنی کثیر مجبوریوں کے ساتھ اس میلے کی سیر کر سکے۔

ایسے دشوار موقع پر مقالے ہمارے کام آتے ہیں، یہ ہماری جنّت اردو،

---

[1] یہ بات محلِ نظر ہے اور اب تک مابہ النزاع چلی آرہی ہے، ناقدوں کی اکثریت ایسا خیال نہیں رکھتی صرف بعض ناقد قدیم ادب کے متعلق اس قسم کا انتہا پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں وہ بھی اس عمومیت کے ساتھ نہیں جس کا اظہار اس مقالے کے مصنف نے کیا ہے۔ (ادارہ)

[2] اس معنی میں عام اصطلاحی لفظ "ہیئتی" ہے (ادارہ)

کرتے ہیں، مقالوں کے ذریعہ افکار و عقائد اور نظریات و تصورات کو ہاتھ لگانا ممکن ہے ان کے ذریعہ ادق سے ادق، بلند سے بلند اور نازک سے نازک باتوں کی گرہیں کھول جا سکتی ہیں۔ ان کی مدد سے حیات کی کثرت، انتشار اضطراب اور حیرت سے نپٹنا آسان ہے، بات کی نوعیت، حقیقت یا افادیت کی آگہی، واقفیت پانے کہ میں مقالے، ہمارے کام آتے ہیں، مقالے ایوانِ ادب میں، دروں کی مثال ہیں۔ کھلے روشن اور ہوادار! اچھے اور معیاری مقالے سے ذہنی تابندگی نصیب ہوتی ہے ہمارے دماغ کے بند دریچے کھول دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شعری اور کہانی اصناف بھی اس مقصد میں ہمارے کام آسکتے ہیں ان کے ذریعہ بھی مسائلِ حیات کو ہاتھ لگانا ممکن ہے۔ مگر ان سانچوں میں افکار و عقائد اور نظریات و تصورات کے بارِ گراں کو سمونا اور حسن و خوبی کیساتھ سمونا ممکن نہیں۔

ایک نامور اور فاضل مقالہ نگار کی حیثیت سے اختر صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، ان کی ادبی شخصیت کے رخ بجز ایک نہیں، متعدد ہیں ہر رخ میں شگفتگی ہے اور پرکشش تابانی بھی، یہ کشش کہیں تیز ہے کہیں مدھم اور کہیں درمیانی، بنیادی طور پر اختر صاحب ایک وہبی فنکار ہیں۔ درد مند اور مخلص اور ان کی درد مندی میں رقت ہے اور سوز بھی، ان کے خلوص میں سادگی ہے اور جدّت کی ہوس نہیں۔

اختر صاحب کے مقالے ان کی ذی علم شخصیت اور بیدار دماغ کے نقوش ہیں، خیالات میں تنوع اور وسعت ان کی کثرتِ مطالعہ کی ضامن ہے۔ اختر میں طالب علم کا بے لوث جذبہ ہنوز موجود ہے۔ انہیں مطالعہ کا ذوق ہے اور سیکھنے اور پڑھنے کی آرزو بھی، کسبِ کمال کی وہ پارسا آرزو، جو اکثروں میں محض توصلہ ہوتی ہے اور بیشتروں میں صرف ہوس! ان کی سیدھی، روشن اور مستقیم شخصیت قابلِ صد رشک ہے۔ وہ ایک خوش قسمت انسان ہیں کہ قدرت نے انہیں زبان و قلم کی طاقت بخشی ہے اور قلب و نظر کی قوت بھی دی ہے، مطالعہ علوم اور عینی مشاہدات سے اختر صاحب استفادہ کرتے ہیں اور اپنے تجربات سے اچھی طرح معرفت بھی لیتے ہیں۔ ادب اور فن کے چند اہم و جدید موضوعات پر انھوں نے بڑے اعتماد و جراُت کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے، ان کے مقالوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

"میں ۱۹۳۶ء سے تنقیدی مضامین لکھ رہا ہوں۔ میرا سب سے پہلا مقالہ "مختصر افسانہ کی فنی خصوصیات" رسالہ ندیم پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ فی الحال میری زیادہ توجہ بہار میں اردو زبان و ادب کے متعلق تحقیقات کی طرف مبذول ہے۔ ..... میرے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "کسوٹی" کے نام سے مکتبۂ خیال پٹنہ نے شائع کیا تھا، بعد ازاں "تنقید جدید" اور "تحقیق و تنقید" میں "کسوٹی" کے مضامین بھی شامل کر لیے گئے۔ میرے انتقادی مضامین کے مذکورہ بالا دونوں مجموعے مکتبۂ شاد پٹنہ نے ۱۹۵۰ - ۵۱ میں شائع کیے، ان مجموعوں کے سارے مقالے ملک کے مشہور اور موقر جریدوں میں پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔ "تنقید جدید" اور "تحقیق و تنقید" پر پروفیسر احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی، پروفیسر عبدالقادر سروری عثمانیہ یونیورسٹی اور دوسرے ادبا نیز اردو جرائد کے مبصرین نے نہایت ہی قابلِ قدر تبصرے کیے۔"

دیباچہ نقد و نظر

(۳) علمیت مقالوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ اس صنفِ ادب کا جوہر ہے۔ مقالہ کا نفسِ کسی مخصوص بات یا خیال سے معمور رہتا ہے ایسی بات، خیال، مسئلہ، نکتہ یا پہلو جو ہماری ذات یا حیات بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھتا ہے۔ جس کی جان پہچان اس جیتی پھرتی بنتی اور بدلتی دنیا میں ہمارے لئے بہت ضروری ہے، ایسی خاص اور مفید بات جس سے ہم میں تہذیب اور فرزانگی آتی ہے، علم و دانش کی گرانقدر روشنی حاصل ہوتی ہے ــــــ یہ علمیت مقالوں کے مزاج، بالفنِ تحریر کے بموجب تین قسم کی ہوتی ہے، معلوماتی، تاثراتی اور فکری۔

معلوماتی مقالے سائنس یا علوم سے متعلق ہوتے ہیں، ایسی نوعیت

کسوٹی	:- شائع کردہ :-	مکتبۂ خیالی (پہلا ایڈیشن)	۱۹۴۲ء —	۲۴۳ صفحے	کس
تنقیدِ جدید "	:-	رام نرائن لعل بینی پرشاد الہ آباد	۱۹۵۰ء	۲۷۴ صفحے	تن
تحقیق و تنقید "	:-	شاد بک ڈپو پٹنہ ۶	۱۹۵۱ء	۲۵ "	تخ
نقد و نظر "	:-	فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۵۵ء	۳۱۹ "	قد

(۵) مجموعۂ ... شائع کردہ: ادارۂ ... ۱۹۶۵ء ۲۵۲ صفحے

یا مزاج کے بموجب یہ سراسر معلوماتی (INFORMATIVE) ہوتے ہیں، یہ کیمیات، طبیعات، فلکیات اور دیگر سائنٹفک موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا منطق، اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات جیسے سنجیدہ علوم سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان مقالوں کی روح سائنس اور علوم کی ارتقا وارفع نکات ونظریات، اور مسائل وتصورات ہوتی ہے۔ ان مقالوں کا اہم ترین جزو معلومات ہے اور ان کا کام ہمارے دائرہ علم کو کشادہ اور وسیع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہمیں انجانی باتوں سے باخبر کرتے ہیں اور ہماری کم شناسائی یا نیم شناسائی کا درماں ہوتے ہیں۔

مقالوں کی دوسری نوعیت تاثراتی (IMPRESSIONISTIC) ہوتی ہے۔ تاثراتی مقالے ہمیں ایسی باتوں سے واقف کرتے ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں۔ پر ذاتی طور پر پہچانتے نہیں۔ ایسی باتیں جو ہماری علمیت میں استحکام کا باعث ہوتی ہیں، معلوماتی مقالے سے ہماری آنکھیں کھلتی ہیں۔ تاثراتی مقالے سے ہماری چشم کو قوت اعتماد نصیب ہوتی ہے۔ معلوماتی مقالہ کی علمیت چند ساعتوں کی ملاقات کی مثال ہے محض چلتی پھرتی رسمی شناسائی، تاثراتی مقالہ کی علمیت رسمی ملاقات نہیں، یہ رفاقت، گہری اور طویل رفاقت کا لطف اتصال بخشتی ہے۔ معلوماتی مقالے میں خارجیت ہوتی ہے، تاثراتی مقالے میں داخلیت اور اس کی مقدار خارجیت سے دوگنی ہوتی ہے معلوماتی مقالے ہمیں تعلیم یافتہ اور ہوشمند بناتے ہیں۔ تاثراتی مقالے ہماری فہم وادراک کی نشوونما میں حصہ لیتے ہیں۔

مقالوں کی تیسری نوعیت فکری (PHILOSOPHICAL) ہوتی ہے۔ یہ علمیت کی نہایت اعلیٰ اور ادق قسم ہے، ایسی قسم جو مقالے کے مزاج کی لطافت و رعنائی کی شہادت دیتی ہے، اس نوع کے مقالوں کا موضوع فلسفہ نہیں ہوتا مگر موضوع سخن کا انداز بیان فلسفیانہ ہوتا ہے۔ مقالہ نگار کی ژرف بیانی کسی دانائے راز کی نکتہ رسی کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کی عالمانہ شخصیت اوسط مرتبہ ومقام کی نہیں ہوتی، اس کی ذہنی قوتیں قدرت کی فیاضی کا نمونہ بے نظیر ہوتی ہیں، وہ اونچی سطح کا ایک غیر معمولی اہل نظر ہوتا ہے جو بصارت سے زیادہ بصیرت سے معرفت لیتا ہے، ایک ماہر نباض کی طرح وہ حیات اور اس کی دکھتی رگوں پر اپنی رمز شناس انگلیاں رکھ دیتا ہے اور بے حد جامع، فکر انگیز اور موثر الفاظ میں ان نکات نادر کی تفسیر لکھ دیتا

جو ستر حجابوں میں مستور ہوتے ہیں۔

اختر صاحب عالم ادب، ادیب اور معلم ادب بھی، ان کے مقالے معلوماتی کم تاثراتی زیادہ ہیں، انھوں نے ادب اور فن کے مختلف اہم امور ومسائل پر طبع آزمائی کی ہے، یہ خالص ادبی موضوعات پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں اور ادبی تخلیقات پر نقد ونظر کی روشنی بھی ڈالتے ہیں موضوعاتی لحاظ سے اختر صاحب کے مقالے تنقیدی، تحقیقی اور علمی تین گروپ میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(الف) ۱۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر ایک عمومی تبصرہ تق ۲۔ غالب کا فن شاعری اور اس کا نفسیاتی پس منظر، تق۔ ۳، فن غزل گوئی اور پروفیسر بیدل عظیم آبادی تق۔ (۴) آفتاب (جدیدہ علی گڑھ یونیورسٹی) تبصرہ تق (۵) عظیم عظیم آبادی کی شاعری پر ایک نظر س تج۔ (۶) صحرانورد کے خطوط پر ایک نظر (س تج)۔ ۷ ابن الوقت پر ایک تبصرہ س تج، نیاز افسانہ نویس کے لحاظ سے (تج س۔ (۹) سوداؔ سی اور تلسی داس پر اردو کا حق تج۔ (۱۰) اقبال اور ٹیگور س تج۔ ۱۱، راسخ عظیم آبادی (ایک تعارف) قد۔ (۱۲) بیان درد قد (۱۳) داغ کی شاعری میں لب ولہجہ کی اہمیت قد۔ ۱۴۔ حسرت کی انفرادیت قد۔ ۱۵، جوش ایک صناع کی حیثیت میں قد (۱۶) فیض احمد فیض کی شاعری اور اس کی فضا قد (۱۷) حضرت عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کی شاعری قد (۱۸) حضرت حافظ شمس الدین احمد شمس منیری اور ان کی شاعری قد، (۱۹) اقبال کی شاعری میں درد کا عنصر (ایک مطالعہ) قد ۲۰ ایک تعارف (غلام سرور کی تصنیف پرکھ کی پیش لفظ) قد۔ ۲۱، اردو شاعری اور غالب (ایک مطالعہ) قد (۲۲) شہاد کی شاعری (تین قسط) س۔ (۲۳) شاد کا انداز نظر س۔ (۲۴) شاد کا فن غزل گوئی اور اس کا تجزیہ (س) (۲۵) شاد کی غزل گوئی (س) ۔ (۲۶) شاد عظیم آبادی کی ناول نگاری س (۲۷) جمیل مظہری کی غزل نگاری (س) (۲۸) پرویز شاہدی کی فنکاری (دو قسط) س (۲۹) اجتبیٰ رضوی کی شاعری س (۳۰) علامہ فضل حق آزاد اور ان کا فن س (۳۱) وجہی کا نظریہ فن اور نقد فن س ۳۲ حالی اور مسئلہ زبان س ۳۳۔ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری س ۳۴ عصر غالب اور غالب کے قبل اور بعد کے میلانات۔ تق س۔ ۳۵ غالب کی فنکاری س

(ب) ۱۔ بزاریوں کا سنگم تج ۲۔ بہار میں اردو ناول نگاری تج ۳۔ اردو زبان کا ارتقا تک ۴۔ بہار میں مثنوی نگاری ۵۔ بہار میں اردو مرثیہ نگاری تک ۶۔ شاد کا عظیم آباد عص ۷۔ اقبال کا خط شاد عظیم آبادی کے نام س ۸۔ سلیمان خان جاوؔد کی شاعری عص۔ ۹۔ لالہ جگر ناتھ کنگھم عص ۱۰ محمد حسن وحدت عص ۱۱۔ نظم منڈی عص۔

(ج) ۱۔ ترقی پسند ادب تن ۔ ۲ ادبیاتِ عالم اور ادب میں اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات تن ۔ ۳۔ اردو کی رومانی شاعری تج ۴۔ افسانہ میں مقصد تج۔ ۵ فن اور ماحول تج ۶۔ انشائیہ س تج ۔ ۷۔ افسانہ فنی نقطۂ نظر سے تج ۸۔ افسانہ میں حقیقت طرازی اور مثالی نگاری تج ۔ ۹۔ ڈراما فنی نقطۂ نظر سے تج ۱۰۔ جبلتیں اور قدریں تک ۱۱۔ ادب اور نفسیات تک ۔ ۱۲۔ تخلیق و تنقید تک ۱۳۔ ادب اور فن کی بنیادی قدریں تک ۔ ۱۴۔ فن میں اسلوب کا مسئلہ عص ۱۵۔ عالمی ادب اور ادب اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات عص ۱۶۔ ادب میں روایات اور تبدیلیاں تن ۔

یہ مقالے اختر صاحب کے ذوقِ ادب اور خدمتِ ادب کی شہادت دیتے ہیں موضوعات کا تنوع فاضل مقالہ نگار کے مطالعہ کی کثرت کی نشان دہی کرتا ہے ان مقالوں میں اختر صاحب کی ادبی شخصیت کے نقوش جھلکتے ہیں۔ اور ان میں علمیت کی روشنی بھی جھلملاتی ہے یہ علمیت سطحی یا عامیانہ نہیں یہ اکتسابی ہے اور بیشتر غور و فکر کا نتیجہ ہے ان مقالوں سے اختر صاحب کی محکم فاضلانہ شخصیت ہمارے پیشِ نگاہ آجاتی ہے۔

اردو زبان کی ترویج و نشو و نما میں ہندوستان گیر قوتوں کا عمل ہے "سیاسی نعروں کے بجائے اثرات کی چھوت ہے یا محض طفلانہ خود فریبی کہ ملک کے مختلف گوشوں سے بھانت بھانت کے عنوان کی آوازیں آرہی ہیں۔ کہیں سے صدا آتی ہے "پنجاب میں اردو" کہیں سے یہ پکار سنائی دیتی ہے کہ "دکن میں اردو" کوئی اردوئے معلیٰ اور اہلِ زبان کے نعرے لگاتا ہے، کسی گوشے سے یہ لہر اٹھتی ہے کہ گجرات میں اردو، اور کہیں سے دبی ہوئی آواز آتی ہے کہ بہار میں اردو، یہ قسم قسم کی صدائیں اس دعوے کا اعلان کرتی ہیں کہ اردو سب سے پہلے میرے گھر میں بنی یا پیدا ہوئی ہے۔ یہ صوبائی تنگ نظری محض آرزو پروردہ خیال آرائی کی پیداوار ہے، ایسی جذباتیت ایک تسکین دہ فریب تو ہو سکتی ہے، لیکن صداقت اور علم و فن کے لئے یہ کیفیت سخت گمراہ کن اور خطرناک ہے۔

"ابا جان میرے ہیں تمہارے نہیں!" "امی جان صرف میری ہیں اور کسی کی نہیں"، "دادا جان میں آپ کا بیٹا ہوں اور کوئی نہیں نا؟" اس نوع کی ادائیں بچپن میں بھلی لگتی ہیں، مگر بالغ بھائی بہنوں کے منہ سے ایسی باتیں احمقانہ چونچلے معلوم ہوں گی۔ اہلِ نظر اور اربابِ حکمت کے لئے پنجاب کی اردو، دکن کی اردو، اہلِ زبانوں کی اردو وغیرہ وغیرہ قسم کے من مانے دعوے صرف مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ سخت ناگوار بھی ہیں۔ کیوں کہ یہ مسئلہ زبان سے متعلق ایک اہم صداقت کے ایک گوشے کو دکھا کر مکمل صداقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔

اردو پنجاب میں پیدا ہوئی یہ ایک وسیع اصلیت کا جز ہے۔ اردو دکن میں پیدا ہوئی یہ بھی حقیقت کبریٰ کا ایک حصّہ ہے، اردو لشکر شاہجہانی میں تولد ہوئی، یہ بھی عظیم الشان کل کا ایک ٹکڑا ہے، گجرات کی اردو اور بہار کی اردو یہ سب باتیں آفتاب کے مقابلے میں ذرے کی حیثیت رکھتی ہیں (نیم صداقتوں پر اگر اتنی روشنی ڈالی جائے، کہ وہ دوسرے پارہ ہائے حقیقت کو چھپالے تو وہ جھوٹ سے زیادہ مہلک بن جاتی ہیں) یہی حال مذکورہ بالا دعویٰ کا ہے۔

سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے قریباً سارے صوبوں میں اردو کی تخلیق اور نشو و نما ہوئی ہے، جن عناصر اور اسباب نے تخلیق اردو میں حصہ لیا ہے وہ تاریخی طور پر ہندوستان گیر وسعت رکھتے تھے ان اسباب و عناصر کو کسی ایک خطے میں محدود کر دینا تاریخی صداقت کو جھٹلانا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان عناصر اور اسباب کی موجیں کسی ایک خاص گوشے سے شروع ہو کر آگے نہیں بڑھی ہیں۔ بلکہ چند خطوں میں لہریں لیتی ہوئی پھیلیں، ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئیں، اور ایک دوسرے کو متاثر کرتی اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہندوستان پر رحمت بن کر چھا گئی ہیں۔" تج

تنقیدِ حقیقت نگاری

"عہدِ حاضر کے ادیب کو سب سے پہلے زندگی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرنی چاہیئے، حقیقت سے گریز کرنا ادب کا خون چوسنا، زندگی کو فریب دینا اور انسانیت کو تباہ کرنا ہے ظاہر ہے کہ موجودہ دور کی زندگی میں تضاد بحران، انحلال

یاس و حسرت اور بیکسی کا احساس سب کچھ ہے اور ادیب کا فرض ہے کہ ان کیفیات کو منظر عام پر لائے مگر اسے ان کیفیات سے بلند ہو کر ان پر تنقید و تبصرہ کرنا چاہیے۔ ادنیٰ درجہ کے ادیب اسی رو میں بہ جاتے ہیں، مگر بلند مقام اور دور بیں ادباء ذہن رسا کی "کشتی نوح" پر سوار ہو کر اس طوفان سے محفوظ رہتے اور انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ عصر حاضر میں تخریبی قوتوں کے ساتھ ساتھ تعمیری قوتیں بھی کارفرما ہیں، کہیں کہیں امید اور ارادہ کی روشنی بھی نظر آتی ہے اور عمل کی گرمی بھی، اگر ادیب واقعی حقیقت نگار ہے تو اسے ان امید افزا رجحانات کی تصویر کشی بھی کرنی چاہیے، جیٹھ بیساکھ کے مہینوں میں ہر طرف خشکی و ویرانی، تناؤ اور جھلسا دینے والی حدت ہوتی ہے، زندگی منھ چھپائے پھرتی ہے، آسمان توے کی طرح دہکتا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب زمین کبھی ہری بھری نہ ہوگی، اساڑھ آتے ہی فضا میں کشاکشی پیدا ہو جاتی ہے، طوفان آتے ہیں اور ماحول کو دھندلا کر چلے جاتے ہیں بجلیاں کڑکتی اور گزر جانے والے بادل گرجتے ہیں، کسان کی امیدیں بندھ بندھ کر ٹوٹتی ہیں مطلع پھر صاف ہو جاتا ہے، مگر دوبارہ غبار آلود ہونے کے لئے کبھی کبھار ایک آدھ چھینٹا کا دُھبی ہو جاتا ہے اور پھر سناٹا، سبزۂ خوابیدہ کہیں کہیں بیدار ہوتا نظر آتا ہے، اور کھیتوں کی گرد دب سی جاتی ہے، کاشتکاروں کے دل دو بارے میں رہتے ہیں، عام بادشاہی ابھی تک امید فزا ہے، اگر کوئی فنکار اس فضا کی خارجی اور داخلی ترجمانی کرے تو اسے امید و بیم کی کشمکش دکھانی پڑے گی، اور پھر اسے دہقانوں میں دبی ہوئی غیر شعوری امید اور چھپے ہوئے ارادہ کو بھی نمایاں کرنا چاہیے۔ "اٹھ کر ایک ذرہ جو گلستاں دیکھتا ہے" مستقبل اسے مرجھائے ہوئے سبزۂ نودمیدہ سے بہار پیدا کریگا اور بہو کے پیاسے کھیت زرخیز گہر ریز نظر آئیں گے۔

دنیا کا موجودہ دور اساڑھ کے مہینے سے مشابہ ہے ایک حقیقت نگار فنکار اس عہد کی سچی ترجمانی اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ رات کی گہری تاریکی میں سپیدۂ سحر کو دیکھ سکے اور نور و ظلمت پر تنقید کرے ایسی حقیقت نگاری کو تنقیدی حقیقت نگاری (CRITICAL REALISM) کہتے ہیں ترقی پسند ادیب اسی قسم کی واقعیت کا علم بردار ہوتا ہے" ق ن ۲۴ تا ۲۶

۳۔ ادب جدید میں نئی زندگی نمودار ہوتی ہے۔

"نظام جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ جمہوریت اپنے اپنے وقت کے بہتر نظام تھے، ارتقائے نظام معاشرہ انسانی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نظام ترقی پذیر اور متحرک (DYNAMIC) ہے جب ایک نظام اپنا وقت پورا کر لیتا ہے اور نئے حالات کے رونما ہو جانے کے سبب نئے مطالبات پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں، یا کوئی علمی اور سائنٹیفک دریافت حالات کو بدل دیتی ہیں، مثلاً مشین کی ایجاد بخارات و برق کی قوتوں کا انکشاف کسی نظام کے انحطاط کے زمانہ میں ہر طرف پژمردگی، تضاد، اور نصب العین کا فقدان معلوم ہوتا ہے، اس کا اثر ادب پر بھی پڑتا ہے دور انحطاط (DECADENCE) کا ادب غیر معتقدی اور مریضانہ ہوتا ہے ادب میں فرار و گریز (ESCAPE) پیدا ہو جاتا ہے، کبھی یہ گریز اپنے نفس کے اندر ہوتا ہے، کبھی شاہد و شراب کی طرف، کبھی ماضی کے نقش کی جانب، کبھی مادیت اور روحانیت کی دنیا میں اور انتہائی صورتوں میں موت اور بربادی کی سمت یہ گریز طرح طرح کے خیالی یا تخریبی صورتیں اختیار کر لیتا ہے زندگی اس حال میں قائم نہیں رہ سکتی تحفظ حیات، بقائے انسانیت اور احیائے تہذیب کی خاطر معاشرہ ایک کروٹ لیتا ہے اور انقلاب کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ پرانے معیاروں پر جرح و تنقید ہوتی ہے اور نیا نصب العین تلاش کیا جاتا ہے، تکمیل انقلاب سے پہلے سارے سماج میں تصادم عمل اور ردعمل کا دور دورہ ہوتا ہے زندگی ایک بحران (CRISIS) کا تجربہ کرتی ہے اور بحران ادب کو بھی متاثر کرتا ہے لہذا ادب میں بھی تصادم عمل اور ردعمل منعکس ہو جاتا ہے، ادب کا خارجی عنصر بھی بحران اور اس کی شکست و ریخت سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ طرز اور تعمیر ادب (STYLE AND CONSTRUCTION) پر بھی ضرب پڑتی ہے اور ادب کی ساری عمارت اندر اور باہر سے متزلزل ہو جاتی ہے، ترقی پسند قوتیں آگے بڑھنا چاہتی ہیں اور دم توڑتی ہوئی رجعت پسندی ان کی راہ روکتی ہے، ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کرنے والے اکثر شکست دل سمجھ لیتے ہیں اور

[illegible]

اور دنیا میں ایک قیامت آجاتی ہے، تاآنکہ انقلاب کامیاب ہو جاتا ہے اور آفتابِ تازہ، کی زندگی افشاں شعاعیں، نئی امید اور نئی زندگی کا پیام دیتی ہیں (نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہوتا ہے، اور نئے آدم کی تخلیق ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی احیاء کے ساتھ ایک نیا ادب جنم لیتا ہے۔ اس ادب جدید کی زمین میں نئی زندگی نمو پاتی ہے۔ اور اس کے آسمان پر ایک نیا نصب العین رہبر ستارہ کی طرح درخشاں نظر آتا ہے۔" ق ن ۱۲

۴۔ فن تنقید جلوہ ہائے حسن کا شاہدہ و تمیز ہے۔

"بہر کیف تنقید فن تخلیق فن کی طرح عمومی معیار کے ساتھ ذاتی زاویۂ نگاہ سے بھی وابستہ ہے، فن حسن آفرینی ہے، بشرطیکہ وہ کامل ہو، ورنہ ہر قسم کی فن کاری سعی حسن آفرینی تو ضرور ہے انتقاد فن جلوہ ہائے حسن کا شاہدہ و تمیز ہے۔ حسن کامل کے بغیر حد کامل ناممکن ہے لیکن حد کامل کا مقام قرب حسن کا انتہائی مقام ہے، اس قرب خاص کے بغیر نظارۂ جمال آتشنہ رہتا ہے ناقد کا مجاہدہ یہ ہے کہ وہ حسن کے قریب پہنچنے کی سعی پیہم میں لگا رہتا ہے، فنکار اپنے انداز سے زائر حسن ہے اور ناقد اپنی طور پر۔"

س ۱۸۸

۵۔ ادب اور فن زندگی کے اندرونی تاروں کو چھوتا ہے

" آرٹ صرف اندازِ بیان کی جدت و دلکشی اور طرز کی طرحداری پر منحصر نہیں، آرٹ ایک صد پہلو حقیقت ہے، عمیق، ارفع، وسیع و لبیط اگر آرٹ واقعی آرٹ ہے، اگر فنکار کی قوتِ مشاہدہ اس کے حواس احساسات، جذبات، تخیلات و ادراک، اس کے دل و دماغ، اس کی شخصیت اور اس کی روح نے تخلیقِ فن میں حصہ لیا ہے تو فن کبھی بھی کھوکھلا اور سطحی نہیں ہوگا، بلکہ وہ بھرپور جیتا جاگتا اور دھڑکتا ہوا ہوگا وہ زندگی کے حقائق سے گریز نہیں کرے گا بلکہ حقائق اور زیادہ پراثر ہو کر اس میں جلوہ گر ہوں گے اعلیٰ ادب و فن انسان کے احساسات، جذبات، تخیلات اور اس کی دوسری لطیف قوتوں کو بیدار کرتے ہیں اور نہایت لطیف انداز میں ہمدردی و دلسوزی اور انسانیت دوستی کی روح جگاتے ہیں۔ فنون لطیفہ کے ذریعہ بے تعصبی، رواداری، عدل، وسیع النظری، اور آفاقیت پیدا ہوتی ہے، ان سے دردمندی، نیکی اور انصاف کا حسن نمایاں ہوتا ہے، آرٹ سے زیادہ لطافت کا امکان ممکن ہے ——

صوفیت پیدا کرتی ہو، لیکن لطافت کو تنوع، وسعت، ہمہ گیری اور زندگی عطا کرنے میں آرٹ اپنی مثال آپ ہے، آرٹ کی پیدا کردہ بصیرت صرف ایک خنکاری میں طور کا جلوہ دیکھ کر مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ وہ شیطان میں فرشتگی کی تلاش بھی کرتی ہے آرٹ کی پیام رسانی اصلاح اور اخلاق آموزی منطقی اور خشک نہیں ہوتی وہ زندگی کے اندرونی تاروں کو چھوتی ہے اور واردات کے عالم کو منقلب کرتی ہے اس کے اصول بندھے ٹکے نہیں ہوتے، حسن صداقت اور عشق کائنات اور حیات کی بیکرانی کا احساس لئے ہوئے صناعت کی دنیا میں گلے لگتے ہیں۔" ق ن ۲۱۸

(۳)

تلمیت مقالہ کا جوہر ہے، یہ علمیت محض علوم یا سائنس کا بے کیف اور بے رونق سبق نہیں، مقالہ نگار کی شخصیت کا صحت مند رخ بلاشبہ عالم و مفکر کا ہوتا ہے، یہ رخ مگر ثانی ہے جیسے آفتاب کی روشنی اور اس کی حرارت اساسی طور پر مقالہ نگار ادیب ہوتا ہے۔ یہ آرٹسٹ کا دل و دماغ رکھتا ہے، حساس اور پر از تاثر! دوسرے اصناف ادب کی طرح مقالہ میں بھی داخلیت لازمی ہے، ایسی داخلیت جو سپید پھول کی بھینی خوشبو جیسی خفیف ہوتی ہے، وہ تمام اصناف جو کہانی یا شاعری سے علاقہ رکھتے ہیں، ان میں رنگ و نکہت کی فزونی کا سبب یہی داخلیت ہوتی ہے، پر مقالہ میں اس کی تیزی کا گذر نہیں۔

اختر صاحب کے مقالوں میں داخلیت کی بوباس ہوتی ہے جو ان کے ادراک لطیف (FINE - SENSIBILITY) کا پرتو ہے یہ خوشگوار بوباس ان کی شخصی رنگ آمیزی (PERSONAL TOUCHES) سے ابھرتی ہے اور تحریر کی تروتازگی کا سبب بن جاتی ہے، اختر صاحب عالم ادب ہیں اور معلم ادب بھی، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک آرٹسٹ ہیں، یہ دہری شخصیت انہیں ایک بلند مقالہ نگار کا منصب بخشتی ہے، یہ مدرس ہیں، مگر ان کی باتیں درس فرسودہ نہیں، یہ اہل کیف ہیں اور صاحب فکر و نظر بھی، شخصی رنگ آمیزی سے ان کے مقالہ میں شگفتگی اور رونق پیدا ہو جاتی ہے، پھر خشک، روکھے اور ادق موضوعات بے جان نہیں رہتے یہ جاذبِ نگاہ ہو جاتے ہیں۔ اور اثر بخش و فکر خیز بھی۔!

۲۔ زندگی نئے قالب بدلتی رہتی ہے اور ادب اس سے تاثرات لیتا رہتا ہے۔

"ہمارا اپنا ادب بھی کچھ اسی قسم کی ارتقائی منزلوں سے گذرا ہے، ہماری ادبی اور لسانی روایات دور "پراکرت" سے شروع ہوتی ہیں، ہماری ہندوستانی زبان اپنے چمن زاروں میں پھول پھل رہی تھی کہ مسلمانوں کی آمد آمد ہوئی، عرب بیٹھے گئے اور اپنے ساتھ عربی انجا دو ثمر لائے پھر ترکی فارسی پودے نصب ہوئے، عربی اور فارسی قلمیں خوب لگیں اور پھوٹ کر بار آور ہوئیں۔ ہماری زبان و ادب کے چمن زاروں میں رنگا رنگ پھول کھلے اور قسم قسم کے پھل آئے "پراکرت" نے چولا بدلا اور سنور سنور کر ایک دلکش اور نئی نویلی دلہن بن گئی، اس ہندوستانی عروس کو اب مغربی گہنوں، اور غازوں کا شوق ہوا ذرا دیکھئے تو سہی اسے یہ آرائش بھی کتنی بھلی لگتی ہے، کیسی پیاری صورت پائی ہے، اللہ اللہ اس پر یہ جامہ زیبی، روپ رنگ کے ساتھ ساتھ فن کے بھی سنواگن رکھتی ہے، اس کے من کی سندرتا ہی تو اصل من موہنی ہے۔

غرض دوسری زبانوں کی طرح ہمارا ہندوستانی اردو زبان کی بھی روایات ہیں اور ان روایات کی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر سے ہوئی ہے جدا جدا دوروں میں جدا جدا تبدیلیاں تدریجاً ہوتی رہی ہیں اور اس دورِ جدید میں بعض تبدیلیاں اچانک بھی ہوئی ہیں، مثلاً احیائے قومیت کے اثر سے حب الوطنی کے نغمے جاگ اٹھے ہیں۔ اور انقلاب روس نے کسان اور مزدور اور پسماندہ طبقوں کی ہمدردی میں نالوں کو اکسایا ہے، چونکہ فریاد کی کوئی لئے نہیں ہے، لہذا نالۂ ہمدردی "پابندِ نظم" ہو کر نہ رہا، بلکہ ترقی پسندانہ افسانوں کا بھی شور و شیون سنائی دے رہا ہے روایات کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے، اب آئیے ذرا تبدیلیوں کی قیمت لگائی جائے۔

ادبی تبدیلیاں، ضروری، لازمی، فائدہ رساں اور

نظری ہیں، چونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا جب کبھی آثارِ حیات میں تبدیلی ہوگی ادب اس سے ضرور متاثر ہوگا، زندگی ہمیشہ نئے قالب بدلتی رہتی ہے۔"

ص ۸۷

(۳)

اشعارِ غزل حسن کہکشاں ہیں۔

"بنیادی طور پر غزل کا فن شعر مفرد کا فن ہے، تجزیہ کی مرکزیت، ارتقا، اور تکمیل، سب کچھ دو مصرعوں سے وابستہ و پیوستہ ہوتا ہے۔ یہ ایجاز کا ہنر ہے اور اعجاز بلاشک یہ نگینہ سازی کا نفیس و نازک کام ہے، آرٹ کی قدریں، توازن و تحمل، شعر مفرد کے عالمِ صغیر میں مل جاتی ہیں، ہیں قافیہ و ردیف کے اہتمام میں مفرد اشعار کو ایک منجھے ہوئے ڈور کی مدد سے منسلک کرنے کی کوشش سمجھتا ہوں، یوں تو یہ محض میکانکی کام ہے لیکن قافیہ و ردیف کی ہم آہنگی سے مفرد اشعار کے اتصال میں ایک حسنِ تعریب پیدا ہو جاتا ہے اور ترقی یافتہ غزلوں میں کچھ ارد لیف و قوافی ارتکاز تجربات کے باعث بھی ہوتے ہیں۔ ہر غزل کو ایک وحدت تصور کرنا یا اس کی توقع رکھنا صحیح طرزِ فکر نہیں، بڑی نظموں کے امکانات اور ہوتے ہیں اوسط درجہ کی نظموں کے اور مختصر نظموں کے کچھ اور اسی طرح شعر مفرد کے کچھ اور غزل کا ایک مکمل شعر دنیائے شاعری میں مختصر ترین نظم کی مثال ہے، ان اشعار کے مجموعہ کو ہم انتشار خیال کا الزام کیوں دیں، کیا یہ چھوٹی اور اوسط قامت کی نظموں کے مجموعہ کو ہم انتشار خیال اور لامرکزیت کا طعنہ دے سکتے ہیں، ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ایک رزمیہ نظم یا ایک منظوم المیہ یا طربیہ یا مثنوی کے امکانات فن اور حسن تعمیر کا مقابلہ غزل کا ایک شعر نہیں کر سکتا، ہلال سے بدرِ کامل کا موازنہ فضول ہے، لیکن ہی جو حسن لطافت نزاکت اور تاثر ہے وہ ماہ کامل میں نہیں، دونوں کی اپیل کی نوعیت جدا جدا ہے، دونوں کے حسن کی ادائیں الگ الگ ہیں۔ کامیاب شعر مفرد کے ارتکاز، وحدانیت

تعمیر، کاریگری، تکمیل، وتاثیر کا دوسری اصناف شاعری میں جواب ملنا مشکل ہے، اشعار منفرد کی فنی تجلی تو زہرہ، مشتری اور قطب تارے کی طرح جلوہ بار ہوتی ہے، الف ستاروں کا حسن کیا نظام شمسی کا مرہون منت ہے، لیکن آسمان کے ہر ستارے کا حسن منفرد ہے، ستاروں بھری رات میں ستاروں کے انتشار سے بدنمائی تو پیدا نہیں ہوتی، کہکشاں کے حسین بکھراؤ میں بڑی کشش ہوتی ہے، لیکن انتشار کی کیفیت بدصورتی اور تاثیر کی ابتری بھی پیدا کرتی ہے، یہ ہنرمندی پر منحصر ہے کہ انتشار وحشی ہے یا سنجیدہ فنکارانہ۔

تاروں بھری رات کا مجموعی حسن بھی ہوتا ہے اور اس کے جادو کی کلی تاثیر بھی ہوتی ہے، دور دنیا سے ستاروں کا سرگم سنائی دیتا ہے، لیکن ہر ستارہ منفرد حسن رکھتا ہے کم از کم سطح دنیا سے ستاروں کے کلی جمال افروزی میں تنظیمی یا ارتقائی حسن نہیں محسوس ہوتا، تاروں بھرے آسمان کی جمالیاتی تاثیر مربوط نہیں، ہر کلی کی تاثیر مربوط نہیں ہوتی، اچھی غزل میں چمکتے ہوئے حسین اشعار ایسی کہکشاں بنادیتے ہیں غزل کے فنکار کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اشعار کے موضوعات بدصورت انتشار پیدا کرنے کا باعث تو نہیں ہوتے، کامیابی کا انحصار کاریگری، صناعت اور ذوق پر منحصر ہے، غزل کا آرٹ نظم کے آرٹ سے مختلف ہے، دونوں کا برتاؤ کامیاب یا ناکامیاب ہو سکتا ہے ۔" ص ۱۹۲

(۴)

اختر صاحب کے مقالے ان کے میلان طبع اور ذاتی رجحان کے غماز ہوتے ہیں، یہ ان کے انداز نظر (ATTITUDE) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اختر صاحب ان ہوشمند معلموں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں جو درس و تدریس کو محض پیشہ قرار نہیں دیتے معاملہ ادبی ہو یا سماجی یہ عموماً نیاز مندانہ اقدام کرتے ہیں روایتی قدروں کا پاس ادب رکھتے ہوئے بھی رسم و روابط میں اختر صاحب عامی (COMMNER) نظر نہیں آتے ان کے برتاؤ میں سطحیت (SUPER CIALITY) نہیں ہوتی ان کا اخلاص نت نئے جلوے دکھاتا ہے، کہیں وفاداری ہے، اور کہیں دلداری، کسی جگہ یہ شفقت ہے اور کبھی عقیدت! ان کے نرم اور حساس دل میں ولولے اور امنگیں بھری ہیں یہ کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور اپنے ہونہار عزیز شاگردوں کو پر از امید نگاہوں سے دیکھتے ہیں، خود کہتے ہیں — (میں اپنی امنگوں کو اگر ابدی بنا سکتا ہوں تو اسی طرح کہ نوجوان دلوں میں نئی دھڑکن پیدا کردوں)

اور ان کا انداز نظر واقعی غیر عامیانہ اور انداز فکر (LINE OF THINKING) مخصوص ہے، جو نوجوان اور غیر مقلد دلوں میں فکر و خیال کا نیا جادو جگاتا ہے ان کے رجحانات اور نظریات ادب و فن میں روایتی کھنگی نہیں ملتی۔ ادب اور حیات کے اساسی مسائل ہوں یا آفاقی قدروں کا مسئلہ، اختر صاحب کی باتیں خیال انگیز اور نکتہ آفریں ہوتی ہیں، مذہب، اخلاق، روایات، فن اقدار جیسے اہم اور ادق موضوعات پر یہ غیر رسمی اور نئے انداز سے نہایت موثر انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

اس نوع کا ایک نمونہ دیکھئے

" میں اردو ادب کی دنیا میں محدود نقطۂ نظر رکھنے اور صوبہ واری تعصب کو راہ دینے کا قائل نہ ہوں، بلکہ اس انداز نظر کو مہلک سمجھتا ہوں، ہمارے لئے جیسے ابن نشاطی دلی دکنی، میر دہلوی، غالب، انیس، چکبست لکھنوی حالی پانی پتی اور اقبال، ویسے ہی بیدل، راسخ، جوشش اور عظیم عظیم آبادی ہیں، لیکن مجھے تاریخ ادب اردو کی تکمیل کرنے سے دلچسپی ہے، اب تک کے تاریخ ادب لکھنے والوں نے بہار کا خانہ گویا خالی چھوڑ دیا ہے اس سے قصداً خلا پر پردہ پڑتا ہے اور اردو ادب کے ارتقاء کا صحیح تصور نہیں قائم ہوتا لہذا ہمارا یہ فرض ہے کہ جو گوشے اور زاویے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں ان پر تحقیق کی روشنی ڈالیں عصبیت کے نقطۂ نظر سے نہیں اردو کی ہندوستان گیری کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لئے ۔" ص ۱۷۱

(۵) شخصی رنگ آمیزی اختر صاحب کے مقالوں کی داخلیت کو کبھی حد مقرر سے متجاوز بھی کر دیتی ہے، اس کی تیزی سے مقالوں میں نئی اور انوکھی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ خصوصاً ان مقالوں میں

جو عملی ہیں، یہ کیفیت عجیب سی نظر آتی ہے، ایسے موقع پر انداز نظر کی عمر عمومیت ایک طرف مقالہ نگار کی دیانت و اخلاص پر دفعتاً ہمیں چونکا دیتی ہے اور دوسری طرف اس کی جدت طرازی کو شائستہ بنا دیتی ہے۔

عنوانات ذیل کے تحت مقالہ نگار کے اس نوع کے چند افکار پیش کیے جاتے ہیں جو قابل غور ہیں۔

۱ مذہب نے آرٹ کو تائیدی قدر پہنچایا ہے۔

"مذہب اور آرٹ مناسبت اور مشابہت کی وجہ سے ہی تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں آرٹ کی ترقی ضرور مذاہب کے ساتھ وابستہ رہی ہے بلکہ مذہب نے آرٹ کو تائیدی طور پر بڑھایا بھی ہے، مثلاً قدیم عہد نامے میں نغمۂ داؤد، اور حضرت سلیمانؑ کا "نغمۂ نغمات" انجیل اور قرآن کی تمثیلیں، صوفیائے مشرق و مغرب کا کلام، بودھ فنکاری، اجنتا کی تصویریں، نشاۃ الثانیہ کے مصوروں کے کارنامے،

دافنچی، مائیکل، انجلو، لیونارڈو، ڈی اینچی وغیرہ،

اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اصل مذہب خود ایک عظیم آرٹ ہے۔ نبی اور صوفی مشاہدۂ جمال کے بعد انسان اور انسانی معاشرہ کو حسین بنانا چاہتا ہے، ہر آرٹ کا ایک واسطہ اظہار ہوتا ہے (Medium) مذہب کے آرٹ کا میڈیم نفس انسانی ہے، عام فطرت انسانی وہ خام مال ہو جسے "مذہبی فنکار" مجلّٰی و مصفّٰی و حسین بناتا ہے، جیسے سنگ مرمر کی چٹانوں سے معمار "صناع" "تاج محل" کی تخلیق کرتا ہے، بالکل اسی طرح نفس عمارہ سے ایک صاحب مجاہد صوفی "نفس مطمئنہ" پیدا کرتا ہے اور یہی اس کی حسین جنت ہے۔ "آدم کامل" کو "محسن" بھی کہتے ہیں، محسن کا مادہ حسن ہے، صوفیا اسی لئے کہتے ہیں۔ "اللہ جمیلٌ و یحب الجمال"۔

آرٹ و مذہب دونوں میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تجربۂ فنکارانہ اور تصوف، طریقت اور شریعت دونوں لازم و ملزوم ہیں زندہ آرٹ اور زندہ مذہب نہ جسم کو ترک کر سکتا ہے نہ روح کو، جلیل القدر فنکاروں نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے اور رفیع الشان صوفیوں نے بھی۔ تجربہ اور فارم کے ربط و ضبط کے اظہار کے لئے آرٹ کی دنیا میں "ریاض" کی ضرورت ہوتی ہے، اور مذہب کی دنیا میں "ریاضت" کی، میرا خیال ہے کہ مذہب فنون لطیفہ میں لطیف ترین فن ہے۔

ق ۲۹۵

۳ ـ بے جان اشیائے فطرت میں تنظیم حسن نہیں ہوتی

"تنظیم حسن کے بارے میں میرا مطالعہ یہ ہے کہ بے جان اشیائے فطرت میں نسبتاً تنظیم کی کمی ہوتی ہے، مثلاً ابر، دریا، کہسار، صحرا وغیرہ میں، عالم نباتات میں تنظیم کی ترقی ہوتی ہے اور یہ ترقی عالم حیوانات میں ارتقاء کی منزل طے کرتی ہے، یہاں تک کہ انسانی جسم میں حسن کی تنظیم و لطافت بلند تر سطح پر نظر آتی ہے، حسن کے جلوے اور ادائیں مرکب تر، نفیس تر، لطیف تر اور وسیع تر ہوتی جاتی ہیں فکر انسانی اور صناعت الٰہی میں صوری اور کیفی حسن کے ساتھ معنوی حسن کی شعاعیں جنت ذوق و فردوس شوق ہونے لگتی ہیں، نازک خیالی اور معنویت حسن کی اعلیٰ تر منزل ہے کیونکہ ان میں لطافت زیادہ ہوتی ہے۔" ق ۳۰۲

۴ ـ ادب و فن اسلامی نقطۂ نظر سے

"آپ نے غور فرمایا کہ ادب و زندگی متوازی طور پر منازل ارتقا طے کرتے رہے ہیں، میں نے اسلامی انقلاب کا تذکرہ کیا ہے، اب آئیے میں یہ دکھاؤں کہ اسلامی انقلاب نے ادب و فن کو کس طرح متاثر کیا۔

اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی اس معیارِ فن کی بنیاد ڈال دی تھی، جو معیار آج رائج ہو رہا ہے۔ یعنی فن برائے زندگی نہ کہ فن برائے فن یہی وجہ تھی کہ وہ فنون مروجہ جو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زندگی کی بھونڈی کو بیل کے لئے مضر سمجھے گئے، ممنوع قرار پائے، اسلام مقصدی فن کا قائل ہے، فن برائے تعیش کا نہیں بلکہ برائے فلاحِ انسانیت، فنون کو زندگی کے معیار و منہاج کا طابع ہونا چاہیئے۔ اور جبھی فن انحلاطِ مزاج، بیجا انفرادیت اور مجرمانہ رجحانات سے محفوظ رہ سکتا ہے، میرے خیال میں اسلام نے سب سے پہلے جو عملی نظریۂ فن کی مثال قائم کی وہ حضرت عمرؓ کا "قالینِ بہار" والا واقعہ ہے، خلیفۂ ثانی کے کسریٰ نے زر و جواہر سے آراستہ ہوئے قالین کو حضرت علیؓ کے مشورے سے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بٹوا دیا تھا، بعض لوگ یہ مشورہ دے رہے تھے کہ یہ ایک شہکارِ فن ہے" اس نادر شے کی حفاظت کی جائے، لیکن اس لحاظ سے کہ وہ جمہور کے لئے نہیں بنا تھا، بلکہ انسانوں کا خون چوس کر بنایا گیا تھا اور معاشیات کے نقطۂ نظر سے وہ دولت کا ایک منجمد اور ضرر رساں ڈھیر تھا، جس میں روانی و حرکت پیدا کرکے قدر و قیمت پیدا کی جا سکتی تھی، ایسے نادر شے کی حفاظت کی جائے، لیکن اس لحاظ سے کہ وہ جمہور کے لئے نہیں بنا تھا بلکہ انسانوں کا خون چوس کر بنایا گیا تھا اور معاشیات کے نقطۂ نظر سے وہ دولت کا ایک منجمد اور ضرر رساں ایک ڈھیر تھا، جس میں روانی و حرکت پیدا کرکے قدر و قیمت پیدا کی جا سکتی تھی، اسے تقسیم کر دیا گیا، تاکہ عمرانِ عامہ و اقتصادِ جمہور کے لئے تقاضی و زمانی حالات کے مطابق باعثِ برکت و ترقی ہو۔ "قالینِ بہار" کے حصوں کی تقسیم سے اسلام کے فلسفۂ معاشیات اور فلسفۂ فن دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

غرض اسلام فن برائے فن کا مخالف ہے اور فن برائے انسانیت کا مؤید اسی اسلامی فلسفہ کے مطابق اسلامی ادب نے جنم لیا؛ اور وہ ایشیا و یورپ کو متاثر کرتا رہا، امام مالکؒ، شافعیؒ، ابو حنیفہؒ، ابن رشید، سینا، فارابی، غزالیؒ اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ کے مذہبی اور فلسفیانہ کارناموں سے قطع نظر ادبیاتِ اسلامی میں ہمیں ابن عربیؒ صاحبِ فتوحاتِ مکیہ، سعدیؒ اور مولانا رومؒ وغیرہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کے نام ملتے ہیں، جن کے ادبِ عالیہ کے کارناموں کی سارے عالم میں دھوم ہے"

ص ــ ۴۵

۴ ــ کتابی علم تجرباتی علم سے کم تر ہوتا ہے۔

"اصلی علم کتابی نہیں بلکہ تجرباتی ہوتا ہے، کتابیں تو تجرباتی علم یا فکری معلومات کو مدون کرنے کا ذریعہ ہیں علم کا مصدر و منبع تجربہ و مشاہدہ ہوتے ہیں، لہٰذا ایک ادیب اور شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ براہِ راست مشاہدۂ حیات و تجرباتِ زندگی سے تعنیاتِ انسانی کا علم حاصل کرے" ص ۱۵۳

۵ ــ مقالے ایوانِ ادب میں اونچا وجود رکھتے ہیں،

یہ ادب کی جھانکیاں نہیں جہاں دیکھنے میں دیکھے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے، یہ وہ صاف و شفاف قیمتی شیشے ہیں، جو نہایت اعتماد کے ساتھ دوربینی اور خوردبینی میں کام آتے ہیں، معیاری اور فنی مقالے خیالات و افکار کی تربیت یافتہ شکلیں ہیں، منظم، مربوط اور مستحکم، مقالہ نگار کسی پیشہ ور خطیب کی طرح فی البدیہہ اظہارِ خیال نہیں کرتا، اظہار سے پہلے وہ موضوع پر غور و فکر سے کام لیتا ہے، ذاتی مطالعہ اسکی رہبری

کرتا ہے۔ دماغ میں خیالات آتے ہیں، آمد میں کثرت ہوتی ہے، تنوع ہوتا ہے اور کبھی جوش و خروش بھی، صبر و سکون کے ساتھ مقالہ نگار ہجوم افکار کی یورش کو روکتا ہے اور مستعدی سے روکتا ہے، افراط و تفریط سے وہ غافل نہیں رہتا، غلبا وہ جانتا ہے، ہمیں سب نہیں دیتا بلکہ جو ہمیں درکار ہے وہ سب دیتا ہے، یہی اس کی قدرتِ ضبط کا کمال ہے اور یہی اس کا عمل دیانت۔ اسی ضبط و قرار سے خیالات میں انتشار پیدا نہیں ہو پاتا اور اسی دیانت سے مقالہ کی سالمیت (SOLIDARITY) محفوظ رہ جاتی ہے، وہ مضبوط اور پختہ سالمیت جو باتوں کے اتحاد اور خیالات و افکار کی یکتائی سے قائم ہوتی ہے۔

مقالہ میں خیالات کا اتحاد ہوتا ہے، انشائیہ کی طرح انتشار نہیں ہوتا، افسانہ کی امتیازی خصوصیت "وحدت اثر" فنی لحاظ سے اس صنف میں بھی پائی جاتی ہے جو وحدت خیال ہوتی ہے، جس طرح پھول کی ہر پنکھڑی ایک دوسرے سے علحٰدہ نظر آتی ہے، لیکن جزوی طور پر ایک مرکز سے علاقہ رکھتی ہے اسی طرح مقالے میں موضوع کے مختلف پہلو یا نفس تحریر کے مختلف حصے آپس میں متحد رہتے ہیں، جب ہم مقالہ شروع کرتے ہیں نگاہیں تحریر کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں، مختلف پیراگراف میں منقسم مگر مربوط عبارتیں گذرتی جاتی ہیں اور ذہن پر خیالات کے نقوش مرتسم ہونے لگتے ہیں، بات کھلتی ہے زیادہ کھلتی جاتی ہے، آخر شش نفس مطلب مثلِ آئینہ صاف ہو جاتا ہے از ابتدا تا اختتام ایک ہموار و معتدل عالمانہ سنجیدگی ہمارے ساتھ رہتی ہے جس کا انجام اور بارور انجام (FRUITFUL EFFECT) ذہنی تابندگی (MENTAL ILLUMINATION) ہوتا ہے، یہی مقالہ کی وہ سالمیت ہے جو اس صنف کی مستحکم جبلی تعمیر کی دلالت کرتی ہے جو مقالہ نگاری کو مضمون نگاری نہیں "فنکاری" کا مرتبہ عطا کرتی ہے۔

اچھے اور کامیاب مقالوں میں خیالات کی منزلیں ہوتی ہیں، یہ بہ تدریج ہوتی ہیں، جنھیں ہم زینہ بہ زینہ طے کرتے ہیں۔

اختر صاحب اوسط دل و دماغ کے انسان نہیں۔ ان کی چند قلبی اور دماغی کیفیتیں بلاشبہ غیر معمولی ہیں، جو طباعی ذہانت، پرزور تخیل اور اخلاص و دردمندی ہیں، ان میں غور و فکر کا مادہ ہے اور نقد و نظر کی استعداد بھی جس عنوان پر یہ قلم اٹھاتے ہیں، بے اختیار بہک ڈہکتے ہیں۔ یہ بے اختیاری اختر صاحب کی جذباتی افتاد کا مظہر ہے، یہ رقیق القلب ہیں اور بے حد جذباتی بھی، ضبط و صبر جو ہوشمند فنکار کے لئے نہایت ارفع شرطیں ہوتی ہیں، جو جذبات کی تیزی اور جوش و خروش یا تخیلات کی پرواز ناگہاں فنا ہو جاتی ہیں۔ اختر صاحب کے مقالوں میں اس کی مثالیں کم نہیں، ان کے مقالوں میں عالمانہ سنجیدگی ہوتی ہے اور فکر کی تابانی بھی، ان کے خیالات عموماً بلا تکلف بھی آتے ہیں، مگر ان اوصاف کے باوجود اختر صاحب کے اکثر مقالے اپنی عدم تربیت و تنظیم کی حسرت آگیں تحریریں ہیں، ضبط و صبر کی اساسی فنکارانہ قوتیں، فاضل مقالہ نگار کی طباعی، ذہانت اور پرواز تخیل کی نذر ہو جاتی ہیں، پرشور جولان جذبات اور شورش انگیز جوش بیان سے خیالات و افکار کی یکتائی و وحدت پر پاش کن تھپیڑے پڑ جاتے ہیں اور مقالہ کی سالمیت بری طرح ٹوٹ جاتی ہے، مقالہ کا عنوان کچھ ہوتا ہے اور اظہار خیال غرض دیگر کی جانب توجہ مبذول کرنے پر مصر رہتا ہے، لازماً مقالہ مختلف سالم ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور ہر حصہ ایک ذیلی عنوان اختیار کرکے خود مختار ہو جاتا ہے[ع]۔

مثال کے طور پر اس پس منظر میں اختر صاحب کے ایک مقالے پر تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے۔

شاد عظیم آبادی کی ناول نگاری

اس مقالہ میں شاد عظیم آبادی کے مشاہدہ[ع] نہیہ مطبوعہ ناول موسوم بہ صورت خیال پر روشنی ڈالی گئی ہے مقالہ نگا

ع یہ انتشار اختر اورینوی کے مقالوں کی عام خصوصیت نہیں (ادارہ)

کا مقصد اردو ناول نگاری میں صحت الخیال کا تلاش ہے جسے انکساری کے ساتھ ان الفاظ میں وہ خود بیان کرتے ہیں

("... میں شاد عظیم آبادی کی ناول نگاری کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں") "عرض" ۱۴ صفحات میں قلمبند ہے اور اس کچھ عرض کے لیے ۲۶۲ سطریں استعمال ہوئیں ہیں، مصنف کی اس طویل سنجیدہ اور عالمانہ تحریر کو "پیش لفظ"، یا، دیباچہ قرار دیکر ہم اس کی بضاعت میں کمی نہیں کر سکتے، یہ تحریر ایک مقالہ ہے، اس لحاظ سے بھی اس کا صنفی جائزہ لینا ہے۔

پہلے ہم اس مقالہ کی جسدی تعمیر (BODY CONSTRUCTION) پر نگاہ ڈالتے ہیں، یہ دیکھیں کہ موضوع کے مختلف پہلو کیا ہے، کتنے ہیں اور ان کی ترکیب کیسی ہے نیز خیالات کے تدریجی ارتقاع کا کیا عالم ہے۔

اس مقالہ میں موضوع سے متعلق کئی اہم امور زیرِ گفتگو آئے ہیں ان امور کی تعداد چھ ہے اور یہ قابلِ ذکر بھی ہیں، ان امور کے ذیلی یا عنوانات، خود مقالہ نگار کے تحریر کردہ ہیں، یہ امور اور ان سطروں کی تعداد جن میں مختلف خیالات سپردِ قلم ہوئے ہیں مندرجہ ذیل ہیں

(۱) شاد عظیم آبادی کی ذات دنیائے ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے

سطریں ۲۵

(۲) "اردو ادب کی دنیا میں محدود (نقطۂ نظر رکھنا) اور صوبہ داری تعصب کو راہ دینا) مہلک ہے۔" س - ۱۲

(۳) "وہ بہار میں اردو زبان آوردہ نہیں بلکہ یہاں کی پروردہ ہے" س - ۱۵

(۴) "ابھی میرا موضوعِ سخن ناول نگاری ہے"۔ س ۲۵

(۵) "کہئیے اب ہم فنِ ناول نگاری کے اصول و ضوابط قماش و ترکیب اور تراش و خراش کے متعلق مختصر گفتگو کریں" س ۱۰۶

(۶) "ادب میں شاد عظیم آبادی کی ناول نگاری کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں" س ۶۰

یہ ۱۴ صفحات پر محیط اس تحقیقی مقالہ کا ڈھانچہ ہے جس پر علم آفریں اور اثر بخش خیالات کے تانے بانے چڑھائے گئے ہیں

آپ غور کریں مذکورہ بالا عنوانات کے تحت مقالہ کے چھ غیر برابر حصے نظر آتے ہیں، یہ تقسیم صنفی لحاظ سے مقالہ کے ناقص جسد کی تعمیر کی دلیل ہے، ان حصوں کی خودسری یا منفرد وجود کا سبب نفسِ تحریر یا موضوعِ سخن سے ان کی بے تعلقی اور عدم اعتماد ہے، ان امور کے تحت بیان کردہ باتیں زائد از ضرورت ہیں، علاوہ سب سے تجاوز کرتی ہوئی یہ موضوع سے دور ہو جاتی ہیں، نہ صرف دور بلکہ ان حصوں میں پیش کردہ باتیں اصل مقصد کا بھی خاتمہ کر دیتی ہیں، لازماً مقالہ کئی منفرد اور سالم ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے اور مقالہ کی سالمیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ عسل

اچھے اور کامیاب مقالے میں خیالات کی منزلیں ہوتی ہیں۔ جنھیں ہم زینے بہ زینے طے کرتے ہیں، اس مقالے میں خیالات کی یہ خوش ترکیبی معدوم ہے، یہ کہنا حق بجانب نہیں کہ مقالہ نگار موضوع سے کم آشنا ہے، وہ موضوع سے واقف ہے اور اچھی طرح واقف ہے، موضوع کے پیشِ نگاہ جن دیگر ضروری امور کو زیرِ گفتگو لاتا ہے اس بات سے بھی وہ باخبر ہے، اظہارِ خیال میں وہ ان تفصیلات، ذیلی تفصیلات سے معرف کیتا ہے۔ نہایت مخلصانہ اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ وہ موضوعِ سخن پر قلم فرسائی کرتا ہے اس کی باتیں بڑھتی ہیں اور متعلقہ ضروری امور کو زیرِ گرفت لاتے ہوئے آگے پھیلتی ہیں ان مبسوط باتوں میں مگر ربط اور حسنِ ترتیب کا فقدان ہے پیش کردہ امور نفسِ تحریر سے متعلق ہیں مگر یہ تعلق میکانکی ہے آپ غور کریں عنواناتِ بالا کے تحت جو خیالات قلمبند ہوئے ہیں، ان کی ترتیب کی ساخت میں تبدیلی ممکن ہے مثال کے طور پر نمبر ۴ اور نمبر ۲ کو مقالے کا ابتدائی حصہ بنا دینے سے مقالے کی مجموعی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح نمبر ۲ اور نمبر ۳ کو اگر مقالہ سے خارج کر دیا جائے تو مقالہ کی علمیت میں کوئی کمی یا ادھوراپن نہیں نظر آتا، نمبر ۵ مقالہ کا بعد احصہ اور بد ترتیبی کا نمونہ بھی، مقالہ نگار کا مثبت اظہار ہے کہ ۔ ("آئیے اب ہم ناول نگاری کے اصول و ضوابط، قماش و ترکیب اور تراش و خراش کے متعلق مختصراً گفتگو کریں")

عسل مضامین کے تجزیہ کا یہ انداز میکانکی اور دور از کار ہے۔ (ادارہ)

"یہ گفتگو بے کار اور بے مطلب کی گئی ہے، موضوع "شاد کی ناول نگاری" ہے نہ کہ فنِ ناول اور شاد عظیم آبادی۔ اس گفتگو کو بھی "مختصر"[1] نہیں کہا جا سکتا جب کہ یہ ایک سو کچھ سطروں تک پھیلی جاتی ہے۔ یہ گفتگو پھر بے جوڑ اور لاحاصل بھی ہے نفسِ مطلب سے اس بیان کا کوئی تعلق نہیں، اظہار کے باوجود اس میں صنفِ ناول کے "اصول و ضوابط" یا "قماش و ترکیب" یا "تراش و خراش" پر مطلق روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اس طویل اور بے جوڑ گفتگو میں ناول کی فنی خصوصیات پر اظہارِ خیال نہیں کیا گیا ہے، اس کے برعکس اس موقعہ پر قصہ یا کہانی کی مختلف صنفی شکلوں پر عالمانہ و فاضلانہ اظہار ہوتا ہے مقالہ کے اس ذیلی حصہ کے بھی مزید ذیلی عنوانات نمودار ہو جاتے ہیں۔

(الف)	قصہ نگاری کی قسمیں	تعداد سطر ۱۵
(ب)	داستان	" ۲۷
(ج)	تمثیل نگاری	" ۱۹
(د)	افسانہ	" ۷
(ر)	ناول	" ۳۸

قصہ کے مذکورہ بالا صنفی صورتوں کے بیان اور تقابلی بیان کو ممکن تھا کہ ناول کی فنی خصوصیات واضح ہو جاتیں، پر یہ لاحاصل بیان اس مقصد کی تکمیل کرنے سے بھی مجبور ہے۔

نمبر ۶ مقالہ کی سرخی ہے، یہ تحریر کا موضوع ہے، اس عنوان کے تحت جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ محض ڈھائی صفحات پر مشتمل ہیں، یہ ڈھائی صفحات بھی موضوع کی وضاحت و صراحت سے معذور رہیں۔

اختر صاحب کے مقالوں میں خیالات و افکار کے اس عدم اتحاد کی مثالیں اکثر نظر آتی ہیں۔ درمیان سے یا ادھر ادھر سے پوری کی پوری عبارت اگر مقالہ سے نکالی جائے تو نفسِ تحریر میں کسی قسم کا نقص نہیں آتا، یہ بے محل اور سالم عبارتیں اپنے معانی و مطالب کے بموجب موضوعِ سخن کی قطعاً حاجت مند نہیں ہوتیں ذیلی عنوانات کے تحت یہ آپ مکمل ہوتی ہیں —— ذیل میں ایسے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ان عبارتوں کی سرخیاں فرضی ہیں مقالہ کا اصل عنوان زیریں حصہ میں تحریر کر دیا گیا ہے کہ تا کہ اندازہ ہو سکے کہ موضوعِ سخن کیا تھا اور مقالہ نگار اظہار میں نفسِ موضوع سے کس قدر دور ہو جاتا ہے۔

۳- بہار میں اردو

"میں اردو ادب کی دنیا میں محدود نقطۂ نظر رکھنے اور صوبہ داری تعصب کو راہ دینے کا قائل نہیں، بلکہ اس انداز نظر کو مہلک سمجھتا ہوں ہمارے لئے جیسے ابن نشاطی ولی دکنی، غالب، انیس، چکبست لکھنوی، حالی پانی پتی، اور اقبال ویسے ہی بیدل، راسخ، جوشش شاد اور عظمت عظیم آبادی ہیں، لیکن مجھے تاریخ ادب اردو کی تکمیل سے دلچسپی ہے، اب تک تاریخ ادب لکھنے والوں نے بہار کا خانہ گویا خالی چھوڑ دیا ہے، اس سے صداقت پر پردہ پڑتا ہے اور اردو ادب کے ارتقا کا صحیح تصور قائم نہیں ہوتا لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ جو گوشے اور ذخیرے نظر انداز کر دیے گئے ہیں ان پر تحقیق کی روشنی ڈالیں، عصبیت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اردو کی ہندوستان گیری کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لئے"[2]

بہار میں اردو زبان آوردہ نہیں بلکہ پروردہ ہے آغاز زبان کے مختلف مدارج یہاں طے ہوئے ارتقا کے مراحل بھی گزرے اور ادب کی تخلیق کے ادوار بھی ادا ہوئے، اردو زبان و ادب کی تخلیق، پرورش و پرداخت

---

[1] کسی ناول نگار یا اس کے ناول پر تبصرہ فنِ ناول نگاری کی روشنی ہی میں صحیح ہوگا نہ کہ محض ناول کے صفحے کے صفحے بلا اقتباس درج کر دینے سے۔ (ادارہ)
[2] درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ (ادارہ)

ہندو پاک برصغیر کے اور خطوں میں بھی رونما ہوئی ہے۔
لیکن اکثر علاقوں میں تفتیش و تحقیق کا کام تشنۂ تکمیل طور پر ہوا ہے، افسوس کہ ارضِ بہار میں باضابطہ ادب پاروں کی تلاش و جستجو نہیں کی گئی، اور نہ معلوم شدہ فن پاروں کی اشاعت کا کام ہی انجام پایا ہے اب اس طرف توجہ کی جانے لگی ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اردو ادب کی بہت بڑی خدمت ہو جائے گی، اردو کی جڑیں بہار میں بہت گہری ہیں۔ یہ سرزمین خوب خوب بارآور بھی ہوا ہے اور ہر دور میں وقت پر پھل بھی دیتا رہا ہے، متقدمین کے عہد میں بھی یہ چمن گل بار و گلفشاں ہوا، متوسلین نے بھی خوب گل طرازیاں کیں، متاخرین کی لالہ کاریاں بھی حسرت نگاہ نہیں اور عصرِ جدید میں بھی یہاں تختہ ہائے لالہ و گل کی کمی نہیں رہی " ص ۱۲۷

شاد عظیم آبادی کی زبان نگاری

اختر صاحب کی گرم گفتاری سے مقالہ کی سالمیت پر کاری ضرب لگتی ہے، قادر الکلامی اور رطب اللسانی اختر صاحب کی قوت خداداد ہے، اختر صاحب خلیق، مشفق اور لائق مدرس بھی ہیں، وہ خادم ادب ہیں اور معلم ادب بھی۔ درس و تدریس اختر صاحب کا محض پیشہ ہی نہیں بلکہ ان کی طبیعت کا تقاضہ بھی ہے کسی موضوع پر بلا جھجک، موثر اور دلکش انداز سے وہ نہایت اعتماد کے ساتھ باتیں کر سکتے ہیں، ان کی گفتگو میں دلگیری ہوتی ہے، اور سحرِ حسنِ بیان کا وہ جادو جو عدم حسنِ معانی کا پتا نہیں لگنے دیتا اختر صاحب کے درس و تقریر کا کرشمہ ہے، ابلاغ لسانی ہو یا تحریری اختر صاحب کے یہاں یہ سیل تند رو کے جلال و شکوہ کا مظہر ہوتا ہے۔ جو نغمہ خواں بننے کی تقدیر نہیں پاتا، اختر کی رطب اللسانی کی تاب و تب ان کے مقالوں میں جو بہت جھلکتی ہے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور مدعا محض خطابت، پر شکوہ

اور پرکشش خطابت ہو جاتا ہے، رنگ لب و لہجہ، ولولہ خیزی طمطراق صیغہ واحد متکلم میں تخاطب اور بڑی بوند جیسے پر آہنگ باران الفاظ سے مقالہ کے بیشتر معانی و مطالب کبھی تحریر کی طرح دھل جاتے ہیں۔ ؎

آپ دیکھیں گے کہ مقالہ نگار کا ایک طویل اقتباس پیش نظر ہے اسے پڑھئے اور بار بار پڑھئے کہ لکھنے کا اصل مقصد کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مقالہ نگار کی رطب اللسانی موضوع یا نفسِ تحریر کو طوطی کی آواز بنا رہی ہے، خیالات مندرج کو مہمل یا لامعنی نہیں کہا جا سکتا مگر یہ محض چھلاوے کے اندر چھلکے والی بات ہے۔

" گذشتہ پچیس سال کے اندر دنیا کی شکل بالکل تبدیل ہو گئی ہے، جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء نے سرمایہ دارانہ نظام شہنشاہیت اور وطنیت کے داخلی اور خارجی تضاد و تصادم کو بالکل عریاں کر دیا تو موجودہ نظام کے نقائص بری طرح ظاہر ہو گئے ارباب سیاست نے معاہدہ وارسائی کے ذریعہ مٹتے ہوئے نظام کے نقوش پھر ابھارنے چاہے، اور جناب ولسن نے استقرار و تحفظ قومی کا اصول پیش کر کے نہایت اعلومی سے یہ سمجھ لیا کہ اب دنیا امن کی نیند سو گئی اور امریکہ زر و جواہر سے مالامال ہو جائے گا، مگر اس معاہدہ کے اندر ہی بارود بھرا ہوا تھا جو ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو بھک سے اڑ گیا، جنگ عظیم کے ختم ہونے سے پہلے ہی انقلاب روس برپا ہوا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی دھوم سارے عالم میں مچ گئی، اندلس (SPANIA) اور میکسیکو میں بھی پرولیتاری انقلاب برپا ہوا اور تقریباً ہر ملک میں کسانوں اور مزدوروں کی تحریکیں پیدا ہو گئیں دنیا کے سامنے ایک نیا نظام حیات پیش ہوا، اور روس میں اس کا وسیع پیمانہ پر کامیاب تجربہ بھی ہوا، روس کی پنجسالہ اور دس سالہ تجاویز کی کامیابی نے سرمایہ دار ملکوں

ؔ : یہ بات اختر اورینوی کے مقالوں کے سنجیدہ مطالعہ سے نہیں معلوم ہوتی۔ (ادارہ)

کی آنکھیں کھول دیں، یورپ میں بڑھتی ہوئی پرولیتاری تحریک کی راہ فاشیسٹ اور نازیت نے روکی یہ دونوں تحریکیں دم توڑتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کے اژدھا کے پیٹ سے پیدا شدہ نئے مردخود رکھشش ہیں انھوں نے اندلس کو نگل لیا حبشہ کو ہضم کر لیا، جیکوسلاوکیہ کو چبا ڈالا، البانیہ کو لقمۂ تر بنایا اور پھر بھی یہ سیر نہ ہوئے، یہ سرمایہ داری اور شہنشاہیت کی سب سے بھیانک شکل تھی، جاپان بھی اسی قسم کا ایک عفریت ہے، انھوں نے منچوریا کو پھاڑ کھانے کے بعد اب سالمے چین پر حملہ کر دیا، غرض ساری دنیا اس وقت محشرستان بنی ہوئی ہے، فلسطین، مصر، عراق، ایران، افغانستان ہندوستان ہر جگہ کم و بیش کشمکش جاری ہے اور اب اس نئی جنگ چھڑ جانے کے سبب حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ دنیا میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی مسئلے پیش ہیں اور مختلف نصب العین ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار یا برسر پیکار ہیں۔ اب دنیا کا کوئی مسئلہ مقامی نہیں رہا بلکہ ساری دنیا یہ محسوس کر رہی ہے کہ نظام معاشرہ میں بنیادی نقص اور انسانیت کی تحفظ و بقا کے لئے نئے نظام کی اشد ضرورت ہے کہا جاتا ہے کہ موجودہ جنگ بھی نئے دور کے طلوع کے لئے لڑی جا رہی ہے، بہر حال تبدیلی کی تمنا عام ہے اور ہر گھنٹہ انسانی واردات کے دھارے کو بدل رہا ہے تاریخ اتنی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے کہ ایک سال دس سال کے برابر معلوم ہوتا ہے اور دس سال ایک صدی کے برابر ایک ادیب ایسے دور میں زندگی بسر کرتے ہوئے بھی بھلا کس طرح حالات سے بلا متاثر ہوئے رہ سکتا ہے۔ "قعر دریا" میں رہنے والے کو "دامن تر مکن ہوشیار باش" کی صدا دینی کچھ عجیب سی بات ہے، موجودہ عہد میں اگر ادیب کسی فلسفی کی پیروی نہ بھی کرے، اگر وہ سائنس کی روشنی میں حالات پر نظر نہ بھی ڈالے اگر وہ منطق سے نفرت بھی رکھتا ہو اور وہ صرف قریبی مشاہدہ اور احساس اور جذبہ پر بھروسہ کر لے، تو بھی اگر وہ واقعی ادیب ہے تو تجربات سے ضرور بحث کرے گا۔ اور ہمارے زمانے میں صرف تجربات کو پیش کرنا عالمگیر تصادم کے پہلوؤں کو نمایاں کرنا اور عظیم الشان سماجی تبدیلی کو ظاہر کرنا ہے کوئی قابل ذکر شخص اس وقت فن برائے فن کی بانگ بے ہنگام نہیں لگا سکتا ہے، یہ مقولہ اب مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا ہے، ادب سوائے دورِ انحطاط کے کبھی بھی بغیر مقصد کے نہیں رہتا ہے، اور وہ ادب پر عالم دورِ انحطاط گذر چکا اور اب عمل کا دور آیا ہے عمل بغیر کسی صالح نصب العین جنون یا انداز ہٹلری ہے ادیبوں کو عہد حاضر میں انسانی نصب العین کی تلاش کرنی چاہئے۔

دورِ حاضر کا ادیب شیش محل میں بیٹھ کر خواب کی دنیا آباد نہیں کر سکتا، اس شیش محل کو معاشی سختیوں، بے روزگاری، بیکاری نازیت و فاشیت کے مظالم نے توڑ کر رکھ دیا ہے اب فرار و گریز اور غیر جانبداری دن بدن ناممکن ہوتی جا رہی ہے، ادیب بھی زندگی کی ایک معاشی اکائی ہے وہ بھی کہ دبازاری سے متاثر ہوتا ہے، اس پر بھی جنگ کے شعلے گرتے ہیں اور وہ بھی بھوک، تحدید و پابندی اور ارمانوں کی ناکامیابی کے نشتر اپنے سینے میں چبھتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ بلکہ وہ حساس ہونے کے سبب ان "ستم ہائے روزگار" کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے، نازیت کتابیں جلاتی اور ادیبوں کو قید و بند میں مبتلا

کرتی اور گوئی کا نشانہ بناتی ہے نازیت کی جھلک
تھوڑی بہت کہاں نہیں پائی جاتی، ایسے سمے میں
فرار و گریز غیر جانبداری اور خاموشی ناممکن یا خود
کشی کے مترادف ہے۔" ص ۵

۸ ۔ اختر صاحب کو نقادوں کی تمہید کا اچھی طرح
خیال رہتا ہے وہ اسے محنت و شوق سے تیار کرتے
ہیں ۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے اور اکثر
ہوتا ہے کہ اس ترتیب میں وہ نفسِ تحریر سے دور
ہو جاتے رہے ہیں، طبیعت کی بے اختیاری اور قلم
کی جولانی انھیں راہ سے بے راہ کر دیتی ہے ؟ اپنی
اس طول بیانی کا پھر وہ فوراً اعتراف کرنے لگتے ہیں
اور معذرت خواہ ہو کر اصل بات پر متوجہ ہو جاتے
ہیں۔ ص

چند مثالیں ملاحظہ ہوں : ۔

اس تمہید کے بعد میں مرزا ادیب بی اے آنرز کی
کتاب "صحرا کے خطوط" کا آپ سے تعارف کراتا ہوں، صحرا
نورد کے افسانے شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکے ہیں آپ
نے بھی ان میں سے چند کو ضرور پڑھا ہوگا، آئیے اب میں
آپ کے سامنے ان افسانوں کی خصوصیات اور ان کی
فنی حیثیت کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں
تح ۷۹

جوش کی صناعی سے بحث کرنے کے لئے مذکورہ بالا
تمہید کی ضرورت تھی، میں اس مضمون میں جوش کی نظم
نگاری پر تبصرہ کروں گا اور غزل کے سانچے کے بارے
میں فی الحال سوائے سرسری اشاروں کے کچھ نہ کہوں گا
تح ۱۶۵

میں اس مختصر مضمون میں اجتبیٰ کی شاعری پر تفصیلی بحث
طور پر تنقید نہیں کر سکتا، میں یہ کوشش کروں گا کہ ان
کے فن کے چند جلووں کے متعلق اپنے تاثرات کا تجزیہ
پیش کر دوں اور بس ۔

ص ۳۲۵

میں اس مضمون میں اجتبیٰ صاحب کی شاعری کا محض
ایک جائزہ پیش کر رہا ہوں ۔ ص ۲۶۹

اب میں شاد کی صناعی سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا
ہوں ۔ ص ۔ ۹۲

آئیے اب ہم فن ناول نگاری کے اصول و ضوابط
قماش و ترکیب، تراش و خراش کے متعلق مختصراً
گفتگو کریں ۔ ص ۱۳۰

آئیے اب ہم شہباز کے نظریۂ زندگی اور فلسفہ
عمل کا جائزہ لیں ۔ ص ۱۰

---

۹ ۔ اختر صاحب ان باکمال مصنفین
میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں، جن کی نگارشات
نام دیکھے بغیر پہچانی جا سکتی ہیں ۔ یہ تحریر کہانی
ہو یا مقالہ، اس میں اختر صاحب کی ادبی تشخصیت
کی تابانی ، شگفتگی اور دلآویزی صاف جھلکتی
رہتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اختر صاحب کی شہ زور
انشا پردازی انہیں صف اول کے دوسرے تمام کہانی
نویسوں اور مقالہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت

ص ۔ اس اقتباس کو بغور پڑھ کر تو معانی کے مغز کا ایک
انبار لگ جاتا ہے۔ (ادارہ)

ع۵ مقالہ نگاری میں تمہید کی بھی ایک مستقل جگہ ہے اس کے لئے نہ معذرت کی ضرورت
ہے اور نہ اس پر مذمت کی ۔ (ادارہ)

کا مستحق بنا دیتی ہے، صنفِ مقالہ میں، مقالہ نگار کی دو شخصیت ہوتی ہے اول تو وہ ایک ہوشمند اور بیدار دماغ عالم ہوتا ہے اور دوسرے ایک باشعور انشاپرداز وہ صرف مفید و اعلیٰ اور ادق و ارفع بات ہی نہیں کہتا بلکہ اسے عام فہم بنا کر قابلِ قبول بھی بنا دیتا ہے یہی اس کی قلم کاری ہے، یہ مقالوں کی صاف و رواں زبان و موضوع کی ذہن نشین توضیح کا نتیجہ ہے کہ ہم انجانے عالمانہ و فاضلانہ امور و نکات کو بغیر درد سر اور بڑی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ مقالہ کے معلوماتی یا فکری عنصر کو اپنی کم بے بضاعت علمی شخصیت کا ایک جزو بھی بنا لیتے ہیں اسی طرح اساسی لحاظ سے مقالہ نگار کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج، اگر وہ کسی بات کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے اور دوسرے کو بھی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔

مقالہ سنجیدہ اور خیال آفریں تحریر ہے اس صنفِ ادب میں انشائی دل کشی اور شاعرانہ حسن و جمال کی تلاش موتیوں کو تاروں کی تنک تابانی دیکھنے کی سعی بے سود ہے، لیکن اس غیر شاعرانہ اور غیر فنون کاری مزاج کے باوجود مقالہ میں ادبی رنگ و آہنگ کا وجود لازمی ہے، مقالہ نگار کے لئے اندازِ بیان میں فصاحت و بلاغت سے واسطہ رکھنا شرط ہے یہ ایسی فصاحت ہوتی ہے جو نفسِ تحریر کے ہر پہلو کو مانندِ رخ تاباں دکھاتی ہے۔ اور ایسی بلاغت جو خیال و الفاظ کو موصل رکھتی ہے، اس مقصد کی خاطر مقالہ نگاری میں تھوڑی انشاپردازی کی ضرورت پڑتی ہے، مگر اعتدال کے ساتھ ورنہ انشائیہ نگار کی طرح شستہ بے مہار بن جاتی ہے اظہار خیال میں اسے ادبی پیرایہ اختیار کرنا لازمی ہوتا ہے پر تمثیل نگار (ALLEGORIST) کی طرح بحرِ رمز و کنایہ میں دل و دماغ کی غرقابی قطعاً نا روا ہے، تشبیہہ و استعارہ کی خوش رنگی کی اسے اجازت ہوتی ہے پر خیالات کو عروسِ نو کی طرح سج دھج کی اجازت نہیں مقالہ میں جو باتیں نظم بند ہوتی ہیں یہ صاف و روشن

اور واضح الفاظ میں پیش کی جاتی ہیں، قارئین کی نگاہوں کے سامنے نفسِ تحریر رواں رہتا ہے اور ذہن پر خیالات کا سایہ پڑتا جاتا ہے اختر صاحب ایک ماہر انشاپرداز ہیں وہ عموماً کامیابی کے ساتھ اس فرض سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ خیال کو مناسب اور بجا ذبِ نظر تحریری پیکر سے ساتھ عطا کر دینا ان کی غیر معمولی انشاء کی دلیل ہے ان کی نگارشات اپنی جامہ زیبی کا دل کش نمونہ ہوتی ہیں، مقالے میں اپنے جامہ زیبی کے نمونے بکثرت ملتے ہیں زیرِ نگاہ مقالہ کے دوسرے حصہ میں ۱، ۵ اقتباسات نیز تیسرے حصے میں ۱، ۳، ۴ کے اقتباسات دیکھئے۔

اختر صاحب کی تحریر کیف آگیں ہوتی ہے اور فکر خیز بھی یہ الفاظ میں روح پھونک دینے کا سحر جانتے ہیں، ان میں معنی کی لہریں سمٹ آتی ہیں اور ان فقروں کو بار بار دہرانے کا جی چاہتا ہے۔ کبھی کبھی تو اختر صاحب کے منفرد شان پرواز حرارت الفاظ و فقرے اقوالِ زریں کا حسنِ دوام پا لینے کی بلندی حاصل کر لیتے ہیں مقالوں میں اس نکتہ آفریں و معنی خیز شگفتگی کے نمونے بھی بے شمار ہیں۔ چند اقوالِ اختر پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہو۔

۱۔ "فاصلۂ نظر کا بہت ہی کم ہونا بھی اس کے دور ہو جانے کی طرح فریب دہ ہے، انتہائی قربت اشیا کی جسامت کو بڑھا دیتی ہے اور ایک حد تک دیانت کو مجہول بھی کرتی ہے۔" تنج ۔ ۷۶

۲۔ "نیم صداقتوں پر اگر اتنی روشنی ڈالی جائے کہ وہ دوسرے پارہ ہائے حقیقت کو چھپا لیں تو وہ جھوٹ سے زیادہ مہلک بن جاتی ہیں۔" تنج ۔ ۱۹

۳۔ "حسن، صداقت اور عشق، کائنات اور حیات کی بیکرانی کا احساس لئے ہوئے صناعت کی دنیا میں گلے ملتے ہیں۔" تنج ۔ ۳۱۸

۴۔ "عمل بغیر صالح نصب العین کے جنون یا انداز سفلی ہے" تنج ۔ ۱۸

ھ۔ یہ شاید اختر اورینوی کی مقالہ نگاری کا دوسرا رخ ہے ممکن ہے اسطرح کی باتیں برابر ہو جاتی ہوں مگر اس سے تضاد بیانی کا بھی پتہ چلتا ہے یعنی یہ کہ وہ جو لکھ کے دوبارہ بھی لکھ سکتے ہیں (ادارہ)

۵ ۔ " تنقید مجاہدہ بھی ہے اور محاسبۂ نفس بھی"

ص ۲۹۰

۶ ۔ " اس دورِ سعادت (یعنی ہندوستان کے ابتدائی عہدِ مسلم حکمراں) میں اسلام کی ذہنی و روحانی فتوحات سیاسی فتوحات سے آگے چلتی تھیں

(تج) ۳۲

۱ ۔ ہماری اس روزمرہ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ مصرف میں آتی ہے، وہ الفاظ ہیں، اس لئے کثرتِ استعمال سے الفاظ میں سکوں کی طرح (WEAR AND TEAR) بھی لازمی ہوتا ہے، رفتہ رفتہ یہ الفاظ لازمی طور پر کم رو اور کچھ بے اثر سے ہونے لگتے ہیں، عام انسان الفاظ کے گھساؤ کو نہیں دیکھ پاتا مگر ایک اچھا انشاپرداز ان کی کم مائیگی کو محسوس کرتا ہے، اپنی قوتِ انشاء، فنکارانہ صلاحیت اور ادبی مزاج سے یہ الفاظ کو کم قدر ہونے سے بچا لیتا ہے، صرف بچاتا ہی نہیں، وہ ان میں نیا اثر بھی پیدا کر دیتا ہے، اختر صاحب کے مقالوں میں انشاء کی اختراعی ہنرمندی موجود ہے، ان کی انشاپردازی کے سحر سے چلتے پھرتے، گھسے پٹے الفاظ کو حیاتِ نو نصیب ہوتی ہے، نئی ترکیبوں کا روپ دھار کر اختر صاحب کے الفاظ جانداری اور دل میں گھر کر لینے کی قوت حاصل کر لیتے ہیں، چند مثالیں دیکھئے :۔

طفلانِ خودسر پیشہ (ص ۔ ۱۹) آذر پروردہ خیال آرائی تشکیک دہ فریب ۔ انوار افشانی آفتاب ہائے تازہ (ص ۸۰) ۔ قلزمِ زخار (ص ۵۰) ـــ از بجز ۔ وجدانی اکبری کارفرمائی ۔ (۱۲۵) زلفِ شب رنگ ۔ بالیدہ حسن کاری ۔ اختراعی ہنرمندی سے بھی ملکۂ شاعری اکز یتہ آدم (ص ۱۲۹) ۔ صنادید شاعری (ص ۱۹۱) ۔ ادبی صالحیت (ص ۔ ۱۹۱) اسلامی ملی المیۃ (ص ۔ ۶۷) ۔ منزۂ توانائی (ص ۔ ۱۷۱ ۔)

از (قلم)

۔ اختر صاحب کی انشاپردازی ان کے مقالوں میں عیب بھی بن جاتی ہے ۔ جب یہ کاجل کی خوبصورتی نہیں کالکھ کی بدصورتی ہو جاتی ہے ۔

مقالوں میں یہ نقص دو جگہ ابھرتا ہے ۔ اولاً، جب مواد مناسب اور مفید مواد، کی کمی ہوتی ہے، خیالات و افکار کے تانے بانے مطالعہ کی مدد سے نہیں بنے جاتے بلکہ یہ محض سرسری اور خام مشاہدہ سے مرتب کئے جاتے ہیں، بات بھی بنتی یا بڑھتی نہیں، یہ زاویہ بنا بنا کر محض گھومتی اور حلقے بناتی رہتی ہے، اس مقام پر اختر صاحب کی عالمانہ و فاضلانہ شخصیت محض انشاپرداز ہو کر رہ جاتی ہے، وہ خوش بیانی، گرم گفتاری، کبھی شخصی رنگ آمیزی سے کام چلانا چاہتے ہیں، پر مقالہ نگاری، فن کاری سے بہت نیچے گر کر نری عبارت آرائی ہو جاتی ہے۔

دوئم، جب اختر صاحب جذباتی ہوتے ہیں ۔ مراسم و تعلقات یا کوئی جذباتی رابطہ جب ان کی غیر جانبداری کا دامن پکڑ لیتا ہے، پاس احترام یا عقیدت ان کی گداز اور دردمند طبیعت پر غالب ہو جاتی ہے، اختر صاحب اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ لائق و فاضل مقالہ نگار کی غرض "کچھ" کہنا ہوتا ہے "سب کچھ" سنانا نہیں ہوتا، بے اختیاری اور جذبات کے نشے میں کبھی وہ بے تعلق اور غیر اہم امور کے اندراج پر متوجہ ہونے لگتے ہیں ـــ ان دونوں مواقع پر ان کی انشاپردازی کے محاسن عیوب بن جاتے ہیں، انشاء کنفس تحریر پر بھاری ہو جاتی ہے، عبارت آرائی سے اصل مفہوم نیم جان اور بے جان ہو جاتا ہے ۔ خیالات و افکار میں انتشار رونما ہونے لگتا ہے، مقالہ اپنے اسلوب کے بموجب پھر محض پر تصنع اور پرتکلف تحریر ہو جاتا ہے، یہ فن کاری نہیں ہو پاتا عہ

" شاعری الفاظ کی صناعی ہے شاعری کا ذریعۂ اظہار لفظ ہیں ۔ اسی "میڈیم" کو ہنر مثلاً فوزیہ برت کر ہی شاعر اپنے جذباتِ شعری کو پیکرِ وجود اور حیات عطا کرتا ہے، فن کا تجزیہ ایک توانائی ہے،

عہ یہ شاید پہلے رخ کی تکرار ہے ۔ پورے مقالے میں اس طرح اگر اور مگر کا ایک سلسلۂ دراز ہے کوئی ایک بات صاف نہیں ہوتی صاحب مضمون کا اصل مدعا واضح نہیں ہو پاتا ۔ (ادارہ)

غیر مرئی و نامشہود، ہئیت فن، ہئیت فن اس داخلی توانائی کو مرئی، مشہود و محسوس بناتی ہے، اظہار
فن کی کامیابی " میڈیم " کے ہنر مندانہ استعمال پر منحصر ہے، تجربۂ فن اور پیکرِ فن میں مکمل ہم آہنگی ہونا چاہیے
شاعری کی ادب کی سند لتا یہ ہے کہ وہ اندرونی سندرتا کا درپن ہو " (ص ۹۲)

یہ الفاظ اپنے مفہوم و مطالب کے عکاس ہیں عبارتِ مندرجہ بالا کہنے والا کا مدعا صاف اور واضح کر دیتے ہے مقالہ نگار کی مگر اپنی تشفی
نہیں ہوتی، ان الفاظ پر وہ اکتفا نہیں کرتا، انشا پردازی کا غلبہ ہے، اسی بات کو مزید وہ چار جملوں میں بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ ان چار
جملوں میں محض گرم گفتاری ہو آخری جملہ طویل ترین ہو، جیسے وقتِ نزع اکھڑتی ہوئی آخری سانس!۔

" بغیر جامِ الفاظ کے، بغیر مینائے ترکیب کے، صہبائے شاعری نشہ باز نہیں ہو سکتی، بغیر روح کے جسم مردہ
ہے، لیکن بغیر جسم کے روح پرواز کر جاتی ہے۔ روح فن کو اسیر آب و گل کئے بغیر نہیں رہ سکتی، مختصر یہ کہ
انتخاب الفاظ، ترکیب الفاظ، فقروں کی بندش، جملوں کی تراش، ان کا رکھ رکھاؤ۔ سلاست و فصاحت، ترنم و
آہنگ، لب و لہجہ، اوزان و بحور، قوافی و ردیف مصرعوں اور شعروں کی گرفت، بندوں کی تشکیل ان سب اجزا
کی کلی اور آخری قلم کاری کی کاریگری پر پوری توجہ رکھنی اظہار بلیغ کے لازمی اور فن کے حسن تکمیل کے لئے ضروری
ہے"

اندازہ کیجئے، اصل خیال صرف اتنا ہے۔ " اظہار فن کی کامیابی میڈیم کے ہنر مندانہ استعمال پر منحصر ہے " اور یہ خیال نہایت جامع
طور پر عبارت اول الذکر میں ادا ہو چکا ہے، دوسری عبارت محض بات کی گرفت ہے

بقیہ:۔ اختر کی شاعری

عصیاں کا تصور تکمیل حیات کے طور پر ابھرتا ہے۔ لغزشوں میں
ثبات زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اقدار حیات پارسائی کی بے
کیفیوں میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے شاعر زندگی کو گنہگار
بنا لینا چاہتا ہے۔ عصیاں کے روایتی تصور اور اس تصور میں
فرق یہ ہے کہ روایتی تصور میں عصیاں کا ارتکاب رحمت باری
تعالیٰ کا محرک بن جاتا ہے۔ لیکن زندگی خود اپنے اثبات کے لئے
معصیت پسند ہونا چاہتی ہے۔ یہ اسی دنیا کی چیز ہے اور اسی دنیا
کے ماحول میں اپنی اقدار کا اظہار کرتی ہے[ع۵] ؎

بنی پارسائی میں اظہار ہستی ۔ گنہگار کو سے گنہگار کر دے

شاعری میں اختر صاحب کی افتاد طبع کا اظہار ابھی مدھم
سروں میں ہے۔ ڈیڑھ دم کی ملا ان کے نغمے کو بلند بانگ نہیں ہونے
دیتی اور نہ ابھی اس میں وہ جامعیت پیدا ہو سکی ہے۔ جس کی
آواز پر اردو دنیا آواز دے سکے۔ یہ شاید اس لئے کہ شاعری

اختر صاحب کیلئے "یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا" کے مصداق نہیں
ہے۔ ان کی شہرت کا انحصار ان کی نثری تخلیقات پر ہے پھر
بھی ان کی شاعری میں مستقبل کے مثبت امکانات موجود ہیں۔
ان کی آواز عام آواز نہیں۔ اس میں انفرادیت ہے، کشش ہے
زندہ احساس ہے۔ فکر و فن کے اعتبار سے ان کی تخلیقات
کا دماغی تجزیہ ہماری امیدوں میں اعتماد و یقین بھر دیتا ہے۔

ع۵ . معصیت کی گہرائی کے یہ دونوں تصور جو مضمون نگار نے پیش کئے ہیں حقیقت کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ اور دونوں تمام فکر انسانی کی ایک ایسی کجی پر مبنی ہیں
جو کہ تاریخ تہذیب کیلئے ہمیشہ مہلک ہوتے ہیں — ادارہ

پروفیسر مظفر اقبال

اختر اور بیتوی کی ڈرامہ نگاری

ڈرامہ اُردو ادب کا کوڑھ ہے' افسانۂ عشق اور اندر سبھا سے لے کر بلوا منگل اور انارکلی تک کوئی بھی ایسا ڈرامہ نظر نہیں آتا جسے دنیا کے بڑے ڈرامے کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے ۔ واجد علی شاہ اختر[1]، سید آغا حسن امانت، ماسٹر احمد حسن دافر[2]، پنڈت ونائک پرشاد طالب بنارسی، منشی مہدی حسین احسن لکھنوی، آرزو لکھنوی، آغا حشر کشمیری اور امتیاز علی تاج کے نام اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں بہت ہی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی ہندوستان کے کالی داس، بھبھوتی، اسوگھوش، ہرش وردھن، یونان کے ارسطوفینس، ایسکلس اور سفوکلیز اور جرمنی اور انگلستان وغیرہ کے دانتے، گوئٹے، شیکسپیر، مارلو، البن، گالز وردی اور برنارڈ شو وغیرہ کا ہمسر و ہم مرتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ اُردو ادب کی سب سے کمزور اور کم عیار صنف ڈرامہ ہے اور اس کی کمزوری کا سبب تاریخی ہے' اُردو ڈرامہ کی بنیاد اودھ کے زوال پذیر ماحول میں پڑی اور پرورش و پرداخت پارسی تاجروں کے ہاتھوں ہوئی' اودھ کے عیش کوش اور عشرت پسند جاگیرداروں نے اسے محض عیش کوشی اور نشاط انگیزی کا ایک وسیلہ قرار دیا اور بنگال، بمبئی اور دہلی کے پارسی تاجروں نے اسے کسب زر کا ایک بہترین آلہ سمجھا' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو ڈرامہ جب تک پارسی تاجروں کی تھیٹریکل کمپنیوں سے وابستہ رہا اس وقت تک ابتذال اور پستی کے عالم میں پڑا رہا' ہمارے ڈرامہ نگار، چونکہ کمپنی کے ملازم ہوتے تھے اس لئے ڈرامہ لکھتے وقت کمپنی کے مالک کی ہدایت پر عمل کرتے ۔ نتیجہ کے طور پر تیسرے درجہ کے سامعین کے ذوق کا لحاظ رکھتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بجز آغا حشر کے کوئی دوسرا ایسا ڈرامہ نگار نظر نہیں آتا جس کی تخلیقات کو قابل اعتناء قرار دیا جا سکے حقیقت یہ ہے کہ آغا حشر کے اندر ایک بڑے ڈرامہ نگار کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں' یہودی کی لڑکی، بلوا منگل، رستم و سہراب اور سلور کنگ وغیرہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر حشر پارسی تاجروں کے ملازم نہ ہوتے اور ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر قلم اُٹھاتے تو یقیناً اُردو ڈرامہ کی تاریخ میں ایک انقلاب آجاتا اور آج اُردو میں اعلیٰ درجہ کے ڈراموں کی یہ کھٹکتی ہوئی کمی نظر نہیں آتی۔

بہرکیف! اس صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آغا حشر کی جدت و اختراع نے نئے لکھنے والوں کے ذہن کو جو نکا ضرور

---

[1] واجد علی شاہ اختر کی وہ مثنوی جسے کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد رہس کے طور پر انہوں نے اپنے شاہی اسٹیج پر پیش کیا، دورِ جدید کے محققین نے اسی رہس کو اُردو کا اولین ڈرامہ قرار دیا ہے۔

[2] اُردو کے اولین نثری ڈرامہ "بلبل بیمار" کے مصنف

پلاٹ کی تعمیر و ترتیب کے اعتبار سے۔ المیہ کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:۔

"کسی[1] کا انجام خالص حزن و ملال اور المناک ہوتا ہے کوئی درمیان میں رنج و حسرت سے ہمکنار ہو انجام بخیر ہو جاتا ہے کسی حزینہ ڈراما کا پلاٹ آغاز سے خوشی و مسرت پر مبنی ہوتا ہے رفتہ رفتہ اس نیک کردار نیک اور خوشی انجام ثابت ہوتے ہیں اور برے کردار کا خاتمہ بربادی اور آفات و مصائب پر ہو جاتا ہے۔"

مختصر یہ کہ :۔ "ایک[2] ٹریجڈی یا حزینہ وہ ہے جس میں حزن و ملال اور غم و الم کے سوا انجام تک طرب و نشاط کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا اور (ایک) حزینہ وہ ہے جس میں حزن و غم کا اصل جزو ضرور ہوتا ہے مگر سامعین کی خاطر یا تدبیر گری کے لحاظ سے شادمانی و طرب کا خفیف شائبہ شریک کر کے رنج و غم کے بار گراں کو کسی حد تک کم کر دیا جاتا ہے مگر انجام غمناک ہوتا ہے۔"

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں اختر صاحب کے ڈرامہ شہنشاہ جشن کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کا انجام نہایت المناک اور دل سوز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ درمیان میں ایک منظر ایسا ضرور آتا ہے جس سے طبیعت تھوڑی دیر کے لئے تازہ ہو جاتی ہے لیکن اسکی حیثیت یاس و ناامیدی اور رنج و الم کے خارزار میں شاداب ایک کلی کی سی ہے۔ ایکٹ نمبر ۲ کا منظر اول کچھ اسی قسم کا تاثر پیدا کرتا ہے جس میں چاندنی رات کی روان پرور فضا میں ڈیڈش سماج اور فلورا ایک دوسرے سے مل کر اپنی پاکیزہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

زوال گلشن کا انجام دل دوز اور دردناک ہے لیکن ابتدا اور وسط کی منزلیں حزن انگیز نہیں ہیں۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب کے ڈراموں کا جائزہ لینے سے پیشتر ڈرامہ کے عناصر ترکیبی کے متعلق چند باتیں پیش کر دی جائیں ارسطو سے لے کر اب تک کے ماہرین نے ڈرامہ میں جن اجزا کا ہونا ضروری قرار دیا ہے[3] وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) پلاٹ یا نفس مضمون (۲) کہانی کا مرکزی خیال یا تھیم (THEME) (۳) آغاز (۴) کردار اور سیرت نگاری (۵) مکالمہ (۶) تسلسل، کشمکش اور تذبذب (۷) تصادم (۸) نقطۂ عروج (CLIMAX) اور (۹) انجام۔

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا اجزا میں سے ہر ایک کی اہمیت یکساں ہے، ان میں سے کسی ایک جزو کی بھی کمی یا کمزوری کسی بھی ڈرامہ کو ناکام اور نامکمل بنانے کے لئے کافی ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں سے بعض اجزا کو وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور عمارت میں بنیاد کو حاصل ہوتی ہے۔ پلاٹ، کردار اور مکالمہ کو ڈرامہ میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے جس پر ڈرامہ کی پوری عمارت تعمیر کی جاتی ہے اور ان عناصر ثلاثہ میں بھی ایک عنصر یعنی پلاٹ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسلئے کہ وہ بجائے خود تقریباً تمام اجزا یعنی مرکزی خیال، آغاز، کشمکش اور تذبذب، نقطۂ عروج اور انجام کسی نہ کسی انداز میں پلاٹ سے ہی وابستہ ہیں البتہ تصادم کا تعلق کردار سے ہے۔

بہرکیف! ایک کامیاب اور اعلیٰ ڈرامہ میں حسب ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:۔

ایک ایسا پلاٹ جو توجہ کش اور دلچسپ ہو، اس کی تمام کڑیاں مرتب اور منظم ہوں، ان میں غیر معمولی حسن ترتیب ہو اور حسن تعمیر ہو، اس میں ایک کارآمد اور واقعات آفریں مرکزی خیال ہو، اس کا آغاز لطف انگیز اور دلکش ہو، اس میں ابتدا سے انتہا تک عضویاتی ارتقاء ہو، درمیان میں تذبذب اور کشمکش کی منزل بھی آئے لیکن اس میں خلاف واقعہ کوئی بات نہ ہو اور واقعات کو زیادہ الجھایا نہ جائے ورنہ ربط و تسلسل پر اس کا برا اثر پڑے گا، کہانی ابتدا اور درمیان کی منزلوں کے تمام پیچ و خم سے کامیابی کے ساتھ گزر کر بالکل فطری انداز میں اپنی انتہا پر پہونچ جائے جسے ہم اصطلاح میں نقطۂ عروج کہتے ہیں۔ دراصل یہی نقطۂ عروج کہانی کی سب سے اہم اور مشکل منزل ہے اور اسکی کامیابی پلاٹ

[2] ایضاً صفحہ ۲۲

[3] ایضاً صفحہ ۲۶

دیا چنانچہ بعد کے ڈرامہ نویسوں میں سید امتیاز علی تاج نے انارکلی لکھ کر اردو ڈرامہ کو ایک نیا موڑ دیا لیکن انارکلی کا حشر وہی ہوا جو اس مبتذل ماحول میں ایک اچھے ڈرامہ کا ہونا چاہئے تھا، تھیٹریکل کمپنیوں نے اسے اسٹیج پر پیش کرنے سے انکار کر دیا لیکن تاج نے ہمت نہیں ہاری اور اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا، اشاعت کے بعد اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انارکلی کی اس غیر متوقع مقبولیت نے پہلی بار اردو کے ڈرامہ نگاروں کو یہ احساس دلایا کہ اردو ڈرامہ کا مستقبل محض اسٹیج سے وابستہ نہیں ہے چنانچہ اس کے بعد اردو میں "ادبی ڈرامہ نگاری" کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

اسی دور میں ہندوستان میں سینما کی ابتدا ہوئی اور بہت جلد اس نے تھیٹر کی جگہ لی اتفاق سے فلمی صنعت کی زمام بھی زیادہ تر سیٹھوں اور ساہوکاروں کے ہاتھوں میں رہی چنانچہ سستے تفریحی ڈراموں کو سینما گھروں کے پردہ سیمیں پر پیش کیا جانے لگا اور اس نوع کا ڈرامہ لکھنے والوں نے فلم کمپنیوں کی ملازمت اختیار کر لی لیکن دوسری طرف سینما کے پردۂ سیمیں اور تھیٹر کے اسٹیج کے مروجہ تقاضوں سے بے نیاز ہو کر خالص ادبی ڈرامے لکھے جانے لگے۔ یہ ڈرامے محض سطحی رقص و سرود اور گھٹیا راگ رنگ تک محدود نہیں ہیں، یہ اُن مقاصد کے تحت لکھے گئے ہیں، اُن میں زندگی کے مختلف فکر انگیز مسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس اعتبار سے بلاشبہ یہ ڈرامے نسبتاً زیادہ قابل قدر ہیں۔ اُن ڈراموں کے متعلق ناقدین کی یہ رائے بالکل صحیح نہیں ہے کہ انھیں اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اسٹیج کے مروجہ تقاضوں سے بے نیاز ہو کر لکھے گئے ہیں لیکن دورِ جدید کا اسٹیج بہت ترقی یافتہ اور بالیدہ ہے اس لئے انہیں اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو میرے خیال میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئے گی۔

اردو میں "ادبی ڈرامہ نگاری" کا آغاز محمد حسین آزاد نے کیا اور اس روایت کو آگے بڑھانے میں مولوی عبدالحلیم شرر، شوق قدوائی، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، نیاز فتحپوری، سید امتیاز علی تاج، عابد علی عابد، عابد حسین، سید محمد مجیب، اشتیاق حسین قریشی، فضل حق قریشی، مرزا ادیب، اختر اورینوی اور فضل الرحمٰن نے نمایاں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ نورالٰہی محمد عمر صاحبان، سجاد حیدر یلدرم، مولانا سالک بٹالوی، پطرس بخاری، شاہد احمد دہلوی، عنایت اللہ دہلوی وغیرہ نے مشرق و مغرب کے بلند پایہ ڈراموں کا ترجمہ کر کے اس صنف کو مزید تقویت پہونچائی۔

اختر اورینوی اردو کے ایک معروف ادیب ہیں، اُنکی طبیعت بہت ہی ہمہ گیر اور مہم پسند ہے، انہوں نے ادب کی مختلف صنفوں میں کامیاب تجربے کئے ہیں، وہ بیک وقت شاعر، ناقد، محقق، افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔

اختر صاحب نے ڈرامہ نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے، انہوں نے ابتک صرف دو ڈرامے لکھے ہیں، اول شہنشاہ جشنہ اور دوم زوال کنشک، شہنشاہ جشنہ پانچ ایکٹ کا ڈرامہ ہے اور زوال کنشک ایکانکی لیکن یہ دونوں ڈرامہ کی اعلیٰ ترین صنف المیہ سے متعلق رکھتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ المیہ یا حزنیہ (TRAGEDY) ڈرامہ کی معراج ہے، یوں تو طربیہ (COMEDY) کو بھی ڈرامہ کی اعلیٰ صنف قرار دیا گیا ہے اور بلاشبہ اسے ڈرامہ کی دوسری اقسام مثلاً ٹریجڈی کومیڈی، میلوڈراما، فارس اور اوپرا وغیرہ پر فوقیت حاصل ہے لیکن یہ بھی اپنی صورت اور سیرت (ہیئت اور اثر خیزی) کے اعتبار سے المیہ سے لگا نہیں کھاتا، المیہ انسان کے شریف ترین جذبات کو بیدار کرتا ہے اور ڈرامہ نگار المیہ کے ذریعہ نفسِ انسانی کی تطہیر و تہذیب کرتا ہے۔ المیہ کی مفصل تعریف بچے ایس۔ کلتف نے بہت صحیح کی ہے۔

"ٹریجڈی کا تعلق انسانی فطرت کے عمیق اور گہرے مگر حقیقت آشنا پہلو سے ہے، زندگی کے مختلف شعبوں میں جو مصائب ظہور پذیر ہوتے ہیں انہیں عملی طور پر دکھا کر ہمدردی اور دل سوزی کے جذبات کو ٹریجیڈی کے ذریعہ متحرک اور مشتعل کیا جاتا ہے۔" [1]

[1] بحوالہ اردو ڈراما تاریخ و تنقید مؤلفہ عشرت رحمانی صفحہ ۲۲

کی کامیابی کی ضامن ہے، اگر ڈرامہ نگار ابتداء اور درمیان کی منزلوں کو کامیابی سے طے کرکے بالکل فطری انداز میں اس منزل پر پہونچ کر سامعین اور قارئین کی تمام تر توجہ کہانی کی جانب مبذول کرکے انہیں کسی حد تک حیرت میں ڈال دے تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے، اگر عروج کامیاب ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قصے کا انجام بھی کامیاب نہ ہو، انجام کی کامیابی کا انحصار حقیقتاً نقطۂ عروج کی کامیابی پر ہے، پھر بھی انجام کو نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا ہی چاہیئے ورنہ پلاٹ کو ادب عیب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ڈرامہ کے پلاٹ کی کامیابی کا انحصار بہت کچھ اُن کرداروں پر ہے جن کی حرکات و سکنات کے ذریعہ قصہ پیش کیا جاتا ہے، دراصل پلاٹ کی حیثیت ایک خاکہ کی ہے جس میں کردار کے افعال و اعمال کے ذریعہ رنگ آمیزی کی جاتی ہے، ڈرامہ نگار کو چاہیئے کہ کردار نگاری میں موقع و محل کا لحاظ رکھے اور افرادِ قصہ کی سیرت و شخصیت کو اس طرح پیش کرے کہ ہر فرد ایک دوسرے سے جدا اور منفرد نظر آئے، بہ الفاظ دگر افرادِ قصہ نہ صرف قد و قامت اور صورت و شکل میں ایک دوسرے سے جدا ہوں بلکہ اپنی سیرت و شخصیت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے علاحدہ نظر آئیں۔

ماہرین نے ڈرامہ میں تصادم کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، تصادم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی اور ان دونوں کا تعلق کردار سے ہے، دو متضاد کردار کے تصادم کو اصطلاح میں خارجی تصادم کہتے ہیں اور ایک فرد کے دو مختلف اور متضاد قسم کے جذبات، مثلاً محبت اور نفرت کی باہمی آمیزش کو داخلی تصادم کا نام دیتے ہیں۔ تصادم کی کامیاب تصویر کشی کے لئے کردار کے نفسی کوائف کا تجزیہ اور اس کی عمدہ عکاسی ضروری ہے،

کردار کی سیرت و شخصیت کا اظہار اُن کی باہمی گفتگو سے ہوتا ہے جسے اصطلاح میں مکالمہ کہتے ہیں، مکالمہ نگاری کے وقت اس امر کا خیال رکھنا از بس ضروری ہے کہ ؎

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

مناسب ایجاز و اختصار، سلاست و فصاحت اور برجستگی و برجستگی وہ اوصاف ہیں جو مکالمہ کو کامیاب بنانے کے ضامن ہیں۔

ان شرائط کے علاوہ ارسطو نے اپنے عہد کے اسٹیج کے حدود کے پیش نظر ڈرامہ اور خصوصاً المیہ ڈرامہ کے لئے تین وحدتوں کو ضروری قرار دیا تھا۔ وحدت زمان، وحدت مکان اور وحدت اثر لیکن زمانہ کی گردش نے اب صرف وحدت اثر کی اہمیت کو باقی رکھا ہے اور کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد کسی حد تک وحدت زمان کو بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم رکھا ہے لیکن وحدت مکان کو فرسودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے۔

اب ذیل میں ان ہی اصولوں اور معیاروں کے پیش نظر اختر صاحب کے ڈراموں کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے:۔

شہنشاہ حبش

اسی صفحات پر مشتمل پانچ ایکٹ کا یہ ڈرامہ المیہ کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے جو شروع سے آخر تک حزن و ملال، رنج و الم اور یاس و حسرت کے عالم میں ڈوبا ہوا ہے، یہ صحیح ہے کہ درمیان پر در فضاء میں فلورا اور ڈیڈرٹ ساچ کی رومان انگیز گفتگو تھوڑی دیر کے لئے طبیعت کو فرحت بخشتی ہے لیکن اس کی حیثیت غم و الم اور مایوسی و اضمحلال کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی اس کرن کی سی ہے جو صرف چند ساعت کے لئے ابھرتی ہے اور پھر اندھیرے کا جز و بن جاتی ہے۔

شہنشاہ حبش کا موضوع تاریخ عالم کا ایک المناک باب ہے، ۱۹۳۵ء میں اطالیہ کے آمر مسولینی نے اپنے شیطانی عزائم کو پورا کرنے کے لئے بے گناہ حبشہ پر حملہ کیا اور اس چھوٹے سے کمزور پس ماندہ اور غریب ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا، اس مظلوم ملک کے شہنشاہ نے اپنے ملک کو دفاع کے لئے ہر ممکن کوشش کی، ایک طرف محاذ جنگ پر اپنے حلیفوں کی مدد سے اسلحہ بند مدافعت کی اور دوسری طرف مجلس اقوام کو مداخلت کے لئے آمادہ کرنے کی سعی کی لیکن یہ تمام سعی و جہد بے سود ثابت ہوئی اور اس کا وطن عزیز جنگ کے شعلوں میں جھلس کر رہ گیا، اختر صاحب نے اس اندوہناک واقعہ کو اپنے ڈرامہ میں پیش کرکے

ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے بلاشبہ ہمارے شریف ترین جذبات کو حرکت پیدا ہوتی ہے، ہمارے دل میں مظلوم شہنشاہ سے پوری ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور ظالم مسولینی کی ہر ادا سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈرامہ کا انتساب بڑا ہی پرمعنی اور بصیرت افروز ہے:-

"خدا کے نام میں اسے معنون کرتا ہوں، صرف وہی انسانیت کو اس کے خود ساختہ دکھوں سے نجات بخش سکتا ہے" اس انتساب کا جو مفہوم ڈرامہ کے مطالعہ کے بعد واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اقوام عالم نے اپنے مسائل کا حل جینوا کے مجلسِ اقوام سے حاصل کرنے کی کوشش کی حالانکہ اس کا صحیح حل انہیں مکہ کے خانہ کعبہ میں ڈھونڈنا چاہیئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان آج جن آفات و مصائب میں مبتلا ہے وہ اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں، اور جب تک کہ وہ اپنے بنائے ہوئے ناقص ضابطوں پر عمل کرتا رہے گا اس وقت تک اسی طرح آفات کا شکار ہوتا رہے گا اور جب وہ خدا کے دیئے ہوئے نظام حیات کے تابع ہو جائے گا تو ان دکھوں اور مصیبتوں سے نجات پائے گا۔

شہنشاہ حبشہ کے پلاٹ میں پیچیدگی اور الجھاؤ کی جگہ سادگی اور پرکاری ہے، واقعات کی ترتیب و تنظیم فنکارانہ طور پر کی گئی ہے اور اسی لئے قصہ کا ارتقاء عضویاتی انداز لیے ہوا ہے۔ کہانی کا آغاز توجہ کش اور تجسس انگیز ہے، ایکٹ نمبر (۱) کے منظر اوّل میں شہنشاہ حبشہ کے محل کے محافظ سپاہیوں اور ان کے افسر کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کر دیا ہے اور شہنشاہ کی صلح و صفائی کی تمام کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں اور اب دونوں ملکوں کے مابین جنگ ناگزیر ہو گئی ہے:- "شہنشاہ نے بہت کوشش کی کہ ان کی رعایا میں جنگ میں ہلاک نہ ہو مگر ان کی سعی لاحاصل رہی، مسولینی ایک سرپھرا سا شخص ہے، پرغرور انسان، وہ دنیا کو جنگ کے شعلوں میں جلانا چاہتا ہے" اس آغاز کے بعد فطری طور پر ہم دو ملک کے تصادم اور اس کے انجام کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو کر پورا ڈرامہ پڑھ ڈالتے ہیں، ڈرامہ کی کہانی ابتداء اور وسط کی منزلیں کامیابی سے طے کر کے بالکل فطری انداز میں اپنے عروج پر پہونچتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ نے نازک صورت اختیار کر لی ہے، مجلس اقوام اس جنگ کو روکنے میں ناکام ہو چکی ہے اور حبشہ کی تباہی اس کا مقدر بن چکی ہے، حبشہ کی فوج کے تمام سردار اور افسر مایوس اور ناامید ہو چکے ہیں لیکن شہنشاہ نے ابھی ہمت نہیں ہاری اور وہ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کرنا چاہتا ہے، اس کے سردار اور مشیر اس کے اس خیال کی تائید نہیں کرتے اور اسے یورپ جا کر مجلس اقوام کے اجلاس میں شرکت کرنے اور برطانیہ کو حبشہ کی حمایت کے لئے آمادہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن وہ اس مشورے کو قبول کرنے کے لئے کسی طرح رضامند نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ اس نازک وقت میں ملک کو چھوڑنا اسے بزدلی کے مترادف نظر آتا ہے، لیکن دوسری طرف ملک کی حفاظت اور بقا کے لئے اس مشورہ پر عمل کرنے کے سوا اسے دوسرا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا، کچھ عرصہ وہ اس تذبذب کی کیفیت میں رہتا ہے لیکن آخرکار اپنی ملکہ اور ملک کے دوسرے اہل الرائے سرداروں کے سمجھانے بجھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے، چنانچہ ایکٹ نمبر (۵) کے منظر دوم میں جب وقت شہنشاہ اپنے تمام افرادِ خاندان کے ساتھ بے پناہی کے عالم میں محل سے روانہ ہونے لگتا ہے تو بے اختیاری کے عالم میں روتے ہوئے محل کے ایک پہرہ دار سے لپٹ جاتا ہے اور یہ کہتا ہوا روانہ ہوتا ہے:-

"میرا ملک! پیارا حبش! رخصت! خدا حافظ! رخصت!"

قطع نظر اس سے کہ اس جملہ میں جذبۂ غم کی شدت کی نہایت کامیاب ترجمانی کی گئی ہے، اس موقع پر قارئین کے دلوں میں مظلوم شہنشاہ کے لئے بے پناہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد مجلسِ اقوام کے ایک غیر معمولی اجلاس میں شہنشاہ کی ایک شاندار تقریر پر قصہ کامیابی کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے۔

قصے کے ارتقاء میں کئی مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں تذبذب اور کشمکش کی موجیں نمودار ہوتی ہیں لیکن تذبذب کا شدید جوار بھاٹا اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شہنشاہ کے مشیر اور بہی خواہ اسے ملک چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں اور وہ اس پر رضامند نہیں ہوتا، اس کی ذہنی کیفیت اس کی درج ذیل گفتگو سے ظاہر ہوتی ہے:-

"نہیں اے بہادرو! میں بے عزتی کی زندگی قبول نہیں کر سکتا،

میں اپنے پیارے وطن کے لئے ایک معمولی سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مر جاؤنگا"

"آہ مظلوم حبش! تیرا شہنشاہ اور ایک بے کس فراری! معزز سردارو مجھے اپنے دوش بدوش لڑ کر مر جانے دو!"

"میرے وفادار سردارو! میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟ میں اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟ مجھے پھر کوشش کرنے دو! مجھے پھر کوشش کرنے دو!"

"مجلس اقوام ہمارے معاملے کو غیر معمولی التوا میں ڈال رہی ہے! ظالم یورپ! ظالم یورپ!! آہ حبش کا خونی گیسوں سے گلا گھونٹا گیا اور مجلس اقوام کے حلق سے مؤثر آواز تک نہ نکلی . . . .

اے ننگ تمدن مجلس! حبش کا خون رنگ لائے گا! ع

"جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا"

اور جب حالات اسے ترک وطن پر بالکل مجبور کر دیتے ہیں:۔

"کیا معزز حبش کے شہنشاہ کو مجلس اقوام کے در پر جا کر بھیک مانگنی پڑے گی"

"اچھا! خدا حافظ حبش! حبش!"

مندرجہ بالا جملے جہاں تہاں سے لئے گئے ہیں، اُن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ترک وطن کے مشورہ پر شہنشاہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے لیکن حالات سے مجبور ہو کر آخر کار اسے یہ مشورہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس تذبذب کی کیفیت کو ڈرامہ نگار نے بہت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

شہنشاہ حبشہ ایک تاریخی و سیاسی ڈرامہ ہے، اس کے قصے کا تعلق دو ملک کی جنگ سے ہے اسلئے اس میں کردار کی کثرت ہے لیکن ان کثیر افراد میں چند بہت ہی نمایاں اور پھر ایک دوسرے سے متفرق اور منفرد نظر آتے ہیں مثلاً شہنشاہ حبشہ، مسولینی، ایڈن، جنرل واہب پاشا، ڈاکٹر احمد، ڈیڈ شا سماج محمد اور شہزادی فلورا اور اُن میں بھی نمایاں ترین کردار شہنشاہ کا ہے جس کی حیثیت اس ڈرامہ کے ہیرو کی ہے۔ حقیقتاً یہ ڈرامہ شہنشاہ ہی کا المیہ ہے، شہنشاہ کی سیرت و شخصیت بہت ہی دلآویز اور پُر کشش ہے وہ اپنے ملک کا محض تاجدار نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں ایک وطن دوست انسان ہے، اُسے اپنے ملک اور اُسکے باشندوں سے بے پناہ محبّت ہے، اس کا ملک چونکہ ہر صورت سے پسماندہ ہے اسلئے وہ اسکی اصلاح و فلاح کی کوشش کرتا ہے اور جب اطالیہ اس ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ ملک کے دفاع کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے، وہ بزدلی اور عیش پسند بادشاہوں کی طرح تاج و تخت کے عوض ملک کو فروخت کرنے اور دب کر صلح کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا بلکہ ایک غیور اور شجاع انسان کی طرح اطالیہ کی چیرہ دستی کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور اپنے ملک کے دفاع میں سرگرمی سے حصّہ لیتا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ شکست کھا جاتا ہے لیکن اُس کی یہی شکست ہمدردی کا مستحق بنا دیتی ہے شجاعت، غیرت اور تدبر کے علاوہ شہنشاہ کے اندر خطابت کی بھی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے۔ جنگ کے وقت جب وہ اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو ملک کے دفاع کے لئے آمادہ کرتا ہے تو اس کے بیان میں غیر معمولی قوت نظر آتی ہے اور مجلس اقوام کے ایوان میں اس کی تقریر تو فنِ خطابت کا ایک شاہکار ہے۔

مسولینی غرور و نخوت اور ظلم و جور کا مجسمہ ہے، اس کے ہر انداز و ادا سے اس کی ابلیسیت اور شیطنت اُبھر کر سامنے آتی ہے، ڈرامہ نگار نے اس کے کردار کا کامیاب چربہ اتارا ہے، اس کی آمریت، خونخواری، سفاکی اور فتنہ پردازی کی نہایت کامیاب تصویر کھینچی ہے، شہنشاہ حبشہ اور مسولینی کے کردار متضاد ہیں اور اس لئے باہم دگر متصادم بھی چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ڈرامہ ان دونوں کے تصادم اور ٹکراؤ کی کہانی ہے۔

ایڈن کا کردار اپنے ملک کی نمائندگی کرتا ہے، وہ برطانیہ کی چالبازی فریب کاری اور ظاہرداری کا مظہر تام ہے، چنانچہ مجلس اقوام کے اجلاس میں جس طرح وہ اپنا رول ادا کرتا ہے وہ بہت ہی خوب ہے۔

جنرل واہب پاشا اور ڈاکٹر احمد کے کردار اپنے اندر ایک اعلیٰ مثال رکھتے ہیں، مظلوم کی حمایت اور انسانیت دوستی کے جذبہ کے تحت یہ لوگ غیر ملک کے باشندہ ہونے کے باوجود اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس آڑے وقت میں حبشہ کی عملی طور پر اعانت کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ ایک ایسا وصف ہے جس نے اُن کے کردار کو دلآویز بنا دیا ہے۔

ڈیڈشا سماج اور فلورا کے کردار میں محبت کی پاکیزگی اور صفت نظر آتی ہے، وہ اپنی محبت کو وطن کی محبت پر قربان کر دیتے ہیں ڈیڈشا سماج کے کردار میں پاکیزگی اور بلندی ہے اور فلورا کی سیرت میں دلکشی وفاکیشی۔

شہنشاہ حبشہ کے مکالمے چند مقامات پر بلاشبہ طویل ہو گئے ہیں اور مشکل الفاظ اور تراکیب کے استعمال کے باعث اُن میں روانی اور سلاست کی کمی بھی نظر آتی ہے جسے ڈرامہ نگار کی ادنیٰ توجہ درست کر سکتی تھی۔ مکالمہ کا اصل مقصد کردار کی سیرت و شخصیت کو بے نقاب کرنا ہے اور اس اعتبار سے شہنشاہِ حبشہ کے مکالمے کامیاب کہے جا سکتے ہیں، ذیل کے چند مکالمے دیکھیے۔

"روحی تہذیب اور اقتدار کے احیاء کے لئے جنگ ضروری اور لازمی ہے" جنگ، فسطائیت کا مقصد ہے" سوال صرف وقت کا ہے اور آج ہم لوگ اس کے تعین کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، لیگ انگریزوں کا آلۂ کار ہے، افریقہ کے معاملات ہمیں خونریزے کی نوک سے طے کرنے ہونگے۔"

"ہر دماغ سوچنے کے لئے پیدا نہیں ہوا، اطالیہ کی ضرورتیں سارے دلائل سے ارفع ہیں" "خطرات سے ڈرنا ایک رومی کے لئے باعث توہین ہے۔ اطالیہ مجھ سے سرتابی نہیں کر سکتا، میں رومی شوکت کو قائم کر کے رہونگا۔"

"خیالات کی دوئی، ریاست کی موت ہے" اطالیہ میں صرف ایک رائے اور ایک مقصد ہوگا، نظریہ کا اختلاف ناقابل برداشت ہے۔"

ان کالموں کو پڑھ کر کون نہیں کہہ سکتا کہ یہ الفاظ اطالیہ کے کسی ایسے آمر کی زبان سے نکلے ہیں جو غرور اور کبر آمیز خود اعتمادی کے جذبات سے پُر ہے، ان مکالموں میں مسولینی کی سیرت کا بھرپور عکس دیکھا جا سکتا ہے۔

شہنشاہ حبشہ کی تصنیف کا مقصد لوگوں کو ظلم کی مذمت اور مظلوم کی حمایت پر آمادہ کرنے کے علاوہ یہ ہے کہ دورِ حاضر کی تہذیب و تمدن کی چکا چوند اور جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے، یہ تہذیب غارت گرِ انسانیت ہے اس لئے کہ یہ ایک حد تک نا آشنا مادی تہذیب ہے اور یہ تہذیب انسانیت کی ہلاکت کا باعث ہے۔ عہدِ حاضر کا انسان جن نظریات کے تحت زندگی گزار رہا ہے وہ چونکہ خود ساختہ ہیں اس لئے ناقص اور باطل ہیں اور ان ناقص نظریہ ہائے زندگی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج انسان خود نوعِ انسان کا شکاری بن گیا ہے اسلئے ضرورت ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خدا ساختہ نظام کے تابع کر دے اور تب ہی وہ ہلاکت اور تباہی سے بچ سکتا ہے۔

شہنشاہِ حبشہ میں وحدتِ مکان کی کوئی قید نہیں ہے لیکن وحدتِ زمان کا التزام کیا گیا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا واقعہ ایک مخصوص وقت سے تعلق رکھتا ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ آفتاب کی ایک گردش کے اندر ختم نہیں ہوتا اور حق تو یہ ہے کہ دورِ جدید میں وحدتِ زمان کی تعریف غلط ثابت ہو چکی ہے۔ وحدتِ اثر بدرجہ اتم موجود ہے، ڈرامہ کے انجام پر ہمیں شہنشاہ کی مظلومیت اور بے چارگی سے شدید ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور یورپ کے کھوکھلے اخلاق اور سطحی تہذیب اور اقوامِ غالب کی چیرہ دستی سے بھی شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ڈرامہ نگار اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

شہنشاہِ حبشہ پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسے اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا، اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اول تو یہ ایک ادبی ڈرامہ ہے، اس لئے اگر اسے اسٹیج پر پیش نہیں بھی کیا جائے تو اس سے اس کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور دوم یہ کہ عہدِ حاضر کا اسٹیج اس قدر بالیدہ ہو چکا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اسے کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر بھی پیش کر سکتے ہیں۔

زوالِ کینٹن

شہنشاہِ حبشہ کے برعکس زوالِ کینٹن کا کینوس مختصر ہے، یہ ایکانکی ہے، اُردو میں مکمل ادبی ڈراموں کے بعد ایکانکی کی ابتدا بعینہٖ اسی انداز میں ہوئی ہے جس طرح داستان کے بعد ناول اور مختصر افسانہ کا آغاز ہوا ہے اور ایکانکی بھی ناول، افسانہ کی طرح یورپ کی دین ہے چنانچہ شروع میں اُردو کے ادیبوں نے یورپ کے ایکانکی ڈراموں کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد طبع زاد ایکانکی لکھے جانے لگے اور جب ہندوستان میں ریڈیو کا رواج ہوا تو ریڈیو کے لئے بھی ڈرامے لکھے جانے لگے اور یہ ریڈیائی ڈرامے زیادہ تر ایکانکی ہی ہیں، بہرکیف بشری ایکانکی ہوں یا ادبی فنی حیثیت سے اُن میں

اور مکمل ڈرامہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ الا یہ کہ ایک کا کینوس بڑا ہے اور دوسرے کا چھوٹا۔

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ زوالِ کینٹن بھی ایک المیہ ہے۔ اس کا انجام دردناک اور غم انگیز ہے لیکن ابتدا اور درمیان کی منزلیں نہ صرف یہ کہ غم نا آشنا ہیں بلکہ بعض مقامات تو طربناک اور مسرت خیز ہیں، خصوصاً اس آیا اور خاہیان کی گفتگو کے موقع پر کواوچنگ کی دخل اندازی اور اس پر اس آیا کا برافروختہ ہو کر کواوچنگ کی سیرت و شخصیت کا مذاق اُڑانا نہایت دلچسپ اور فرحت بخش ہے۔

بہر کیف! زوالِ کینٹن ایک المیہ ہے اور اس کا مطالعہ بھی ہمارے شریف اور لطیف جذبات کو متحرک کرتا ہے۔ خاہیان اور اس آیا کا وطن کی آبرو کی حفاظت کی خاطر اپنی محبت کو قربان کرنا بلاشبہ ایک اعلیٰ اور مثالی عمل ہے اور اس سے قارئین اور سامعین کے دل میں حبِ وطن کا جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوتا ہے۔

زوالِ کینٹن کا پلاٹ بہت ہی گٹھا ہوا ہے، کہانی کا ارتقاء فطری انداز میں ہوا ہے کہانی تین مناظر پر منقسم ہے اور یہ تینوں مناظر پلاٹ کی مختلف منازل، ابتدا، وسط، عروج اور انجام کو پیش کرتے ہیں، منظر اوّل جسے ڈرامہ کا آغاز کہنا چاہیے خیال انگیز اور پُرکشش ہے۔ چین کے ایک شہر کینٹن کے ایک مکان میں کئی افراد محوِ گفتگو ہیں، گفتگو کا موضوع چین پر جاپان کا حملہ اور چین کی اسلحہ بند مدافعت ہے، ڈرامہ کا ہیرو خاہیان چین کے اس اقدام کی حمایت کرتا ہے لیکن اس کی محبوبہ اور ڈرامہ کی ہیروئین اس آیا اس کے خیال کی تردید کرتی ہے، وہ گاندھی کے فلسفۂ اہنسا پر ایمان رکھتی ہے چنانچہ اس کا خیال ہے کہ جنگ کا جواب جنگ نہیں ہے اور جاپان کی اس جارحانہ کارروائی کے جواب میں چین کے نوجوانوں کو اسلحہ بند مدافعت کے بجائے ستیہ گرہ یعنی پُرامن اور خاموش مزاحمت کرنا چاہیے تھا، خاہیان اس کے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

"حفاظتِ ناموس اور حمایتِ مظلوم کی خاطر جنگ جرأت و سعادت ہے"

اس موضوع پر دونوں کے درمیان کچھ دیر تک بحث ہوتی ہے، بحث میں خاہیان کا دوست کواوچنگ اور اس آیا کے والدین جینفا اور اس

کو تو بھی کبھی کبھی حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بحث کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا ہے، خاہیان اپنے نظریہ پر قائم رہتا ہے، اس آیا اپنے عقیدہ کے متعلق تذبذب میں ضرور پڑ جاتی ہے لیکن اُسے ترک کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی، خاہیان کی بحث اسے مدلل اور معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اسے اپنا عقیدہ بھی محبوب ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک نفسیاتی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے

منظر دوم کہانی کی درمیانی منزل کو پیش کرتا ہے، کینٹن کے بازار میں لوگوں کی بھاگ دوڑ اور قومی حکومت کی ایما پر پلوں اور عمارتوں کو تباہ و برباد کرنے کی آوازوں سے پتہ چلتا ہے کہ جاپانی فوج کینٹن کے قریب پہونچ چکی ہے اس لئے شہر کے باشندے کسی دوسری جگہ ہجرت کر رہے ہیں، صرف "حزبِ دفاعِ قومی" کے نوجوان اراکین رہ جاتے ہیں، خاہیان بھی ان ہی میں سے ایک ہے، حملہ کی خبر سن کر اس آیا خاہیان کو تلاش کرتی ہوئی بازار میں پہونچ جاتی ہے اور جب اس سے ملاقات ہوتی ہے تو اسے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہتی ہے لیکن وہ آمادہ نہیں ہوتا اس پر وہ اسے اپنی محبت کا واسطہ دیتی ہے لیکن وہ یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیتا ہے کہ:۔ "میری اور تمہاری محبت سے ایک اور اعلیٰ و ارفع محبت مجھے یہاں رہنے پر مجبور کرتی ہے" اور وہ ہے وطن کی محبت، ابھی دونوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی ہے کہ اس آیا کا باپ جینفا اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہونچ جاتا ہے اور اس آیا کے کہنے پر وہ بھی خاہیان کو شہر چھوڑنے کے لئے کہتا ہے لیکن خاہیان اس کی بات کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور پھر بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے۔ آخر کار جینفا اس آیا کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے۔

منظر سوم ڈرامہ کا آخری منظر ہے، اس میں عروج اور انجام کہانی کی دونوں منزلیں موجود ہیں۔ جاپانی فوج کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر حزبِ دفاعِ قومی کے اراکین اِدھر اُدھر چھپ جاتے ہیں، صرف خاہیان تنہا مقابلہ کرتا ہے لیکن بہت جلد گرفتار ہو جاتا ہے، جاپانی فوج کا افسر اسے جان بخشی کا لالچ دے کر اُسے کہتا ہے:۔

"نوجوان! اگر تم مجھے چینی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاع بہم پہونچا دو گے تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ اچھا اور یہ تو بتاؤ کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

خاہیان اس کی پیشکش کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیتا ہے:۔ "میں اپنے

پیارے وطن کی غداری کرنے سے موت کو ہزار بار ترجیح دیتا ہوں۔"
اس پر افسر کے حکم سے جاپانی سپاہی اسے زدوکوب کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں اوہ ای۔ آیا گرفتار ہو کر آتی ہے، فاہیان کے شہر میں رہ جانے کے باعث وہ اپنے والدین کے ساتھ نہیں گئی تھی اور شہر میں کسی جگہ موجود تھی۔ جاپانی فوج کے افسر نے اس کی گفتگو سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ فاہیان کی محبوبہ ہے چنانچہ وہ اس نازک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور فاہیان کو پھر ایک بار لالچ دیتا ہے:۔ "فاہیان! اگر تم مجھے حالات اور سازشوں سے آگاہ کر دو تو میں تم دونوں کو آزاد کر سکتا ہوں۔" لیکن فاہیان پھر اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے، آخر کار افسر اسے گولی سے اڑا دینے کا حکم دیتا ہے جیسے ہی کہ اہنسا کے عقیدہ کو ماننے والی ای۔ آیا بے چین ہو کر تشدد پر اتر آتی ہے وہ جھپٹ کر ایک سپاہی کی رائفل چھین لیتی ہے اور سپاہیوں پر گولیاں برسانے لگتی ہے اور اس طرح کہانی اپنے عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ کچھ لوگ ای۔ آیا کی گولی سے مجروح ہوتے ہیں لیکن جلد ہی جاپانی سپاہی اس پر قابو پا لیتے ہیں اور افسر کے حکم سے دونوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے فاہیان ای۔ آیا کو کہتا ہے:۔ "میری اور تمہاری محبت اور وطن کی محبت مل کر لازوال اور مقدس ہو گئی۔" اس طرح ڈرامہ کامیابی کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے۔

زوال کنٹین کی تخلیق کا ایک مقصد ہے، ڈرامہ نگار نے گاندھی کے فلسفہ اہنسا پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ ایک ناقص اور ناقابل عمل فلسفہ ہے۔ یہ انسانی فطرت کے مطابق نہیں ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ای۔ آیا جو نظریاتی اعتبار سے ڈرامہ کی ابتدا میں اس عقیدہ کی قائل نظر آتی ہے کہ:۔

"اگر حفاظت ناموس و حمایت مظلوم پرامن ستیاگرہ سے ہو سکے تو پھر جنگ کی کیا ضرورت ہے؟ جنگ سے دنیا میں منافرت بڑھتی ہے، یہ ایک وحشیانہ طریقۂ دفاع ہے۔۔۔۔۔ دنیا میں امن سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔" ڈرامہ کے انجام پر خود اپنے عمل سے اس کی تردید کرتی ہے اور جاپانی حملہ آوروں کو اپنی گولی کا نشانہ بناتے ہوئے فاہیان کے اس خیال کی تصدیق و تائید کرتی ہے کہ:۔ "اگر اخلاقی پابندیوں کے تحت جنگ کی جائے تو اس میں بہیمیت نہ پیدا ہو، ایسی جنگ منافرت نہیں پھیلاتی بلکہ منافرت کے ساتھ ظلم کا بھی سدباب کرتی ہے۔ جنگ محض ایک فطری جذبۂ دفاع و بقا ہے، فطری رجحانات کو مٹانا مہلک ہے، ہاں انسانیت کی سرحدوں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے فطری رجحانات اخلاق کے ماتحت آجاتے ہیں" اور یہ کہ:۔

"جنگ نہ شر ہے اور نہ خیر، اس کا با موقع اور بے موقع استعمال اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔۔۔۔ جنگ اگر حرص و آز کے لئے کی جائے تو وہ قتل و غارت ہے اور حفاظت ناموس و حمایت مظلوم کی خاطر جنگ جائز و مناسب ہے۔"

زوال کنٹین میں فاہیان اور ای۔ آیا کے کردار کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی حیثیت ہیرو اور ہیروئن کی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن جنگ اور امن کے متعلق دونوں کے نظریات میں اختلاف ہے، ای۔ آیا گاندھی جی کے فلسفہ اہنسا پر ایمان رکھتی ہے اور فاہیان اسے ایک غیر فطری اور لچر فلسفہ سمجھتا ہے، خیالات کے اس اختلاف کو ہم نظریات کے تصادم کا نام دے سکتے ہیں۔ انجام کار ای۔ آیا کے نقطۂ نظر کو شکست ہو جاتی ہے۔ اور فاہیان کے خیالات کو فتح حاصل ہوتی ہے لیکن دونوں کا انجام المناک ہوتا ہے، وہ اپنی محبت کو حب وطن پر نثار کر دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوکو اور چانگ جن، ای۔ آیا کو نو اور جاپانی افسر کے کردار بھی کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

زوال کنٹین کے مکالمے ہر اعتبار سے قابل تعریف ہیں، ان کی زبان فصیح اور سلیس ہے، جملے مختصر اور تراشیدہ ہیں، تراکیب چست اور برمحل ہیں اور بہ حیثیت مجموعی عبارت میں روانی اور برجستگی ہے، اس کے علاوہ ہر کردار کی گفتگو اس کی سیرت کے نقوش کو اجاگر کرتی ہے۔

اتفاق سے اس ڈرامہ میں ارسطو کی تینوں وحدتوں پر تھوڑی ترمیم کے بعد عمل کیا گیا ہے۔ ڈرامہ کے واقعات چین کے ایک خاص شہر کنٹین میں رونما ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ تینوں مناظر کا تعلق شہر کے مختلف مقامات سے ہے، واقعات کے ظہور میں آنے کا زمانہ بھی ایک ہے ہاں یہ صحیح

(باقی ص [illegible] پر)

پروفیسر سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی

فن اور فن کار — پروفیسر اختر اورینوی

شخصیت نگاری بہت آسان کام ہے۔ آپ قلم لے کر بیٹھ جائیے اور شخص متعلقہ کے سلسلہ کی ساری کڑیاں ملاتے جائیے۔ وہ کب ملا تھا، کیسے ملا تھا، کیا بات ہوئی تھی۔ اس سے گفتگو کی ابتدا کس طرح ہوئی تھی، اور انتہا کیسے ہوئی۔ لیکن جس شخص سے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔ ایسے شخص کی شخصیت کا بیان نہایت مشکل کام ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم آزاد، حالی، میر اور سودا پر جب قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی شخصیت ان کے فن پاروں کے آئینے میں مرتب کرتے ہیں۔ آزاد (شمس العلما محمد حسین) کو ان کے مو قلم سے پہچانتے اور متاثر ہوتے ہیں۔ میر (محمد تقی) کو ان کی تخلیقات کے آئینے — اور حالی (الطاف حسین) سے ان کی تحریروں کے عکس کے ذریعے۔ واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہم نے ان کی تحریریں ہی دیکھی ہیں۔ ان سے ہم کلام نہیں ہو سکے ہیں۔ اب ان کے تیور اور ان کے جلال سے آگاہی ان کی تحریر یا تصویر ہی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ وہ شخصیتیں نہیں ہیں۔ جو "سدا برگ" کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ "سدا بہار" ہیں۔ ان کی شخصیت زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ یہ ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی ہم میں موجود ہیں بلکہ ہماری حیات و ممات ان سے وابستہ ہے۔

مگر موجودہ دور کے ادبا اور شعرا جن سے ہم واقف ہیں اور ان کی تحریر سے متاثر بھی ہیں۔ پھر بھی ہم ان سے کبھی ملاقات نہیں کر سکتے ہیں۔ لہذا ان کا رشتہ بھی ہمارے لئے "گزشتہ صدی" کے لوگوں جیسا ہی ہے۔ ہم ان سے ملے نہیں ہیں۔ مگر ان کی ادبی تخلیقات سے متاثر ضرور ہوئے ہیں۔ میرے لئے ایسی شخصیتوں میں ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کا شمار بھی ہے۔ مجھے یاد نہیں ان سے کبھی میری باقاعدہ یا بے قاعدہ ملاقات ہوئی ہو۔ لیکن یاد آتا ہے جب علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر کا پہلا اجلاس شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سیمینار روم میں منعقد ہوا تھا۔ تو میں نے تمام حاضر الوقت ممبران سے دستخط حاصل کئے تھے، اور یہ تاریخی دستخط اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں اختر اورینوی صاحب کا دستخط بھی ہے۔ میری اور ان کی دیدار و دید یا خاموش ملاقات کی ابتدا و انتہا اسی قدر ہے اگرچہ میں ان کی تخلیقات زمانہ طالب علمی سے پڑھ رہا ہوں اور متاثر بھی ہوں متاثر ہونا ایک فطری فعل ہے۔ شعوری نشو و نما جب اپنے ایقان کی اس منزل پر پہونچتا ہے جہاں اس کیلئے یہ فیصلہ ہی مشکل نظر آئے کہ منزل ختم ہو گئی یا آگے بڑھنا ہے۔ تو وہ ان حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ایسے لمحہ کو ہم بے یقینی کا دور کہہ سکتے ہیں اور ایسے لمحات ہر طالب علم کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ جب ادیب کی تصنیفا

بڑھتا ہے۔ اس کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ پریم چند جیسا ادیب بھی دوسرے ممالک کے ادیبوں سے ابتدا میں متاثر ہوا تھا۔ اور اس نے اسی بات کا ذکر بہت فخر سے کیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے لئے وہ عظیم ہے۔ اس کی تخلیقات اس سے بھی زیادہ عظیم اور قابل احترام ہیں۔

اختر صاحب شاعر بھی ہیں۔ ناول نگار بھی، افسانہ طراز بھی ہیں۔ اور مضمون نگار بھی۔ لیکن ان کی ادبی اہمیت صرف ناقد کی حیثیت سے ہی زیادہ اہم ہے۔ ان کے یہاں تنقیدی شعور اس حد تک بالغ ہے۔ کہ قاری کا ذہن کسی اور طرف نہیں جاتا۔ اس لئے کہ وہ فن کو اپنے تخیلات پر قربان کرنا گوارا نہیں کرتے ان کی رائے صائب اور ان کا فیصلہ ٹھوس بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں خارجی نہیں، داخلی شہادتیں اور بیرونی نہیں اندرونی شہادتیں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کی داخلیت سے ان کے مضامین اپنا اثر و رنگ اجاگر کرتے ہیں۔ وہ حال و قال سے متاثر نہیں ہوتے۔ اور یہی ان کے فن کو مزید جلا بخشتا ہے۔

فن کیا ہے؟ اصول کیا ہے؟ ضابطہ کیا ہے؟ اس کو جاننا اور عمل پیرا ہونا ہی، کسی ادب کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ ویسے نقد بذات خود ایک ایسی کسوٹی ہے جس کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔ انصاف اور رواداری دو علحدہ چیزیں ہیں۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اصل اور نقل کے فرق کو دانش سے واضح تر کر دیا جائے اور رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ اصل سے ہٹ کر بات کی جائے۔ حقیقت سے بعد رواداری اور حقانیت سے قربت انصاف ہے اور انصاف ہی نقد کا دوسرا نام ہے۔ اس طرح ادبی تنقید۔ عام تنقیدوں سے مختلف ہے۔ عام تنقیدوں سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اگر انگور کو کھٹا کہہ دیں تو بھلا ہر دوکاندار کو ناگوار گزرے گا۔ اور اس کا ایک خریدار کم ہو جائے گا مگر اس کا مال کسی نہ کسی طرف فروخت ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف۔ ادبی تنقید اس ادب کی زندگی کا سوال بن جاتا ہے جس کے ادب پارے کے متعلق ہم رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس ادیب کے یہاں جو رجحانات یا حقائق ملتے ہیں۔ ان سے اگر انصاف نہ کیا جائے تو اور اپنے انداز سے غلط طرح منظر عام پر لائے جائیں۔ تو قاری کا ذہن ناقد کی وجہ سے اس ادیب کی اصل روح یا تصورات سے دوسری سمت چلا جائے گا۔ اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ ناقد کو اپنے فرائض کا احساسات بھی شدت سے رہنا چاہئے۔ اس قدر ادیب یا شاعر مجبور نہیں ہوتا۔ ادیب کا قلم اپنے ذہن کا تابع ہوتا ہے۔ لیکن ناقد کا قلم ان تمام مسائل کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ جن سے عوام دوچار ہوتے ہیں۔ ادیب کا قلم منہ زور گھوڑا ہے اس کا رخ جس سمت کو بھی ہوتا ہے۔ وہ دوڑتا بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے مگر ناقد کا قلم ایک محاسب ہوتا ہے۔ اس کی ذرا سی بھول چوک ادب اور عوام کی تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے افسانہ نگار، ناول نویس یا شاعر کا تصور اس قدر اہمیت نہیں رکھتا۔ جتنا کسی ناقد کا تصور اور اس کا تجزیہ اس سلسلے میں دو ہم عصر ناقدوں کا بیان ملاحظہ ہو۔

"تنقید تخلیق ہی نہیں فن ہے۔ اور کوئی فن ایسا نہیں جس کے اصول نہ ہوں۔ جس کے بنیادی مسائل نہ ہوں، یا جس کا کوئی معیار نہ ہو، یہ الگ بات ہے کہ تخلیقی فن کے اصول بندھے ٹکے ہوتے ہیں اور نہ اس کا معیار ترشا ترشایا ہے" (شوکت سبزواری۔ معیار ادب ص ۵)

"فن کار ـ زمانہ، سماج اور دلیتاں کے مشترک میلانات کے علاوہ، انفرادی میلانات بھی رکھتے ہیں۔ فن کا جذبہ اور تخیلی ردعمل نہایت پیچیدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں فن کاروں کو سانچوں اور فارمولاؤں میں مقید نہیں کرنا چاہئے۔" (اختر اورینوی۔ تحقیق و تنقید جدید ص ۴)

شوکت صاحب کا یہ کہنا کہ "تنقید تخلیق ہی نہیں فن ہے۔ بہت صاف بات ہے۔ مگر ان کے اس جملے سے دو سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں"

۱۔ کسی تخلیق پر ہی تنقید کی جا سکتی ہے۔

۲۔ جب تنقید تخلیق ہو گئی تو فن کس طرح ہو گئی۔ اور اس پر تنقید کیوں کر؟ اس ضمن میں موصوف کا یہ فرمانا کہ۔

"تخلیقی فن کے اصول بندھے ٹکے ہوتے ہیں اور نہ اس کا معیار ترشا ترشایا۔" تو سوال یہ ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے یہ بات کیوں فرمائی کہ

۱۔ کوئی فن ایسا نہیں جس کے اصول نہ ہوں۔ جس کے بنیادی مسائل نہ ہوں۔ یا ۲ جس کا کوئی معیار نہ ہو۔

یہ دراصل تنقید کے الجھاؤ ہیں۔ اور ایسے ناقدین جو محض اپنے سکون کی خاطر قاری کو ادھر ادھر کرتے ہیں، وہ تنقید سے انصاف نہیں کرتے۔ پھر شوکت صاحب جیسے ناقد کو جو اپنا ایک جدا معیار رکھتے ہیں اور اردو ادب میں خاص احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔ اس کے برخلاف اختر صاحب کا یہ خیال قاری کو کسی نتیجے پر پہنچا سکتا ہے اور اس کا شعور مطمئن ہو سکتا ہے کہ

۱۔ فن کا جذبہ اور تخیل ردعمل نہایت پیچیدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں ———

۲۔ فن کاروں کو سانچوں اور فارمولاؤں میں مقید نہیں کرنا چاہئے۔

فن کار — خواہ افسانہ نویس ہو یا تنقید نگار

دونوں کو آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے اپنے ماحول کے مطابق جائزہ لیں اور اپنے تجزیے و تجربے کو اس پس منظر میں صفحۂ قرطاس پر پیش کریں۔ مصور کا موقلم بغیر کسی "تصور" کے کینوس پر نہیں چلتا۔ اسی طرح اس کا موقلم رنگ آمیزی میں رنگوں کے انتخاب میں خطا نہیں کرتا۔ حسن و تجلّی کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اس کا مشاہدہ باریک سے باریک اور غیر اہم باتوں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا۔ دراصل اچھا مصور اور اچھا ناقد "تنقید حیات" کا ضامن ہوتا ہے۔ اس کے اشارے اور اس کے خطوط مشاہدہ و مشہود کو ایک کر دیتے ہیں۔ اور یہی یک جائیت اس فن کار کا کمال ہے۔ ناقد کی ذمہ داری ذرا زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں ان تمام خطوط پر پہنچتی ہیں۔ جو مصور یا ادیب سے سہواً نظر انداز ہو گئی ہے۔ اس کی نظر میں فن کار کے سرمایہ پر عیب جوئی کے لحاظ سے نہیں "معلمانہ" پڑتی ہیں۔ اس کی نظر ایسا سنگ تراش ہے۔ جس کے ذریعے دل تراشے جاتے ہیں۔ اس لئے اصل اصول یا تجربات کا ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ اختر صاحب کا بھی خیال ہے۔

فن کاری بغیر تجربات کی صداقت کے ناممکن ہے اور تجربات کی سچائی ماحول کے مطالعہ و مشاہدہ سے وابستہ ہے"

(تحقیق و تنقید جدید ص ۹۲)

یہی نہیں بلکہ اس کے واسطے مزید صلاحیتوں کا ہونا بھی لازمی ہے وہ یہ ہے۔

سچائیوں کو منظر عام پر لانے کیلئے مناسب اور موزوں ٹکنک کا صحیح انتخاب بھی بدلتے ہوئے ماحول پر نظر رکھنے سے ہی سکتا ہے۔

(تحقیق و تنقید جدید ص ۹۲)

بلکہ فن اور اس کی مقصدیت سے زیادہ قرب حاصل کرنے کیلئے یہ اصول بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

"فن میں زندگی، تازگی، جوش، ولولہ، سادگی اور خلوص پیدا کرنے کیلئے فن کار کی آنکھوں کو وا، کانوں کو شنوا، اور دوسرے حواس کو بیدار ہونا چاہئے۔ (۹۱)

کیوں؟ اس لیئے کہ

زندگی میں ہر گھڑی حرکت ہے۔ ماحول بدلتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی کا اثر تجربات پر بھی ضرور پڑے گا۔ اور اگر ہمارے تجربات جاندار ہیں تو انہیں ماحول کی ہم آہنگی کرنی پڑے گی" (تحقیق و تنقید جدید۔ ص ۹۱)

"دوسرے حواس" اور زندگی میں ہر گھڑی حرکت، یہی تصور اصول فن کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اختر صاحب کے مضامین میں ان اصولوں کو برتا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین "سرچشمۂ حیات" سمجھے جاتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ماضی کو مستقبل سے ملانے والی کڑی کا انحصار ناقد پر ہوتا ہے۔ قاری تو محض حال کا شیدائی ہوتا ہے وہ اپنے حال سے بے خبر ہو کر آگے قدم بڑھا سکتا ہے۔ نہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکتا ہے۔ اس کے برعکس ناقد ماضی اپنے حال میں رکھتے ہوئے ہر بات سے آگاہ کرتا ہے۔ فرض کی اس ادائیگی سے قوموں کی زندگی سنورتی ہے اور ملکوں کا مستقبل شاندار ہوتا ہے۔

اختر اورینوی کے دو تنقیدی مضامین کا مشترک مجموعہ عرصہ نو کی شکل میں "تحقیق و تنقید جدید" کے نام سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے ذہنی شعور اور ادبی و تنقیدی بالغ نظری کا علم ہوتا ہے۔ اور سادگی اور تصنع سے دور، خلوص اور سچائی سے مملو خیالات اپنے اثر و تاثر کے لحاظ سے بے پایاں کمال کا درجہ

رکھتے ہیں۔ خیالات میں ہم آہنگی اور تصورات میں بلندی اس حد تک کہ ہمارا ذہن مثبت و منفی کے چکر میں نہیں۔ اصل حیات کی طرف منعطف رہتا ہے اور سب سے بڑا وقت یہ ہے کہ ان کے مضامین میں انگریزی شعر و ادب یا اس کے ادیبوں اور غیر ملکی تنقیدی نظریات کا چرچا غلو کی حد تک نہیں کیا جاتا ضرورت اور تناسب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں ماحول وقت، زمان و مکان، خالص مشرقی ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ شیکسپئر یا ملٹن کا ذکر کرتے ہیں تو صرف زمان و مکان اور قید مثال کیلئے۔ نہ کہ برتری و بلندی یا مرعوبیت کے نظریئے کیلئے۔ ہاں حالی، اقبال، امرالقیس زہیر، اور نابغہ، جنید گوئی اور کعب بن زہیرہ کے ادب پاروں کا ذکر زیادہ شغف سے کرتے ہیں۔ کیونکہ ادب ایک "سماجی عمل" ہے اور ہر سماج میں، ہر معاشرے میں، صالح ذہن ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے ذہنوں کو جلا ملتی ہے۔ ان کے افکار و خیالات سے ہمارے عزائم میں پختگی اور ہمارے مسائل میں دستوری آتی ہے۔ سعدی، رومی، کبیر، نانک، تلسی داس اور عبدالرحیم خانخاناں کے اخلاقی تصورات "آفاق گیر" اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ذہنوں سے نکلی ہوئی بات آیات و حدیث نہیں مگر تمیع ہدایت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ لوگ اپنے الگ الگ مسلک سے وابستہ تھے۔ مگر تھے ہمارے درمیان کے۔ اس لئے ہم شیلے اور ملٹن کے مقابلہ میں ان عوامی فنکاروں سے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ ورنہ سخن ہائے گفتنی کے لئے ہر کس و ناکس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مگر ایسے ناموں سے مقصدیت کو نقصان پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ اختر صاحب نے ترقی پسند ادب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

(۱) "یورپ کا نشاۃ ثانیہ ایک انقلاب تھا۔ جو عربی علمی و تمدنی ترقی اور یونانی علم قدیم کے زیر اثر برپا ہوا۔ عربوں کی نئی سائنٹفک ایجادات و تحقیقات نے پرانے نظریوں کو ملیا میٹ کر دیا۔"

(۲) "یورپ کے صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس نے جاگیردارانہ نظام پر ایک ضرب لگائی۔"

(۳) "......... فن برائے فن کے دلستان کی صدائیں آنے لگتی ہیں اور ادب بلند مقاصد سے نیچے گر کے سرمایہ داروں اور خوش حال، متوسط طبقے کی خلوتوں اور محفلوں میں محض رامش گری کے فرائض انجام دینے لگتا ہے۔"

(۴) "عہد حاضر بھی ایک عبوری اور بحرانی دور سے گزر رہا ہے اور اب عالم اس بحرانی دور کی آئینہ سامانی کرتا ہے۔"

(۵) "ادب حاضر میں فرار اور گریز بھی ہے۔ رجعت پسندی وغیرہ جانبداری کا اثر بھی اور ترقی پسندی کا رنگ بھی۔"

(تحقیق و تنقید جدید ص ۴۳)

ان اقتباسات میں یورپ سے تاثر اور عربی و یونانی علم کے برکات جاگیردارانہ نظام اور اس کی طبقاتی جنگ، سرمایہ دارانہ ذہن اور جدید ادب کا رنگ و رخ، عہد حاضر کا ادبی رجحان اور ترقی پسند ادب کا مختصر جائزہ ـــ سب ہی نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں ـــ

ان کے مطالعہ

سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقش و نگار اگر دھندلے ہوں تو طبع سادہ سے اجاگر کرے گا۔ سنہ زور اگر کسی لمحہ دوڑ میں ٹھہر جائے تو ہوا خواہ بڑھاوا دے کر اس کی ہمت دو چند کر دیں گے۔ کوئی طائر بال و پر ہونے کے باوجود شکستہ پری کا احساس کرے تو چمن میں دوسرے طیور اڑ کر اسے اپنے ساتھ ملا لیں گے۔ لیکن ادب کا میدان مختلف ہے۔ اس میں کمی یا زیادتی دونوں مضرت رساں ہیں۔ ادب میں قضا و قدر نے جو میزان عدل مقرر کر دی ہے۔ اس سے انحراف نہ کرنا۔ نادانی ہی نہیں، قوموں کے زوال کا باعث بھی ہے۔ اس نظریے کو پیش نظر رکھنے کے بعد تنقید کے یہ جابجا ٹکڑے ناقد کے شعور اور ذہن کی پختگی کی گواہی دیتے ہیں وہ یہ ہیں۔ زیر تذکرہ مجموعۂ تنقید میں جو مضامین سب سے معیاری اور کشش ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ سور داس اور تلسی پر اردو کا حق

۲۔ ترقی پسند ادب

۳۔ فن ناول نگاری اور نذیر احمد دہلوی

۴۔ غالب کا فن شاعری اور اس کا نفسیاتی پس منظر

غالب کا فن شاعری" نہایت مفید اور بصیرت افروز مضمون ہے۔ اس مضمون کے ذریعے غالب کا ہم غالب سے قبل و بعد دونوں حالتوں میں مطالعہ کر سکتے ہیں اور یہ دورخی تصویر، ہم کو غالب کے سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

غالب ۔ ایک فن کار کی طرح اپنے عہد اور ماحول سے متاثر ہوا تھا ۔ وہ اپنے ماحول کی بے کیف ترجمانی نہیں کرتا، خارجی ہیجانات نفسی تجربات کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد غالب کے فن میں منعکس ہوتے ہیں اس انعکاس میں داخلی رنگ بہت زیادہ ہے اور یہی غالب کی کمزوری ہے۔" (تحقیق و تنقید جدید ص ۱۹۸)

اختر صاحب کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن ان کے اس تجزیے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی بیرونی اثرات سے کام نہیں لیا ہے۔ اسی لئے وہ اس کے یہاں عملی انقلاب" کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ غالب مکمل انقلاب تھا اس کے یہاں فرار و گریز کی جو کشمکش ملتی ہے وہ خود انقلاب کی ایک شکل ہے۔ ورنہ یہ کیسے کہتا کہ

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی ؟

اس شعر کے اندر جو سوال پنہاں ہے اس کا جواب دینا زمانے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس شعر میں ایک جاگا ہوا اور بے دار و بے قرار جذبہ پوشیدہ ہے۔ اس کے بیان منفی نہیں۔ اثباتی رجحان ہوتا ہے جسے وہ منفی انداز میں بیان کر کے ذہنوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے اور یہ بات اس کی کمزوری ہو سکتا ہے۔ ورنہ اس کے حال و قال و مآل و سوال میں کوئی فرق نہیں۔ وہ رجائیت پسند ہوتے ہوئے بھی قانون حیات کا پیغامبر تھا۔ بہرحال اختر صاحب کے ان اصولوں اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کے ضوابط کا مطالعہ و موازنہ کیا جائے تو دونوں ایک سطح پر آجاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ حالی نے جو باتیں کہی تھیں۔ وہ اس دور کی تھیں۔ جس کے وہ خود نابغہ تھے، مگر اختر صاحب نابغہ ہوتے ہوئے بھی (بقول شکیلہ اختر) نابغہ نہیں ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ حالی بحیثیت ناقد کے ہمارے ادب میں بہت بعد میں روشناس ہوئے مگر اختر صاحب اس دور کی پیداوار ہیں ۔ جہاں ناقدوں کی بھرمار ہے۔ حالانکہ انھوں نے ناقدوں کے فرائض میں اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ

"........... ادبی گمراہوں، خام کاروں، خطا کوشوں اور باغیوں پر نگاہ رکھنا بھی اس کا کام ہے (ص ۶۳)

مگر ہم میں ابھی اتنی جرات و ہمت کہاں پیدا ہوئی ہے کہ اس طرح کے مجرم کا سامنا کریں اور سزا دیں ۔ اگرچہ یہ کام اسی قدر ضروری ہے جس قدر کسی ادب کی تخلیق، کیونکہ محاسبہ ہم میں بلند نظری اور وسیع ہونے کے احساسات پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ادب میں زندگی اور اس کے لوازم سے انسیت پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اختر صاحب کا بھی خیال ہے کہ

"ہمارے اردو ادب کو حیات پرور ہونا چاہئے۔ اسلئے ضروری ہے کہ ہمارے ادبا و شعراء کی آنکھیں کھلی ہوئی، کان سننے والے اور دوسرے حواس بیدار ہوں لیکن ادب اور شاعری صرف سطحی عکاسی ماحول کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ماحول کے ہیجانات کو ذاتی، داخلی و تخیلی تجربے کی شکل اختیار کرنی لازمی ہے۔ بغیر فن کار کے خون دل و جگر کی آمیزش کوئی نقش زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔" (تحقیق و تنقید جدید ص ۹۸)

اختر صاحب کے تنقیدی شعور کے ضمن میں ایک بات جو صاف طریقہ سے سمجھ سکا ہوں، وہ اصول پسندی کا ہے۔ اور ان کے ذہن نے جس حد تک اسے قبول کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ ادب کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ

ادب میں معیار کا وجود بھی نہایت ہی اہم چیز ہے۔ اگر معیار نہ ہو تو طوائف الادبی پیدا ہو جائے..... (کیونکہ) معیار کا ترک ادبی فسق و فجور ہو (اور) ہر ایں و آں معیار کے خلاف قدم اٹھانے کا مجاز نہیں۔ اس سے اقلیم ادب کا امن

اٹھ جائے گا۔" (تحقیق و تنقید جدید ص ۶۲)

اس ضمن میں انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کر دی مناسب سمجھی ہے کہ اصول شکستگی کا حق کسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔"

شکست معیار صرف نابغہ کے ہاتھوں ہو سکتا ہے اور ہونا ہے۔ نابغہ ہی صاحب شریعت جدید بننے کا اہل ہے۔ زمانے کے رجحانات بھی نابغہ ہی کو اپنا ماخذ بناتے ہیں۔ (ص ۶۲)

نابغہ یا قائد ادب کو ہر طرح کے حقوق حاصل ہونے کے باوجود چند شرائط کا پابند ہونا چاہئے۔ وہ پابندی یا شرط کیا ہے؟ اسکو سنیئے

"پھر شکست معیار کا بھی ایک اصل الاصول ہے جس سے نابغہ بھی سرتابی نہیں کر سکتا۔ یہ تبدیلی اور شکست اس وقت حق ہے جب تجلیات و ادب کے کسی نئے انداز حسن کو بے حجاب کرے۔ (ص ۶۲)

اس پیغام کو کہ ہمارے اردو ادب کو حیات پرور ہونا چاہئے۔ ہر خاص و عام کی زبان پر اور ذہنوں پر مرتسم ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خون جگر کی آمیزش اور مطالعہ و مشاہدہ کی گیرائی و گہرائی کے بغیر کسی ادب کا وجود میں آنا فنا کے مترادف ہے۔ بقا اور دوام کیلئے یہ لازمی ہے کہ ادب میں حسن کے لوازمات پوری طرح موجود ہوں، معاشرے کی بدحالی اور تمدن کی خوش حالی کا انحصار بھی ہمارے اپنے جذبے پر منحصر ہے۔ اس لئے ان تمام گوشوں پر منظر رکھنا ضروری ہے جن سے کوئی ادب بچ کر اور اپنا دامن سمیٹ کر نکل نہیں سکتا۔ اور فن کار کا کمال اسی احساس پر منحصر ہے۔

میں نے اختر صاحب کی شاعری افسانہ نگاری یا ناول نویسی کے متعلق کوئی بات نہیں کہی ہے۔ اس لئے کہ میرے ذہن کا میلان اس طرف نہیں ہے۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ بہار کے افسانہ نگاروں میں اس فن سے کما حقہ واقفیت اور اس کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر کام کرنے والوں میں صرف سہیل عظیم آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اس طرح شعراء میں عروض و قواعد اور اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھ کر شاعری کرنے والوں میں صرف اور صرف علامہ جمیل مظہری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں فن اور فن پاروں کی قدروں کا خاص اہتمام ہے۔ وہ انسانیت اور اس سے انسیت رکھنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری۔ دماغی خلل نہیں ہے کہ بلا جیا تیا کی انتہا ہے ورنہ یہ شعر

دیتے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تلخی و عمل
پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

زندگی اور اس کے لوازم سے آگاہی کے بغیر منظر شہود پر کیسے آ سکتا ہے بہر کیف ـــــ یہ دونوں بزرگ فن کے اقدار سے واقف ہیں اور اس کے احترام کے پاسبان بھی۔ ان کے تصورات و خیالات ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ جیسے آسمان پر لاتعداد ستارے جلوہ ریز ہیں اور ہم ان سب کے وجود کے قائل ہیں۔ منکر نہیں بقول غالب

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

بقیہ:۔ اختر اورینوی کی ڈرامہ نگاری

ہے کہ اس کا عرصہ آفتاب کی ایک گردش تک محدود نہیں ہے' وحدتِ اثر بھرپور طور پر موجود ہے اور نقطۂ عروج پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈرامہ کا انجام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ وطن کی محبت افراد کی محبت سے زیادہ اہم ہے

زوال کینتھن کو نہایت کامیابی سے اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی ایسا منظر نہیں ہے جس کی نمائش میں کوئی دشواری پیش آئے۔

شہنشاہ جبشہ اور زوال کینتھن کے اس جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اختر اورینوی میں ڈرامہ نگاری کی زبردست صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور اگر وہ کبھی اس پسماندہ صنف کی طرف مائل ہوئے تو یقیناً شہنشاہ جبشہ اور زوال کینتھن سے بھی زیادہ بہتر اور اعلیٰ ڈرامہ اردو کو دے سکیں گے جو ممکن ہے دنیا کے بہترے ڈراموں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے!

ڈاکٹر ممتاز احمد

حسرت تعمیر ایک مطالعہ

جین آسٹن نے لکھا ہے کہ ایک ناول نگار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ انسانی فطرت کی مکمل معلومات سے بہرہ ور ہو اور اسے ان معلومات کی فنکارانہ ترکیب کرنیکی اہلیت ہو اور اسکے ساتھ ساتھ اسے اس بات کی بھی قدرت ہو کہ وہ معلومات کے بیش بہا ذخیروں کو بہترین زبان میں ادا بھی کر سکے۔ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت کی معلومات کا جوہر اور عطر حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ شعبدہ بازی بھی کام نہیں دے سکتی۔ اور بازیگری بھی بیکار ہی ثابت ہوگی۔ اس کیلئے یہ نہایت ضروری ہے کہ فنکار مشاہدہ کی عمیق نظر سے ایک اچھی خاصی مدت تک انسان کے حرکات و سکنات کا بنظر غائر سے مطالعہ کرے۔ ایک ہی طرح کے عادات و اطوار کے حامل انسانوں کو مختلف حالات میں اور مختلف عادات و اطوار کے حامل انسانوں کو ایک جیسے حالات میں دیکھے، جانچے، پرکھے، تولے اور ان متضاد حالات سے انسان کے ظاہر اور باطن میں جو تغیرات آئیں۔ ان کے داخلی احساسات میں جو مجادلے ہوں اور یہ داخلی مجادلے جس صورت سے انسانوں پر اثر انداز ہو کر ان کی شخصیت کو بناتیں بگاڑیں ان تمام جزئیات اور کوائف نفسی کی تہوں کو وہ کھرچ کر حقیقت تک رسائی کرنیکی کوشش کرے ورنہ ناممکن ہے کہ اس کے تجربات اور مشاہدات نادر اور بیش قیمت ہوسکیں۔

ڈاکٹر اُدیبوی نے سچ پوچھئے تو نقد دل اور نقد حیات لٹا کر بیش قیمت تجربات کے خزانے اور گوہر شہوار حاصل کئے ہیں۔ ان کی زندگی موت اور محبت دونوں آماجگاہوں سے فاتح کامران بچ نکل ہے ورنہ ان طوفانوں سے نبٹ کر کسے ایسا موقع ملا ہے کہ جو یہ صلا لگائے کہ کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق، اور ان کا چراغ زندگی تو اب بھی اس دیرینہ زلزلہ کیوجہ سے کبھی کبھی آندھی کی زد میں مضطرب ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ ان کی حیات کی طنابیں کن طوفانوں نے کھینچی شروع کی تھیں اس کی تفصیل خود انہیں کی زبان سے سنئے "میری صحت کمزور تھی اور میں تبدیل آب و ہوا کیلئے سال میں ایک دو بار چھوٹا ناگپور ضرور جایا کرتا تھا۔ میں اس خطۂ پاک کا گرویدہ تھا۔ میری زندگی میں یوں تو کئی زلزلے آئے ہیں لیکن تین زلزلے اپنی شدت میں بے پناہ اور مہیب تھے۔ ایک کا مداوا تو ممکن نہ ہو سکا۔ میری حیات کی بنیادیں جھٹکے کھاتی ہی رہتی ہیں۔ اور روح لرزتی ہی رہتی ہے۔ لیکن دو زلزلوں سے مجھے پناہ مل گئی تھی۔ پہلی پناہ گاہ دریائے سون کے حسین و جاں فروز ساحل پر تھی اور دوسری چھوٹا ناگپور کے زندگی بداماں کہساروں میں۔ کاش سون ندی چھوٹا ناگپور کے کہستانوں سے دور ہو کر بہت جلد علیحدہ نہ ہوتی

ان دونوں کا وصال مکمل جنت ہے۔ ابدی دار السلام لیکن اس عالم ناکامل میں تکمیل مسرت کہاں! سون کا نغمۂ فراق اور چھوٹا ناگپور کے کہساروں کا خاموش نالۂ جدائی زندگی میں سوز و سامان پیدا کرتے رہتے ہیں"۔

مصنف کو چھوٹا ناگپور کے پہاڑ کی بسیط روح میں گم گشتہ نغموں کا سراغ ملتا ہے۔ سوز و ساز اور درد و داغ و آرزو کے غم و آلام کا مارا مصنف انسانیت کے دکھ کا مداوا ڈھونڈتا ہوا دیوانہ وار اس دیار میں پہونچتا ہے جہاں اڑاؤں، منڈا، کول اور ٹرکی کا لندی اور سرکنڈی گاؤں کے لوہے کی طرح سخت کوئلے کی طرح سیاہ، لالہ کی طرح اپنی مٹی سے لپٹے اور چپکے ہوئے، جنگلی بانسوں کی طرح لاتعداد اور بیش قیمت لکڑیوں کی طرح کارآمد اور سڈول لڑکے اور لڑکیاں ملتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان کا دھمکڑیاں گھر، بوڑھے اور بوڑھیاں، ان کی روح کا غم، ان کی ناکام تمناؤں اور حسرتوں کے دانے ہائے زعفرانی بوس محبوب کی صنعت سازی کے ذریعہ اس خطہ کی تباہی و غارتگری، بوس محبوب سے مصنف کی ملاقات، بوس محبوب کی اس خطہ کے قدرتی و فطری نغمۂ دلگیر اور میہاں کے شجر حجر سے ٹپکتے ہوئے راگ کو مشین کی گھڑگھڑاہٹ سے بدلنے کی تمنا، یہاں کے ڈیگا اور پھمی لکڑا کا بے گھر ہو کر بے یار و دیار اور بے غمگسار در ماندہ ہونا اور ابرک اور تانبے کی طرح چمکتی اور دمکتی ہوئی جاندنی اس ناول کے تار و پود کو تیار کرتے ہیں۔

اب تار و پود کی بات آگئی ہے۔ تو اس کا بھی حال خود مصنف ہی کی زبان سے سماعت فرمائیے۔ "چھوٹا ناگپور دولت مناظر کے ساتھ ساتھ معدنیات کے خزانے بھی رکھتا ہے۔ لوہے، کوئلے، ابرک، ابرک اور تانبے کی کانیں بکھری پڑی ہیں۔ راہ جنگلوں میں کثرت سے ہوتا ہے۔ اور یہ جنگلات اچھی اور کارآمد لکڑیوں اور بانسوں کا بغیر ختم مخزن ہیں۔ میں تو اس دیار کا دیوانہ ہوں۔۔ اس سفر میں مجھے ایک اور دیوانہ ملا مگر خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو،

ہمارے حال پر صادق نہ آیا۔ میں شہید جلوۂ مناظر اور وہ ہلاک امکانات، صنعت، ہر شخص بخیال خوش خبطے دارد، میں جب اپنے مشاغل اور غم روزگار سے تھک جاتا ہوں تو جنوب کا رخ کرتا ہوں ان جنگلوں میں حیات ملتی ہے۔ تمنائے حیات میں دو ہفتے تک میں ان اضلاع جنوبی کے صدر مقام میں ٹھہرا اور پھر جنگلوں میں آکر میں نے ڈیرا لگا دیا۔ اس داستان نے ان ہی دو ہفتوں میں چند ضروری منزلیں طے کیں۔ اور بعد میں بھی اس کے تار و پود بنتی رہیں، ورنہ اس کا ماجرا تو زندگی پہلے سے تیار کر رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ فنکار کے ذہن میں فن کا خام مواد اسی طرح ترتیب و تزئین اور ترتیب دیر ورش پاتا ہے۔ فنکار کسی مافوق العنصری دنیا کی مخلوق نہیں ہوتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی حس عام انسانوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اس کی دور اس اور نکتہ شناس نگاہ اور فہم و ادراک بہت جلد اور بہت دور تک معاملات کے بنیادی نکات پہ پہونچ جاتے ہیں۔ اس کے دل کے طوفان دریاؤں کے دل دہلا دیتے ہیں۔ اور اس کے احساس کی شبنم جگر لالہ میں ٹھنڈک پہونچاتی ہے اس کی نگاہ میں نیلگوں آسمان کی بیکرانی ہوتی ہے۔ وہ یورپ اور بیچیم کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ قطرہ میں دجلہ دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ وہ ایسا محتسب ہوتا ہے۔ جیسے راز درون خانہ سے کچھ مطلب ہوتا ہے، لیکن وہ اس راز درون خانہ میں سے صرف ایسے راز کو بیرون خانہ لاکر پیش کرتا ہے۔ جن میں کچھ انفرادیت ہو کیونکہ یوں تو فنکار اتنے مختلف النوع تجربات و حادثات و واقعات سے دوچار ہوتا رہتا ہے کہ اگر ان میں وہ حذف و اضافہ نہ کرے تو ان میں فنی محاسن پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ ان واقعات میں سے وہ ایسے حصوں کو جن میں ندرت، تازگی، کشش جاذبیت، انوکھا پن اور حیرت و استعجاب شامل رہتے ہیں۔ جن کی پرچھائیں کبھی کبھی قلب فنکار پر پڑتی ہے۔ اپنے لاشعور میں پھینکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی قبیل کا کوئی پر شدت واقعہ راکٹ کی تیز رفتاری کے ساتھ فنکار کے شعور و حس اور قلب گداز میں گھس کر ایک

طوفان، ہلچل اور ہیجان پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے تحت شعور میں لاوے ابلنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح ذہن و دماغ اور قلب میں اس ابال کے بعد فنکار کے داخلی احساسات میں قدرے سکون پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس منزل پر ایک نامعلوم سی خلش اس کے اندر گدگدی پیدا کرتی رہتی ہے۔ ستاتی اور اکساتی رہتی ہے۔ فنکار اب تجربات کے فن کو لکھنے کیلئے بیتاب سا نظر آتا ہے۔ اس سوز نہاں سے اس کی ہڈیاں جلنے لگتی ہیں۔ اور جلن سے مجبور ہو کر وہ اپنے خام مواد کی پیشکش کیلئے اپنے ذہن میں واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے اس کا پیکر سانچہ، ترتیب، تنظیم اور ترکیب قائم کرتا ہے۔ اور اس طرح تجربہ ہی اس کے دماغ میں تنقید و تخلیق یا مواد اور ہیئت کے مختلف سانچے بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ فنکار کے ذہن پر ایک آخری شکل اس طرح کی نمودار ہوتی ہے۔ کہ وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور پھر ان تجربات کو وہ احاطۂ تحریر میں لاتا ہے۔ تخلیق کی اس رسم و راہ منزل سے جو فنکار کو گزرنا پڑتا ہے مصنف حسرت تعمیر کے تجربات علمی بھی بہت دنوں سے کچھ اسی قبیل کے تھے کہ یوسف محبوب نے اپنی شمولیت سے اس ناول کے سارے ماجرے کو دو ہفتوں میں مکمل کرا دیا غرض کہ یوسف محبوب کی شخصیت کی برق تابی نے ناول کے قصوں میں برقی لہر دوڑا دی۔ اور حسرت تعمیر، وجود میں آیا۔

ناول نگار یوں تو اپنے ناول میں چھوٹا ناگپور کے ارضیہ کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن اس ارضیہ کی بنیاد اس کے نادر بیش قیمت تجربات اور مشاہدے کی گہری جڑوں پر قائم ہے وہ اس خطہ میں دیوانہ وار آتا ہے۔ لیکن یہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار بھی رہتا ہے۔ اس کا دل دیوانہ اسے اس وادی میں بھٹکاتا ہے۔ اور وہ اپنے دل کو کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن جب ان وادیوں، کہساروں، آبشاروں اور جنگلوں کے حسن کو نئی آب و رنگ دینے کی بات آتی ہے تو وہ ان حسین نمونوں سے اپنا دامن بچا کر غبارِ راہ تکنیک چلا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہو کر پورے ناول میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان گھاٹیوں کا حسن ناول نگار کو اپنی طرف کھینچے ہوئے ہے۔ اور وہ ذاتی طور پر اڑاؤں۔ منڈا اور سرکنڈی قبیلوں کے رقص و سرود میں شامل ہو کر ان کے جسم کے شراروں کی حدت اور حرارت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ بھک سے جلتے ہوئے ملبے میں اسے سنگ موسی سے تراشے ہوئے صنم کو بھی ازلی نقابیں دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے وہ منظر بھی نیا ہے۔ اور مئے تجدید کو لیکر اس گلشن و گلستان و سبزہ زار میں صفت جام بھی پھرا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن انتخاب ماجرا میں اس نے اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کو فن کے حسن پر غالب نہیں آنے دیا ہے۔ اس مقام کی زندگی اور اس کے دکھ، درد، غم، آنسو، ہنسی خوشی کے پہلوؤں میں حک و اضافہ کر کے صرف ان ہی گوشوں اور زاویوں کو منتخب کیا ہے۔ جو فنی ضرورتوں کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس ناول کے پلاٹ میں ایک زبردست منطقی ربط و تسلسل بھی ملتا ہے۔ وہ اس روتی، سسکتی بسورتی اور تقریباً دم توڑتی اور کچلی ہوئی انسانیت کے مناظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ اسے کسی پہلو کل نہیں پڑتی لیکن اس کی یہ بے کلی فن کو نہیں چھپاتی۔ جذباتیت کا جھاگ نہیں پیدا کرتی۔ اسے واعظ نہیں بنا پاتی۔ یہ سچ ہے کہ فنکار اپنا ایک واضح نظریۂ حیات رکھتا ہے۔ لیکن اس کا تصور حیات اور ضابطۂ حیات اسے ہر حال میں انسانیت دوست ہی رہنے دیتے ہیں۔ اور اس کا یہ عمل روح کے اندر متلاطم خیالات و جذبات رکھنے کے باوجود الفاظ کے اسلوب پر قابو پانے کی ایک زبردست مثال ہے۔

اس بات کا تو تقریباً ہم سبھوں کو علم ہے کہ ناول میں وحدت تاثر ہوتا ہے۔ لیکن مختصر افسانہ کی طرح صرف ایک وحدت تاثر نہیں ہوتا۔ مگر جاننے کی چیز یہ ہے کہ ناول نگار کو وحدت تاثر کا التزام کہاں پر کرنا چاہئے۔ مثلاً ناول کے ہر باب میں اس طرح کا واقعہ بیان ہوتا ہے جس میں نقطۂ عروج کا مقام آتا ہے۔ اور اس واقعہ کے اختتام پر قاری ایک اثر محسوس کرتا ہے۔ اور میرے خیال میں کرنا چاہئے اور اگر یہ اثر نہ قائم ہو تو ہم اس باب کے واقعہ یا ماقبات کو بے جان سمجھیں گے

۱؎ حسرت تعمیر، اختر اورینوی کی سرگزشت پہلی اور شاید طویل ناول ہے اس میں معروضی طور پر ایک حقیقی کردار کو، جس سے اختر صاحب شخصی طور پر واقف تھے۔ فنی کام کو دے دیا گیا ہے۔ ادارہ

لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ ناول کے ابواب کی تقسیم ایک مشکل امر ہے اگر ناول نگار کا تنقیدی شعور پختہ نہیں ہے، اگر اسے ذہن انسانی کی رد اور اس کے عمل کا گہرا اور وسیع علم نہیں ہے۔ اگر وہ انسان کے ادراک کی پیچیدگیوں سے کما حقہ واقف نہیں ہے تو اس کے ناول کے ابواب کی تقسیم غیر فطری تقسیم ہوگی۔ ناول نگار کو بہرحال انسانی نفسیات کا علم ہونا چاہئیے۔ جس سے وہ اندازہ لگا سکے کہ ایک قاری کہاں پر ناول کو عام طور پر اپنی فطرت اور جبلت کے لحاظ سے مجبور ہو کر پڑھنا چھوڑ دیگا یا پڑھنا چھوڑ دینا چاہے گا۔ یہ ناول نگار کے واقعہ کی ترتیب دل چسپی اور اس کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً تمام ریلوے جنکشن پر ایک پل ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ ہم دوسرے پلیٹ فارم پر آسانی اور حفاظت سے پہونچ جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ سیڑھیوں پر جب ہم چڑھتے ہیں تو اس پل پر ایک چوڑی سی جگہ ملتی ہے۔ وہاں ہم کسی کا انتظار کرتے ہیں۔ یا دم لیتے ہیں یہ عین ممکن ہے کہ پل پر جو چوڑی سی جگہ رہتی ہے۔ ہم اس سے ایک دو سیڑھی پہلے ہی تھک جائیں لیکن ہم ہمت کرکے ایک دو سیڑھی اور چڑھ کر ہی ٹھہرتے ہیں۔ یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ انجینئر انسان کے عادات و اطوار کو مدنظر رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی بے ڈھنگا انجینئر کسی پل کو بناتا ہے تو ہم اس پر گذرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ یہی حال ناول کے ابواب کی تقسیم کا ہے۔ اس کے ہر باب کو جنکشن کے پل کی سیڑھی کے درمیان اس چوڑی سی جگہ کی طرح ہونا چاہئیے۔ جہاں پہونچ کر ہی ہم دم لیں۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ ناول کے ابواب کی تقسیم آسان نہیں۔ جب تک انسانی ذہن کے عمل کا نفسیاتی علم ناول نگاری کو نہ ہو وہ تقسیم ابواب میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ہر باب کو پلاٹ کے تسلسل کیلئے آپس میں بہرحال مربوط ہونا چاہئیے۔ اور وحدت تاثر کی صورت یہ ہونی چاہئیے کہ جہاں پر ناول کا ایک باب ختم ہو اس کے اختتام پر مبہم وحدت تاثر نہ ہو کیونکہ ہر باب کے آخر میں شدت وحدت تاثر ناول کے منطقی ربط کو صدمہ پہونچا سکتی ہے۔ مزید براں ناول نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ اس کے ناول کا ہر باب آئندہ والے واقعات کیلئے قاری کے ذہن کو بالواسطہ طور پر کچھ اس طرح تیار کرتا جائے جس سے اس کا دماغ مستقبل کے واقعات سے ہم آہنگ ہوتا جائے اسی لئے ایک ملنا۔ یا یہ ناول ایک بسیط، بوقلموں اور بیکراں زندگی کو اپنے جلو میں رکھنے کے باوجود قاری کو ذہنی طور پر اپنے سے علحدہ نہیں ہونے دیتا۔ زیر نظر ناول میں ایسی ہی فنکاری کی جلوہ گری ہے۔ واقعات ہیں جن سے حسرت و یاس امڈے پڑتے ہیں۔ کردار ہیں جن میں لقدر پیمانہ تخیل ایسی خواہش پائی جاتی ہے۔ کہ ہر خواہش پر دم نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے بھی کردار ہیں جن کے اندر ناکردہ گناہوں کی حسرتیں مچل رہی ہیں۔ لیکن یہ حسرتیں کچھ ایسی ہیں۔ ان میں کچھ ایسا سحر و جادو اور اعجاز ہے، کچھ ایسا کس بل ہے۔ کہ ان کی گرفت میں ہمیں ذہنی حظ حاصل ہوتا ہے۔ یہ حسرتیں ہمیں سکون کا ساحل بخشتی ہیں۔ سکون کے سراب کی زیبرنائی دکھاتی ہیں۔ اور زندگی ناپائیدار کی حسرت تعمیر!

زیر جائزہ ناول کی منظر نگاری اور فضا نگاری میں بھی ناول نگاری نے ایک نیا لیکن موثر طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ منظر و فضا اور منظر سے واقعہ میں شدت تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ناول کے تیسرے باب کے اس واقعہ کو لیجئے جہاں ناول نگار کی ملاقات مسرور سے نوادہ اسٹیشن پر اچانک ہوتی ہے۔ وہ مسرور کی جن ریل ہوتی ہوئی چند پائی ملنے اقبال کو دیکھ کر اپنے ڈبے کے مسافروں نوکروں، سروں، تونددوں، ٹانگوں اور جوتوں کو روندتا ہوا باہر نکل کر سیدھا مسرور کے پاس پہونچتا ہے۔ مسرور اپنے وطن جا رہا تھا اس لئے واقعی مسرور تھا۔ اس ملاقات کے ایک عشرہ کے بعد منظر کا خط ناول نگار کو ملتا ہے۔ لکھا تھا "مسرور ماموں کو ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ فوت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ......" مسرور ماموں کی موت سے مجھے درد زندگی کا شدت کے ساتھ احساس ہونے

لگتا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ اب مجھے اپنی بیماری کا ایسا غم نہیں رہا
مسرور ماموں کبھی بیمار نہیں پڑتے تھے۔ ان کی صحت قابل رشک
تھی۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا "!

دیکھئے کیسی حقیقت نگاری ہے۔ کس قدر تاسف تاثر سے پر
موت کی یہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ ہم اپنے مستقبل
سے بالکل نابلد ہیں۔ ریل کا ڈبہ ایک علامتی رنگ اختیار کر لیتا
ہے۔ ایک ڈبہ میں نہ جانے کتنے مسافر بیٹھے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی
مسافر کو پتہ نہیں کہ موت انھیں کس منزل پر اتار دیگی۔ ریل کی کہا گہمی
شور شغب، چہل پہل۔ بھاگ دوڑ کے بعد مسرور کی موت ایک
سناٹا پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ تلخ حقیقت نگاری ہمیں افسردہ نہیں
ہونے دیتی۔ بلکہ ایک آفاقی حس پیدا کرتی ہے۔ اپنے ذاتی درد و
رنج اور غم والم سے پرے اور انسانیت کے غم کو اپنانے کا حوصلہ
عطا کرتی ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسرور کی موت کا اثر جا رہے
اوپر بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ منظر محسوس کرتا ہے۔ یعنی ہم بھی
درد زندگی کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور اپنی
تکلیف کا غم نہیں رہتا۔ اسے کہتے ہیں جذبات نگاری، کتنی نازک
کتنی گہری، کتنی پیچیدہ، کتنی لطیف اور کتنی حسین

لیکن یہ سب تو ہوا اور انداز بیان اور، نہ ہو تو طبیعتوں
کا میلان اور رجحان اس مصنف کی طرف بھرپور نہیں ہو پاتا۔ ڈاکٹر
اختر اور بیوی محفلوں، مجلسوں، اور تحریروں میں انداز بیان
اور طریقۂ تحریر دونوں طرح سے سحر قائم کرنے کا گر جانتے ہیں۔
ان کی جادو بیانی کے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، سبھی قائل ہیں
اور شاید ان کی اثر آفرینی کا راز اسی نکتہ میں پوشیدہ ہے کہ وہ
واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے طرز بیان یا انداز نگارش انتخاب
کرتے ہیں اور یہی عمل اس ناول میں بھی برتا گیا ہے۔ انداز تحریر کا یہ
طریقہ ہرگز مستحسن نہیں کہ واقعات کی نوعیت کو مد نظر رکھے بغیر
کوئی ناول نگار کی طرح واقعات بیان کرنا شروع کرتا ہے

تو آخر تک یہی عمل برتتا رہتا ہے۔ کسی نے آپ بیتی
کا طریقہ اختیار کیا تو کوئی خطوط و بیانات
کے ذریعہ واقعات بیان کرتا ہے۔ تو آخر تک وہی نقشہ ملے گا۔ جانا
چاہئے کہ واقعات اپنے تاثرات اور حیثیت کے لحاظ سے اپنا
پیراہن چاہتے ہیں۔ اور اگر ان کی لحاظ سے ان کی قبا تیار نہیں کی
گئی تو الفاظ و معانی اور پیرایۂ بیان کی قبا ان پر سج کر ناز
نہیں کرتی ہے۔ جہاں جہاں تک حسرت تعمیر کا سوال ہے اس میں طریقہ
اظہار کو واقعات کے لحاظ سے منتخب کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ
کی ہیبت، دہشت اور درندگی کے اثر کو تیز سے تیز کرنے کیلئے کپتان
شہباز میدان جنگ کے ان واقعات کو بیان کرتا ہے جن سے وہ
خود دوچار ہوا ہے۔ کپتان شہباز اپنی آپ بیتی یوں سناتا ہے
میں دھوئیں اور شعلوں میں سانس لے چکا ہوں اور گولیوں اور شعلوں
کی بوچھاڑ میں دوڑتا بھاگتا ہوں۔ زخمیوں اور لاشوں کے درمیان
مارنے پر آمادہ اور ہر گھڑی مرنے پر مجبور رہا ہوں.......... میں نے
ویران گاؤں کو دم کے دم میں پھنکتے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے
بارود اور شعلوں میں جلتے ہوئے انسانی اور حیوانی جسموں کی
مہک سونگھی ہے۔ اپنے سپاہیوں اور اپنے باربرداری کے خچروں کو
ہنکتے ہوئے اور جھلستے ہوئے دیکھا ہے "!

میدان جنگ کے تجربات کو ظاہر ہے کہ کپتان سے زیادہ بہتر
طریقہ سے اور کون بیان کرے گا۔ اور اسی وجہ سے اس آپ بیتی
میں ہمیں زیادہ دلچسپی ملتی ہے۔ اگر اس واقعہ کو کسی اور طریقے سے
پیش کیا جاتا تو وہ تاثر نہیں پیدا ہو سکتا تھا جو ابھی قائم ہوا ہے
کیونکہ ہم آپ بیتی بیان کرنے والے کی شخصیت کے نہاں خانوں میں
جھانک کر اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اس کی بے بسی ہمیں اس کے
قریب اور اس کا ہمدرد بنا دیتی ہے۔

ناول نگار جہاں پر صرف واقعات کو بیان کرتا چلا جاتا
ہے اگر وہ واقعات خود دلچسپ اور پر تاثیر نہ ہوں تو ناول نگار

نے اسے دلچسپ نہیں بنایا ہے۔ تو وہ قصہ صرف بیانیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سادگی، سپاٹ پن کی حد کو چھو لیتی ہے۔ اس لئے اس واقعہ کی تنظیم و ترکیب میں اسے بڑی عرق ریزی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اگر بیانیہ حصہ میں جانفشانی کی جائے تو اس میں بھی فنی آب و تاب اور چمک دمک پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً منظر کی بیماری کا مختصر سا خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔

"منظر مجھ سے مل کر نہایت خوش ہوا۔ وہ اپنی صحت کی طرف بہت مایوس ہو گیا تھا۔ دل کی کمزوری کی شکایت پرانی تھی۔ اور اب ڈاکٹروں نے پھیپھڑوں کی بیماری کا شبہ بھی ظاہر کر دیا تھا...... وہ خوش و خرم ہوئی صحت گاہ کو روانہ ہو گیا۔ اور میں پٹنہ واپس چلا آیا۔"

خط کا سہارا ہم اپنے جذبہ کے اظہار کیلئے خاص طور پر اس وقت لیتے ہیں جبکہ ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے ہوئے بھی بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ ایسے حالات میں یہ خطوط ہمارے جذبات کی ترجمانی کرنے میں بڑے مددگار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مولوی نجابت حسین صاحب کو جنھیں انھیں بوس محبوب کی دولت، جاہ و ثروت، اور کے عالی شان مکانات اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور اس دولت و جاگیر کے باعث مولوی نجابت حسین صاحب اپنی لڑکی کی منسوب بوس محبوب سے کرنے کے بھی خواہش مند ہیں۔ لیکن جب بوس محبوب نجابت صاحب کی لڑکیوں اور ان کی بیوی کو اپنے گھر مہمان ہونے کی دعوت دیتا ہے تو وہ حیص بیص میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کے اندر ہمت نہیں ہے۔ کہ وہ محبوب کی اس دعوت کو صاف طور پر انکار کر دیں۔ اس لئے وہ خط کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی طرح بوس محبوب جب دوسری شادی کرنے جاتا ہے۔ اس سے ایک روز قبل اپنی بیگم خط کے ذریعہ اس بات کی خبر کر دیتا ہے۔ نجابت حسین بوس محبوب کو خط لکھتے ہیں۔ اور بوس محبوب عقد ثانی سے ایک روز قبل اپنی بیگم کو خط لکھتا ہے۔ بنیادی باتیں دونوں خطوط میں ایک ہی ہیں۔ مثلاً نجابت حسین بھی بوس محبوب کو اپنے خیال سے باخبر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی گرفت اور رد عمل سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ بالکل یہی معاملہ بوس محبوب کا ہے۔ وہ بھی بیگم کو باخبر کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے رد عمل سے دور رہنا چاہتا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ خطوط ہمارے ایسے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جب ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو کر بھی بے تکلف نہیں ہو پاتے اور ان کے لئے ہم خطوط کو ہی وسیلۂ اظہار بناتے ہیں۔

غرض کہنے کی یہ ہے کہ اگر مختلف واقعات کیلئے ان کی مناسبت سے موزوں پیمانے منتخب نہ کئے جائیں تو وہ مطلب خیزی و مطلب برآری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ واقعہ محض بے جان چیز نہیں۔ اس کا اپنا چراغ اور ہوا ہوتا ہے۔ اس کا اپنا وزن اور رفتار ہوتا ہے۔ اسکی اپنی موزونیت اور محل وقوع ہوتا ہے۔ اس کی ہر آن دہک اور مہک شعلہ سا لپکاتا ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ ناول کے صفحہ ۱۹۸ پر یہ جملے ملتے ہیں: "ہر واقعہ کا ایک اثر ہوتا ہے۔ اور واقعات کے مجموعے کا اثر صرف اثرات کا مجموعہ نہیں بلکہ اجتماع واقعات ایک نیا تاثر بھی ساتھ لاتا ہے۔ نئی کیفیت یا نئی کمیت یا نئی رفتار پیدا ہو جاتی ہے۔ یا پھر ان میں کوئی دو یا تینوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔" ناول نگار کا واقعات کے نئے تاثر اور نئی رفتار کے متعلق یہ خیال بالکل صحیح ہے۔

زیر نظر ناول میں سب سے اہم چیز کردار نگاری ہے۔ ناول نگار نہ صرف انسانی شعور کا غواص ہے بلکہ اسے فطرت انسانی سے بھی گہری واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ اور اپنی اس واقفیت سے اس ناول میں پورا مصرف بھی لیتا ہے۔ اتنی سی بات تو ہم جانتے ہی ہیں۔ کہ ناول میں وہی کردار آنے چاہئیں جن کی حرکت ناول کی ہیئت کو مجموعی طور پر متاثر کرے یعنی ان کے افعال اور مکالمے اتنے بچے تلے مناسب موقع اور برمحل ہوں کہ ہمیں یہ واضح طور پر محسوس ہو سکے کہ اس کی ضرورت تھی، اور جیسے ہی ارتقائے پلاٹ میں ان کی ضرورت باقی نہ رہے۔ انھیں اپنا فرض ادا کر کے قارئین سے فوراً رخصت لے لینی چاہئے۔ ان کے اندر بے جا مکالموں کا خبط بھی نہیں ہونا چاہئے۔

ناول میں جس طرح سے کردار روشناس ہوتے ہیں اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو وہ جسے ہم بلا واسطہ یا سوانحی طریقہ کہتے جس میں ناول نگار

اپنے کرداروں کے ساتھ ان ہر طرح کی مشغولیت میں شریک ہو کر آخر میں ان کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ دوسرا وہ جسے ہم بالواسطہ یا ڈرامائی طریقہ کہتے ہیں۔ اس طریقۂ پیشکش میں ناول نگار اپنے کو علحدہ رکھتا ہے اور ایک کردار دوسرے کردار کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتا ہے۔

اسی طرح ہماری روزانہ زندگی میں جس طرح کے انسان ملتے ہیں اسی طرح کے دو خانوں میں بٹے ہوئے لوگ ناول میں بھی ملتے ہیں۔ ایک وہ کردار جو پختہ عادت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن غبی ہوتا ہے۔ حالات بدل جائیں وہ اپنی خو نہیں بدلتا۔ ایسے کردار سپاٹ (Flat) کہلاتے ہیں۔ دوسرا کردار وہ ہوتا ہے جو حالات کے اعتبار سے اپنی خو بدلتا رہتا ہے ایسے کردار مرکب (Compound) کہلاتے ہیں۔ اب یہ ناول نگار کی صلاحیت و صلابت پر منحصر ہے کہ وہ کیسے کردار پیش کرے اور جس طرح کے کردار اور جس وقت تک ان کی ضرورت ہے وہیں تک انھیں رکھتا ہے یا نہیں۔

حسرت تعمیر میں یوسف محبوب ہیرو کی کردار نگاری میں جس طرح اس کی شخصیت کو تہوں تک ناول نگار پہونچاتا ہے۔ یہ اس کی بڑی اعلیٰ و برتر کردار نگاری کا ثبوت ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی ناول میں "ایک شیطان" کو پیش کیا ہے۔ جس سے ملنے کے بعد وہ ہمیشہ قاری کے دل میں اپنی بے پناہ قوت عمل اور شیطنت کی وجہ سے کھٹکتا رہتا ہے۔ ہم اخلاقی نقطہ نظر سے اسے خواہ کچھ ہی سمجھیں لیکن اس کا ناٹا قد، اس کی بول چال، اس کی صلاحیت تنظیم، توڑ جوڑ، ہیرے بازی، کچھ اس طرح ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ کہ ہمیں تاب لاتے ہی بنتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یوسف محبوب کو ناول نگار نے بہت قریب سے اور ایک اچھی خاصی مدت تک دیکھا ہے۔ چنانچہ فنکار کا مشاہدہ ہے۔ اس کی دور رس نکتہ رسی اور جزئیات بینی کا ملکہ ہے یوسف کی داخلیت کی نفسیاتی عقدہ کشائی ہے۔ جو یوسف کی شخصیت کو ہمارے لئے چیزے دیگر بنا کر سامنے لاتی ہے۔ ناول نگار محبوب کے حرکات و سکنات اور الفاظ اور جملوں کی تحلیل کرکے اسے ہمارے سامنے کھڑا کردیتا ہے۔ دیکھو یوسف محبوب یہ ہے جو میں دکھاتا ہوں۔ وہ نہیں جسے سرسری اور عام نظر سے تم دیکھتے رہتے ہو۔

ناول نگار ہمیں بتاتا ہے کہ یوسف محبوب ایک کمپاؤنڈر کا بیٹا ہے کمپاؤنڈر صاحب پر اور بھی گھریلو ذمہ داریاں تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم واجب ہی واجب کرا سکے۔ اور اس سے زیادہ ان کیلئے ممکن بھی نہ تھا۔ یوسف نے شادی کے بعد اپنی سسرال کی مدد سے ٹھیکہ داری شروع کی اور پھر روپئے اس کے پاس سیلاب کی طرح آگئے۔ آگ کی طرح اس کی شہرت اور کاروبار پھیلا اور جس طرح لکڑی جل کر کوئلہ اور کوئلہ جل کر راکھ بن جاتا ہے اسی طرح محبوب کی دولت مردشوں کی نذر ہوئی اور جب دولت ختم ہوئی تو شہرت بھی اپنا دامن سمیٹ کر علحدہ ہوگئی۔ اور جب شہرت ختم ہوگئی تو یوسف محبوب زندہ رہ کر بھی مرگیا۔

یہ تو مختصر اور مجمل سی زندگی کی حالت ہوئی جناب یوسف محبوب کی اور اس میں کوئی خاص بات بھی نہیں کیونکہ اس طرح کے کردار سے ہم زندگی اور فن دونوں میں واقف ہیں۔ لیکن اصل چیز اب دیکھئے، جس سے ناول نگار کے مشاہدہ کا ثبوت ملے گا۔ ناول نگار کی نظر میں یوسف محبوب گہرے سانولے رنگ، تیز عقابی مگر دھنسی ہوئی آنکھیں اور ترشی ہوئی بلند پیشانی، ریہل دار کھوپڑی میں پکے گھونگھریلے بال تھوتھنی نما ناک۔ اور لانبے سے جبڑے کا نام ہے۔ اور اب یوسف محبوب کی جزئیات اور ان سے جو نتیجہ ناول نگار اخذ کرتا ہے ان کی داد دیجئے۔ لانبی ناک اور لانبے جبڑے نے چھوٹے سے قد والے کی شخصیت کو پس منظر میں پھینک دینے کی بجائے اسے اور نمایاں کردیا تھا۔ ٹائٹ پینٹ اور ٹائٹ شرٹ میں اس کی بوٹی بوٹی چمک رہی تھی۔ چست و چالاک عضلات برق تپاں دماغ کے نہایت ہی شریک کار معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو کے وقت اس کی گردن ہمیشہ تنی اور سنجیدہ رہتی ہے۔ جو اس کی خود پسندی اور پندار کا پتہ دیتے۔ اس کے چہرے کے نچلے حصہ کی ترتیب سے قدرے مسخرگی اور قدرے حماقت

کا انعکاس ہوتا تھا۔ دیکھا نا آپ نے ناول نگار کتنا عمیق مشاہدہ کرتا ہے
جزئیات کی پرت کی بھی وہ تحلیل کرتا ہے۔ اور اسی محنت کی وجہ سے اس
کے فن میں ایک نئی بات پیدا ہوتی ہے۔

یہ تو بوس محبوب کے خط و خال سے متعلق باتیں ہوئیں۔ اب بوس
محبوب جو باتیں کرتا ہے۔ ان سے اس کے کردار پر جس طرح روشنی پڑتی
ہے وہ بھی دیکھتے چلئے۔ وہ بولتا ہے۔

(۱) خیال فرماتے ہیں آپ تجارت کی وسعت ...... اور (۳) کے ذریعہ
دولت کمانے کے امکانات کتنے لامحدود ہیں۔ مگر افسوس بھائی جان آپ
نہیں جانتے میں بد نصیب آدمی ہوں۔ بندھا ہوا ہوں بندھا ہوا!"

(۲) ہمارا نظام تعلیم قطعی لغو ہے۔ ناکارہ مگر خوش پوش نوجوانوں کے
بنانے کی کل...... اعلیٰ تعلیم محض عیاشی ہے۔ بی اے پاس لڑکوں کو
پیسہ بنانا نہیں بتایا جاتا ہے۔ شاعری اور فلسفہ سیکھنے سے کیا حاصل
شیکسپیئر اور ملٹن سے زیادہ ضروری چیز بازار کا بھاؤ"

(۳) میری ہمت افزائی گھر پر نہیں ہوتی۔

(۴) بھائی جان! بوس نے مجھے مخاطب کیا۔ میں چونک پڑا کاش کوئی ایسی
کل نکلتی جس سے چاندنی کا یہ ذخیرہ بھی استعمال کیا جاتا۔ کیا چاندنی
سے کوئی غازہ یا پاؤڈر تیار نہیں کیا جا سکتا، وہ مسکرانے لگا۔ مون
کریم یا مون بیم پاؤڈر، کیا چاندنی صرف شاعروں کے خیالی تعیش کیلئے ہے

(۵) رومانیت تو دراصل ایک عورت جیسی ہوتی ہے۔ اٹھلاتی ہوئی عورت
نہ ملے تو پھر ندی کو ہی اٹھلاتی ہوئی بتا کر خود فریبی کے ذریعہ غم غلط کرتے ہیں

(۶) کاش میں چھوٹا ناگپور کی ہواؤں اور چاندنیوں کو بھی ٹین کے
ڈبوں میں بند کر کے دساور بھیج سکتا۔

(۷) دامودر ندی کو دیکھ کر بوس محبوب کہتا ہے۔ "یہ ندی نہیں ہے
بھائی جان! بجلی ہے بجلی، پتہ پتہ پر قمقمے جلاؤ، پاور! پاور!
پاور!"

اس طرح کتنی مثالیں دی گئیں۔ یہ بوس محبوب کے اس وقت
کے خیالات تھے۔ جبکہ اس کی غربت امارت سے بدل چکی تھی۔ وہ سنج د
کامرانی کی انتہائی بلندیوں کو چھو چکا تھا۔ اس لئے اس کی باتوں میں
غرور کی بو بھی آتی ہے۔ وہ تجارت کے علاوہ ساری چیزوں کو بیکار
محض سمجھتا ہے۔ فضول! لیکن اوپر کی ساری مثالوں میں صرف ایک
ہی مختصر سا جملہ ملے گا۔ جس میں وہ دکھی نظر آئے گا۔ اور وہ یہ کہ
اس کی ہمت افزائی گھر پر نہیں ہوتی۔ بیوی کا گھر مالدار تھا اس
لئے وہ دینا نہیں جانتی تھیں۔ بوس محبوب سسرال ہی کی بدولت
سرمایہ بناتا ہے۔ لیکن اس کی انانیت کسی نہ کسی شکل میں بیگم پر فتح
حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ دوسری شادی کرتا ہے۔ اسے
دوسری شادی کی اسے کسی طرح ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ویسے بھی بے
شمار مرغیاں، رنڈیوں کی شکل میں اس نے پال رکھی تھی۔ اس لئے ناول
نگار دوسری شادی کے سلسلے میں بالکل صحیح نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ
عقد ثانی کے عمل سے اس کے پندار کو تسکین ہو گئی تھی۔ نئی شادی کے
عمل سے اس کا نفس اس یقین کامل کی منزل تک پہونچ گیا۔
کہ وہ ایک ذی اقتدار سرمایہ دار ہے۔"

لیکن کچھ دنوں کے بعد بوس محبوب کی نیز اپنی محبت کا نشہ ہرن ہو
ہے۔ اب زعم زر حالات کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ حقائق اب اس کے
سامنے آجاتے ہیں۔ وہ بقول ناول نگار صرف کمپاؤنڈر سے کیمسٹ نہیں
وہ ہر معنی میں ابن الوقت ہے۔ وہ خود مشین کی پیداوار ہے۔ وہ ہر شعبہ
میں بے استاد رہ جانے کی وجہ سے ناقص رہ گیا ہے۔ بوس جنگلی پودے
کی طرح بڑھا ہے۔ اور وہ بھی پہاڑ کی چوٹی پر، طوفانوں کے درمیان
چھٹ بنائے ہوئے، یہ بالکل صحیح ہے لیکن جب اس کی زندگی میں
شکست و ریخت شروع ہوتی ہے تو اس کی زندگی اور اس کے نظریے
بھی پلٹا کھاتے ہیں۔ اب چاندنی اس کے لئے محبت کے خیالات لاتی ہے
اسے لطیف درد بخشتی ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے۔ "صرف بیوپار سے خوشی
نہیں ملتی دولت سے عورت خریدی جا سکتی ہے۔ محبت نہیں اور
بغیر محبت عورت ایک لاش ہے۔" اس کا یہ شکستہ دل ہمیں اس کی
شخصیت کو اور عزیز تر بنا دیتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی چند اور کردار ملتے ہیں۔ مثلاً مسٹر پیارے سے ہے جو جیغل خوری میں ماہر ہے۔ جمیل انور ہے جو خط، لکھنؤ اور پنجاب کا حسین امتزاج یعنی لفافہ اور تختی ہے۔ کرسچین لڑکی سے شادی کرنیکی خاطر عیسائی بن جاتا ہے۔ بیگم نجو امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اپنی ہر بات کا پاس رکھتی ہیں۔ وہ بہن کو دوسری شادی کرنیکی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن جب بہن محبوب بیٹے کا درد دل آنسو بند کرکے زمین پر لیٹ کر پھانسی لگا لیتا ہے تو اس کے اس جیل کپٹ میں بھی انہیں نفع نظر نہیں آتا اور وہ اپنی شدت انکار کو کچھ کم کر دیتی ہیں۔ مسز شمیشر ہیں جنہیں کار سے بڑی محبت ہے۔ چونکہ وہ بچپن ہی میں آغوش مادر سے محروم ہو گئی تھیں۔ اور ان کے والد ہمیشہ اپنے موٹر ہی کی پچھلی سیٹ پر کھلونوں، ٹافیوں، نارنگیوں اور باجوں کے ساتھ انہیں لیے پھرتے ہیں۔ اس لئے کار کی پچھلی نشست جو ان کیلئے انا اور نرسری کی حیثیت رکھتی تھی جوانی میں بقول ناول نگار کاروں کی دائمی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ سید شاہ فراست حسین عرف ننھو میاں ہیں۔ جو مخصوص پرانے تہذیبی ورثے کو سینے سے لپٹائے رہتے ہیں اور تجربے کی حفاظت اپنی دولت اور جان سے زیادہ کرتے ہیں۔ میر گھوسی ہیں جو مقدر کی پیروی کیلئے جتنے عیب درکار ہیں ان سے آراستہ نظر آتے ہیں۔

منظر اور سلمی سوگیتی دراصل وہ کردار ہیں جو ناول نگار کے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ منظر اپنی خالہ کے حکم کی وجہ سے سلمی سوگیتی سے شادی نہیں کر پاتا ہے۔ اور سلمی سوگیتی خود منظر کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی خالہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ منظر کے دامن میں اگر سلمی ٹک جاتی تو اس سے ان دونوں کی زندگی میں بڑی رونق آجاتی پھر بھی یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے اپنے دلوں میں بڑی قدر رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ ان دونوں کے سیاسی نظریے بھی مختلف تھے لیکن مطمح نظر ایک تھا۔ انسانیت کی خدمت

اس سلسلے میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ ناول نگار نے چھوٹا ناگپور کے اراؤں اور منڈا کے قبیلوں کے کرداروں کو منفرد طور پر نہیں بلکہ ان کے مجموعی تاثر کو پیش کیا ہے۔ اور اسی کی ضرورت بھی تھی۔ ان سادہ قبیلوں میں اپنی زمین سے محبت کا نقشہ کرما کے آخری سیدل کی تصویر کشی کے ذریعہ جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ وہ بڑا پر اثر ہے۔ نقل مکانی کے وقت راموٹینگا کی بیوی اپنی سوریا کے بچے کو ٹلیوں سے جس والہانہ طور پر نکال کر لاتی ہے وہ انسان دوستی کی ایک دلکش اور حسین تصویر ہے ہم ان قبیلوں کے افراد کو دیکھ کر گویا چھوٹا ناگپور کے ادیباسیوں کی خصوصیات سے کماحقہ واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول نگار کے تنقیدی شعور اور احتیاط کا نتیجہ ہے کہ وہ طوالت سے کام نہ لیکر ہمیں ان کیفیتوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔ جو ہم چاہتے ہیں۔ اور یہی چیز اگر کسی کمتر فنکار کے ہاتھ میں پڑتی تو اسے بے اعتدالیوں کے شکار ہو جانے کا شدید خطرہ لاحق رہتا۔

لہذا ہمیں ناول کے مطالعہ کے وقت اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ گو ناول اپنی ہیئت کے لحاظ سے غیر محدود نظر آتا ہے اور ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ناول نگار جس چیز کو جتنی طوالت سے پیش کرنا چاہئے اسے اس کی آزادی ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اسے پلاٹ کی ترکیب و تنظیم میں داخلی اور منطقی ربط کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے اسے بعض ایسے پسندیدہ ٹکڑوں کو بھی حذف کرنا پڑتا ہے۔ جو اسے ذاتی طور پر بہت زیادہ پسند خاطر ہوتے ہیں۔ فضا نگاری دراصل پیش کئے جانے والے واقعات کی وہ ادا ہے جو قاری کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور کسی باب کی فضا ہی اس باب کے قصے کے رنج و غم یا انبساط و مسرت یا حیرت و استعجاب کے تاثرات میں اضافہ کرتی ہے کیونکہ فضا نگاری بے مقصد حسن کا اظہار نہیں ہوتی۔ یہ چراغ راہ ہے۔ جس کی روشنی اور ضیا تابی واقعات کے دھندلکے اور اندھیارے کو اس طرح منور و تاباں کر دیتی ہے۔ جس کہ قاری کی منزل متعین اور اس کی ذہنی مسافت بے راہ روی سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ اس ناول کی حسرتیں ہماری ہمتوں کو جوان کرتی ہیں ہمارے کانوں میں یہ صدا ہو بجاتی ہے۔ کہ کائنات ابھی ناتمام ہے

مظہر امام

اختر اورینوی کا بہترین افسانہ

ہمارے یہاں ایک بزرگ ہیں —— وقار عظیم صاحب۔ اُردو افسانے پر بطورِ خاص شفقت فرماتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون ہے —— "ہمارے مختصر افسانے میں زندگی اور فن کا امتزاج" جس کے ذریعہ یہ انکشاف ہوا ہے:

"یہ بات ۱۹۳۴ء کے آخر یا ۱۹۳۵ء کے پہلے کی ہے کسی ادبی مجلس میں اچھے افسانہ نگاروں کی فہرست مرتب کی جا رہی تھی۔ اس وقت پریم چند زندہ تھے۔ ان کے نام سب سے پہلے لکھا گیا۔ پھر علی عباس حسینی کا۔ سجاد حیدر، سلطان حیدر جوش، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، اور حامد اللہ افسر کے نام پیش ہوئے، لیکن انہیں لکھا اس لیے نہیں گیا کہ ان کی افسانہ نگاری کا دور ختم ہو چکا تھا..... غرض پریم چند کا نام لکھا گیا، پھر علی عباس حسینی کا، اور اس کے بعد نئی پود کے لکھنے والوں میں اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور اشک کے نام۔ پھر کرشن چندر اور ان کے ہم عصروں کے نام، جن میں احمد علی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی سب شامل تھے۔ جس وقت یہ نام لکھے گئے ہیں ترقی پسندی کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی۔"

اس اقتباس کا پہلا جملہ ہی محلِ نظر ہے۔ خیر اسے جانے دیجئے ہمارے تنقید نگاروں کی بدنصیبی یہ ہے کہ جب تک وہ ہر پیراگراف میں اس پانچ نام نہ گنوا لیں، ان کا جائزہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے وقار عظیم صاحب کو یہ دُھن ہے کہ جہاں اردو افسانے کا تذکرہ آیا وہ اختر انصاری اور حیات اللہ انصاری کو موقع محل کا خیال کئے بغیر ضرور گھسیٹ لائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۹۳۴ء کے اواخر تک پریم چند اور علی عباس حسینی باقاعدگی سے لکھ رہے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ اختر اورینوی، اپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، احمد علی اور ایک حد تک اختر انصاری بھی اپنے وجود کا احساس دلا چکے تھے۔ اس وقت تک حیات اللہ انصاری کے دو چار افسانے منظرِ عام پر ضرور آ گئے تھے۔ لیکن ان کا نام کسی فہرست میں شامل کئے جانے کے قابل نہیں ہوا تھا، اور نہ ۱۹۳۵ء سے پہلے کرشن چندر، منٹو، بیدی اور ندیم کے کسی افسانے کی اشاعت ہوئی تھی۔ عصمت کا افسانہ تو پہلی بار ۱۹۳۸ء

میں شائع ہوا۔ اس لئے "۱۹۳۶ء کے آخر" میں ان کے نام کو کوئی نجومی ہی لے سکتا تھا۔ یہاں وقار صاحب کو شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہوگی کہ جب بیدی، کرشن، عصمت، ندیم وغیرہ نے لکھنا شروع کیا، ترقی پسندی کی تحریک "باقاعدہ طور" پر" شروع ہو چکی تھی۔

وقار عظیم کے مندرجہ بالا بیان میں کئی غیر ذمہ دارانہ باتیں سہی، لیکن اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند اور علی عباس حسینی کے دوش بدوش افسانہ نگاروں کی جو نئی پود ابھری، اور جس نے اردو افسانے کو حقیقت نگاری کی نئی پیچیدگیوں اور فنی نزاکت کی نئی بلندیوں تک پہنچایا اس میں اختر اورینوی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے، اور یہ اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ بیدی، کرشن چندر، اور صفِ اول کے دوسرے بہت سے افسانہ نگار اختر اورینوی کے بعد آئے اور انہوں نے اورینوی کی جلائی ہوئی شمع سے کسی نہ کسی شکل میں اخذِ نور کیا۔

اختر اورینوی کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ اس لئے ان کے قلم کی جولانیاں ادب کی مختلف اصناف میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں ڈرامہ، ناول، تنقید، تاریخ، تحقیق، شاعری (غزل، پابند نظم، آزاد نظم) —— کس کس کا ذکر کیا جائے۔ نیاز فتح پوری کے علاوہ ہمارے ادب میں شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہو جس نے اتنے اصناف پر "مشق" کی ہو اور حسبِ توفیق داد بھی وصول کی ہو۔

اختر اورینوی کے بارے میں جب بھی میں نے سوچا، وہ ہمیشہ ایک افسانہ نگار ہی کے روپ میں میرے سامنے آئے ہیں۔ اگر ادیب کی شخصیت اور اس کی تحریروں میں ہم آہنگی ہو تو وہ تحریریں تخلیق کا درجہ پاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اورینوی کی شخصیت کا بھرپور اظہار ان کے افسانوں ہی میں ہوتا ہے۔ ایک پڑھے لکھے، ذہین ادیب کے لئے یہ کام کچھ اتنا مشکل نہیں کہ وہ مختلف اصنافِ ادب سے شوق کرکے اپنے "قادر الکلام" ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔ لیکن تخلیق جس طرح علم، مطالعہ اور نظر کے بغیر بے جان ہے۔ اسی طرح صرف علم، مطالعہ اور نظر کا امتزاج ہی اچھی تخلیق کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

اختر اورینوی کے بیشتر افسانے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے۔ انہوں نے تینتیس ۳۳ سال کی مدت میں کم و بیش سو افسانے لکھے ہوں گے۔ ان کی افسانوی تخلیقات کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اورینوی کے افسانے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے نادیدہ جہانوں کی تلاش و جستجو کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دنیا اپنے موضوعات کے لحاظ سے بڑی وسیع اور متنوع ہے۔ یہ افسانے کسی مقید فضا میں سانس نہیں لیتے۔ ان کا خمیر زندگی سے اٹھایا گیا ہے اور زندگی کہیں دور خلا کے اندھیروں میں پرواز نہیں کرتی۔ وہ انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہنستی اور مایوسیوں میں آنسو بہاتی ہے۔ اورینوی کے زندگی آمیز اور زندگی آموز افسانوں پر ایک ہمہ جہت اور پُر وقار شخصیت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں علم، مطالعہ اور نظر کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ فنکار کی انفرادیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ کے لئے قصہ کی دلکشی ضروری سہی، لیکن جب تک افسانہ نگار کو زندگی کے پیچ در پیچ مسائل کا علم نہ ہو، جب تک حیات و کائنات کے مظاہر کا اس نے مطالعہ اور مشاہدہ نہ کیا ہو، اس وقت تک بحیثیت فنکار، وہ اپنے لئے ایک ممتاز اور پائیدار مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اختر اورینوی صرف و محض ایک قصہ گو یا داستان سرا نہیں، وہ زندگی کے نباض بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ایک نکھری ہوئی توانائی کا پتہ دیتے ہیں۔

وقار عظیم نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اختر اورینوی کے افسانوں کے دونوں مجموعے "منظر و پس منظر" اور "کلیاں اور کانٹے" بہار کے

دیہاتوں کی اس زندگی کے مرقعے ہیں جس میں سیاسی
اور نئے معاشی مسائل نے طرح طرح کی پیچیدگیاں
پیدا کی ہیں، لیکن ان دیہاتوں کے علاوہ شہر کے
متوسط طبقے کے بعض کرداروں کی زندگی کا مطالعہ
بھی انہوں نے اسی سیاسی اور معاشی پس منظر
میں کیا، اور اسے افسانوں کے ذریعے زندگی
بخشی ہے۔"

وقار عظیم نے اپنے کئی مضامین میں اختر اورینوی کو دیہاتی زندگی، خصوصاً بہار کی دیہاتی زندگی کے عکاس کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

وقار صاحب اردو افسانے کے سب سے معتبر نقاد سمجھے جاتے ہیں۔ لہذا ان کی بات پر شبہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اورینوی کے افسانے پڑھنے کی زحمت نہیں فرمائی، لیکن اپنی جگہ یہ امر حیرت انگیز ضرور ہے کہ انہوں نے اورینوی کے افسانوں کو "دیہاتی زندگی کے مرقعے" کیسے کہا جب کہ ان کے بیشتر افسانے شہری زندگی کے معاشی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اختر دیہات کے رہنے والے ہیں۔ ان کی سسرال بھی ایک قصبے میں ہی ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی سے اپنے افسانوں میں اغماض بھی نہیں برتا، لیکن ان کے مجموعوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شہری زندگی سے زیادہ مانوس ہیں۔ دیہاتی زندگی اور اس کے عوامل سے وہ بے خبر اور بے نیاز نہیں لیکن شہری زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں کا مطالعہ اور مشاہدہ انہوں نے زیادہ دلچسپی سے کیا ہے۔ "شگو رداد" اور "سینی ٹوریم کا فقیر" اگر گاؤں کے کردار ہیں، تو "جونیئر"، "ٹائپسٹ"، "کوٹھے والا" اور دوسرے بہت سے کردار شہری زندگی سے آئے ہیں۔

اورینوی نے اردو ادب کو کئی عمدہ افسانے دئے ہیں۔ "آخری الٹی"، "پس منظر"، "کلیاں اور کانٹے"، "انار کلی" اور "بھول بھلیاں"، "کواڑ کی اوٹ سے"، "پندرہ منٹ"، "اندھیرے سائے" وغیرہ۔ میں نے اس فہرست میں "کیچلیاں اور بال جبریل" اور "سپنوں کا دیس" کو قصداً شامل نہیں کیا، کیوں کہ انسان کی تخلیق اور کائنات کی تنظیم کا ماجرا ہونے کے باوجود یہ تخلیقات ان لوازمات سے عاری ہیں جو افسانے کو افسانہ بناتی ہیں۔ انہیں ارتقائے آدم سے متعلق الوہی اور انسانی نظریوں کی انسائیکلوپیڈیا کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں افسانہ کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے۔ بہرحال، یہ آپ کی مرضی پر ہے کہ آپ انہیں بھی اورینوی کے بہترین افسانوں کی فہرست میں شامل کر لیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بہترین قرار دینے کے لئے صرف اپنے ذوق اور پسند کی رہنمائی کافی نہیں ہوگی۔

محمد حسن عسکری نے اب سے بیس بائیس سال پیشتر "میرا بہترین افسانہ" کے نام سے اردو کے نئے افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ افسانہ نگار خود اپنا بہترین افسانہ منتخب کریں۔ خالق کے لئے اپنی بہترین تخلیق کا انتخاب کچھ زیادہ ہی دشوار ہوتا ہے، اس لئے محمد حسن عسکری کو اپنے مقصد میں کما حقہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کوشش میں اردو کے چند بہت اچھے افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب ہو گیا۔ اس کے لئے اختر اورینوی کا قرعہ فال "انار کلی اور بھول بھلیاں" کے نام نکلا ہے۔ ویسے وہ خود اس انتخاب سے مطمئن نہیں معلوم ہوتے۔ اسی مجموعے میں اپنے حالات زندگی لکھتے ہوئے انہوں نے "کلیاں اور کانٹے" کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور اس ضمن میں کنہیا لال کپور کی رائے بھی درج کی ہے۔ لاہور میں کپور سے اختر اورینوی کی ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو میں کپور نے یہ کہتے ہوئے کہا کہ "کلیاں اور کانٹے" اردو افسانے میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے، اورینوی کو مشورہ دیا کہ اب وہ ناول لکھا کریں۔ الفاظ صحیح یاد نہیں۔ مفہوم کچھ ایسا ہی تھا۔

اختر اورینوی کا پہلا ناول "حسرتِ تعمیر"، اس گفتگو کے کم و بیش بیس سال بعد شائع ہوا۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو، لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "کلیاں اور کانٹے"، کنہیا لال کپور کی رائے اور اختر اورینوی کی ناول نگاری میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی تُرب ضرور ہے میرے اس خیال کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اورینوی نے اپنے ناول کا عنوان (شاید نیم بھی) "کلیاں اور کانٹے" سے ہی لیا ہے، جس میں ایک کردار کہتا ہے:

ہم لوگ کشتیٔ شکستہ پر، سندباد جہازی یا رابن
سن کروسو کی طرح صحت گاہ کے صحرائی جزیرے
میں بیٹھے سنسار سے الگ تھلگ، انتظار کی دی ہوئی
آگ سینوں میں لئے بڑی بھلی اپنی ایک چھوٹی سی
دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لاانتہا
"حسرتِ تعمیر" بھری ہوئی ہے۔"

"کلیاں اور کانٹے" اسی حسرتِ تعمیر کی کہانی ہے۔ موت کے بھنور میں گھرے ہوئے انسانوں کی یہ کہانی زندگی سے والہانہ پیار کی روئداد بھی ہے۔ زندگی کتنی بے رحم ہے! — اسے اپنانے جاؤ تو وہ موت کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیتی ہے۔ اپنے گھر، اپنے عزیز و اقارب سے دور، زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دق اور سل کے مریض — زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے حصول کے لئے بے قرار۔ نرسیں، ایک غیر آباد علاقے میں، انسانی ہمدردی کی مشعلیں لئے، مریضوں کی تاریک زندگی میں روشنی لانے کے لئے شب و روز مصروف۔ لیکن جب وہ خود اپنی اُداس تنہا زندگی کو روشن کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو دق اور سل کے کیڑے ان کے پھیپھڑوں سے چمٹ جاتے ہیں!

غلام عباس کی "آنندی" ہی کی طرح "کلیاں اور کانٹے" بھی کسی فرد یا چند افراد کی کہانی نہیں، ایک ماحول کی داستان ہے۔ اس میں کوئی مخصوص کردار نہیں۔ یہ کسی ایک ہیرو یا ہیروئن کی رودادِ حیات کا کوئی ورق نہیں۔ ویسے اس افسانے میں کئی کردار اہم ہیں اور ان گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش بھی بڑی خوبی سے اُجاگر ہوا ہے۔ سینی ٹوریم کے ماحول اور فضا کی عکاسی اور اس ماحول میں رہنے والے افراد کی نفسیاتی کش مکش، زندگی کے بارے میں ان کا رویہ، ان کے محسوسات اور احساسات کی جتنی مکمل مصوری اس افسانے میں ہوئی ہے، اُردو کے کسی اور افسانے میں نہیں ہوئی۔ سینی ٹوریم کی زندگی اور ماحول سے اُردو افسانہ ناآشنا رہ جاتا اگر اختر اورینوی نے اس افسانے کی تخلیق نہ کی ہوتی۔ اگر اورینوی کے فن کی کشیدہ قامتی دیکھنا ہو تو اس افسانے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں اگر "کلیاں اور کانٹے" کو اورینوی کا بہترین افسانہ کہتا ہوں تو اس کے اسباب یہی ہیں۔

اختر اورینوی نے اس افسانے میں زندگی سے مایوس اور موت سے خائف انسانوں کے نفسیاتی نشیب و فراز کا نہایت گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ایک مخصوص ماحول کی ہر فردگی اور جزدی کیفیت اس افسانے میں ابھر آئی ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کے بے شمار نقش ہماری نگاہوں کے سامنے بنتے اور مٹتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طوالت کے باوجود افسانے کا تسلسل اور دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔

اختر اورینوی کو اپنی سماجی زندگی میں خطابت اور تقریر سے خاص شغف ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی یہ کمزوری کہیں کہیں در آئی ہے۔ اور فلسفیانہ افسانوں میں تو خطابت اور تقریر کی گنجائش ہے ہی۔ لیکن "کلیاں اور کانٹے" میں ایسا کوئی عیب نہیں۔ مکالمے کہیں غیر فطری نہیں ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ افسانہ مصنف کے ذاتی تجربات کا آئینہ دار ہے۔ زبان سادہ ہونے کے باوجود شاعرانہ اور دلنشیں ہے جس کی شگفتگی اور روانی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔

اس افسانے میں نادرہ کار اور معنی خیز تشبیہات کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے ہوا ہے۔ چند مثالوں سے آپ بھی

لطف اٹھائیے:

(۱) ہر صبح اُٹھ نرسیں ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھیں۔

(۲) وہ یوں افقِ نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔

(۳) گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کی طرح خشک ہو جاتی تھیں۔

(۴) وہ اتنی بار ٹی۔ بی۔ ٹی۔ بی کا وِرد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی بے حقیقت ہو جاتی تھی، جیسے مُلّا کی تسبیح پر گھومے گھومتے خُدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔

(۵) ڈولی (نقی کے ساتھ) اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا

(۶) ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیسا کھیاں استعمال کرتے ہیں۔

(۷) بادِ شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالاتِ ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطفِ پرواز حاصل کرتے ہیں۔

(۸) نقی اس کی (داشیری کی) سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔

(۹) سیگی گھر یلو چکّی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی

(۱۰) وہ چلتی تھی جیسے اسپِ تازی "قدم" چلتا ہے۔

عورت کے پُرشباب سینے کی تعریف میں ادبا، وشعراء ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں اور اس کے لئے طرح طرح کی تشبیہیں اور استعارے تراشے گئے ہیں۔ اُبھرے ہوئے سیبوں کی تشبیہہ سے کے چھلکتے ہوئے پیالوں سے دینا کوئی نئی بات نہیں ہے، اور ان کے لئے "خُم" کا استعارہ ہی کوئی نیا پن رکھتا ہے۔ لیکن اختر اورینوی نے ایک نرس کے سینے کو ــــ "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردِ افگنِ عشق، قسم کا خُم" ــــ کہہ کر جو ندرت پیدا کی ہے، اس کی مثال کم از کم اُردو ادب میں تو نہیں ملتی ــ نہ مہدی افادی کے یہاں، نہ سجاد انصاری کے یہاں۔

"کلیاں اور کانٹے"، کا ایک کردار کرتن ایک جگہ کہتا ہے:

"خدا اور شیطان نے ملکر انسان کا بھرکس نکال دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور شیطان کے درمیان بٹ گیا ہے۔"

جمیل مظہری نے کئی سال بعد اسی خیال کو اس طرح ادا کیا:

ع

خُدا و ابلیس کی شراکت میں چل رہا ہے یہ کارخانہ

اس افسانے میں اختر اورینوی نے زندگی اور انسان کی بابت اپنے نقطۂ نظر کا اظہار بھی فلسفیانہ انداز میں کیا ہے:

"انسان میں کتنی الوہیت ہے۔ وہ ہر آن اپنے آپ کو بچوانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذّتِ آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔"

زندگی، کائنات اور خدا کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش اورینوی کے نئے افسانوں میں زیادہ نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ "کیچلیاں اور بال جبریل" اور "سپنوں کا دیس"، فلسفیانہ اور سمبانک طرزِ نگارش کے نمونے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ افسانے، فنِ افسانہ کے جدید تقاضوں کو پورا کرتے ہیں یا نہیں[عہ]، ان کے مطالعہ سے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ فلسفہ کو بھی افسانہ بنانے کے امکانات موجود ہیں۔ اس طرح کی ایک آدھ کوشش نیاز فتح پوری کے یہاں ملتی ہے اور نسبتاً زیادہ بھرپور انداز میں جمیل مظہری کے یہاں ــ ان کے افسانے "ایک سوال" میں۔

افسانے کا مقصد کسی واحد تاثر کا نقش ابھارنا ہے۔ افسانہ نگار اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک ایسی فضا کی تخلیق کرتا ہے جس سے قاری کا ذہن اس واحد تاثر کو قبول کرلے۔ ابتدا، عروج اور انجام کی "پلاننگ" کی جاتی ہے۔ کم و بیش ہر افسانے میں خواہ وہ کسی بھی ٹیکنک میں لکھے گئے ہوں، کسی

عہ مذکور افسانے جدید ترین تقاضوں ہی کو زیادہ پورا کرتے ہیں۔ (ادارہ)

نہ کسی شکل میں اسی ڈھانچے کو ہی اساس بنایا جاتا ہے۔ کہنے کو تو یوں بھی فنی لحاظ سے کامیاب افسانے تخلیق پا گئے ہیں جب افسانہ نگار نے "۸۶" لکھنے کے بعد، کسی واضح خیال کے بغیر ہی افسانہ لکھنا شروع کر دیا ہے، لیکن اسے کوئی کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ افسانے جن میں بظاہر کوئی پلاٹ نہیں ہے (اور باضابطہ پلاٹ کا ہونا جدید افسانے کی ضروری شرائط میں داخل بھی نہیں) کسی منظم پلاننگ کے بغیر وہ نقشِ واحد قائم نہیں کر پاتے جو افسانے کا مقصد ہوتا ہے۔ "کلیاں اور کانٹے" نظم و ترتیب کا نہایت دلآویز نمونہ ہے۔ اس افسانے کے پہلے جملے سے "وہ تعداد میں نو تھیں، گوری، سانولی، گوار اور ناگوار" سے لے کر آخری جملے (جسے کیتھرین نے ادا کیا ہے)۔

"انور بابو! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا، بس ایک گڑیا، ایک گڑیا، ایک گڑیا" تک آپ کو ایک بہاؤ، ایک ارتقا، ایک سلسلہ اور ایک ترتیب کا احساس ہوگا۔ اور نیوی کے افسانے "محشر" میں یہ نو نرسیں "کلیاں اور کانٹے" کے خالق سے شکایت کرتی ہیں۔

"فن کار بابو! آپ نے ہمیں بس ایک گڑیا کیوں بنایا؟ اور وہ بھی خوبصورت نہیں!"

یہ شکایت بجا ہو یا بے جا۔ لیکن اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ بحیثیت فن کار اختر اورینوی نے اس افسانے میں اپنے آس پاس کی زندگی کے ان پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے جو ان کے قریبی مشاہدہ کا جزو ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں انہوں نے زندگی کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا ہے۔ اس لئے یہ افسانہ بہار کے ایک سینی ٹوریم کی روداد ہونے کے باوجود عالمگیر انسانی زندگی کا المیہ بن گیا ہے۔ یہ افسانہ کوئی ایسا شخص لکھ ہی نہیں سکتا تھا جس نے زندگی کا مطالعہ ایک مخصوص پس منظر میں تمام دکھال جذبات کے ساتھ نہ کیا ہو، اور جس نے خود زندگی کو چھوا اور چکھا نہ ہو۔ خالی خولی لفاظی، کچھ عبارت آرائی، کچھ انشا پردازی، کچھ فلسفہ موشگافی۔ ایسے افسانے کی تخلیق نہیں کر سکتی۔

اردو کے بہترین طویل مختصر افسانوں کی فہرست بنائی جائے تو شاید اس میں ان کچھ ناموں سے زیادہ کے اضافے کی گنجائش نہ ہوگی :-

"زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) "ان داتا" (کرشن چندر) "کلیاں اور کانٹے" (اختر اورینوی) "ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد" (احمد ندیم قاسمی) "دن سنیاں اور صدیاں" (عزیز احمد) "آنندی" (غلام عباس) —

بقیہ :- اختر صاحب کا تنقیدی رجحان

یا ادیب بے حد حساس ہوتا ہے۔ اگر جذباتی بھی۔ حسن اور اسکی دلکشی بھی اسکو اسطرح متاثر کرتی ہے۔ جسطرح حالات کی گرانباری بہ فنکار کی فطری حسن پرستی یا جمال پسندی ہوتی ہے جو کسی تجربہ یا مشاہدہ کو حسین و دلکش انداز میں منظرِ عام پر لانے کے لئے اُکساتی ہے۔ اختر صاحب کا خیال ہے کہ "آرٹ کی تخلیق و تعمیر میں کارفرما غالب قوت جبلت جمال ہوتی ہے۔ یہی آرٹ کو اُسکی لطیف روح اور اس کا حسین جسم عطا کرتی ہے۔" (قدر و نظر ص ۱۳۴)

لطیف روح سے میری مراد نازک دلکش معنویت حسین جسم سے مراد پرکشش اور دلفریب اندازِ بیان یا ذریعۂ اظہار۔ آرٹ میں دراصل داخلی انفرادی اور خارجی حسن کاری کا سبب یہی جبلت جمال ہے۔ ایسے تو جمال پسندی ہر شخص میں ہوتی ہے لیکن فنکار ہر معنی میں عام انسان پر فائق ہوتا ہے۔ اور اسلئے یہ عنصر بھی اس کے یہاں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ فن کی تزئین و آرائش جتنی زیادہ کی جاتی ہے اس میں اتنی ہی زیادہ کشش اور جذبہ و احساس کی آنچ پیدا ہوتی ہے۔ حسن اور نکھرتا ہے۔ اگر اس ذوقِ جمال کا عنصر اس کے مزاج میں فطرۃً علاوہ کے لحاظ سے بھی نہ ہو تو پھر وہ شاعرانہ خصوصیت اور اعلیٰ فنکارانہ دلفریبی پیدا نہیں کر سکتا، اور یہ چیز کسبی نہیں وہبی ہے۔ مشق و ممارست عروض و بلاغت پر تو قدرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ذوق جمال پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سلطان احمد

فنکار اور اس کا فن

رنگ گورا، بدن چھریرا، قد بلند و بالا، یہ فراخ پیشانی، یہ طالع ارجمند، یہ آواز، یہ بولی، یہ کہانی کس کی ہے؟ بابا تری گھڑی میں بولتا ہے کون؟ ایک نوجوان، جس کے جوان ہوتے ہی جان کے لالے پڑے۔ اس کے عزیز و قریب تیمارداری سے تھک گے۔ وہ خود اپنی جان سے تنگ و بیزار ہوا اور معالجوں کی برداشتہ۔ مگر زندگی مسکرائے، بفضلِ ربی صحت پائے تعلیم سے فارغ ہوئے اور حصولِ معاش میں کامیاب۔ اپنے فرائض اور دین دنیا کی خدمتوں میں لگے اور صدی کے دوسرے نصف میں بھی اقدام کی برکتوں اور فکر کی جولانیوں سے بہرہ ور رہے۔ تو واقعہ افسانہ سے زیادہ حیرت انگیز کیوں نہ ہو؟ واقعی لرزتے ہوئے دلوں کی تمنائیں اور مالکِ حقیقی سے عاجزانہ التجائیں وہ بھی کر سکتی ہیں، جو عقل و دانش میں نہ آئیں اس عالم کی سب سے بڑی حیرت یہ ہے کہ انسان اتنا ظاہر پرست ہے کہ وہ ان واقعات کے باوجود صرف اسباب کو دیکھتا ہے۔ مسبب الاسباب کو نہیں۔ دعاؤں میں اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر حقیقتوں سے سرشار ہو جائے۔ لیکن ان کے اثر اور مقبولیت کی حقیقتوں سے غافل رہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

بتاؤ یہ سب کھایا علم، کہ لفظ کُن سے فیکون کا منظر سامنے آ گیا؟ حرکت سے زندگی اور خیال سے سخن پیدا ہوا، آواز حرکت میں آئی اور گویائی سخن میں، سخت تیز و رواں اور سست نرم و نازک۔ اسی آمد سخن میں شعر، نغمہ، افسانہ اور سب کچھ جو جادو جگائے اور دلوں کو مسخر کرے۔ اپنا اپنا راگ اپنی اپنی دھن۔ فن کی مہارتیں اور بیان و کلام کی صورتیں مختلف ہوں لیکن خیال ہی کے جلوے سب میں نمایاں اور روشن ہوتے ہیں۔ فسانہ مختصر طویل جو بھی ہو اگر اثر نہ ہو تو کچھ نہیں۔ حکایت کی لذت اثر میں ہے۔ اکثر طوالت کے باوجود اثر کو ڈھونڈو وہ نہیں ملتا اور کبھی چند جملوں ہی میں پکار اٹھے۔ یہ لگن کی بات ہے، سخن جب خون جگر سے پیدا ہو تو دل نواز اور دل نشین ہوتا ہے۔ اب ستار ہو یا ستارہ، ایک نغمہ، ایک ہی سرود اور اختر نہ ساز ہے، جس میں نغمہ ہے اور سرور بھی۔ بس چھیڑ دو اور دیکھو، کیا نغمہ ہے کیا سرود۔ افسانے میں کون چھپا ہے، جلوہ گری کس کی ہے؟ شخصیت پکارے، انفرادیت

نعرے لگائے کہ یہ سخن ہے، یہ جانِ سخن۔

ہماری زبان میں مختصر افسانوں کے استاد منشی پریم چند تھے۔ انہوں نے اس فن میں جو کمال دکھایا، وہ انہیں کا حصّہ تھا۔ افسانوں کی اولیت وطول نویسی میں کسی کو فوقیت حاصل ہو۔ لیکن چھوٹے چھوٹے موثر مضامین، غریبوں دیہاتوں کی زندگی اور انسانی سوز وگداز کی جو تصویریں پریم چند نے کھینچی ہیں، ان کا رنگ دروغن کہیں نہیں ملتا۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت ہر طرف پھیلی۔ پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کی کثرت میں ظاہر ہوئی۔ مذاقِ سخن میں تبدیلی ہو اور فن کی ترکیب، تشکیل، ہیئت اور صورت میں کتنا ہی فرق پایا جائے، پھر بھی رسائی فکر، رجحانِ طبع اور میلانِ فن کے اعتبار سے یہ سب پریم چند کے گلشنِ بہار کی خوشہ چینیاں ہیں[1]۔ خواہ کرشن چندر کی جہانبانی ہو، یا عباس کی جہاں بینی، بیدی کی نکتہ دانی، منٹو کی بیباکدستی اور اختر کی حق شناسی، یہ تمام واردات ایک ہی رشتۂ فکر سے متعلق ہیں۔ سب نے خونِ جگر اور درد مانا سوزی سے کام لیا۔ اپنی مشق ہے اور اپنا بیان سرچشمہ قائم اور نہریں جاری۔ فسانوں کو کسی رنگ میں رنگو، وہ ہر رنگ کو قبول کرے اور اجاگر ہو۔ جلوے کی تابانیاں گویا خواب کی تعبیریں ہیں کتنے جلوے ایسے بھی ہیں جو نظروں میں سمائیں، خیالوں میں آئیں مگر تعبیروں کو ترسیں۔ یہ فن کار جانیں اور ان کا فن

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

فسانوں کے اسی دورِ قمر میں ستارۂ اختر طلوع ہوا۔ اپنی فلک کا اشارہ پاکر وہ ساحری صفت سامنے آیا۔ اس کی چمک کی ساحرانہ کشش میں بعض کرنوں سے ایسی شعاعیں بھی نکلیں، جن سے فکر وفن کے علاوہ تبلیغ وہدایت کی ضیا باریاں ہوئیں۔ کیونکہ وہ صرف اختر شماریوں کی لذتوں کا قائل نہیں۔ ایک مشنری کا دل وجگر رکھتا ہے اور دلوں اور حوصلوں سے کام لینا جانتا ہے۔

یہی وہ معنوی ربط وتعلق ہے جو استاد فن اور مبلغ کے خط وفکر کو مستقیم کرتا اور آگے کھینچتا ہے۔ کیونکہ پریم اور اختر کے درمیان کوئی خلا نہیں ہے۔ ایک نے سوتے کو جگایا اور متاثر کیا۔ دوسرے نے جرأت دلائی اور راہِ عمل دکھائی۔ پہلے متوجہ ومتاثر کرتے ہیں، پھر دل کی لگن اور کام کی دھن ہوتی ہے۔ ورنہ حسرتِ تعمیر اور سپنوں کے دلیس میں کیا دھرا ہے۔ اس لحاظ سے اختر کی بساط زیادہ وسیع وورانہ ہے۔ اس کی جلوہ نمائی وسعتوں میں پھیلی، نتیجۂ میں وہ رس اور ہمہ گیر ہے۔ بمقابلہ پریم چند کے جن کی کہانیاں سمٹی سمٹائی اثر میں ڈوبی ہمارے سامنے ضوفگن ہوتی ہیں۔

بلاشبہ فن کی یہ کامیابی نمایاں اور شاندار ہے۔ مگر مبلغ کی سرگرمیوں میں صحرانوردی کی ہنگامہ آرائیاں رجز خواں ہیں اور تعمیریات کی شاد کامیاں گامزن۔ بظاہر یہ صورت بدیہ دلچسپی ماندہ نظر آئے۔ لیکن دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، انجام کار اپنا اثر دکھلاتی ہے۔ اختر نے اپنے افسانوں میں تبلیغ کی ہے۔ فن کو نوعیت دی ہے۔ آہنگ کو راگ اور زندگی کو تعمیر کا سبق

یہ کوئی راز نہیں کہ عورت دمساز ہے، ہمدم اور نصف ثانی وہ اپنی خوشگواریوں کی بدولت نصف اول سے بہتر، اس کی صورتیں عام ہوں لیکن خانۂ اختر میں خاص الخاص کہ شکیلہ اختر بہتر نصف ہونے میں افسانہ سے زیادہ حقیقت ہیں۔ فنکار کی فن کار اور رفیق کی رفیق، گویا قرانِ السعدین۔ وہ اختر کے سکون وطمانیت کے ساتھ ساتھ ان کے فکر وفن کی گنجائشوں میں سمائی ہوئی ہیں۔ شکیلہ کی خوبیوں میں اختر جلوہ گر ہے اور اختر کی سرگرمیوں میں شکیلہ سایہ فگن ہیں، اور ان دونوں کی مشترکہ توانائیوں سے فن کو غیر معمولی تقویت پہنچی ہے۔

فن کا کمال یہ ہے کہ فنکار اپنے عمل سے مطمئن نہ ہو

---

[1] پریم چند اردو افسانے کی جدید تحریک کے بانی ضرور ہیں لیکن بعد والوں میں ہر افسانہ نگار کو پریم چند کا خوشہ چیں کہنا صحیح نہیں۔ اسلئے کہ ان میں کئی ایک پریم چند سے آگے چلے گئے اور بحیثیت مجموعی وہ ان سے متاثر بھی ہیں۔ (ادارہ)

وہ کمال سے کمال کا خواہاں ہو۔ اختر کے فنی رجحان کا یہ عالم دیدنی تھا کہ دہلی کی ایک افسانوی تقریب سے پہلے، وہ اپنے افسانوں کے کچھ سال کرداروں کو کھوج کھوج کر تبع کرتے ہیں[1] اور فن کی خصوصیات پر پوری آزادی کے ساتھ مباحثہ ہوتا ہے۔ ہمیں کسی بزم خاص کے راز و نیاز کا کیا علم؟ البتہ دور کا جلوہ اجو اس صحبت عزیز کے بیان مجریہ سے ہمیں حاصل ہوا، ظاہر کرتا ہے کہ یہ مذاکرۂ جمیل اپنی جدّت کے علاوہ فن کی بعض خصوصیات کا علمبردار ہوا۔ وہ اپنی وضاحتوں میں پراسرار ہو کہ علم حجاب کا پردہ، بعد قرب کا ذریعہ اور زندگی کی ہر آن متوقع اور پر امید ہوتی ہے۔ لیکن یہ کون بتائے کہ ہر سانس آہ کی گرمی ہے یا واہ کی ٹھنڈک؟

اچھائی سے محبت، مصیبت نہیں مسرت ہے اور بُرائی سے نفرت انسان کی طبیعت۔ آدمی کتنا ہی بُرا ہو، اس کی خلقت بری نہیں۔ اس لئے بُرے کاموں کو وہ بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ عادتوں سے مجبور، اچھائی کا اختیار کرنا مصیبت ہو۔ مگر ہمت سے کام لے تو یہ مصیبت ہی مسرت بن جائے۔ کہتے ہیں شدّتوں میں آنے والی مسرتوں کا مزہ ہے اور لذتوں میں نکل جانے والی حسرتوں کا گلہ۔ حال کی لذت ہی کیا جو ماضی بدامن ہو۔ فکر کا تقاضا ہے کہ آگے دیکھے، پچھلے سے غافل نہ ہو اور آنے والے کا منتظر رہے عقل بھی یہی کہتی ہے، آدمی کا جذباتی ہونا مفید ہے اور مضر بھی۔ دراصل افراط تفریط ہی برائیوں کی جڑ ہے۔ اعتدال صحت اور اچھائی کی دلیل۔ اس زندگی میں تپتے رہنا آدمی کا وہ منصب جلیل ہے جو آزمائش کی شرطوں کو پورا کرتا ہے۔ اور کرد بیان کے لیے قابل رشک۔ پھر خیر ہی خیر اور حسن ہی حسن ہونے میں ہماری منزلت کیا ہوتی ہے؟ ہماری تخلیق بہر وجوہ کامل ہی نہیں اس میں اکمل ہونے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ اس کا احسان ہے۔

ورنہ ہم خیر و حسن کو بس اتنا ہی جانتے ہیں جہاں تک ہماری نظر پہنچے۔ یہ نظر دیکھتی ہی کتنا ہے۔ وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔ آخر وہ بھی اسی جسم کے انجن اور بھاپ سے چلتی ہے۔ آگے کیا بڑھے اور کیا دیکھے۔ یہاں کی ہر شے اپنی ضد سے پہچان میں آتی ہے۔ کمال صفت سے ظاہر ہوتا ہے اور ذات و حقیقت چھپی رہتی ہے۔ کسی شے کا نہ معلوم ہونا اس کی نفی نہیں۔ اور نہ ہمارے ذہن کی کوئی مبہم شکل اس کی اصلی و حقیقی صورت ہے۔ یہ معاملہ صرف اشیاء اور اسماء تک محدود نہیں، ان کے اقدار کے صحیح سمجھنے کی صورتیں بھی مشتبہ ہیں، اور ذات سایہ نما عنقا صفت، یہ جسم خاک میں ملے، آگ میں جلے، ہوا میں اڑے، منتشر و برباد، اس سعی تمام کے بعد جب حضوری حق میں آئے تو ذات کا پتہ چلے اور حقیقت معلوم ہو۔ دم واپسیں کی سرگذشت کتنی ہولناک اور ہوشربا ہو۔ لیکن بہر مستقل کی طلب ترقی کے منافی اور اختیار کا حل کی آرزو قبل از وقت ہے۔ اگر ابن آدم خیر و شر میں نہ پڑے تو اپنی کھوئی ہوئی جنت کیونکر پائے جس کا کھونا بھی اسی تعجیل کا نتیجہ ہے۔ اپنے خالق کی بخششوں اور اس کے کرم کی بارشوں کا شکر کس منہ سے ادا ہو، جو ہماری غلط کاری کو اپنی ستاری سے ڈھانپ لے اور آدمیت کو اس درجہ نوازے اور وہ مرتبہ بخشے کہ اپنے عطیہ کو صلہ بنا دے۔ اس رحم کی بخشش میں کرم کی دو گونہ لذتیں ہیں کہ نقص و خامیوں کے باوجود اعمال کی قبولیت کو نیتوں پر منحصر رکھا اور اپنے عطیہ کو ہمارے لیے صلہ کار ٹھہرایا۔ یہ ہے عروج آدم جس سے انجم ہی نہیں فرشتے بھی حیرت میں ہیں کہ یہ خاک کا پتلا تپنے کے بعد کیسا روشن اور کتنا قریب ہو گیا۔

---

[1] رسالہ آج کل، دہلی شمارہ اگست ۶۲ء میں اختر صاحب نے اپنے افسانے "محشر خیال" میں اپنی افسانوی تخلیقات کا ایک دلچسپ جائزہ پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں زندگی کے متعلق اپنے کچھ فنکارانہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ (ادارہ)

انسان کی عظمت اس کے زورِ کلام میں نہیں، نرمیٔ کلام اور پاک باطنی میں ہے۔ اختر کا احتسابِ عمل اس کی بڑائی کا ثبوت ہے وہ تخیل کی وسعت رکھتا ہے اور تعمیل کی گنجائش۔ اس کے فن کے شاہکار ہونے کی یہی ضمانت ہے اور یہی خصوصیت اس کا طرۂ امتیاز کوئی الٹا سیدھا نہ دیکھیے، پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ کون سیدھا ہے کون الٹا۔ جامعہ ہفت رنگ کی زیبائشوں میں اگر الٹے سیدھے کی تمیز نہ ہو، بلکہ اس کی ابھری بناوٹ، چمک دمک کے موٹے نشان اور خط و لکیر کی پُرپیچ کشش کا شیدائی الٹے ہی کو سیدھا سمجھ لے، تو اس کی جدت پسندی دوسروں کے نزدیک خفت کا باعث ہوگی اور وضعداری کے ساتھ بیداری بھی رخصت۔ انسانی اعمال کی کسوٹی پر جانچ اتنی ہی ہے کہ توفیق ہمت سے ہے اور تفوق و برتری اس کی عنایت ہے، صلہ اور ہے انعام اور یہاں جس کی جتنی قدر ہو جائے، غنیمت ہے۔ ورنہ میدانِ حشر اور میزانِ عمل کی ضرورت کیا تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب تک خوف اور محبت مسخر نہ ہو جائیں حقیقتوں کا راز نہیں کھلتا۔ جلووں کا قرب مل جائے، قرب کا جلوہ نہیں ملتا۔ کچھ یاد ہے اس جلوہ کی ایک ذرا سی تابش نے کیا کیا؟ وادیٔ مقدس کا پہاڑ جل اٹھا اور کلیم اللہ کے ایسے جلیل القدر بندہ اور نبی علیہ السلام جن کی نظریں پہاڑ پر جمی ہوئی تھیں، آن واحد کی لپک میں غش کھا کر گر پڑا۔ اس لئے ذات کا تصور اسی قدر ہو سکتا ہے کہ اس کی مثال نہیں۔ وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہے اور بس۔ ذات کا تصور کچھ بکر ہو، جب اس کی شرط نقد جان ٹھہری۔ خرابی کی یہ صورت ہی ہماری تعمیر کی بنیاد ہے۔ نئی تعمیر کے لئے پرانی عمارت گراتے ہیں۔ اس عالم میں ہمارا پتے رہنا اسی بنا پر ہے۔ کہ ہمارے اندر تسلیم و رضا کی کتنی صلاحیتیں پیدا ہوئیں اور ہم اس کی بخششوں کے کس درجہ امیدوار ہیں۔

نوٹ جتنا غور کرو اتنا ہی یاد۔ اختر کی ضیا بدایوں

یں فکر کی شعاعیں روشن ہیں۔ فسانوں میں حیات کی بیتابیاں ہیں۔ اور اقدام کی سرگرمیاں۔ قدم بہ قدم، منزل بہ منزل آہستہ اور محتاط چلنے والے ہی زندگی کے مقابلوں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اقدام کی تیزی سے پہلے اپنی طاقت کا اندازہ رخ کا درست اور سمت کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔ اختر شناسی میں فن کے قطب نما نشانات ملتے ہیں۔ ان کا مطالبۂ عمل ہمیں یہ بتاتا ہے کہ افکار کی تصویروں کا رنگ روپ ہی قابلِ توجہ نہیں۔ حرف دیکھنا نہیں، سننا یہ ہے کہ وہ کیا بولتی ہیں؛ گویا تصویریں گویا ہیں کہ وہ تاثر کو پیدا، میلان کو ظاہر اور جذبے کو موجزن کرتی ہیں۔ اور گویائی ہے کیا؟ ہم خیالات بھی ایک زبان ہے۔ اور افسانہ ایک حربۂ سلامتی، جو بڑے بڑے معرکے فتح کرے، تسخیر کا متلاشی، ہلاکتوں سے متنفر۔ اس کی نغمہ جانیں میں نہ خونریزی نہ اتلاف جان۔ وہ امن پسند اور ترقی پسند۔ اختر کے سرگم میں ایک مدھم آواز یہ بھی ہے کہ افسانے کا ایک نہ ایک بول پیامی ضرور ہو۔ یہ ٹیپ کا بند ہے، جو بہانے تڑپائے اور دوڑائے۔ اس کے بغیر افسانہ کتنا ہی رنگین و طرفہ تماشا ہو اس پھول کے مثل ہے، جس میں شادابی و جاذبیت کی فراوانی ہو مگر خوشبو نہ ہو کہ مشامِ جاں بنے اور گلے کا ہار ہو۔ افسانہ زندگی کی حرکت ہے اور حیات کا تراز وہ نہ ساکن ہے نہ خاموش۔ اس کو دوڑنا چاہیے اور گونجنا تاکہ حرارت پیدا کرے اور سرگرمی دکھلائے۔ زندگی کو مشغول رکھے اور مشغولیت کو زندہ ••

طیب عثمانی (ندوی)

اختر ارینوی کا نظریۂ فن

ادب میں نظریۂ فن کی حقیقت کو اقبال نے اپنے ایک سادہ سے شعر میں بڑے بلیغ انداز سے پیش کیا ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اختر اورینوی کے نظریۂ فن کا چراغ بھی بڑی حد تک اقبال ہی کے ادبی و شعری نظریہ سے فروزاں ہے۔ اختر کا ذہنی پس منظر بھی نہ صرف یہ کہ اقبال سے متاثر ہے بلکہ اس کے ذہنی افق پر جدید و قدیم کے ویسے ہی ستارے روشن ہیں جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ اختر کے یہاں بھی ہمیں جدید علوم کی گہرائی، اُن کی پرکھ، حُسن و قبح کا صالح معیار ویسا ہی ملتا ہے، جیسا اقبال کا ہے۔ ساتھ ہی زندگی کا ایک واضح تصور، اخلاقی اقدار کا احساس، مذہبی نقطۂ نظر اور زندگی سے اس کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ باتیں اختر اورینوی کے نظریۂ فن کو ایک انفرادیت اور یگانہ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اختر اورینوی کے نظریۂ فن کا تفصیلی جائزہ لیں، فن اور نظریہ کی حقیقت پر چند باتوں کا اظہار مناسب ہے۔

فن کی حقیقت تک رسائی کے لئے ہمیں کائنات کی جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ کائنات پر جب ہم ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں حُسن کے مختلف جلوے نظر آتے ہیں۔ فطرت نے اس جہان رنگ و بو میں وہ گل بوٹے کھلائے ہیں اور زمین نے اپنی کوکھ سے حُسن کے وہ خزانے اگلے ہیں، جو نگاہوں کے لئے جنت اور ہمارے لئے باعثِ مسرّت ہیں۔ ہر سال بہار کا موسم اپنی پوری رنگینیوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس کے علاوہ آسمان پر جھلملاتے ہوئے ستارے، چاند کی تابانی، آبشاروں کی روانی، کوہ و صحرا، دشت و دریا، یہ سب حُسنِ فطرت کے جلوۂ صد رنگ ہیں، جنہیں دیکھ کر نہ صرف یہ کہ ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے ہمیں روحانی مسرت اور فنی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

انسان جو فطرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ فطرت کے ان حسین مناظر سے متاثر ہو کر اس کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے، اور وہ اس دنیا کے بنانے اور سنوارنے میں ویسے ہی انہماک اور دلچسپی کا ثبوت

دیتا ہے، جیسے خود خدا کا عمل اس پر سایہ فگن ہو۔ انسان کے تخلیقی کارناموں نے اس کائنات کے حسن و تابانی میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ انسان کے اس جمالیاتی، تخلیقی عمل ہی کا نام حقیقتاً "فن" ہے۔ فن اظہارِ خیال کی سب سے قدیم شکل ہے۔ اجنتا اور ایلورا کے فنی کارنامے انسان کی حسن کاری کے شاہکار رہے ہیں۔ فن نے انسان کو زندہ رہنے کے آداب سکھائے اور زندگی میں رنگ و آہنگ کی آمیزش سے ایک بہترین زندگی کے خواب دکھائے اور خوب سے خوب تر کی جستجو پیدا کی۔ ہر فن کے پس منظر میں عشق، محبت اور عبادت کے جذبے اور تجربے کے جھلملاتے ہوئے سائے ایک ہوا دہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر عشق و محبت کے جذبے نے تاج محل کی تخلیق کرائی تو عبادت کے جذبے نے انسان سے مجسم ترشوائے، مندر، مسجد اور گرجا بنوائے۔ اس طرح اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو فن کی تخلیق میں قدرت اور انسان دونوں ہی شریک ہیں۔ اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

سفال آفریدی ایاغ آفریدم

فطرت کا وجود خواہ وہ سنگ و آہن کی شکل میں ہو یا مادۂ سیال اور دھاتوں کے روپ میں۔ یہ سب براہِ راست خدا کی قوتِ تخلیق کے مرہونِ منت ہیں۔ اور ان سے صناعت و فن کی تخلیق میں انسانی شعور و عمل اور جذبۂ محبت و عبادت کا دخل ہے۔ فطرت کے اعلیٰ شاہکار سے انسانی فن کے شاہکار وجود میں آتے ہیں۔ خاک و آب اور سنگ و آہن خدا کی تخلیق ہیں۔ اسپین کے خدا پرست فنکاروں نے ان سے مسجدِ قرطبہ اور قصرِ الحمرا کو وجود بخشا، اور اس "حرمِ قرطبہ" کے حسن و جمال میں حکیمِ مشرق اقبال کو کسی "مردِ خدا" کے حسن و جمال کی تخلیق کی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ادب و فن میں جمالیات ایک اہم قدر ہے۔

ادب و فن کے سلسلے میں جہاں جمالیات ایک بڑی قدر ہے۔ وہیں مواد اور نظریہ کی اہمیت، فن و ہیئت کے مقابلے میں بہرصورت زیادہ ہے۔ کوئی فنی کارنامہ نظریاتی مواد کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس طرح ادب کے جمالیاتی پہلو اور نظریئے کے مکمل ہم آہنگی کے بغیر ہم ادب و فن میں حسن اور عظمت کا کوئی تصور نہیں کر سکتے۔ ہمارے کلاسیکل شعراء نے ادب اور فن کا احترام و اہتمام زیادہ کرتے تھے۔ فن اور زندگی میں جو پیچیدہ رشتہ ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کا موضوعِ سخن کم بنتا تھا، وہ الفاظ کی تراش و خراش اور نوک و پلک کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں ترشے ہوئے ہیرے کا حسن ہوتا ہے۔ بلاشبہ الفاظ اپنے اندر لازوال قوت کا خزانہ رکھتے ہیں وہ اپنے معنی و مفہوم کے اظہار میں خلاقانہ حصہ لیتے ہیں۔ اور ان میں حسن کا جادو جگانے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے لیکن خیال و معنی، حرف و صوت سے بہرحال زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ الفاظ کی بامعنی ترتیب کا مقصد حقیقتاً خیال کی شمعیں روشن کرنا ہے۔

ادب و فن میں نظریہ کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر و فکر کی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا یہ قول بھی پر صداقت ہے کہ "ادب کی عظمت صرف ادبی معیاروں سے نہیں جانچی جاسکتی گرچہ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ادب کے عدم اور وجود کو صرف ادبی معیاروں ہی سے پرکھا جا سکتا ہے۔" نظریہ کا لفظ جب ہم بولتے ہیں تو اس میں عقیدہ اور عمل دونوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ایک اچھے ادیب و شاعر کے یہاں ایک نظریۂ زندگی کا احساس ضروری ہے بلکہ جو ادیب و شاعر زیادہ باشعور ہوگا اس کے یہاں نظریہ کا تصور زیادہ مربوط، مکمل اور ایک نظامِ زندگی کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ میرے نزدیک اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ باشعور نظریہ اور ایک

نظامِ حیات کے ساتھ اپنے اندر کمالِ فن، اندرونی ربط، موزونیت اور نفاست سب کچھ بدرجۂ کمال رکھتے ہیں۔

اچھا ادب ہمیشہ باشعور ہوتا ہے۔ اس میں صرف تلقین نہیں ہوتی، وہ انسانی زندگی کے پیچ و خم اور جذبات و افکار کے زیر و بم سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ انسانی دکھ سکھ، آرزوؤں، امنگوں اور کامیابیوں، ناکامیوں، عزائم اور حوصلوں کی نہ صرف یہ کہ جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر یقین کی گرمی، ایک نظامِ حیات کی روشنی اور مقصد کو پانے کی توانائی بھی پائی جاتی ہے۔ ایسے ادیب و شاعر کے لئے نظریہ نعرہ بازی کا نام نہیں رہتا بلکہ اس کے احساسات، جذبات، جمالیاتی حس، اخلاقی قدر، سماجی ذمہ داری، یہ سب کچھ اس طرح ہم آمیز ہوتے ہیں کہ اس کی تخلیق ایک زندہ، متحرک صداقت بن جاتی ہے۔ یہی صداقت ایک شاعرانہ ادبی اور ابدی صداقت میں نمودار ہوتی ہے۔ اس طرح نظریہ ایک دیدۂ بینا بن جاتا ہے، جس سے زندگی کے حقائق پر نظر ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد ہی ہمارا "زجاج" "حریفِ سنگ" بن سکتا ہے۔

ادب و فن میں جب نظریہ کا ذکر آتا ہے تو بعض ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس پر پریشان یا پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقیقتاً ادب و فن میں نظریے کے معنی ایک شعور کے سوا کچھ اور نہیں، اور شعور کا اظہار جب کبھی ہوگا اس کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی نظریے کی کارفرمائی ضرور ہوگی۔ اس طرح نظریہ کسی باشعور احساس ہی کا پرتو ہوتا ہے۔ ادب کے مختلف اصناف میں نظریے کے اظہار کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، تنقیدی ادب تو نظریوں کا ادب ہی ہوتا ہے۔ ہاں تخلیقی ادب میں نظریہ ہمیشہ پس پردہ ہوتا ہے۔ ادبی تخلیق میں جب فکر، جذبہ

بن جاتا ہے تو اس سے فنِ لطیف و جمیل وجود میں آتا ہے بقول آل احمد سرور "صرف فکر کی روشنی سے فن کی محفل میں چراغ نہیں جل جاتے، فن بہار وہ ایک فانوس ہے جو شمعِ فکر کو حسین و دلپذیر بناتا ہے۔" آج کی یہ پیچیدہ اور نظریاتی دنیا میں فکر اور اس میں نظریے کی تلاش ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر زندگی میں نظریات کی ضرورت ہے تو ادب میں بھی نظریات کی گنجائش باقی رہے گی، جس سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ادب میں نظریہ کی اہمیت کو اقبال کی شاعرانہ صداقت نے اس طرح اظہار کیا ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود....
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس سائنسی دور میں جب کہ "ہر دم متغیر ہیں خرد کے نظریات" یہ حقیقت زیادہ ابھر کر سامنے آگئی ہے کہ زندگی کی طرح ادب میں بھی ایک مثبت نظریہ کی ضرورت ہے۔ 'نظریہ' کے بغیر ادب ایک سادہ و بے رنگ پھول ہے، یعنی ادب میں وہی پھول خوش رنگ و دلکش ہیں، جو اپنے اندر نظریے کی خوشبو رکھتے ہیں۔

ادب، فن اور نظریہ پر اس اظہارِ خیال کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے سامنے تینوں کی صحیح حقیقت واضح ہو جائے تاکہ آئندہ ہم اختر اورینوی کے نظریہ فن پر گفتگو کرتے ہوئے ادب کے جمالیاتی، اخلاقی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

اختر اورینوی کے نظریہ فن پر براہ راست اظہارِ خیال سے پہلے مناسب یہ ہے کہ ہم اختر کے ذہنی پس منظر اور فکری نظریہ کا جائزہ لیں۔ کسی شخصیت کے فن پر گفتگو سے پہلے اس کے فکر کا تجزیہ ضروری ہے۔ فن کے ارتقا اور فنی اقدار کی تشکیل میں فکر کی کارفرمائی رہتی ہے۔ اختر اورینوی کے ذہنی پس منظر میں مذہب و اخلاق اور جمالیات

دونوں کی جڑیں بہت گہری دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک "جمالیات" کا تعلق ہے اس کا ہم ان کے نظریۂ فن اور "فنی اقدار" کے سلسلہ میں تفصیل سے جائزہ لیں گے، اس وقت ہم اختر اورینوی کے اُس ذہنی و فکری پس منظر کا پتہ چلائیں جہاں مذہب و اخلاق کی شمع فروزاں ہے۔ اختر اورینوی کے ذہن و فکر کی تعمیر میں مذہب و اخلاق کا بڑا حصہ ہے۔ اختر نے زندگی کے مطالعہ میں سنجیدگی اور گہرائی سے کام لیا ہے۔ آج کل کے متنوّر ذہن کی طرح مادی زندگی کی دلفریبیوں اور سائنسی انکشافات و ایجادات کی جھلملاہٹ نے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں کی ہیں جیسا کہ ابتدا ہی میں، میں نے یہ عرض کیا ہے کہ اختر اورینوی نے زندگی کے حقائق کا مطالعہ اقبال ہی کی طرح مغرب میں ڈوب کر کیا ہے۔ نئے علوم اور سائنس پر غور و فکر سے انہیں کائنات کا علم بھی ہوا ہے۔ اور اپنا عرفان بھی! اختر اورینوی کے سامنے یہ حقیقت روشن ہے کہ سائنس نے جہاں فطرت کی طاقتوں کو عریاں کیا ہے۔ اور جس کے پیچھے کوئی اخلاقی قدر نہیں رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ع

اسی کے بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ بے پناہ طاقت ہمارے لئے رحمت بھی ہے اور لعنت بھی! ایسے حالات میں زندگی کی شب تاریک کو سحر میں تبدیل کرنے کے لئے ایک ایسے نظام حیات کی ضرورت ہے جو زندگی کو حقیقی امن اور سکون بخش سکے۔ اسی حقیقت کے ادراک نے اختر اورینوی کے ذہن کی تعمیر کی ہے۔ ان کے ذہنی افق پر جدید افکار و نظریات کے ساتھ اسلامی اخلاق و روحانیت کے روشن ستارے بھی جھلملا رہے ہیں۔ اختر اورینوی کے نزدیک اسلام کی طاقت ایک زندہ اور متحرک طاقت ہے اسلامی انقلاب نے نہ صرف یہ کہ دنیا کے اکثر انقلابوں کو متاثر کیا ہے بلکہ آئندہ بھی اس کے امکانات ہیں، کہ ایک بار پھر دنیا اپنے کو اسلامی انقلاب کی گود میں ڈال دیے اور جارج برنارڈ شا کا یہ قول صادق آئے کہ آئندہ ساری دنیا کا مذہب صرف اسلام ہوگا۔ اس حقیقت کا اظہار اختر اورینوی نے بہت واضح طور پر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"ہر چند کہ یہ اسلامی انقلاب اجتماعی طور پر میدانِ کربلا میں حسین کے ساتھ شہید ہو گیا لیکن بہ حیثیت فلسفۂ حیات یہ اب تک زندہ و پائندہ ہے۔ اور ہمیشہ تہذیبوں اور انقلابوں کو متاثر کرتا رہا ہے۔ بالواسطہ طور پر انقلاب فرانس اور انقلاب روس کو متاثر کیا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ مستقبل کے عالمگیر انقلاب کو اسلامی تصورِ حیات و نظام معاشرہ شدید طور پر متاثر کرنے والا ہے۔"

(ادبیات عالم ـ تنقید جدید از اختر اورینوی)

اس حقیقت کو زیادہ واشگاف لفظوں میں اور صراحت کے ساتھ دوسری جگہ یوں کہتے ہیں۔

"قبل اس کے کہ میں ادب کے متوازی سلسلے کو پیش کروں، میں نہایت ہی اہم امر کو پیش کرنا چاہتا ہوں نظام معاشرۂ انسانی کو متاثر کرنے والے، انقلابات فرانس اور روس کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر انقلاب عرب کو لوگ بھول جاتے ہیں۔ اسلام کے انقلاب نے بہ یک وقت دو شہنشاہیتوں کا خاتمہ کیا یعنی قیصریت اور کسرائیت کا۔ اس انقلاب عظیم نے انقلاب فرانس سے صدیوں پہلے عصر کہن کے کھنڈروں کو خشت و سنگ سے پاک کرنے کے بعد نئے قدروں کی عمارت بنائی تھی۔ اسلام کا انقلاب بورژوائی انقلاب نہیں تھا، اور نہ پرولتاری بلکہ صحیح معنوں میں انسانیت عظمیٰ کا انقلاب تھا۔ اس نے خلافت الٰہی کو دنیا میں قائم کیا۔ نیز مادیت و روحانیت، انفرادیت و اجتماعیت میں صحیح توازن پیدا کر کے اس نے اخلاقی معیار پر جمہوریت انسانی کی بنیاد ڈالی۔"

(ادبیات عالم ...... تنقید جدید از اختر اورینوی)

اختر اورینوی کے ذہن و فکر پر اسلام کے سائے بڑے گہرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ذہنی افق پر مذہب و اخلاق کی پرچھائیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اسی چیز نے ان کی ادبی تخلیقات میں روشنی و تابندگی پیدا کی ہے اور ان کے ادبی نقطۂ نظر میں تعمیری انداز اور اسلامی نظر کے نقوش ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام نے کیا ادبی انداز نظر پیدا کیا ہے۔ اس کے بارے میں اختر اورینوی کے ذہن میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ وہ صاف لفظوں میں اس کا اظہار کرتے ہیں کہ

"اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی اس معیار فن کی بنیاد ڈال دی تھی۔ جو معیار آج رائج ہو رہا ہے یعنی فن برائے زندگی، نہ کہ فن برائے فن۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فنون مروجہ جو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زندگی کی پھوٹتی کونپل کے لئے مضر سمجھے گئے، ممنوع قرار پائے۔ اسلام مقصدی فن کا قائل ہے، فن برائے تعیش کا نہیں، بلکہ فن برائے فلاح انسانیت

فنون کو زندگی کے معیار و منہاج کا تابع ہونا چاہیے۔"
(ادبیاتِ عالم ..... تنقید جدید، اختر اورینوی)

غرض اسلام برائے فن کا مخالف ہے، اور فن برائے انسانیت عظمیٰ کا اسی اسلامی فلسفہ کے مطابق اسلامی ادب نے جنم لیا، اور وہ ایشیا یورپ کو متاثر کرتا رہا۔"
(ادبیات عالم)

اسلام کے اس ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت سے یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ محض ادبی تخلیق جس کے پیچھے کوئی اخلاقی قدر اور بلند مقصد نہ ہو۔ کوئی بلند ادبی تخلیق نہیں ہو سکتی بلکہ ایسا ادب مریضانہ انفرادیت کا شکار ہوتا ہے۔ فن کار صرف عکاس یا نقاش نہیں ہوتا کہ وہ بے سوچے سمجھے اور بے مقصد قلم لے کر لکھنے بیٹھ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ادیب و شاعر کی حیثیت اس کے ادیب و شاعر ہونے سے پہلے ایک ذمہ دار انسان کی ہے۔ یہی ذمہ دارانہ حیثیت اسے بے مہار ہر طرف منہ مارنے اور جو چاہا لکھ دینے سے روکتی ہے۔ ایک باشعور فنکار اپنے ذہن میں زندگی کا ایک وسیع تصور رکھتا ہے۔ اور وہ تصور اسے ایک مقصد کا پابند بناتا ہے۔ ایسے ہی فنکار کی شاعری جزو پیغمبری ہوتی ہے۔ جو انسانیت کی فلاح کی موجب ہے۔ عالمی ادب و فنون پر جب ہم ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت صاف دکھائی دیتی ہے کہ عالمی ادب کے ہر بڑے فنکار کے یہاں اعلیٰ اخلاقی اقدار کسی مذہب یا عقیدہ کے پیش نظر ہی کافی گہری دلچسپی اور ان کی شخصیت میں پیوست نظر آتی ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ اگر کوئی خیال یا عقیدہ خون میں حل ہو گیا ہو اور فنکار کا جذبہ بن گیا ہو، تو اس کی جلوہ گری ہمیں اس کے فنی کارناموں میں ضرور نظر آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام بڑے فنکاروں کے یہاں ان کے یقین و عقیدہ کی تجلیاں اور ان کی روشن زندگیوں کی تجلیاں نظر آ رہی ہیں۔ اسی حقیقت کا اظہار اختر اورینوی نے دوسرے لفظوں میں اس طرح کیا ہے۔

"ادب بھی دوسرے فنون لطیفہ کی طرح اخلاقی قدور کے ذریعہ عظمت و بزرگی کا اکتساب کرتا ہے۔ لیونارڈو ڈی ونچی، رفائیل وغیرہ مصوروں کے کارنامے مذہب عیسوی کی روایت کے سرچشمے سے سیراب ہیں، ہندوستانی مصوری کو لیجئے یہ بھی اساطیر سے اثر پذیر ہے۔ ایک خاص اخلاقی قدر (NORL VALUE) کی نمائندہ ہے۔ بدھ تہذیب کی بت تراشی بھی مخصوص اخلاقی قدر کو پیش کرتی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کا انتہائی عروج بھی مذہب و اخلاق کی مملکت سے جا ملتا ہے۔ پروفیسر لیبان کے بقول

"ہر آرٹ میں مخصوص قومی اخلاق کے جوہر چمکتے نظر آتے ہیں۔" اور میرا خیال ہے کہ فنون کے وہی کارنامے شہرت دوام حاصل کرتے ہیں جو دورِ اجتماع کے سامنے ان اخلاقی قدور کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہومر کی رزمیہ نظمیں، رامائن

اور مہابھارت، شاہنامہ اور مرثیے اخلاقِ اجتماعی سے روحِ زندگی حاصل کرتے ہیں۔" (ترقی پسند ادب ـ تنقید جدید از اختر اورینوی)

اس عہدِ جدید اور سائنسی دور میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث بیکار و بے معنی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا تصور اتنا وسیع رنگا رنگ اور متنوع ہے کہ اس پر ہماری موجودہ زندگی کی پرچھائیں ضرور پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سوائے دورِ انحطاط کے کبھی بھی ادب بے مقصد نہیں رہا ہے۔ آج کا کوئی ادیب و شاعر اپنے سماجی ماحول، معاشی تحریکات، سیاسی حالات، مذہبی عقائد اور تہذیبی رجحانات سے علیحدہ نہیں ہو سکتا، دورِ انحطاط کا ادب غیر مقصدی اور مریضانہ ہوتا ہے۔ یہ سائنس اور عمل کا دور ہے۔ مگر بغیر کسی صالح نصب العین کے جنون ہٹلری ہے اور سائنس بغیر کسی اخلاقی بلندی کے ایٹمی لعنت ہے۔ موجودہ شعر و ادب کی دنیا میں کسی بلند انسانی نصب العین کی تلاش اور اخلاقی اقدار کا تعین کرنا چاہئے۔ اختر اورینوی کا ادبی نقطۂ نظر یہی ہے، وہ پیام اور نصب العین کو زندگی کی زندہ، رواں دواں محسوس کرتی اور سوچتی ہوئی حقیقتوں کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "سخن‌ہائے گفتنی جب جمالیات سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ تو مقصدی ادب پیدا ہوتا ہے۔ ادب ایک صناعت ہے، لہٰذا یہ جمالیات (Aesthetics) کے بنیادی اصولوں کی پیروی آتا ہے، لطافت اور حسن کاری ادب کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔ ادب کا تبلیغی مقصد ادب کے اجزائے حسن و لطافت کے ساتھ شیر و شکر ہوتا ہے۔" (ترقی پسند ادب ـ تنقید جدید)

یہاں سے ہم اختر اورینوی کے مخصوص نظریۂ فن پر گفتگو کی ابتدا کرتے ہیں۔ اب تک ادب، فنی نظریہ اور مقصد کی جو بحث سامنے آئی ہے، اس سے اختر اورینوی کا فکری پس منظر نظریاتی ذہن اور ادب میں ان کے مقصدی اور تعمیری انداز کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام مسئلوں میں اختر اورینوی کا ذہن نہایت صاف، واضح اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج کا ادیب و شاعر "اپنا کوئی نہ کوئی" مقصد خیال اور رجحان رکھتا ہے، بڑا ادیب و شاعر بننے یا ہونے کے لئے بے عقیدہ، بے مقصد اور بے یقین ہونا ضروری نہیں۔ اگر شعر و ادب میں حسن و عظمت پیدا کرنے کے لئے جہاں فن پر گہری نظر درکار ہے۔ تو ساتھ ہی حیات و کائنات کا فکری شعور، ایک عقیدہ کا یقین اور تعمیری مقصد اور نصب العین کا ہونا لازمی ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جو شعر و ادب کو حسن و دل آویزی بخشتے ہیں اور بقائے دوام بخشتے ہیں۔

ان باتوں پر سیر حاصل گفتگو کے باوجود جو بات سب سے زیادہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ ادب کی بنیادی قدر صرف فنی اور جمالیاتی ہے یا فکری اور افادی بھی؟ اس سلسلہ میں اختر اورینوی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب و فن کی بنیادی قدر صرف "جمالیات" ہے، اس چیز نے اختر اورینوی کے فکر و نظر اور ادبی تخلیق میں تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک نظریاتی طور پر ان کا فکری پس منظر اسلام ہے اور دوسری طرف فن کی بنیادی قدر صرف جمالیات کو قرار دینے کی وجہ سے ان کے یہاں ایک طرح کا اضطراب (Confusion) نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکر و فن میں ہم ان کے یہاں وہ ہم آہنگی اور توافق نہیں پاتے جس کی ان جیسے باشعور فنکار سے ہم توقع رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "آرٹ کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ وہ آرٹ ہو، یعنی آرٹ کی بنیادی قدروں کو وہ کامیابی کے ساتھ برتے ہاں اس کا ثانوی مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا ہے!" اختر اورینوی کے اس نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا

چلنا ضروری ہے، ایک ان کا تصورِ حُسن اور دوسرا تصورِ عشق! ان کے نزدیک آرٹ کی بنیادی قدروں میں ایک قدر اگر حُسن وجمال ہے تو دوسری قدر عشق ہے۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "حُسن کے جلوؤں کا انعکاس وانضباط فنونِ لطیفہ کی بنیادی قدر ہے۔ فنونِ لطیفہ میں حُسن کی جلوہ گری، حُسن کاری کہلاتی ہے۔"[۱۱] اس کے ساتھ ہی ان کا خیال ہے کہ "فنکاری کے لیے بے کلی بھی لازمی ہے، حُسن کے ساتھ عشق کا بھی لگاؤ ہے آرٹ کے بنیادی قدروں میں سے ایک قدر "عشق" بھی ہے۔"[۱۲] اور، ان دونوں کی مزید تشریح وتفسیر اس طرح کرتے ہیں۔

حُسن وعشق دونوں کو وسیع معنوں میں سمجھنا چاہیئے فن کے اِن محرکات کو محدود کر دینا مناسب نہیں، مسجدِ قرطبہ ہو یا بدھ کے مجسمے، مریم عذری کی تصویریں ہوں یا نوٹرڈام کے بت، سٹالن گراڈ کی جنگ کی داستان ہو یا شاہنامہ ہو یا رباعیات خیام ہو یا خمریات امرأ القیس ان سب کی بنیادی قدریں تصورِ حُسن اور سوزِ عشق سے وابستہ ہیں۔"[۱۳]

اختر اورینوی کا یہ "جمالیاتی" تصور انتہا پسندانہ ہے۔ اس حیثیت سے ان کا ڈانڈا ان جمالیین سے مل جاتا ہے۔ جو فن زندگی اور معاشرہ انسانی کے لیے جمالیاتی اقدار کو مطلق اور فائق ترین حیثیت دیتے ہیں۔ حالانکہ ادب وفن کے لئے جمالیات ایک اہم قدر تو بن سکتی ہے۔ لیکن سب کچھ "جمالیات" ہی نہیں ہو سکتی یہ سچ ہے کہ ادب کا مقصد براہ راست عمل کی تلقین نہیں بلکہ بالواسطہ عمل کی ترغیب دلانا یا اس پر اکسانا ہے۔ میرا ادبی نقطۂ نظر یہ ہے کہ فکر وفن باہم اس طرح ہم آمیز اور رچے بسے ہوں کہ دونوں کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچا جا سکے۔ فکر وفن — جس میں جمالیات بھی ایک اہم قدر ہے دونوں فکر ادب کے روئے تاباں پر نکھار اور دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ اختر کے یہاں حُسن کا مفہوم ومعنیٰ اپنے اندر بہت ہی وسیع انداز رکھتا ہے۔ کائنات میں بکھرے ہوئے تمام ہی حُسن اختر کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں حسن کی جلوہ آرائیوں سے فیضیاب ہوتے ہیں اُن کے نزدیک ادیب وشاعر کے لئے کوئی حدود وقیود نہیں۔ کائنات کا ہر حُسن نگاہوں کے لئے جنت ہے اور اس سے آرٹ کی تخلیق ممکن ہے، ان کا کہنا ہے کہ

"آرٹ کی تخلیق کے لئے ایمان شرط ہے۔ خواہ یہ ایمان ذرہ پر، ستارے پر، پھول پر یا حسین آنکھوں پر، شرابِ طہور پر یا آبِ انگور پر، خودی پر یا خدا پر۔"[۱۴]

"ایک حسین عورت، ایک حسین منظر، ایک حسین خیال ایک حسین عمل، ان سب میں حُسن کی قدر مشترک ہو سکتی ہے۔"[۱۵]

"نسائی حُسن ہو یا منظری حُسن، شمیم گیسو ہو یا نکہت گل، سینہ کی بلوریں گولائی ہو یا ماہ تاباں، ان میں حُسن کی قدر مشترک موجود ہے۔" (ادب وفن کی بنیادی قدریں۔ قدر ونظر از اختر اورینوی)

نتیجہ یہ نکلا کہ حُسن کے یہ تمام جلوے فنکار کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں اور ان سے آرٹ کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں حُسن کے ان جلوؤں کے اظہار کے پس منظر میں اخلاقی حدود واقدار کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ ادب وفن میں حُسن کے ان جلوؤں کے اظہار کے پس منظر میں اخلاقی حدود واقدار کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ ادب وفن میں حسن کے اظہار کی بے قید چھوٹ فنکار کو اس مریضانہ جنسیت اور لذت پرستی کا شکار بنا دے گی۔ جس کا خمیازہ آج کی نئی نسل بھگت رہی ہے۔ اور آج نہ صرف فرائیڈ زدہ شعرا، وادباء بلکہ پوری نئی نسل کے اعصاب پر عورت اور جنس سوار ہے۔

آج کا یہ اخلاقی مزاج موجودہ انسانی تاریخ میں ایک انتہائی
ناپسندیدہ اور مضر حادثہ ہے۔ جس کے ناخوشگوار اثرات سے
نئی نسلوں کے ذہن زہر آلود ہو رہے ہیں اور ان میں ذہنی وفکری
اور اخلاقی مزاج برپا ہے اس لئے ادب فن میں اخلاقی اقدار
کا واضح طور پر تعین ہونا چاہیے۔ اختر اورینوی کے نظریۂ فن میں
جہاں "جمالیات" اتنا حاوی نظر آتا ہے کہ اخلاقی اقدار کا نہ صرف
یہ کہ واضح تعین نہیں ہوتا ہے بلکہ حسن کی تیز آنچ سے اخلاقی قدر
پگھل کر رہ گئی ہے حالانکہ ادب وفن میں جمالیاتی اور اخلاقی قدر
باہم متوازن اور ہم آہنگ ہونا چاہیے، ادب و اخلاق کے اسی
تعلق اور ہم آہنگی کو میں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں اس
طرح بیان کیا ہے۔

"میرے خیال میں ادب اور اخلاق دونوں کا مقصود و
منتہی یہ ہے کہ ایک ایسے نظام زندگی کا احیاء کیا جائے جس میں گندگی
فحاشی، بے حیائی اور جنسی بے راہ روی نہ ہو۔ عفت و عصمت
کا تصور عام ہو، شرم و حیا عورت کے رخ تاباں کا غازہ ہو،
سماج میں شرافت، نیکی اور پاکدامنی ہو، صحت مند جائز جنسی
تعلقات آسان ہوں اور جنسی مزاج مشکل ہو، ادب و اخلاق کا
کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے سماج اور معاشرہ کے قیام
کے لئے کوشاں ہو، جس میں صحت مند جنسی تصور ہو اور مرد و
عورت کی جنسی زندگی میں ایسا توازن برقرار رہے، جس کے
تلاش میں انسان آج تک سرگرداں ہے۔" (ادب میں اخلاقی
اقدار کا تصور۔ اپریل ۸۲ء، سہ ماہی فکر ونظر، علی گڑھ)

اگر ادب وفن کی بنیادی قدر میں صرف "جمالیات" پر نظر رہی اور
اخلاقی قدر کو نظرانداز کیا گیا تو اس اعلیٰ ادب وفن کی تخلیق ممکن
نہیں۔ جس سے حیات انسانی میں تازگی و شادابی آتی ہے اور
جس سے ہمارے سرمایہ، مسرت و بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔
زندگی کے اعلیٰ اقدار اور معیاری حسن پر یقین سے اعلیٰ ادب کا
وجود ہوگا اور زندگی کے ادنیٰ اقدار اور ادنیٰ حسن پر یقین سے
ادنیٰ ادب کی تخلیق ہوگی۔ ذرہ اور ستارے، آسینہ کی بلوریں
گولائی یا ماہ تاباں، حسین آنکھوں یا آب انگور پر یقین سے اعلیٰ
اعلیٰ اثر فنکار کی تخلیق ممکن نہیں، جو خودی اور خدا پر یقین سے
وجود میں آتی ہے۔ اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" "ذوق و شوق
ساقی نامہ" وغیرہ اور امرأ القیس کی عریانیات کا ادب کی دنیا
میں ایک مرتبہ و مقام نہیں ہو سکتا ہے، اور نہ ہے۔ حسن و
عشق کے محرکات کو اخلاقی حدود و اقدار کا پابند بنانا نہ صرف یہ کہ
لازمی ہے بلکہ اعلیٰ ادب وفن کی تخلیق کے لئے ضروری بھی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اختر اورینوی کے یہاں
مذہب اور جمالیات دونوں کی جڑیں بڑی گہری اور دور تک
پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان کوئی ایسا نقطۂ اتحاد
وہ اپنے پیش نظر نہیں رکھتے ہیں جس سے فکر وفن میں توازن و
توافق پیدا ہو، ان کے نزدیک "آرٹ اور مذہب دونوں کا
بنیادی اور حقیقی تعلق وجدان
سے ہے۔ دونوں کا سرچشمہ فیض جمالیاتی تجربے ہیں"[۱۰] اسی
بات کی وضاحت دوسری جگہ اس طرح کرتے ہیں۔

"اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو اصل مذہب خود ایک
عظیم آرٹ ہے، نبی اور صوفی مشاہدۂ جمال کے بعد انسان اور
انسانی معاشرہ کو حسین بنانا چاہتا ہے"[۱۱]

یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے آرٹ اور مذہب دونوں کا
بنیادی اور حقیقی تعلق انسانی ضمیر و وجدان سے ہے اور دونوں
انسان کی اسی لازوال جمال پسندانہ جبلت سے فیضیاب ہوتے
ہیں۔ جس سے انسان کا اندرون روشن و تابناک ہے۔ لیکن
ضرورت اس بات کی ہے ادب وفن میں "جمالیات" اور
اخلاقی اقدار آپس میں متوازن ہوں، ان دونوں کی ہم آہنگی
ہی سے اعلیٰ شعر و ادب کی تخلیق ممکن ہے۔ اختر اورینوی کے
نظریہ فن پر "جمالیات" کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کا اثر
ان کے دیگر ادبی تخلیقات پر بھی نمایاں رہتا ہے اور ان کے فکر ونظر

کی پرچھائیں ان کے تخلیقی کارناموں کے رومانی لہروں میں دب کر رہ جاتی ہے حالانکہ ادبی تخلیق اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتی۔ اگر اس کے پیچھے انسانی معاشرہ کی تعمیر و تطہیر اور کائنات کے بناؤ و سنوار کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ انسان اور انسانی معاشرہ کی تہذیب و تطہیر کا جذبہ ہی کسی عظیم فنکار کو اعلیٰ قسم کی تخلیق پر آمادہ کرتا ہے۔ انسانی اعمال پر اس کے اندرونی اخلاق کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ انسان جس طرح خارجی دنیا کی تسخیر اور اس پر تصرف سائنس کی قوت اور ٹکنالوجی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح انسان کے اندرون پر اس کا اخلاقی نقطۂ نظر اثر انداز ہوتا ہے۔ اپنی تطہیر روح اور تہذیب نفس کا کام وہ اخلاق ہی کے ذریعہ لیتا ہے۔ اس طرح اخلاقی اقدار زندگی کی تعمیر و تطہیر اور اس کو حسین و پُرمسرت بنانے میں بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب و فن میں ان اخلاقی اقدار کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انہیں کی بدولت زندگی کی شبِ تاریک کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ عقل کا چراغ رہگذر آس پاس کی کچھ زمین کو تو روشن کر سکتا ہے، لیکن انسان کے درون میں جو ہنگامے برپا ہیں انہیں تو مذہب و اخلاق ہی کی روشنی سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

نیکی اور خیر کے اخلاقی اقدار انسان سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ اس کی تمام تر تابانی خود اس کی قوتِ عمل میں مضمر ہوتی ہے۔ نیکی اور خیر کے اخلاقی اقدار ہی انسانی عزائم کی تہہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جو افراد اور جماعتوں کو تخلیق مقاصد پر اکساتے رہتے ہیں اور یہی اعلیٰ مقاصد ایک اچھے ادیب و شاعر کو اعلیٰ ادب و فن کی تخلیق پر آمادہ کرتے ہیں۔ جب کوئی فنکار ان ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار کو ہم آہنگی سے اپنے اندر سمو لیتا ہے تو اس کی مثال اس "ماہ نو" کی ہو جاتی ہے جس کے اندر "ماہ تمام" بننے کی پوری صلاحیتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ اس طرح اس فنکار کی مخفی قوتوں سے اعلیٰ تخلیق کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

بقیہ اختر اورینوی کی اداریہ نگاری

جائزہ لیتے ہیں۔ اور ان حالات و مسائل کا تجزیہ کر کے بڑی سنجیدگی سے اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس دور میں جو اداریے لکھے وہ وقت کی اہم ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا انداز نظر بڑا سلجھا ہوا، ان کی باتیں صاف اور ان کے خیالات واضح ہیں ان کے یہاں انانیت اور جھنجھلاہٹ کا کوسوں پتہ نہیں بلکہ اس کی جگہ ایک توازن، وقار اور متانت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا اپنا کوئی نقطۂ نظر ہی نہیں کیونکہ جب وہ مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس تجزیہ میں ان کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے۔ "معاصر" کے اداریے اختر اورینوی کی فکری اور ادبی صلاحیتوں کی رونمائی کرتے ہیں اور یہ رونمائی ان کے سماجی اور ادبی شعور کا پتہ دیتی ہے۔

پروفیسر ظہیر احسن

اختر اورینوی کی شاعری

ان دنوں میڈیکل کا پیشہ بہت ہی باعزت اور باوقار سمجھا جاتا تھا۔ اسے محض ذریعہ معاش کے خیال سے نہیں اپنایا جاتا تھا بلکہ اسے خدمتِ آدم اور خدمتِ انسانیت شمار کیا جاتا تھا۔ اختر صاحب (جن کے پیشِ نظر ایک اور ش اور منصب العین شروع سے رہا ہے) نے انٹر سائنس کرکے ۱۹۲۳ء میں میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۰ء تک میڈیکل کالج کے متعلم رہے۔ اس درمیان ان کی متجسس نگاہوں نے بہت کچھ دیکھا ہوگا۔ سوچنے والے دماغ نے بہت سے خاکے بنائے ہوں گے۔ اور بنا کر مٹائے ہوں گے۔ ان کے مشاہدے میں بہت ساری باتیں آئی ہوں گی۔ غرض یہ کہ بہت کچھ دیکھا ہوگا، بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ یہاں کے حالات اور فضا نے اختر صاحب کے حساس دل و دماغ پر ضربیں لگائیں۔ اور ان کا ان کی صحت پر برا اثر پڑا۔ زہریلی آب و ہوا، دم توڑتے ہوئے انسانوں کی بے کلی، روتے بلکتے بچے، چیخ و پکار کرتی ہوئی عورتوں کے دردناک مناظر نے اختر صاحب کے جسم و جان دونوں کو متاثر کیا۔ اور مسیحا بننے کے بجائے خود مستِ کش دوا ہو گئے۔ علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کالج چھوٹا، تعلیم چھوٹی اور جن خوابوں اور منصوبوں کے لئے وہ یہاں داخل ہوئے تھے انہیں وہیں ڈیڈ روم (DEAD ROOM) میں ڈال دینا پڑا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک زیادہ تر مریض بنے رہے۔ لیکن ان کی زندگی مریضانہ کبھی نہیں رہی۔ وہ اس صبر آزما وقت میں بھی خوش مزاج اور زندہ دل رہے۔ قدرت اور مظاہر قدرت حیاتِ انسانی اور تہذیب معاشرت کا مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۳۲ء میں مرض کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اور اک بار پھر عزم بیدار اور جواں حوصلوں کے ساتھ ارمانِ شکستہ کو یکجا اور اکٹھا کر کے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ البتہ راہ بدل گئی۔ منزل پھر بھی وہی رہی۔ یعنی خدمتِ آدم اور خدمتِ ادب، میڈیکل کالج کی جگہ پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ ممکن ہے پہلی راہ سے الگ ہو جانا انھیں شاق گذرا ہو اور تمنا کی پامالی نے سوگوار بھی کیا ہو۔ لیکن ادبی دنیا کیلئے یہ حادثہ نہیں فرخندہ تھا۔

بہار کا صوبہ مسائلِ حیات کے ساتھ جلوۂ رنگیں بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ بہار کے شہر ان کی دلفریبیاں، دلنوازیاں اور سحر طرازیاں اختر صاحب کے یہاں پورے طور پر موجود ہیں۔ ایک طرف شہر وں کی رونق اور فسوں سازی ہے تو دوسری طرف دیہات کی فضا، اس کے مسائل، وہاں کے رہنے، بسنے والوں کے سپنے، دشواریاں اور حقیقتیں، ان کے آنسو اور ان کی مسکراہٹیں جھلکتی ہیں۔ اختر صاحب کے ادبی ذوق، مطالعے سے دلچسپی اور ادبی فضا اور ماحول نے انہیں شروع ہی سے شعر و شاعری کی دنیا سے بھی قریب کر دیا۔

اس مختصر سے مضمون میں ان کی شاعری کے متعلق چند باتیں مقصود ہیں۔

اختر اورینوی کا مجموعہ کلام "انجمن آرزو" سنگم کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ پیش نظر ہے۔ اس میں بعض نظموں سے اکثر اشعار نکال دیئے گئے ہیں۔ اور بعض نظمیں سرے سے الگ کر دی گئی ہیں۔ جن کا میں نے ایک مضمون میں حوالہ دیا تھا۔ مجموعہ کلام کے مطالعہ سے پہلی ہی نظر میں یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اختر صاحب نے شاعری "نیم وحشی" صنف شاعری سے ہٹ کر نظموں سے شروع کی میں اپنے طور پر ان کی شاعری کو دو دور میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا دور سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۳۸ء تک کا ہے۔ یہ دور تحصیل علم کا ہے مگر مختلف النوع تجربات کا۔ دوسرا دور سنہ ۳۹ء سے حال تک کا ہے۔ چنانچہ انجمن آرزو میں سنہ ۴۲ء تک کا کلام موجود ہے۔

اختر اورینوی نے شاعری کب شروع کی اور ان کی پہلی چیز کیا تھی اس کے بارے میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ اس لئے کہ سنہ ۳۰ء سے پہلے کا کوئی نمونہ ہمیں نہیں ملتا۔ اور یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ سنہ ۳۰ء سے پہلے تک جبکہ عمر ان کی ۲۱ سال کی تھی۔ وہ سخن سنجی کی صلاحیت سے محروم تھے۔ بہرحال میدان شعر و سخن میں اترنے سے پہلے انھوں نے پروفیسر عبدالمنان بیدل سے مشورے کئے اور اپنے کلام پر ان سے اصلاح لیں۔ لیکن بہت جلد ان کی طبیعت آزاد اصلاح سے بے نیاز ہو گئی۔ اختر صاحب کی شخصیت رنگا رنگ اور ڈائنامک (Dynamic) ہے۔ ماضی خوب صورت اور دلنشیں ہو سکتا ہے۔ مگر ماضی پرستی نفی حیات ہے۔ زندگی کو دھوکا دینا اور وقت کی رفتار کو پکڑنے کی ناکام اور جھوٹی کوشش ہے۔ غرض یہ ہے کہ اختر اورینوی میدان سخن میں بلند عزائم اور یقین محکم کے ساتھ وارد ہوئے۔

پہلے دور کا کلام

اختر اورینوی تعلیم کے دوران بیمار پڑ کر سنہ ۳۱ء سے سنہ ۳۲ء تک ٹی بی سینا ٹوریم میں مقیم رہے لیکن یہاں شاعر کا تخیل نئے سانچے میں ڈھلنے لگا۔ حالات اور رنج والم نے فکر کے نئے دریچے کھول دیئے اور شاعر ان دریچوں سے حیات کی وسعت اور گہرائیوں میں جھانکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اشتراکیت کی طرف مائل ہونے لگا۔ لیکن اختر صاحب کی اشتراکیت سستی، گھٹیا اور مادی نہیں ہے۔ بلکہ وہ روحانی اور اسلامی اشتراکیت[1] کے ہمنوا ہیں۔ بچپن کی ابتدائی مذہبی تعلیم اور مطالعہ نے رواداری اور مساوات کی ترجمانی شروع کر دی۔ اسلامی تعلیمات کی روح ان کے فکر و فن میں نمایاں ہے۔ مادہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ وہ مادہ کے منکر نہیں۔ لیکن بڑھتی ہوئی مادیت سے یقیناً بیزار ہیں۔ اس لئے پھیلی ہوئی اشتراکیت کے حامی ہو نہیں سکتے۔ اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔ ارتقائی انقلاب کو وہ خوش آمدید تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مغلوب ہوئی انسانیت اور جبری انقلاب ان کے نزدیک مہلک اور خطرناک ہے۔ فطری میلان اور اعتدال میں ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہاں ہم ان کی شاعری اور دوسرے ادبی کارناموں میں پاتے ہیں۔ فن میں فنی جمال و کمال کے علاوہ اعلیٰ مقاصد کی تلاش کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے۔ وہ تخلیقی ادب اور مقصدی ادب کے علمبردار ہیں۔ تخلیقی، مقصدی اور افادی ادب ذہنوں کو جلا بخشتا ہے۔ ان کے یہاں یہ احساس شدت کے ساتھ موجود ہے کہ ہر ادبی تخلیق کو جذبہ انسانی کو سراہنا چاہئے اور اسے مقصدی ہونا چاہئے۔ افادیت کا پہلو لئے ہوئے مگر فنی توازن کے ساتھ ورنہ وہ کار ہوس پیشگاں ہے۔ وہ شاعری یا دوسری ادبی تخلیق اور پیش کشی کے وقت زمانہ کے تقاضوں اور مطالبوں کو فراموش نہیں کرتے اور ان کا قتل روا رکھتے ہیں (?)۔ البتہ ہر جگہ افادیت کو ادب کی روح تصور کرتے ہیں۔ سوز و ساز کی ہم آہنگی ان کی فنی تراش کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ ان کا نظریہ زبان و فن ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہے زباں راستہ منزل یہ کہاں ہے پیارے
فن ہو بے سوز تو دو ہم (?) وہ گماں سے پیالے (?)

[1] اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اختر صاحب اشتراکیت سے اپنی براءت ظاہر کر چکے ہیں۔ ادارہ

لطف انداز ہے لبس طرزِ بیاں سے پیارے
دل میں جب آگ نہ ہو فن تو دھواں ہے پیارے

اسی کے ساتھ یہ حوصلہ جواں دیکھئے!

آؤ تہذیب کو تنویر عطا کر کے چلیں
یوں زباں کھولیں کہ تاثیر عطا کر کے چلیں
سوزِ تقریر کو شمشیر عطا کر کے چلیں
حسنِ تقریر کو تقدیر عطا کر کے چلیں

اس میں شک نہیں کہ یہ نظم سنظریہ زبان و فن پختہ ذہن اور تجربہ کی طرف اشارہ کرتی ہے —

دورِ اول کی شاعری کی چند اہم نظمیں ہیں۔

خندہ و زدیدہ ۱۹۳۱ء روحِ حرا سے ۱۹۳۶ء ماضی سے ۱۹۳۴ء ماں ۱۹۳۳ء پیغامِ جنوں ۱۹۳۵ء جا ہد ۱۹۳۶ء رخنت سے انکار ۱۹۳۵ء تاج محل ۱۹۳۳ء دھان کا کھیت ۱۹۳۱ء جگنو ۱۹۳۰ء برق ۱۹۳۱ء پیغامِ فطرت ۱۹۳۱ء دریائے سون ۱۹۳۲ء روحانِ رفتہ ۱۹۳۳ء زندگیِ عشق ۱۹۳۲ء نوائے بہار ۱۹۳۷ء ابتدائے محبت ۱۹۳۷ء ارمغانِ شباب ۱۹۳۸ء محبت ۱۹۳۶ء رخصت ۱۹۳۳ء اجتناب ۱۹۳۸ء

اختر اورینوی کے کلام کے مطالعے سے چند ملے جلے تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ دورِ اول کی ایسی نظموں کے علاوہ جن میں فطرت یا فطرت کے کسی شاہکار کی تصویر کشی اور ترجمانی کی گئی ہے۔ جوش، ولولہ، عزم اور قوت و توانائی سے بھرپور نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ابتدائی شاعری کے چند نمونے آپ دیکھیں تو یہ احساس ہوگا کہ ان میں کہیں عزمِ جواں ہے اور کہیں نغمگی، کہیں رجائیت اور بشارت، کہیں فطرت کے حسین مناظر اور کہیں مقامی رنگ و رونق۔ آپ کچھ ادھر ادھر سے کلام کا جائزہ لیتے چلیں۔ ان کی سب سے پہلی نظم جگنو ہے جو ۱۹۳۰ء کی پیش کش ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو اخترِ رقصاں ہے — یا اخترِ تاباں ہے
تو نورِ بداماں ہے — یا داغِ نمایاں ہے
اڑتا ہوا پارا ہے — جگنو ہے کہ تارا ہے
تصویرِ دلِ عاشق — یا روئے دل آرا ہے
جگنو نہیں بجلی ہے — یا شبت دمنقی ہے
عاشق کی سیہ بختی — معشوق کی شوخی ہے
آنکھیں ہیں چھچھوروں کی — باغوں میں پری پہنچے
شمعیں تو نہیں روشن — فانوس میں بجھوں کے
جگنو یہ اکٹھے ہیں — یا چرخِ زر افشاں ہے
ماتھے پہ عروسِ شب — جھومر کے ہوا افشاں

یہ اشعار غضب کی آمد اور روانی کا پتہ دیتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ ابتدائی مشق شاعری کے ترجمان ہیں۔ پھر بھی ان سے شاعر کی روانیِ طبع کا پتا چلتا ہے۔ جگنو اور برق کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں ابھرتی چلی آتی ہیں۔ شاعری کی سرحد مصوری سے ملی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعر کا تخیل، حسین اور جاندار تشبیہیں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ ایک کے بعد ایک ایک کے بعد ایک۔

فطرت کے مناظر کی ایک اور تصویر دیکھئے۔ اس میں شاعر کا تخیل ہے، خلوص ہے۔ تشبیہوں کے ساتھ حقیقت چھلکی ہے۔ دھان کا کھیت ہے یا "فرحِ قلبِ غمگیں"

اے کشت زار رنگیں — اے تازگی بداماں
اے فرحِ قلبِ غمگیں — اے غم ربائے دہقاں
کتنی صعوبتوں سے — کن کن مصیبتوں کو
خونِ جگر سے اپنے — دہقاں نے سینچے پودے
بادل ہے وقت تجھ پہ — کرتا ہے دُر بچھاور
اور آفتابِ انور — کیا زر فشاں ہے تجھ پہ
آرام جانِ دہقاں — اے کاوشوں کے حاصل
پروائی کی یہ لہریں — تجھ کو جھلا رہی ہیں
بوٹے ہیں دھان کے یا — اترا رہی ہیں سبز پریاں

یا سبز پوش عذرا   منظر ہیں میری حیراں

اس عہد کی ایک نظم "ماں" ہے جس میں محبت کا نغمہ ہے۔ عقیدت کے ترانے ہیں۔ خلوص کی اثر انگیزی ہے۔ اور حقیقت کی جلوہ نمائی ہے ایک ایک شعر صداقت اور حقیقت کی گواہی دیتا ہے۔ دیکھئے!

ایک ذرا بچے کی بیماری پہ وہ بیتابیاں
رات کو بیداریاں دلداریاں اور زاریاں!
رنج و غم بچے کو ہو اور گریہ ساماں تو ہوئی
درد ہو بچے کو پہلو میں اس کے اشک افشاں تو ہوئی
لب پہ جاری ہیں دعائیں روتی ہے تو زار زار
گلشن ہستی پہ اس کے تو ہے ابر نو بہار
دور ہو جاتا ہے تجھ سے جب ترا نور نظر
ہجر میں بچے کے جلتا ہے ترا قلب و جگر
باعث آرام ہے تو چشم پر نم کے لئے
تو بہشت ارض ہے اولاد آدم کے لئے
گم شدہ جنت کی تو اک خوشنما تصویر ہے
پیکر صدق و صفا فردوس کی تنویر ہے
بے غرض الفت کی دیوی پیکر محبوبیت
جذبۂ الفت میں تیرے جلوۂ روحانیت
پرورش پاتی ہے تیری گود میں انسانیت
تیری ہی آغوش میں پلتی ہے اسکی تربیت

اس دور کی نظموں میں "دریائے سون" اور "رومان رفتہ" میں سرور و کیف جھلکتا ہے۔ ان میں ماحول کی زندہ تصویریں ہیں۔ مقامیت کی روح ہے، خراج عقیدت ہے۔ اظہار حقیقت ہے۔ سادہ حسن و جمال کی پر سکون وادی ہے۔ جہاں ہزاروں جنتیں آباد نظر آتی ہیں۔ اور جہاں ہر آنکھ افسانہ سناتی ہے محبت کا۔ سپنوں کی بستی ہے۔ ارمانوں کا جہان۔ "دریائے سون" اور "رومان رفتہ" روحانی میلانات کو پیش کرتی ہیں۔ اور ایک خاص عمر کے دماغ کو اپیل کرتی ہیں۔ شاعر نے بڑی چابکدستی اور صفائی کے ساتھ شاعرانہ صنعت گری کا تاج محل پیش کیا ہے۔ نظموں میں سرور و کیف، مستی اور مدہوشی، رنگینی اور رعنائی کے علاوہ کچھ تاریخی حقیقتیں اور ابدی قدریں بھی ہیں۔ خاص طور پر دریائے سون کا آخری بند۔ اس سلسلے کی آخری اور اہم نظم "ارمغان شباب" ہے۔ درحقیقت یہ نظمیں افسانہ کہہ رہی ہیں عہد شباب کا۔ ان کے پڑھنے سے دل پر (خاص عمر کے لوگوں کا) سرور ہوتا ہے۔ دماغ خاکہ سازی کرتا ہے۔ اور نفس کی آمد و شد تیز ہو جاتی ہے اور دل کی دھڑکن صاف سنائی پڑنے لگتی ہے۔ حسین اور رعنا تشبیہوں نے "ارمغان شباب" کو اور بھی زیادہ دیدہ زیب اور دل فریب بنا دیا ہے۔ گل رخوں، لالہ لبوں اور رنگین عذاروں نے ساری نظم کو رنگین کر دیا ہے اور ان کے قہقہوں نے سحر آگین بنا دیا ہے ملاحظہ ہو ـــ

گل رخوں، لالہ لبوں، رنگیں عذاروں کا ہجوم
شوخ چنچل لڑکیاں ہیں یا شراروں کا ہجوم
تیتریوں، جگنوؤں، زرّیں ستاروں کا ہجوم
چاند کے ٹکڑوں کا یا خورشید پاروں کا ہجوم
فطرت رنگیں قلم کے شاہکاروں کا ہجوم
دل ربا، تمکیں شکن، تقویٰ شکاروں کا ہجوم
جلوہ گستر حسن کے سرمایہ داروں کا ہجوم
آسماں جو عشق کے پروردگاروں کا ہجوم
سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم
سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
غنچۂ نورس، ثمر ور، نونہالوں کا ہجوم
شاعر سرشار کے رنگیں خیالوں کا ہجوم
ہر طرف زہرہ جبینانِ حرم جلوہ فروش
دل کو لغزش، شوق کو حیرت، خرد کے گم ہیں ہوش

چہل کرتی کھیلتی لشہ سا برساتی ہوئی
بل پہ بل کھاتی، لچکتی، رکتی، شرماتی ہوئی

سیر دریا کر رہی ہیں دخترانِ شوخ و شنگ
جیسے جمنا کے کنارے گوپیاں گاتی ہوئی

سون کی پریاں ہنسی سے کس قدر بیتاب ہیں
نوجوانی کے نشے میں غیرتِ سیماب ہیں
حسن بے پروا ہے احساس کے شعلے کا رنگ
چشم بیگانہ ہیں ان کے آرزو کے خواب ہیں

یہ خواب کی وادی ہے۔ سون کو بار بار اختر صاحب نے پُراسرار طور پر پیش کیا ہے۔ انداز والہانہ ہے۔ جیسے ندی وقت کے دھاروں پر بہت سی دھڑکنوں اور رازوں کو چھپائے بہی جا رہی ہے۔ اور اس کی موجوں کی نغمہ طرازیاں ذہین شاعر کو آج بھی مسرور کئے دیتی ہیں۔

لیکن اختر اورینوی کی شاعری میں رومان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اسی دور میں ان کی شاعری کروٹ لیتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ جوشِ جنوں کی جگہ پاسبانِ عقل ساتھی بن جاتا ہے۔ اور شاعری میں محض لے اور نغمہ نہیں بلکہ وزن اور توانائی آ جاتی ہے۔ اختر اورینوی کی شاعری کا نقشِ اول اختر شیرانی کی شاعری کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اختر شیرانی کی آواز اختر اورینوی کے یہاں نئے لہجے، نئے سرور کیف اپنا اثر اور نمک کے ساتھ افسوں کاریاں کرنے لگی ہے۔ دونوں میں رومان کی چاہ گہری نظر آتی ہے دوسری طرف اختر اورینوی اقبال سے بھی قربت رکھتے ہیں۔ اور ان سے متاثر ہیں۔ دونوں بڑھتی ہوئی مادیت اور سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کرنے اور محاذ قائم کرتے ہیں۔ اختر صاحب کے دورِ اول میں ہی ایسے شرارے نظر آتے ہیں۔ جو ان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ "پیغامِ جنوں" اور "خندہ دزدیدہ" جیسی نظموں کے مطالعے سے عزم راسخ اور صدق فکر و عمل کا پتا چلتا ہے۔ قوت و توانائی اور رجائی نظریہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔

زندگی اور زمانہ پر اس قدر اعتماد حسنِ تسخیر کی دلیل ہے۔ میری نظر میں اس زمانہ کی سب سے زیادہ اہم اور کامیاب نظم "جنت سے انکار" ہے۔ یہ نظم اپنی نوعیت اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ ہے۔ انسان یادِ جنت میں ہمیشہ اشک افشاں رہا ہے سینہ چاک اور گریباں کناں۔ اس کی بہاروں کے گیت گاتا رہا ہے اور جنت کے باشیوں سے عشق کا اظہار کرتا رہا ہے۔ جنت کی یاد و آرزو آدم کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ لیکن اختر صاحب کا جنت سے انکار حیران کن ہے۔ اقبال کی طرح اس جنت کو کیا کریں وہ جس میں دلربائی نہ ہو، کج ادائی نہ ہو، جہاں تلک جھانک نہ ہو۔ عفو شعاری اور کرم فرمائی کی کہانی نہ ہو۔ بھاگ دوڑ نہ ہو، جہاں تقویٰ اور تقویٰ شکن حالات نہ ہوں اسے "جنت نہیں رنگین گھونگھے کہیے"۔ ایسی جنت جہاں لطف کا دشمن نہ ہو، خانہ برباد نہ ہو، دل ناشاد نہ ہو، کام میں فریاد نہیں، رکھی یہیں۔ صیاد نہیں۔ اس میں کیا دلکشی باقی رہی۔ غرض یہ کہ جس جنت کے گیت گائے جاتے رہے ہیں وہاں ارمان کا نشتر نہیں بلکہ "جو چاہے ہو جاتا ہے"۔ لیکن قلبِ مضطر کو قرینہ یہ نہیں بھاتا ہے۔ اس لئے کہ وہاں زندگی پہلی زندگی کی نقل ہے اور دراصل۔۔

زندگی نام ہے ارمان کی بیتابی کا
خلش و درد کا محرومی کا ناکامی کا

زندگی نام ہے بس خانماں بربادی کا
سوزِ الفت میں ترے سوختہ سامانی کا

موت ارمان کی ہے ارمان کا پورا ہونا
جنت شوق ہے آوارہ و خستہ ہونا

اور حقیقت یہ ہے کہ نخلِ حیات کی سیرابی، شیفتگی اور شادابی خونِ ارمان و تمنا سے ہوتی ہے، اور فردوس میں ارمان کی خلش ہے "نایاب"، یعنی وہاں نہ حوصلہ ہے نہ عزم و ولولہ ہے نہ شوق و ارمان نہ جہد ہے اور نہ حسرت و ناکامی۔ اس ایک بے کیفی ہی بے کیفی ہے

اس لئے شاعر پکار اٹھتا ہے کہ

لطف کاوش ہی نہ ہو جس میں وہ نعمت کیا ہے

ذوق ایذا طلبی کے لئے راحت کیا ہے

ہے جنوں اپنا سلامت تو یہ عشرت کیا ہے

وسعتِ شوق کے آگے مری جنت کیا ہے

باغِ فردوس کو رنگین کھلونا کہئے

دل کے بہلانے کو بچوں کا گھروندا کہئے

ایک بے کیف تسلسل مجھے مطلوب نہیں

مجھ کو بے خار گلستاں کبھی مرغوب نہیں

عشرتِ بزم سکوں شوق کو محبوب نہیں

عیش کوشی دلِ مجذوب کا اسلوب نہیں

دائمی موت دے یا قسمت سیمابی دے

دلِ مضطر کو مرے درد دے بیتابی دے

شرمساری کے مزے اہلِ جناں کیا جانیں

کیفِ بیتابیٔ دل سوزِ نہاں کیا جانیں

خوگرِ موسمِ گل لطفِ خزاں کیا جانیں

لذتِ نالہ و فریاد و فغاں کیا جانیں

یہاں اقبال کی آواز اختر اورینوی میں صاف سنائی دیتی ہے۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں

وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد (اقبال)

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں

انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد (اقبال)

غرض یہ ہے کہ پہلے دور سے ہی ہلکی ہلکی روشنی ان کے مستقبل کی شاعری کی پڑنے لگتی ہے۔ اور یہ احساس بیدار ہونے لگتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں عزم اور رجائیت کا عنصر اور بھی زیادہ حاکم ہوتا جائے گا۔

پہلے دور کی شاعری کے چند ذہنی فکری نمونوں کا جائزہ لے کر میں دوسرے دور میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ سہولت کے خیال سے کلام اختر کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

دوسرے دور کی نظموں میں "تو یہ تجلی" "جشن جمہوریہ" گوا ۱۹۶۱ء "گاندھی جی" ۱۹۵۲ء "ہندوستان" ۱۹۵۳ء "کونل" ۱۹۳۹ء "شین" ۱۹۴۱ء "نوائے زندگی" ۱۹۳۹ء "غبی" ۱۹۴۲ء اور کو خاص اہمیت اور مقام حاصل ہے۔

ان نظموں کے مطالعے سے فکر و فن، خیال اور تجربے کے تدریجی ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کے قلب کی وسعت اور نظر کی بصیرت اور جمال کی پہنائی میں ساری انسانیت سما جاتی ہے اس شاعری میں مقامی رنگ و بو بھی ہے۔ اور آفاقی نظریہ اور خیال بھی

جشن جمہوریہ، گاندھی جی، ہندوستان اور گوا میں ان کی حب الوطنی کی پر خلوص، پر اثر اور جاندار تصویریں ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "خاک وطن کا" ان کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔ شعری محاسن کے علاوہ یہ تاریخ ہے۔ اور تہذیب و تمدن کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے ہندی الفاظ کا استعمال بکثرت روا رکھا گیا ہے۔ شاعر سیاسی دھاروں سے متاثر نظر آتا ہے۔ یہ نظمیں ہندی اور اردو کا سنگم معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نظمیں شاعر کو وطن دوست کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ وطنیت اور قومیت کا جذبہ ان میں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور شاعر اس جذبے سے سرشار معلوم ہوتا ہے۔ "گاندھی جی" میں ان کی عظمت کردار کو نذر عقیدت پیش کی گئی ہے۔ "جشن جمہوریہ" بڑی دلکش نظم ہے۔ شاعر ملک کی خوشی میں شریک ہے، قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے۔ مسرت کے ترانے گاتا ہے شہر کی تزئین، رونق اور بہاروں میں جذبۂ بیتاب اور جوش فراواں چھلکتا ہوا گیت گا اٹھا۔ عوام کو دعوت نغمہ سرائی دیتا ہے۔ نظم اپنی روانی، برجستگی اور تشبیہوں کے سبب بڑی اثر انگیز ہو جاتی ہے

ہندوستان اور گوا میں شاعر کے جذبات پھوٹ پڑتے ہیں شاعر کی وطن دوستی ہمالہ کی بلندی پر دکھائی دیتی ہے۔ گوا خاص نظم

و نصرت و کامرانی کا گیت ہے۔ اور ہندوستانیوں کے بیدار، نیم بیدار اور خفیہ جذبات کی ترجمان، شاعر نے اسے زیادہ سے زیادہ جمہور کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ الفاظ بھی بکثرت بلکہ بے دھڑک ہندی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً دھج، ناچنی، گگن، پون، ہرنے، اترانی، کرن، کنچن، دلاری، روپ، سیج، رتاپا، کیشلے، بان وغیرہ ملاحظہ ہو۔

چھٹا گہرا
چمکتا ہے حسین سورج
ذرا دیکھو فضا کی دھج

زمیں سے آسماں تک ایک سیل نور جاری ہے
رنگتی ناچتی کرنوں پہ وجد و حال طاری ہے
گگن نیلا، پون ہرنے چلے مستی میں اتراتی
کرن کنچن ہر اک سو رقص کرتی سونا برساتی
دلاری دھوپ نکلی ہے دلہن کے روپ میں سج کر
فضا آئینہ ساماں ہے ہر نوے ہیائے نغمہ گر

ہندوستان ان کی وطن دوستی کا معیار بلند ہے۔ جس کے قدموں پر شوق کے جذبات گل فشاں ہیں۔ شاعر فرطِ شوق اور فرطِ جذبات سے متوالا ہو جاتا ہے۔ ملک و وطن کی محبت کے گیت والہانہ طور پر گاتا ہے۔ دیوانہ وار، دیوانہ وار۔ اس میں عظمتِ رفتہ کا نشان ہے۔ عہد ماضی کی کہانی، یہاں کی دلنوازی اور تہذیب کی تاریخ بیان کی گئی ہے چند شعر درج ذیل ہیں۔ اندازہ لگائیے۔

اے وطن محبوبِ جاں تیری زمین و آسماں
شوق کے جذبات قدموں پر ترے ہیں گل فشاں
تیرے جلوے ناز فرماں گلستاں در گلستاں !
تیری تنویریں ہیں رقصاں کہکشاں در کہکشاں
تیری تہذیب درخشاں بن گئی نورِ جہاں
دلنوازی میں جہاں گیری تری عظمت نشاں
صرف اسی قدر نہیں بلکہ

اے بہشتِ آرزو جنت نشاں گلشن ہے تو
اے وطن پیارے وطن پیارے وطن ہندوستاں
آئین وفا کی پاسداری دیکھئے۔
مر مٹوں گا تیری عزت کیلئے دیوانہ وار
اے وطن پیارے وطن پیارے وطن ہندوستاں

ان نظموں کی حیثیت قومی ترانے کی ہے۔ ان کے برعکس دوسری نظمیں مثلاً "نوید تجلی" انسان، تبصرہ، مشین، نوائے زندگی سے جوش و ولولہ، عزم اور اعتماد جھلکتا ہے۔ شاعری رجائیت اور تہذیب حاضر کی جادوگری، طلسم سازی اور سرمایہ داری کا جال توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعری حقیقت بداماں معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی انقلاب گیت کا میلان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شاعر کی آتش نوائی، جنگ کے شعلہ کو نگل جانا چاہتی ہے۔ شیطانی طاقت بنی آدم کو کچلنے کیلئے مصروف ہو رہی ہے۔ تباہی ناچتی اور آگ بھیکتی دوڑی آ رہی ہے۔ مگر انسان بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کی روح میں نئی کرنیں ضیا افگن ہیں۔

"نوید تجلی" میں اختر اورینوی کا عزم اور حوصلہ بلند اور پختہ تر نظر آتا ہے۔ انسان اور اس کی کوشش پر انہیں بھروسہ ہے مستقبل پر انہیں اعتماد، مانا کہ تہذیب حاضر نے سیاہی بکھیری ہے۔ اندھیرا پھیلایا ہے۔ انسانوں کے درمیان سونے چاندی اور لوہے کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ مگر حیات کے افق پر اجالا بڑھ رہا ہے — اور اختر صاحب کو یہ یقین ہے کہ۔

مگر ہیں روحِ انساں میں نئی کرنیں ضیا افگن
اندھیرے کے پجاری بھی کریں گے شمع نو روشن
سنور کر آدمیت خود سجائے گی نئے گلشن
حیاتِ نو اٹھائے گی نئی تہذیب کا دامن !
باوجود اس کے کہ

غم عالم کی تڑپ سے دل شاعر دھڑکتا ہے
لرزتا کانپتا ہو جاں جیسا جنگ کا شعلہ بھڑکتا ہے

بچھلنے کو ہی آدم کے جب لوہا کوٹا کرتا ہے
تباہی ناچتی ہے ہر طرف لاشہ پکڑتا ہے

یہ جنگِ زرگری ان کی وہ عشقِ سروری ان کی
کہیں ہے ساحری ان کی کہیں تیشہ گری ان کی

(نوید تجلی - ۱۹۵۲)

غرض یہ کہ کئی طرف سے تباہی کا دھواں پھیل رہا ہے، بربریت عریاں رقص کر رہی ہے۔ بگولے اڑ رہے ہیں۔ ہر طرف کالی گھٹائیں ہیں۔ پھر بھی "چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے"۔ "آدمی پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں۔ مگر انسان زندہ رہتا ہے، پائندہ رہتا ہے۔ اس کی سیرت کا جلال و جمال دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے۔ روشن روشن، اجلا اجلا، انسان ہمیشہ زندہ رہے گا۔" انسانیت دبتی ہے، کچلتی ہے، سسکتی ہے۔ مرتی نہیں۔ یہی مثبت ہے یہی حقیقت ہے۔ اختر اورینوی کی نظم "انسان" آدم کے ماضی، حال اور مستقبل کی تاریخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم بڑی پُر درد، تابناک، حسین اور باوزن ہے۔ دلوں کو گرمانے اور روح کو برمانے والی عجیب تقدیرِ انسانی ہے۔ عجیب تعبیرِ انسانی، پوری نظم داستانِ آدم ہے اور اردو شاعری میں ایک نادر تحفہ۔

کلامِ اختر کے مطالعے سے تدریجی ارتقاء، وقار، وزن اور ترقی کا احساس ہوتا ہے۔ ابھی آپ نے "انسان" کو دیکھا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی چیز ہے۔ اس سے پہلے تو "نئے زندگی" ۱۹۳۹ء اور "سنگم" ۱۹۴۱ء میں پیش ہو چکی تھی۔ اور پھر "تبصرہ" ۱۹۴۳ء میں چھپ گئی۔ ان تمام نظموں کو ایک سلسلے میں مرتب کر کے دیکھئے تو شاعر کی وسعتِ قلب، مشاہدہ اور تجربوں کی ہمہ گیری، انسانیت دوستی، ذہن و ادراک کی بیداری اور پر دل کی آواز صاف سنائی دے گی۔ ان نظموں میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے۔ اس کا تجربہ اور خیال اور شخصیت بولتی ہے۔ شاعری دراصل تجربے اور تخیل کا بیان ہے، تجربے اور شخصیت کا اظہار۔ وقت کی شاہراہ پر چلتا ہوا انسان نشیب و فراز، تلخ تجربے اور شیریں یادوں کی داستان سناتا ہے۔ نگاہوں میں مستقبل کے خواب لئے گزر رہا ہے۔ شاعری ایک احساس

انسان کا عالم انسان اور انسانیت کیلئے پیغام ہے۔ اور وہی شاعر بڑا اور کامیاب ہے جس کی آواز دور تک اور دیر تک سنائی پڑے جس میں ماضی اور حال، ربط اور تسلسل، قرینے اور سلیقے کے ساتھ سموئے ہوئے ہوں۔ مستقبل کی تصویریں جھلکتی ہوں۔ زندگی کی ترجمانی ہو حیات اور کائنات کا گیت ہو۔ صرف جمال نہیں جلال بھی ہو۔ صرف جلال نہیں جمال بھی ہو۔ ابدی قدریں ہوں۔

اختر صاحب کی ان نظموں میں کچھ ایسے عناصر ہیں جو زندگی بداماں ہیں۔ ابدی قدروں کے حامل ہیں۔ ان میں عزمِ راسخ ہے ان میں ارادہ ہے۔ پیغامِ حیات ہے۔ عالمگیر انسان دوستی کا جذبہ، بلند نگہی، حوصلوں کی استواری، جوش اور اعتماد، انسان، اس کی صلاحیت اور اس کے مستقبل پر بھروسہ، تہذیبِ حاضر کی بدنہادی اور فتنہ و فساد کو لپا کرنے کے منصوبے، مظلوموں کے ساتھ بے پناہ ہمدردی، بڑھتی ہوئی مادیت اور مادہ پرستی سے بیزاری، یہ چند ایسی چیزیں ہیں جو ان نظموں میں ملتی ہیں۔ اور ان سے شاعر کی سیرت اور شخصیت جھانکتی ہے۔ یہی جو باتیں ابتدا میں ان کی شخصیت سے متعلق کہی تھیں۔ یہ نظمیں ان کی صلاحیت و صداقت کی گواہی دے رہی ہیں۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اختر صاحب نہ تو ترقی پسندی کا لیبل لگائے پھرتے ہیں اور نہ دب جانے کے لئے اس نوع کی باتیں کرتے ہیں۔ اور نہ رجعت پرستی کی طرف ہی مائل ہیں وہ دونوں کے درمیان مفاہمت کے قائل ہیں۔ ماضی کی قدر و قیمت کا انہیں احساس ہے۔ اور حال سے وہ باخبر ہیں۔ مستقبل پر انہیں بھروسہ ہے۔ جدید میلانات، ترقی پسند میلانات، ابھرتے ہوئے تعمیری حوصلوں اور ولولوں کو وہ خوش آمدید کہتے ہیں۔ جمہور اور اہلِ محنت سے انہیں پیار ہے اور ان سے بہت ساری امیدیں ہیں۔ وہ ان میں ہمت اور خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ داری اور سرمایہ داروں دونوں ہی کو وہ انسان اور دنیا کیلئے مہلک اور خطرناک تصور کرتے ہیں۔ اختر اورینوی نے مادیت اور زر اندوزی

و سرمایہ داری کے خلاف احتجاج اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ یہ مادیت آدمی کو انسانیت کے پاکیزہ اور معصوم جذبے سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ صرف دولت کا آلۂ کار بن کر رہ جاتا ہے۔ سماج کی چولیں ڈھیلی پڑنے لگتی ہیں۔ قصور مشین کا نہیں، مشین جن کے ہاتھوں میں حرکت کرتی ہے، ان کا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ ؎

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت

اختر صاحب اقبال کے اس خیال کے ہمنوا ہیں۔ دیکھئے ان کی نظم "مشین" جس میں تہذیب جدید کیلئے تیر و نشتر ہیں۔ جس سے ان کی عالمگیر دوستی اور ترقی پسند میلان کا پتہ چلتا ہے۔

یوں تو ہر دم دل ہے غم کے بار سے ماتم کناں
یہ دکھ ہمدردیٔ مظلوم اور فکر جہاں

آہ یہ دنیا یہ کشت و خوں کے میدان یہ فساد
حیف یہ تہذیب حاضر کا نظام بد نہاد

زندگی پامالیوں سے دن کو ہے ڈرتی ہوئی
رات کی تنہائیوں میں سسکیاں بھرتی ہوئی

کانپتا ہوں خوف سے اس دن کے اے دل کے قرار
جب تمہارے سکے کو گرے گی یہ ناگن سنگسار

الاماں سرمایہ داری کی نگاہ زہر ناک
کر رہی مشرق و مغرب میں انسان کو ہلاک

مفلسی کے جور سے پیسوں میں بکتی ہے حیات
جنگ کے مقتل میں ملتی ہے اسے غم سے نجات

الحذر سرمایہ کے قبضہ میں ہے اے مشین!
چیخ اٹھتی ہے فضا میں خون روتی ہے زمین!

بڑھ رہا ہے جو ترقی کرتی وا ہن کا وبال
روز افزوں مادیت سے ہے انسان کا زوال

کون کہتا ہے مشین ہے باعث افلاس و جنگ
اس ہلاکت کا سبب تھا دنیوں کے دل کا زنگ

(مشین۔ ۱۹۴۱)

گویا وہ مشین سے شاکی نہیں ہیں۔ بلکہ سرمایہ دارانہ نظام اور مادہ پرست ذہنیت اور اس کے خونریز چنگلوں سے خائف ہیں۔ یہ بات ان کی نظم مشین سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں ایک طرف رومان اور رومانیت ہے تو دوسری طرف زندگی کی تلخ حقیقت بھی۔

نوائے زندگی دراصل یہ نظم جوان حوصلوں اور زندگی کی حرارتوں اور فطرت کے تقاضوں سے لبریز ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ نظم فکر و فن کا ایک گلدستہ ہے۔ یہ مشہور بھی ہے اور مقبول بھی اس لئے کہ اثر و کیف، خلوص و تاثیر سے بھرپور ہے۔ یہ حیات کا ترانہ ہے۔ وقت کی پکار ہے۔ اس میں ایک طرف سادگی ہے دوسری طرف جوش ہے اور تیسری طرف حسن ہے۔ نغمگی اور موسیقیت ہے۔ شیرینیت ہے۔ اس نظم میں اختر صاحب کا آدم پر یقین ان کے تعمیری حوصلے اور رجائیت موج بیتاب کی طرح مچلتی ہیں، تڑپتی ہیں۔ نظم کی ابتدا سے ہی ترنم ابھرتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ حقیقت حیات کی رونمائی ہے۔ بیداری کا قرینہ ہے عمل کی ترغیب اور تلقین ہے۔ موضوع اور قوت کے لحاظ سے نوائے زندگی ان کی چند اہم اور کامیاب نظموں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

قدم آگے بڑھاتا چلا جا
عزائم کے پرچم اڑاتا چلا جا

زمین و زمان پر تو چھاتا چلا جا
خدائی پہ قبضہ جماتا چلا جا

دو عالم پہ سکہ بٹھاتا چلا جا

قیود و غلامی مٹاتا چلا جا
قلعوں زنجیر گراتا چلا جا

سلاسل کے ٹکڑے اڑاتا چلا جا
مفاسد کی بنیاد ڈھاتا چلا جا

نئی ایک دنیا بناتا چلا جا

غبار تغافل سے سب جگاتا
تباہی کے عفریت کا خون بہاتا

فلاکت زدہ بستیوں کو جلاتا
شباب ظفرمند کے گیت گاتا

ترقی کو رستہ دکھاتا چلا جا

کہیں تیوری کے نظام ستم ہیں
یہ سرمایہ داری کی جھوٹی نگاہیں

شقاوت سیادت کی رہ میں لگے ہیں
شیاطین کے پنجوں میں انسان گرا ہیں

تب و تاب جرأت دکھاتا چلا جا

حقائق سے بنا تخیل کی بستی — حقائق سے ڈرنا تری پرستی
حقائق سے بچنا کشی اصل مستی — یہ تخریب و تعمیر میں راز ہستی
حقائق کو تابع بناتا چلا جا

فراغت یہ کیا کہہ دیا تو نے ہمدم — نہیں ہے مرے زخم کا یہ مرہم
فراغت ہے دو دن بسر کیلئے کم — عمل زندگی ہے عمل قاتل غم
تو دریا کا دل بڑھاتا چلا جا

نہ احساس کو دے فریب مسرت — جنوں ہے فراغت مرض ہے فراغت
نہیں سرخوشی ہیچ یا اندوہ راحت — عمل ہی میں جنت عمل سے ہے جنت
جہنم کو جنت بناتا چلا جا

نہ غم زندگی ہے نہ سم زندگی ہے — ہیں کیوں ماتموں پر الم زندگی پر
ہے دل جام جم جام جم زندگی پر — جلا ہو گی تیغ دو دم زندگی ہے
روانی تیغ آزماتا چلا جا

(نوائے زندگی ۳۹)

اس سلسلے کی آخری اور اہم کڑی تیسرا ہے۔ یہ شاہد ہے اور تجربوں کا ایک حسین سنگم ہے۔ شاعر کی قوت ادراک کی ترجمان اس کے حواس بیدار کی غمازی اس میں غیرت ہے۔ خودداری ہے۔ شجاعت اور جانبازی کی تلقین، انقلاب تازہ کی خبر ہے۔ رجائیت کے ہیولے ہیں حرارت حیات ہے اور آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر ہے۔ اور شاعری کے پیمانے میں شاعر کی بیدار شخصیت جھلکتی ہے۔ یہ نظم بڑی زوردار اور پر جوش و پر عزم ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اختر صاحب کی نظمیں جنت سے انکار انسان نوائے زندگی اور تبصرہ اردو شاعری میں جاندار اضافے ہیں۔ ان کا مقام بہت بلند ہے اور یہ ہی لوگوں کو دعوت فکر و عمل دیتی ہیں۔ ساتھ ہی اختر اورینوی کی شہرت دوام کی ضامن ہیں۔ قافیہ اور موضوع کے حسن اور ہمہ گیر عنصر نے ان میں ابدی قدریں اور دائمی رنگ و بو بھر دیا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ دوسری بہت ساری نظمیں بھی ان کی شعری صلاحیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ اکثر چھوٹی بحروں اور الفاظ کے انتخاب اور کبھی کبھی الفاظ کی تکرار سے ترنم پیدا کیا گیا ہے۔

یہ موسیقیت بڑی دلکشی ہے۔ بعض نظموں میں (کوئل) عنوان کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال فن کارانہ ہے اور ان سے حسن و سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر ہندی کے نرم و شیریں شبدوں کے چناؤ میں انہیں کمال حاصل ہے اور ان کے سبب نظمیں پیاری اور اثر انگیز ہو جاتی ہیں۔

نظموں کے علاوہ اختر صاحب نے غزلوں کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ ان کے پہلے دور کی شاعری میں بھی غزلیں ملتی ہیں۔ مجموعہ کلام میں سب سے پہلی غزل ۱۹۳۲ء (راز دوست) کی ملتی ہے۔ اختر صاحب نے ایک غزل گو شاعر سے اپنے کلام پر اصلاح لی تھی۔ مگر شاگردی کی غزلوں پر استاد کا کوئی اثر یا رنگ مجھے نظر نہیں آتا ہے۔ یوں بھی اختر صاحب کی طبیعت کو غزل سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ آئین دنیا کا خیال ہو یا رسم ادب کی پاسداری۔ جس نے انہیں غزلوں کی راہ پر بھی آنے پر مجبور کیا۔ ان غزلوں میں "مولوی مدن" کی سی بات کہاں۔ خیالات کا اظہار الفاظ میں (اور اکثر خوبصورت الفاظ میں) ضرور ہے۔ لیکن نظموں کے مقابلے میں ان غزلوں میں وہ چاشنی اور دلکشی نہیں۔ البتہ بعض قابل توجہ ضرور ہیں۔ مثلاً "مجھ کو معلوم ہے دل پہ مرے کیا گزری ہے" والی غزل۔ ان غزلوں میں نرمی اور نغمگی کا التزام معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر انجمن آرزو کے مطالعہ اور جائزہ سے اختر اورینوی کی شخصیت کے مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

وہاب اشرفی

حسرتِ تعمیر — ایک فنی جائزہ

اردو میں اچھے ناول کم لکھے گئے ہیں، قصے نے داستان سے افسانے تک کی ایک طویل مسافت تو طے کی لیکن اس کے ارتقا کی رفتار سست رہی ہے۔ یہ سست گامی ناولوں کے ضمن میں اور بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ انگریزی ناولوں نے فنی اعتبار سے ایک صدی میں ہی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرلیں۔ رچارڈسن کے اصلاحی خطوط نے 'پامیلا' بنکر ناول کی شکل اختیار کی۔ لیکن اسکے فوراً بعد ہی فیلڈنگ کا 'ٹوم جونس' مکمل ناول کی صورت میں آگیا۔ دوسرے ناول نگار نے پہلے ناول نگار کو کتنا پیچھے چھوڑا اسکا اندازہ اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ عجیب ماجرا نگاری کے باب میں جہاں فلابیر کے 'مادام بوری' اور ٹالسٹائی کے 'وار اینڈ پیس' کے نام لئے جاتے ہیں وہیں اس فہرست کی تکمیل 'ٹوم جونس' کے تذکرہ سے ہوتی ہے۔ ترتیب و تنظیم کی اعلیٰ مثال تو 'ٹوم جونس' بنا لیکن اسی عہد میں ادبی صنف میں انتشار و پراگندگی کا بھی فنی تجربہ کیا گیا اس سلسلہ میں اسٹرن کا 'ٹرسٹرم شینڈی' ایک شاہکار ہے۔ اس طرح اٹھارہویں صدی میں ہی 'شعور کی رو' کی تیکنک کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی جس پر بعد میں جیمز جوائس اور ورجینیا وولف نے عظیم عمارتیں کھڑی کیں۔

اردو کے ناول نگار ترقی تو کرتے گئے لیکن تجربے کی رفتار میں سرعت نہ آسکی، یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک ناول کو اخلاقی نقطۂ نظر کی وضاحت کا آلہ کار سمجھا گیا اور ناول نگار بہت دنوں تک ناصح اور مصلح کے فرائض انجام دیتے رہے۔ فنی تکنیک کے لحاظ سے اردو کا پہلا قابلِ لحاظ ناول 'امراؤ جان ادا' ہے۔ مرزا رسوا بڑے اچھے ماجرا نگار نہ تھے اس لئے پلاٹ میں ناہمواری ہے، ان کے یہاں کردار نگاری میں بھی نقص ہے لیکن 'امراؤ جان ادا' اپنے نقائص کے باوجود بے حد اہم ہے کہ مرزا رسوا نے اسے اپنے عہد کی زوال پذیر بورژوائی تہذیب کا آئینہ بنا دیا ہے۔ رسوا کے بعد پریم چند نے اس فن کو مزید جلا بخشی۔ 'گئو دان' ناول کے ارتقا کی سفر میں ایک اہم موڑ ہے۔ پریم چند نے بڑی فنکاری سے ناول کی جڑیں اس آب و گل میں نصب کر دیں جہاں کے ہم باشی ہیں۔ اس طرح ان کے ناول فنی لغزشوں کے بعد بھی زندگی کی تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ پریم چند کے بعد ناول کی صناعی کی طرف خاصی توجہ کی گئی۔ عزیز احمد کے ناول 'ایسی بلندی، ایسی پستی'، اور گریز نے کئے

گئے، ابھی بھی ایک کوشش عصمت چغتائی نے 'ٹیڑھی لکیر' میں کی۔ قرۃ العین حیدر اردو ناول کی ابو ثابت ہوئیں 'مجنیز' کے دونوں ہتھکنڈے ان کے حصے میں آئے۔ انہوں نے شعور کی رو

اور

فال بیک FALL BACK کے طریقۂ کار کو اپنایا اور ابہام کے لئے ہرمن میلول کے 'موبی ڈک' کی ALLEGORY کی راہ اختیار کی۔ اس طرح ایک بسیط ماضی 'آگ کا دریا' کا موضوع بنا۔ اچھے ناولوں کے شمار میں عبداللہ حسین کے 'اداس نسلیں'، شوکت صدیقی کے 'خدا کی بستی' اور جمیلہ ہاشمی کے 'تلاش بہاراں' کے نام آتے ہیں، لیکن یہ فہرست میری نظر میں 'حسرت تعمیر' کے تذکرہ کے بعد مکمل ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ شعر و ادب کے سلسلہ میں کسی شاعر یا ادیب کے اوائل عمر کا کوئی ناگوار تجربہ کبھی کبھی کسی عظیم تخلیق کا باعث بن جاتا ہے۔ چنانچہ بائرن کے پاؤں کے عیب نے اسے شاعر بنا دیا۔ ڈکنس ناول نگار نہ ہو پاتا اگر اسے چند ہفتے سیاہ کارخانے میں نہ بسر کرنے پڑتے۔ دوستو فسکی اور فلابر کے مراق نے انہیں عظیم ناول نگار بنا دیا۔ ہرچند کہ یہ خیال لغو ہے لیکن یہ بات کم از کم اختر اورینوی کے بارے میں ضرور صادق آتی ہے۔ 'حسرت تعمیر' کی تخلیق اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک کہ اس کے خالق کو چھوٹا ناگپور کی فضا کا پورا پورا حال معلوم نہ ہوتا، وہاں کی عوامی زندگی کی پسماندگی سے کلی واقفیت نہ ہوتی یا وہاں کی وادی خزاؤں کی جغرافیائی تفصیل معلوم نہ ہوتی۔ اختر اورینوی اپنی علالت کے سلسلہ میں چھوٹا ناگپور رہے تھے۔ اس طرح وہاں کی مٹی اور اس مٹی سے متعلق ضروری تفصیلات کا انہیں براہ راست تجربہ ہوا۔ اختر متعلقہ علاقہ کے حسن و قبح سے اسی طرح آگاہ ہیں جس طرح سون اور سین کی فضا سے۔ یہی وجہ ہے کہ 'حسرت تعمیر' کا اہم ترین پہلو اس کی ٹوپوگرافی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ٹوپوگرافی کے اعتبار سے اردو کا کوئی دوسرا ناول اس کے

مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جزئیات کی ایسی تفصیل اردو کے کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ چھوٹا ناگپور کے دیہی عوام کی پوری زندگی 'حسرت تعمیر' میں منعکس ہے۔ ان کے شب و روز کے احوال من و عن بیان کر دئے گئے ہیں۔

چھوٹا ناگپور کی جغرافیائی تفصیل ہی 'حسرت تعمیر' کا واحد حسن نہیں۔ اس میں دوسرے اہم محاسن بھی ہیں۔ اس کی ایک نمایاں خوبی قصہ کہنے کا ڈھنگ ہے۔ عام طور سے ناول دو طریقے سے لکھے جاتے ہیں۔ ایک طریقہ

کا ہے۔ اس طریقہ کار میں قصہ گو ہر جگہ موجود ہوتا ہے، وہ اپنے کردار کے رگ و پے میں نہاں ہوتا ہے، اسطرح وہ ایک مطلق العنان کی طرح ضرورت کے مطابق ان کی حرکتوں پر حکم لگاتا ہے۔ یعنی کسی کیریکٹر کے احساسات و جذبات اس کے اپنے احساسات و جذبات ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی کسی کردار کے احساسات و جذبات اس کے تجربے کی روشنی میں نئے ہوتے ہیں تو وہ اس کی عکاسی بالواسطہ طریقہ پر کرتا ہے۔ ایسے میں تجربے کی خامی آڑے آتی ہے اور متعلقہ کیریکٹر دب کر رہ جاتا ہے۔ یہ مشکل فرسٹ پرسن میں لکھنے والوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ واحد متکلم کا 'میں' ناول نگار کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا جاتا ہے اور ناول کے دوسرے کردار کی طرح ایک واضح کیریکٹر بن کر اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، اور ان پر ضروری روشنی ڈالتا ہے۔ 'حسرت تعمیر' میں یہی طریقہ کار اپنایا گیا ہے۔ اس ناول کا 'میں' اختر اورینوی کی اپنی ذات ہے۔ اس 'میں' کا نقطۂ نظر وہی ہے جو اختر اورینوی کا ہے۔ 'حسرت تعمیر' میں 'میں' نے بڑا کام انجام دیا ہے۔ وہ ناول کے دوسرے کرداروں کے آلام و آسائش کا شریک ہے، ان کی نفسیاتی الجھنوں سے واقف ہے اور بڑے عالمانہ طریقہ پر ان پر تبصرہ کرتا ہے۔

اختر اورینوی نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے

شاید' میں' کو کافی نہیں جانا' چنانچہ مسرور اور منظر کی تخلیق سے اس' میں' کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ بہرحال' میں' نے 'حسرتِ تعمیر' کے ماجرا کی تعمیر میں بڑی مدد کی ہے۔ 'میں' کے ساتھ ساتھ واقعات آگے بڑھتے ہیں' واقعہ پر واقعہ ثبت ہوتا چلا جاتا ہے۔ واحد متکلم ایسے سلسلہ کو ٹوٹنے نہیں دیتا' اس طرح ناول میں نظم و ضبط کی خوبی خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔ کامیاب ماجرا نگاری کی اہم ترین شرط تذبذب کی کیفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ای۔ ایم فارسٹر نے پلاٹ کے لئے اختتام تک 'اس کے بعد! پھر اس کے بعد!!' کی کیفیت کو ناگزیر بتایا ہے۔ 'حسرتِ تعمیر' میں بوس کی ذہنی قماش' اس کے پس منظر' اس کے احساس کمتری و برتری' اس کی چالاکی و بے وقوفی' اس کی آرزوؤں اور حسرتوں اور اس کے ہتھکنڈے اور کارگذاریوں کا قصہ کہا گیا ہے۔ لیکن قصہ کی فضا میں ڈرامائی عنصر ہر جگہ موجود ہے۔ بوس کے علاوہ ضمنی کردار سے متعلق حادثات و واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں جو کسی نہ کسی طرح بوس کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کا سبب بنے ہیں۔ بوس کے احباب' اس کے خوشہ چیں اور حاشیہ بردار' اس کی شریکِ حیات اور اسکے شریکِ کار پھر ان تمام افراد سے متعلق افراد بوس کے عروج و زوال کی کہانی سنانے میں مدد دیتے ہیں' ماجرا کو روکتے نہیں اسے اختتام تک لے جاتے ہیں' اس طرح کہانی کہیں اکھڑتی نہیں' بڑے منطقی طریقہ پر بتدریج آگے بڑھتی ہے اور بوس کی شخصیت کی وضاحت کرتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں بوس کے جیل چلے جانے پر 'حسرتِ تعمیر' مکمل ہو گیا ہے' اسے فطری طور پر وہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن منظر اور رسمی سوگیتی کا ضمنی قصہ مزید دو صفحے گھیر لیتا ہے' دراصل 'حسرتِ تعمیر' کی توجیہہ صرف صرف بوس کی حسرت سے نہیں ہوتی باقی منظر اور رسمی سوگیتی کے تعمیری خواب کا شرمندۂ تعبیر نہ ہونا بھی 'حسرتِ تعمیر' کا سوچا سمجھا المیہ ہے۔ کامیاب ماجرا نگاری میں کہیں نقص پیدا ہوا ہے تو اسی نیم رومانی' نیم تعمیری قصہ سے۔ یہاں ماجرا پر اختر اور مینری جیسی ذی علم شخصیت کے Idealism کا بوجھ پڑا ہے۔ حسرتِ تعمیر کے لئے یہ بوجھ ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

'حسرتِ تعمیر' کا پلاٹ الجھا ہوا نہیں ہے۔ اس میں سادگی و پرکاری ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کے پہلے سین کی طرح اسکا پہلا باب ہمیں چیدہ کرداروں کی خوبو سمجھا دیتا ہے اور ہمیں ناول کے قماش سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ بعد کے واقعات پہلے باب کی سرسری مگر اہم باتوں کی وضاحت ہیں۔ اسی سے ناول کی کوئی چول ڈھیلی نہیں ہوتی اور ماجرا ہر جگہ سے کسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

عام طور سے قصہ کی ترتیب کردار ہی کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ کردار کے نقوش کہانی بناتے ہیں' ناول نگار اپنی ضرورت کے مطابق کسی کیریکٹر میں رنگ و روغن بھرتا ہے۔ وہ واقعات کا کردار سے اس طرح تعلق پیدا کرتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر روشنی ڈالتے ہیں' کردار کی نمو صرف کہانی بناتی ہے بلکہ بعض اوقات وہ خیالات و نظریات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ بعض کردار ماحول اور حالات کے پس منظر میں اپنی صورت بدلتے ہیں لیکن بعض جامد و ساکت ہوتے ہیں۔ جامد و ساکت کردار ماحول کا اثر قبول نہیں کرتے' انگریزی میں ان دو خانوں کے کیریکٹر کو راؤنڈ اور فلیٹ کے نام دئے گئے ہیں۔ لازوال کردار وہی ثابت ہوئے ہیں جو انسان کی خوبیوں اور خامیوں کو پورے طور پر اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہیں' لیکن کسی ایک ناول میں تمام کیریکٹروں کے ساتھ یکساں سلوک ممکن نہیں' مرکزی کردار تو کوئی ایک ہی ہوتا ہے۔ دوسروں کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔ یہ ضمنی کیریکٹر دراصل مرکزی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے خد و خال کو واضح بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ایک ناول میں کتنے کردار ہوں اس کا کوئی تعین ممکن نہیں' ابھی بروننٹے کے

ڈوورنگ ہائٹس' میں جذب کر دا ہیں جبکہ ٹالسٹائی نے 'وار اینڈ پیس' میں سینکڑوں کیریکٹر پیدا کئے ہیں' لیکن اپنی اپنی خوبیوں کے اعتبار سے دونوں ناول شاہکار مانے جاتے ہیں۔

'حسرتِ تعمیر' میں بوس محبوب کی شخصیت کلیدی ہے۔ یہ ناول اس کی زندگی کی تفسیر ہے۔ بوس محبوب حاشیائیؔ آدمی ہے' خودرو پودے کی طرح بڑھا ہے' تربیت سے عاری ہے' مستحسن روایت کی چھینٹ بھی اس پر نہیں پڑی ہے۔ احساس کمتری اس کی روح کا ناسور ہے' امتیاز و افتراق کی اس دنیا نے اس کی پسماندگی کو چرکے لگائے ہیں۔ پسماندہ طبقہ میں تقابلی احساس کا پیدا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ یہ احساس بوس محبوب میں شدید تو ہے' سسرال کی برتری نے اس کے احساس کمتری کو ایک تازیانہ لگایا ہے' اس لئے اس میں فطری طور پر حالات سے لڑنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ سرکش ذہن اسے بہت کچھ کرنے پر مجبور کرتا ہے' قدرت ایک عرصہ تک اس کا ساتھ دیتی ہے' اس کی قسمت اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ طبیعت کی لچک اور محنت کی عادت اسے یکسر انقلابی بنا دیتی ہے۔ حاشیائی افراد میں ذہانت ضرور پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں قدرت بوس محبوب کے ساتھ اور بھی فیاض ہے' بوس محبوب کی ذہانت اس سے نت نئے تجربے کرواتی ہے۔ اس طرح وہ بے حد معمولی آدمی سے قابل لحاظ کیریکٹر بن جاتا ہے' اس پیشہ نے اسے اتنی دولت بخشی کہ وہ محبوب نگر کی تعمیر کے ساتھ ساتھ چھوٹا ناگپور میں صنعتی انقلاب لانے پر کمربستہ ہے۔ اس کے خواب بیکار محض نہیں' وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ سخت محنت کرتا ہے۔ شرنعات کی ترقی اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے' وہ ٹاٹا اور ڈالمیا بن جانا چاہتا ہے۔ بے ترتیب و حساب دولت خرچ کرتا ہے یہاں تک کہ صنعتی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا اور تعمیر کی حسرت دل میں لئے زنداں میں مقفل ہو جاتا ہے۔

ذہن کی ایسی انقلابی افتاد اور تعمیر و ترقی کی ایسی لگن کے باوجود بوس محبوب روحانی طور پر بیمار ہے' یہ بیماری شریکِ حیات کے عدم تعاون کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بیوی جو بجال نہیں' اچھی صورت نہیں رکھتی' ڈھنگ سے ساری تک نہیں پہن سکتی' غم ربائی اور دل نوازی نہیں جانتی' ہمت افزائی نہیں کر سکتی' شوہر کی برتری تسلیم نہیں کرتی' سخت گیر اور نکتہ چیں ہے۔ بوس محبوب اپنی شریکِ حیات کے آگے بے بس ہے' خودکشی کے ڈھونگ سے بھی بات نہیں بنتی' دوسری بیوی بھی اس کے رخوں کا علاج نہیں بنتی بلکہ اس کی الجھنوں میں اضافہ کرتی ہے۔

بوش کی زندگی کا انتشار اسے مسائل کو یکسوئی اور تدبّر سے حل کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے باوجود احمق ہے۔ اس کے پیچھے چاپلوسوں کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ جن کی چالیں وہ سمجھ نہیں پاتا' تحسین ناشناس سے خوش ہوتا ہے کھرے اور کھوٹے میں تمیز نہیں کیا اس اپنے زوال کا سامان خود مہیا کرتا ہے۔ 'میں' کے الفاظ میں "بوس جنگلی پودے کی طرح بڑھا ہے..... اس کی خاندانی روایات مجہول ہیں..... خود بیگم کی ذات کے پتھر نے اپنے دباؤ سے بوس کی سیرت میں سبزہ اگنے نہ دیا۔" مسرور نے کہا ہے۔ "بوس میں تخیل کی پرواز ہے مگر تدبر کا استحکام نہیں۔" تدبر کے استحکام کے نقدان نے اس کے کیریکٹر کو داغدار بنا دیا ہے اور نو دولتا محبوب شرابی اور عیاش ہے۔ اس کا ضمیر اس مٹی سے گوندھا گیا ہے جس مٹی سے "وار اینڈ پیس" کا ہیرے PIERRE بنا ہے۔ دونوں ہی الجھے ہوئے کیریکٹر ہیں جس اور عورت کے الیسا ہیں۔ گاہے چالاک اور گاہے احمق ہیں۔ خلوص اور محبت کے جذبات سے عاری نہیں۔ ایسی متضاد

عـہ حاشیائی کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اتنا صاحبِ علم اور ترقی یافتہ سمجھتا ہو کہ سماج کے اصول و ضوابط اسے تنگ اور ناکافی معلوم ہوتے ہوں' چنانچہ اپنے اعمال و افعال میں وہ سماج کے آداب و اخلاق سے بالکل آزاد ہو۔ — ادارہ

باتیں دونوں کی کردار کو دلچسپ بناتی ہیں۔

اور سیر مجیب، جبل انور اور متین طبیعت کی مختلف افتاد کے باوجود ایک ہنچ کا کام انجام دیتے ہیں۔ عقد ثانی کے بارے میں بوس کے ذہنی الجھنوں کو مزید الجھاتے ہیں۔ وہ اس دوڑ میں ایک دوسرے کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ ذہانت بیش و کم کے فرق کے ساتھ سبھوں کا حصہ ہے۔ اس طرح وقفے وقفے کے ساتھ وہ ایک دوسرے کو مات دیتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور اس سلسلہ میں بوس کا سیمابی مزاج ایک نئی راہ نکال لیتا ہے۔

یہ تینوں کردار اپنی اپنی جگہ پر نمایاں ہیں اور اپنی کارگذاری سے قصہ میں نئی دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔

شمشیر گھرانے کا ضمنی قصہ مزید کردار کی تخلیق کا باعث بنا ہے۔ یہ کیریکٹر اپنے ضمیر کے اعتبار سے "میرے بھی صنم خانے" کے افراد سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ مسٹر شمشیر الدولہ، ان کی اہلیہ مسز گنگولی، ان کی لڑکیاں سلمیٰ سوگیتی، عذرائے شانتی اور بینا فرحت کی کہانی مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن پر ایک گہرا طنز ہے۔ ان کے یہاں سج دھج اور آرائش میں مصنوعی بے اعتدالیاں ہیں۔ ملنے ملانے کی آزاد روش ہے، پینے پلانے کے بے تکلف مرحلے ہیں۔ روح سے عاری حسن ان کا ورثہ ہے۔ اس خدا کی یہ دین سطحی نمائش کا ذریعہ ہے اور ناجائز آمدنی کے حصول کا ہتھکنڈہ بھی۔ ناول نگار نے ان کی تخلیق میں بڑی محنت کی ہے اور حسن و ادا کی یہ ڈالی نائیں اپنے بے پناہ حسن، اپنی کافر اداؤں اور اپنے دلکش چونچلوں سے دل موہ لیتی ہیں۔ لیکن ان کا بھرم زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ خود ان کے خاندان کی ایک فرد سلمیٰ سوگیتی کی سنجیدگی ان کے تمام اصولوں کے خلاف ایک آواز ہے۔ سلمیٰ سوگیتی پر دولت کے غلط اثرات نہیں پڑے۔ مصنوعی آرائش سے اس کا حسن اور مزاج آزاد ہے، اس کے یہاں عذرائے شانتی کا چونچال پن نہیں۔ عذرائے شانتی جسم کو سنوارنے میں اپنا وقت صرف کرتی ہے جبکہ سلمیٰ سوگیتی اپنی روح کو محبت پذیر رشتانہ سمجھتی ہے۔ یعنی عذرائے شانتی مسز شمشیر کے اصولوں کا ایک نقش جدید ہے۔ اور سلمیٰ سوگیتی ان اصولوں کے خلاف ایک زبردست محاذ۔

سلمیٰ سوگیتی اور منظر کے رابطے نے ایک دوسرے کو سنبھالا ہے۔ منظر بنیادی طور پر عندلیب گلشن ناآفریدہ ہے، اس کی سنجیدگی اور متانت سبھوں کا دل موہ لیتی ہے۔ خصوصاً سنجیدہ مزاج افراد کے لئے اس کا کیریکٹر بے حد پرکشش ہے۔ سلمیٰ سوگیتی اپنے ذہن کی فطری افتاد کے باعث منظر کی طرف کھنچ جاتی ہے۔ روح کی بالیدگی دونوں کا اثاثہ ہے۔ یہ بالیدگی شدید جنسی تقاضے کے باوجود انہیں الگ رکھتی ہے۔ اور وہ جسم کی پکار سے پیہم لڑتے گاندھی جی کی راہوں پر قومی و ملکی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ دراصل سلمیٰ سوگیتی اور منظر ناول نگار کے آئیڈیل کردار ہیں۔ ان کی خوبوں میں ناول نگار کی اپنی روح سمائی ہوتی۔ آخر ملک و قوم کے مسائل کے حل کے لئے ایسے ہی افراد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن "حسرت تعمیر" کے یہ لوگ ہماری دنیا میں خال خال ہی تو ہیں۔

کپتان شہباز جنگ کی ہولناکیاں بیان کرتا ہے۔ جنگ کی مکروہ صورت اس کی تفصیل سے مشخص ہو گئی ہے۔ میدان جنگ کپتان شہباز کی تجربہ گاہ رہا ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں خلوص کی آنچ ہے۔ اس کے الفاظ ہیں "جنگ انسانوں کو مشین بنا دیتی ہے۔ . . . جذبات بہیمانہ کی لذت سے بھی سپاہی محروم ہو جاتا ہے۔ . . . . . تیز رفتار جنگ کی بھٹی میں زندہ انسان بھی لوہے کے دہکتے ہوئے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ . . . . . میدان جنگ میں نوجوان لاشوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ سانس کتنی قیمتی چیز ہے"۔ شہباز اپنی ناکامیاب محبت کی کہانی میدان جنگ میں بھی نہیں بھولتا، تسلیم اسے وہاں بھی جھنجھوڑتی رہتی ہے اور سلمیٰ سوگیتی کے حضور میں وہ دور ہی سے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

مولوی نجابت علی شریف گھرانوں کے بدلتے ہوئے حالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انکی شخصیت میں لچک ہے۔ وہ تعلیم نسواں کے حق میں ہیں اور اپنے خوانوادوں کو زیور علم سے آراستہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی صاحبزادیوں کو تیراکی بھی سکھاتے ہیں۔ بس محبوب کی دولت سے ان کی آنکھیں خیرہ بھی ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی خاندانی روایت کو یکسر بھول جانے پر آمادہ نہیں۔ ان کی مغربیت میں مشرقیت کی مستحسن روائتوں کا واضح ردعمل ہے۔ اس لئے مغربی مرد کو وہ قبول کرنے میں ایک حد اعتدال کے قائل ہیں۔

ایسے کردار کے علاوہ کالنڈی اور سرکنڈی کے باشندے بھی ہیں۔ یہ آدی باسی ہیں۔ مفلس و قلاش ہیں لیکن بہادر اور محنتی ہیں۔ ان میں مادرن چولا ہو یا اموٹیگا، کبھی لکڑا ہو یا برگی سب کی طبیعت ایک ہے اور قسمت بھی۔ تہذیب و تمدن کے ہاتھ اب تک ان کے سروں پر سایہ نہ کر سکے ہیں۔ اس لئے مثالی محنت و مشقت کے باوجود ان کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ ایسے کردار کا المیہ بڑے خوبصورت انداز میں ”حسرت تعمیر“ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ رینگتے ہوئے کردار اپنے ولولے اور جوش کے اعتبار سے ہر وقت زندہ ہیں اور زندہ رہنے کے لئے ہر لمحہ مرتے ہیں۔

”حسرت تعمیر“ اپنے عہد کے بہت دھاروں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ دراصل ادب خلا کی کوئی چیز نہیں، اس کا تعلق بہرحال زندگی سے ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی سے اس کا ربط ناگزیر ہے۔ زندہ ادب اپنے وقت کے تقاضوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جین آسٹن کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں وقت کی اہم تحریکوں کو جگہ نہ دے سکی تھی۔ اس طرح ”پرائیڈ اینڈ پری جوڈس“ یا اس کے دوسرے ناول نپولین کی جنگ کے دوران لکھے گئے، لیکن اس جنگ کا ان میں کوئی تذکرہ نہیں۔ ”حسرت تعمیر“ کے خالق نے اپنے وقت کی تحریکوں کا خاص خیال رکھا ہے اور اپنے کردار کی گفتگو اور عمل کے ذریعہ ان کی تصویر پیش کر دی ہے۔ چنانچہ اس ناول میں جہاں روس اور چین کے انقلاب، مسولینی کے زوال کے تذکرے ہیں۔ وہیں ۴۲ء کی تحریک کے لوازمات، چرخہ اور کھدر کی بحث، گاندھی جی کا نقطہ نظر، ہندو مسلم فساد اور انگریزوں کے اکھڑتے ہوئے قدم اور ان کی سازشیں، پھر ہندوستان کی تقسیم کی باتیں بڑے فطری انداز میں اس کا جزو بن گئی ہیں۔

ہنری جیمز اور مری ڈتھ کے اسلوب نگارش پر تنقید کرتے ہوئے نقادوں نے لکھا ہے کہ ان کے ناولوں کے کردار کی زبان وہی ہوتی ہے جو ہنری جیمز اور مری ڈتھ کی زبان ہے۔ ”حسرت تعمیر“ کے خالق کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ”حسرت تعمیر“ کے کیریکٹر کی زبان وہی ہے جو اختر اورینوی کی زبان ہے۔ ہر جگہ الفاظ گویا نگینے جڑے نظر آتے ہیں۔ ہر کریکٹر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے چیدہ اور منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کے پس منظر کے اعتبار سے اس کے بس کی بات نہیں۔ تعلیمی اعتبار سے پرس محبوب کی کوئی اہمیت نہیں لیکن اس کے الفاظ ہیں ”محبت بغیر دوشیزگی بدن یا دوشیزگی خیال کے ہو ہی نہیں سکتی ہے“ ”میری کارگاہ میں دوشیزائیں نہیں آتیں نہ جسم و جان کی کنواریاں نہ ذہن و گمان کی اچھوتیاں“

اوپر کی بحث اس نتیجہ پر پہونچاتی ہے کہ بحیثیت مجموعی ”حسرت تعمیر“ اردو ناولوں کے ارتقا کے باب میں ایک سنگ میل ہے اور اختر اورینوی کو ناول نگاروں کی پہلی صف میں ممتاز جگہ دیتا ہے۔

محمد لطف الرحمٰن

اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ

اردو ادب بالخصوص تنقید میں انتشار و اختلال، افراتفری، انتہا پسندانہ بے راہ روی کورانہ تقلید اور تعصب و تنگ نظری کا شکار ہے یہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اردو کے ادباء شعراء اور ناقدین شدید احساس کمتری کے شکار ہیں۔ جس کا خطرناک ردعمل بڑے واضح انداز میں ہمارے ادب پر اپنے اثرات مترتب کر رہا ہے۔ ہمارے ائمہ فن کی اکثریت اپنی کم مائیگی علم اور اپنے کھوکھلے پن کو چھپانے کیلئے انگریزی ادیبوں کے بڑے بڑے مجسمے نام گنانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اور مارکس، ہیگل، ڈارون فرائیڈ، بنتھم، ایلیٹ وغیرہ کا وظیفہ پڑھنے میں اپنی نجات سمجھتی ہے۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر ان کے بنیادی نظریات و فکریات سے اسی طرح نابلد ہیں جیسے میں اور آپ۔ خیر انگریزی ادب تو بہت ہی وسعت و ہمہ گیری کا حامل ہے۔ یہ حضرات خود اپنے ادب کے سرمایہ سے بھی پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ اور نہ انھیں اس کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ ہے ممکن ہے میری باتیں آپ کو بری لگیں لیکن حقیقت کو صاف دلی سے تسلیم کر لینے میں بڑی عظمت ہے۔

جہاں اقبال کی عظمت کا اندازہ صرف اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ وہ ایک عظیم فلسفی تھا، قوم کا ایک بڑا رہبر اور مصلح اور ایک صاحب دل صوفی جس کی حیثیت پیمبرانہ عظمت کی حامل تھی۔ جو قوم مسلم کے زوال و انحطاط کے ماتم گروں میں سب سے بڑا نوحہ خواں تھا ـــــ اور اس کی شاعرانہ اور ادبی اہمیت و خصوصیت کو نظر انداز کر دیا جائے کہ ناقدین و ماہرین فن کے نزدیک اس کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی اس ادبی و تنقیدی سرمایہ کا کوئی مستقبل تاریخ ادبیات عالم میں نہیں ادب و تنقید کی ایسی گمراہیاں، گھٹن اور مسموم فضا میں کسی فنکار کے متعلق حقیقت پسندانہ انداز میں کچھ کہنا انا الحق کہہ کر دار پر چڑھ جانے سے کم نہیں میں بھی اسی جرم کا مرتکب ہوا چاہتا ہوں۔ میری سلامتی کی دعائیں کیجئے۔

زیر نظر مضمون کی شان نزول ادکار کے نئی تخلیقی نمبر میں شکیلہ اختر صاحبہ کے ایک خود نوشت سوانحی مضمون کے درج ذیل سطور ہیں۔

"میری تمنائیں بس اتنی ہیں کہ لوگ میرے افسانوں کو میرا اپنا لکھا ہوا سمجھا کریں۔ مجھے اس بات کا بڑا غم ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے افسانے اختر صاحب لکھ دیتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اختر صاحب کے لکھنے کا انداز مجھ سے بالکل الگ ہے۔ ان کے پاس الفاظ کے ذخیرے

ہیں اور میرے یہاں نہیں دیتی۔ سیدھے سادے الفاظ، بس جو دیکھا محسوس کیا اور اسی کو اپنی گھریلو زبان میں لکھدیا ——— !

اردو کے ایک عظیم اور منفرد فن کار کے یہ سطور اردو ادب کے دامن کیلئے لمحۂ فکریہ ہیں۔ کیا حقیقتاً اردو کے ناقدین و قارئین غور و فکر کی تمام صلاحیتیں کھو چکے ہیں کہ ان کو اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کی منفرد فنی خصوصیات کا صحیح احساس و اندازہ نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ دونوں فنکاروں کی راہیں قطعی الگ ہیں۔ ان کی ذہنی، نفسی، فکری اور نفسیاتی افتاد اور ماحول میں اتنا بین اور واضح فرق ہے جو بیک نظر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے اندر کی حسن کارانہ شخصیت کی دنیائیں ایکدوسرے سے الگ اور جدا ہیں۔ ان کے تجربات و مشاہدات تخلیقات و تصورات، نظریات و فکریات اور ان کی پیش کش میں اتنا بعد اور اتنی تفریق ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی تخلیقات و اختراعات پر کسی دوسرے کا شبہہ کرنا کج فہمی و کم بینی کے مترادف ہوگا۔ اگر اردو کے ناقدین و قارئین میں سے کچھ افراد بھی ایسے تصورات رکھتے ہیں تو یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شکیلہ اختر کا یہ کرب ناک اور غم انگیز احساس کسی بنیاد پر ہوگا۔ اس لئے آئیے ہم ان دونوں فن کاروں کے فن کا تجزیہ کرکے ان کی فنی اور جمالیاتی خصوصیات اور امتیازی صفات کو واضح کردیں تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔

اختر اورینوی کے اب تک پانچ مجموعے ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ منظر و پس منظر، کلیاں اور کانٹے، انار کلی اور بھول بھلیاں، سمنٹ اور ڈائنا میٹ، اور کینچلیاں اور بال جبریل ——— اور شکیلہ اختر کے دو مجموعے ڈائن اور آگ اور پتھر۔ ان تمام مجموعوں کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بہت ہی بھرپور اور واضح طور پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ منظر و پس منظر سے، کینچلیاں اور بال جبریل تک کی منزل میں زندگی اور وجود کا عرفان حاصل کرنے کیلئے جو روح بیتاب نظر آتی ہے۔ وہ ڈائن اور آگ اور پتھر کے فنکار کی نہیں ہو سکتی۔ ان افسانوں کا خالق اختر اورینوی دور سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈائن اور آگ اور پتھر کی مصنفہ بھی بہت ہی دور سے اپنے انفرادی انداز و رجحان کی بنا پر متشخص کرلی جاتی ہے کہ یہ بھی اپنے حدود میں انفرادی حیثیتوں اور زاویوں کے ساتھ احساسات و جذبات کے تروتار میں جلتی ہوئی اپنی تکمیل کیلئے بیقرار اور سرگرداں ہے۔ ان دونوں فنکاروں کے احساسات میں ممکن ہے کہ کچھ مماثلت نظر آئے۔ لیکن یہ مماثلت یکساں حادثات و اتفاقات کی پیدا کردہ ہے۔ اور ان اثرات کی بنا پر بھی ہے جو ان دونوں نے عملی زندگی میں ایک دوسرے سے اتنی قربت کی بنا پر اخذ کئے۔ ویسے اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ تمام بڑے فنکار اپنی وجدانی منزل میں یکساں احساسات و جذبات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود اختر اورینوی اور شکیلہ اختر دو منفرد شخصیتیں ہیں۔ جو الگ الگ اپنی اکائی بناتے ہیں۔ اس لئے ان میں سے کسی ایک کے فن پر کسی دوسرے کا احتمال ممکن نہیں۔ اور اگر ایسا ہو تو یہ کج فہمی و کم نظری کی بنا پر ہوگا۔

ادب میں اسلوب بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ اسلوب کی جمالیاتی کشش اور حسن کارانہ دلآویزی ہی کسی تحریر کو ادب کے دائرے میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ ادب کس درجے اور معیار کا ہے۔ اور اس وقت ادب میں اسلوب کے ساتھ موضوع اور مواد پر غور کرتے ہیں۔ پہلی منزل طرز اظہار اور سلیقۂ بیان کی ہے۔ پھر یہ کہ ادیبوں کے مخصوص و منفرد انداز کو اجاگر کرتے ہیں اسلوب بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جو کسی ادیب کی عظمت و انفرادیت کی تشکیل و تجسیم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے فن کی راہیں مختلف ہیں۔ اختر اورینوی کے اسلوب میں بڑی شان و شوکت، پر جلال، بلندی و عظمت، جمالیاتی سنجیدگی و متانت دلآویزی وسعت و ہمہ گیری، جاذب توجہ روانی اور ہمواری کیساتھ

ساتھ قابلِ قدر دلکشی و دلنشینی ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا ایک بحرِ بے کراں ہے۔ وہ اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کی بندش و چستی، تراکیب کی ندرت و جدت اپنی تمام تر معنویت و خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ الفاظ کے استعمال میں بہت ہی صناعانہ فنکاری سے کام لیتے ہیں۔ اردو کے کم ادیب الفاظ و تراکیب کے استعمال میں اپنی جدت طرازی و ندرت آفرینی سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ لفظوں کو معانی و مطالب کے نئے نئے گوشوں اور زاویوں سے متعارف کراتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اختر اورینوی کا اسلوب خفی معنوی وسعت و ہمہ گیری، باطنی عمق و گیرائی اور ظاہری دلکشی و جاذبیت اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اردو کے کم ہی ادیبوں کے اسلوب میں اتنی معنی آفرینی اور دلنشینی ہوگی۔ یہ اختر اورینوی کا قطعی اپنا شخصی اور ذاتی اسلوب ہے جو خونِ جگر کی آبیاری سے معجزۂ فن کے طور پر رونما ہوا ہے ان میں کہیں ناہمواری نہیں پائی جاتی۔ بہت ہی منفرد طرز کا ادا ماہر کے اسلوب میں بھی کہیں کہیں ثقالت، بوجھل پن، ناہمواری، جھول، آورد اور تکلف و تصنع کی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً ابوالکلام آزاد جیسی بے مثال نثر لکھنے والے کے یہاں بھی کبھی کبھی گرانباری اور ثقالت کی فضائیں ملتی ہیں۔ بالخصوص جب وہ خشک فلسفیانہ مسائل کی موشگافیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ لیکن اختر اورینوی کا اسلوب مجموعی طور ان کی شخصیت کی طرح سدابہار ہے۔ بالکل سرسبز و شاداب، تازہ و جولاں، اس میں گنگا کی سی روانی و تیزی بھی ہے اور بادِ صبا کی سی نرم خرامی و شوخی بھی۔ میں یہاں بغیر کسی تخصیص کے ایک مثال پیش کروں گا۔

"اب ثروت کا خیال بھی میرے لئے محرومی و ناکامیابی کا اشاریہ تھا۔ اُف! بیسویں صدی کا نوجوان کتنی تمنائیں، کتنے ارمان اپنے دل میں رکھتا ہے۔ ان میں اکثر آرزوئیں گھٹ گھٹ کر دم توڑ جاتی ہیں۔ اور جو پوری بھی ہوتی ہیں وہ کچلا کچلا کر اور مسلا مسلا کر پوری ہوتی ہیں۔ میں دن بھر ایک وحشی بن جانے کی خواہش میں گھلتا، کھولتا، گھٹتا اور منجمد ہوتا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ اگر جائز تمناؤں کے گرد بھی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اگر معصوم خواہشوں کی گردن میں بھی بھاری بھاری سلیں ہیں تو پھر دنیا کسی ستارۂ تخریب سے ٹکرا کیوں نہیں جاتی۔ زلزلہ دہ رف بہار اور کو گرطین کیوں آتا ہے۔ سارے عالم میں یک وقت زلزلہ کیوں نہیں آجاتا..............؟" (شادی کے تحفے)

یہ ہے وہ سحرکارانہ اندازِ بیان جو اختر اورینوی کے اسلوبِ نگارش کا امتیازی وصف ہے۔ اس کو جادو بیانی سے تعبیر کیجئے تو بیجا نہ ہوگا ان کے اسلوب میں خطابت کا زور و شور، قصیدہ کی گرمی و حرارت اور غزل کی دل گرفتگی و اثر پذیری مکمل طور پر موجود ہے۔ طرزِ تحریر کی یہ خصوصیات ان کے افسانوں کو شکیلہ اختر کے افسانوں سے بالکل الگ اور منفرد وصفات سے متّزہ کرتی ہیں۔

شکیلہ اختر کے اسلوب میں سادگی کا حسن اور بے ساختگی کا جمال ہے۔ اس میں وہ عظمت و شوکت تو نہیں جو اختر اورینوی کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے۔ لیکن اس میں سادگی و صفائی برجستگی و بے ساختگی سلاست و روانی دل گرفتگی و اثر پذیری جاذبیت و رعنائی کے تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس اسلوب میں نسائیت کا تقدس اور اس کی پاکیزگی و معصومیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس میں آبشار کی سی نرم خرامی اور بانسری کی مدھم اور موہن موسیقی کی لہریں ہیں۔ جبکہ اختر اورینوی کے یہاں نغموں کا تلاطم ہے۔ شکیلہ اختر کے یہاں الفاظ و تراکیب میں وہ جدتِ ادا اور ندرتِ بیان نہیں جو اختر اورینوی کا مخصوص انداز ہے پھر بھی بے ساختگی و برجستگی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اس اسلوب میں بڑا دلآویز رس ہے۔ جس میں بڑی شیرینیت اور بڑا

ٹھاس ہے۔ ان کے یہاں ٹھیٹھ ہندی محاورے اور عام بول چال کے ساتھ ساتھ بیگماتی لہجے کا احساس بھی موجود ہے۔ جو نسوانی فطرت کا غماز ہے۔ اختر اورینوی کے تیور سے مردانہ وجاہت و عظمت، سختی و کرختگی ٹپکتی ہے تو شکیلہ اختر کے لب و لہجے سے شیریں ادائیں اور ان اداؤں کی نزاکت و نفاست بھی۔ وہ عام بول چال کی زبان کو سلیقہ اور حسن سے فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت و مہارت رکھتی ہیں۔ کہیں تصنع، تکلف یا آورد کا احساس نہیں ہوتا۔ اختر اورینوی کی زبان پڑھے لکھے اور اونچے طبقے کی زبان ہے۔ سوائے ان جگہوں کے جہاں کردار نچلے طبقے کے لیے گئے ہیں۔ مگر شکیلہ اختر کی زبان عام لوگوں کی زبان ہے جو بغیر کسی تکلف کے استعمال کر دی گئی ہے۔ یہ زبان اپنے فنکار کے سلیقہ اظہار، طرز اور حسن استعمال سے ایک منفرد اور دلکش اسلوب پیدا کرتی ہے۔ پیش کش میں اختر اورینوی اور شکیلہ اختر دونوں ہی باشعور اور چابکدست فنکار ہیں۔ البتہ اس کے انداز میں دونوں کے یہاں بہت ہی روشن اور واضح فرق ہے۔ اور بلاشبہ اختر اورینوی کی طرح شکیلہ اختر بھی اپنا ایک الگ اسلوب رکھتی ہیں۔ میں یہاں بھی ایک مثال بغیر کسی تخصیص کے پیش کر دوں گا۔

"ہائے توبہ! پلنگ پر بیٹھی ہوئی تینوں بہنوں کی نگاہیں ایک ساتھ اوپر اٹھ گئیں۔ یہ جو صبح ہی صبح ایسی منحوس صورت پر نظر پڑی ہے تو اب اللہ جانے سارا دن کیسا کٹے گا۔ چھوٹی بہن منہ ہی منہ میں بدبدائی۔ چکنی سی لاٹھی کے سہارے بائیں پہلو پر جھکی ہوئی ایک بڑھیا عجب بے ڈھنگی چال سے چلتی ہوئی برآمدے کے نیچے پائے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ پسینے سے شرابور اور سڑی ہوئی مچھلی کے باس سے بسی ہوئی کسی مریل کتے کی طرح وہ منہ پھاڑے ہوئے ہانپنے لگی۔ اور اس طرح ہانپتے ہوئے اس کا کالا بھوت چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔" (ڈائن)

مختصر یہ کہ اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے اسالیب کی الگ الگ امتیازی خصوصیات ہیں۔ جو اس قدر واضح، روشن صاف اور بھرپور ہیں کہ دونوں کو ایک فنکار کی کاوش کا نتیجہ سمجھنا حماقت ہے۔ دونوں کے فن اور اس کی پیش کش الگ الگ نوعیت کی حامل ہیں۔ اور دو غیر مطمئن اور ناآسودہ روحوں کے ذہنی افکار کی الگ [illegible]

دوسرا امتیازی افتراق و اختلاف ان دونوں فنکاروں کے یہاں تجربات و مشاہدات کی تعبیرات و تفسیرات کی الگ الگ ناہمیتوں کا ہے۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے بھی یہ دونوں حسن کار مختلف فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ کہیں کسی طرح کی یکسانیت و مشابہت محض حسن اتفاق کی بنا پر ہے۔ ورنہ دونوں کے فن میں دو مختلف فنکاروں کے دلوں کی دھڑکنیں صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔

اختر اورینوی کے یہاں فنی احساس و ادراک کی منزلوں سے گزر کر فلسفہ فکر کی دنیاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ وہ زندگی کے بہت ہی گہرے، گمبھیر اور سنجیدہ و متین مسائل کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اور عالمگیر و آفاقی افکار و احساس کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے یہاں فلسفیانہ اور مفکرانہ طرز استدلال بھی ہے۔ اور رومانی طریقہ اظہار بھی، جمالیاتی مثالیت پرستی بھی اور فنی حقیقت پسندی بھی۔ وہ عام اور سیدھے سادے تجربات و مشاہدات کی بھی بہت ہی گہری اور بصیرت انگیز تعبیر و تفسیر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی تہذیب و تقدیر میں بڑی فلسفیانہ گہرائی اور ہمہ گیرانہ وسعت و ہمہ گیری ہے۔ ان کا فن بہت ہی بوقلموں اور متنوع ہے۔ شکیلہ اختر کے یہاں یہ تنوع اور وسعت نہیں۔ وہ عام تجربات و حیات کو بہت ہی صاف اور سیدھے انداز میں پیش کرنے کی عادی ہیں۔ ان کے فن میں سادگی، خلوص اور صداقت کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا فن احساس و ادراک کی درمیانی منزلوں میں ہے اور اپنی حدود

سے واقف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی مخصوص فضا میں ان کا فن بڑا عظیم اور بہت ہی برتر ہے۔ اور اپنی ذاتی اور نجی خصوصیات اور آداب رکھتا ہے۔ جو اس کی غیر فانی زندگی کے ضامن ہیں۔ شکیلہ زندگی کے معمولی واقعات و حادثات کو بغیر کسی فلسفیانہ نظام فکر کی سنجیدگیوں کے پُرخلوص ایمانداری سے فنکارانہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اور یہی ان کے فن کی معراج ہے۔ اورینوی کے یہاں کبھی کبھی فن پر فلسفہ و فکر کی گرانباری حاوی ہوجاتی ہے۔ جس سے افسانے کی فضا بوجھل ہوجاتی ہے۔ مگر ناگواری کی حد تک نہیں۔ البتہ فن قدرے مجروح ضرور ہوتا ہے۔ مگر مجموعی طور پر ان کا ادب آفاقی اور عالمگیر حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اورینوی کے وہ افسانے زیادہ غیر فانی و دوامی اقدار کے حامل ہیں۔ جو فلسفیانہ سنجیدگی اور مفکرانہ خیال پرستی کے جذباتی احساسات سے قدرے بوجھل ہوگئے ہیں۔ مثلاً، کچلیاں اور بال جبریل، سمنٹ اور ڈلنا بیٹ، سینو کے دیش میں اور محشر وغیرہ۔ یہ وہ افسانے ہیں جو اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں قابل قدر ارتقائی بلندیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے بے مثل انداز و بیان اور فضا بندی و ماحول آفرینی سے اپنے بعد کے بیشتر ادیبوں کو متاثر کیا ہے۔

شکیلہ کی کہانیوں کا ماحول فکر و فلسفہ کی خشک سنجیدگی سے بوجھل اور گرانبار نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے بہت ہی عام اور روزمرہ کے مسائل کو اٹھاتی ہیں۔ اور ان کا تجزیہ و تحلیل کرکے زندگی اور سماج پر اس کے دیرپا اثرات کو واضح کرتی ہیں۔ اس عمل میں بھی ان کے یہاں فن مجروح نہیں ہوتا۔ بلکہ دلچسپی کے تمام عناصر کے ساتھ کہانی ارتقائی بلندیوں کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ان کے ذاتی اور نجی تجربات و مشاہدات کی حسین و دلنشین عکاسی ہیں۔ ان کا غم ذاتی غم ہے اور اپنی حدود میں مطمئن ہے۔ لیکن اورینوی کا غم و درد عالمگیر انسانیت کا دکھ اور درد ہوجاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات ان کے یہاں کائنات کے آلام و مصائب کا شدید احساس کرب ناک سنجیدگی اختیار کرلیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے زندگی بیزاری اور فراریت کا جذبہ دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اس انداز اظہار میں بھی وہ سلیقہ اور حسن فن موجود ہے جس سے زندگی کی تہذیب و تقدیر ہوتی ہے۔ اور زندگی کو حسن و خیر سے ہم آغوش کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اس سے کہانی میں دلچسپی کا عنصر ضرور کم ہوجاتا ہے۔ فلسفہ و فکر کو شعریت کا حسن اور اس کی دلنوازی بخشنا بڑا مشکل امر ہے پھر بھی اورینوی بہت حد تک اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔

شکیلہ کی دو کہانیاں منزل اور سرحد پر، ایسی کہانیاں ہیں جو اپنے دامن میں فلسفیانہ بحث و استدلال کے تمام امکانات رکھتی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ شکیلہ کے ان افسانوں میں فکری پہلو بہت روشن ہے۔ کیونکہ ان میں زندگی کی ماہیت و اصلیت اس کی حقیقت و واقعیت اور حادثات و حالات کی بے رحمی و سنگدلی پر بڑی گہری اور بصیرت انگیز تنقید ہے۔ مگر اتنے شیریں انداز میں یہ تنقید کی گئی ہے کہ نثر میں شعریت کا حسن خوب ملتی ہے۔ انھوں نے فنی تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔ اور یہ بڑا کمال ہے۔ شکیلہ ہمیشہ اپنے موضوعات کو اپنی فطری اپج اور اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیت سے عظمت و وسعت اور آفاقیت و ہمہ گیریت عطا کرتی ہیں وہ فنی احساس و شعور کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں۔ ان کے یہاں سادگی میں، تقدس معصومیت اور پربہار شگفتگی ہے جو قاری کو حسن کار کے ذہنی رجحان سے مکمل طور پر ہم آہنگ کردینے میں مدد و معاون ہے۔ اورینوی کی عظمت و فنکاری قاری کو بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔

اورینوی رومانی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے نیاز سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے یہاں رومانی رجحان نمایاں ہے۔ ابتدائی دور میں تو ان کا یہ میلان بہت ہی واضح اور بھرپور طور پر سامنے آتا ہے۔ مگر اب اس کی صرف جھلکیاں ملتی ہیں

اسی انداز نظر کی بنا پر صنف نازک کی طرف میلان طبع جھکاؤ اور
کشش کے جذبہ کا اظہار ان کے یہاں بہت ہی والہانہ انداز میں ہوا
ہے۔ اور اگر آپ اسے جمال پرستی سے تعبیر کیجئے یا رومانیت سے
لیکن میں اسے نفسیاتی افتاد کی ایک جبلی و فطری خصوصیت سمجھتا
ہوں جو جمالیاتی کیف و انبساط سے مملو ہے۔ ہمارے ادب میں بعض
اصطلاحیں بہت ہی غلط اور غیر ذمہ دارانہ طور پر مستعمل ہیں جن
کی بنا پر یہ اصطلاحیں اپنے اصل معانی و مطالب کو مکمل طور پر واضح کرنے
سے قاصر ہیں یا بہت ہی محدود معنویت کی طرف اشارے کرتی ہیں۔
رومانیت یا جمالیات سے ہمارے یہاں عام طور پر صنف نازک کا تذکرہ
مراد لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اصطلاحیں ایک دنیا کے معنی اپنے
اندر رکھتی ہیں۔ بہر کیف! اورینوی کے یہاں نیاز کے یہ اثرات
بہت ہی واضح اور روشن ہیں۔ بالخصوص پہلے دور افسانوں میں
مثلاً ——————!

عورت زندگی کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ اگر
عورت کی نرم دست پہ کنار نگاہوں کے ایک گوشے
میں زندگی کی لڑائی سے تھکے ہوئے مرد کو تھوڑی سی جگہ
مل جائے تو وہ اس کیلئے نعمت سرمدی ہے۔ عورت کی
صرف ایک نظر التفات، ایک ہلکی سی یگانگی، ایک حقیر
سی توجہ کھلاتی ہوئی زندگی کیلئے سامان شگفتگی ہے

اورینوی کے یہاں مرد اپنی تمام نفسیاتی پیچیدگیوں اور جبلی
تقاضوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ صنف نازک کی محبتوں کا خواہاں
ہے۔ اور اس کی نظر التفات کا آرزومند۔ وہ آدم کی پہلی لغزش
کا تجربہ کا خواہشمند ہے اور اس خلا میں از سر نو رنگ بھرنے کی
تمنائیں رکھتا ہے۔ یہ مرد کی ایک فطری افتاد طبع ہے جو اختر اورینوی
کے یہاں موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ مرد ہونے کی وجہ سے مرد کی نفسیاتی
الجھنوں اور جبلی خواہشوں کی حشر سامانیوں سے واقف ہیں۔
ظاہر ہے کہ شکیلہ کے پاس ایسے تجربات نہیں۔ اس لئے ان کی
کہانیاں ان گوشوں سے خالی ہیں،

لیکن شکیلہ کے یہاں نسائیت اپنی تمام معصومیت، سادگی
تقدس، نیکی بھولا پن اور پاکیزگی کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں
نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کا خاصا کامیاب اور نادر
تجزیہ کیا ہے وہ ان کا اپنا حصہ ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت اپنے
تمام روپ میں کھل کر سامنے آتی ہے۔ بچپن سے لیکر جوانی اور اس
کے بعد تک کی منزلوں میں عورت کی نفسیاتی تبدیلیوں کا مکمل شعور
ان کے یہاں موجود ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بڑی
ہنر مندی اور چابکدستی سے ان سرکش مسائل کو حل کیا ہے۔ بالخصوص
عورت کی فطری محبت جو ماں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے وہ اپنی
بے تابانہ اور والہانہ مامتا کے جوش و جذبہ کے ساتھ ان کے
یہاں فنی شکل و صورت اختیار کرتی ہے۔ ان نقوش میں بڑی رعنائی
و دلنشینی کی کیفیت ہے۔ اس لئے کہ یہ ان کے ذاتی نہیں تو جذباتی
تجربات ہیں۔ جنہیں انھوں نے فن کے حسن و جمال سے افادیت اور
دوامیت عطا کی ہے۔ اورینوی کے یہاں ایسے نقوش نہیں ملتے
کیونکہ وہ ایسے ذاتی طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ شکیلہ اختر کی
نفسیاتی فطرت کے ذاتی احساسات ہیں۔

اورینوی اور شکیلہ اختر میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ شکیلہ اپنے
موضوع سے شدید جذباتی ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ اور اپنی شخصیت
کو موضوع فن کا ایک لازمی جزو بنا دیتی ہیں۔ جس کی بنا پر ان کا
کینوس محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن اورینوی اپنے موضوع سے
احساسی و جذباتی تعلق رکھنے کے باوجود تصور و تفکر کی وادیوں
میں نکل جاتے ہیں۔ وہ کون و مکان کے خم و پیچ کے مختلف الجھے ہیں
مختلف گوشوں اور زاویوں سے اپنے موضوع کو دیکھتے ہیں جس
کے نتیجے میں ان کے فن میں عمومیت اور ابدیت پیدا ہو جاتی ہے اور
یہ غیر فانی اقدار و معیار کا حامل ہو جاتا ہے گو جذباتی اثر انگیزی
میں شکیلہ ان سے بڑھ جاتی ہیں۔

دونوں اسپتال اور سینی ٹوریم کے پس منظر میں اپنی کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس معاملۂ مخصوص میں دونوں کے تجربات ومشاہدات میں بہت حد تک مماثلت اور اتفاق ہے لیکن پیشکش کے مرحلہ میں دونوں دو مختلف سمتوں کو مڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں کو یکساں انداز میں اسپتال اور سینیٹوریم کے ماحول سے سابقہ پڑا۔ دونوں نے اپنی اپنی ذہنی وفکری ساخت اور نفسیاتی مزاج کے اعتبار سے اس کا الگ الگ ردعمل قبول کیا۔ اس فطری نفسیاتی اختلاف فکر کی وجہ سے دونوں کے تجربات ومحسوسات کی نوعیت وماہیت مختلف ہے۔ اوریندی کے یہاں ان کی "میں" اپنے رستے ہوئے زخموں کے کربناک احساسات کے باوجود ایک کائناتی درد کا احساس اپنے سینے میں رکھتی ہے۔ اور شکیلہ کے یہاں "وہ" کا احساس بھی اپنی پوشیدہ "میں" کی مشاطگی میں گم ہو جاتا ہے ایک کے یہاں اپنی عزیز زندگی سے مایوسی کا غم انگیز احساس بھی کائنات کے حسن وجمال کی کشش اور برتری کو تسلیم کر لیتا ہے۔ دوسرے کے یہاں اپنے رفیق حیات کا غم اور مستقبل کی تاریکیوں کا احساس کائنات کے جمالیاتی نظاروں کا بہت حد تک منکر ہو جاتا ہے۔ بہرشکل۔ دونوں کے تجربات واحساسات میں بڑا لطیف وباریک اختلاف ہے۔ اور انہیں لطافت وباریکی کے ساتھ دونوں کے محسوسات ان کے فن میں ڈھل گئے ہیں۔ اوریندی کے یہاں کلیاں اور کانٹے' اور شکیلہ اختر کے یہاں گھر یا دیوار، میں دونوں فنکار اپنی الگ الگ شخصیت کا بھرپور جائزہ پیش کرتے ہیں اور ان فن پاروں میں دونوں شخصیتیں بہت ہی آسانی سے منفرد انداز میں دونوں فنکاروں نے ہندو مسلم فساد کے عنوانات پر کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہی فرق ہے جو دونوں شخصیتوں کی باطنی فطرت کے خمیر کے مختلف پہلوؤں میں ہے۔ جو بعد کی نفسیاتی افتاد اور ذہنی کیفیات میں ہے۔ وہ ان کی کہانیوں میں رفتہ رفتہ یاں منظر آتا ہے جس کی طرف اشارے

کردیئے گئے ہیں۔ اختر اوریندی کے یہاں بالعموم علائم ورموز اور تشبیہات واستعارات کے پردے میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائی جاتی ہے۔ وہ شاید اس پر عمل کرتے ہیں۔

برنہ حرف نگفتن کمال گویائی است

حدیث خلوتیاں جز برمز وایمائیست

یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں رمزیت وعلامیت کی سحرکاری اور اشاریت وایمائیت کی دلآویزی حسن فن کو ابدیت وسرمدیت سے متصف کرتی ہے۔ لیکن شکیلہ سادگی وپرکاری بیخودی دیکھیا پر زیادہ عمل کرتی ہیں۔ اور سادگی اور اصلیت کو مدنظر رکھتی ہیں فساد کے پس منظر میں شکیلہ اختر کی کہانی ایک دن یا مظلوم " کو سامنے رکھئے اور اوریندی کی محشر کو ان کہانیوں کا مطالعہ دونوں کی مختلف ومنفرد ادبی حیثیتوں کو بہت ہی صاف اور روشن انداز میں پیش کرے گا۔ شکیلہ اختر کے یہاں اس منظر میں بھی حقیقت نگاری کا جذبہ موجود ہے۔ اختر اوریندی کے یہاں شدت کرب کائنات کے المیہ انجام کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ لیکن جو بھرپور فنی پختگی جمالیاتی شعور اور حسن کارانہ ادراک واحساس اختر اوریندی کے یہاں ہے وہ شکیلہ کے یہاں نہیں۔ "محشر" ایک بہت ہی ذہین وذکی اور بڑے عظیم فنکار کی تخلیق ہے اور یہ دونوں کہانیاں ایک سادہ ومعصوم ذہن کی۔ اور یہ فرق ان کہانیوں میں بہت آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے

اوریندی ایک زمانے میں ترقی پسند تحریک سے بہت متاثر رہے ہیں۔ اس کے دور رس اثرات ان کے فن پر پڑے ہیں۔ انھوں نے سماج اور ماحول کے کمزور پہلوؤں پر بے لاگ اور بے ریا تنقید کی ہے اور بہت ہی ایماندارانہ خلوص وصداقت سے ان کی خامیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اس عمل میں انھوں نے اخلاقی قدروں کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا فن بہت ہی مہذب ومتمدن حسن کاری وسحر طرازی سے مملو ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ترقی پسند تحریک سے

ایک ہلکی سی ذہنی وابستگی کے نشانات و آثار موجود ہیں۔ مثلاً شادی کے تحفے، میں انھوں نے طبقاتی کش مکش کی برائیوں پر بڑی دلگداز روشنی ڈالی ہے۔ اور سماج اور ماحول کی غیر مساوی تقسیم کی پیدا کردہ خامیوں پر بڑے عارفانہ انداز میں انگشت نمائی کی ہے۔ اسے ہم حقیقت پسندی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن اوپندر ناتھ اشک کا ایسے موقع پر اپنے موضوع سے جذباتی لگاؤ ان کے ذہنی جھکاؤ کی سمت بھی کسی حد تک معین کرتا ہے۔ جو ترقی پسند تحریک سے ان کی ہلکی سی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن شکیلہ اختر کے یہاں ایسے نقوش و افکار کی جلوہ گری نہیں۔ ان کی کہانی محاذ کے بارے میں ایسا شبہ بادی النظر میں ہو سکتا ہے لیکن درحقیقت وہ سماج کے بعض کرداروں کی ننگی تصویریں ہیں۔

اختر اورینوی اپنا ایک نظریۂ فن رکھتے ہیں۔ جو بہت ہی واضح اور متوازن و معتدل انداز میں بتدریج ان کے یہاں ارتقائی شکل میں جاری و ساری ہے۔ وہ اس سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتے بلکہ لب اوقات ان کا نظریہ ان کے فن پر حاوی نظر آتا ہے اور ایسے مواقع پر ان کا فن قدرے کمزور نظر آتا ہے۔ لیکن فوراً ہی اختر اورینوی اپنی اس کمزوری کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اور اس کو دور کرنے کی شعوری و احتیاطی کوشش کرتے ہیں۔ شکیلہ اختر کے یہاں کسی واضح ادبی نظریہ کا احساس نہیں ملتا۔

اختر اورینوی کا دائرہ فکر و عمل بہت ہی وسیع اور متنوع ہے۔ حیات و کائنات کے تمام مسائل و موضوعات پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اپنی بے پناہ فنی و تخلیقی قوت سے کام لیکر انہیں زندگی جاوداں سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ اپنے انداز افکار و سلیقۂ اظہار سے صدیوں کے مزاج کی تاریخی و تہذیبی و ثقافتی، تمدنی، معاشی و اخلاقی، سماجی و معاشرتی اور علمی و ادبی تحریکوں اور میلانوں کی ترجمانی و عکاسی کرتے ہیں۔ شکیلہ اختر اتنا وسیع کینوس نہیں رکھتیں۔ انہوں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ان کا فن اپنے حدود کو پہچانتا ہے۔ اور انہوں حدود میں اپنی معراج حاصل کر چکا ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ دونوں کے جمالیاتی محسوسات اور فنی خصوصیات میں بھی بڑا فرق ہے۔ فضا بندی، منظر کشی اور ماحول آفرینی میں دونوں کے تجربات کی نوعیت، مشاہدات کی اہمیت اور احساسات کی واقعیت و حقیقت میں بڑا اختلاف ہے۔ دونوں فطری مناظر میں اپنے جذبات و احساسات کی عکاسی و ترجمانی مختلف اور منفرد انداز میں کرتے ہیں۔ علاوہ بریں کردار نگاری اور پلاٹ سازی میں بھی دونوں کا انداز جدا ہے۔ اختر اورینوی کے کردار نگاری میں جامعیت زیادہ ہے۔ شکیلہ کے کرداروں میں اثر و تاثر کی کیفیت۔ اختر اورینوی کے پیش کردہ کرداروں میں زندگی اپنی بھرپور ظاہری و باطنی کیفیات میں منتشکل ہوتی ہے۔ شکیلہ کے یہاں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ پلاٹ شیرازہ افسانہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختر اورینوی اس فنی تقاضے سے بخوبی واقف ہیں اور اس پہلو کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔ اسلئے ان کے پلاٹ میں بڑی فنی پختگی ملتی ہے۔ شکیلہ کے یہاں بھی پلاٹ سازی میں فنی حسن موجود ہے۔ لیکن دونوں کے یہاں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اختر اورینوی کا پلاٹ قدرے پیچیدہ اور تہہ دار ہوتا ہے شکیلہ کا سیدھا سادا مگر بھرپور ہوتا ہے۔ واقعات کی ترتیب و تنظیم میں اختر اورینوی زیادہ ماہر ہیں۔ شکیلہ بھی اس سے نابلد نہیں۔

مختصر یہ کہ اختر اورینوی اور شکیلہ اختر دو منفرد اور ممتاز فنکار ہیں۔ ان کی فنی و ادبی شخصیتوں میں بڑا گہرا اور بڑا اختلاف ہے۔ اور دونوں کے فن کا رنگ و بو مختلف ہے اسلئے شکیلہ اختر کے فن پر اورینوی کے فن کا شبہ کرنا بے بصری اور کم نظری ہے۔ ادب کے ناقدین و قارئین کو چاہئے کہ وہ اپنے ادیب پر الزام نہ آنے دیں۔

ابوذر عثمانی

اختر اورینوی کا اسلوب

جب ہم کسی مصنف کے اسلوب سے بحث کرتے ہیں تو ہماری کوشش اس کی زبان اور طرز اظہار کی ان خصوصیات کو نمایاں کرنا ہوتی ہے جو براہ راست اس کی انفرادی شخصیت اور انداز کار کی رہین منت ہوتی ہیں۔ اس لئے اس بحث میں ہم اپنی توجہ محض ادب و فن کے چند مقرر اور مانوس نکتوں کی جستجو تک محدود نہیں رکھتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں فنکار کی شخصیت کا رنگ کہاں تک نمایاں ہے۔ اور اس کے زیر بحث ان میں کیا معنوی تبدیلیاں ہوتی ہیں؟ فنکار نے اپنے موضوعات کو کس طرح برتا ہے اپنے جذبات و احساسات کی تنظیم اور افکار و خیالات کی تشکیل کس طرح کی ہے۔ کس طرح اپنے مشاہدے اور مطالعہ کو یکسو اور منضبط کیا ہے اور اپنے بکھرے ہوئے تاثرات کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے انہیں موزوں و مناسب شکل میں جلوہ گر کیا ہے۔ جب تک ان سارے پہلوؤں پر غور نہ کیا جائے۔ کسی فنکار کے اسلوب کی صحیح قدر و قیمت نمایاں نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہ بحث فنکار کی شخصیت سے بڑا گہرا تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ ادب و فن کے جن اصول و ضوابط کو بنیاد بناکر اب تک اسلوب کے مسئلے پر غور کیا جاتا رہا ہے وہ خود فنکار کی شخصیت اور مذاق و میلان کی زد میں آکر نئی معنویت اور اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان میں نیا نکھار، نئی توانائی اور نئی تابناکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے کسی فنکار کے اسلوب میں ان نکات اور اصول کی جستجو بھی اس کی شخصیت، ذہن و فکر اور مذاق و میلان کے پیش نظر ہی ہونی چاہیئے۔ اور تب ہی اس کے اسلوب کی انفرادیت اور صحیح اہمیت اور معنویت اجاگر ہو سکتی ہے۔ جو چیز موضوعات کے انتخاب اور ان کی فنی تشکیل کے مختلف مرحلوں میں فنکار کی رہنمائی کرتی رہتی ہے وہ اس کا انفرادی مذاق و میلان، انداز فکر اور شعور و بصیرت ہی ہے۔ اقبال نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے۔ کہ نغمہ نئے میں جو سرور ہے آتا ہے۔ اس کی اصل نے نواز کا دل ہے نہ کہ چوب نے۔ اس سے پتہ چلا کہ فنکار کے فن و اسلوب بھی کچھ نہیں۔ اس میں جو سوز و گداز اور حرارت پیدا ہوتی ہے اس کا سرچشمہ اس کے خیالات و افکار ہی ہیں۔ فنکار اپنے خیالات و افکار کو زیادہ سے زیادہ موثر، باوقار اور پُر معنی بنانے کیلئے انہیں اپنی شخصیت کے رنگ میں اچھی طرح ڈبو دیتا ہے اور پھر اپنے مشاہدے، مطالعے اور فکر و تخیل کی مدد سے ان کے گرد کچھ اس طرح مختلف احوال و کیفیات کا جال بن دیتا ہے کہ وہ ایک مخصوص جلا، پاکیزگی اور نکھار سے کر نمودار ہوتے ہیں۔ اور ایک خاص عمومیت، ہمہ گیری، عظمت، گہرائی اور تاثیر کے حامل ہو جاتے ہیں۔ فنکار جس طرح الفاظ کو برتتا، تشبیہات و استعارات کو استعمال کرتا اور جملوں اور فقروں کو ترتیب دیتا ہے اس کا اس کے احساسات و تجربات اور ان کے پیچ و خم سے

بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سٹرلنگ بری جانے یہ بڑی اہم بات کہی ہے
کہ فنکار کے خیالات میں جو چیز وزن و وقار اور نظم و ضبط کا پابند بنا کر ایک
خاص ڈھرے پر لگا دیتی ہے۔ وہ اس کا جذباتی رجحان ہے۔

یہاں اس بحث کے اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ فنکار
اپنے موضوعات کے انتخاب اور اظہار خیال کی راہوں کے تعین میں بڑی
حد تک آزاد ہے۔ لیکن وہ اپنے خیالات کا اظہار بہر حال کسی نہ کسی فارم
میں ہی کرتا ہے۔ جس کے اصول و ضوابط کی پابندی اس پر لازم ہے ورنہ
وہ اپنے خیالات کا صحت مندانہ اور موثر اظہار نہیں کر سکتا۔ اور اس
کی فنی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس سے فنکار کے لئے یہ لازم
ہے کہ وہ ان اصول و قوانین سے پوری پوری واقفیت رکھے اور انہیں
اپنے شعور و مزاج کا جزو بنا لے تاکہ اس کے خیالات خود بخود ایک
مخصوص فارم میں پوری روانی اور سہولت کے ساتھ راہ پا سکیں۔ اس سلسلے
میں فنکار کے وہ فنی وسائل خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جنہیں
استعمال کر کے وہ اپنی تخلیق فن کی دشواریوں کو سہل بنا لیتا ہے۔ دراصل
کسی فنکار کی انفرادیت کا انحصار بڑی حد تک اپنی فنی وسائل پر ہے۔

ادب میں اسلوب کی بحث کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اب
آئیے ہم اختر اورینوی کے اسلوب کا جائزہ لیں۔ اور دیکھیں کہ اس کے
امتیازی پہلو کیا ہیں؟ اختر اورینوی کے متعلق یہ بات بلا خوف و تردید
کہی جا سکتی ہے کہ وہ اردو کے ان چند ان گنے فنکاروں میں ہیں جنہوں نے
ادب و فن کے اصول و ضوابط اور اپنے خصوصی فنی وسائل کا استعمال پورے
خلوص اور دیانتداری کے ساتھ کیا ہے۔ اختر بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک
ہیں۔ اور بیک وقت ادب کے کئی شعبے ان کے قلم کے زیر بار منت ہیں۔ ان
کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا وہ منضبط طرز اظہار ہے
جس نے ان کے اسلوب کو ایک خاص وزن و وقار و رفعت و عظمت عطا کر دی
ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں گہرے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد لکھتے ہیں۔ وہ جس
موضوع اور واقعہ پر قلم اٹھاتے ہیں، اس سے گہرا ذہنی رابطہ قائم کرتے ہیں
اسے اپنی شخصیت کی بھٹی میں اچھی طرح تپا دیتے ہیں۔ اور کافی نکھارنے اور
سنوارنے کے بعد الفاظ کے روپ میں ظاہر کرتے ہیں۔ وہ کسی واقعہ کا
محض سطحی اظہار نہیں کرتے بلکہ اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کی تہہ میں
کام کرنے والے سماجی اور نفسیاتی عوامل اور محرکات کو برقرار لاتے
ہیں۔ اس کیلئے مناسب واقعاتی فضا اور ماحول کی تخلیق اور تعمیر کرتے
ہیں۔ اس کام میں جو چیز ان کی خاص طور پر معاون ہوتی ہے وہ ان کے
تخیل کا وفور اور الفاظ پر ماہرانہ دسترس ہے۔ ان کے ذہن میں ایک
خیال کی بیک وقت کئی تصویریں ابھرتی ہیں۔ اور یہ تصویریں اتنی صاف
اور واضح ہوتی ہیں کہ جب وہ الفاظ کے ذریعہ آئینہ سامان ہوتی ہیں تو
ایک جام جہاں نما کی سی کیفیت نظر آنے لگتی ہے۔ ان کا خاص آرٹ الفاظ
اور تشبیہات و استعارات کا پرزور رواں دواں اور پیچیدہ
استعمال ہے جس کے ذریعہ وہ کسی خیال کے مختلف اور رنگارنگ نقوش
کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانہ "جوہر" سے دو اقتباسات
ملاحظہ ہوں۔

"آج اس کی ناکامیابی کی ساری رسم سامانیاں اس پر اس طرح
برس رہی تھیں جیسے کوئی سنگسار کیا جا رہا ہو۔ سڑک پر کے روڑے اس
کے جذبات میں گڑ رہے تھے۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا، ٹم ٹم گاڑیاں اور موٹریں
اس کے سینے پر چل رہی ہیں۔ راہ گیر اسے منہ لاتے ہوئے بھوت کی طرح معلوم
ہو گئے تھے۔ چہروں سے اسے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر شے اس
کا منہ چڑھا رہی تھی۔ وہ اپنے کندھوں پر ہوا کا بوجھ تک محسوس کر رہا
تھا .... اس نے ایک بندر نچانے
والے کو دیکھا! اس نے سوچا کاش! میں وکیل کی جگہ ایک بندر نچاتا، بندر
ہونا بھی ناکامیاب وکیل ہونے سے بہتر ہے۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ
عدالت گاہ بندروں کے ناچنے کا بہت بڑا اکھاڑا ہے۔ اور وہ اس میں
ناچنے والا ایک بڑھا سا بندر"

(۲) شاندار الماریوں میں سنہرے حروف سے مزین رعب ڈالنے والی
کتابیں فوجی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب وار لائنوں میں آراستہ نظر
آئیں۔ جیسے کوئی فوجی دستہ چمکتے ہوئے لباس اور اسلحوں کے ساتھ

اُٹینشن کی حالت میں ہو، اس کے دماغ میں خیالات مارچ کرتے ہوئے آتے بلکہ یوں کہئے کہ وہ خیالات و تصورات کی بلٹنوں کو منظم کرتا۔ انہیں ساری دنیا کی فتح کیلئے روانہ کر دیتا۔ اور فاتح جرنیل کی طرح فتوحات کے نشہ سے سرشار ہو جاتا۔"

یہ ایک جونیر وکیل کی ناکامیابیوں کی بڑی حسرت خیز داستان ہے۔ وہ اپنے متعلق بڑے اونچے لطیف اور شیریں خواب دیکھتا ہے۔ لیکن یہ خواب حقیقت نہیں بن پاتے۔ اس کے سارے ذہنی منصوبے تلخ اور سنگین حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اختر اورینوی نے جونیر وکیل کی ناکام آرزوؤں اور تمناؤں کی تصویر کشی بڑی خوبی سے کی ہے۔ ساتھ ہی اس کی فریب کارانہ خوش فہمیوں کی ایک جھلک بھی پیش کر دی ہے۔ وہ تخیلات کی آغوش میں پناہ لیکر دراصل اپنی درماندگی شوق کیلئے آئینہ تکرار تمنا کی صورت پیدا کرتے ہیں۔

اختر اورینوی اس انداز کا استعمال عموماً ان موقعوں پر کرتے ہیں۔ جب وہ کسی گہری پیچیدہ نفسی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی مصوری کرتے ہیں یا کسی گہری اور اہم حقیقت کا اظہار کرتے ہیں یا انہیں طنز و تعریض کا کم بیدار کرنا ہوتا ہے۔ یوں بھی وہ کسی واقعہ یا منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کے چھپے ہوئے بھیدوں اور رازوں کو افشا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ واقعہ اور منظر اپنی صحیح اور اصل صورت میں ظاہر ہو سکے اختر صاحب کے یہاں بعض اوقات الفاظ اور فقروں کی جو بہتات نظر آتی ہے۔ وہ اسی سبب سے ہے۔ اگر ان الفاظ اور فقروں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ سبھی اپنی اپنی جگہ اور ناگزیر ہیں۔ اور سب کسی واقعہ اور منظر کے کسی نہ کسی رخ، جہت اور پہلو کو نئے نئے زاویے سے نمایاں کرتے ہیں۔ اس طرح کوئی لفظ اور فقرہ بیکار نظر نہیں آئے گا۔ میں اختر کے یہاں تخیل کے وفور اور احساس کی شدت کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ ان کے ذہن میں جب کوئی تاثر پیدا ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ ہی خیالات کے پرے کے پرے صف باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو بھی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب وار آراستہ۔"

اختر صاحب کے اسلوب اظہار میں جہاں جہاں پیچیدگی ہے وہ بالعموم خیالات کی گہرائی اور پیچیدگی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے اسی لئے ان کے اسلوب میں ایک خاص پیچیدہ تجزیاتی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ جو لوگ سادگی و اور سلاست کا سطحی اور محدود مقصد رکھتے ہیں وہ اختر صاحب کے افسانے پڑھ کر مایوس بھی ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے اختر صاحب کے افسانے محض ذہنی تفریح کے خیال سے پڑھے نہیں جا سکتے یہاں مقصود تفریح سے زیادہ تعلیم ہے۔ محض بصارت پیدا کرنا نہیں بلکہ بصیرت بھی۔ اسی لئے اختر صاحب کے افسانوں سے حقیقی لطف حاصل کرنے کیلئے ایک مخصوص ذہنی سنجیدگی، ضبط اور استقلال کی ضرورت ہے میں یہاں ان کے افسانے، کلیاں اور کانٹے سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ اس میں جو دقیق علمی اور فلسفیانہ معنویت اور فکرانہ نکتہ خیزی ہے اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے ایک گہرا مہذب شائستہ اور ترقی یافتہ شعور اور رویہ کی ضرورت ہے۔

"موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے۔ لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی جو چیزیں چھٹ جانے والی ہوں۔ ان سے کتنا بے تاب عشق ہوتا ہے۔ ناپائدار اشیاء تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے۔ اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم، وزنی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ عورت ہے۔ مادہ کا نقطۂ کمال۔ جسم کے حسن تعمیر کا عروج جمیل، اس لئے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر بیٹھا بیٹھا فنا کو ڈھونڈتا ہوں مجھے اٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جذبۂ دل ایسی حرکتوں پر اکساتا تھا۔ جو سامان بقا ہیں۔ مجھے اپنی روحانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگی۔ میں سوچتا کہ تم لڑکا ہی ہوں۔ بدن کی روانیت

مجسم اور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذبہ و کشش کی لطافتوں کے جالے میں الجھے رہنا پسند کیا ہے۔ بے عملی اور نہاز روی کی دلیل ہے۔ مجھے نفی اور اس کی قوت اقدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی خرد مندی و کار نا کردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا المناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔

قصہ گوئی کے دوران کسی کیفیت، احساس، جذبہ کی بھرپور وضاحت کیلئے فکری اور فلسفیانہ موشگافیاں کرنا ان کا خاص انداز ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک نوع کا بوجھل پن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اگر میں اسے اختر صاحب کی محض فنکارانہ تماشہ سے تعبیر کروں تو غلط نہ ہوگا۔ اختر صاحب معمولی سے معمولی واقع کو بھی اپنے اس مخصوص انداز نگارش کی وجہ سے بڑی گہرائی، وقار اور وزن بخش دیتے ہیں۔ ان کے رومانی افسانوں میں اگرچہ اسلوب بیان کی لطافت اور دلکشی بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن ان سے کسی نہ کسی گہری اور بلند نفسیاتی اور روحانی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی رومانیت اور ماورائیت کو واقعیت کی زیادہ ارفع، پاکیزہ اور ترقی یافتہ صورت بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ رومانی اسلوب کے ذریعہ گہرے اور پیچیدہ حقائق کی بہت ہی لطیف اور دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے رومانی افسانوں میں ہمیشہ ورائے رومان چیزے دیگر کی آمیزش ہوتی ہے۔ رومانیت دراصل ان کی سرشت اور اسلوب دونوں کا حصہ ہے۔

اختر صاحب بڑی خوبی سے واقعات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ وہ واقعات کے اظہار کے دوران ان کے نفسیاتی اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں بے شمار نفسیاتی نکتے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اختر کے فن کا یہ پہلو پوچھئے تو یہ بڑا ہی اہم پہلو ہے اور اس پر مستقل بحث کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ اردو کے چند ایک گنے چنے افسانہ نگاروں میں ہیں۔ جنہوں نے نفسیات کو شعور اور لاشعور کی بھول بھلیوں میں الجھنے کے بجائے اس کے ذریعہ انسانی اعمال کی پیچیدگیوں اور نیرنگیوں کی توضیح کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ پہلو قابل غور ہے کہ نفسیاتی حقائق کی توضیح میں تشبیہات اور استعارات سے خاص مدد لی ہے۔ ان کے یہاں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جبکہ تشبیہ اور استعارے کے استعمال سے ان کا مقصد کسی نہ کسی گہری اور اہم نفسیاتی حقیقت کی توضیح رہا ہے۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال کا یہ انداز اختر صاحب کی تنہا اور منفرد خصوصیت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"جواب فیض اور زیر بار منت دربان کھڑے ہوئے کھڑا تھا۔ جیسے بھرے بازار میں کسی نوجوان لڑکی کو لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔" (پندرہ منٹ)

"اس کے جسم کے کیسے کیسے پیچ کرا دیتی تھی جو ہر جوہر میں بیزاری مگر وہ اس گھٹی ہوئی بیزاری سے معدنی ایٹم کی طرح خود ہی جلتا ہے۔ ایک عالم کو ایٹم بم کی طرح جلا نہ سکا۔ (پندرہ منٹ)

"جیسے بچہ ماں کی گود سے گرتا ہوا محسوس کرتا ہے تو ننھے پنجوں سے گھبراتے جسم کے کسی حصہ کو پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح ادا کو جب آغوش حیات سے پھسلنے کا احساس ہوتا ہے تو سہارے کی تلاش کرتے (شکور دادا)

"دادا دلوں کو نرم کر کے انہیں سیال بنا دیتے تھے۔ اسی بہاؤ میں ان کے ادبے دھول ہو جاتے جیسے چمن کے کنارے کا گھی دھوپ میں بہ کر کو آسمانی سے باہر ڈال لی جاتی ہے۔ (شکور دادا)

"ہم سب لوگ ملے جلے دل تھے اور مبہم جذبات کے نوع در نوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔ جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا ایک تار رس رہا ہو۔" (کلیاں اور کانٹے)

"یادِ خیال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطف پرواز حاصل کرتے ہیں۔" (کلیاں اور کانٹے)

"پیچیدہ جذبات کی تہوں کے اندر سے ایک کچلا ہوا معصوم جذبہ پیدا ہوا۔ الفت اولیں کی کرن منجمد برفستان کے اوپر سے جھانکی، برف پگھل کر اچھلتی ہوئی آبشار بن گئی۔ (پندرہ منٹ)

"فیض اپنی دنیا میں سمٹ گیا۔ ایک ذہنی دنیا جیسے کوئی لاجونتی گھونگھٹ کی اوٹ میں آجائے۔" (پندرہ منٹ)

"اس کے استوار انحصار حرکت خرام کے وقت زندگی کے برق پادوں کے بوچھار کرتے تھے۔ وہ ابلتے ہوئے جوش حیات سے ہیجان میں کانپ کا پیکر

معلوم ہوتی تھی۔ (پندرہ منٹ)

یہ مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ہیں۔ ورنہ اختر کے افسانوں میں اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال ہی میں ان کے یہاں کچھ اور بھی جدتیں ملتی ہیں۔ جو براہ راست ان کے حسِ شعور اور فکری بصیرت کا نتیجہ ہیں۔ وہ تشبیہ و استعارے کے ذریعہ بڑی خوبی سے کسی منظر یا واقعہ یا احساس اور جذبہ کو پوری لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ آئینہ کر دیتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

وہ اپنے بچوں کے معاملے میں نا انصافی کی حد تک جانبدار تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنے بھائی بہنوں سے الجھ پڑتی، کبھی تو ذرا سی بات پر یوں جھٹکتی جیسے بجلی مرغی۔" (یہ اب بھی کبھی کبھی)

"کوکو خاموش کھڑی رہی۔ اس کی گہری سیاہ پتلیاں چمک اٹھیں جیسے ادھ سلگے ہوئے کالے کوئلے سے چنگاری نکل پڑی ہو" (ممتا)

"جھبو کی خودی کی لانبی گردن کچھوے کی طرح اپنے خول میں چھپنے پر مجبور ہو گئی" (بیگم جھبو)

"سب اکڑوں بیٹھے ہوئے مرغوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے جو کسی مطبخ میں ذبح کرنے کے لئے قطار اندر قطار رکھے گئے ہوں" (انھیں مرد کہو)

"ادب و شاعری اس کی نیلگوں جھیل تھی، وہ چنچل مچھلی کی طرح اس میں آزادانہ تیرتا رہا۔" (پندرہ منٹ)

لڑکیاں یوں بکھر گئیں جیسے بط کے تیرنے سے جھیل کی سبز کائی بکھر جائے" (پندرہ منٹ)

"وہ ٹیلیفون کی لائنس کٹ کٹ کر منقطع رگوں کی طرح ناکارہ محض ہو گئیں" (گھر کو واپسی)

"وہ سب خوش خوش ہو کر مجموعی طور پر سرگرم گفتگو تھیں جیسے بہت سی شہد کی مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہوں" (ڈاننا میٹ)

"اس کی بھنویاں کیڑے پر کیڑا ابل رہی تھیں۔ اور یہ پرانی جلد کی کتاب کی طرح بے رونق معلوم ہو رہی تھی" (شادی کے بعد)

"اس شیریں خیال کو اس طرح دماغ میں اٹھتا پلٹتا جیسے

کوئی بچہ ٹافی جوس یا چاکلیٹ کھا رہا ہو" (شکور دادا)

"کوئلے والوں کے منہ ہاتھ ہنومان کی طرح کالے ہوتے جاتے تھے۔" (کوئلے والا)

ان کی تشبیہات و استعارات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ کسی خاص منظر کی معنی خیز توضیح مقصود ہوتی ہے۔ اور ان میں کسی ایسے جذبے اور تخیل کی روح سمو دی جاتی ہے جو کہانی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح ان تشبیہات و استعارات میں ایک خاص معنوی گہرائی، قوت اور اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے براہ راست کہانی کی فضا سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ میں یہاں چند مزید مثالیں پیش کرتا ہوں۔

افسانہ "کل آج کل" میں اختر نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کا ماحول پیش کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ یہ فقرہ لکھتے ہیں۔

"صبح ہوئی صبح قیامت۔ اس روز پورے افق میں ابر کے کٹے کٹے ٹکڑے شفق آلود ہو کر یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے مقتولین کے خون سے لت پت بریدہ جسم کے حصے"

اس فقرہ میں ابر کے کٹے کٹے شفق آلود ٹکڑوں کو مقتولین کے خون سے لت پت بریدہ جسم کے حصوں سے تشبیہ دے کر اختر نے کہانی کے ماحول کو کارندگی عطا کر دی ہے۔

افسانہ "کوئلے والا" میں اختر نے غریب کوئلہ بیچنے والے مزدور کی جفاکشی اور مفلوک الحال زندگی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اس لئے اس میں اس طرح کی تشبیہ لائی گئی ہے جو غربت اور افلاس کی کیفیت کو مزید نمایاں کرتی ہے۔

"دن نکلتے ابر کا خیمہ غریب کی چادر کی طرح چیتھڑا چیتھڑا ہو چکا تھا۔ افق میں سورج کبھی ابر کے شگافوں سے جھانکتا تھا اور کبھی ان ہی ٹکڑوں میں ابن آدم کے حال کو دیکھ کر شرم سے منہ چھپا لیتا تھا"

کلیاں اور کانٹے میں سینی ٹوریم کا ماحول پیش کیا گیا ہے لہذا یہاں مریضوں کو سل کے کیڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

"درجہ اول کی ساری مخلوق سل کمکیڑوں کی طرح محسوس ہوتی جو ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دان کے رکاربولک ایسڈ میں فضا بچو نکیلے

رات بھر میں اختر ریج کے کھیت، آم کے باغ، بنسں بیٹھوں اور ترانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس لئے اس میں بڑی خوبی سے اس ماحول سے تشبیہ لے لی جاتی ہے۔

"اسے صرف اپنا اور سوتیا کا احساس تھا۔ اور یہ احساس سارے چھوٹے چھوٹے احساسات اور جذبات کے مقابل یوں بالیدہ تھا جیسے جھاڑیوں کے درمیان ایک ناڑ کھڑا ہوا ہو۔ سیدھا استوار"

الفاظ کے مخصوص صوتی آہنگ سے اختر اپنے افسانوں میں مصورانہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ فقرے

"اس نے پہلے انڈے تلنے کا ڈول ڈالا کڑھائی چڑھائی، کڑوا تیل جوش دینے لگا۔ تیل کے کڑ، کڑ، کر کھولنے کی آواز آئی اور پھر چھن من انڈے کے تلے جانے کی" (سمنٹ)

نفیسہ نیم غنودگی کے عالم میں رک رک کر پنکھا جھلتی جاتی تھی، پنکھا کبھی کھٹ سے پلنگ کی پٹی سے ٹکراتا اور اسے بیداری کا ایک جھکولا آجاتا"

(پیراب بھی کبھی کبھی)

"حامد اپنے پلنگ سے اٹھ کر بچوں کے پاس آ بیٹھا۔ پلنگ کے اس چوں چوں سے نفیسہ کے دل کو تکلیف دہ مسلن سی محسوس ہوتی جیسے ایک خزاں زدہ سوکھا پتہ کسی کے پاؤں سے روندا جائے" (پیراب بھی کبھی کبھی)

رمضان کبھی کبھار اپنے مفکر کے سامنے مزیل پیتا رہتا تھا.....

"کھوں کھوں کھوں" اور رفتہ رفتہ کھائیں کھائیں" اور ڈھائیں ڈھائیں کی آوازیں اس کے گھر کے اندر سے آتی رہتی تھیں۔ (کوئلے والا)

سائبان کے ایک گوشے میں پتیل کا بڑا سماور خوش آئند سائیں سائیں سے فضا کو آباد کر رہا تھا۔ (شکور دادا)

"چاندنی سجل نہ ہوئی تو اس نے چڑ کر اسے دنیا ہی چھوڑ دیا اور دھب سے تکیہ پہ سر رکھ کر لیٹ گئی" (سمنٹ)

اختر کا آرٹ تفصیل اور تشریح کا آرٹ ہے۔ وہ اشاروں سے عموماً گریز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جزئیات نگاری کے ایک سے ایک نمونے ملتے ہیں۔ وہ جب کسی واقعہ، کیفیت یا منظر کی تصویر کھینچتے ہیں تو اس کے ایک ایک نقش کو بڑی خوبی سے اجاگر کر دیتے ہیں اختر کے اسلوب کا یہ کمال ان کے مشاہدے کی باریک بینی کے علاوہ اس فنکارانہ سنجیدگی، ضبط اور سوز کا رہین منت ہے۔ جس کے بغیر کوئی فنکار جزئیات نگاری میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی ہستی اس واقعہ، کیفیت یا منظر میں بالکل جذب ہو گئی ہے۔ اور وہ اس کی نقش گری میں اپنے اردگرد کی دنیا سے بالکل بے خبر ہو کر پوری سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ ذیل میں ان کے افسانہ ممتا اور آج کل سے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

" وہ شلوکہ اسے انٹ نہیں رہا تھا، سانس روک روک کر اس نے اٹھایا، بہت مشکل سے وہ ڈھیلے سینوں کو کس کس کر، داب داب کر لیپ کے ٹھپوں کے درمیان جسے تن گئے۔ کئی توسیں بن بن گئیں۔ ان ملی جلی توسین کی زنجیر سے بھی بھرے بھرے سینے نہ دبے اور زنجیر کے حلقوں سے حباب نکلنے لگے۔ دباؤ سے دودھ ابل پڑا۔ اور گرم شلوکے پر دو بڑے بڑے نم دھبے پڑ گئے"۔ (ممتا)

"وہ گلی اسے سامنے کے دو منزلوں سے گزار کر محلے کے پچھلے حصے میں لے جاتی تھی۔ پہلے اسے کنڈورے کے ڈھیروں سے اٹا ہوا ایک اونچا سا خرابہ ملتا تھا۔ جس پر میلے کچیلے لونڈے موسم کے لحاظ سے کبھی تو پتنگیاں اڑاتے، کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے۔ کبھی لٹو اور کبھی یونہی ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے، کتوں کی دم اینٹھتے یا اپنے پنجوں سے کنڈوروں کو کریدنے والی مرغیوں کو اپنے من سوچے ڈھیلوں کا نشانہ بناتے۔ ان کی ایک تفریح مرغے مرغیوں کی جفت کا تماشا دیکھنا بھی تھی۔ اس سے زیادہ مزیدار دھوبی کے گدھے ہوتے تھے۔ ان کی خرمستی سے بڑا ہیجان پیدا ہوتا تھا.......... یہ آوارہ گرد لونڈے جن کے گھروں میں مسرت کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔ اور غربت نے جن کی ماؤں کی آنکھوں سے محبت

اور پیار کی دوشنیاں چھین لی تھیں۔ چوری چھپے گدھوں کو پکڑ کر سواری کرتے اور خوش ہو لیتے تھے۔ اس کی دلچسپی کا عروج آسن کاتک میں ہی ہوتا تھا۔ جب یہ حقیقت کھاتے ہوئے کتے کیتوں کے اختلاط پر پا کے پیچھے ڈنڈے لے کر پڑ جاتے تھے۔ آتے جاتے اس کی ان خانہ بدوش لونڈوں سے ضرور مڈبھیڑ ہوتی تھی" (راج محل)

ہر فنکار کے لئے اپنے میڈیم پر قدرت ضروری ہے۔ ورنہ اس کے اسلوب میں کوئی جدت اور تازہ کاری نہیں پیدا ہو سکتی۔ اختر اورینوی ان فنکاروں میں ہیں جو فنکار کے واسطۂ اظہار کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ فن میں اسلوب کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فنون لطیفہ کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ فن کار واسطۂ اظہار کو کس طرح برتتا ہے" ہر فنکار کو اپنے واسطۂ اظہار سے الجھنا اور نپٹنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابی اس امر میں ہے کہ میڈیم کو اس طرح برتا کہ بہتر سے بہتر طور پر اظہار تجربہ ہو سکے ....

"شاعری اور ادبی نثر کا ذریعہ اظہار الفاظ ہیں۔ لٹریچر کا یہی میڈیم ہے۔ لہٰذا ادبی اور شعری ہیئت سازی الفاظ کے حسن انتخاب ان کی خوب صورت ترکیب، سجل فقرہ تراشی، نفیس جملہ سازی اور کامیاب ترتیب اور پراثر ترنم پر منحصر ہے۔"

اختر صاحب کے اسلوب میں الفاظ کا حسن انتخاب، ان کی خوب صورت ترکیب، سجل فقرہ تراشی، نفیس جملہ سازی اور کامیاب ترتیب اور پراثر ترنم۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ الفاظ اور ان کے استعمال پر انہیں بے مثل قدرت حاصل ہے۔ وہ الفاظ کو نوبہ نو انداز میں استعمال کر کے ان میں خاص وسعت، لچک اور تہ داری پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ ان کے اسلوب کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ وہ خاص قسم کے تاثرات پیدا کرنے کیلئے خاص قسم کے الفاظ لاتے ہیں۔ جن کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لائے جائیں۔ تو وہ علامات پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ ظاہر یہ الفاظ سیدھے سادے اور عام فہم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا استعمال شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ یہ فنکار کا اپنا کمال ہے کہ وہ ان الفاظ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال کر روانی اور کامیابی کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ ان فقروں میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ اور دیکھئے کہ ان الفاظ کے استعمال نے ان فقروں میں معنویت پیدا کر دی ہے۔ جو کسی اور طرح ممکن نہ تھی۔

"بیچ بیچ میں بڑ اور پیپل کے بڑے بڑے جٹا دھاری پیڑ دھیان لگائے کھڑے تھے۔" (گرجا کے سائے میں حنت سے دور)

"اس کا جوڑا جکلا کمانڈٹ میاں مٹی میں مل گیا تھا" (ممتا)

"کچھ اجسام کنمنا رہے تھے۔ اور کچھ یونہی کونے کاترے میں ڈھیر تھے" (گرجا کے سائے میں جنت سے دور)

اس سلسلے میں اختر صاحب کے اسلوب کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مہمل ادبی اور گرے پڑے الفاظ کا استعمال بڑی خوش سلیقگی سے کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ گیری اور بامقصد حقیقت آفرینی کرتے ہیں۔ انھوں نے عام بول چال کے ٹھیٹ گنوار الفاظ اور فقروں کو اس خوش اسلوبی سے برتا ہے کہ وہ کہیں کھٹکتے نہیں۔ بلکہ زبان و ادب کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے الفاظ اور محاورات جو عام طور پر تحریر میں رائج نہیں اور جنہیں پڑھے لکھے لوگ ضبط تحریر میں لانا معیوب سمجھتے ہیں۔ اختر اورینوی بلا کھٹک استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ اور موقع محل کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ [illegible] اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ناگزیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اختر کا اسلوب کا یہ ایک بڑا ہی اہم پہلو ہے اور اس پر علیحدہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں بیدی کے علاوہ یہ خصوصیت کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نظر نہیں آتی۔ جس چیز کو بیدی کا پنجابی پن کہا جاتا ہے وہ اختر کے یہاں بہاری پن کے روپ میں نمایاں ہے۔ لیکن عیب بن کر نہیں ہنر بن کر، میں یہاں کچھ فقرے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو اختر کی اس خصوصیت کا بخوبی علم ہو جائے گا۔ خط کشیدہ الفاظ پر یہاں بھی غور کیجئے۔

"وہ شم گھشم اچھا ہوگیا"

"جھبدر حق شوہری جتانے کیلئے گنگی کو گاہے ماہے دھپ دیا کرتا تھا۔"

"وہ نبگلہ حویلی کی ڈیوڑھی اور قصبہ کے بازار کے درمیان چرخ رہتا۔"

"ہر قسم کے اتارن کپڑے پہن لیتا تھا"

"بوڑھی ماماییں کہنے لگیں کہ جھبدر کی شادی کر دی جائے تب وہ اٹوائی کھٹوائی لینا بند کر دے گا"

"مدکو کو کی ماں نا جونے اسے مستقلاً حویلی میں رکھ دیا۔ ادیر کیا کیلئے"

"اس کے سیاہ چہرے پر خون نے دھبے ہوئے توے کا رنگ پیدا کر دیا"۔

"وہ ان فاقہ مستوں کو دیوڑھے اور گھاتے پیچ بھی جپیا کر دیتے تھے"

"انھوں نے کھیت زمینداروں سے لگان پر لینا اور اضافہ کے ساتھ ٹٹ پنجے رعیتوں کو دینا شروع کیا تھا"

"جیسے ٹین کا کنستر بالکل دھوپ میں پر کا کر آسانی سے باہر ڈال لیا جاتا ہے۔"

"آج کی آدھی روٹی کل کی سوچی روٹی سے اچھی"

"میلے چکٹ ربود سے کپڑے پہنے ہوئے کو ظلہ پھیری کرنے والے مزدوروں کو کوئلہ تول تول کر دیا جا رہا تھا۔"

"اس نے کہیک کر ضد لگائی"

"ہنس مکھ کی ہنسی مکھ، لڑاکن کی لڑاکن"

"گاؤں بھر میں سگھڑ کہلانے لگی"

"ماں سے کبھی کھلے درازی کر گزرتی تھی"

"تاؤ آجائے تو مجھے ملا لینا"

"جب دیکھو جیالوٹ، رنگ برنگی ساری"

"میرے اتنا کون کھر سر پاتا ہے"

"ملیانے میں اسے کمال حاصل تھا۔"

یہ ٹھیٹ بہاری الفاظ اور محاورات ہیں جو صرف بول چال تک

محدود ہیں لیکن اختر نے انہیں خوش اسلوبی سے استعمال کر کے بڑا وقار اور اہمیت عطا کر دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے افسانوں میں واقعاتی فضا پیدا کرنے میں بھی ان سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔

اختر صاحب کے اسلوب کی یہ خصوصیت ان کے مکالموں پر خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان کے افسانے "بڑھیہ آبرو ہوکر" سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"وہ آگیا کتے کا نوالہ کھانے کو! کام نہ کاج کھانے کو حید د اڑھائی سیر۔ حرام خود دن بھر اڑا رہتا ہے۔ مگر کھانا نکلا اور موجود کام چور نواب حاضر"۔

"چولہا کوڑ کے منڈی کھاتا۔ سب آگ بتا دیہے۔ بیڑی پی کر منہ میں آگ لگا شے کو ہیش آوے ہے۔ کبھی چہرہ جبر کے کھانا"

(۲) "پکرو بچ جان؟" شمشیر وا نے دروازے پر کسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "قیس ہے رے حرا مجاوہ ہم تیرے پر عاشق ہیں رے؟ کلکھ موہاں گام جاوہ"

سات پست حرام جاوہ کیسے بھوے ہے۔ پکرو بچ جان مجھ پر عاشق ہیں۔ منہ تو دیکھے اپنا مرغی چور مرغے کا جنا۔"

ان کے یہاں ایسے بلیغ اور معنی خیز فقرے مل جاتے ہیں جن میں انھوں نے بڑی خوبی اور سادگی سے احساسات و کیفیات کی پیچیدگیوں کو منتقل کر دیا ہے۔ افسانہ انارکلی اور کنول پھلیاں میں وہ ایک اوڈھیڑ کی متفکر اور درماندہ حال زندگی کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اوڈھیڑ جن ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہے۔ ان کے اظہار کیلئے یہ فقرہ استعمال کرتے ہیں:۔ "اس کے چہرے پر ہر وقت ایک منجمد سنجیدگی طاری رہتی تھی" ظاہر ہو کہ اس فقرے سے ایک انجان قاری بھی کہانی کے ہیرو کے حالات سے بہت کچھ واقفیت حاصل کر سکتا ہے"۔

اس طرح یہ فقرہ دیکھئے۔ "وہ بڑھی لکھی بھا نہ تھی۔ وہ ایک بے قرار ہستی تھی مگر سنجیدگی کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ"۔ اس فقرے سے ہم ایک عورت کی ذہنی اور نفسی کیفیات کو بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

ان فقروں کی بلاغت اور معنی خیزی کو بھی غور کیجئے

"اسے ایسی بیوی ملی تھی جیسے کوئی مثالی عورت قدیم ادب العالیہ کے صفحات میں سے زندہ ہو کر اس کی آغوش میں چلی آئی ہو۔"

انقلاب اور ماڈرن لڑکیاں دونوں چیزیں اس کے نزدیک کوئے اڑانے کیلئے نصب کئے ہوئے بازوکشا تیلیوں کی طرح تھیں۔"

"ایک بھیانک زلزلہ آگیا۔ الف لیلہ کے لرزہ براندام کر دینے والے واقعات بھی سہم کر اپنے اوراق پارینہ میں چھپ گئے۔"

"انیسری مردوں سے اس طرح پرتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زندہ سارہاں اور بولتے ہوئے بلاوز ہیں۔ اسکو سینے سے لگالیا۔ گل اسکو اپنے گرد لپیٹ لیا"

اختر صاحب نے بعض کیفیات کا اظہار بہت منفرد پیرائے میں کیا ہے۔ اور ایسے منفرد الفاظ اور فقرے استعمال (ایجاد کہنا زیادہ صحیح ہوگا) کیا ہے۔ جنہیں صرف ان کی ذہانت اور تخیل کا کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ ان الفاظ کا استعمال ان کے علاوہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔ مثلاً ان دو فقروں کو دیکھئے جن میں "جیتا جیتا" اور "تانا تنا" کے الفاظ نے ایک خاص بات پیدا کردی ہے۔ اگر یہ الفاظ نہ لائے جاتے تو شاید ان فقروں میں کوئی معنویت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

"نفیسہ نے اسے اپنے دونوں پاؤں پرلے کر پاٹ پر بٹھایا۔ سفید لچھے دار آڈی کا گری۔ اور پھر جیتا جیتا سرخ خون۔ مالک کے ہوش اڑ گئے۔ بیماری پھر عود کر آئی تھی۔"

"رات پھر اسی طرح کئی بار دونوں چھپر پور اور علی نگر کے درمیان تانا تنتے رہے۔"

طنز و تعریض بھی اختر صاحب کے اسلوب کا ایک اہم پہلو ہے ان کے افسانوں میں جا بجا ایسے تلخ اور چبھتے ہوئے فقرے ملتے ہیں جن میں احساس کی شدت نے بڑا گہرا جذباتی رنگ داخل کر دیا ہے۔ اور اسی لیئے ان کی اثر آفرینی بھی دوبالا ہو گئی ہے۔

"مجلے متوسط طبقہ نے ایک فرد کیلئے یہ ایک بہت بڑی نعمت تھی کہ اسے ہوا اور روشنی کے بغیر ٹیکس اور ملاگنزوؤں کے میسر آجاتی تھی

"پاسی خانہ اور بار میں نیکی اور پارسائی کے نقطۂ نظر سے کوئی فرق نہیں۔ ہاں خود ساختہ شرافت کے معیار کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی بد وضعی عین وضعداری ہے۔ معطر عصیاں رخسار تہذیب کا گلگونہ"

علی کے نوجوان ایرانی رفیق .... غیرت و شرم کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک پچاس سالہ شیخ کا جواب تملا کر سنا۔ ہماری بغیرتیں ملوک عرب کی زردار تھیلیوں میں بند ہیں یا پھر بیرؤں کے ساتھ دیار افرنگ کو بھیجدی گئیں۔"

فنکار کے اسلوب میں ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے۔ جس سے بڑی حد تک اس کے انفرادی رنگ کی تمیز ہوتی ہے۔ اختر کے اسلوب کا مجموعی آہنگ رومانی اور شاعرانہ ہے۔ وہ بڑی خوبی سے اشعار اور مصرعوں کو جزو تحریر بنا لیتے ہیں۔ اور ایسے رنگین اور مرصع فقرے استعمال کرتے ہیں جو ان کی تحریر میں بلند ادبی معیار پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی رومانیت اور انفرادیت اس وقت اپنے عروج پر ہوتی ہے جب وہ جذبات نگاری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور جذبات کے جوش و ابال میں ان کے قلم سے خود بخود ڈھلے ڈھلائے رومانی اور شاعرانہ فقرے نکلنے لگتے ہیں۔ وہ بالعموم جذیل، پرفتی کھٹ اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ان کے اسلوب میں کہیں کہیں خطیبانہ بلند آہنگی اور خوش وجذباتیت بھی راہ پا گئی ہے۔ اور خشک اور بوجھل علمی اور فلسفیانہ انداز نمایاں ہو کر ان کے فن کے مقصد اور تاثیر کو نقصان پہنچانے کا سبب بھی بنا ہے۔ ان کے اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیت اس کی رنگین، بلند آہنگی اور تہ داری ہے۔ جس میں ان کے تخیل کا وفور نمایاں ہے۔ اختر کا یہ انداز صرف ان کی کہانیوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ ان کی تنقید نگاری کا بھی یہی انداز ہے۔ بات یہ ہے کہ فنکار کسی بھی فارم میں اظہار خیال کرے اس کی فنکارانہ قماش میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور اس کا خصوصی آہنگ لب و لہجہ اور انداز اس کی فنی کاوشوں میں فارم کے تغیر اور اختلاف

کے باوجود تقریباً یکساں انداز میں بروئے کار آتا ہے۔ مضمون ختم کرنے سے قبل اختر صاحب کے افسانہ "کینچلیاں اور بالِ جبریل" کا خصوصی حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ایک ایمائی اور تاثراتی افسانہ ہے جس میں اختر صاحب نے بڑی خوبی سے حیات و کائنات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی یہ تہذیبِ حاضر پر بھرپور طنز بھی ہے۔ جو آج اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اختر صاحب نے بڑی چابکدستی سے ان مادی اور جنونی نظاموں پر نشتر زنی کی ہے۔ جن کی بھول بھلیوں میں پھنس کر آج کا انسان گم کردہ راہ ہو گیا ہے۔ اور جس کے نتیجے میں آج ہر سو شر و فساد اور تباہی و بربادی کا بھیانک اور ہولناک منظر دو نما ہے۔ مادیت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ انسان کے اندر انسانیت کا شرف و مجد کا احساس بیدار کرنے میں قطعاً ناکام رہی۔ اس نے انسان کو محض نفس کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ اس نے انسان کو کوئی ایسا اعلیٰ اور برتر تصور نہیں دیا جو اس کے نفس کے اندر چھپے ہوئے بچھوؤں کو نیش زنی سے روک سکے یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان بے انتہا مادی ترقی کر لینے کے باوجود فکری آسودگی اور ذہنی اطمینان کی دولت سے محروم ہے۔ اختر صاحب کا یہ افسانہ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا اور اہم سوالیہ نشان بن کر آتا ہے۔ کیا آج کا مہذب اور متمدن انسان واقعی مہذب اور متمدن کہلانے کا مستحق ہے؟ انسان نے بظاہر بے پناہ ترقی کر لی۔ لیکن ابھی تک اپنی بہیمانہ سرشت پر قابو نہ پا سکا۔ وہ سانپ کی طرح اب تک محض کینچلیاں بدلتا رہا ہے۔ مادیت انسان کے اندر انسانیت کے جوہر کو چمکانے میں ناکام ہو چکی ہے۔ انسانیت کی فلاح و نجات اب صرف روحانیت سے وابستہ ہے۔ ان فقروں کی معنویت پر غور کیجئے۔

"کیا یہ دجال اور آزاد پرند مجھ میں ہی اژدہے، سانپ اور آتشیں بچھو خود میرے نفس سے نہیں نکلے؟ کیا ارتقا صرف کینچلیاں بدلنے کا نام ہے؟ اور میں سانپ کا سانپ رہا۔ کیا یہ دجال بھی میرے اندر ہے؟ کیا میں نے اپنی روح کے ایک گوشے کو شیطان کے تصرف سے بچا لیا ہے؟ کیا مجھے جبریل کے پر پرواز بھی عطا ہوں گے؟ یا میں اس غم میں خودکشی کر لوں گا؟ اگر مجھے جوہرِ روح نہ ملا تو میں مادہ کی جوہر شکنی کے ذریعہ اس کائنات کو فنا کر دوں گا اور خود بھی فنا ہو جاؤں گا۔"

اس افسانے میں جو بلیغ اور پُرمعنی اشاریت، گہری اور فلسفیانہ معنویت اور اسلوب و تکنیک کی خیال انگیز جدت ملتی ہے۔ وہ اردو کے افسانوں میں بہت ہی کمیاب ہے۔ اس افسانے میں اختر صاحب کا فن انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس کے اس افسانے پر تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ نہ یہ میرا موضوع ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی (ہماری زبان علی گڑھ) میں اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھ چکے ہیں۔ اس افسانے میں اختر صاحب کے وسیع علم، گہرے مطالعہ، باریک بیں مشاہدے بیدار ذہن، رنگین تخیل، لطیف احساس اور نکھرے ہوئے جذبے کا پرتو ملتا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں بڑی خوب صورتی سے یکجا کی گئی ہیں۔

اختر صاحب کے اسلوب میں جو گہرائی، وزن، وقار اور رفعت و عظمت کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کا راز میں سمجھتا ہوں ان کی شخصیت کی اسی ہمہ گیری، تنوع، وسعت، رنگارنگی اور تہ داری میں پنہاں ہے

---:(۵):---

مظفر اقبال

اردو لسانیات اور اختر اورینوی

لسانیات علم و ادب کی ایک اہم شاخ ہے، زبان کی پیدائش اور اس کا ارتقاء، الفاظ کی ساخت، ترکیب اور اس کی سرگذشت، محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات کی گھڑت اور صوتیات کے اصول و ضوابط پر اُردو میں کچھ کام ضرور ہوا ہے لیکن یہ سرمایہ بہت ہی محدود اور مختصر ہے، میں کسی انشاء پرداز کی طرح ترنگ میں آکر یہ تو نہیں کہوں گا کہ اُردو میں لسانیات کا وجود فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر لیکن اِس حقیقت سے انکار بھی نہیں کر سکتا کہ اُردو لسانیات پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ بہت ہی ابتدائی اور کمتر درجہ کا ہے۔

بہر کیف! جو بھی تھوڑا بہت سرمایہ ہے اس میں اُردو زبان کی پیدائش اور اس کی عہد بہ عہد ترقی کے موضوع پر نسبتاً زیادہ مواد ملتا ہے، اس موضوع پر کام کرنے والوں میں مستشرقین میں گریرسن کا رساں دتاسی اور جان بیمز اور اُردو کے ادیبوں میں محمد حسین آزاد، سید سلیمان ندوی، وحیدالدین سلیم، احمد دین، حافظ محمود شیرانی، محی الدین قادری زور، شوکت سبزواری، مسعود حسین خاں اور اختر اورینوی کے نام نمایاں ہیں۔

گریرسن کا کام بہت ہی گراں قدر ہے، اُس نے نہایت ہی جانفشانی سے اس موضوع پر کام کیا ہے، چنانچہ اس کی کتاب ہندوستانی کا لسانیاتی جائزہ LENGUISTIC SURVEY OF 9NDIA کی قدر و قیمت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے، اس موضوع پر کام کرنے والے اُردو کے تقریباً تمام اہم محققین نے اس سے استفادہ کیا ہے جان بیمز کی کتاب ہندوستانی لسانیات کا خاکہ بھی بلاشبہ ایک قابل قدر کوشش کی ہے۔

اُردو کے مصنفین میں محمد حسین آزاد غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر اُردو زبان کی نشو و نما پر اپنی کتاب آبِ حیات میں بحث کی ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ اُردو زبان کا ماٰخذ برج بھاشا ہے۔

محمد حسین آزاد سے قبل اُردو کے ایک مشہور و معروف داستان گو میر امن نے اپنی کتاب باغ و بہار کے مقدمہ میں اس موضوع پر قلم اُٹھایا تھا اور غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے بھی اپنی کتاب جلوۂ خضر میں اس موضوع پر کچھ نکتے پیش کئے تھے لیکن علم و ادب کی دنیا میں ان کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں۔

سید سلیمان ندوی نے اس موضوع پر چند بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں اُن کے مجموعۂ مقالات نقوشِ سلیمانی میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی کتاب عرب و ہند کے تعلقات میں بھی اس موضوع پر کارآمد بحث کی ہے، ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ وادیٔ سندھ اُردو زبان کا

اولین گہوارہ ہے۔

حافظ محمود شیرانی اور محی الدین قادری زورؔ نے اُردو کی جائے پیدائش سرزمین پنجاب کو قرار دیا ہے[1]، ڈاکٹر محمود حسین نے اُردو زبان کا مرزبوم ہریانہ کو بتایا ہے[2] اور شوکت سبزواری نے پالی پراکرت کو اُردو زبان کا ماخذ و منبع قرار دیا ہے[3]۔

اختر اورینوی صاحب نے اُردو زبان کی پیدائش اور ارتقاء کے موضوع پر شروع میں چند مقالے لکھے، مثلاً: بولیوں کا سنگم[1]، سورداس اور تلسی داس پر اُردو کا حق[2] اور اُردو زبان کا ارتقاء[3]، لیکن ان مقالات سے ان کی سیری نہیں ہوئی چنانچہ جب انھوں نے ڈی۔لٹ کی ڈگری کیلئے اپنا مقالہ "بہار میں اُردو زبان کا ارتقاء" مرتب کیا تو اُس کے مقدمہ میں اس موضوع پر نہایت تفصیل سے بحث کی، اپنے مقالات میں جن نکات کو انھوں نے مجمل اور مبہم طور پر پیش کیا تھا انھیں اس مقدمہ میں مفصل اور واضح طور پر پیش کیا، یہ مقدمہ کتاب کے اسّی صفحات پر پھیلا ہوا اور درج ذیل تین عنوانات پر مشتمل ہے:۔

(۱) فلسفۂ زبان و اقوام

(۲) اُردو زبان کے آغاز کا پس منظر

(۳) اُردو زبان کا ارتقاء

فلسفۂ زبان و اقوام کے عنوان کے تحت اختر صاحب نے مستند ماخذوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ:۔

"اس عالم نیرنگ میں نہ تو خالص نسلوں اور قوموں کا کوئی وجود ہے، نہ خالص کلچر کا اور نہ خالص زبان کا، نسل، قوم، کلچر اور زبان یہ سب ہمیشہ سیّال حالت میں ہیں، تھے اور رہیں گے، اُن میں ہر آن میل جول، خلط ملط، لین دین ہوتا رہتا ہے۔"

چنانچہ زبان کی تقسیم جو نسل کی بنیاد پر کی گئی ہے وہ محض سمجھنے سمجھانے کے لئے ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ:۔ "ہر خاندان کی زبان میں اشتراک پایا جاتا ہے۔"

اُردو زبان کے آغاز کا پس منظر بہت ہی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اختر صاحب نے اس باب میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کا بڑا ہی بصیرت افروز تجزیہ کیا ہے، ہندوستان میں مختلف قوموں کی آمد اور آبادکاری اور ان کی زبانوں کی نشو و ارتقاء پر بہت ہی تفصیل کی ہے انھوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں آریہ قوم کی آمد سے قبل تین مختلف قومیں آکر آباد ہو چکی تھیں، اول نگریٹو، دوم آسٹرک اور سوم دراوڑ، آریہ قوم ہندوستان میں اُن قوموں کے بعد داخل ہوئی اور وہ عراق، ایران، افغانستان اور بلوچستان وغیرہ سے ہو کر یہاں پہونچی اسلئے:۔

"ہند آریائی عہد کے شروع ہونے سے پہلے آریائی بولیاں عراقی، عربی اور قدیم آدی باسی ایرانی سے مل کر مخلوط ہو گئی ہونگی۔"

اور:۔ وہ ہندوستان میں آکر آریائی زبان صوتیات، ساخت و حرف، نحو و ترتیب اور لغات کے اعتبار سے دراوڑی زبان کا گہرا اثر قبول کرتی رہی۔"

چنانچہ:۔ "ویدوں کے بڑے حصّے کی زبان ہر پہلو سے مخلوط ہے۔"

اُس کے بعد اختر صاحب نے ہند آریائی زبان کے ارتقائی منزلوں کا بہت ہی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور درج ذیل نتیجہ برآمد کیا ہے:۔

"پالی اور دوسری پراکرتوں کی طرح خود سنسکرت بھی ملی جلی زبان اور تین تہذیبوں کی نمائندہ تھی، آریائی، دراوڑی اور آسٹرک، ایک پہلو سے سنسکرت کو اپنے علاقے اور عہد کی پراکرت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن قواعد دانوں کے اثر سے جب وہ مصنوعی زبان بن گئی تو دوسری مخلوط بولیوں نے پے در پے اس کی جگہ لی، پالی، دوسری پراکرتیں، اپ بھرنش بعد ازاں نئی بھاشائیں اور پھر ہندی، بنگلہ اور اُردو زبانیں جیتی جاگتی زبانوں کی حیثیت سے عوام میں اور زندہ ادب میں مستعمل ہوئیں۔"

اُردو زبان کے ارتقاء کے زیرِ عنوان اختر صاحب نے ماہرین کے مخالف نظریات کا ناقدانہ تجزیہ اور محاکمہ کیا ہے اور اس سے جو نتائج مستنبط کئے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

"اُردو زبان اُس دور کی پیداوار ہے جب دوسری جدید ہند آریائی زبانیں اپ بھرنشوں سے پیدا ہو رہی تھیں، اُردو بھی اسی جدید ہند آریائی دور کی پیداوار ہے لیکن دوسری جدید ہند آریائی

---

[1] پنجاب میں اُردو [2] ہندوستانی لسانیات ص۷۲، [3] تاریخ زبان اُردو
[3] اُردو زبان کا ارتقاء

[1] تحقیق و تنقید ص۔ [2] تحقیق و تنقید ص۔ [3] قدر و نظر

زبانوں کے مقابلہ میں اس کی تخلیق زیادہ مرکب، پیچیدہ، بالیدہ اور ارتقاء یافتہ انداز میں ہوئی ہے۔ اُردو بلاشبہ ایک جدید ہندوستانی زبان ہے لیکن صفتِ آریائی پر غیر متوازن زور حقیقت وحق اور ہندی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کے خلاف ہے، نہ تو ملکِ ہند خالصتاً باعتبار اکثریت "آریہ ورت" ہے اور نہ یہاں کی کوئی جدید ہند آریائی زبان خالصتاً آریائی کہلانے کی مستحق ہے۔"

"میں ریختہ یعنی قدیم اُردو کی صرف ایک شکل تسلیم نہیں کرتا بلکہ میرا نظریہ ہے کہ جتنی بھاشائیں ہند میں تھیں اتنی ہی ریختائیں بنیں، ان مختلف ریختاؤں کے عہد کو اردوئے قدیم کا عہد کہنا چاہیے جب کہ اردو زبان کا لسانی سانچہ متعین نہیں ہوا تھا، اس کے بعد اُردوئے وسطیٰ کا عہد آتا ہے۔ پھر اس دور کی تکمیل کے بعد معیاری اُردو کی منزل آتی ہے اور اُردوئے معلّٰی کا دور شروع ہو جاتا ہے جو آج تک منتہی ہے۔"

قدیم اُردو کے فارم کے متعلق ماہرین کے مابین شدید اختلاف نظر آتا ہے، ان حضرات میں سے ہر ایک نے اُردو کے ارتقاء کے آغاز کے مسئلہ کو کسی ایک علاقہ اور اس علاقہ کی بھاشا سے وابستہ کر رکھا تھا، اختر صاحب نے ان کے درمیان ایک نقطۂ مفاہمت دریافت کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اُردو کے قدیم کے فارم ایک سے زیادہ ہیں، وہ کہتے ہیں:۔

"میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ماہرین و مبصرین نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ارتقائے اُردو کے سلسلہ میں مسئلہ کے دو منفرد پہلوؤں کو خلط ملط کیا گیا ہے، قدیم اُردو کے مختلف سانچوں میں کار ریختہ بن ایک الگ پہلو ہے اور معیاری اُردو کے سانچہ کا تعیّن ایک دوسری جہت ہے، گریرسن، زور، شیرانی، ندوی، چٹرجی، مسعود حسین اور سبزواری نے ان دو پہلوؤں کو شرح و بسط کے ساتھ نہیں پیش کیا، نیز اس امر کا لحاظ اچھی طرح نہیں کیا گیا کہ خالص یک رنگی بھاشا کا وجود بولیوں کے عبوری دور میں ناممکن تھا اسلئے لسانی سانچوں کے متعلق ذمہ دار حضرات نے بھی کثرت پن کے ساتھ باتیں کی ہیں، قدیم آپ بھرنش اور قدیم اُردو کے قدیم ترین نمونے جواب تک ملے ہیں ان کی بنیاد پر حرفِ آخر پیش کرنے کی عجلت غلط ہے۔"

نیز یہ کہ:۔ "قدیم اُردو یعنی ابتدائی ریختائیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔"

ہاں یہ صحیح ہے کہ:۔ ہر بھاشا کی ایک ریختہ بنی اور ہر ریختہ کا اپنا علیحدہ وجود ہے پھر یہ ریختائیں خلط ملط ہوئیں اور اس اختلاط و امتزاج کے لئے دلی کا شہر سب سے بڑا محل ہے۔" چنانچہ ان کا خیال ہے کہ معیاری اُردو کا ماخذ بہت حد تک ہندوستانی کھڑی بولی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس تجزیہ و تشریح اور جائزہ و محاکمہ کے بعد اختر صاحب جن فیصلہ کن نتائج پر پہونچے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

"۱۔ ہندوستانی کھڑی بولی معیاری اُردو کا خاص تنا ہے، مگر کھڑی بولی کی اصل کا دو ٹوک تعین بہت مشکل اور مشتبہ ہے۔

۲۔ قدیم ترین "ریختہ" کس بھاشا سے بنی؟ اب تک کی تحقیقات کے لحاظ سے اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا اور غالباً جواب ملنا ممکن بھی نہیں۔ ہند کی آریائی اور غیر آریائی بھاشاؤں میں قدیم "ریختہ" کے نمونے ملتے ہیں۔ ہاں اس بارے میں پنجابی ریختہ، سندھی ریختہ، گجراتی ریختہ، ہریانی ریختہ اور دکنی ریختہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر سرحدی ریختہ، کھڑی بولی ہندوستانی ریختہ، برج ریختہ، اودھی ریختہ، مگھی اور بنگالی ریختہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ معیاری اُردو کے فارم پر کھڑی بولی کے لسانی سانچے کے علاوہ چند اور بولیوں کے سانچوں کا بھی اثر ہے۔ مثلاً پنجابی، برج اودھی بعض اہم ریختاؤں کے وسطی دور میں ہریانی یا پنجابی اثر نمایاں ہے، مگر علاقائی خصوصیات کے ساتھ۔ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قدیم اُردو کے قدیم ترین نمونے جواب ملے ہیں اُن کے بیشتر حصے کو پنجابی ہریانی ہندوستانی آمیختہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ہندوستانی (کھڑی) ریختہ سب پر

غالب آیات:

اختر صاحب کے اس مقالہ کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہندوستان کی جدید زبانوں کے آغاز و ارتقاء کے موضوع پر مستشرقین اور ہندوستانی ادیبوں نے اب تک جو کام کیا ہے اس کا انھوں نے وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کی تحقیقات کا تجزیہ کرکے ایک جانب ان کی لغزشوں کو بے نقاب کیا ہے اور دوسری جانب ان کی صحیح دریافتوں کو اجاگر کیا ہے، اُن کے بظاہر مخالف و متضاد نظریات کے درمیان ایک نقطۂ مفاہمت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ان ماہرین کی تحقیقات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے ورن پر محاکمہ کرکے وہ نتائج برآمد کئے ہیں جو اب تک اردو میں لسانیات پر کام کرنے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔

اختر صاحب نے اردو زبان کی نشو و ارتقاء کا جائزہ تاریخ، ثقافت اور لسانیات کے وسیع پس منظر میں لیا ہے اور اس اعتبار سے ان کے بیانات کافی مدلّل اور وزن دار ہوگئے ہیں۔

ماہرین کی تحقیقات میں صداقت کی کرنیں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اختر صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نہایت جانکدستی سے ان کرنوں کو سمیٹ کر آفتابِ صداقت کو وجود میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اختر صاحب کے اس محاکمہ سے سابق ماہرین کی پھیلائی ہوئی بہت ساری غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں لسانیات کے طالب علم کے ذہن کی بیشمار گرہیں کھلتی ہیں اور اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کو ایک واضح نشانِ راہ مل جاتا ہے۔

انجم فاطمی

اختر اورینوی کی رومانی شاعری

اردو کی رومانی شاعری میں اختر اورینوی نے بعض کامیاب تجربے کئے ہیں اور ان کی رومانی شاعری میں ہمیں ایک خاص کیف و سرشاری کا احساس ہوتا ہے جس میں جذب و مستی کی ایک دنیا آباد ہے۔ اردو کی جدید رومانی شاعری جوش کی رہین منت ہے جنہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اور حسن کیف سے اردو شاعری کے اس رنگین باب کو رنگین تر بنا دیا۔ اردو کے رومانی شاعروں کا یہ قافلہ جوش کی قیادت میں مستانہ وار بڑھتا ہوا جب اختر شیرانی کے فن کے قریب سے گذرا تو اس کی لے میں کچھ اور شوخی، کچھ اور سرمستی اور کچھ اور بے باکی پیدا ہوئی۔ اختر شیرانی اور مجاز نے رومانیت کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا اور عورت جس کا کردار لکھنؤ کی ریختانہ شاعری میں بہت گر چکا تھا اور جو واسوخت میں آکر ریختی تر ہو چکی تھی اختر شیرانی نے اسے دلفریب وادیوں، مرغزاروں اور فطرت کی حسین آغوش میں لاکر صحت مند بنایا، اسے فطرت کا حسن اور سادگی عطا کی، اسے بیگانہ وحشی اور آزادروی کا سبق سکھایا۔ جوش نے بھی عورت کو پردے کے اندر مقید رکھا لیکن اختر شیرانی اور مجاز نے اسے بڑی بے باکی سے زندگی کی جد و جہد میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ اب عورت سلمیٰ، عذرا، نور اور ریحانہ کے روپ میں آکر نکھر اور سنور چکی تھی اور اس کی لطافت میں وقار اور دلفریبی آ چکی تھی۔ اختر شیرانی کہتے ہیں ؎

بہار حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دست رنگیں سے سنوارا ہے
بہشت رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستان جوانی کا تو اک زندہ ستارا ہے
تو اس دنیا میں بحر حسن فطرت کا کنارا ہے

اور مجاز تو بڑی بے باکی سے کہتے ہیں ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔

اختر اورینوی کی رومانی شاعری بھی اختر شیرانی کے ورثہ کی امانت دار ہے۔ؔ
اور حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی نے اردو کی رومانی شاعری کی روایت
کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ اختر اورینوی نے جہاں پر اپنا سفر ختم کر دیا وہاں سے
اختر اورینوی اس ورثہ کو آگے لے کر بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اختر اورینوی
کی شاعری میں جن کیفیات و جذبات کا اظہار ملتا ہے وہ جدید اردو
شاعروں کے یہاں بہت کم نظر آتے ہیں۔ دراصل اختر اورینوی کے فن کا
خمیر ہی رومان و شباب سے بنا ہے اور رومانیت ان کے فن میں یوں بس
گئی ہے کہ اگر ہم اسے نکالنا بھی چاہیں تو ممکن نہیں اور اگر اختر اورینوی کے فن
سے رومانی عناصر کو خارج کر دیا جائے تو آخر اس میں کیا رہے گا۔ دراصل
رومانیت اور جمالیات تہذیب کے ارتقائی منازل کی نشان دہی کرتے ہیں
اور ایک بڑا فنکار ایک بڑا AesThetic بھی ہوتا ہے اور جتنا بڑا فنکار ہوگا اتنا
ہی زیادہ وہ جمالیاتی طور پر حساس بھی ہوگا کیونکہ جمالیاتی احساس کا تعلق
انسانی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب ہم اختر اورینوی کی
رومانی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں انکے یہاں ایک نکھرے ہوئے احساس
جمال کا پرتو ملتا ہے۔ انکی شاعری میں جو نغمگی، کیف اور ترنم ہے جدید
اردو شاعری میں اس کی مثال کم ملے گی اور یہی نغمگی کیف اور ترنم جب
انکے تجربات و مشاہدات سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شاعری میں ڈھل جاتے
ہیں تو ایک دنیائے احساس سے روشناس کراتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند
اشعار جن میں ایک مخصوص جذبے کی فنکارانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔
ایک حزینہ کیفیت ہے جو ساری فضا کو سوگوار بنا دیتی ہے۔

ہو گئی ختم داستانِ دل
زندگی میری سو گئی جاتی ہے
امنڈ آتا ہے آنسوؤں کا سیل
گردِ حسرت بھی دھوئی جاتی ہے

رک چکی سانس اور یہ بیت کی ٹیس
نبض کا ہے کو ٹوٹی جاتی ہے
زندگی خواب تھی کہ موت ہے خواب
منزلِ ہوش کھوئی جاتی ہے
ٹپکی اک لال سی لہو کی بوند
فصل پت جھڑ میں بوئی جاتی ہے
دفن کیجئے بھی یادِ الفت کی
لاش ہر دم بھی ڈھوئی جاتی ہے

داستانِ دل کا ختم ہونا شاعر کے لئے سوہانِ روح ہے۔ زندگی
کے اس حادثہ کی کتنی فنکارانہ پیشکش ہے، ہر لفظ کے اندر معنویت
اور تجربے کی ایک دنیا پنہاں نظر آتی ہے۔ اندرونی جذبات و کیفیات
کو خارجی چیزوں کے سہارے کتنے حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
لیکن اختر اورینوی کی شاعری میں صرف سوز غم اور ماتم مرگ آرزو ہی
نہیں بلکہ رومان و شباب کی حسین و دلکش دنیا بھی ملتی ہے اور یہ دنیا
کبھی کبھی اختر شیرانی کی بسائی ہوئی پر بہار وادی کی یاد دلا دیتی ہے۔ؔ

وہ سون کے ساحل کے دل افروز نظارے
دامن میں لئے جلوۂ رنگین کے شرارے
وہ ریت کے ذرے کہ فردوس کے تارے
کیا حسن تھا جاگا ہوا ندی کے کنارے
اک بار مجھے اپنے پرستاں میں بلا لے
اے سون کے ساحل کے دل افروز نظارے
دریا کی روانی میں تھا اک نغمۂ بیہم
ہلکی سی شفق دامن مشرق میں سحر دم

اور اس کے بعد پھر یہ مناظر۔

ؔ اختر اورینوی کو اختر شیرانی وغیرہ کے اس رومانی ورثہ کا وارث قرار دینا صحیح نہیں جس کے متعلق مضمون نگار نے یہ رائے قائم کی ہے: "عورت کو ... کو بڑی بے باکی سے زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے پر مجبور کیا" اس جملے کا جو عام مفہوم مروّج ہے وہ اختر صاحب کے فن، افسانے یا شاعری، کسی میں نہیں پایا جاتا۔ شیرانی وغیرہ کے برخلاف اختر صاحب کا رومانی نقطۂ نظر بالغ و سنجیدہ اور اس لئے معاشرتی آداب کی حد میں ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اس مضمون کے مصنف نے آگے چل کر خود بھی کیا ہے۔ ادارہ ؔ یہ بات صحیح نہیں۔ اختر صاحب کا فن رومانیت کی حدوں سے بہت آگے جاتا ہے۔ ادارہ

وہ رنگ کا بکھرا ہوا نظارۂ عریاں
ہر سمت عقیق لہکی ہوئی خوشبو میں پریشاں
وہ رات کی پریوں کی محبت کے تقاضے

وہ نغمہ سرا بھول وہ افسانہ خواں تارے
وہ سون کے ساحل کے دل افسردہ نظارے
ہیں اختر بیتاب کو سو جان سے پیارے

اے سون بلالے مجھے پھر اپنے کنارے

اختر اورینوی کی شاعری میں جو تشبیہ و استعارے ملتے ہیں ان میں زندگی اور ایک تا ثراتی رنگ پایا جاتا ہے اور تشبیہ و استعارے کی مدد سے وہ جو تصویر کھینچتے ہیں وہ تصویر دلکشی اور حسن کے لحاظ سے جیتی جاگتی اور متحرک نظر آتی ہے۔ ان تصویروں میں زندگی بھی ہوتی ہے اور حسن بھی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جن کیفیات اور تجربات کو بیان کرتے ہیں وہ تجربات کسی ماورائی دنیا کے نہیں ہوتے بلکہ یہ ان کے اپنے تجربات و احساسات ہوتے ہیں جنھیں وہ فکر و فن کا حسین پیراہن عطا کر کے ابدی بنا دیتے ہیں۔ انکی ایک نظم "تردید نظر" رومان اور حقیقت کا ایک دلنواز سنگم ہے ملاحظہ ہو ؎

آسماں پر ہیں ستاروں کی دمکتی شمعیں
انکی تابندہ زباں پر ہے یہ پیغام حسیں
بڑھ کے افلاک کو تو چوم لے اے خاکنشیں
رہرو راہِ تمنا کی بندھی آس مگر
دیکھ کر دوریٔ افلاک کو بس ٹوٹ گئی

اور اس کے بعد ؎

تیری آنکھیں ہیں کہ ایک عالم عشق و الفت
مشعل مہر و مروت ہیں کہ جام رنگیں
ایسے ہیں شوخ بلا دے کہ ہو رجعت تمکیں

اور اس شعر میں تو نظم کا سارا حسن سمٹ آیا ہے ؎

چشم بے ریزسے تجدیدِ سحر ہوتی ہے
بے رخی سے تری تردیدِ نظر ہوتی ہے

چشم بے ریز سے تجدید سحر کا ہونا اور پھر بے رخی سے تردید نظر ہونا بظاہر دو متضاد کیفیات کو پیش کرتے ہیں لیکن اس تضاد میں بھی ایک حسن ہے، شاعرانہ اور فنکارانہ۔ شعر کو ایک بار پھر پڑھیے اور لطف اٹھائیے ؎

چشم بے ریز سے تجدید سحر ہوتی ہے
بے رخی سے تری تردیدِ نظر ہوتی ہے

اختر اورینوی کی رومانیت میں ایک پاکیزگی اور سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ ان کا دامن جنسیات کی خاردار جھاڑیوں میں کبھی نہیں الجھتا اور نہ ہی مریضانہ جنسی بے راہ روی ہی نظر آتی ہے جو جدید عہد کے اکثر شعراء کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ عورت اختر اورینوی کی شاعری میں بڑی خاموشی سے داخل ہوتی ہے، ایک مرمریں خواب کی طرح جو فطرت کی گود میں پروان چڑھتی اور ندی کی پر سکون لہروں کے بیچ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ کھو جاتی ہے۔ ہمیں اسکی آمد کا احساس ہوتا ہے لیکن بڑا مدھم اور غیر مرئی سا احساس، وہ دھیرے دھیرے ذہن و احساس پر چھاتی چلی جاتی ہے۔ ایک پرچھائیں کی طرح لیکن پھر بھی اس کا وجود نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ وہ عریاں ہو کر نظروں کو دعوتِ شوق نہیں دیتی ہے اور نہ اس میں اعصاب پر ریضانہ طور پر چھا جانے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اختر اورینوی کے یہاں جو عورت کا تصور ہے وہ بڑا پاکیزہ اور مقدس ہے، لیکن رجعت پسندانہ اور مولویانہ نہیں ؎

اگر وہ محبت کا اقرار کر دے
تو شاعر دو عالم سے انکار کر دے
تو شرمیلی نظروں سے اظہار کر دے
جنونِ تمنا کو بیدار کر دے

غم زندگی سے میں اکتا گیا ہوں
نگاہ غیدہ کو تلوار کر دے،
خودی اور خدا کو فراموش کر دوں
اگر وہ محبت کا اظہار کر دے،،
نہیں پارسائی میں اظہار ہمتی
گنہگار کر دے گنہگار کر دے،
اگر تیری آغوش جنت کشا ہو
تو اختر دو عالم سے انکار کر دے

"دیار محبوب سے آتے ہوئے" شاعر کے دلی کیفیات کی ترجمانی ملاحظہ ہو

دیار حسن سے جلوے چرائے جاتا ہوں
نگہ میں طور کی دنیا بسائے جاتا ہوں
دل نگار میں ہلچل مچائے جاتا ہوں
میں رو رہا ہوں انہیں بھی رلائے جاتا ہوں
کرشمۂ دل الفت شعار کی سوگند
میں ان کے دل میں بھی محشر اٹھائے جاتا ہوں
میری نظر میں تصور بھی اک حقیقت ہے
کسی کو سینے سے اپنے لگائے جاتا ہوں
بھر آیا دل مرا اختر نکل پڑے آنسو
کسی کا راز محبت چھپائے جاتا ہوں

حسن و عشق کی پاکیزگی اور پاکیزہ خیالی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ راز محبت کو چھپانے میں دل پر جو کیفیت بیت جاتی ہے اسے کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جو تجربے کی اسی وادی سے گزر رہے ہوں۔ دل کی ٹیس جب بڑھ جاتی ہے تو وہ آنسو بن کر نکل پڑتی ہے۔ آنسو نکل آتے ہیں لیکن راز محبت افشا نہیں ہونے پاتا کیونکہ یہ دل تو کسی کی امانت ہے اور اسی کا راز تو اس سے زیادہ قیمتی ورثہ ہے جسے شاعر کسی بھی حال میں افشا نہیں کرنا چاہتا لیکن "اگر یہ بے اختیار" کو شاعر کیا کرے۔ سے

زار و نزار عیاں مری
آنکھ بھی اشکبار ہے
قلب حزیں پہ چوٹ ہے
روح بھی سوگوار ہے
نالے ہیں نارسا مرے،
اپنے نصیب کیا کروں
عذر تھا تو مہربان ہے
مہر و وفا کو کیا کروں
جانے کہاں سکوں گیا
دل میں تو بس خلش رہی
چشم وفا کے باوجود
سوز رہا تپش رہی،
دل کی کلی کھلی بھی جو
باد خزاں نے آ لیا،
نغمے نکل رہے تھے کہ
ساز مرا بگڑ گیا
خندہ ابھی تھا زیر لب
آنسو کا ابر چھا گیا
میری خوشی کا آفتاب
وقت سحر غروب تھا

اور اس کے بعد افسردگی اور یاس جب اور بڑھ جاتی ہے تو شاعر اپنے دل کو دوسرے خیالات سے بہلاتا ہے، اپنے ذہن کو فریب دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عشق کی عظمت کا پاس بھی رکھتا ہے اور ہر لحظہ اسے اپنی خودداری کا احساس بھی رہتا ہے

عشق میں کامیاب ہوں
عشق برا سہی رہے
مجھکو نہ ہو نصیب دید،
ان کا خیال ہی رہے
زہر کا جام چھوڑ کر،
عمر خضر نہ لوں کبھی،

بدلے میں اضطراب کے

لوں گا نہیں سکوں کبھی

ان کی نظر میں ہوں عزیز

دل میں مری جگہ تو ہے

میری متاع جان و دل

ان کی وہ اک نگہ تو ہے

اختر اورینوی کی تمام نظموں میں جن اندرونی جذبات اور کیفیات کی جھلکیاں ملتی ہیں وہ اردو کی رومانی شاعری کے لئے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اردو کی رومانی شاعری میں اپنے تجربات اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کر کے صنفِ سخن میں موج در موج کا اضافہ کیا اور اسکے امکانات کو وسیع کیا اور نئی سمتوں کی جانب بڑے صحت مند اشارے کئے ہیں۔ ان کی شاعری احساس و وجدان کی شاعری ہے جو شباب اور اس کے رومان کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ اردو کے تمام رومانی شعراء کی طرح وہ حسن کے پرستار اور شیدائی ہیں اور اسی کو اپنی کائنات سمجھتے ہیں۔ وہ کوئی ماورائی جنت نہیں تخلیق کرتے بلکہ ان کی جنت تو یہی دنیا ہے۔ سون کا کنارہ، لکھنؤ کی شامیں عظیم آباد کی پر بہار اور سکون آفریں صبحیں اور گنگا و گومتی کی سبک خرامی۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں انکی رومانیت پلتی، بڑھتی اور سانس لیتی ہے۔ یہاں حسن بھی ہے اور نغمگی بھی، کیف بھی ہے اور سرور بھی، اضطراب بھی ہے اور سکون بھی، خندۂ زیر لب بھی ہے اور آنسوؤں کا سیلاب بھی۔ خلش بھی ہے اور تپش بھی اسی لئے اختر اورینوی کا چھیڑا ہوا رومان پرور ساز ہمیں اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا نظر آتا ہے اسی لئے کہ انکے تجربے ذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی اور ہمہ گیر ہیں۔ "نذرِ زبانِ لکھنؤ" میں انہوں نے جن تجربات کو پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ اصل اور حقیقی ہیں لکھنؤ کا وہ دل فریب ماحول، وہ رنگینی، گومتی کا کنارہ، امین آباد کی رومان پرور شام، قیصر باغ اور حضرت گنج کی بولتی ہوئی

سحر انگیز اور شباب پرور سڑکیں، بازار اور گلیاں اور اس پر قیامت ایک برقِ ناگہاں کا گرنا اور شاعر کا دیوانہ وار اسی حسن ستم کیش کی جانب کھنچنا ایک متحرک تصویر نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

چند دن گزرے رہا مہمانِ لکھنؤ

دید کے قابل ہے واللہ بوستانِ لکھنؤ

گومتی کے ساحلِ رنگیں پہ نظاروں کا کیف

جلوہ در جلوہ ہے گویا آبِ روانِ لکھنؤ

عشرت رفتہ بہاریں صحبتیں رومان دوش

منزلِ تخیل میں ہے کاروانِ لکھنؤ

وہ امین آباد میں عقدِ ثریا کا سماں

رشک کرتا ہے زمیں پر آسمانِ لکھنؤ

اس کے بعد دیکھئے

اک عمارت میں مگر کچھ حادثہ سا ہو گیا

دیکھ پایا پھر نہ میں ماضی کی شانِ لکھنؤ

ہوش تھا کس کو کہ دیکھے صنعت تعمیر کو

یاد ہے مجھ کو وہ برق ناگہانِ لکھنؤ

کھا کے ٹھوکر وہ پلٹ جانا نگہ یار سے

شرمگیں چتون تھی یا رازِ نہانِ لکھنؤ

رنگ و نور کی متحرک تصویر ملاحظہ ہو ؎

الاماں البیلے آنچل کا سرکنا ناز سے

تھا سمٹ آیا شبابِ گلستانِ لکھنؤ

مشک بو جوڑے کا گھبراہٹ میں کھلنا دوش پر

گیر دے پیچ میں اتھاں شبانِ لکھنؤ

اس کے بعد ستم بالائے ستم ؎

شعر کی فرمائشیں اندازِ تحسیں کا وہ موج

چلبلا پن پھبتیاں حسنِ بیانِ لکھنؤ،

کتنی رنگیں داستاں تھیں کتنی سرشار تھیں

کیف و سرمستی کی شبہائے جوانِ لکھنؤ

دن چڑھے وہ چوری چوری کھڑکیوں سے جھانکنا
بجلیاں چمکا رہی تھیں مہ وشانِ لکھنؤ

لیکن شاعر کو کیا ملا ۔

حسرتِ بیتاب کا تحفہ ملا ہے اے ندیم،
رو برو ہوتا وہ یارِ مہربانِ لکھنؤ
کاش کہہ سکتا میں اس سے بھی تمنائے جنوں
بس مرادل ہی رہا اک رازدانِ لکھنؤ
بھول سکتا ہوں میں تیری دلنوازی کے مزے
اے جزاک اللہ میرے میزبانِ لکھنؤ

ساری نظم ایک کیف اور احساس جمال سے سرشار نظر آتی ہے اور نظروں کے سامنے لکھنؤ کی تہذیب کی ایک متحرک تصویر رقص کرنے لگتی ہے خصوصاً اس شعر میں تو تجربات کی ایک دنیا پنہاں ہے

شعر کی فرمائشیں اندازِ تحسیں کا وہ سوچ
چلبلا پن پھبتیاں حسنِ بیانِ لکھنؤ

اس شعر کا صحیح لطف اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک خود اپنی آنکھوں سے ان تمام کیفیتوں کو نہ دیکھا جائے خصوصاً حسنِ بیانِ لکھنؤ" کا مزا تو آ ہی نہیں سکتا۔ ساری نظم رنگ و بو کے نغموں میں نترا بور نظر آتی ہے اور مجاز کی نظم "لکھنؤ" کی یاد دلا دیتی ہے لیکن مجاز نے لکھنؤ کو جس نظر سے دیکھا اس میں یاسیت کا عنصر زیادہ ہے اور اختر اورینوی کی نظم میں کیف و سرشاری کی ایک دنیا حسین پنہاں ہے۔ اس کے علاوہ "غم نارسائی"، ارمغان شباب، جنونِ تمنا، "زندگی عشق"، ماضی سے "وداع"، اور اجتناب وغیرہ اختر اورینوی کی کامیاب رومانی نظمیں ہیں جن سے اردو کی جدید رومانی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے اور اردو کی رومانی شاعری کو ایک نیا مزاج، ایک نیا اسلوب اور ایک نیا آہنگ ملتا ہے۔

طلحہ رضوی برق

اختر صاحب کا احساسِ جمال

"اختر صاحب کا احساسِ جمال" عنوان ہے جس کے تحت ایک وسیع تخیل، ایک حسین تصور، ایک رنگین مشاہدہ اور ایک متنوع تجربہ مضمون کی شکل اختیار کرنے جا رہا ہے۔ عنوان کی ترتیب لفظی اختر صاحب کو ہمارے سامنے پہلے لاتی ہے۔ اور احساسِ جمال کو بعد میں اور مضمون کو اسی ترتیب کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئیے تھا۔ مگر ایسا ہے نہیں۔ میں اختر صاحب کی شخصیت کو جو مشہور بھی ہے اور معروف بھی پہلے نہیں پیش کرنا چاہتا بلکہ بہ زاویہ نگاہ دانش اس صفت کو سامنے لانا چاہتا ہوں جس سے موصوف متصف ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کسی خیال اور کسی معنی کو ظاہر کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ لیکن اس کے باوصف یہ نفس معنی کے بالمقابل ثانوی حیثیت کے حامل ہیں۔ اچھا ہوگا اگر میں حسب ضرورت جابجا الفاظ کا تجزیاتی جائزہ بھی لیتا چلوں۔ عنوان بالا میرے مقصد کو بتاتا ہے یعنی میں اختر صاحب اور ان کے وہبی احساسِ جمال پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

"احساسِ جمال" دو لفظوں احساس اور جمال کا مجموعہ ہے۔ عام طور پر ہر شخص حواسِ خمسہ، باصرہ، سامعہ، شامہ، لامسہ اور ذائقہ رکھتا ہے۔ اشیاء کا حسن و جمال دراصل انسانی ذہن و دل و دماغ تک انہیں پانچ واسطوں سے پہونچتا ہے۔ یعنی یہی وسیلے ہیں جن سے حسن و جمال قلب پر جو انفعالی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ اپنے اثرات مترتب کرتا ہے۔ قدرت کی بظاہر اس مساوی تقسیم کے باوجود ہر شخص یکساں طور پر حسن کی دلبیری اور جمال کی نظر فریبیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

حسن اور جمال بظاہر دو الفاظ ہیں لیکن تصور ان دونوں کا ایک ہے اور وحدت معنی دونوں کو مترادف قرار دیتا ہے۔ کسی چیز، کسی حالت کسی منظر اور کسی کیفیت میں اگر ہم حسن و جمال محسوس کریں تو اس چیز، حالت منظر اور کیفیت کو حسین و جمیل کہیں گے۔ اب دیکھا جائے کہ حسن ہے کیا اور جمال کہتے کس کو ہیں؟

بالعموم لوگ آگسٹین کے اس نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں کہ حسن دراصل کسی شے کی موزونیت اور اس کے تناسب و آہنگ میں مضمر ہے حالانکہ اسپنوزا نے تو حسن کے تصور کو ہی سرے سے باطل قرار دیا ہے۔ اور کہہ دیا کہ اس کائنات میں حسن و قبح کا وجود ہی نہیں۔ نہ کوئی شے اچھی ہے نہ کوئی شے بری بلکہ یہ حسن ایک بے معنی اصطلاح اور عقل کی دسترس سے الجھنے والی گتھی ہے۔ اگرچہ حسن کی ہی جاذبیت و منظر فریبی افلاطون توت

برگساں کے یہاں قوت حیات اور اقبال کے یہاں قوت خودی بن جاتی ہے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن و جمال کا دارومدار نہ تناسب پر ہے اور
نہ ہم آہنگی پر بلکہ حسن کے نور پر ہے۔ اور یہ حسن و نور ایک دوسرے سے
الگ نہیں بلکہ "اللہ جمیل و یحب الجمال" اللہ حسین ہے
اور حسن کو پسند فرماتا ہے۔ "اللہ نور السموات والارض"
اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ حسن کی تعریف کرتے ہوئے اختر صاحب
بھی ایک جگہ رقمطراز ہیں: "حسن عالم مثال کی دم حقیقت ہے۔ فنکار
صرف عالم واردات و محسوسات ہی اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔" یعنی حسن و
جمال نظر افروزی و سرور انگیزی کی منزہ و نا مصور شئے ہے اور حسن
کا مشاہدہ صرف اظہارات، صفات اور علامات کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔"
اس طرح نظر افروزی و سرور انگیزی حسن و جمال کی دو ناگزیر صفتیں ہوئیں
اور جب یہ چیزیں علامات و اظہارات کی شکل اختیار کریں تب ہی ہمارے
حواس کی گرفت میں آئیں گی اور ہم انھیں محسوس کر سکیں گے۔ یہی حسن
و جمال ہمارے سرور ذہنی و طمانیت قلب کا سرچشمہ، مقصد حیات اور
اس کی کامیابی و کامرانی کی آخری منزل ہے۔ حسن چونکہ منزہ و نا مصور ہے
اس لئے ہمارے احساس کے شکنجے میں اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک
وہ مجازی صورت نہ اختیار کرے، یعنی ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

یہی حسن جب مجاز کے پردے میں اپنی تجلیاں بکھیرتا ہے اور کوئی صورت
اختیار کرتا ہے تو ہم اسے فنی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کے
ہنر کو فن سے۔ جب حسن و فن میں چولی دامن کا ساتھ ہوا تو حسن کی
لطافت و پاکیزگی یقینی طور پر فن میں منتقل ہوئی تو یہ فن صرف فن
نہ رہا بلکہ فن لطیف ہو گیا۔ اب ہر وہ فن جسمیں لطافت آگئی فنون لطیفہ
میں شمار ہوگا۔ جو پانچ ہیں۔ مصوری، تعمیر، موسیقی، رقص اور
شعر و ادب۔ ظاہر ہے کہ ان فنون میں سے ہر فن کا جاننے والا بجا طور پر
فنکار کہا جائے گا۔ فنکار اپنے محسوس کردہ حسن کو مجازی شکل دینے
کیلئے اور اس شکل میں حسن کی وہی لطافت و پاکیزگی اور وہی شان
تجلی جو اس نے حواس کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ پیدا کرنے کیلئے خونِ جگر
سے کام لیتا ہے تاکہ اس کا فن اعجاز نما ہو ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود !!

اختر صاحب کو دنیا ایک فنکار کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کا
تعلق فن لطیف سے ہے۔ اور وہ بھی ایک ایسا فن جو سب سے اہم،
سب سے اعلیٰ اور سب کا سرتاج ہے۔ یعنی شعر و ادب" لہذا جب حسن و
جمال کو پردۂ مجاز میں پیش کرنے کا ہنر فن ٹھہرا اور اختر صاحب ایک
فنکار تو ہم دیکھیں گے کہ ان کا سروکار اس ہنر سے کس حد تک ہے
انھوں نے حسن و جمال کو کس طرح محسوس کیا ہے۔ اور ان کا جمالیاتی
شعور کس مرتبے کا ہے۔ ادب و فن کی بنیادی قدروں کا تذکرہ کرتے
ہوئے اختر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: "فنکار کے سامنے ہمیشہ حسن کا
تصور رہتا ہے اور ذوق حسن عطیۂ فطرت ہے۔" ؎

گرفتم این کہ جہاں خاک و ماکف خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ ما درد جستجو زکجاست

بیشک اختر صاحب اس عطیۂ ربانی کے حامل ہیں۔ ان کے ذوق حسن و
احساس جمال کا آئینہ ان کی جامع شخصیت، ان کا لباس، ان کی
وضع قطع، ان کا رہن سہن، ان کی گفتگو، ان کا لب و لہجہ، ان کی
چال ڈھال، حتیٰ کہ ان کی ہنسی مذاق میں بھی ان کی فطری نفاست
و شائستگی موجود ہے۔ کسی بزم، کسی محفل اور کسی انجمن میں وہ پہنچ
جائیں جان محفل و روح انجمن وہی رہیں گے۔ لوگ ان کی دلکش
شخصیت اور پرلطف گفتگو کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب
جو میں کہہ رہا ہوں وہی محسوس کرتا ہے۔ جس نے اختر صاحب کو
قریب رہ کر بغور دیکھا ہے۔ اور دیکھتا رہا ہے۔ لیکن وہ جنھوں نے
انہیں دیکھا نہیں یا جنہیں ان سے قریب رہنے کا موقع نہیں ملا
اختر صاحب کو ان کے فن یا دواوین میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی روح کو

محسوس کر سکتے ہیں۔ میں نے چونکہ جابجا الفاظ کا تجزیاتی جائزہ لینے کو بھی کہا ہے اس لئے اس پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ اختر صاحب کے فن پاروں میں ان کی روح کیونکر نظر آتی ہے اور آسکتی ہے۔

زندگی چونکہ جسم و روح سے مرکب ہے۔ جسم معروضی صورت ہے اور روح موضوعی۔ دونوں زندگی کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان میں جلال و جمال دونوں کی نمائش اور اظہار بیک وقت ہوتا ہے انسانی وجود کا موضوعی رخ یعنی روح غیر مرئی، منزہ و لطیف ہونے کے سبب نظر نہیں آتی۔ اس روح کا تعلق الوہیت سے ہے۔ قل الروح من امر ربی۔ الوہی صفات میں سب سے پہلی صفت خلاقی تھی۔ اور خلاقی کی محرک اس کی خود نمائی یعنی وہ ظاہر ہو اور وہ جانی پہچانی جائے ؏۔ انسانی روح بھی جو الوہیت سے متعلق ہے اسی جذبۂ خود نمائی سے مملو ہے۔ جس کی عملی شکل تخلیق مجازی ہے۔ یہ مجازی تخلیق فن ہے۔ اور مجازی خلاق فنکار۔ خلاق مطلق کی الوہیت کا مشاہدہ ہم مخلوقات میں کرتے ہیں اور فن کار کی روح کو اس کے فن پاروں (ذہنی تخلیقات) میں دیکھتے ہیں۔ اختر صاحب نے شعر و ادب کی ہر مشہور صنف کو ہاتھ لگایا ہے۔ اور اس طور پہ ہر برتا ہے کہ جمالیات کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ غزل، نظم، افسانہ ناول، ڈرامہ، تنقید اگر ان میں سے ایک ایک مثال بھی الگ الگ لی جائے تو دفتر تیار ہو جائے گا۔ میں یہاں پر اس تفصیلی و تجزیاتی مطالعے سے قصداً گریز کرتا ہوں۔ اور اختر صاحب کے چند ان اقوال پر اکتفا کرتا ہوں جن سے میری باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور جو اختر صاحب کے اندرون کا حال بتاتے ہیں۔ اختر صاحب کا عقیدہ ہے کہ "فنون لطیفہ کی بنیاد نظارہ جمال سے وابستہ ہے اور اسی جمالی تجربے کے انوار فن پارہ میں سما کر اسے قدر و قیمت عطا کرتے ہیں۔"

"حسن ہی مذہب اور آرٹ کی بنیادی قدر ہے اور اسی سے فرحت اور حمد کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔"

خدا حسین ہے، خدا نور ہے خالق مجازی اپنے خالق حقیقی کے اس حسن و نور پر فدا ہے۔ ہر جگہ اسی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی کی جستجو و تلاش میں رہتا ہے۔ اسی سے محبت کرتا ہے۔ اور اسی کو کافی سمجھتا ہے۔ تصوف کی ایک منزل وہ بھی ہے جہاں جنت (عبادت کا معاوضہ) کا تصور بھی نجاست و گناہ سے کم نہیں۔ غالب نے شاید اسی مقام کی طرف اشارہ کیا تھا ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

جب جمال کا احساس بھرپور ہو۔ دل و دماغ وحدت حسن و وحدت جمال کے قائل ہوں اس وقت وحدت مشاہدہ ایک ناگزیر سی چیز بن جاتی ہے۔ فن کار جنت و بہشت کی بوقلموں میں بھٹکنے سے بہتر وحدت حقیقت کے عرفان کو جانے گا۔ یہی لگن، یہی جذبہ، یہی محبت، عشق کا ایک مرکزی نقطہ بن جاتی ہے۔ شاید اختر صاحب بھی انہیں کیفیات و مشاہدات سے گزرے اور اس شعر کی تخلیق کی ؎

قدسیوں کو ہی مبارک رہے جنت تیری
میرے مولا مجھے کافی ہے محبت تیری

یہ مسلّم ہے کہ ذوق حسن و احساس جمال قدرت کا بڑا عطیہ ہے۔ جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ احساس جمال رکھتے ہوئے کوئی شخص فنکاری سے محروم ہو۔ کیونکہ یہ معاملہ دو طرفہ ہے۔ اور سچی فنکاری وہبی و کسبی جوہروں کے میل سے عمل میں آتی ہے۔ احساس جمال کے ساتھ ذوق حسن پیدا کرنا فنکار کیلئے از بس ضروری ہے ورنہ تنہا احساس جمال ہمیں جو کچھ دیگا وہ فطرت کی نقالی ہوگی۔ فطرت کا بدل نہیں اور فن، فطرت کی نقالی ہرگز نہیں۔ اس کا نعم البدل ہے کلیم الدین احمد نے ایک جگہ مشہور انگریزی نقاد و شاعر کالرج کا حوالہ یوں دیا ہے: "کولرج نے ایک جگہ مرد اور ایک عورت کا ذکر کیا ہے جو کسی آبشار کا نظارہ کر رہے تھے۔ مرد نے کہا "یہ کیسا جلال رکھتا ہے عورت نے جواب دیا۔ ہاں! بہت خوبصورت ہے۔ یہ نہ تھا کہ بیچاری عورت حسن کا احساس نہ رکھتی ہو۔ احساس تھا۔ ذوق نہ تھا۔ شعور تھا

؏ خود نمائی کا یہ تصور محض ہمارے شعر کی پرواز تخیل ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ادارہ

مگر تربیت یافتہ اور مہذب نہ تھا۔ اس لئے وہ حسن اور حسن میں فرق نہ کر سکتی تھی۔ اور دلبری و قاہری کے فرق کو نہیں جانتی تھی یا جانتی تھی تو بیان نہیں کر سکتی تھی"

اختر صاحب فطرت کے بیش بہا عطیہ احساس جمال کے ساتھ ایک نہایت تربیت یافتہ، مہذب اور کلچرڈ ذوق حسن رکھتے ہیں اور احساس و ذوق حسن کا اتنا نکھرا ہوا صاف ستھرا اور دلفریب امتزاج انھوں نے بڑی جگر کاوی سے پیدا کیا ہے۔ ابھی ابھی میں نے اختر صاحب کے ذوق حسن کو کلچرڈ کہا ہے۔ آپ ذرا لفظ کلچرڈ پر غور کرتے چلیں۔ کلچرڈ یا ثقافت دراصل انسانی زندگی کے اس شعبے کو کہتے ہیں جس کا تعلق براہ راست اور بلاواسطہ حسن و فن اور اس کی بوقلمونی سے ہے ؎ ایک مغربی مفکر "وایٹ ہیڈ" ثقافت (کلچر) کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"ثقافت تخیل کی فعلیت اثر پذیری حسن اور بیدار دانہ احساس ہے۔ عام طور پر تہذیب و ثقافت کا جو مفہوم نفاست و نزاکت کے ساتھ ہمارے یہاں مروج ہے وہ اختر صاحب نے روایتی طور پر پایا ہے۔ لیکن تخیل کی فعلیت اثر پذیری حسن اور بیدار دانہ احساس بھی اختر صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حسن کی تجلیاں ان کے فن پاروں میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً افسانہ کوکھے والا، شکور دادا، شہنشاہ حبشہ، حسرت تعمیر اور ان کی ادبی تنقیدوں میں بھی ــــ آرٹ چونکہ تنقید حیات ہے اس لئے اختر صاحب تنقید حیات میں جمالیاتی ڈھنگ پیدا کرنے کے قائل ہیں۔

اختر صاحب حسن و جمال کے اداشناس ہیں۔ حسن کی صوری، کیفی اور معنوی خوبیاں ان کے احاطۂ نگاہ میں رہتی ہیں۔ ان سے الگ ہو کر وہ تخلیق فن کر ہی نہیں سکتے۔ آرٹ کی بنیادی قدروں اور اس کی تخلیقی قوت کی جن جن صنعتوں کو اختر صاحب نے محسوس کیا ہے، دیکھا ہے، پرکھا ہے اور برتا ہے۔ ان کا ذکر ایک جگہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ نظروں کے سامنے گلہائے رنگا رنگ کے تختے لہلہانے لگتے ہیں۔ حسن کی نیرنگیاں اور جمال کی رعنائیاں انھیں کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نظر آتی ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"سیدھا پن، گولائی، نیم گولائی، ابھار، تناسب، پیچیدگی، خمیدہ، تیکھا پن، نوکیلا پن، کٹیلا پن، سجیلا پن، تراشیدگی، سجل پن، صف بندی، آراستگی، باقاعدہ، ترتیب، ہیئت گری، رنگ آمیزی، رنگینی، آراستہ پیر کاری، نادرہ کاری، سادگی، گلکاری و گل طرازی، تنظیم، قماش بندی، البیلا گردہٹ، حرکت روانی، تموج، رنگبارہ، تنویر، چمک دمک، لہک، نور فشانی، برق تابی، جگمگاہٹ، جھلملاہٹ، توازن، زیر و بم، سریلا پن، ترنم، تناسب، ہم آہنگی، جہک عطر بیزی، مشک افشانی، گلباری، رقص و وجد، وارفتگی، بے ساختگی، برجستگی، شستگی، نرمی، تیزی، ندرت وجدت، تازگی، لطافت، نزاکت، بھولا پن، نکہت و نزہت، نفاست، شیرینی، کھلاوٹ، رسیلا پن، انجھوتی، حیرت فزائی، رازداری و رمزیت، نقاب کشائی، اچانک پن، انیرنگی، تنوع، وسعت، گہرائی، گیرائی، کشادگی، بھرپور سکون، سناٹا، آبادی، ویران، تقابل و تضاد، مرکزیت اور نظام آفرینی، چونچال پن، خوشمندی، بلند خیالی، اخلاص صداقت، جوش و ولولہ، سوز، درد، گداز، رفت، آلودگی، ہمدردی، غمگساری، سیر دگی، نیازمندی، بے نیازی، خودسرائی، تسلیم و رضا، ایثار و قربانی، ہدایت و اطاعت، انعام، ترنم، تزکیہ، پاکی، اعلال لطیف احساسات، بیدار، جذبات، رفیع و دور رس خیالات، تکمیل زندگی اور حیات بخشی۔ یہ وہ محاسن ہیں جو فنون لطیفہ کو محبوب اور انبساط آفریں بناتے ہیں۔ وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ بہتری اندیکھی اور نامحسوس اداؤں کے امید وار ہیں۔ ؎ بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست۔ حسن و جمال کا اتنا وسیع، اتنا دقیع اتنا عمیق اور اتنا رچا ہوا احساس ذوق اور شعور بہت کم فنکاروں میں دیکھا گیا ہے ہمارا ادب اختر صاحب پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے ــــ

؎ حسن و فن کلچر کے بہترے عناصر میں صرف دو ہیں ــ ادارہ

مصطفےٰ سیماب قادری

اختر صاحب کا تنقیدی رجحان

ڈاکٹر اختر اورینوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے موصوف نے یوں تو ادب کے بہت سے شعبوں پر اپنی مختلف تخلیقات کا گہرا نقش ثبت کیا ہے مگر انکی ادبی شہرت کی خاص وجہ انکی افسانہ نویسی اور تنقید نگاری ہے ۔ میں نے اختر صاحب کے کل افسانے نہیں پڑھے اس لئے انپر کسی قسم کی رائے دینے سے معذور ہوں ۔ البتہ انکے بیشتر تنقیدی مضامین بھی سرسری نظر سے گذرے ہیں اور بیچ بتوجہ انکا مطالعہ بھی کیا ہے مضمون ہذا میں ان کی تنقید نگاری کا جائزہ تو نہیں ہے ہاں یکوشش کی گئی ہے کہ موصوف کے بعض خاص مضامین مثلاً ادب وفن کی بنیادی قدریں اور جبلتیں اور قدریں وغیرہ کی روشنی میں ان کے فنی نقطہ نظر کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اس فن میں ڈاکٹر اختر اورینوی کے خیالات معلوم ہوسکیں ۔ WE SEE THING AS WE ARE NOT AS IT IS ایک مشہور مقولہ ہے۔

ہم لوگ ہر شئے کو اپنے فکر و خیال کے آئینے میں دیکھتے ہیں چیزیں بذات خود کیسی ہیں اسکا ادراک بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ ایک ہی مسئلہ یا موضوع سے متعلق اختلاف آرا کی یہی وجہ ہے ۔ مثلاً گلاب کے پھول کو لیجئے اگر اس کو اشتراکی دیکھے تو نظریاتی علامت ہونے کی وجہ سے اسکو عزیز رکھے گا اگر کسی رومان پسند شخص کی نظر اسپر پڑیگی تو اسے اسمیں اپنے محبوب کے جیسا دلکش حسن نظر آئے گا ۔ اگر کسی صوفی بزرگ نے اسکو دیکھ لیا تو اسے فوراً احساس فنا ہوگا ۔ اور وہ اسکی پتیوں کے سوکھ کر گر جانے کے تخیل سے کل شئی یرجع الی اصلہ کا فلسفۂ حیات یاد کرے گا ۔ اور اگر کسی ذاقہ کش نے اسے دیکھ لیا تو بجائے اسکے کہ وہ اسکی دلفریبی سے خط اٹھائے متنفر ہو جائے گا ۔ اور اس کی خوشبو کی لپک اسکی اشتہا اور تیز کر دیگی ۔ غرضکہ اس ایک ہی پھول کے بارے میں ہر شخص کے احساسات علیحدہ ہوں گے ۔

اور ہر شخص اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرے گا ۔ اسیطرح ادب وفن سے متعلق بھی مختلف نظریات وخیالات ہیں ۔ اشتراکی نظریہ، اخلاقی وصوفیانہ نظریہ، جنسی نظریہ، روحانی نظریہ جمالیاتی نظریہ، جدید اشاریتی نظریہ، اور قدیم ادبی نقطۂ نظر وغیرہ ایک مکتبۂ خیال ایسا ہے جو ادب برائے زندگی کے لئے نعرہ زن ہے

دوسری طرف ایک طبقہ ادب برائے ادب کے نظریہ پر مصر ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ان سب میں کوئی منفاہمانہ راہ نکالنا بہت دشوار ہے ۔ چند ہی ادبا ایسے ہیں جو ان انتہاؤں سے علیحدہ ہوکر بہر حیثیت مکمل معتدل اور متوازن ادبی نقطۂ نظر رکھتے ہیں ۔ ان میں سے ایک اختر اورینوی

بھی ہیں - اختر صاحب کے افسانے پڑھیے، مطالعہ کے بعد یہ نہیں
کہہ سکتے کہ انکو زندگی اور اسکے متعلقات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے
اور وہ تفریحی ادب کے قائل ہیں۔ زندگی کی سنگین اور ٹھوس
حقیقتوں کو اختر صاحب نے جس حسن و خوبی سے اپنے افسانوں میں
پیش کیا ہے بسا اوقات ہمارے بعض اشتراکی قسم کے افسانہ نگار
کا بھی، جو دن رات ادب و زندگی کی رٹ لگاتے رہتے ہیں دامنِ
فن اس سے خالی نظر آئے گا۔ دوسری طرف ان کے تنقیدی مضامین
پڑھیے آپکو اندازہ ہوگا کہ اشتراکی نقادوں کے بعض خاص خاص
جملے جن پر انکی تنقیدی عمارت کی بنیاد پڑ گئی ہے ان میں فٹ نہیں
کیے گئے ہیں اور نہ اختر صاحب انکی طرح اپنے افسانوں ہی میں زندگی
کے حالات کی پیش کش کا اعلان کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور ادب کا رشتہ بڑا مستحکم اور
منضبط ہے۔ فن میں جو حسن، جانداری، توانائی، دلکشی، جاذبیت،
تنوع، ہمہ گیری اور سوز و ساز کا عنصر ملتا ہے وہ دراصل زندگی
ہی کا عطیہ ہے اگر فن کو زندگی سے غیر متعلق کر دیا جائے تو اسمیں کوئی ایسی
خوبی باقی نہ رہ جائے گی جسکو دیکھکر ہماری توجہ انکی طرف منعطف ہو۔
ہم غزل، نظم، یا افسانہ پڑھ کر اسلئے متاثر اور محظوظ ہوتے ہیں کہ
ان میں ہماری ہی زندگی سے متعلق کسی نہ کسی واقعہ، تجربہ،
مشاہدہ یا خیال کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر حالات زندگی کے
اظہار میں سے عنصر فن کو نکالکر سیدھے سادے انداز میں کسی
حقیقت کا انکشاف کر دیا جائے تو اس کثیف کیطرف ہم محض تشنگیٔ
ذوق کو ختم کرنے یا کم کرنے کے لئے متوجہ نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ انکشاف
کسی چیز کا اظہار تو ہوگیا فن نہیں ہوا۔ سہ رب کا شکر ادا کر بھائی
جسنے ہماری گائے بنائی۔ میں زبردست حقیقت بیانی ہے،
مصرع بھی موزوں ہے، لیکن اسکے باوجود صحیح معنوں میں ہم اسکو شعر
کہنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ فن میں احساس و جذبہ کے جگانے کی جو تاثیر
ہوتی ہے اس میں نہیں ہے۔ اس کے برعکس میر کا یہ شعر —

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی —
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

میں بھی انسانی بے بسی اور صناع عالم کی مختارانہ قوتوں کا
اظہار ہے۔ فرق یہ ہے کہ انکے ذریعہ شاعر نے ہماری الگ احساس کو
چھوا ہے۔ اور ہمارے جذبات کو متحرک کیا ہے۔ اس لئے اس میں بے
ذوقی اور خشکی کے بجائے دلکشی اور انفرادیت ہے حقیقت بیانی
بھی ہے اور فن کاری بھی۔ بہرکیف عرض کر رہا تھا کہ زندگی اور فن کا
تعلق ناگزیر ہے۔ لیکن اولیت فن ہی کو حاصل ہے کیونکہ فنکار کے
سامنے پہلا سوال اظہار فن کا ہے۔ اسکے بعد وہ اپنے اس اظہار
فن کے لیے مواد کی فکر کرتا ہے۔ اور یہ چیز وہ زندگی اور اسکے متعلقات
سے اخذ کرتا ہے۔ اس ضمن میں، اختر صاحب کا واضح اور معتدل
خیال ملاحظہ کیجئے ___ "میں دراصل، فن برائے زندگی کا قائل
ہوں۔ لیکن اس فقرہ کے دونوں پہلوؤں پر زور دینے کو کہتا
ہوں یعنی فن پر اور زندگی پر جب دونوں باتیں پوری ہو جائینگی
تو پھر فن برائے فن اور فن برائے زندگی میں قطعاً فرق نہ رہ جائیگا
اس فقرہ سے پہلے فن کی طرف توجہ جاتی ہے۔ اور پھر زندگی کی
طرف بھی اور مغالطہ پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا بشرطیکہ طوطے
کی طرح اس فقرہ کو رٹا نہ جائے" قدر و نظر ص ۳۱۲

ادیب نے اگر زندگی کے مطالبات اور عہد کے مسائل پر توجہ نہ دیا
تو پھر اس کے فن میں عصریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اسنے فن
لوازم سے انحراف کیا اور اس کی شرطوں کو برتنے سے مجتنب ہوا تو
پھر ادب میں ادبیت ہی نہ رہے گی، یعنی اسکی بنیادی اہمیت ختم
ہو جائے گی۔ اختر صاحب کا نظریۂ فن یہ ہے کہ ادیب زندگی کے
تجربات اور حقائق کو منظر عام پر لائے۔ لیکن تمام فنی حسن و خوبی
کے ساتھ۔ ایسا نہ ہو کہ ریاضیت تو ہو ادبیت ہی نہ ہو۔ اختر
صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آرٹ تنقید حیات ہے۔

لیکن اس تنقید حیات کے اپنے طور طریقے اپنے رنگ ڈھنگ اور اپنے ناز و ادا ہیں۔ اس ضمن میں اختر صاحب کا خیال خود انکے الفاظ میں دیکھیے ـــــ

آرٹ جو بہر حال تنقید حیات ہے۔ لیکن کیا وار دغہ جی کی رپورٹ، وکیل کی بحث کچہری کا فیصلہ، ڈاکٹر کا نسخہ دو پنج سالہ پلان اخبار کی خبریں وغیرہ تنقید حیات نہیں؟ آرٹ تنقید حیات ہے مگر اپنے طور طریقے سے اور اپنے طور طریقے والی جہت ہی آرٹ کی انفرادیت ہے۔" (قدر و نظر صـ ۳۱۲)

بیسویں صدی نے موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے اردو ادب اور شعرا کو نئے میدان عمل سے آگاہ کیا ہے۔ صدہا نئے تجربات ہوئے اور سینکڑوں نئے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے، جنہیں سے بعض کی صحتمندی اور درستگی سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس صدی نے ایک بڑی لعنت سے بھی ہمکو دوچار کیا۔ یعنی اردو کے ادبا، اشتراکی، رومانی، جنسی اور جدید تو پہلے ہونے لگے فنکار بعد میں۔ جسکو دیکھئے وہ پہلے اشتراکی، رومانی، جنسی یا جدید ہے بعد میں ادیب۔ اسکا متوقع نتیجہ اس شکل میں برآمد یہ ہوا ہے کہ افسون نظریات و حسن فن پر حاوی ہو گیا۔ اس نظریاتی الجھاؤ، کشمکش اور فکری کشیدگی نے بحیثیت مجموعی فن و ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ادیب پہلے فنکار ہوتا ہے تب اشتراکی یا رومانی۔ فن کی مقصدیت یا غیر مقصدیت جدت یا قدامت، اشتراکیت یا تصوف رومانیت یا جنسیت کا سوال اسوقت پیدا ہوگا جب ہر مکتبۂ فکر کے تمام ادبار فن اور اسکے لوازم کی اولیت کو متفقہ طور پر تسلیم کرلیں۔ جب یہ اتفاق آرا ہو جائے گا تو مسئلہ کا حل خود بخود نکل آئے گا نہ کوئی نظریاتی عصبیت باقی رہے گی اور نہ فکری تناؤ مختلف مکتبۂ خیال کے افراد ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ اور نقائص نکالتے ہیں۔ اختر صاحب کا خیال اس باب میں بھی بڑا واضح اور روشن ہے۔ چونکہ موصوف فن کو بحیثیت فن برتتے ہیں۔ اور یہی خاص رجحان فکر رکھتے ہیں۔ اسلئے انکے یہاں اس قسم کا کوئی فکری انتشار نہیں ہے۔ وہ ادب کا بڑا صحتمند تصور رکھتے ہیں۔ جس میں بیک وقت اخلاقیات مقصدیت اور جمالیات سب آجاتے ہیں ـــ "اگر آرٹ میں سماجی یا اخلاقی قدریں پیش کی جائیں تو پھر اس راہ میں تعصب کو ہرگز دخل دینے کی اجازت نہیں ملنی چاہئے

اخلاص تجربہ صداقت فن اور آزادئ فنکار یہ تینوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، آرٹ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ آرٹ ہو یعنی آرٹ کی بنیادی قدروں کو کامیابی کے ساتھ برتتے ہیں اسکا ثانوی مقصد اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" (قدر و نظر صـ ۳۱۲)

یہاں میں اسکی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اختر صاحب کے یہاں ان سب میں غالب عنصر کون سا ہے؟ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسان ہر چیز کو اپنے مخصوص نکتۂ نظر کی روشنی میں دیکھتا ہے اختر صاحب (بالطبع) جمال پسند ہیں۔ نہ صرف ان کے مزاج بلکہ انکی زندگی کے طور طریقہ میں بھی جمالیات کا خاصہ اثر ہے۔ یوں تو ماہرین نفسیات نے کئی جبلتوں کی اطلاع دی ہے لیکن ان میں جبلت جمال اور جبلت غذا اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ اول الذکر کی وسیع شکل جبلت جنسی ہے جس پر بقائے نسل کا انحصار ہے۔ موخر الذکر پر بقائے فرد کا۔ اہمیتیں دونوں کی ہیں۔ تقدم اور تاخر کا فیصلہ فنکار کی افتاد طبیع پر منحصر ہے۔ اختر صاحب ادب کی جمالیاتی قدروں کے قائل ہیں لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی تحریروں میں جمالیاتی تبلیغ ہوتی ہے۔ فن و شعر کیلئے جسقدر جمالیاتی عنصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اختر صاحب کے یہاں موجود ہیں۔ اگر کسی ادیب کے یہاں اس جمالیاتی احساس کا فقدان ہے۔ تو میرے نزدیک اس کا صالح فنی شعور مشتبہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صحیح فنی شعور اسیوقت ممکن ہے جب فن کار کے مزاج یا فطرت میں کم از کم بقدر ضرورت جمال پسندی موجود ہو کیونکہ جمال کا تعلق حسن سے ہے اور حسن کے بغیر شعور ادب کی تکمیل کا سوال ہی نہیں۔ ذوق جمال ہی وہ عنصر ہے جو فنکار کو حسن آفرینی کیطرف متوجہ کرتا ہے اس جبلت کا شعر و ادب سے براہ راست اور گہرا تعلق ہے۔ شاعر یا

(بقیہ ۴۱۷ پر)

ظفر اوگانوی

حسرتِ تعمیر پر ایک تنقیدی نظر

ایک معیاری ناول میں زندگی اپنی بوقلمونی اور نیرنگ سامانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ مشاہدے کی گہرائی حیات کے ان پہلوؤں کو منظر عام پر لے آتی ہے۔ جہاں عام نگاہ نہیں پہنچ پاتی۔ اور بے لوث جذبات کی گہرائیوں سے اجتماعیت کے نقوش ایک ایسی زندہ تصویر سامنے آتی ہے۔ جسکو حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یعنی ایک فنکار جب مشاہدۂ حیات اور جذبات کو ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ تو ناول کا ایک عظیم دائرہ بن جایا کرتا ہے۔ اردو کی پرانی داستانوں میں مشاہدۂ حیات کی کمی تھی۔ ان میں زندگی یا تو صرف خیر کا نام تھی۔ یا صرف شر۔ البتہ اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد کے یہاں لطافت جذبات اور کلاسن تقریباً نہیں تھی۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے پاس حقیقت پسندی کا احساس، مشاہدۂ حیات اور فلسفۂ حیات کا تصور بھی تھا مگر یہ دونوں بین الملی اجتماعیت کے نقوش واضح نہیں کر پائے۔ سرشار و شرر کے بعد ہادی حسن رسوا کی شخصیت اردو ناول نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ان کو ان کی ریاضی دانی "تحلیل و جذباتی عناصر" کی طرف رجوع ہونے نہیں دیتی۔ پھر یہ کہ رسوا "امراؤ جان ادا" میں ایک ناول نگار سے زیادہ تاریخ داں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اسی لئے وہ کبھی کبھی واقعات کی تحلیل نفسی سے شعوری یا لاشعوری طور پر گریز کر جاتے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود رچارڈسن کی طرح ہادی حسن رسوا بھی اردو ناول نگاری کے باضابطہ بانی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد اردو ناول نگاروں نے زندگی کی پہنائیوں کو محسوس کیا اور زندگی کے دوسرے ضروری پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ کھیتوں اور کھلیان میں سسکتا اور تڑپتا ہوا ہندوستان اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ملکی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام پریم چند کا آتا ہے۔ مگر پریم چند کے تجربے محدود تھے وہ ہندوستان کے اعلیٰ اور اوسط طبقے سے بالترتیب ایک حد تک بہت کم واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں تنقید حیات نامکمل ہے۔ پریم چند زندگی سے محبت اور مشاہدے کا تیقن ضرور رکھتے تھے۔ مگر ان کے جذبات میں ایسی گہرائی نہیں تھی جس سے انسانیت کا کوئی آفاقی تصور نمایاں ہو سکے۔ تاہم پریم چند جدید اردو ناول کے ایک اہم معمار یقینی تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے تقسیم ملک تک کے تقریباً دس سال اردو ناول کیلئے دور جمود و انحطاط میں پھر بھی کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد نے اردو کو بالترتیب "شکست" "ٹیڑھی لکیر" اور "گریز" تین ایسے ناول دئیے جن میں زندگی اپنی صحیح شکل و صورت میں نظر آتی ہے۔

ان ناولوں میں سب سے اہم اور بڑی بات یہی ہے۔ مگر آزادی کے بعد اور خاص کر ادھر پانچ سال کے اندر اردو میں کچھ نئے ناول اس طرح کے سامنے آئیں جن کے اندر موضوع کو آفاقیت حاصل ہے۔ اور جن میں مشاہدے کی گہرائی اور جذبات کی گہرائی سے انسانیت کے ازلی نقوش واضح ہوتے ہیں۔ ایسے ناولوں میں قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" اور عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

انھیں مؤخر الذکر ناولوں میں اختر اورینوی کے ناول "حسرت تعمیر" کو بھی ایک خاص حیثیت و اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے۔ جس میں فرد کی زندگی سے اجتماعیت کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار محبوب کا ذہن آج کی دنیا کا ذہن ہے۔ اس کی زندگی اور اس کا تصور انقلاب اس کی حیات آفریں جہد مسلسل اور بالآخر وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے۔ یہ سب کچھ فرد کی وہ آفاقی حیثیتیں ہیں جن سے اجتماعیت کا تصور بنتا ہے۔ یا جس سے جزو اور کل کے رشتے کی ابدیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی آفاقی حیثیت اور اسی کے نقطۂ نگاہ سے انسان کے تصورات اور اس کی طاقتوں کو جہاں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہیں ایک دوسری ابدی اور ازلی حقیقت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ احساس انسان کی بے پناہ طاقتوں کے ساتھ اس کی ازلی بے بضاعتی کا اظہار ہے۔ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر وہ مجبور محض بھی ہے۔ وہ مادی انقلاب لانے کی صلاحیتیں ضرور رکھتا ہے۔ مگر فطرت کے پاس انسان سے زیادہ بے انتہا زیادہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ انسان ہر ایک چیز پر قادر نہیں ہے۔ مگر فطرت اپنی تمام سچائیوں کے ساتھ عَلیٰ کُلِّ شَیءٍ قدیر ہے عجز و تضاد کا یہ کمال انسان اور فطرت کی طاقتوں کی حد بندی کرتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل پر اصرار کرتا ہے۔ مگر فطرت اپنی قدرت کی رعنائیوں کو اس وقت سمیٹ لیتی ہے۔ اور انسان کو اس دائرے سے باہر آنے نہیں دیتی۔

جو فطرت کی حدود کے اندر واقع ہوا ہے۔ عجز و کمال کا یہی آفاقی فلسفہ اختر اورینوی نے حسرت تعمیر کے اوراق میں پھیلایا ہے۔ د محبوب مرکزی کردار ایک غریب و ناتواں خاندان کا ایک عاجز و نادار لڑکا بڑا ہو کر جب مادیت کے سراب کی طرف لپکتا ہے اور محبوب نگر جیسے مستقر کا مالک و مختار بن جاتا ہے تو اسے فطرت پھر اسی نقطہ پر پیچھے ڈھکیل دیتی ہے۔ جہاں انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود فطرت نہیں بن سکتا ہو اور جہاں انسان صرف انسان رہا کرتا ہے۔ یعنی وہی محبوب بہت اونچے مینار سے نیچے گر گیا تھا۔ وہ ٹاٹا اور ڈالمیا بنتے بنتے چھوٹا ناگپور کے سنگلاخ کہستانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اب نہ محبوب نگر اس کا ٹھکانہ اکائیں اس کی تھیں۔۔

..... اور جب دولت کا یہ چشمۂ شیریں نہ رہا تو یاران میکدہ کی صحبتیں ختم ہو گئیں۔ اور انجام کار وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

اگر یہ صحیح ہے کہ ناول میں ازلی اور آفاقی حقیقتیں ہی پیش کی جانی چاہئیں۔ تو یہ اس سے زیادہ صحیح ہے کہ ان ازلی اور آفاقی حقیقتوں کو پیش کرنے میں فن کو بھی اہمیت دی جانی چاہئے۔ موضوع اور ہیئت دو وحدتیں ہیں اور جب یہ دونوں وحدتیں آپس میں جذب ہو جایا کرتی ہیں تو فن کا وجود ہو جایا کرتا ہے۔ اردو ناول میں فنی بالغ نظگی کا احساس ہادی حسن رسوا نے دلایا۔ رسوا کے پہلے بے جان قصوں اور طویل مکالموں کے بیچ سے کبھی کبھی ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، آزاد، خوجی اور شیخ علی وجودی جیسے جاندار کردار ضرور پیدا ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن امراؤ جان ادا اور ہوری کے کرداروں میں جو عظمت رسوا اور پریم چند نے پیدا کی۔ عظمت کا وہ تصور پہلے نہیں تھا۔ خاص طور سے تقسیم ملک کے بعد کے ناولوں میں "آگ کا دریا" کا مرکزی کردار گوتم جو ہزاروں سال کی ہندستانی تہذیب کا ایمائی ترجمان ہے۔ یا حسرت تعمیر کا مرکزی کردار محبوب جو سائنسی دور کے ذہن کی ایک علامت ہے۔ جس طرح آفاقیت کا احساس دلاتا ہے جس طرح کی ہمہ گیریت کی عکاسی ان کرداروں کے ذریعہ کی گئی ہے وہ کردار نگاری کے فن میں بہت اہم ہے۔ جہاں تک صرف حسرت تعمیر کا تعلق ہے یوں تو اس میں چھوٹے اور بڑے کئی کردار ہیں مگر جیتے اور جاندار کرداروں میں محبوب منظر اور خود مصنف کا کردار توجہ کا مستحق ہے بقیہ دوسرے کرداروں میں، مسرور، سلمیٰ سوگیتی اور سر محبوب، جمیل انور مولوی نجابت حسین، بینا نزہت، سر شمشیر، دیوان سنگھ، مسٹر پیار خاکساں وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت کا حامل ہیں۔ اس کے

ماسوا یہ سب کے سب ذیلی کردار اپنی اپنی انفرادیت سے قطع نظر اس لئے اور بھی زیادہ وقیع ہیں کہ ان کی موجودگی میں مرکزی کردار محبوب کے نقوش زیادہ صاف دکھائی پڑتے ہیں۔ بہرکیف ناول کا سب سے بڑا کردار محبوب کا ہے۔ اور ناول نگار نے اس کردار کو دلچسپ اور جاندار بنانے کیلئے اس کی ظاہری اور باطنی شخصیتوں پر تیز روشنی ڈالی ہے۔ اس کی ظاہری شخصیت کا تعارف مصنف نے ان الفاظ کے ذریعہ کرایا ہے۔ "سفید ہوئی مگر تیز عقابی آنکھیں، ابھری ہوئی بلند پیشانی، بیل دار گھونگھروں میں بکھرے گھونگریالے بال، بہت اونچی کھوتھنی نما ناک .... ہینٹ اور بانس شرٹ میں اس کی بوٹی بوٹی چمک رہی تھی۔ چست دبلا لاگ عضلات ایک برق تپاں دماغ کے نہایت ہی موزوں شریک کار معلوم ہوتے تھے۔" ظاہری خدوخال باطن کی غمازی کرتے ہیں۔ محبوب کا یہ ظاہر اس کی بے انتہا جدوجہد اس کی تندہی اور آہنی عزم کو بتایا ہے۔ موزوں شریک کار معلوم ہوتے تھے۔ اور اس کی بے پناہ تعمیری و انقلابی صلاحیتوں کا پتہ دیتا ہے۔ تعارف کیلئے جسمانی ساخت و اعضاء اور ان کی تفصیلات و جزئیات کا بیک وقت اس طور پر اظہار کہ پورا کردار اور اس کی مکمل شخصیت نظروں کے سامنے آجائے۔ یہ انداز تعارف بہت حد تک اختر اورینوی کا اپنا حصہ ہے۔ اسکا بیان کے بعد ناول نگار محبوب کے کردار کے مخصوص کیفیات کو منظر عام پر لے آتا ہے۔ دراصل محبوب ایک ایسی شخصیت ہے جو موجودہ دنیا کے کسی بھی ملک کے ذہن کا ترجمان ہے۔ آج جسطرح آدمی مادیت کا شکار ہو گیا ہے اور مادیت کی ترقی کے حصول میں جس طرح غریبوں پر ظلم و ستم روا رکھتا ہے صنعتی شہروں کو بسانے کیلئے جس طرح غریبوں کی بستیاں اجاڑ دی جاتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ اس طرح کے افراد کس طرح ہوسناکی کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ اور کس طرح وہ جرائم کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں چھوٹا ناگپور کے ایک کردار محبوب کے اندر مجتمع نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے کی اس خواہش کا اعادہ کرنا چاہتا ہے۔ جس کو ہزاروں سال پہلے فراعنہ مصر عملی جامہ پہنا چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عموماً کم سخن تھا۔ عام بیوپاریوں کی طرح وہ اکثر سنجیدگی کے عالم میں سوچتا ہی رہتا تھا۔ یہی بیوپار کے جوڑ توڑ، رہی اونچ نیچ، بھاؤ بھٹے، داؤ پیچ۔ محبوب کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اس لئے وہ یہ بھی کہتا ہے " اعلیٰ تعلیم محض عیاشی ہے۔ بی اے پاس لڑکوں کو پیسہ بنانا نہیں بنانا آتا ہے۔ شاعری اور فلسفہ سیکھنے سے کیا حاصل شیکسپیر اور ملٹن سے زیادہ ضروری چیز بازار کا بھاؤ ہے ......" تو اس کی ذہنی ساخت کا ایک قاری بہت آسانی کے ساتھ اندازہ لگا لیتا ہے۔ "ایک بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ لیکن بڑا تاجر اور بڑا ٹھیکیدار چھوٹے تاجروں اور چھوٹے ٹھیکیداروں کو ہضم کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" محبوب بھی اسی بیمار ذہنیت کا شکار ہے۔ "سکھو صاحب! اجرت دوگنی کر دیجئے تگنی کر دیجئے، بڑھاتے جائیے۔ یہاں تک کہ دوسرے ٹھیکیدار کام چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ پھر سارے ٹھیکے اپنے اور اسی وقت جتنی کم مزدوری چاہئے دیجئے" اور آدمی کہاں تک پہونچ جاتا ہے۔ اس کا اندازہ محبوب کے ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ "کاش! کوئی ایسی کل نکلتی جس سے چاندنی کا یہ ذخیرہ بھی استعمال کیا جاتا۔ دھوپ سے تو ریڈیو والٹ وغیرہ بناتے ہیں۔ دواؤں کے اندر وٹامن کے اجزا پیدا کرتے ہیں۔ کیا چاندنی سے کوئی فائدہ یا پاؤڈر تیار نہیں کیا جا سکتا۔" ایک دوسری جگہ محبوب انہیں خیالات کا اعادہ کرتا ہے۔ "کاش! میں چھوٹا ناگپور کی ہواؤں اور چاندنیوں کو بھی ٹین کے ڈبوں میں بند کر کے دساور کو بھیج سکتا۔" محبوب کی شخصیت کا دوسرا پہلو جنسی اور نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اس کے نزدیک عورت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس سے جنسی پیاس بجھائی جائے۔ "میں کہتا ہوں رومانیت تو دراصل ایک عورت میں ہوتی ہے۔ اس کے سوا سب فضول ہے۔ ندی الھڑاتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ الھڑاتی ہوئی عورت نہ ملے تو پھر ندی کو ہی الھڑاتی ہوئی سمجھ کر خود فریبی کے ذریعہ غم غلط کرتے ہیں۔ یہی ہے جبلی رومانی شاعری......

.... کامل لطف وانبساط اور رومان کیلئے صرف عورت ہے" — محبوب کا کردار ذہنی پیچیدگیوں سے مملو ہے۔ اس کی پیچیدگیاں دفعتہ سامنے نہیں آتی ہیں۔ بلکہ تدریجاً جس طرح واقعات آگے کی طرف بڑھتے ہیں چلے جاتے ہیں اسی طرح محبوب کے کردار کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملتی جاتی ہے۔ قصے کی ابتدا میں وہ بہت زیادہ باتونی اور اپنے عزائم کا دوسروں پر دھونس جمانے کی حد تک مظاہرہ کرتا ہے۔ ناول کے ارتقائی منازل میں وہ جنسی شہوانیت کا شکار نظر آتا ہے۔ اور اپنے عزائم کو مکمل کرنے میں منہمک نظر

آتا ہے۔ غصے کی انتہا کے قریب اس کے عزائم اور حوصلے اس کا درد اندیشی
اور اس کے اعمال کی بجنگی کے باوجود محبوب نظر سے اس کے اقتدار کے خاتمے
کی کہانی پڑھنے والے کے سامنے سے گزرتی ہے۔ محبوب کا کردار اپنی اپنی
پیچیدگیوں اور ندرتِ اوصاف کی وجہ سے قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا
ہے۔ اور اسی وجہ سے ناول کے اختتام پر مجموعی حیثیت سے وہ قاری کی
ہمدردی سے محروم بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے ظالمانہ رویہ سے اور شہوانیت
کے باوجود قاری کی اس کے نجی حالات کی وجہ سے اس کے ساتھ ایک حد تک
ہمدردی پیدا ہوئے بغیر بھی نہیں رہتی۔ خاص طور سے محبوب جب اپنی بیگم
کی سرد مہری سے عاجز آجاتا ہے۔ اور بیوی کی تلخ کلامی میں بجھے ہوئے تیر
کھاتا ہے۔ تو وہ تلملا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ سوچتا ہے کہ اس کی بیوی بھی
ایک ایسی بیوی ہوتی جو اس کے اقتدار کو بالکل اسی طرح تسلیم کر لیتی جس طرح
اس کا عملہ اس کی تعمیل ارشاد کیلئے منتظر رہتا ہے۔ وہ دن بھر کی محنت
کے بعد گھر میں آکر سکون تلاش کرتا ہے۔ اپنے کارناموں کی تعریف اپنی بیوی کی
زبانی سننا چاہتا ہے۔ مگر بیوی کی زبان سے تحسین کا ایک کلمہ بھی جب
اس کیلئے نہیں نکلتا تو وہ مایوسی سے بیکار ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت
اپنے جذبات کا جب اظہار کرتا ہے تو اس کے اندر چھپے ہوئے زخم کے
درد کا احساس ہوتا ہے۔ "کڑی محنت کے بعد آخر دو گھڑی کیلئے تو انسان
کسی طرح دل بہلائے۔ .... نہ ہمدردی نہ قدر، نہ تعریف، ....
.... بس سو طرح کی نکتہ چینیاں۔ جل مر کر گھر واپس آئے تو اوپر سے
بیوی کی لتاڑ۔ نہ مسکراہٹیں، نہ دلربائیاں، نہ ہمدردیاں، کھانے تک کو
تو نہیں پوچھتی۔ .... بغیر تعریف و توصیف کے حصول کامیابی
محال ہے۔ میں نے اس محال کو بھی کر دیا ہے۔ لیکن میری شریک زندگی نے
میرے کاموں میں ہمیشہ کیڑے ہی ڈالے۔ سو عیب نکالے۔ کبھی بھول کے
بھی میری قدر نہیں کی گئی۔ بھائی جان اگر میرے تھکے ہوئے جسم و دماغ میں
کوئی ہمدردی و شیریں کلامی سے حیات تازہ ڈال دے تو پھر آپ دیکھئے کہ
معجزے پر معجزے دکھاؤں"۔ محبوب کا یہ اندرونی کرب قاری کی ہمدردی
کو اپنی طرف کر لیتا ہے۔ اور وہ جب اس کرب کو ختم کرنے کیلئے ایک دوسری
شادی رچا لیتا ہے تو پھر محبوب کا اصلی روپ اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ
قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ انہیں حالات میں حسرت تعمیری کا یہ مرکزی
کردار اپنی نفسیاتی اور عملی پیچیدگیوں کی وجہ سے ایک خاص ذہنیت کا
ترجمان بن گیا ہے۔ ایک کردار کو زندہ رکھنے کیلئے جن خصوصیات کی ضرورت
ہوا کرتی ہے۔ وہ سب محبوب کے کردار میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اس ناول کے بقیہ کرداروں میں منظر کی معصومیت اور ملکی سیاست میں
اس کی عملی سرگرمیاں، فسادات سے پیدا شدہ حالات میں قوم کی خدمت کا
جذبہ اور سلمیٰ سوگیتی سے اس کی معصوم اور پاک محبت، یہ سب چیزیں اختر
اور مینوی نے منظر کے اندر کچھ اس طرح سمو کر رکھ دی ہیں کہ اس کی شخصیت
ناول کے مرکزی کردار کے مقابلے میں خیر کا نمائندہ بن گئی ہے۔ محبوب
تخریب کے ذریعہ تعمیر کا قائل ہے۔ لیکن منظر اپنے ذہن میں تخریب کا کوئی بھی
تصور لائے بغیر تعمیر کا صرف قائل ہی نہیں ہے بلکہ اس کیلئے اس نے جان
کی بازی بھی لگا دی۔ منظر کے ساتھ ساتھ سلمیٰ سوگیتی کا کردار بھی بہت
جاذب نظر ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اور اس کو بھی منظر سے والہانہ
محبت ہے۔ منظر کے ساتھ سیاست میں خود بھی شریک ہوتی ہے۔ چونکہ وہ
کافی ذہین ہے۔ اور روایت کی اہمیت کو محسوس کرتی ہے۔ اس لئے وہ منظر کو
محبت کے باوجود اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کر لینے کا مشورہ دیتی ہے اور
اس طرح وہ اپنی محبت خود ہی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ تیسرا اہم کردار
خود مصنف کا ہے۔ ناول نگار پورے ناول میں ہر جگہ موجود ہے۔ وہ محبوب
سے منظر کے ذریعہ متعارف ہوتا ہے۔ اور محبوب کے تمام پروگراموں کو بہت ہی
سنجیدگی کے ساتھ سنتا جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنی ذہانت طبع کے جوہر
دکھانے سے باز نہیں آتا۔ بات بات میں وہ محبوب کے ساتھ مذاق اور اس کی
شخصیت پر اس طرح کا طنز کر جاتا ہے جس سے محبوب تلملا جاتا ہے۔ اس طرح
مصنف کی موجودگی سے دوسرا اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ واقعات کی تحلیل نفسی
کرداروں کی گفتگو میں جذباتیت اور عمل میں بے ساختگی خود بخود پیدا ہوتی
چلی جاتی ہے۔ بقیہ دوسرے کردار بھی توجہ کے مستحق ہیں۔ مگر ان سے
قاری ذہنی طور پر وابستہ نہیں ہوتا۔

لیکن ناول کے فن میں کردار نگاری ایک لازمی عنصر یقینی ہے۔ اور اس کو اولیت بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ کردار نگاری کے علاوہ ناول کا فن ایک خوب صورت، مضبوط اور مرتب پلاٹ، منظر نگاری و جزئیات نگاری اور وحدت اثر کو بھی ہوتا ہے۔ اختر اورینوی نے تقسیم ملک کے بعد بڑے ناول نگاروں کی طرح آفاقی موضوع کیلئے اپنے ناول کے اندر کسی فن کے دامن کو نہیں چھوڑا ہے۔ جہاں تک حسرت تعمیر کے پلاٹ کا تعلق ہے وہ بہت حد تک فنی ہے۔ ناول نگار نے اپنے پلاٹ کو فنی حیثیت دینے کیلئے تناسب کا خیال رکھا ہے۔ وہ اس طور پر کہ ناول کے پہلے باب کے ابتدائی سطروں میں محبوب کا حسن انداز سے تعارف کرایا گیا ہے۔ اس سے اس کی امارت اس کی نخوت اس کے آہنی ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ناول کے آخری باب میں مرکزی واقعے کے اختتام پر وہی محبوب اس طور پر سامنے لایا گیا ہے جس سے اس کی لاچارگی اور اس کی بے بسی کا نقطہ عروج بھی قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ محبوب اس مکمل شخصیت کو ابھارنے میں منظر اور مسلمی سوگیتی کے دو اہم کردار کام میں لائے گئے ہیں۔ محبوب اپنے مرکز صنعتی شہر محبوب نگر کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اور منظر و مسلمی سیاسی تحریکات سے وابستہ رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ منظر ناول کے خاتمے پر خواں بھی ہو جاتا ہے۔ اور محبوب بے یار و مددگار پاگل کی زندگی گزارتا ہے۔ بہر حال خیر و شر دونوں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ واقعات و کردار کا یہ تناسب ناول نگار کی حسن کارانہ اور فن کارانہ صلاحیتوں کا پتہ دیتا ہے۔ پلاٹ کو مستحکم بنانے کیلئے، واقعات کو مناسب اور اجزا کو ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ ناول نگار کو اس ہم اہم آہنگی کیلئے آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اختر اورینوی نے مختلف واقعات کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ ایک پڑھنے والا ناول ختم کر جاتا ہے۔ اور اسے یہ محسوس نہیں ہو پاتا کہ کوئی واقعہ کسی خاص مقصد کیلئے لایا گیا ہے۔ اور کوئی کردار بالقصد کسی واقعہ سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کی ہم آہنگی اردو میں امراؤ جان ادا میں نظر آتی ہے۔ بعد کے ناولوں میں اسی طرح کی دقیق ہم آہنگی حسرت تعمیر کے علاوہ کم نظر آتی ہے۔ پلاٹ کو دلکش بنانے کیلئے جہاں واقعات و کردار میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ وہیں ایک ناول نگار کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ

واقعات میں یکسانیت پیدا نہ ہونے دے۔ یکسانیت و یک رنگی سے قاری کا ذہن بوجھل ہو جاتا ہے۔ اور سنجیدگی کی گرانباری اسے ناول کا اختتام تک جانے سے روک دیتا ہے۔ اسلئے پلاٹ کو خوشگوار بنانے کیلئے رنگا رنگی پیدا کی جاتی ہے۔ اور تنوع کے جال میں طنز و مزاح اور غیر سنجیدگی کا چارہ بکھیر جاتا ہے۔ تاکہ قاری آسانی کے ساتھ ناول کے اختتام تک پہونچ جائے حسرت تعمیر کی مرکزی کردار بذات خود بہت پہلو ہے۔ اس کی حرکتیں، اس کا انداز گفتگو، اور تخاطب یہ سب کچھ خود ہی متنوع ہیں۔ اس کا بیوی سے جھگڑا کرنا، بیوی کی صلواتیں سننا، خودکشی کا سوانگ رچانا یہ سب باتیں ایک طرف محبوب کی کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اور دوسری طرف ان سے واقعات کی یکسانیت میں قدرے کمی ہوتی ہے۔ قاری کے ذہن پر سنجیدگی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ کسی بھی ناول کے پلاٹ کی تکمیل میں تناسب ہم آہنگی اور تنوع کے علاوہ ایک اور اہم جزو وحدت اثر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ واقعات میں تناسب اور ہم آہنگی اتحاد اثر کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ واقعات کے تنوع سے عموماً اتحاد اثر مجروح ہو جاتا ہے۔ خاص کر جہاں کہیں مزاح کے عنصر کو اہمیت دیدی جاتی ہے تو وہاں کا ذہنی مرکزی تاثر سے بھٹک جاتا ہے۔ مگر کامیاب ناول نگار قاری کے ذہن کو دیر تک اس کیفیت میں نہیں چھوڑتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی چابکدستی سے آہستہ آہستہ قاری کو پھر اسی مرکزی تاثر سے منسلک کر دیتا ہے۔ حسرت تعمیر میں بھی ناول کی ابتدا سے انتہا تک پڑھنے والے کا ذہن ایک ہی محور پر چکر لگاتا رہتا ہے۔ وقتی طور پر حسرت تعمیر کا قاری مولوی نجابت حسین کی حوص ہوس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مگر پھر وہ لوٹ کر محبوب کے ہائی جان کی طرف چلا آتا ہے۔ اور وہاں سے محبوب نگر کے کارخانوں میں الجھ جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اس پر دلالت کرتا ہے۔ کہ اختر اورینوی نے حسرت تعمیر کے پلاٹ کی تعمیر میں بے انتہا کاوش کی ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے اس طرح کا منظم و مربوط پلاٹ اردو کے ناولوں میں پایا جاتا ہے۔

حسرت تعمیر میں منظر نگاری و پس منظر نگاری کو بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مصنف نے منظر نگاری پر بے انتہا کاوش کی ہے۔ خاموشی د

ساکت مناظر متحرک و متشکل نظر آتے ہیں۔ چونکہ ناول بہار کے چھوٹا ناگپور
کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں پہونچ کر واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ
بہار کا یہ خطہ جنت نشان ہے۔ لیکن اس کی سرسبز پہاڑیاں، آدیباسی قبیلے،
ان کے ساتھ ٹھیکے داروں کا ظالمانہ سلوک پڑھنے والے کو دنیا کے کسی بھی خطے
میں لے جا سکتا ہے۔ فطرت کے حسین مناظر فطرت کی یہ ازلی رکھوالے دنیا
میں آج بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ ان پر آج بھی ظلم و ستم ہو رہے ہیں۔ اور پھر
کی جنگی ہولناکیاں مستقبل میں کسی بھی جنگی تخریب کا تصور پیش کرتی ہیں۔ ناول
کی یہ خصوصیت کہ وہ مقامی ماحول کا عکاس ہوتے ہوئے بھی آفاقیت کو محیط
ہے۔ حسرت تعمیر ایک عظیم ناول سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ بہرکیف جیسا کہ کہا گیا ہو
کہ اس ناول میں منظر نگاری کی کافی اچھی اور اعلیٰ مثال قائم کی گئی ہے
چھوٹا ناگپور کی پہاڑیاں، ان پہاڑیوں میں بسنے والے آدیباسی قبائلیوں کا
بیان اتنا متحرک ہے کہ جب بھی بیٹھ کر اس کو پڑھا جائے آنکھوں کے سامنے
سے وہ مناظر اور ادیباسی قبیلے کے افراد کی منظر نگاری فلمی ریلوں کی طرح
گذرتی چلی جائیں گی۔

منظر نگاری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

برسات تو اس علاقے میں جادو کی بانسری بجاتی ہوئی آتی ہے۔
ڈھلوانوں اور ٹیلوں کے کوروں پر سبزۂ خوابیدہ جاگ اٹھتا ہے جنگلی
رتنے سحر انگیز طور پر جاندار ہو جاتے ہیں کہ ان کی روحانیت پر ایمان لانا
پڑتا ہے۔ نشیبی میدانوں میں دھان کے کھیتوں کے اندر سفید بیل مشک
رنگ مرد اور عورتیں یہ سب مل کر مٹی کو سونا بنانے کے حقیقی کیمیا
کو عملی شکل دینے میں مشغول نظر آتے ہیں...... سیکھ دیوتا سب کے
دامن موتیوں سے بھر دیتا ہے۔ بوں کی دیوی چھاگل پہن کر ہر سو ناچتی
تھرکتی اور سسکتی پھرتی ہے۔ بیر بہوٹی اور نرالے نرالے کیڑے پیڑوں کے سایہ
میں اپنی سبھا سجاتے ہیں۔ اور شہد کی مکھیاں، تواره، بالکس، بیل اور چمپا
کے جنگلی پھولوں سے سرگوشیاں کرتی اور ان کے منہ چومتی اور رس چوستی
رہتی ہیں۔ برسات کی راتیں خوابناک ہوتی ہیں۔ مگر چھوٹا ناگپور کی شب
برشکال اور وہ بھی جب چاند کے رخ تاباں سے ابر کا پردہ ہوا سے ہٹا ہوا ہو

نیند اچاٹ کرنے والی ہوتی ہے۔

منظر نگاری میں جزئیات کا کمال زبان کی چاشنی میں بھی ذیل کے
اقتباس میں دیکھئے۔

"بہت احتیاط سے موٹر چلانی پڑتی تھی۔ پہاڑی سڑک ڈھلوان
سے نیچے اتر رہی تھی۔ عمیق کھڈوں سے لرزتی کتراتی بہ ہیبت چٹانوں سے
سہمتی دامن بچاتی۔ جھاڑیوں اور درختوں سے الجھتی۔ بل پر بل کھاتی۔
رام نگر کی طرف جا رہی تھی۔ کاتک کا خوشگوار مہینہ تھا۔ وادی و کہسار پر
ہلکی سی شبنمی دھند کی چادر تنی ہوئی تھی۔ دور کی پہاڑیاں نیلگوں دھبوں
کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ نزدیک کی چوٹیاں ٹیالے سبز رنگ کی نظر آ رہی
تھیں۔ اور کھنڈر ایک رتھاہ کا ہی دھندلکا دکھائی دے رہا تھا۔ دو طرفہ
گھنے جنگل کے درخت شبنمی غسل سے شاداب ہو کر اپنی گرم گستر شاخوں اور
کشادہ دست پتوں کے ذریعہ فرح بارشی ددر خنکی کی نکہتیں بانٹ رہے تھے"

چونکہ اختر صاحب نے چھوٹا ناگپور کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔
وہاں کے آدیباسی قبیلوں کے ساتھ گھل مل کر رہے ہیں۔ ان کی تہذیب اور رہن
سہن کے انداز انھوں نے سنکر نہیں قلمبند کئے ہیں۔ بلکہ ان میں حقیقت ہی
حقیقت ہے۔ اراؤں اور منڈا قبیلے کی تصویر کشی اور اس کی جذبات میں
کتنی زیادہ حقیقت سموئی ہوتی ہے۔ اراؤں اور منڈا مرد صرف ایک لنگوٹی
پہن کر زندگی کے دن کھپا دیتے ہیں۔ جوانی میں ان کے سڈول سیاہ جسم اور
سنورے ہوئے لانبے بال چمکتے رہتے ہیں۔ عورتیں ایک تنگی سی موٹیا کی ساری
پہن کر گذار دیتی ہیں۔ اس کے سینے اور شانے کھلی ہوا میں سانس لیتے رہتے
ہیں۔ لانبے سیاہ بال بیچ سنورے ہوئے رانوں میں کانسے کے موٹے موٹے
چھلے اور کانوں کی لووں میں سرخ رنگین بانس یا سرکنڈے کی ڈھائی انچ
کی نلکی گھسی ہوئی۔ یہی ان کا سامان آرائش و تجمل ہوتا ہے۔ ان قوموں کی
جوانی کا کس بل دیدنی ہوتا ہے۔ اشعار کی سی بندش، لوچ، تراش، اٹھان
اور ابھار ایسے دیدہ زیب ہوتے ہیں جیسے کسی بے مثل سنگ تراش نے سنگ موسیٰ سے
نادر مجسمے تراش تراش کر رکھ دیئے ہوں۔ ان کے گٹھیلے بدن کی استواری
کسیلے پن، سختی اور توانائی دیکھنے والوں میں یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ وہ

ماؤں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے جنوبی سنگستانوں کے بطن سے معجزانہ رنگ میں جنم لیا ہے۔ ان کے جھرنوں کی لچک، ابھرتی، حرکت و خرام و خرام تناؤ اور سہرے زندگی، آبشار کی طرح بھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور ہمیں یہ احساس پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ فطرت کی تخلیق و تعبیر جدید فن کار کا فریضہ ہے۔ اس میں اختر صاحب بڑی طرح کامیاب ہیں۔ چھوٹا ناگپور کی پہاڑیاں صرف خوبصورت و دلکش ہی نہیں رہتی بلکہ ان سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی سوکھی چٹانوں میں دھڑکتا ہوا دل محسوس ہوتا ہے۔ اس جنگل کی سرسبز شادات ٹہنیاں نازنین کی لچکتی ہوئی دکھائی پڑتی ہیں۔ اختر صاحب کی یہ منظری تفصیل شرر کی منظر نگاری سے بہت حد تک مختلف ہے۔ شرر کی منظر نگاری واقعات و کردار سے میل نہیں کھاتی۔ منظر نگاری کرداروں کی نفسیات کو

لیکن شرر کی غیر مانوس و غیر فطری منظر نگاری مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے شرر کے ناول پڑھتے وقت قاری منظر نگاری کے صفحات کو یک سر چھوڑ کے واقعات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ شرر کے ساتھ دوسرا حادثہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی منظر نگاری بہت ہی مختلف طور کی حامل ہوتی ہے۔ ایک تو بیجا طوالت دوسرے خشک اسلوب یہ خامیاں ہیں جن کی وجہ سے شرر کی منظر نگاری بہت ناکام رہی ہے۔ مگر اختر صاحب کی منظر نگاری نہ تو خشک ہوتی ہے اور نہ کرداروں سے غیر متعلق اور غیر مانوس۔ اختر صاحب نے حسرت تعمیر میں جہاں کہیں بھی چھوٹا ناگپور اس کی پہاڑیاں، دریا، گاؤں اور بستیوں کی تصویر کشی ہے۔ وہ لایعنی نہیں ہے بلکہ وہ مناظر نہایت اہم ہیں اس لئے کہ انہیں مناظر میں حسرت تعمیر کے کردار آگے بڑھتے ہیں۔ ان مناظر کو ناول سے اگر نکال دیا جائے تو حسرت تعمیر کے کرداروں پر اثر پڑے گا۔ اور اس کی وجہ سے ناول کا پلاٹ بھی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ اور پھر منظر نگاری کیلئے اختر صاحب کی فطری زبان فطرت کی تصویر کشی کو اور نمایاں کرتی ہے۔ قاری بہت دلچسپی سے پہاڑوں اور پگڈنڈیوں میں گنگناتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

بقیہ:- اختر اورینوی کی تحقیقی کاوشیں

اختر اورینوی نے اس گراں قدر تصنیف میں جن شاعروں، نثر نگاروں اور تذکرہ نویسوں کا ذکر کیا ہے، ان کا ذکر اگرچہ ان سے پہلے بھی کیا جاتا رہا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ ان کی مجموعی خدمات پر اتنا سیر حاصل تبصرہ کسی نے نہیں کیا۔ انہوں نے مرزا عبدالقادر بیدل سے لے کر مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق تک اور حضرت عماد الدین قلندر پھلواروی سے لے کر مولانا فیاض علی تک کی شعری اور نثری فتوحات کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ ایک طرف ان شاعروں اور نثر نگاروں کی علیحدہ علیحدہ خدمات کا علم ہو جاتا ہے اور دوسری طرف بہار نے مجموعی طور پر اردو شعر و ادب کی جو خدمت کی ہے، اس کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

اختر اورینوی ثانوی ذرائع پر اعتماد نہیں کرتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اصل مآخذ تک پہنچ جائیں اور ان کی بنیاد پر کوئی نتیجہ نکالیں۔ اصل مآخذ تک پہنچنے میں انہیں جن منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا، اس کا احساس صرف ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو تحقیق کی منزل کے راہی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کے اوراق پارینہ کو فراہم کیا اور انہیں اس طرح مرتب کیا کہ آج وہ ایک زندہ حقیقت کے روپ میں ہمارے سامنے ہیں!

علی حیدر ملک

اختر اورینوی اور "شہنشاہ حبش"

بعض شخصیتیں بڑی سیمابی، متحرک اور Dynamic ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیتیں صرف چند کلیوں پر قناعت نہیں کرتی ہیں بلکہ ہمیشہ علاجِ تنگیِ داماں میں مصروف رہتی ہیں۔ یہ زندگی کے مختلف شعبوں اور حیات کے متعدد پہلوؤں پر بیک وقت حاوی ہو جاتی ہیں۔ اگر تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ایسی بہت ساری شخصیتیں مل جائیں گی۔ ان شخصیتوں میں علاوہ دیگر خصوصیات کے ایک قدر مشترک کا ہونا ضروری ہے اور یہ قدر مشترک ہے ذہانت، ایسی تمام شخصیتیں بنیادی طور پر حد درجہ ذہین ہوتی ہیں۔ ان کی ذہانت انھیں کبھی نچلا یا چین سے بیٹھنے نہیں دیتی بلکہ ہمیشہ مختلف سمتوں میں سیر و سیاحت کی دعوت دیتی رہتی اور مختلف شعبہ ہائے حیات پر حاوی ہو جانے پر اکساتی رہتی ہے۔ اقبال نے ایسے ہی لوگوں کو جو جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی کے اصول پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ "مردِ مومن" کے نام سے یاد کیا ہے[1]

اس لحاظ سے اختر اورینوی بھی ایک مردِ مومن ہیں۔ ان کا شمار بھی ایسے ہی مشاہیر میں ہے جو کسی ایک محدود دائرے میں اپنی جولانیاں نہیں دکھاتے بلکہ اپنے لئے ایک وسیع افق کی جستجو کرتے اور مختلف سمتوں میں اپنی شخصیت کے جلوے بکھیرتے رہتے ہیں ——— خوب سے خوب تر کی تلاش ان کی زندگی کا بنیادی مقصد اور ایمان ہوتا ہے

اختر اورینوی کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ وہ ایک کامیاب اور عظیم ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم سے مختلف اصنافِ ادب کو سیراب کیا ہے۔ جن میں تنقید، تحقیق، شاعری، افسانہ، ناول اور ڈرامہ سبھی شامل ہیں۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع ہے خصوصاً ادبیات، تاریخ، مذہبیات، الٰہیات، سیاسیات اور سائنس کا۔ انھیں پینٹنگز کا شوق ہے۔ اور وہ ایک اچھے آرٹ پینٹر ہیں۔ مصور کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ چند بڑے اور جادو نگار مصوروں میں لیا جاتا ہے۔ اسٹیج پر وہ اتنی روانی، بیباکی، خوش سلیقگی اور اعتماد کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں کہ بعض اوقات ان پر بہ دیرینہ شاہدی کے "جری مصور" کا دھوکا ہونے لگتا ہے نیز یہ سچ ہے کہ وہ ایک ہمدرد، غمگسار اور شفیق استاد ہیں۔ اور ان کی محبت و شفقت اکثر انھیں استاد کے درجے سے ہٹا کر باپ کے درجے پر لے آتی ہے۔

اختر اورینوی ڈرامہ نگار بھی ہیں ——— ڈرامہ نگاری دراصل خلاقی کا دوسرا نام ہے۔ خلاقی یوں تو تمام فنون میں پائی جاتی ہے۔ لیکن ڈرامہ بلا واسطہ، ٹھوس اور مکمل خلاقی کا نمونہ ہوتا ہے۔ ہر فن کی طرح اس میں بھی ہوتا وہی ہے جو فنکار یا خالق چاہتا ہے۔ لیکن خالق کہیں ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ رہتا ہے۔ ڈرامہ نگار صرف ایک "کن" سے ڈرامے کی دنیا کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے اسے ذرہ ذرہ اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اور مسلسل و مستقل کد و کاوش اور محنت کرنی ہوتی ہے ——— یہ اس کا شعوری عمل ہوتا ہے۔

اختر اورینوی نے صرف ایک ڈرامہ لکھا ہے۔ "شہنشاہ حبش"[2] جو پانچ

نوٹ: [1] مردِ مومن بننے کیلئے اقبال کے نزدیک کچھ اور صفات بھی درکار ہیں۔ ادارہ [2] اختر اورینوی نے ایک ڈرامہ اور بھی لکھا ہے جس کا نام ہے "زوالِ کیلاش" ادارہ

ایکٹ پر مشتمل ایک تاریخی المیہ ہے۔ اس کے متعلق مکتبۂ اردو لاہور کے
منیجر "سخنہائے گفتنی" میں لکھتے ہیں۔

"یہ ڈرامہ ملک کے مایہ ناز ادیب جناب اختر اورینوی کے قلم سے
ہے۔ اختر صاحب ایک کامیاب افسانہ نگار، ایک خوش بیان شاعر اور
ایک صاحبِ فن ڈرامانویس ہیں۔ اس ڈرامے میں وہ "تمثیلی خصوصیات"
ہیں جن سے ہمارے ڈرامے قریباً قریباً محروم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔
تاریخی ڈرامہ لکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس امر کے لئے ڈرامہ نویس کو
ڈرامہ نویسی کے علاوہ تاریخ دانی کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔"

"شہنشاہ حبشہ" حبشی اور اطالیہ کی جنگ پر مبنی ہے جس میں
مجلس اقوام (League of Nations)
کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

یو۔ این۔ او (U.N.O.) کے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

اے یو این او تجھے قاتل کہنا
سخت نادانی و کم عقلی ہے
تیرے ہاتھوں میں ڈرانے کیلئے
ہے تو پستول مگر خالی ہے

آج سے کچھ سال قبل مجلس اقوام کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔
اختر اورینوی نے پیغمبرانہ شان سے اس مجلس کے ختم ہونے سے قبل
ہی اس کے جنازے پر فاتحہ پڑھ دیا تھا ۵

ڈرامہ کے عناصرِ ترکیبی میں سب سے زیادہ اہم اس کی کشمکش
ہے۔ دراصل یہ کشمکش ہی ڈرامے کو دوسری اصنافِ ادب سے
ممتاز کرتی ہے۔ یہ کشمکش اور Tension "شہنشاہ
حبشہ" میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جس کا احساس شدت کے ساتھ ہر منظر
میں ہوتا ہے۔ Thrill اور Tension کے بعد کردار
اور مکالمے کی اہمیت ڈرامے میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں تک
کرداروں کا تعلق ہے "شہنشاہ حبشہ" میں بہت سے کردار
ہیں۔ مختلف طبقوں اور شعبوں کے لوگ بیک وقت اس میں پیش کئے
گئے ہیں۔ اہم کرداروں میں شہنشاہ حبشہ، مسولینی، شہزادی
فلوریا اور ڈیڈشاہ سماج محمد منیر وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے
کرداروں کی جھلک ڈرامے کے اسٹیج پر بہت ہی مختصر اور قلیل عرصے کے
لئے نظر آتی ہے۔ ڈرامے میں دوسری افسانوی اصناف کی طرح صرف
ایک ہیرو ہوتا ہے لیکن شیکسپیئر کے "جولیس سیزر" اور امتیاز علی
تاج کے "انارکلی" کا ہیرو کون ہے۔ اس کے متعلق دو رائیں ہیں۔ یہی
حال شہنشاہ حبشہ کا بھی ہے۔ اس کے متعلق بھی عام طور پر یہ کہا جاتا
ہے کہ اس میں دو کردار یکساں اہمیت حاصل کر لیتے اور ہیرو کی حیثیت
اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دو کردار شہنشاہ حبشہ اور مسولینی کے ہیں۔
بادی النظر میں یہ دونوں کردار تقریباً یکساں اہمیت حاصل کرتے ہوئے
نظر تو ضرور آتے ہیں لیکن یکساں اہمیت حاصل کر نہیں لیتے۔

شیکسپیئر کے "جولیس سیزر" کا ہیرو دراصل سیزر ہی ہے
یہ بات پورے ڈرامے کو ذہن میں رکھ کر اور اس کے مختلف کرداروں
کا تفصیلی و تقابلی جائزہ لے کر بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے۔ امتیاز
علی تاج کے "انارکلی" کا المیہ اکبر کا المیہ بنتے بنتے سلیم کا المیہ بن جاتا
ہے۔ اس طرح سلیم ہیرو کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ شہنشاہ حبشہ
کا ہیرو بھی خود شہنشاہ حبشہ ہی ہے۔ مقابل میں مسولینی کا کردار
ویلن کے طور پر شہنشاہ کے کردار کو زیادہ واضح اور نمایاں کرنے اور
مرکزی خیال یا موضوع کو زیادہ اجاگر کرنے کیلئے پیش کیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ ڈرامے کا عنوان "شہنشاہ حبشہ" اس بات کی طرف
اشارہ کرتا ہے کہ ڈرامہ نگار شہنشاہ حبشہ کو ہی سب سے زیادہ اہم
کردار سمجھتا ہے۔ سیزر کو "جولیس سیزر" کا ہیرو قرار دینے کے سلسلے میں
بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ مسولینی کے کردار سے ہمیں کوئی ہمدردی
نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف شہنشاہ حبشہ کیلئے قاری یا سامع کے دل
میں ایک نرم گوشہ موجود ہوتا ہے۔ ہیرو کے کردار کیلئے یہ ضروری ہے
کہ اس کی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود قارئین یا سامعین اس
کے لئے اپنے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمدردی کا جذبہ محسوس کریں

۵ اس پیشگوئی کے پیچھے بھی علامہ اقبال تھے۔ ملاحظہ ہو ان کی نظم "مجلس اقوام"۔ ادارہ

اس سے بھی یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ شہنشاہ ہی اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے ۔ مرکزی کردار کے علاوہ دوسرے کبھی کردار بھی حد درجہ متحرک اور عملی انسان ہیں ۔ یہاں کوئی بھی مجہول کردار نہیں ہے حتیٰ کہ ڈیڈشاہ سماج محمد اور شہزادی للو رانی بھی نہیں جو ایک دوسرے سے سچی اور بے لوث محبت کرتے ہیں ۔ یہ دونوں کردار بھی "کام کے آدمی" ہیں ـــــ یہ عشق کے ہاتھوں نکمے نہیں ہو جاتے ـــــ کوئی دو معمولی سے معمولی کردار بھی ایک دوسرے سے گڈمڈ نہیں ہوتے ۔ ہر کردار کی انفرادیت ہمیشہ نمایاں رہتی ہے ۔ اور اسے اس کی انفرادی خصوصیات کی وجہ سے ہر جگہ بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے ۔ مکالمے صاف ، پہنچتے ہوئے اور زیادہ تر مختصر ہیں ۔ یہ مکالمے نہ صرف یہ کہ مکالمے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں بلکہ یہ کرداروں کی ذہنیت ، ان کے انداز نظر اور شخصیت کی بھرپور طور پر آئینہ داری بھی کرتے ہیں ۔ جب اسٹرلیس کہتا ہے ـــــ "آپ لوگوں کو علم ہے کہ کابینہ کے بہت سے ممبر جنگ کے خلاف ہیں ۔ وہ صرف سیاسی حکمت عملی سے حبشہ پر حقوق قبضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں ـــــ" تو مسولینی جواب دیتا ہے "ہر دماغ سوچنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ۔ اطالیہ کی ضرورتیں سائنٹ دلائل سے ارفع ہیں " یہ ایک مختصر سا مکالمہ ہے ۔ جس سے ایک مطلق العنان آمر کی ذہنیت کا صحیح طور پر اندازہ ہو جاتا ہے ۔ مکالمے کی کامیابی کی آخری منزل یہی ہے ۔

کرداروں کی شخصیت کو پورے طور پر واضح کرنے کے لئے اختر اورینوی نے جا بجا خود کلامی کا استعمال بھی کیا ہے ۔ خود کلامی سے کرداروں کے دل کی دنیا اور اس کی کیفیات آشکار ہو جاتی ہیں ۔ کہیں کہیں مکالمے کچھ زیادہ طویل ہو گئے ہیں لیکن اس کی وجہ سے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے ڈرامے کو اسٹیج کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اس لئے کہ عالمی ادب کے بہت سارے ڈراموں میں طویل مکالمے پائے جاتے ہیں اور انھیں کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے ۔ پھر یہ کہ اداکار صرف اپنے حافظے کی مدد سے مکالمے اسٹیج پر ادا نہیں کرتے بلکہ مکالمے پردے کے پیچھے سے پرامٹ (PROMPT) بھی کئے جاتے ہیں ۔ "شہنشاہ حبشہ" کے مکالموں میں کہیں کہیں اختر اورینوی نے اشعار کا استعمال بھی کیا ہے ۔ ڈاکٹر احمد (جو ہندوستانی ہے) کی زبان سے تو اردو اشعار موزوں معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن جب اردو یا فارسی اشعار ڈرامے کے دوسرے کرداروں کی زبان سے سننے میں آتے ہیں ۔ تو حیرت کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے یا سننے والے کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے ۔ یہ بات اس کی نظر میں کھٹکتی ہے اور وہ اسے کسی طرح قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا ۔

جہاں تک اسٹیج کی ضرورت کا تعلق ہے اردو کے بہت کم ایسے ڈرامے ہیں جو اسٹیج کے تقاضوں کو پورے طور پر پورا کرتے ہیں ۔ آغا حشر کاشمیری کے چند ڈراموں کے علاوہ اردو کا کوئی ڈرامہ نگار اسٹیج کے تقاضوں کا لحاظ نہیں رکھتے دوسرے ڈرامہ : کمپنیاں اور دوسرے ادارے ڈرامے کو اسٹیج کرنے کے سلسلے میں کرداروں کی ، صحت اور محنت سے گریز کرتے ہیں ۔ شہنشاہ حبشہ بھی انہی بے اعتنائی اور گریز کا شکار ہوا ہے ۔ ؎

مجموعی طور پر اردو میں صرف چند کامیاب اور اہم ڈرامے لکھے گئے ہیں جن میں "شہنشاہ حبشہ" بھی شامل ہے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اتنے اہم موضوع پر اور اس سے (شہنشاہ حبشہ سے) بہتر تاریخی ڈرامہ اردو میں آج تک پیش نہیں کیا گیا اس لئے کہ ـــــ "تاریخی ڈرامہ لکھنا کوئی معمولی بات نہیں ۔ اس کام کیلئے ڈرامہ نویس کو ڈرامہ نویسی کے علاوہ تاریخ دانی کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے" اور اس "سخت ضرورت" کو اختر اورینوی نے پوری کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے ۔

نوٹ : ؎ ڈرامہ ادب کا ایک صنف ہے ۔ اس کی خوبی و کامیابی کیلئے ضروری نہیں کہ تھیٹر کے معیار پر بھی پورا اترے ۔ ادارہ

یاسمین روحی ظفر

اختر کی شاعری میں منظر نگاری

شاعری اور نثر ہر دو فنکاریاں صرف زندگی کے تجربوں کا سیدھا سادا اظہار نہیں ہوتیں۔ باہر کے تجربے فنکار کی داخلی زندگی سے مل جاتے ہیں۔ اور ان دونوں کے امتزاج کے بعد شاعر و فنکار کی تخلیقی صلاحیت اس مرکب سے فنی نمونے پیدا کرتی ہے۔ اور انہیں مناسب اور موزوں پیکروں میں ڈھالتی ہے۔ شاعری فنکاری ہے اور فنکاری کے دو پہلو ہیں۔ تجربۂ فنی اور ہیئت فن۔ تجربہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ محض مشاہدہ یا محض فطرت کی تحریکوں پر مبنی نہ ہو بلکہ مشاہدۂ حیات اور محرکات زندگی شخصیتِ فنکار میں گھل مل جائیں۔ اس کے احساس جذبہ اور تخیل سے فیض پائیں اور پھر مرکب ہو کر کسی موزوں و مناسب اور ہم آہنگ ہیئت میں ڈھل جائیں۔ جذبہ احساس اور تخیل کے درمیان بھی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ توازن تناسب اور ہم آہنگی آرٹ کی اہم خصوصیات ہیں۔ داخلی عناصر میں بھی ہم آہنگی ہونی چاہیے اور پھر اندرونی مرکب تجربہ اور فورم کے درمیان بھی توازن تناسب اور ہم آہنگی ضروری ہے۔

ان باتوں کے علاوہ شاعری میں تجربے کو لطیف، نفیس جذبہ اور عمیق ہونا چاہیے۔ شعریت ایک روح لطیف کا نام ہے جس کو جذبہ سوز و گداز عطا کرتا ہے۔ احساس نزاکت اور لطافت بخشتا ہے اور تخیل اس میں رنگینی و پرکاری پیدا کرتا ہے۔ یہ اسے صد پہلو اور پر معنی بناتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات سب تخیل کے پروردہ ہوتے ہیں۔ غرض شاعری فطرت کی صرف فوٹوگرافی یا نقالی نہیں ہوتی بلکہ وہ تخیل کے ذریعے فطرت کی تشکیل جدید ہے۔ وہ زندگی کے حقائق کی آئینہ سامانی تو کرتی ہے مگر بہ انداز جمال جناب اختر اورینوی نے اس آئینہ سامانی کو بہت ہی خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ "عروس حیات آئینۂ ادب میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔" ایسی جمالیاتی حقیقت جس کی تشکیل شاعر کے شعور نے کی ہے اس میں تخیل اور جذبات کا امتزاج ہوتا ہے۔

آرٹ کی اسی روشنی میں ہمیں اختر اورینوی کی نظموں میں انکی بہ حیثیت منظر نگاری کے پرکھنا ہے۔ اور ان کی ان نظموں کا جائزہ لینا ہے جن میں انھوں نے منظر نگاری براہ راست کی ہے۔ یا ان میں پس منظر میں فطرت کو اجاگر کیا ہے۔

اختر اورینوی نے نگار خانۂ فطرت کے بیشتر نقوش و تصاویر پر نظر ڈالی ہے اور اس حسن دہر کے دیدہ ور شاعر کو فطرت میں حسن کی جو جھلک نظر آتی ہے اس میں وہ اپنے احساس جذبہ اور تخیل کے امتزاج سے نزاکت اور لطافت رنگینی و پرکاری اور معنویت پیدا کرتا ہے۔

اختر اورینوی کی ایسی نظمیں بے شمار ہیں۔ جن میں اشیائے فطرت کی جلوہ گری ہے۔ شمال کے نود پر جگنو دھان کا کھیت، کومل پیام فطرت برق، ادائے بہار، دریا کے سون وغیرہ وغیرہ یا پھر ایسی نظمیں جن میں فطرت کو اجاگر کیا گیا ہے یا پس منظر میں منظر نگاری ہے۔ مثلاً، جھنکار، حجاب، نغمے، ایک شام، رخصت، [illegible]، تاج محل، دھان رفتہ، نذر نور وغیرہ۔ تقریباً سبھی نظمیں پر اثر، پر وقار، بالیدہ شگفتہ اور شعریت بداماں ہیں۔ ان نظموں کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی مزاج و میلان کی ترکیب ملتی ہے۔ اور مقامی

رنگ جھلکتا ہے۔ اختر اور نیوی کے اس آئینہ خانہ میں عروسِ فطرت اپنا ہندوستانی خلوانہ لباس پہن کر مسکراتی نظر آتی ہے۔ مناظرِ فطرت کے پس منظر میں جگہ بجگہ مقامی رنگ نمایاں ہے۔ شاعر کو ان مقامی چیزوں سے والہانہ محبت اور شیفتگی ہے۔ کوئل کی کوک شاعر کی روح کو رفعت بخشتی ہے۔ کوئل کے گیت میں اسے شعلے کی تاثیر نظر آتی ہے۔ ؎

گیت میں تیرے پنہاں کوئل شعلے کی تاثیر
راگ میں تیرے رقصاں کوئل ہستی کی تنویر
پریم کی دیوی تیرا نغمہ الفت کی تفسیر

تان میں ایسا سوز کہ آکاش کو جائے چیر
میرے دل پہ تیر! کوک کوک اے کوئل کوک

کبھی جگنو میں اسے حسن کی تجلیاں نظر آتی ہیں۔ شاعر کے نزدیک جگنو عروسِ شب کے ماتھے پر چھڑکے ہوئے افشاں کی مانند ہے۔ کبھی وہ دامنِ گنگا پر فطرت کی اداؤں کی عجیب جلوہ گری دیکھتا ہے اور اس دریائے تجلی سے نگاہوں کی پیاس بجھاتا ہے ؎

دریائے تجلی سے نگاہوں کی بجھے پیاس
سیرابیٔ جذبات ہو شادابیٔ احساس

کبھی دھان کے کھیت میں خود کو گم کر دیتا ہے۔ ہر کھیت کا نظارہ اس کیلئے عشرتِ نظر ہے۔ اور ایک خوابِ حسین ہے۔ کبھی یادوں کی چلمن سے رومان رخ کے نظارے دیکھتا ہے اور بے قرار ہو کر کہہ اٹھتا ہے

وہ سون کے ساحل کے دل افروز نظارے

ہیں اخترِ بیتاب کو سو جان سے پیارے
اے سون بلائے مجھے پھر اپنے کنارے

فطرت کی دلآویزی کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے جب شاعر کا دل موہ لینے والی گوریاں موجود ہوں۔ ؎

سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم
سون کی وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
شاعرِ سرشار کے رنگیں خیالوں کا ہجوم

فطرت کے اس بکھرے ہوئے حسن نے بھی اختر کی نظموں میں شاعری کی ساری اہم خصوصیات حسن کا رانہ طور پر یکجا کر دی ہے۔ شکیلہ اختر نقوش کے شخصیت نمبر میں لکھتی ہیں۔ "سون کے ساحل پر گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے یا اپنی تصویروں میں رنگ بھرتے ہوئے یا بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھتے رہا کرتے تھے۔ اور چاندنی راتوں میں پام والے سامنے نہر کے کنارے جب چاپ بیٹھے ہوئے وہ شیشم کے پتوں سے چھن چھن کر چھنتی ہوئی بے قرار چاندنی کو دیکھتے ہوئے اپنی تازہ کہی نظم گنگنایا کرتے تھے انھیں دنوں کی لکھی ہوئی نظم کا ایک ٹکڑا یہ بھی تھا۔ ؎

دل کی کلی کھلی بھی جو بادِ خزاں نے آ لیا
نغمے نکل رہے تھے کہ سازِ مرا بگڑ گیا
خندہ ابھی تھا زیرِ لب آنسو کا ابر چھا گیا
اپنی خوشی کا آفتاب وقتِ سحر غروب تھا

اور دل کی شاداب فضاؤں، ہرے بھرے باغوں اور لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جہاں وہ حیاتِ نو پا رہے تھے۔ تو اسی جگہ وہ ایک [illegible] ادیب شاعر اور نقاد بھی بن رہے تھے۔"

کائنات کے خارجی مظاہر و مناظر سے اختر نے غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ اور ان کی باریکیوں اور ان کے حسن کی لطافتوں اور خصوصیتوں سے اثر قبول کیا ہے۔ فطرت کے جانے بوجھے مناظر کو بھی نئے کیف و حال کی روشنی میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اختر کی نظم "نوائے بہار" ملاحظہ ہو۔ بہار کی دلآویزی اور دلکشی سے کسے انکار ہے۔ میر جیسے خلوت پسند شاعر بھی بہار کی دھوم سن کر کہہ اٹھے تھے ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں کم کم بادوباراں ہے

نظم "نوائے بہار" بہت ہی تراشیدہ اور خوبصورت نظم ہے بہت ہی نکھرا ہوا اسلوب بیان ہے۔ پوری نظم میر کے اس شعر کی "موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی" شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی" کے تجربے پر قائم ہے۔ پھاگن کی ہوائیں شاعر کی جنوں خیزی کو دوبالا

گردش... میں سے

موسم ہے پرستی کا
ہاں حسن پرستی کا
حاصل ہے پرستی کا
مرا دل ناداں ہے
اور جادو کے مژگاں ہے
پھر فصل بہاراں ہے

دے ساقیا پیمانہ　　با لغزشِ مستانہ
با غمزدہ ترانہ
پیمانے پہ پیمانہ　　پیمانے پہ پیمانہ
پیمانے پہ پیمانہ

نظم "برق" کا مطالعہ کیجئے۔ "وہ جو اک بات ہے بجلی کے چمک جانے میں" وہ بات اسی نظم میں ملتی ہے۔

شعلہ کوئی بھڑکا ہے　　یا برق کی تابش ہے
یا رعد کا کڑکا ہے　　کس زور کی بارش ہے

الفاظ سے مصوری کی گئی ہے۔ تازہ کاری اور تازہ خیالی اس نظم میں جابجا ملتی ہے ؎

شاعر کے تصور میں　　آتا ہے کوئی جیسے
یا قلبِ فسردہ میں　　امید کوئی جھلکے
یہ آنکھ کی گردش ہے　　یا جنبشِ مژگاں ہے
یا قلب کی سوزش ہے　　یا جلوۂ عریاں ہے

یہ حسن کا پرتو ہے　　یا عشق کا نغمہ ہے
یا ابر کے محمل میں　　بیٹھی کوئی عذرا ہے

یا دل میں یہ بجلی ہے　　یا رقص میں پریاں ہیں
یا نالۂ شرر افشاں　　یا عرش پہ لرزاں ہیں

نظم "دہقان کا گیت" میں نری نقاشی نہیں بلکہ مصوری ہے اور الفاظ کے نور و رنگ سے تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اور حقیقتوں کی تعبیرِ جدید ہے۔

پودے ہیں دہقان کے یا　　اتری ہیں سبز پریاں
یا سبز پوش عذرا　　نظریں ہیں میری حیراں

کشتِ زمردیں پہ　　شبنم کے چھوٹے قطرے
قالینِ مخملیں پہ　　موتی کے پھول جیسے

برسات نے بنائے　　صد منظرِ بہاریں
شہکار ہیں سجائے　　تصویرِ خوش نگاریں

شاعر حسنِ فطرت میں جو رعنائی پاتا ہے اسے تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ حسین تصویروں میں ڈھال دیتا ہے۔

جگنو نہیں بجلی ہے　　ہاں منتِ دستی ہے
عاشق کی سیہ بختی　　معشوق کی شوخی ہے

خورشید کا ذرہ ہے　　یا برق کا ٹکڑا ہے
داغِ دلِ افسردہ　　خالِ رخِ زیبا ہے

اختر اورینوی کی شاعری میں فطرت کا رنگین اظہار ملتا ہے ؎

دریا کی روانی میں تھا اک نغمۂ پیہم
رنگین سی شفق دامنِ مشرق میں سحر دم
آغازِ جوانی کی سی وہ روشنی کم کم
اور دہکے ہوئے پھول پہ جھکی ہوئی شبنم
غنچوں کی طرح نورس و نوخیز ہے یہ سال
دوشیزہ تمناؤں کی اٹھلاتی ہوئی چال

جذبات کے سنگیت پہ تخیل نے دی تال
جلوؤں کے تقاضوں پہ ہوا شوق کا کیا حال
خوابیدہ بہاروں کی یہ انگڑائیاں اللہ
میرے دل بیتاب کی رسوائیاں اللہ

بہت ہی نکھرا ہوا اسلوب بیان ہے۔ ساری نظموں میں اک بر لطف کیفیت پائی جاتی ہے۔ غنائی حسن ہے۔

ان نظموں میں شاعر کی شخصیت بہتر سے کھل مل گئی ہے۔ فطرت شاعر کی رازدار بھی ہے، ہم دم اور رفیق بھی، شریک حال بھی اور ندیم بھی۔ فطرت اس کے جذبے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کی نظر میں چمن کا ہر ہر پھول اور ہر ہر غنچہ گویا نازک احساسات کا آئینہ دار ہے

آخری شب میں چاندنی کا گداز
بہر ساکت تھی بانغ تھا خاموش
کس کی "آنکھوں" نے روح کو چھیڑا
کون تجھ سے ملا تھا زلف بدوش
چاند پھیکا تھا آسمان تھا اداس
تم چلیں اور ادھر تھا رخصت ہوش

آفتاب شام کا جیسے ہو افسردہ جلال
یاد کے چہرے پہ تھی اک مضمحل تابندگی

شام کو دن کی نگاہیں جبکہ وہ پردوش تھیں
آتش عریاں سے میرا دل بھی گیا تو مس تھا
گلستاں در گلستاں وہ پھول سے رخسار تھے
آسماں پہ تھی شفق اور رقص میں طاؤس تھا

شاعر نے مطالعہ فطرت سے بصیرت بھی حاصل کی ہے۔ اور

تب وہ ملنے میں روشنی بھی پیدا کی ہے۔ پیام فطرت، صبح صحرا وغیرہ نظموں میں وہ فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے۔ ان نظموں میں تخیلیت ہے۔ اور تخیلیت مختلف استعاروں سے ظاہر ہوتی ہے

نظم "جھٹکارا" ایک مکمل استعارہ ہے۔

جھٹا کہرا!
چمکتا ہے جبیں سورج
ذرا دیکھو فضا کی دھج

زمیں سے آسماں تک ایک سیل نور جاری ہے
چھکتی ناچتی کرنوں پہ وجد و حال طاری ہے
گگن نیلا نچن بھرے چلے مستی میں اترا تی
کرن کیجن ہر اک سو رقص کرتی سونا برساتی
دلارتا دھوپ نکلی ہے دلھن کے روپ جگمگ کر
فضا آئینہ ساماں ہے، ہر منظر پیارے تیز گر

جمال مہر عالم تاب
مرے سورج نہ جا تاب

یہ نظم بہت ہی تراشیدہ اور خوبصورت ہے۔ ترکیبیں بڑی حسین اور خیال انگیز ہیں۔ وحدت تجربہ اور حسن ادا کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔

غرض کہ بحیثیت فطرت نگار اختر اور بیخودی کا مرتبہ بلند ہے۔ فطرت نگاری کی جو لطافتیں اور نزاکتیں ہیں وہ سب ان کی نظموں میں موجود ہیں۔

سرور جہاں

اختر اورینوی کی اداریہ نگاری

اردو ادب جہاں اور اصناف میں انگریزی یا دیگر مغربی ادبیات کے مقابلے میں بہت سست رفتار ہے وہاں اداریہ نگاری کی صنف میں بھی بہت پیچھے ہے۔ در اصل بحیثیت فن کے اردو ادب میں صنف اداریہ نگاری یا دیباچہ نویسی کو لوگوں نے برتا ہی نہیں۔ یہاں اداریہ نگاری اور دیباچہ نویسی تبصرہ تنقیص اور تحسین سے آگے نہیں بڑھی۔ اگر اسے اردو کے ادیبوں نے ایک صنف کی حیثیت سے برتا ہوتا تو شاید ادب میں اسے کوئی نمایاں مقام مل جاتا۔ انگریزی ادب میں جارج برنارڈ شا نے دیباچہ نگاری کے فن کو ایک انفرادیت بخشی۔ شا کے دیباچے اپنی انفرادیت کے ہی لحاظ سے بلند مقام کے حامل نہیں بلکہ اس انفرادیت کے ساتھ اس نے فنِ دیباچہ نگاری کے ذریعہ اپنے خیالات و افکار کو فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے بعض ڈراموں کے دیباچے اس کے بعض ڈراموں سے بھی زیادہ دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ اردو ادب کی یہ شروعات ہی سے بدقسمتی رہی ہے کہ اس میں فنکاروں نے اصناف کے ساتھ محنت و توجہ سے کام نہیں لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیباچہ نگاری تعریف و تحسین کا دوسرا نام ہو کر رہ گئی ہے اور اداریہ نگاری سرسری تبصروں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

جدید دور میں اداریہ نگاری نے باضابطہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اداریہ نگاری کے ذریعہ ایک مدیر اپنے خیالات و افکار کو آزادانہ اور غیر جانب دارانہ طور پر پیش کرتا ہے۔ ادبی، سماجی، سیاسی یا معاشی مسائل پر نظر ڈالتا ہوا اپنے طور پر ان کے حل بھی پیش کرتا ہے۔ موجودہ صحافت میں اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مدیر اپنے افکار و خیالات کو غیر جانب داری سے پیش کرے۔ اگر کسی اداریہ نگار کا قلم جانب داری کے خارزاروں میں الجھ جاتا ہے تو ہم اسے کبھی بھی ایک کامیاب اور انصاف پسند مدیر نہیں کہہ سکتے۔ خواہ اس کے خیالات کتنے ہی بلند اور اس کے افکار کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ خیالات کی بلندی اور افکار کی وسعت اگر جانب داری سے آلودہ ہو جاتی ہے تو وہ بلند و وسیع خیالات و افکار بھی پست وادی ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس مدیر کی انصاف پسندی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اداریہ نویس کو ذہنی طور پر بھی بلند ہونا چاہئے تا کہ وہ جس بلندی سے مسائل کا مطالعہ کرے وہاں جانب داری کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ پڑنے پائے۔ اس کے علاوہ اس کی ذہنی سطح تمام مسائل کو سمجھنے کی بھی اہل

ہوتا کہ وہ مسائل کا تجزیہ بھی کرے اور جب تجزیہ کرنے کے بعد وہ کوئی معقول حل پیش کرے تو اسکی اہمیت بھی ہو اس کی نظر ہر ان وقت کے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، معاشی، ادبی اور ثقافتی میلانات پر ہو اور اس کے ذہن کی گرفت وقت کے تقاضوں پر شدید ہو۔

جب ہم اختر اورینوی کی اداریہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر یہ تمام معیار رہتے ہیں۔ اور ان ہی معیاروں کو مدِ نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اداریہ نگاری کی جانب توجہ کی بلکہ بحیثیت صنف اسے بڑی کامیابی کے ساتھ برتا۔ اختر اورینوی کے فکر و فن پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اور جب جب ادب کے نئے اوزان و معیارات مقرر ہوتے رہیں گے ان کے فکر و فن کو ان اوزان و معیارات کی کسوٹی پہ پرکھا جاتا رہے گا، اور ہر بار ہمیں اختر اورینوی کا فن ایک نئے روپ میں نظر آئے گا۔ یہاں میرا موضوع اختر اورینوی کی مجموعی ادبی حیثیت کا احاطہ کرنا نہیں ہے اور نہ یہ کام چند دنوں یا چند صفحات کا ہی محتاج ہے۔ میں تو یہاں محض ان کی اداریہ نگاری کا ایک جائزہ لینا چاہتی ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس صنف میں انہوں نے کہاں تک کامیابی حاصل کی اور اس صنف کو اپنی انفرادی کاوشوں سے کہاں تک آگے بڑھایا۔ انہوں نے اداریے بھی لکھے اور دیباچہ نویسی بھی کی ہے۔ انہوں نے مختلف حضرات کی کتابوں پر تعارف اور دیباچے لکھے ہیں۔ کہیں تو سنجیدہ اور کہیں محض ضرورتاً یا مجبوراً ہلکے پھلکے انداز میں فنکار کو پڑھنے والوں سے متعارف کرایا ہے۔ جس کی عمدہ مثال "تحسین کے ڈھائی سو شعر" ہے۔ عظیم آباد کا سب سے قدیم اور معیاری جریدہ "معاصر" کے جو اداریے اختر اورینوی نے لکھے ہیں وہ ان کی ذہنی کاوشوں اور فکر و نظر کی سنجیدہ روی کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان اداریوں میں انہوں نے وقتاً فوقتاً ادب کے بنیادی مسائل کو پیش کیا ہے۔

ان مسائل کو جو ہوتے ہوئے بھی ادب کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک "معاصر" کے اداریے لکھے۔ یہ دور اردو ادب اور شاعری کے لئے بڑا اہم اور کڑا آزمائش کا دور رہ چکا ہے۔ اس عہد میں اگر ایک جانب ملک میں سیاسی بیداری اپنے عروج پر تھی تو دوسری جانب ادب میں نئے اور جدید اقدار پیدا ہو رہے تھے۔ اور جدید ادب تجرباتی دور سے گذر رہا تھا۔ یہ دور ترقی پسند تجربہ کہا جاتا تھا۔ ادب میں ہر جانب ایک ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اور کوئی ایسا معیار نہیں تھا جس پر اس دور کے ادب کو پرکھا جا سکتا۔ ہر شخص بغاوت پہ کمربستہ نظر آتا تھا۔ اور نوجوانوں نے پرانی روایت اور اقدار سے انحراف کو ہی معیار بنا رکھا تھا اور پرانی اور صالح روایت کے حامل فنکاروں نے ان ہنگاموں سے گھبرا کر گوشہ تنہائی میں پناہ لی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ کب کوئی من چلا سر بازار ان کی پگڑی اچھال دے۔ اختر اورینوی نے اس انتشار اور ابتری کے دور میں بھی سنجیدگی سے ادب کا مطالعہ کیا اور روایت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ادب کے جدید رجحانات کی نشاندہی کی۔ انہوں نے اس دور میں جو اداریے لکھے ان میں ہمیشہ توازن اور سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ ابتدائی اور سطحی پروپگنڈے بازی سے گریز کیا۔ انہوں نے کبھی بھی اپنا سماجی اور ادبی نقطۂ نظر پڑھنے والوں پر مسلط نہیں کیا۔ لیکن شاد نے اپنے نظریات اور نقطۂ نظر کی ہمیشہ پبلسٹی کی۔ شاد ہمیشہ دوسروں کو اس چیز کو پسند کرنے پر مجبور کرتا جسے وہ درست سمجھتا، اس نے کبھی دوسروں کے خیالات نظریات یا نقطۂ نظر کو جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس نے کبھی اس بات کو سمجھنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ کچھ لوگ اس کے ادبی اور سماجی نظریات سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اختر اورینوی کے فن میں شاد کی انانیت پسندی کا جذبہ نہیں ملتا وہ بڑے معقول اور معتدل انداز میں حالات اور مسائل کا

بقیہ ص ۴۲۹ پر

شمیم احمد صدیقی

اختر صاحب کے افسانے

(منظر و پس منظر میں)

ایک تاثر، ایک جائزہ

ادب حقائق و مسائل زندگی کے بیان کا ایک حسین و دلنشیں ذریعہ ہے۔ جس سے دل و دماغ بیک وقت متاثر ہوتے ہیں احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔ شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ دل میں سوز و گداز کی کیفیت اور ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ انبساطی یا انقباضی، اگر ادیب سازِ حیات کے تاروں کو مرتعش کر دیتا ہے تو اس سے نکلنے والے نغموں پر ابدیت اور پائیداری کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ اور اگر ادیب زندگی کے ساز کو چھوئے بغیر اپنی انگلیوں کو حرکت دیتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کے تانے بانے سے سطحی اور لمحاتی تعیش ذہنی کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ مگر لمحہ کے گزرنے کے ساتھ ہی اس کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ فن اور فن کار دونوں مر جاتے ہیں، لیکن حقائق زندگی ـــــ ان سے تو چولی دامن کا واسطہ ہے۔ زندگی کی حقیقتیں ہر حال میں اور ہر وقت اپنی واقعیت کا اقرار کراتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ادب برائے ادب" ادب برائے زندگی" تک پہونچنے کیلئے ایک زینہ تو ہو سکتا ہے لیکن وہ خود منزل نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ ہی وہی فنکار یا ادیب حیات بکنار تخلیقات سے سرمایۂ ادب کو وسیع اور مالا مال بنا سکتا ہے۔ اور زندگی کی رہبری کر سکتا ہے جو زندگی کے بارے میں تشکیک کا شکار نہ ہو بلکہ وہ مسائل حیات سے پوری آگاہی اور کامل واقفیت رکھتا ہو۔ زندگی کے کڑوے کوس جھیل چکا ہو۔ اس کے تجربے میں پختگی، گہرائی گیرائی اور اس کے مشاہدے میں دوربینی ہو۔ اس لئے کہ تشکیک رہبر گم کردہ راہ تو ہو سکتی ہے خضرِ راہ نما نہیں۔

اختر صاحب کے افسانوں کے مجموعہ منظر و پس منظر کو پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اختر صاحب سازِ حیات کے تاروں کو ایک ماہر موسیقار کی طرح چھیڑتے ہیں۔ جن سے نہ صرف آوازیں نکلتی ہیں بلکہ ان سے دلکش نغمے ابلتے ہیں۔ مسحور کن بھی اور خواب شکن بھی۔ اختر صاحب نے زندگی کا بھرپور اور بغور مطالعہ کیا ہے۔ ایسا مطالعہ جو عام انسان نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایک غیر معمولی احساسات و جذبات اور خاص دل و دماغ رکھنے والا ادیب ہی کر سکتا ہے۔

انھوں نے زندگی کا نظریاتی مطالعہ نہیں عملی تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے دشت و بیاباں کی خاک چھانی ہے۔ اس کے نشیب و فراز میں اترے ہیں۔ تند ائد حیات کا تجربہ کیا ہے۔ اور زندگی کے ایک ایک گوشے کی تلاشی لی ہے۔ سماجی، معاشی، اقتصادی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی، شہری، دیہاتی، ہنستی، مسکراتی اور روتی بلکتی غرض زندگی کی کوئی ادا اور اس کی کیفیت ان کی دور رس نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی ہے۔ زندگی جہاں بھی ہو اور جس حال میں ہو اختر صاحب کی نگاہ اس پر پڑتی ہے۔ ان کا دل متاثر ہوتا ہے۔ اور ذہن و دماغ ایک فیصلہ سناتا ہے۔ اور وہ اپنے اس تجربہ، مشاہدہ اور تاثر کو اپنے فن کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ جس میں نہ صرف زندگی کی کسماہٹ ہوتی ہے۔ بلکہ زندگی کی جھنکار ہوتی ہے۔

اختر صاحب نے اپنی کہانیوں کے لئے ایسا موضوع منتخب کیا ہے جو اس عالم کون و مکاں کی سب سے زبردست مگر قابل رحم حقیقت ہے۔ جس کے شیرازے کارزار حیات کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جنھیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شیشہ نگاہ جس طرف پھر جائے، اس میں ایک نہ ایک ترسیدہ و لرزیدہ عکس آ جاتا ہے۔ ٹانیمنٹ کی بوسیدہ و فرسودہ جھونپڑی ہو یا زخم خوردہ چہروں میں "جیری ملوسم" یا ڈاڑھی مونڈنے والے حجام کی کان، سبزی باغ کی بدتر بات حال اپنی بربادی کی کہانی آپ سنانے والی سڑک ہو یا دیہات کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی، کسی زمیندار کی عالی شان حویلی ہو یا کسی مزدور کی قابل نفرت کھولی۔ پارک ہو یا سینما ٹوریم، ساہوکار کی گدی ہو یا دیہات کا اسٹیشن، ہسپتال ہو یا ظلم کدہ ہر جگہ زندگی افتاں و خیزاں ہے۔ ہر طرف انسانیت کی لاش پر ابلیسیت کا محل تعمیر کیا جا رہا ہے۔ ہر جانب ایک طاقت ور، ایک مجبور کی آتی جاتی سانسوں کو چھین رہا ہے۔ ہر طرف اُمڈتے ہوئے بادل سے بے بسی و بے کسی کے آنسو ٹپک رہے ہیں اختر صاحب کا درد مند دل ان جان گسل اور کربناک مظالم کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ بیتاب ہو جاتے ہیں۔ اور سبزی باغ سے کھنور پوکھر تک رینگنے والی بوڑھی فقیرن، فاقہ زدہ بیر بس، موتیا گاڑی بان، جنا یکہ بان رنڈ کا کھلنے والا شبرتیا، سینما ٹوریم کا بوڑھا فقیر، قصبہ کا پاگل جواد اور معاشی ابتری کا شکار طالب علم سہیل کو بھی زندگی اور حیات بخش توانائی دلانے کیلئے وہ قلمی جہاد، کہانیوں کی شکل میں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ان سب کے لبوں کو تبسم آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے داغوں کے بجائے نور مسرت کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں اور پوری سوز مندی و درد مندی کے ساتھ چاہتے ہیں کہ ہر انسان کو زندگی کے اسباب میسر رہیں۔ سرمست و سرشار رہیں۔ غم زمانہ سے دور انبساط جاناں سے قریب، کاش! اختر صاحب کی درد میں ڈوبی ہوئی یہ صدا ہر کان میں پہونچتی اور ہر دل میں اتر جاتی، اور ہمارا سماج سبزی باغ میں رینگنے والی فقیرن کی طرح اندھا نہ ہوتا،

اختر صاحب کی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد اسی موضوع کی وجہ سے ہمارے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اختر صاحب کی نظر انتخاب انسانیت کے اس مظلوم اور نقطی فریادی طبقے ہی پر کیوں پڑتا؟ جبکہ خود اختر صاحب "غریب" نہیں ہیں اور غالبا کمیونزم و اشتراکیت کے مبلغ بھی نہیں۔ اس سوال کا قطعی اور آخری صحیح جواب تو اختر صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ فن فن کار کا آئینہ ہوتا ہے اور تخلیقات میں خالق کی جھلک ہوتی ہے تو اختر صاحب کے افسانوں کو پڑھکر اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اختر صاحب کے پیش نظر انسان، انسانیت اور زندگی کا واضح اور بہت ہی صاف و سیدھا نصب العین ہے۔ وہ اس نصب العین کو رواج عام دینا اور مقبول بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ کسی انسان کی لاش پر بیٹھ کر کوئی انسان مسرت و فتح مندی کے

تھپیٹے نہ لگائے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے خون کو کشیدہ نہ کرے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی مسرتوں کو تاراج نہ کرے۔ اور اس کے لئے ضروری تھا کہ قہقہوں کی گونج کی طرف دھیان دینے سے پہلے رونے والوں کی اشک شوئی کی جائے۔ بام آسمان پر پرواز کرنے والوں کے ادائے ساحرانہ میں محو نظارہ ہونے سے پہلے شام زندگی کی تاریکی میں بھٹکنے والوں کی رہنمائی کی جائے۔ شبستان ارم کی رنگینیوں اور نشاط انگیزیوں سے لذت انبساط حاصل کرنے سے پہلے زندگی کے تپتے ہوئے ریگستان میں جھلسنے والوں کو سایۂ دیوار کی نعمت بخشی جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے زندگی کی ساری پیچیدگیاں، ساری کمزوری اور تمام مسئلوں کا تعلق غمکدوں سے ہے۔ یہ چیزیں وہیں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ پیٹ کی آگ۔ اور تن کی عریانی سے لیکر گور وکفن تک کے سیکڑوں اور ہزاروں ناقابل حل مسائل کا تعلق صرف شکستہ حال اور خستہ جگر مظلوموں سے ہے۔ اور ارم کدے ــــ وہاں تو حسن وشباب کی ترنگ، جام ومینا کی کھنک، عشق ومستی کا وفور، عیش وطرب کا ہجوم، چنگ ورباب کے نغمے لب ورخسار کی سرخی زلف وکاکل کے سائے، سنگ وخشت کے آسمان، سیم وزر کا نور اور جاہ وحشمت کے غرور کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور یہ مسائل نہیں۔ مسائل کا حل ہیں۔ اگر وہاں نام خدا کوئی مسئلہ اور کوئی برائی ہو بھی تو وہ آرٹ ہے۔ تہذیب ہے کلچر ہے جسے برا کہنا کلچر وتہذیب کی توہین ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ وہاں کوئی مد گئے ارمی کے بلند بام آسمان کے حصار میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ جہاں نہ فکر مفکر کی رسائی ہو اور نہ طرد خیال فنکار کی پرواز اور نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اختر صاحب کے سامنے ایک منظم پروگرام ہے۔ افراد، سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا۔ اس لئے اختر صاحب کی کہانیاں اسی ماحول میں گردش کرتی ہیں، جہاں مسائل ہیں ـــ وہ زندگی کے ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے وہ ارم کدوں کی بجائے غمکدوں کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں

کہ اختر صاحب نظر اس طرف جاتی ہی نہیں۔ اختر صاحب بالا خانوں کے بلند دروازوں میں کبھی کبھی جھانک لیتے ہیں۔ اور اگر وہاں بھی مرض ہوتا ہے تو اس کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حویلی کے نرم وگداز بستر پر کانٹوں کی چبھن محسوس کرنے والی راشدہ کا درد بھی ان کو متاثر کرتا ہے۔ اور ڈاکٹر کریمی کی غیر اعتدال اور حماقت مآبی پر بھی ان کو ترس آتا ہے۔ اور ایک معصوم جوانی کو گھر کے جیل میں جلبن جلے کا شکار دیکھ کر بھی ان کا دل کڑھتا ہے۔

موضوع اور وجہ موضوع کے بعد اب ہم اختر صاحب کی کہانیوں کا مختصر تجزیہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ جس سے ہمارا مقصد اختر صاحب کی کہانیوں کی تاثیر اور حسن کے اسباب کو جاننا ہے۔ وہ اب ہم بلا کسی مزید تمہید کے ان اسباب کو اپنی بساط کے مطابق بیان کرتے ہیں۔

اختر صاحب کی کہانیوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا نفسیاتی پہلو ہے۔ جس سے اختر صاحب کی نفسیاتی بصیرت وآگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ انسان کی نفسیات بہت ہی پیچیدہ اور تہہ بہ تہہ ہے۔ اکثر ہم انسان کے محض ظاہری اعمال کو دیکھ کر اس کے متعلق ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں اور اسی نظریے یا مفروضے کے آئینہ میں ہم اس کو دیکھتے اور اس کے افعال واعمال کے متعلق فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس قسم کا نظریہ کبھی صحیح ہو جائے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے افعال کے پیچھے کچھ نفسیاتی عوامل ومحرکات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس سے اضطراری وغیر شعوری حرکات سرزد ہوتے ہیں۔ جب تک ان عوامل ومحرکات کا علم نہ ہو ہمارا کوئی نظریہ اور مفروضہ بہت کم صحیح ہو سکتا ہے۔ "پاگل" "ایس منظر اور یہ دنیا" اس مجموعہ میں اختر صاحب کی کامیاب نفسیاتی کہانیاں ہیں۔ جن سے ہمیں ان کی نفسیاتی مہارت اور انسانی کردار پر ان کی نفسیاتی گرفت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ ایک ادیب اور صحیح ادیب کیلئے نفسیاتی آگاہی ہمارے خیال میں بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی کہانی کے کردار کے ساتھ انصاف و رواداری برتنے میں کامیاب نہیں

ہو سکتا۔ اور نہ تلاشِ حقیقت ہی اسے کامیابی ہو سکتی ہے اور یہی نفسیاتی آگاہی کا نتیجہ ہے کہ اختر صاحب اپنی کہانی کے مجرم اور داغدار کردار کو بھی تند و تیز الفاظ میں معتوب نہیں کرتے بلکہ قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔

اختر صاحب کے افسانوں کا ماحول اور کردار دونوں ہماری دنیا کے حقیقی جانے پہچانے اور دیکھے سنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو پڑھتے وقت قطعی احساسِ اجنبیت نہیں ہوتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کا ماحول ہمارا اپنا، کہانی کا کردار خود ہم، ہمارے احباب شناسا اور دیگر دیکھنے والے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اختر صاحب بے شمار مسائلِ حیات میں سے کسی ایک مسئلہ کو لیتے ہیں۔ اور اسے ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ دنیا میں قدم قدم پر ہر لمحہ کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ ہم ان سے باخبر ہوتے ہوئے بھی انجان رہتے ہیں لیکن ایک فنکار ان حقیقتوں کو نظرانداز نہیں کر پاتا ہے۔ اسے ہر طرف اور ہر جگہ کہانیاں ہی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ وہ ہماری دنیا میں بکھری ہوئی بے شمار کہانیوں میں سے ایک کہانی چنتا ہے۔ اور اسے ادب کے قالب میں ڈھال کر اور الفاظ کے موتیوں سے سجا کر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ماحول و کردار کی اسی صداقت و واقعیت کی وجہ سے اختر صاحب کے افسانوں میں زندگی کی دبازت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی کوئی کہانی پڑھ جائیے حقیقت و واقعیت سب میں یکساں طور پر آپ کو ملے گی۔

کردار نگاری اور واقعیت نگاری اختر صاحب کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور اس کی جتنی کامیاب اور اچھوتی مثالیں ہمیں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں اردو کے بہت کم دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں مل پائیں گی۔ اختر صاحب جس کردار کو بھی پیش کرتے ہیں بالکل واقعی اور حقیقی رنگ میں۔ اور اس طرح کہ اس کردار کا پورا سراپا اور اس کی سچی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ "جونیر ٹائپسٹ" اور "بوڑھی ماما" اختر صاحب کی کردار نگاری کے بہترین اور مثالی افسانے ہیں۔

اپنے افسانوں میں حقیقت کی روح قائم رکھنے کیلئے اختر صاحب اکثر و بیشتر حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔ افسانے کا کردار جس قماش، جس سماج اور جس طبقہ کا ہوگا۔ اس کے حرکات و سکنات گفت و شنید اور نشست و برخاست سے اس کی خصوصیات خود بخود ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر موتیا گاڑی بان، ایک دیہاتی مزدور ہے۔ اس کے ذہن و دماغ پر دہقانیت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے کیف و سرور کی حالت میں غالب و اقبال کے مصرعے نہیں نکل سکتے۔ اور اگر وہ غالب و اقبال کے اشعار گنگناتا ہے تو یہ خلاف واقعہ بھی ہوگا اور پڑھنے والوں پر زیادتی بھی۔ چنانچہ موتیا گاڑی ہانکتے ہوئے میر و غالب کی غزل کی بجائے یہ الاپتا ہے: "جویا سے جو بنا ہر بھیل ہو راما۔ جیت ملے"

خشک سالی کی آگ میں دیہات کے کسانوں کی امیدیں اور تمنائیں جھلس رہی ہیں۔ ہر شخص افسردہ اور مضمحل نگاہوں سے آسمان پر ابرِ رحمت کا متلاشی ہے۔ مستقبل کا روح فرسا تصور سوہانِ روح ہے۔ ہربنس سوچتا ہے: "اتنے دم کھانے والے اور ہر سال ملگجاری لگان کیسے بھرا جائے گا۔ سال بھر کھانا کرجا ادھار بھی تو ملے کا آس نہیں۔ بھولو کی مائے لڑکوری ہے۔ آدھا پیٹ کھا کے کے کیسے رہتئے .... بھو دھجو کا رہے ہے ـــ" (دو مائیں)

ایک قصبہ کا باشندہ جواد پاگل ہو جاتا ہے۔ فتورِ عقل و آگہی سے پہلے وہ ایک سنجیدہ اور باعزت حیثیت کا مالک تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جب وہ پاگل ہو جاتا ہے تو وہ جو کچھ بکتا ہے۔ وہ کردار نگاری اور واقعیت نگاری کی بہترین مثال ہے۔ ایک پاگل کے بے ربط باتیں ملاحظہ ہوں۔

"ادھر ادھو بنوا گئے ہو .... ادھو تیو گئے ہو .... میاں ہمرا ادھو بنوا گئے ہو .... یہ سب ہمرا قوم ہے۔ جو کہے

گاندھی ، نماز کے وقت دخل اندازی —— ہم اب دافع شرک
استعمال کریں گے تو پھر مت کہیو کہ جوا دیا گل ہے — اگر یہ سچ
ہے ۔ ہم نہیں کہتے کہ ہے ...... مگر دیکھو بھائی مذہب میں دخل
دوگے تو ہم ابن سعود کو بلا لیں گے ۔ تب خدا کو مانا —— ہی ہی ہی
ہا ہا ہا ۔ پاگل تو یہ ہے ڈپٹی سمجھ جا ہے کچھ ہم نہیں پاگل ....
.... ۵۔ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ۔ من انداز قدت
را می شناسم — دل بدست آور کہ حج اکبر است ۔ حج کرنے میں کس
کی مجال جو دخل دے ۔ ابن سعود بھی نہیں روک سکتا ۔ تم جاؤ نہ
بھائی بیت المقدس ۔ ہم روکے ہیں تم کو ...... سبحان اللہ کیا بڈھو
نیز آگئے ہو ۔ بڈھو ہوا گئے ہو ۔

افسانے میں مرکزی کردار کو اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوتی ہے
اور پوری کہانی اسی مرکز پر گردش کرتی ہے ۔ مرکزی کردار کے بھی
اسی پہلو پر خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے ۔ اور اسی کو نمایاں کیا جاتا
ہے ۔ جس کا اس کہانی سے تعلق ہوتا ہے ۔ لیکن محض ایک کردار اور
اس کے کسی خاص پہلو ہی سے کہانی مکمل نہیں ہو جاتی ۔ مرکزی
کردار کے علاوہ دوسرے جزوی کردار بھی افسانے میں کسی نہ کسی
طور پر اپنا ایک خاص مقام اور اپنی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں
بعض کہانیوں میں ضمنی جزوی کردار بھی کہانی کو حسین اور موثر
بنانے کیلئے ضروری ہوتے ہیں ۔ اختر صاحب کے افسانوں میں
جزئیات نگاری کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں ۔ جو جزوی ہونے
کے باوجود اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہیں ۔ اور اگرچہ مرکزی کردار
کہانی پر چھایا ہوا ہوتا ہے مگر جزوی کرداروں کا گہرا نقش بھی ہمارے
ذہن پر مرتسم ہو جاتا ہے ۔ اور یہ ارتسام لمحاتی نہیں ہوتا بلکہ افسانے
کی یاد کے ساتھ ہمارے ذہن میں جزوی کردار بھی باقی رہتے ہیں ۔
جزئیات نگاری کی اختر صاحب کی کہانی سے کوئی مثال پیش کرنے
سے پہلے ہم ایک اور بات کہنا چاہتے ہیں ۔ اردو ادب کا ایک معتوب
و مغضوب کردار "مولوی" ہے ۔ اس کردار سے ہمارے ادیبوں
کو اللہ واسطے کا بیر ہے ۔ اردو شاعروں کی چوٹ تو اس طبقۂ
ناکردہ گناہ پر پڑتی ہی رہی ہے ۔ اردو افسانہ نگاروں کی نگاہ کرم
اور نظر عنایت سے کبھی یہ بدنام ادب طبقہ بچ نہ سکا ۔ اردو ادب
میں اصلاح و انقلاب کی کئی لہریں اٹھیں ، روایت سے بغاوت کا
نعرہ بلند کیا گیا ۔ اردو ادب کے فرسودہ اور قدیم بتوں کو مسمار کرنے
کیلئے جہاد کیا گیا ۔ ترقی پسندی اور تجربہ دلپذیری کا ہنگامہ بھی
ہوا لیکن اس کردار کے سلسلے میں آج تک بغاوت کا کسی کو خیال بھی
نہیں آیا ۔ اردو ادب میں اب تک کوئی محمود پیدا نہ ہو سکا ۔ جو ادبی
سومناتھ کے اس طلسمی بت کو مسمار کرتا ۔ ترقی پسند اور قدامت
پرست دونوں طبقہ کے ادیب گمراہی کی حد تک روایت پرستی بلکہ
اوہام پرستی کا شکار ہیں ۔ اختر صاحب کی منصفانہ طبیعت ہمدردانہ
و مساویانہ روش اور دردمندی سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ مختلف
النوع مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کرنے کے ساتھ ہی اس صدیوں کے
مظلوم طبقہ سے بھی اظہار ہمدردی کریں گے ۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک
شدہ "پاگل" اختر صاحب کا ایک کامیاب نفسیاتی افسانہ ہے ایک
بستی میں ایک بارات آتی ہے ۔ جس میں امین میاں بھی ہیں ۔ اور شکور دادا
بھی ۔ خوش فعلیوں میں وقت گنوانے والے نوجوان بھی ہیں ، اور
ضرورت و بے ضرورت چیخنے چلانے والے میزبان بھی اور نام خدا ایک
"مولوی" بھی ، آگے اختر صاحب کی زبانی سنئے ۔

سب سے دور سائبان کے ایک گوشے میں محترم مولوی صاحب بصد
انداز تمکنت و رعونت "شجر الزقوم" بنے بیٹھے تھے ۔ پر رونق چہرے
پر خشونت مستمرہ سے کانٹے سے بن گئے تھے ۔ سیاہ لانبی الجھی ہوئی
بے ترتیب سی داڑھی ۔ سر پر اعلان سیادت کے طور پر متکبرانہ عمامہ لانبا
کرتا ، دکھلا دے کی حد تک اونچی جھری کا عجیب القطع مولویانہ پائجامہ
یہ تھی ان کی وضع ، مولوی صاحب مجلس کی خوش فعلیوں اور زندہ دلانہ
مشاغل کو نظر حقارت و استکراہ سے دیکھ رہے تھے ۔ اور ان کی
مجموعی کیفیت سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ان کی

مجموعی کیفیت سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ان کی ذات تقدس اس محفل نغمۂ سرود اس مجلس بدعت وحشیاں میں نہ ہوتی تو قہر عذاب خداوندی کو روکنے والی صورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ باجے بج رہے تھے۔ زنان خانے سے گیت کی آوازیں مختلف سروں میں پے بہ پے آرہی تھیں۔ مولوی صاحب اس مجلس میں ہرگاہ شریک نہ ہوتے مگر وہ دعوت طعام رد کرکے گنہگار بننا پسند نہیں فرماتے تھے "یہ سارے واقعات بالبداہت جواد کے افعال شنیعہ کے نتائج قبیحہ ہیں" (پاگل)

قطع نظر اس سے کہ کسی ذات تقدس مآب کا اس سے زیادہ بھیانک اور عبرت انگیز تعارف اور کیا ہو سکتا ہے۔ جزئیات نگاری کی یہ بہترین مثال ہے۔ مولوی صاحب کا کردار افسانے میں محض ضمنی اور لمحاتی ہے مگر افسانہ پڑھنے کے بعد جہاں جواد کا پاگل پن فراموش نہیں کر سکتے وہیں مولوی صاحب کو بھی بھول جانا مشکل ہے۔ کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں کردار کی خصوصیات کے اظہار کیلئے اختر صاحب ایسے برمحل الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو زبان حال سے اظہار خصوصیت کرتے ہیں۔ "مشیر الزقوم" خشونت منزہ افعال شنیعہ اور نتائج قبیحہ جیسے ثقیل اور بھرکم عربی الفاظ خود ایک ثقیل نامانوس عربی داں مولوی کی غمازی کرتے ہیں

کسی بات کو پیش کرنے اور عرض مدعا کے بہت سے طریقے ہیں ایک ہی بات اختلاف زبان و قلم اور لب و لہجہ سے تاثیر کے لحاظ سے مختلف ہو جاتی ہے۔ ایک واقعہ جسے سنکر کبھی ہمارے دل میں ایک درد کی کسک اور خلش پیدا ہوتی ہے وہی واقعہ محض نوعیت بیان کی تبدیلی سے ہمارے دل میں معمولی سا سوز و گداز بھی پیدا نہیں کرتا ہے۔ یہ صرف پیشکش اور انداز بیان کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اختر صاحب کی پیشکش نہایت موثر اور حسین ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی باتیں ہمارے دل میں کھب جاتی ہے اور ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اختر صاحب کے افسانہ "جینے کا سہارا" کا مرکزی کردار بوڑھی فقیرنی ہے۔ جو سبزی بیچتی ہے جھونپڑیوں کو گھونگٹ کھسکی اور رنگتی رہتی ہے۔ آج بھی بالکل وہی کردار اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ سبزی باغ کی سڑکوں پر "ہے کوئی اللہ کا پیارا" کا صدا لگاتی ہوئی گھسٹتی پھر رہی ہے۔ ہم اسے روزانہ دیکھتے ہیں۔ مگر وہ کیفیت وہ سوز و گداز اور وہ درد مندی ہم میں پیدا نہیں ہوتی جو اختر صاحب کا افسانہ "جینے کا سہارا" پڑھکر پیدا ہوتی ہے۔

اختر صاحب ہمارے معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دیکھتے ہیں ان کے دل میں ایک درد پیدا ہوتا ہے۔ ان کی روح بیقرار ہو جاتی ہے اور ان کا ضمیر مچل جاتا ہے۔ لیکن ان کے ماتھے پر شکن آنکھوں میں سرخی اعصاب میں سختی اور زبان میں درشتی پیدا نہیں ہوتی۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس لئے کہ یہ کیفیتیں جذبہ منتقمانہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ایک مصلح انتقام نہیں لیا کرتا اصلاح کیا کرتا ہے۔ اختر صاحب بھی ہماری اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے سماج کو ان غلاظتوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ جن سے ہمارا سماجی نظام متعفن ہو رہا ہے۔ اختر صاحب کی نفسیاتی بصیرت بہت تیز ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ڈانٹ پھٹکار اور گھڑکیوں سے اصلاح کی بجائے منفی ردعمل بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ بڑے خلوص اور بڑی ہمدردی سے ہماری اصلاح کرتے ہیں۔ بڑی ہوشیاری سے ہمیں صراط مستقیم کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ نشتر بھی چبھوتے ہیں تو بیدردانہ نشتر زن جراح کی طرح نہیں بلکہ مرہم میں ڈبو کر وہ ہماری کمزوریوں کو کریدتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہ ہم تلملا جائیں وہ تلخ بات بھی کہتے ہیں تو گوارا بنا کر وہ ہمیں بیدار بھی کرتے ہیں تو جھنجھوڑ کر نہیں خواب شکن نغمے سنا کر۔ اور یہی وجہ ہے کہ اختر صاحب کی باتیں ہمیں بیدار و ہوشیار تو کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی چونکا بھی دیتی ہیں مگر ان سے ہم تلخی محسوس نہیں کرتے ہمارا موڈ خراب نہیں ہوتا۔ وہ ہماری کوتاہیوں پر ہمیں لعنت و ملامت کا نشانہ نہیں بناتے بلکہ وہ درد دل سے مجبور ہو کر اگر کچھ کہتے بھی ہیں تو صرف

یہ کہ "وہ (بوڑھی فقیرن)، ہماری سماج کی طرح اندھی تھی۔ آنکھ رکھ کر اندھی" کبھی کبھی تو ان کی آواز تیز بھی ہو جاتی ہے۔ اور اس میں طنز کی چبھن بھی ہوتی ہے۔ "ڈاکٹر کریمی میری ایک لڑکی کانونٹ میں پڑھتی ہے تمہیں اس کا نام بتاتی ہوں۔ وہ تمہاری بیقرار آرزوؤں کیلئے زیادہ موزوں ہوگی۔"

اختر صاحب جادۂ افسانہ نگاری سے ہٹ کر کبھی بھی خطیب و ناصح ناگوار نہیں بنتے اگر ان کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو مختصر طور پر اور لطیف پیرایہ میں کہکر گذر جاتے ہیں۔ مگر کچھ اس انداز سے کہ ہم اس سے بےخبر نہیں رہ سکتے۔ "ایک گوشے میں گاندھی جی کی تصویر ہندوستان کی تصویر، ہندوستان کی غربت و فلاکت کا مجسمہ بھی ستیہ گرہ کے جالے بن رہی تھی۔ سیلون کا حجام سہیل کے رخسار پر چیری بلوسم کا پاؤڈر مل رہا تھا۔ (آئینۂ الگنی)

"جو غم ملا اسے غم جاناں بنا دیا" کے فریب میں چوٹ پر چوٹ کھانے والوں کی کمی نہیں۔ یہ فریب ہمارے شعری اور افسانوی ادب کا جزو لازم ہے۔ اس فریب کو حقیقت بنانے کیلئے آج بھی کتنے لوگ دام فریب میں گرفتار ہیں۔ اختر صاحب یہ فریب کبھی نہیں کھاتے انھوں نے اس طلسم فریب کو چور چور کرنے کی کوشش کی ہے — یہ فریب تو وہ کھاتے ہیں جو زندگی کے تپتے ریگستان سے بھاگ کر زلف و کاکل کے عنبریں سائے کی لمحاتی لذت کو دوامی سمجھتے ہیں۔ جو زندگی کے تقاضوں سے صرف نظر کرکے زندگی سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں لیکن اختر صاحب کی نظر تو زندگی کی حقیقتوں، تلخیوں اور سختیوں پر ہے۔ وہ زندگی کے تقاضے کو سمجھتے ہیں۔ اسلئے وہ ان حقیقتوں کو فریب سمجھکر فریب کو حقیقت کیسے تسلیم کرلیں۔

"سہیل نے ان سنی کردی۔ مگر حسن کے تصور میں وہ غم روزگار کو غرق نہ کرسکا۔ اس کے دماغ کے تاریک گوشوں سے نئے خیالات اٹھنے لگے۔ جیسے کوئی نشے سے ہوش میں آنے لگے۔ ماضی کی دلکشی کا فریب ٹوٹنے لگا۔ اور حال؟ غیر یقینی و دھندلکا، بے آس افسردہ ناکام اس بے روزگاری کے عفریت نے ہی ماؤں کی طرح عالم خلد سے چھین لیا۔" (آئینۂ الگنی)

اختر صاحب سارے زمانے کا غم اپنے دل میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں وہ کائنات سے اپنا سینہ معمور کرلینا چاہتے ہیں وہ سینا ٹوریم میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں مگر اس حالت میں بھی سینا ٹوریم کے فقیر کی دردناک زندگی اور خزاں رسیدہ چہرے کو دیکھ کر وہ اپنا سارا درد بھول جاتے ہیں اور بوڑھے فقیر کی حسرتناک داستان حیات سننے لگتے ہیں۔

وہ بوڑھا فقیر جھم جھماتی بارش میں سینا ٹوریم سے نکال دیا جاتا ہے اور اپنے افلاس کے پھریرے (چھتری) کے ناکام سایہ میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے، مگر ایک طوفان زدہ کشتی کے بادبان کی طرح ہوا کے تیز جھونکے سے چھاتہ قلابازیاں کھاکر فقیر کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑ گیا" انسانوں کو ایک تفریح کا ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ تالیاں بجیں، قہقہے بکھرے اور انسانوں کے اس رویہ سے سینا ٹوریم کے بستر پر پڑے ہوئے اختر صاحب کے دل پر چھریاں چلتی رہتی ہیں۔ مگر وہ مجبور ہیں کچھ کر نہیں سکتے۔ بالآخر وہ بوڑھا فقیر ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتا ہے اور اختر صاحب انسانوں کے قہقہوں اور تالیوں کا بدلہ یہ کہکر لیتے ہیں اور اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں کہ "شاید انسانوں سے زیادہ فراخ حوصلہ اور نفع رساں یہ باوقار اور حلیم درخت ہوتے ہیں۔" (سینا ٹوریم کا فقیر)

آخر میں ہم اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ منظر و پس منظر کے تمام افسانے حیات بکنار زندگی کے ترجمان اور مقصدیت سے بھرپور ہیں۔ اور تمام کے تمام تعمیری اور اصلاحی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد میرا تاثر یہ ہے کہ اختر صاحب ایک عظیم فنکار ہیں اور ان کی تخلیقات ہمارے ادب کا گراں قدر اور حیات بداماں سرمایہ ہے۔ اختر صاحب زندگی کا گہرا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ رکھتے ہیں۔ اور انکے پیش نظر زندگی کا ایک صالح و صحت مند نظریہ ہے وہ اپنے تجربے، مشاہدے، مطالعے اور نظریہ سے ہمیں فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں کچھ کہنا چاہتے ہیں کچھ دینا چاہتے ہیں بقول آل احمد سرور "اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں (اختر صاحب کو) کچھ کہنا ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے"۔ اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے بہت کچھ کہا، بہت کچھ دیا، پڑھنے والوں کو بھی اور اردو ادب کو بھی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اختر اورینوی کی تنقید نگاری

اختر اورینوی کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "کسوٹی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا "تنقید جدید" پریس میں ہے۔ اقبال پر ابھی انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ انہیں سے ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ ادب و شعر میں ماحول اور وراثت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، ماحول میں شخصی اور سماجی دونوں کا اس پر اثر ہوتا ہے اور وراثت میں شخصی اور ادبی دونوں کے اثرات نظر آتے ہیں ایک جگہ انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "ادب و شاعری پر اجتماعی قماش دماغ کا اثر پڑتا ہے، کیونکہ فنکار کی نفسی ترکیب اجتماعی رجحانات سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ اجتماعی نفسی قماش خانوں، ورثہ اور ماحول کے مطابق حال اور ماضی کی ادبی، اخلاقی، سیاسی و اقتصادی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے، لہٰذا ادب و شاعری کی پیدائش اور ان کی نوعیت کی تشکیل میں مذکورہ بالا چیزوں کا بڑا دخل ہے۔ چنانچہ وہ انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر ادب و شعر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ ادب کو اجتماعی اور سماجی زندگی کی پیداوار سمجھتے ہیں لیکن ادب کے اشتراکی نظریئے کے قائل وہ بھی نہیں ہیں۔ ان کا میدان اس سے مختلف ہے۔ لیکن ان کے تنقیدی نظریات کے سائنٹفک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان کی بنیادیں عقل و شعور پر استوار ہیں۔

اختر اورینوی اپنی عملی تنقید میں پہلے ماحول اور وراثت کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی بحث نہایت خیال انگیز ہوتی ہے۔ وہ بہت گہرائی میں جانے کی کوشش کرتے ہیں پھر ادبی ماحول اور ذہنی ساخت کے اثرات بھی دکھاتے ہیں۔ تہذیب اور کلچر کے اثرات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اور پھر فنی خوبیوں کا پتہ لگاتے ہیں۔ مثلاً غالب کے متعلق ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "غالب ایک دوراہے پر کھڑا تھا، اس کے زمانے میں ایک عصر ختم ہو رہا تھا اور دوسرا شروع۔ غالب دونوں کے درمیان تھا اور ایک نفسی دوبد   میں مبتلا، عصری کے فیضان رجحانات کے ساتھ بدلتی ہوئی فضا کے اثباتی عناصر بھی غالب کی شاعری میں ظاہر ہوتے ہیں۔" غرض یہ کہ اسی طرح وہ تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تنقید میں تجزیے کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ (اردو تنقید کا ارتقا۔ ص ۱۳۱-۱۳۲) ●●

ڈاکٹر محمود الٰہی

اختر اورینوی کی تحقیقی کاوشیں

اردو شعر و ادب کو مقامات اور علاقہ جات کے لحاظ سے تقسیم کرنا کس حد تک مناسب ہے اور اس تقسیم کا کوئی منطقی اور عقلی جواز ہو سکتا ہے یا نہیں، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری ادبی تاریخ میں "لکھنؤ کا دبستان شاعری" اور "دہلی کا دبستان شاعری" جیسے فقرے ایک مستقل عنوان کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ پھر بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ان عنوانات کے محل استعمال کو اردو ادب کے فطری ارتقا کے پس منظر میں پرکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اگر شعر و ادب کا مورخ اپنی ذات کو دبستان سازی کے جھمیلوں سے الگ کر لے تو وہ شعر و ادب کی رفتار ترقی کا تعین کر سکتا ہے یا نہیں۔ جس طرح ہم اپنی آسانی کے لئے حادثات عالم کو ماہ و سال کے پیمانے سے ناپتے ہیں، اسی طرح کسی ایک مقام یا کسی ایک علاقے کے سہارے اگر ہم شعر و ادب کی رفتار ترقی کا جائزہ لیں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن افسوس اس کا ہے کہ کسی ایک مقام یا کسی ایک علاقے کا نام آتے ہی ہم معاصرانہ چشمک کے شکار ہو جاتے ہیں اور کسی ایک مقام کی زائیدہ منفی قدروں کو بھی رفیع اور حسین ثابت کرنے کے لئے تاویل و توجیہ کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ تاریخ نویسی اور تنقید نگاری میں یہ غلط مگر انتہائی خطرناک رجحان بڑی تیزی سے راہ پا رہا ہے اور اگر اسے روکا نہ گیا تو نہ تاریخ و تنقید تاریخ و تنقید نہ رہے گی، کچھ اور ہو جائے گی!

اردو ادب کو آج جس شکل میں ہم دیکھ رہے ہیں اور اسے جس رنگارنگ اور متنوع رجحانات کا حامل پا رہے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کی تعمیر میں نہ تو کسی ایک مقام کا ہاتھ رہا ہے اور نہ کسی ایک علاقے کا۔ اس کل "میں جن اجزا" کا خون جگر صرف ہوا ہے ان میں ایک عظیم آباد بھی ہے۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا چرچا رہا ہے اور اس سرزمین سے اردو نے جو اثر قبول کیا اور جو یہاں اثرات چھوڑے، ابھی تک بوجوہ اس کا جامع تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی ہمارے ان نقادوں اور محققین میں ہیں جنہوں نے اس مشکل مگر اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور بہار کی گوناگوں ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس باب میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق و تنقید کا دامن دبستان سازی کی آلائشوں سے پاک رکھا اور گم شدہ لسانی اور ادبی خزانوں کی ایک ایک کڑی کو اس طرح پیش کیا کہ وہ ایک کل کے فعال اجزا ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جس نظریے کو خلوص

صداقت کے ساتھ اپنایا وہ یہ ہے:

"علم اور تحقیق کی دنیا میں صوبائی عصبیت، قطعیت

اور کٹر پن کی کوئی جگہ نہیں۔"

انہوں نے عظیم آباد کی ادبی خدمات پر ایک مخلص نقاد اور ایک سچے محقق کی حیثیت سے روشنی ڈالی اور یہ ثابت کر دیا کہ شعر و ادب کا کوئی مورخ اس سرزمین کی ادبی فتوحات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اختر اورینوی کی خدمات کے مختلف مظاہر ہیں۔ وہ دراصل جامع حیثیات ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ وہ نقاد بھی ہیں اور محقق بھی۔ ان صلاحیتوں کے ان سارے مظاہر کی اہمیت و افادیت اپنی اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن انہوں نے عظیم آباد اور بہار کے موضوع پر جو کام کیا ہے، وہ ان کی بے پناہ علمیت اور نکتہ رسی کا آئینہ دار ہے۔ اس موضوع پر وہ [illegible] برس سے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے کے جس عنوان کو بھی چنا، اسے اردو ادب کی تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ایسا صرف اس لئے ہوا کہ وہ تحقیق کو تنقید کا پابند رکھتے ہیں۔ یوں تو تحقیق کے مختلف مدارج ہیں۔ مخطوطات کا تعارف، کسی شاعر یا ادیب کے عہد کا تعین، اشعار کی تاریخی ترتیب، متن کی تصحیح وغیرہ تحقیق کی شاخیں ہیں لیکن ان میں تنقیدی بصیرت نہ صرف کی جائے تو اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ یہ سمجھنا کہ تنقید و تحقیق کی دو جدا گانہ راہیں ہیں، غلط ہے۔ حقائق کی بازیافت اور ان کی نئی تعبیر، کسی مسئلے پر از سر نو غور و خوض کرنا درحقیقت ایسی باتیں ہیں جو صرف اُس دماغ کی پیداوار ہو سکتی ہیں جس میں تحقیق و تنقید کا صحت مند امتزاج ہو۔ اختر اورینوی ایک ایسے ہی دماغ کے مالک ہیں۔ وہ کسی مخطوطے کے تعارف میں صرف یہ کہہ کر اکتفا نہیں کرتے کہ یہ کب اور کن حالات میں لکھا گیا۔ وہ نوادر کی صرف نشاندہی کر کے نہیں رہ جاتے بلکہ اسے وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنی دریافت کو تاریخ میں صحیح مقام دلائیں۔ وہ حقائق کی بازیافت بھی کرتے ہیں اور پھر ان کی نئی تعبیر بھی کرتے ہیں۔ "بہار میں اردو ناول نگاری" "تاریخ عظیم آبادی" "بہار میں اردو مرثیہ نگاری" "فقہ ہندی" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

"بہار میں اردو زبان و ادب کا آغاز و ارتقا" اختر اورینوی کی مایہ ناز تصنیف ہے جس میں تحقیق کی گہرائی بھی ملتی ہے اور تنقیدی بصیرت بھی۔ اسے ان کی محققانہ کاوشوں کا حاصل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس تصنیف سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا سب سے وقیع حصہ وہ ہے جہاں انہوں نے علم اللسان سے بحث کی ہے اور اردو کی لسانی حیثیت کا از سر نو جائزہ لیا ہے۔ اس میں انہوں نے صرف علمائے لسانیات کے اقوال فراہم نہیں کئے ہیں بلکہ انہیں سامنے رکھ کر ایک صائب، صحت مند اور پر مغز نتیجہ نکالا ہے۔ انہوں نے اپنے پیش روؤں یا اپنے معاصرین سے جگہ جگہ اختلاف کیا ہے اور اس اختلاف کا محرک اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ ان علمانے حقائق تک پہنچنے کا وہ راستہ اختیار نہیں کیا جس پر وہ چلے ہیں۔ وہ رایوں کا اختلاف ٹھوس دلائل اور عقل پر مبنی براہین کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ:

"ماہرین و مبصرین نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور دوسروں کے نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ارتقائے اردو کے سلسلے میں مسئلے کے منفرد پہلوؤں کو خلط ملط کر دیا ہے۔"

اختر اورینوی نے یہ صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ:

"اردو کا ارتقا نہایت ہی پیچیدہ، مرکب، نازک، نیرنگ ساماں لسانی تماشیں پیش کرتا ہے۔ مبصر و محقق کو ان نازک تہہ دار پردوں کے اٹھانے میں چابکدستی، لطافت و نفاست سے کام لینا چاہئے۔"

اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے لسانی گتھیوں کو سلجھانے میں انہیں اصول و ضوابط سے کام لیا ہے۔ (بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ڈاکٹر اعجاز حسین

"طولِ عمرہٗ"

جب تمنائیں دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لیتے لیتے بے چین ہو جاتی ہیں خلوص ان کو بر پرواز عطا کرتا ہے، تمنائیں جذبات کا سہارا لے کر لبوں تک آتی ہیں یہاں خاموش تمناؤں کا نام "دعا" ہو جاتا ہے وہ گویائی کا جامہ پہن کر امید و حوصلہ کے براق و برق پر سوار ہو کر باب اجابت کی طرف رخ کرتی ہے یہاں کبھی اس کا خیر مقدم اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ جذبات و خلوص کا پیکر طائر لاہوتی ہے۔ اس کو بے نیل و مرام واپس کرنا شان کریمی کے خلاف ہے کبھی یہ خیال آتا ہے کہ پاکیزہ جذبات کو ٹھکرانا حسن سلوک سے بیگانگی کا اظہار ہوگا۔ دعا کی اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب وہ ذاتی و شخصی منفعت سے بے نیاز ہو کر نیاز مندانہ انداز میں ارباب قضا و قدر کے سامنے آتی ہے۔ وہ ملکوتی مجھے اس لئے بھی مائل بہ کرم نظر آتے ہیں کہ اس دعا میں خدمت خلق یا ایک مقبول و معروف تحریک کی خدمتگزاری کا شوق ہے۔

ادب کی خدمت بھی خدمت خلق ہے۔ اس لئے کہ اب عوام و خواص کے دلوں کی پکار ہے اس کے پس پشت ایک ہمہ گیر و قابل احترام جذبہ ہوتا ہے جس کی وسعت و نہایت لامحدود ہے۔ ادیب کی ہر جنبش قلم آواز دیتی ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے، اختر اورینوی صاحب ادب کے ایسے وقیع خدمت گزار ہیں جن کی ادبی کاوشوں نے ایک زمانہ کو اپنا لیا ہے۔ ان کی ذات و صفات ادبی پیکر کا نمونہ بن گئی ہیں ادب نے بھی ان کی خدمات کو مستحسن سمجھ کر ان کو کرسی موجودہ نقادوں کے صف اول میں لگا دی ہے۔ جس پر وہ اپنے قد و قامت کے لحاظ سے بھی بہت موزوں نظر آتے ہیں۔ یہاں میری مراد خارجی جسامت سے نہیں۔ بلکہ ان کا ادبی مرتبہ پیش نظر ہے یعنی ان کا ادبی شعور و بالیدگی کا احساس ہے۔ ان ہی خصوصیات کے پیش نظر میری دیرینہ تمنائیں دعا بن کر لب اظہار تک آپہونچی ہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ عالم الغیب کو میری آرزوں میری دعاؤں کا علم اس وقت سے بھی پہلے تھا جب وہ عالم وجود پردۂ خیال پر بھی نہ آئی ہوں گی۔ لیکن بشریت کو کیا کہا جائے وہ اپنی تسکین کیلئے بار بار مائل کرتی ہے کہ میں یہ کہتا رہوں کہ اختر اورینوی کی عمر دراز ہو، ان کی صحت جسمانی، توانائی اور دل و دماغ بالیدگی سے ہمیشہ ہمکنار رہیں۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ یہ دعا کروں کہ اے خدا ان کو اتنی دراز عمر و صحت و دماغ عطا کر کہ خضر علیہ السلام کو اپنی یکتائی پر نظر ثانی کرنا پڑے۔ مگر اس لئے چپ ہوں کہ بقول شخصے

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

پروفیسر آل احمد سرور

اس خرابے میں کچھ انسان ابھی باقی ہیں

اختر اورینوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ وہ علی گڑھ میں اردو کے ایک لکچرر کی جگہ کے انٹرویو کے لئے آئے تھے۔ اس وقت لکچرر درجہ اول کی جگہ خالی تھی جس کے لئے میں امیدوار تھا۔ لکچرر دوم کی دو جگہیں خالی تھیں۔ ان میں سے ایک جگہ کے لئے اختر بھی امیدوار تھے۔ انٹرویو سے پہلے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں وقار عظیم، حامد حسن بلگرامی، اختر اورینوی اس وقت یاد آتے ہیں۔ ایک جگہ پر اختر کے لئے جانے کا خاصا امکان تھا۔ مگر اتفاق سے امیدواروں میں ایک صاحب کے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا جو علیگڑھ کے ایک ممتاز اولڈ بوائے تھے۔ چنانچہ ان کے خاندان کی سرپرستی کے لئے ان صاحب کو لے لیا گیا دوسرے دن اختر میرے گھر آئے تو ان کے ماتھے پر شکن تک نہ تھی۔ بلکہ وہ ان حالات میں دوسرے صاحب کے انتخاب کو حق بجانب قرار دے رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اختر کو بجا طور پر اس کی شکایت ہوگی، مگر ان کا یہ رویہ دیکھ کر ان کی شرافت نفسی کا میرے اوپر بہت اثر ہوا۔ یہ اثر آج تک قائم ہے۔

انتخاب سے پہلے اختر اپنے ساتھ اپنے سارے مطبوعہ مضامین کا ایک فائل لائے تھے۔ ہر مضمون سلیقے سے سارے کاغذوں پر چپکا ہوا تھا۔ اور ایک ہی نظر میں اختر کے کام کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ میں ان معاملات میں بہت سست ہوں۔ کبھی اس طرح اپنے مضامین کا فائل مرتب نہ کر سکا۔ لیکن اختر کے پاس اس قسم کی چیز دیکھ کر ان کی باقاعدگی اور چستی کا اندازہ ہوا۔ باقاعدگی اور چستی والے مجھے پسند ہیں۔ گو میں نہ باقاعدہ ہوں، نہ چست، لیکن جہاں سلیقہ، نفاست، باقاعدگی، تنظیم و ترتیب دیکھتا ہوں اس کی داد ضرور دیتا ہوں۔ اختر کے یہاں مجھے یہ خوبی اب تک بھاتی ہے۔

کچھ دن کے بعد معلوم ہوا کہ اختر پٹنہ کالج میں اُردو کے لکچرر ہو گئے ہیں۔ ابتدا میں جب پٹنے جانے کا اتفاق ہوا تو ان سے ملاقات ضرور ہوئی۔ گو میں ٹھہرا مرزا اختر حسین اور پھر کلیم الدین کے یہاں۔ مگر انہیں قریب سے دیکھنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ضرور ملا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صرف اُردو کے اُستاد ہی نہیں، طلباء میں ہر دلعزیز بھی ہیں۔ ان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں۔ نصاب کے باہر کی سرگرمیوں سے بھی انہیں دلچسپی ہے خصوصاً ڈرامے سے۔ کالج کی اقامتی اور تہذیبی زندگی میں ان کی خاص جگہ ہے۔ دو تین دفعہ کے بعد ایسا ہوا کہ میں گیا تو اختر کے ساتھ ہی ٹھہرا۔ ان کے ساتھ جو وقت گذرتا تھا وہ دل و دماغ دونوں کے لئے لطف و انبساط کا باعث ہوتا تھا۔ اب تو اگر پٹنے جاؤں اور ٹھہرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اختر کے گھر کو میں اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ ان کی علمی و ادبی صلاحیت، ان کی ذہانت، ان کی خطابت، ان کی انتظامی استعداد، ان کے خلوص اور محبت کا قایل ہوں۔ وہ صرف اُردو کے پروفیسر نہیں ہیں۔ بہت اچھے معلم ہیں۔ علم کے منصب کو پہچانتے ہیں۔ طلباء کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ انہیں علمی کاموں میں لگاتے ہیں، ان کے ذوق کو بلند کرتے ہیں۔ ان میں زندگی کی اچھی قدروں کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ انہیں بہتر حیات کے آداب سکھاتے ہیں۔ انہیں انسان بناتے ہیں۔

اختر صاحب شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، ناولسٹ بھی اور نقاد بھی۔ ان کی شاعری میں سنجیدگی اور گہرائی ہے۔ گو شاعری ان کے یہاں ایک ذہنی اور حساس طبیعت کا کبھی کبھا کا جلوہ ہے۔ شاعری کے لئے جس دیوانگی اور سپردگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اختر کے بس کی بات نہیں، میرے بس کی بھی بات نہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا گہرا مطالعہ ہے۔ اس کے معنی خیز پہلوؤں کا احساس ہے۔ کردار نگاری کا سلیقہ ہے۔ زبان میں تاثیر اور کیفیت ہے۔ اور یہ افسانے ہمیں گرد و پیش کی زندگی کے متعلق ایک بصیرت ضرور عطا کرتے ہیں۔ ایک طویل بیماری کی وجہ سے انہیں اسپتال اور سینی ٹوریم کی فضا کے مطالعے کا موقع ملا اس سے انہوں نے بڑا کام لیا ہے۔ اردو کے اچھے افسانوں کا کیسا ہی انتخاب ہو ان کے کسی نہ کسی افسانے کو اس میں ضرور شامل کیا جائے گا۔ لیکن دراصل اختر کا اصلی میدان تنقید ہے۔ ان کے ڈی لٹ کے مقالے سے قطع نظر جس میں تحقیق اور تنقید دونوں کی طرف توجہ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے، ان کے ادب کے مطالعے اور اس کی پرکھ کے بڑے اچھے نمونے ہیں۔

اختر ہمارے ناقدوں میں ایک امتیازی صفت رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید صرف تشریح نہیں بلکہ کسوٹی بھی ہے۔ ان کے یہاں ادب کی اعلیٰ قدروں کا احساس ہے اور فن پاروں کو ان قدروں کی روسے پرکھنے کی کوشش بھی۔ میں دوستوں کے کارناموں پر تنقید کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔ تعریف کی جائے تو لوگ اُسے دوست نوازی سمجھتے ہیں۔ اگر ذوق کے اختلاف کی بنا پر کچھ پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی اپنے وجود کے ایک حصے پر اعتراض کر رہا ہے یہ بات ممکن ہے اچھی نہ ہو۔ لیکن اس معاملے میں مَیں بھی مجبور ہوں۔ اختر کے میرے اوپر کئی احسانات ہیں۔ ان کی وجہ سے میں دو ایسی شخصیتوں سے متعارف ہوا جنکو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک تو اب اس دنیا میں نہیں۔ میری مراد ایّوب مرحوم سے ہے۔ مجھے بہت لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں آسانی سے لوگوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن ایوب جیسے کھرے اور محبت کے پتلے میں نے کم دیکھے ہیں۔ کتنے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو نہی مایہ ہیں مگر اپنا ڈھول ہر وقت پیٹتے رہتے ہیں۔ مرحوم ایوب علم و عمل اور جذب و جنوں کی بہت بڑی پونجی لئے بیٹھے تھے۔ مگر درویشانہ زندگی گذارتے تھے۔ اور دوستوں کے سامنے اس طرح بچھ جاتے تھے

گویا وہ خاک پا ہوں۔ حالانکہ وہ سر پر بٹھانے کے قابل تھے

دوسری شخصیت جمیل مظہری کی ہے۔ خدا انہیں عمر خضر عطا کرے۔ یہ بہت بڑے شاعر ہی نہیں، بڑے اچھے اور سچے آدمی بھی ہیں۔ ایک دفعہ اپنی بدحواسی کی وجہ سے جلتے ہوئے سگریٹ سے میرا ہاتھ جلا بھی چکے ہیں۔ لیکن بڑے پیارے آدمی ہیں اور مجھے بہت بھلے لگتے ہیں۔

اختر اور جمیل مظہری سے ادبی گفتگو مسرت ہی نہیں بصیرت کا بھی باعث ہوتی ہے۔ جمیل مظہری میں گہرائی ہے، اختر میں وسعت۔ جمیل مظہری شاعر ہیں اور پسند و ناپسند کے شکار۔ اختر ناقد ہیں اور کثرت میں وحدت دیکھنے کے عادی۔ جمیل مظہری سے عشق کیا جا سکتا ہے، مگر اس عشق میں خطرہ یہ ہے کہ جدید دور کی بہت سی بصیرتوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اختر ہمارے ساتھ دور تک جا سکتے ہیں۔ ان میں نئی کروٹوں میں پرانی وادیاں مل جاتی ہیں اور پرانی فضاؤں میں نیاپن بھی نظر آتا ہے۔

اختر کی یاد آئے تو ان کی رفیقۂ حیات شکیلہ اختر کا خیال ضرور آتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو عرصۂ دراز سے جانتے ہیں۔ مگر ملاقات حال ہی میں ہوئی۔ اختر کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں شکیلہ اختر جیسی رفیقۂ حیات ملیں۔ جن کی دلنواز شخصیت اور ذوقِ سلیم دونوں کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

اختر اور بیوی کی ایک اور حیثیت بھی ہے۔ جس کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ بہار میں اردو کی تحریک میں وہ سامنے نہیں آئے۔ مگر پس پردہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس تحریک کی ہر منزل پر اختر کی رہنمائی ہمیں حاصل رہی ہے۔ حکومت سے اردو کے حقوق کو منوانا ہو، یا تعلیمی اداروں میں اردو کی حیثیت کو تسلیم کرانا، عوام کے سامنے اردو کے مسئلے کو قومی نقطۂ نظر سے پیش کرنا ہو یا تنظیم کے پیچ و خم کو ہموار کرنا، اختر ہر وقت اور ہر منزل پر ایسی مدد کرتے رہے ہیں۔ جو دوسروں سے ممکن نہیں تھی۔

انہوں نے صرف زبان کے تحفظ کے لئے ہی کوشش نہیں کی بہار میں نئے لکھنے والوں کی ایک نسل کی بھی تربیت کی ہے آج بہار میں اچھی نثر لکھنے والے اور اچھا شعر کہنے والے کسی اور علاقے سے کم نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے بہار کے کتنے ایسے شعراء پر قلم اٹھایا ہے جن کی اہمیت کا اردو دنیا میں مناسب احساس نہ تھا۔ گویا تاریخ ادب اردو میں اختر اور ان کے رفیقوں نے کئی ابواب کا اضافہ کیا ہے۔

یہ چند سطریں جو غلام سرور کے اصرار پر لکھ رہا ہوں، نہ تعارف ہے، نہ تبصرہ، نہ تنقید۔ اختر کو اب ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہاں! انہیں اور ہم سب کو ابھی اردو ادب کی اور خدمت کرنا ہے۔ کچھ ایسی کتابیں لکھنی ہیں جو زندہ رہ جائیں۔ نوجوانوں میں ذوقِ سلیم کی اور ترویج کرنا ہے اور زبان و ادب کی خدمت کے راستے سے مشترک تہذیب کے نقوش جاگزیں کرنا اور ملک میں جمہوریت اور سوشلزم کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے۔

ہماری نسل دیوزادوں کی نسل نہیں ہے۔ مگر ہم نے دیوزادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ہمیں قدیم رنگ کے اچھے پہلوؤں کا احساس ہے۔ اور جدید دور کے تقاضوں کا علم، ہم نے خواب دیکھے ہیں اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور آج کے حالات کی ترشی کے باوجود ان خوابوں کا نشہ باقی ہے۔ نشہ جو نجات بھی ہے ●●

سید فضل احمد
آئی۔ پی۔ ایس

جب میری بڑی بہن پیدا ہوئیں تو بھیّا کو مایوسی ہوئی۔ لیکن پھر بھی انہوں نے بازار سے کھلونے لائے اور بہن کو دیئے۔ مگر وہ خوش نہ تھے۔ یہ تحفہ ایک نفسیاتی تسکین کی کوشش تھی۔ وہ اپنے بھائی کی تلاش میں تھے۔ اور یہ تحفہ دراصل اسی کے لئے تھا۔

فطرت بھیّا کو اور انتظار کرانا چاہتی تھی۔ ہمارے والدین کی تیسری اولاد بھی ایک لڑکی ہی تھی۔ بھیّا اس بہن کو بہت چاہتے لگے۔ اور جب یہ بڑی ہوئی تو بڑی بہن سے چھوٹے موٹے جھگڑے ہو جاتے تھے۔ بھیا ہمیشہ چھوٹی بہن کا ساتھ دیتے اور بڑی بہن کی تنبیہ کیا کرتے۔

بھیّا کے بارہ سال بعد میں پیدا ہوا۔ ان کے لئے یہ عید کا دن تھا۔ وہ بے حد خوش ہوئے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ اختر کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ میں دو سال کا تھا کہ والدہ انتقال فرما گئیں۔ دادی اماں نے مجھے پالا۔ والدہ کے فوت ہونے کا غم بھیّا کو اتنا ہوا کہ وہ مہینوں روتے رہے۔ اور ان کی محبت ہم لوگوں کے لئے اور بڑھ گئی۔ دادی اماں نے میری بڑی ناز برداری کی۔ منجھلے چچا مرحوم بھی ہم سب بھائی بہنوں پر فدا تھے۔ میں دادی اما، منجھلے ابا، اور بھیا کی محبّت کے سائے میں پلا۔ بھیّا مجھے اکثر پھل خرید کر لا دیا کرتے تھے۔ خصوصاً انار۔ اس لئے کہ میں عموماً بیمار رہتا تھا۔ چھوٹے پن ہی میں مجھے نمونیہ ہو گیا اور والدہ کے انتقال کے بعد بھی میں بیمار رہا۔ میں کئی سالوں تک بھیّا کو 'انّا' کہتا رہا۔ یعنی انار لانے والا اختر۔ اسکول سے جب بھیّا کالج گئے تو میں چند سالوں ہی کا تھا۔ اسی وقت سے میں ان کی نقل کرتا تھا۔ قمیص پہنوں گا تو انّا کی طرح، بال جھاڑوں گا تو انا کی طرح۔ غرض ہر بات میں ان کی پیروی کرتا تھا۔

بھیّا کو میری تعلیم کی بے حد فکر تھی۔ اور جب وہ ملازم ہوئے تو میں ان کے ساتھ جا رہا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ بھیّا چونکہ خود میڈیکل کالج کی تعلیم مکمل نہ کر سکے وہ چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں، لیکن ایسا نہ ہوا، اور میں بھی آرٹس ہی کی طرف گیا۔ اب بھیّا کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ میرا بڑا بیٹا نعیم احمد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرے۔ بھیا کی

ساری محبت اب میرے بچوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔

میں چھ سال کے عرصے تک بھیا کی محبت اور شفقت کے سائے میں تعلیم حاصل کر رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی بھی انہوں نے مجھ سے سختی سے بات بھی کی ہو۔ وہ میری غلطیوں پر بھی بڑی محبت سے سمجھایا کرتے تھے۔ میں کچھ عرصے کے لئے انڈین ایر فورس میں چلا گیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ میں نے بھیا سے اجازت نہیں لی تھی۔ لیکن چونکہ امام جماعت احمدیہ مسلم نوجوانوں کو فوجی تعلیم کے لئے ترغیب دیا کرتے تھے۔ بھیا کچھ نہ بولے۔ لیکن وہ بہت پریشان رہے۔ آخر ش کسی چھوٹی موٹی غلطی کی وجہ سے مجھے ایر فورس چھوڑنا پڑا۔ اور فطرت نے خود بھیا کے لئے مسرت کا سامان پیدا کر دیا۔

میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۷۶ء تک پٹنہ سے باہر میں رہا۔ میرے بچے تعلیم کے لئے بھیا کے ساتھ رہے اور انہیں بھیا اپنا جگر گوشہ بنائے رہے۔ میں کچھ دنوں کے لئے پٹنہ میں سیٹی ایس۔ پی مقرر ہوا۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ میں نے بڑے لڑکے نعیم احمد کو ایک تھپڑ مار دیا۔ بھیا کو خبر ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ بچے اب فضل کے یہاں نہیں جائیں گے۔ میرا ڈر کے مارے برا حال ہوا اور دو تین دنوں کے بعد میں نے بھابھی کے ذریعہ اپنی سفارش کروائی۔ اور بھیا سے وعدہ کیا کہ ان کے بچوں کو کبھی نہیں ماروں گا۔ میں نے یہ وعدہ پورا کیا ہے لیکن میں ہی جانتا ہوں کہ صرف بھیا کے ڈر سے۔ اگر میں بچوں کو ڈانٹا ہوں تو وہ مطمئن رہتے ہیں کہ بڑے ابی کے ہوتے ابی میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں جب بھی مجھے پریشانیوں یا دشواریوں سے سابقہ پڑا، وہ بے قرار ہو گئے۔ نمازوں میں بے تابی سے میرے لئے دعائیں کرتے رہے اور بزرگوں کو دعاؤں کے لئے خط لکھتے رہے۔ اور میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ ان کا وجود ہی میرے لئے ایک بڑی طاقت اور ایک بڑا سہارا بنا رہا ہے۔

میں نے اپنے بھیا کی علمی صلاحیتوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ انہیں اسلام، قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، احمدیت اور اپنے مقصد سے بے انتہا محبت ہے۔ انہوں قرآن کریم کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اسے مکمل طور پہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے اشتراکیت کا بھی بہت اچھا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی بیشتر تقریروں میں اسلام کی اشتراکیت کے مقابلہ میں برتری کا احساس واضح طور پہ ہوتا ہے۔ وہ حق پرست ہیں۔ اور صداقت اور حق کی باتوں کو کسی بھی پلیٹ فارم سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تمام جرأت وہمت رکھتے ہیں

میں اپنے بھیا سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور ان کی ذات پر مجھے بڑا فخر اور ناز ہے۔ خداوند انہیں صحت اور سلامتی کے ساتھ تادیر زندہ اور سلامت رکھے۔ تاکہ وہ قوم اور ملک کے لئے اور بھی مفید ثابت ہو سکیں۔ اور ہمیں ان کی محبت اور شفقت اور ان کا سہارا ملتا رہے۔ آمین! •

ڈاکٹر ایس۔ ایم نواب
ایف آر۔ سی۔ ایس

اختر۔ میری نظر میں!

اختر اورینوی صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں اپنے داخلے کے وقت پٹنہ سائنس کالج میں ہوئی۔ اختر صاحب سے ملنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں ایک مخلص، شفیق اور ہمدرد انسان سے مل رہا ہوں اور خلوص، شفقت اور ہمدردی کے اسی جذبے نے شاید ہم لوگوں کو اس قدر قریب کیا۔ اختر صاحب نے سائنس کالج اور میڈیکل کالج کی بوجھل اور مادی فضاؤں میں بھی اپنے دلنشیں مضمون سے حسن و محبت کے حسین پھول کھلائے۔ میڈیکل کالج میں تین سال تک پڑھنے کے بعد ان کے مرض نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ادب اور شاعری کیلئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔ میڈیکل سائنس سے اختر صاحب کی کنارہ کشی ادب اور شاعری کیلئے خوشگوار ثابت ہوئی۔ کیونکہ انھیں ایک ادیب ایک فنکار اور ایک شاعر مل گیا تھا لیکن میڈیکل سائنس کی یہ بدنصیبی تھی کہ اس نے ایک ہونہار ذہین اور ہمدرد ڈاکٹر کو کھو دیا۔ اختر صاحب کی یہ علالت نے انہیں تنہائی بخشی اور یہی تنہائی انہیں ادب اور شاعری کے گوشۂ عافیت میں لے گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہم لوگوں نے دیکھا کہ اختر صاحب بہت تیزی کے ساتھ ادب کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر رہے تھے۔ اس وقت اختر صاحب اور ہمارے حلقے کے بے تکلف دوستوں میں پروفیسر زین العابدین، پروفیسر سید محمد محسن اور مسٹر سلیمان آئی۔ اے۔ ایس وغیرہ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اختر صاحب ایک بڑے ادیب اور سلجھے ہوئے ذہن کے فنکار ہیں اور جب بھی میں نے ان کے فن کا مطالعہ کیا میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ انسان کے مختلف مسائل کو دیکھا اور انہیں پیش کیا ہے۔ میں نے ان کے فن میں انسانی زندگی کی دھڑکنوں کو سنا ہے ان دھڑکنوں کو جن میں مسائلِ حیات کی لرزش شامل ہے۔ اور غالباً یہی وہ مسائل ہیں جو مجھے اور اختر صاحب کو اس رشتۂ اشتراک میں پروتے ہیں اور اس رشتۂ اشتراک نے ہمیں اور اختر صاحب کو اس قدر قریب کر دیا ہے کہ ایک میڈیکل سائنس سے تعلق رکھنے والا انسان ایک ادیب کا ہمدم اور ہمراز بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ اختر صاحب کی قربت نے مجھ میں لطیف جمالیاتی احساسات کو بھی بیدار کیا اور مجھے ذوقِ سلیم کی جانب متوجہ کیا۔ اب بھی جب مجھے اختر صاحب کے یہ اشعار یاد آتے ہیں تو میں بے چین ہو جاتا ہوں یہ وہ اشعار ہیں جو ان کے دلی جذبات کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کرتے ہیں ؎

دل کی کلی کھلی بھی جو بادِ خزاں نے آ لیا ۔۔۔ نغمے نکل رہے تھے کہ سازم اکھڑ گیا
خندہ ابھی تھا زیرِ لب آنسو کا ابر چھا گیا ۔۔۔ ابھی خوشی کا آفتاب وقتِ غروب تھا

لیکن اختر صاحب صرف ایک فنکار اور ادیب ہی نہیں بلکہ ایک پیاری اور موہ لینے والی شخصیت کے بھی حامل ہیں۔ ان کی تقریر میں روانی اور آبشار کا سا بہاؤ اور اندازِ گفتگو میں جذب کر لینے والی طاقت ہے اور اسی خوبی نے ان کے دوستوں کے حلقے کو اس قدر وسیع کیا کہ آج ان کے دوستوں کی تعداد سینکڑوں تک پہونچ چکی ہے۔ جو ملک کے کونے کونے تک پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ دنیا کے اور بھی مختلف ممالک میں جہاں اختر صاحب کے دوست اور جاننے والے ان سے عقیدت اور محبت رکھنے والے موجود ہیں اور یہی ان کی عظمت ہے

کوئی دیکھے کہ جیسے میں نے دیکھا

کے علاوہ دوسری صنف میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو ان کے قلم کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے اگر وہ تمام اصناف سے قطع نظر صرف افسانے لکھیں تو میرا خیال ہے وہ اپنی صلاحیت کا صحیح مصرف لیں گے

قیوم خضر

کوئی دیکھے کہ جیسے میں نے دیکھا!

اختر صاحب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اساطیری ادب کے کسی کردار کو اس زمانے میں دیکھ رہے ہیں کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ زمانہ قدیم کا کوئی یونانی مجسمہ آواگون کے اصول کے مطابق جاگ کے چلتا پھرتا نظر آرہا ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ کوئی مغل بادشاہ کوٹ پتلون پہن کر اس زمانے کا جائزہ لینے کیلئے قبر سے نکل آیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اختر صاحب کا ڈھانچہ موجودہ زمانے کے لوگوں سے قدرے مختلف ہے۔ کتنی جاذبیت کتنی دلکشی، کتنا حسن ہے۔ ان کے تناسب اعضا دیکھ کر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو دیکھتے ہی رہیے۔ نہ جانے اپنی جوانی میں انھوں نے کتنوں کا کلیجہ پانی کیا ہوگا۔ اور جب وہ محو گفتگو ہوں تو بس فراق کا شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

وہ مخاطب بھی ہیں، قریب بھی ہیں
ان کو دیکھیں کہ ان سے بات کریں

دل کو گدگدا دینا۔ روح کو حرارت بخش دینا ان کی گفتگو کا ادنیٰ کمال ہے جب وہ اپنے موڈ میں کسی سبجکٹ پر گفتگو یا تقریر کرتے ہوں تو اس وقت گلفشانی گفتار کا حسن دیکھئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک دریا ہو جس کی موجیں لعل و گوہر اچھالتی گنگناتی چلی جارہی ہیں۔ اگر آپکے دامن میں صلاحیت ہے تو بے شمار جواہرات چن کر بھرے جاسکتے ہیں۔ ان کا اپنا لہجہ اپنا انداز اور اپنا آہنگ ہے لہجے میں غزلوں کی لپک، انداز میں شاعری کی دلنوازی اور آہنگ میں موسیقی کا سحر چھپا ہوتا ہے۔ اختر صاحب کا کردار ایک مثالی کردار ہے۔ اور انہوں نے دنیاداری کے جھمیلوں سے اپنے دامن کو ایک حد تک آلودہ ہونے سے بچایا

ان کا کیرکٹر، ایک اچھے اور شریف آدمی کا کیرکٹر ہے۔ وہ چکنی چپڑی باتیں کرنے کے عادی نہیں۔ دل میں جو بات ہوگی اسے وہ برملا اپنی زبان سے کہیں گے۔ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ والی بات کے وہ آدمی نہیں۔ میں نے بیشمار مواقع پر ان کی اس خصوصیت کا تماشا دیکھا ہے۔ ان کے کیرکٹر میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ حد درجہ دوست پرست ہیں۔ دوستی نباہنا اور دشمنوں کے وقار کو قائم رکھنے کا ہنر کوئی اختر صاحب سے سیکھے۔ وہ دوستوں کے جھگڑے میں گھرے رہنے کے عادی ہیں۔ دوست کا خفا ہونا ان کے نزدیک سب سے بڑا عذاب ہے۔ وہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کی شکایت کبھی نہیں کرتے۔ وہ دلوں کے ملانے کے قائل ہیں۔ انکے سامنے جب کوئی کسی کی شکایت کرتا ہے تو سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اس طرح دلوں کی دنیا اجڑتی ہے اور محبت کی دیواریں گرتی ہیں۔ اور غلاظت و خباثت کا راستہ دکھلاتی ہے غیبت بہت برا ذریعہ ہے دلوں کو الگ کرنے کا۔ اس لئے وہ غیبت کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس طرح کے گندے جذبات سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں بڑا شریفانہ اور متمدن سکون نظر آتا ہے۔ اختر صاحب کے کردار پر مستقل ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر وقت کی کم مائیگی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اختر صاحب کے فن پر لکھنے کا یہ موقع نہیں مگر پھر بھی چلتے چلتے یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے ان کا قلم حد درجہ چابکدست اور فنکارانہ ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ افسانہ لکھنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ انھوں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں بعض ایسے افسانے لکھے ہیں جو اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ

(بقیہ صفحہ ۵۱۲ پر)

ڈاکٹر یان مارک

پروفیسر اختر اورینوی صاحب سے میری ملاقات

ڈاکٹر یاں مارک چیکوسلوواکیا کے ادارۂ علومِ مشرقی، پراگ کے شعبۂ ہندوستانیات میں اردو کے پروفیسر اور مشہور ماہر لسانیات ہیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے ممنون کرم ہیں کہ اپنی بیحد مشغولیت کے باوجود انہوں نے ہماری فرمائش پوری کی اور اختر صاحب سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرکے ہمیں بھیجا۔

ادارہ

مجھے پہلی دفعہ ہندوستان گئے پانچ سال کا عرصہ ہوا۔ اور ۱۹۶۰ء میں مجھے ہندوستان کی بڑی بڑی یونیورسیٹیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ تنقید، لسانیات اور تاریخ ادبیات کا جو تحقیقی کام اُردو میں ہو رہا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور اس واقفیت سے کچھ فائدہ اٹھا سکوں۔

پٹنہ یونیورسٹی میں میرے ایک معزز دوست ہیں۔ جن کو میں عرصہ سے جانتا ہوں۔ ان کا نام ڈاکٹر سید فخرالدین احمد ہے یہ کئی سالوں پہلے علاج کے لئے چیکوسلواکیہ آئے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ آپ اختر اورینوی صاحب سے ضرور ملئے۔ وہ اردو کے پروفیسر ہیں۔ لسانیات و ادبیات کے بڑے ماہر ہیں۔ نقاد ہیں اور اس کے علاوہ خود افسانہ نگار ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ شوق سے آپ کی رہنمائی کریں گے۔

یہ مشورہ از حد قیمتی نکلا۔ اختر صاحب نہ صرف میری رہنمائی کرنے کے لئے تیار تھے بلکہ مجھے اپنے گھر میں رہنے کی بھی انہوں نے دعوت دی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ "دعوت شیراز" کس قسم کی دعوت کو کہتے ہیں۔

میری خواہش یہ تھی کہ پٹنہ سے قریب جو بودھ مذہب کے تاریخی آثار ہیں ان کی بھی زیارت کروں۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔ یہ بڑی آسان بات ہے۔ گیا میں میرے بھائی رہتے ہیں وہ پولیس سپرنٹنڈنٹ ہیں ان کا بڑا گھر ہے اور گاڑی بھی ہے۔ میں ان کو خط لکھوں گا۔ ان کے لئے آپ کا آنا کسی دقت کا باعث نہ ہوگا۔

کئی دنوں بعد گیا آنے کی دعوت ملی۔ ہم اختر صاحب کے ساتھ چل پڑے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر تھا۔ ریل گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہم کو اطمینان سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نہ صرف ادبیات کے ماہر ہیں۔ بلکہ اپنے ملک کی شاندار تاریخ کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہیں اور ہندوستان کی بہبودی و ترقی کے تہہ دل سے خواہش مند ہیں اگرچہ وہ سوشلسٹ نہیں ہیں پھر بھی اشتراکی نظام کی بنیادوں سے ناواقف نہیں۔

گیا میں ان کے چھوٹے بھائی ہمارے منتظر تھے ان کی اہلیہ سے مل کر اور کھانا کھا کر ہم راجگیر اور نالندہ دیکھنے گئے۔ میں بہت خوش تھا کہ پروفیسر اورینوی صاحب میرے ساتھ تھے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم نے کنگ اور بھونتک سام اکھوٹں کے قلعے دیکھے۔ صحت بخش چشموں سے پانی پیا۔ اور نالندہ کے بودھ دھرم کی سب سے پرانی یونیورسٹی کے کھنڈروں کا مفصل معائنہ کیا۔ اس کے لئے میں پروفیسر صاحب کا بڑا شکر گزار ہوں۔

دوسرے دن ہم بودھ گیا دیکھنے گئے جو بودھوں کا شاندار مذہبی مرکز ہے۔ پروفیسر اختر صاحب نے مجھے اس درخت کو بھی دکھایا جس کے نیچے گوتم نے بزرگی پائی تھی۔ اس دن میری طبیعت بگڑی ہوئی